

# کاشف الحقائق

سید امداد امام اثر

رہ لاماں کا صد شکر ہے کہ اس نے ہمیں توفیق دی کہ ہم اردو ادب کی کتب کو سافٹ میں تبدیل کر سکے۔ اسی صورت میں یہ کتاب آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ مزید اس طرح کی عمدہ کتب حاصل کرنے کے لئے ہمارے گروپ میں شمولیت اختیار کریں۔

انکھامیہ برقی کتب

گروپ میں شمولیت کے لئے:



محمد ذوالقرنین حیدر: +92-3123050300

اسکالر سید روٹا ہر صاحب: +92-334 0120123



# کاشف الحقائق

(معروف بہ بہارستانِ سخن)

مصنف  
سید امداد امام اثر

مرتبہ  
ڈاکٹر و باب اشرفی



ترقی اردو بیورو نئی دہلی

شک 1903

سنة اشاعت : 1982

© ترقی اردو بیورو، نئی دہلی

پہلا اڈیشن : 1000

قیمت : 22/00

سلسلہ مطبوعات ترقی اردو بیورو

اس کتاب کی طباعت کے لیے حکومت ہند نے رعایتی قیمت پر کاغذ فراہم کیا

ناشر : ڈائریکٹر ترقی اردو بیورو، ویسٹ بلاک 8 آر کے پورم نئی دہلی 110022

طابع : جے۔ کے۔ آکسفٹ پرنٹرز۔ دہلی



## پیش لفظ

اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے لیے حکومت ہند کی وزارت تعلیم و ثقافت کے تحت ترقی اردو بیورو کے ذریعے جن لاکھوں اور منصوبوں کو عملی شکل دی جا رہی ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مختلف جدید علوم پر کتابیں ماہرین سے لکھوائی جائیں اور ان علوم سے متعلق اہم مغربی و مشرقی کتابوں کے تراجم شائع کیے جائیں جو نہ صرف زبان بلکہ قوم کی ترقی میں بھی مفید و معاون ثابت ہوں۔

اس منصوبے کے تحت ترقی اردو بیورو اب تک خاصی تعداد میں کتابیں شائع کر چکا ہے۔ ان میں شعروادب، تنقید، لسانیات، تاریخ، جغرافیہ، سیاسیات، تجارت، زراعت، امور حکومت، معاشیات، عمرانیات، قانون، طب، فلسفہ اور نفسیات پر اعلیٰ کتابوں کے علاوہ تعلیم، الفان، بچوں کے ادب، سائنس اور ٹیکنیکی علوم سے متعلق ایسی کتابیں بھی شامل ہیں جو اردو کی نصابی ضرورتوں کو بھی کسی حد تک پورا کر رہی ہیں۔ ان موضوعات پر اچھی آسان اور معیاری کتابوں کی جو کمی اردو حلقوں میں شدت سے محسوس کی جا رہی تھی وہ بیورو کے ذریعہ آہستہ آہستہ پوری ہو رہی ہے۔ ترقی اردو بیورو کی شائع کردہ کتابیں حسن طباعت کا ایک معیار قائم کرتی ہیں اور ان کی قیمت بھی نسبتاً کم رکھی جاتی ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ ان کتابوں کی مقبولیت میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔

ترقی اردو بیورو کے جامع منصوبوں کے تحت اردو انسائیکلو پیڈیا، اردو لغت (کلاں)، اردو لغت (برائے طلبہ)، انگریزی اردو لغت، اردو انگریزی لغت، بنیادی متون کی اشاعت، اردو کتابیات کی تیاری اور مختلف علوم کی اصطلاح سازی کے کام بھی جاری ہیں۔ ان کی تکمیل کے لیے ہمیں ملک بھر کے ماہروں کا تعاون حاصل ہے۔

زیر نظر کتاب ترقی اردو بیورو کے اشاعتی پروگرام کا ایک جز ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اردو داں حلقوں میں اس کتاب کی بھی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

کے کے کھٹر

ڈائریکٹر، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی





# فہرست

## حصہ اول

46	صلی علیٰ احمد و آلِ کریم
48	غرض تصنیف ہذا
51	تعریف شاعری و حجاست شاعری باموسیقی و مصوری
52	موسیقی
59	موسیقی اور غنا پر مذہبی پہلو سے نظر
66	مصوری
70	مصوّر کے لئے علوم کی ضرورت
74	پہلی تصویر
75	دوسری تصویر
75	تیسری تصویر
80	مصوّر کو مشاہدہ عالم کی حاجت
80	شاعری
83	بیانِ عالم مادی و غیر مادی
89	شاعری کی تقسیم از روئے تقاضائے مضامین
90	رعایت لفظی
90	مبالغہ پر دازی
91	صنائع و بدائع
91	پست خیالی
91	مکر وہ مضامین





138	مرثیہ نگاری
145	اسکاٹلس
”	سفا کلینر
147	یورپائیڈیز
”	ارسطو فینئر
148	لاطینی شاعری
150	بیان اہل روم
152	لکڑیشنس
153	کٹلس
154	مرثیہ
155	ورجل رومی شاعر
158	ہارس شاعر رومی
160	خطاب بہ پیرا
163	لوکن شاعر رومی
164	مضامین ہجو
166	یورپ کے عہدِ جہالت کا بیان اور اس عہد کی شاعری
169	اہل عرب کی شاعری
”	ملک عرب اور اس کے صوبے
170	کیفیت ملک عرب
171	اہل عرب کا بیان
174	عرب کی شاعری قبل و بعدِ بعثت صلعم
182	عربی شاعری کے نمونے

210	بسم اللہ - عرفی - ذوق
212	داستان گھوڑے کی تعریف میں
251	انتخابات ذیل کتاب حماسہ سے لئے گئے ہیں
261	قصیدہ در مدح ابو علی ہارون بن عبدالعزیز الارواجی الکاتب
263	غزل حافظ
294	جنگ احد
298	جنگ خندق
300	جنگ خیبر
326	غزل
327	منتخب از دیوان امیر المومنین علیہ السلام
329	تجزیر از مجاست جاہلاں و تنفیر از موانست غافلان
334	مدح علم و ادب و ہر عقل و حسب
335	بیان آنکہ بناء کار مردم بر مال ست نہ بر عقل کامل و طبع راست
۳۳۸	ارشاد ارباب صلاح بہ اسباب فلاح
338	قصیدہ فرزدق
344	نمونہ کلام زہیر
346	ولہ
۳۴۷	ولہ
347	ولہ
۳۴۸	تمام ہوئی جلد اول



## (حصہ دوم)

349	فارسی اور اردو شاعریاں واحد المذاق
354	ملک ہندستان کا بیان
356	ہندستان بچہ حکومت انگلشیہ
360	فارسی کی نظم و نثر کے تاریخی حالات
369	غزل
379	خواجہ حافظ
384	سعدی
387	غزل جامی
388	غزل فغانی
"	غزل خسرو
389	غزل اہلی شیرازی
"	غزل مرزا علی قلی خاں میلی
390	غزل ابوطالب ہمدانی کلیم
"	غزل ہلالی
392	غزل شیخ محمد علی حزیں
"	غالب
394	حافظ - غالب
395	حافظ - غالب
397	غزل مرزا صائب
398	غزل صائب
"	غزل حافظ
399	فارسی اور اردو کا مختصر بیان
403	اردو کی نظم و نثر کی مختصر تاریخ
409	ولی دکنی

410	مرزا رفیع سودا
412	قطعہ
414	خواجہ میر درد
416	میر تقی میر
417	کلام میر تقی میر
418	قطعہ
423	مومن دہلوی
424	غزل مومن
425	غزل خواجہ آتش
426	غزل مومن
428	ذوق دہلوی
429	ذوق کے خارجی مضامین کے اشعار
431	ذوق کے داخلی مضامین کے اشعار
434	غالب دہلوی
445	ناسخ
447	غزل ناسخ
448	غزل ناسخ
449	غزل غالب
450	غزل ذوق
451	غزل غالب
"	اشعار ناسخ
452	آتش
453	غزل آتش
454	رند
468	سہرا

469	غالب کا سہرا
470	ذوق کا سہرا
472	سلام
"	سلام میر ضمیر رحمہ اللہ تعالیٰ
473	سلام میاں دلگیر مرحوم و مغفور
"	سلام میر انیس اعلی اللہ مقامہ فی الجنۃ
474	سلام میر تونس ثور اللہ مرقدہ
475	قصیدہ
476	فارسی کی قصیدہ گوئی
"	رودکی
478	اشعار از قصائد رودکی
479	فردوسی طوسی
"	قصیدہ فردوسی
480	سنائی
"	قصیدہ سنائی ع ۱
481	قصیدہ سنائی ع ۲
482	انوری
483	قصیدہ انوری
484	خاقانی
485	قصیدہ
486	مطلع ثانی
"	سعدی بحیثیت قصیدہ گو
487	قصیدہ سعدی ع ۱
488	قصیدہ نمبر ۲ در صفت ربیع
489	قصیدہ سعدی ع ۳



مولانا جمال الدین عرفی شیرازی

قصیدہ عرفی

قاآنی

اشعار از قصیدہ منقبت در شان سیدنا امام رضا علیہ الجزوالثنا

قصیدہ قانونی ع

اردو کی قصیدہ گوئی

مزار فیح سودا بہ حیثیت قصیدہ گو

نمبر ۱۔ قصیدہ نعت تاسی اشعار

نمبر ۲۔ قصیدہ منقبت تاجہل و ہفت اشعار

نمبر ۳۔ تشبیب قصیدہ در مدح نظام الملک

نمبر ۴۔ قصیدہ در تہنیت فتح

نمبر ۵۔ قصیدہ شہر آشوب

نمبر ۶۔ قصیدہ در ہجو اسپ

ذوق بحیثیت قصیدہ گو

نمبر ۱۔ تشبیب قصیدہ در مدح اکبر شاہ

نمبر ۲۔ تشبیب قصیدہ غسل صحت

نمبر ۳۔ قصیدہ مداح

نمبر ۴۔ تشبیب قصیدہ مدح

نمبر ۵۔ تشبیب قصیدہ مدح

قطعہ

فارسی کی قطعہ نگاری

انتخاب قطعات ابن یمن

انتخاب قطعات سعدی

قطعہ فردوسی

قطعہ نظامی

- 537 قطعہ سنائی  
538 قطعہ غالب دہلوی  
" اردو کی قطعہ نگاری  
539 قطعات ذوق  
540 قطعات غالب  
542 رباعی  
543 فارسی کی رباعی نگاری  
" رباعی فردوسی  
" رباعی رومی  
544 خاقانی بحیثیت رباعی نگاری  
" انوری بحیثیت رباعی نگار  
545 عمر خیام بحیثیت رباعی نگار  
546 انتخاب، از رباعیات عمر خیام  
549 سعدی بحیثیت رباعی نگار  
550 اردو کی رباعی نگاری  
551 خواجہ میر درد بحیثیت رباعی نگار  
552 رباعیات مومن خاں  
" رباعیات میر انیس  
557 رباعیات مرزا دبیر  
559 مثنوی  
563 فارسی کی مثنویاں  
" حکیم ابوالقاسم فردوسی بحیثیت مثنوی نگار  
" شاہنامہ فردوسی  
566 تحسین جنگ رستم با افراسیاب  
569 در بزم خسرو پرویز با شیرین و صف بہار می فرماید

خواب دیدن یوسف سجدہ آفتاب و ماہتاب و یازدہ

571

ستارہ و استماع اخوان و ازدیا و حسد ایشان

574

سعدی بحیثیت مثنوی نگار

"

حکایت انابک مرحوم تکلہ بن سعد زنگی

"

در بیان عمل خالص

575

مولانا روم بحیثیت مثنوی نگار

578

مثنوی سعدی

579

اردو کی مثنویاں

580

میر تقی میر بحیثیت مثنوی نگار

"

انتخاب اشعار از مثنویات میر

581

مثنوی میر تقی میر

582

اشعار از ساقی نامہ

583

مومن خاں بحیثیت مثنوی نگار

589

میر حسن دہلوی بحیثیت مثنوی نگار

590

میر حسن کی مثنوی پر ریلوے

593

اشعار مناجات

595

آغاز داستان

597

داستان تولد ہونے شاہزادہ بے نظیر کی

598

داستان تیاری باغ کے بیان میں

601

داستان سواری کی تیاری کے حکم میں

602

داستان حمام میں نہلنے کی لطافت میں

604

سواری شاہزادہ بے نظیر جانب باغ

606

داستان شہزادہ کے کوٹھے پر سونے کی اور پری کے اڑالے جانے کی۔

607

داستان حالت تباہ کرنے ماں باپ کی شاہزادے کے غائب ہونے سے

609

داستان برستان میں لے جانے کی



614

داستان گھوڑے کی تعریف میں

615

داستان وارد ہونے میں بے نظیر کے باغ میں بدر منیر کے

618

داستان تعریف بدر منیر اور عارثی ہونا بے نظیر کا

619

داستان زلف اور چوٹی کی تعریف میں

621

داستان ملاقات کرنا بدر منیر کا بے نظیر سے

623

داستان بے نظیر کے آنے کی اور باہم صحبت کرنے کی

625

داستان پاناماہ رخ کا زبانی دیو کے عشق بے نظیر اور بدر منیر سے  
اور قید کرنا بے نظیر کو

غزل

629

داستان بدر منیر کے غم و اندوہ کی اور عیش ہائی کے بلانے میں

630

داستان بے قراری بدر منیر کی بے نظیر کے فراق میں اور نجم النسا کے  
تسلی دینے میں

635

خواب دیکھنا بدر منیر کا بے نظیر کو کونٹیں میں اور جوگن بن کر نکلنا نجم النسا کا  
اس کی تلاش میں

637

داستان فیروز شاہ جنون کے بادشاہ کے بیٹے کا عارثی ہونا جوگن پر

643

داستان فیروز شاہ کی مجلس آرائی اور جوگن کے بلانے میں

647

داستان پیغام بھیجنے میں فیروز شاہ کے ماہ رخ کی

649

داستان کنویں سے لکھنے میں بے نظیر کے

650

داستان بے نظیر و بدر منیر کے ملنے اور اس کے باپ کو بیاہ کا رقبہ لکھنے میں

654

نامہ بھیجنا بے نظیر کا مسعود شاہ کو خواستگاری میں بدر منیر کی

655

جواب نامہ بے نظیر کا ملک مسعود شاہ سے

"

داستان بے نظیر اور اس کے تہن میں

"

نکاح ہونا بے نظیر کا بدر منیر سے اور شادی نجم النسا کی

656

پری نداد سے اور رخصت ہونا آپس میں

657

داستان بے نظیر کا بدر منیر کو اپنے وطن لے جانے اور ماں باپ سے ملاقات کرنے میں

- 659 مثنوی گلزار نسیم  
 660 آوارہ ہونا بکاولی کا آج الملوک گلچیں کی تلاش میں  
 663 حکمت آموز مثنویاں  
 " تصوف آموز مثنویاں  
 665 اشعار از مثنوی ہجو ولی راجہ تربت سنگھ  
 666 اشعار از مثنوی ہجو شیدی کوتوال  
 667 اشعار از مثنوی ہجو امیر دولت مند  
 668 اشعار از مثنوی ہجو ضاحک  
 669 اشعار از مثنوی ہجو حکیم غوث  
 670 اشعار از مثنوی ہجو چک مرزا فیضو  
 672 حکایت  
 " مثلث و منہس  
 673 تضمین فارسی  
 " تضمین غزل مرزا فاخر کلیں از مرزا رفیع سودا  
 674 تضمین اردو  
 " مثلث اردو  
 675 اردو میں غزل حافظ شیرازی کی تہنیں  
 676 تہنیں غزل انداز رند  
 677 میر تقی میر کی غزل کی تہنیں  
 678 منہس سلام خلیج از مولیٰ رحبہ اللہ تعالیٰ  
 680 مسدس  
 " نمبر ۱۔ واسوخت  
 683 نمبر ۲۔ مسدس حکمت آموز  
 685 بیان ملک عرب و بعثت آل صلعم  
 688 نمبر ۳۔ مرآتی

690	میرانیس کے معاملات شاعری
696	رزمی شاعری کی رفعت
698	خارجی مضامین کی مثالیں
699	ہندہائے بالا پر ریویو
701	نمبر ۲۔ لشکر اعدائے حضرت قاسم علیہ السلام کی جنگ
703	نمبر ۳۔ تلوار کی تعریف۔ خارجی مضامین کی قمیصری مثال
705	نمبر ۴۔ گھوڑے کا بیان
707	ہندہائے بالا پر ریویو
709	ہندہائے بالا پر ریویو
713	میر صاحب کے مرثیہ کس طرح کے مضامین پر مشتمل ہیں
714	نمبر ۱۔ حضرت عباس علم دار کی وفاداری
717	ہندہائے بالا پر ریویو
720	نمبر ۲۔ صبح شب عاشورہ اور نماز صبح کا بیان
725	ہندہائے بالا پر ریویو
727	نمبر ۳۔ رجز امام حسین علیہ السلام
728	حضرت عباس کا رجز
729	ہندہائے بالا پر ریویو
731	نمبر ۴۔ شیریں امام علیہ السلام کی آمد کی خبر پا کر مہمانی کا سامان کرتی ہے
733	ہندہائے بالا پر ریویو
734	مرزا دبیر صاحب کے کمالات
735	نمونہ کلام مرزا دبیر صاحب اعلیٰ اللہ تعالیٰ





## مقدمہ

### سنہ ولادت اور خاندان

سید امام نام، تخلص اثر، خطاب شمس العلماء اور نواب، ۱۸۴۹ء کو موضع سالارپور، ضلع پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام شمس العلماء سید وحید الدین بہادر تھا۔ سید علی محسن بلگرامی شاگرد صغیر بلگرامی کا شرف الحقائق معروف بہ بہارستان سخن کی تقریظ قلم بند کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

• حضرت مصنف یعنی جناب شمس العلماء مولوی حکیم سید امداد امام صاحب جو خلف اکبر جناب شمس العلماء مولوی سید وحید الدین خاں بہادر ابن سید امام علی ابن سید بقیۃ اللہ ابن سید احمد اللہ حسینی الحسنی کے ہیں نسبت نسل حضرت زید شہید فرزند ازبند حضرت امام زین العابدین علی ابن الحسین ابن علی ابن ابی طالب علیہم السلام کے ساتھ رکھتے ہیں۔

ان کا نانا ہے حسن داد احسین

جہاں جناب مدوح کے سید فیروز جو سید ابوالنضر واسطی کی نسل سے تھے ہندوستان میں تشریف لائے۔ حضرت مصنف کے والد بزرگوار کے اجداد مادری سے حضرت سید حسین جنگ سوار تھے۔ جو اسی صوبہ میں بشکل مجاہد تشریف لائے اور بعد فتح یابی کے موضع تہوار میں توطن پذیر ہوئے اور اسی پجورہ میں جو اس وقت حضرت مصنف کا مسکن ہے ان کا مزار واقع ہے۔ یہ بزرگ حضرت سید حسن جنگ سوار کے جن کا مزار شریف اجیر کی پہاڑی پر واقع ہے اور جن کا ذکر کتاب مقتل المتوہج میں مطربیل صاحب فرماتے ہیں برادر اصغر تھے۔ حضرت مصنف کے والد کے مادری بزرگواروں میں نواب حاجی سید احمد سید خاں بہادر ظفر جنگ ایمر نواز اور نواب سید عتیق اللہ خاں

آباد بھی تھے....

مصنف مدوح کے اجداد مادری میں سید محمد مجیب ایک بہت بڑے تعلق دار صوبہ بہار کے تھے ان کے مہاجر اجداد سید حسن عسکری افواج دہلی کے بخشی تھے، یہ حضرت اپنے وقت کے ایک بڑے نامی اور صاحب اختیار امیر تھے ان کا مزار موضع کرا پر سرائی واقع ہے، سید حسن عسکری صاحب کے دو فرزند میرا محمد علی صاحب اور میر مردان علی خاں بہادر بڑے نامی و گرامی ہوئے میرا محمد علی صاحب تو وہی بزرگ ہیں جن کا نام ضلع پٹنہ کے جنوبی حصوں میں آج تک اللہ خلائق پر جاری ہے اور جنہوں نے اپنے لشکر سوار و پیادہ سے کولون کی لڑائی میں سرکار انگلشیہ کو بڑی اعانت دی تھی اور جس کے صلہ میں ان کو ایک بڑا تعلقہ سرکار بہادر سے ضلع گیا میں مرحمت ہوا تھا....

والد ماجد جناب مصنف کے شمس العلامتہ وجید الدین خاں بہادر عہدہ ہائے صدر الصدور محبٹرٹ ضلع درجہ راجہ اسامال کا زکوٰۃ و جسٹس آف دی پیس پر سر فراز تھے۔  
دادا حضرت مصنف کے سید امداد علی خاں بہادر صدر الصدور اور حاکم فوجداری تھے  
پر دادا حضرت مصنف کے سید امام علی حاکم مال بہ لقب تحصیلدار تھے اس طرح جد اجداد حضرت مصنف کے یعنی سید بقیۃ اللہ صاحب بھی اس عہدہ پر سر فراز تھے....  
جناب مصنف کے والد ماجد کے نانا سید سلامت علی خاں اور ماموں سید راحت علی خاں بہادر جلیلہ عہدہ ہائے عدالت و فوجداری پر سر فراز تھے، جناب مصنف کے حقیقی چچا سید منیر الدین خاں صاحب بھی حاکم عدالت تھے۔  
(تقریباً سید علی حسن بلگرامی کاشف الحقائق جلد اول)

## شادی اور اولاد

امداد امام اثر کی دو شادیاں ہوئیں، پہلی شادی زمانے کے دستور کے مطابق عین جوانی میں ہوئی۔ ان کی بی بی جسٹس شرف الدین کی بڑی بہن تھیں۔ ان ہی کی وہ مشہور و معروف اولادیں ہوئیں جن کے نام سے ہر شخص واقف ہے، میری مراد علی امام اور حسن امام سے ہے۔ علی امام کو سرکار انگلشیہ نے سر کے خطاب سے بھی نوازا تھا۔ امداد اثر کی دوسری شادی ۱۹۰۹ء میں ہوئی جب کہ ان کی عمر ساٹھ سال کی تھی۔ ان سے آٹھ اولادیں ہوئیں۔ چار لڑکے اور چار لڑکیاں۔



ان چار لڑکوں کے نام یہ ہیں، سید حسین امام، سید کاظم امام، سید عابد امام اور سید صادق امام۔ حسین اور کاظم امداد امام اثر کی زندگی ہی میں فوت ہو گئے۔ ان کے علاوہ دو بچوں کا بھی انتقال اسی وقت ہوا جب اثر بقیہ حیات تھے۔ اپنی دوسری شادی کی وجہ امام اثر یوں بیان کرتے ہیں۔

”میرا سن شادی بیاہ کا نہ تھا مگر کیا کرتا یہ کراہ پر سر کے امام باڑے اور پنپورہ کی مسجدیں ویران ہو گئیں۔ علی امام، حسن امام کرستان ہو گئے، کلہ توجید پڑھنے والا میری نسل میں نہ رہا۔ مجبوری شادی کر کے دوبارہ نسل جاری کرنی پڑی.....“ (کاشف الحقائق)

## تعلیم اور ذوق مطالعہ

امداد امام اثر کی باضابطہ تعلیم مدرسہ، اسکول اور کالج میں نہیں ہوئی لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے والد نے نفس نفیس ان کی تعلیم میں لچپی لی اور درس دیتے رہتے پھر انہی چیدہ لوگوں کی صحبت بھی نصیب تھی، بہر حال اس باب میں ان کی وضاحت ملاحظہ ہو۔

..... یہ سچے بہن ابتداء سے سن شعور میں بھی شاعری کی طرف میلان طبعی رکھتا تھا ہر چند اسے شاعری کی قوت نہ تب حاصل تھی اور نہ اب ہے تو بھی شاعری کی پرتائیری کا اس وقت بھی ویسا ہی معترف تھا جیسا کہ اس وقت ہے اسی میلان طبعی کے تقاضے سے یہ فقیر عبد طالب علی میں شعرائے یورپ و ایشیا کی تصانیف کو استادوں سے بغیر تلمذ پڑھا کرتا تھا اور بعد منقضی ہونے اس عہد کے بھی حتی الامکان کتب مبنی کے ذریعہ سے اپنی واقفیت شاعری کو بڑھاتا رہا یہاں کہ کہ رفتہ رفتہ کسی قدر شعرائے یورپ و ایشیا کے طرز کلام اور انداز مذاق سے آشنا ہو گیا۔ یورپ کے اکثر شعرا کی تصانیف سے مطلع ہونے کی یہ صورت ہوئی کہ اس فقیر کو ساہا سال اسکولوں اور کالجوں میں پڑھنے کا مشغلہ رہا۔ جس کے ذریعہ سے علوم جدیدہ کے علاوہ یورپ کی سب سے شعرائے نامی کی تصانیف کے درس لینے کا موقع ملا اس سلسلے وار تعلیم کے بعد کتب مبنی کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ مختصر یہ کہ اسی طور سے فقیر کو یورپ کی شاعری سے از وقت ہو ورس تا عہد ٹینس (کنڈاکم) ویش طور پر اطلاع کی شکل پیدا ہو گئی اس انگریزی تعلیم کے ساتھ ایشیائی شعرا کی تصانیف سے بھی مطلع ہونے کے سامان میرا آئے۔ اس کا یہ طور ہوا کہ جناب والد ماجد شمس العلماء سید وجید الدین خان بہادر..... خوشحالی کے ساتھ علوم یورپ و ایشیا سے بہرہ وافر رکھتے تھے۔ حضرت غفران مآب نے حتی المقدور اس ناچیز کی تعلیم میں کوئی کوشش

اٹھا نہیں رکھی۔ خود بہت سی عربی و فارسی کی کتابیں پڑھائیں اور جب مجرم کار سے عیم الفرست رہنے لگے تو باذقات مختلف چند معلم کے بعد دیگرے مقرر فرمانے لگے رجن سے علاوہ معقولات و منقولات کی تحصیل کے بغیر اکثر شعرائے عرب کی تصانیف کے درس لینے کا بھی موقع ملا۔ پھر کتب بینی اور صحبت علمائے باذواق سے منفعہ ہوتا رہا۔ تعلیم عربی کے ساتھ فارسی کی بھی تعلیم ہوتی رہی اور اکثر شعرائے عجم کے دواوین وغیرہ نظر سے گندے..... دم تحریر فقیر کی آنکھوں میں بہت سی ایسی جھتیں پھر رہی ہیں جن میں یورپ و ایشیا کے شعرا کا مذکور گھنٹوں رہا ہے۔ کبھی زبانِ انانِ فرنگ کی صحبتوں میں ہومر، ورجل ہارس، شکسپیر، ملٹن، ہارن، شیلی، ٹینیسن وغیرہ کے کلام پڑھے گئے ہیں، کبھی حضرات علمائے باذواق کے جلسوں میں ماسہ، سعد، معلقہ، دیوان زہیر وغیرہ سے اشعار خوانیاں ہوتی ہیں اور کبھی مجالس اجاب ۶ باذواق میں فردوسی، ظہیر خاقانی، سنائی، انوری، رومی، سعدی، حافظ، جامی، صائب، قاضی، مرزا فوشہ، مرغیام، ابن یمن وغیرہ کی طبایعوں میں روح کو حظ وافر نصیب ہوا اور کبھی مجمع سخن سخنجان میں میر تقی میر، مرزا سودا، میر حسن، ذوق، مومن خاں، خواجہ آتش، نواب سید محمد خاں رند، صبا، بحر، قلق، سحر کے کلاموں نے جان کو تازگی بخشی ہے.....“

اس تفصیل سے بھی امداد امام اثر کے کسی بھی استاد کا نام معلوم نہیں ہوتا لیکن رسالہ ندیم گیا جلد ۸ شمارہ ۴ میں درج ہے کہ موصوف نے ابتدائی تعلیم محمد محسن صاحب بناری سے حاصل کی۔ یہ طور امداد امام کی اپنی تفصیل شاہد کہ موصوف کا مطالعہ وسیع اور متنوع تھا اور حصول علم و ادب کی طرف طبعی رجحان تھا جس کا مظاہرہ ان کی نگارشات میں کما حقہ ہوا ہے۔

## خطابات

امداد امام اثر کو انگریزی حکومت نے دوبارہ خطاب سے سرفراز کیا۔ پہلی بار ۲۴ مئی ۱۸۸۹ء میں انہیں شمس العلماء کا خطاب دیا پھر ۱۹۰۹ء میں نواب کا۔

## اخلاق و عادات

امداد امام اثر کے اخلاق و عادات نیز عقیدے کے بارے میں ڈاکٹر اختر قادری لکھتے ہیں۔  
”اندر صلح کل، گوشہ گیر اور تنہائی پسند تھے، فقر و قناعت ان کے مزاج میں داخل تھی چنانچہ



یہی وجہ کہ پٹنہ کی شاندار کوٹھیوں، موٹر گاڑیوں، ملازموں کے ہجوم اور اجاب کے مجمع سے گریزاں رہے، دیہات کے مکان کی سادگی، پاکیزگی اور صفائی ہمیشہ انہیں اپنی طرف متوجہ کیے رہی۔ دونوں نامور صاحبزادوں کی دولت، شان و شوکت، اعزاز و اکرام و شہرت امارت نے اثر کے قناعت پسند مزاج، استغنا، بے نیازی اور فقر پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔

اثر کے مزاج میں مذہبیت بہت تھی۔ خود نماز و ظائف کے پابند تھے، شیعہ تھے اور شیعیت میں کٹر لیکن بنیادی طور پر مسلمان رہنا ان کے لیے ضروری تھا.....

(غیر مطبوعہ مقالہ، اختر قادری)

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ امداد امام اثر شیعیت کے معاملے میں اتنے کٹر نہیں تھے ورنہ وہ اپنے بچوں کے بارے میں ایسی نصیحت نہیں کرتے۔

”بابو میری وصیت ہے کہ میرے بعد میرے بال بچوں کے والی و کفیل آپ ہوں، علی امام، حسن امام سے ان کا کوئی واسطہ نہ ہو، میں جانتا ہوں آپ سنی ہیں، آپ کی تربیت میں میرے بچے شیعہ نہ رہ سکیں گے۔ یہ مجھے گوارہ ہے موجد مسلمان نور ہیں گے کرستان تو ہو جائیں گے لہذا آپ جان لیجئے کہ میری وصیت پر آپ عمل کریں گے (دکاشف الحقائق)

## امداد امام اثر کی نثری تصنیفات

۱) دکاشف الحقائق (۲) مراۃ الحکما (۳) فسانہ ہمت (۴) کتاب الاثمار (۵) کیمائے زراعت (۶) فوائد دارین (۷) مصباح النظم (۸) کتاب الجواب معروف بہ مناظر المناصب۔ ۱۔ مراۃ الحکما۔ میں ۶۲ فلسفوں کے افکار و نظریات درج ہیں اور روختہ الحکما میں ان کے احوال زندگی۔

۲۔ فسانہ ہمت۔ یوں تو بنیادی طور پر ایک ناول ہے لیکن اس میں فلکیات و نجوم فلسفہ وغیرہ ہیں۔ جنرل ایداز تاریخ کے مباحث بھی درج کیے گئے ہیں۔

۳۔ کتاب الاثمار۔ پھلوں اور اس کی قسموں پر ایک مکمل کتاب ہے۔ اس میں اشجار و اثمار کے فوائد سے بھی بحث کی گئی ہے۔ اور بعض پودوں کی تصویریں دی گئی ہیں۔

۴۔ کیمائے زراعت۔ اس کتاب کے بارے میں مسٹر محمد حسین صاحب رقمطراز ہیں: ”..... یہ کتاب ضرور اس قابل ہے کہ ہر ایک شخص جس کو زراعت سے تعلق ہے اور

خصوصاً وہ لوگ جو اس فن سے لچکے رکھتے ہیں۔ اس کو اپنے پاس رکھیں اور اس کے مسائل پر جو ہندوستان کے کسان سے ضروری تعلق رکھتے ہیں حل کرتے ہیں....“ (کیمائے زراعت)

۴۔ فوائد دارین۔ ایک مذہبی کتاب ہے جو رو عبائیت میں لکھی گئی ہے۔

۵۔ مصباح النظم۔ شیعہ عقیدہ کے پس منظر میں مذہب امام اور آل محمد سے متعلق مختلف امور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

کتاب الجواب معروف بہ مناظر المصائب۔ مذہب امام کے پس منظر میں بعض سوالات کے جواب نیز خاندان پنیر کو جن مصائب کا سامنا کرنا پڑا ان کا بیان ہے۔

## کاشف الحقائق (جلد اول)

امداد امام اثر کی "کاشف الحقائق" کئی جہتوں سے ایک اہم تنقیدی کتاب ہے حیرت یہ ہے کہ اس کتاب پر اب تک خصوصی توجہ نہیں دی گئی ہے حالانکہ یہ تصنیف ایسی تھی کہ اس کا باضابطہ جائزہ لیا جاتا اور اس کے مختلف پہلوؤں پر تنقیدی نگاہ ڈالی جاتی۔ گاہے گاہے بعض لوگوں نے اس کی طرف نگاہ بھی ڈالی ہے تو وہ بے حد سرسری انداز سے لیکن یہ ہے کہ امداد امام اثر کا زہن قلمو سی تھا اور پہلی بار نہ صرف اردو اور فارسی شعریات سے کاشف الحقائق میں بحث کی گئی بلکہ عالمی شاعری کے بعض گوشوں پر بھی نگاہ ڈالی گئی۔ ایسی صورت میں کسی حد تک اس کتاب کی اہمیت تقابلی تنقید کی ہو جاتی ہے۔ کہیں کہیں عملی تنقید کے بھی نمونے اس میں ملتے ہیں۔ لہذا اس بات کی ہنوز ضرورت باقی ہے کہ کاشف الحقائق کا تفصیلی تجزیہ کیا جائے۔ ذیل میں میں کوشش کروں گا کہ تمام نکات کا اختصار کے ساتھ احاطہ کر لوں اور بہت ضروری مباحث پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالوں۔

کاشف الحقائق کی پہلی جلد ۱۹۹۷ء میں مطبع اشرف انڈیا قصبہ آرا سے شائع ہوئی۔ اس کا نام "مبارستان سخن" بھی ہے۔ خود مصنف نے پہلے صفحہ پر اس کا اہلار کر دیا ہے کہ اس میں مختلف اقوام جہاں کی شاعری کا ذکر ہے نیز اخلاق، مذہب و معاشرت سے بھی بحث کی گئی ہے گویا جلد اول میں مشرق و زمان و اٹلی و عرب کی شاعری زیر بحث آئی ہے۔ لیکن ان ممالک کی شاعری سے گفتگو کرنے سے پہلے کاشف الحقائق کی پہلی جلد میں ذیلی عنوانات کے تحت مختلف شعری نکات پر نگاہ ڈالی گئی ہے۔ مثلاً شاعری کی تعریف، موسیقی سے اس کا تعلق، مصوری وغیرہ۔ امداد امام اثر نے شاعری کی تعریف یوں کی ہے۔



” شاعری حسب خیال راقم رضاء الہی کی ایسی نقل صحیح ہے جو الفاظ بامعنی کے ذریعہ سے ظہور میں آتی ہے۔ رضاء الہی سے مراد فطرت اللہ ہے اور فطرت اللہ سے مراد وہ قوانین قدرت ہیں جنہوں نے حسب مرضی الہی نفاذ پایا ہے اور جن کے مطابق عالم درونی و برونی نشوونما پائے گئے ہیں۔ پس جاننا چاہیے کہ اس عالم درونی و برونی کی نقل صحیح جو الفاظ بامعنی کے ذریعہ سے عمل میں آتی ہے، شاعری ہے۔“

اس خیال کا تجزیہ کیا جائے تو اس کا اندازہ لگانا مشکل نہ ہوگا کہ شاعری کے بارے میں یہ تصور افلاطونی ہے۔ افلاطون کا خیال تھا کہ صرف وہی تصورات جو الہیاتی ہیں اور جن کا تعلق عالم مثال سے ہے حقیقی اور سچے ہیں اور اس مادی دنیا کی ساری چیزیں انہیں الہیاتی تصورات کی نقل ہے۔ یہ دنیا بذات خود ایک حقیقی عالم مثال کی نقل ہے اسی بنیاد پر ارسطو نے شعر و ادب کے بارے میں اپنا مشہور نظریہ نقل پیش کیا تھا جس کی وضاحت اس کی کتاب ”بوطیقا“ میں ہے۔ بہر حال ایسا محسوس ہوتا ہے کہ امداد امام اثر افلاطونی اور ارسطوی تصورات سے نہ صرف باخبر تھے بلکہ شعری تعریف میں ان فلسفیوں کے نکات ان کی نظر میں تھے۔

اس کے بعد امداد امام اثر نے شاعری اور موسیقی کے باب میں اپنے خیالات رقم کیے ہیں اس ضمن میں موزونی و ناموزونی اثبات، موسیقی کا کیونکر اثر انسان پر ہوتا ہے، موسیقی اور غنا کا فرق موسیقی کے لیے فوڑ قابلیت کی حاجت۔ امیرزاؤں کا مذاق غنا، موسیقی قانون فطرت پر مبنی ہے۔ ٹیلیو نواسنج فطرتی ماہر موسیقی ہیں بعض حیوانات پر بھی موسیقی کا اثر پیدا ہوتا ہے موسیقی کی اس تفصیلی بحث میں شاعری کا ذکر ضمنی طور پر ہوا ہے اس لیے ایسا محسوس ہوتا ہے موسیقی پر یہ ایک الگ ہی باب ہے۔ موسیقی اور شاعری کے ربط کے سلسلے میں آج کتنے ہی نئے خیالات پیدا ہوئے ہیں بلکہ بعضوں کا تو یہ بھی خیال ہے کہ تمام فنون کی غایت یہ ہے کہ موسیقی بن جائے۔ لیکن یہاں امداد اثر کو جس بات سے تعلق ہے وہ یہ ہے کہ فنون میں موسیقی ہی ایک ایسا فن ہے جس کے اثرات صرف انسانوں تک محدود نہیں ہیں بلکہ طیور اور حیوانات بھی اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ اب ان کی متعلقہ باتوں کی طرف رجوع کیا جائے تو مندرجہ ذیل نکات واضح ہوتے ہیں:-

- ۱۔ خدا تعالیٰ نے اپنے کمال حکمت سے اصوات کو موزونی اور غیر موزونی کی کیفیت بخشی ہے۔
- ۲۔ سامع میں سرور غم کی کیفیت پیدا کرنے کے واسطے اصوات کے فطری تقاضوں سے واقفیت رکھنا ضروری ہے۔

۴۔ کوئی آواز روئی فطرت سرور پیدا کرنے کی اور کوئی غم پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔  
عالم موسیقی کو آوازوں کے برتنے کے وقت ان کی کیفیتوں پر لحاظ رکھنا واجباً ہے۔  
۵۔ وہ شے جسے عوام موسیقی کہتے ہیں اور جس سے نفس حرام کاری، فسق و فجور، رزمی و باشی کی  
طرف ذہن مائل ہو جاتا ہے وہ موسیقی نہیں ہے وہ درحقیقت غنا ہے۔

۵۔ موسیقی کا مار بڑی قابلیت عمل پر ہے اور یہی سبب ہے کہ فن موسیقی کسی انسان کی بربادی کا  
سبب نہیں ہوتا ہے برخلاف غنا کے جس کے ذریعہ سے سیکڑوں امیر زادے بد حال، بد افتخار  
پریشان روزگار، افلاس زدہ، بتلائے نکبت ہو جاتے ہیں۔

ان نکات پر نگاہ ڈالی جائے تو یہ محسوس ہوگا کہ امداد امام اثر موسیقی اور غنا میں فرق کرتے ہیں۔  
انہیں احساس ہے کہ موسیقی کا حصول اور اس کے اسرار و رموز سے واقفیت انتہائی مشکل کام ہے۔  
اس کے برخلاف غنا ایک سطحی سی چیز ہے جس کا اثر انسان کے سطحی جذبات پر ہوتا ہے۔ اس طرح وہ  
امیر زادے جو موسیقی کی فنی باریکیوں سے واقف نہیں ہوتے وہ دراصل غنا پر جان چھڑکتے ہیں اور  
اس طرح ان کے کردار میں سطحیت در آتی ہے۔ یہاں یہ محسوس کیا جاسکتا ہے کہ امداد امام اثر موسیقی  
کو ایک اخلاقی نوعیت کی چیز سمجھنے پر مجبور ہیں اور اصوات کی زیر و بم میں بھی وہ اخلاقی تصورات  
کو فراموش نہیں کرتے بلکہ اگر اخلاقی سطح سے موسیقی کا کوئی رخ گرتا ہوتا ہے تو وہ اسے غنا  
سے تعبیر کر کے اس کی حیثیت کی مذمت کرتے ہیں۔

موسیقی کا یہ باب اپنے آپ میں انتہائی مکمل ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اثر کی نگاہ میں  
یہ بات تھی کہ اصوات اور موسیقی پر نگاہ رکھی جائے تو شعر کہنے اور سننے دونوں ہی باتوں میں ان  
کے اثر و نفوذ سے بہتر کیفیت پیدا ہو سکتی ہے اس لیے کہ موسیقی کا تعلق بہر حال شعر گوئی سے ہے۔  
اس کے بعد امداد امام اثر مصوری کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اس موضوع پر اپنے خیالات  
کا اظہار کرتے ہوئے اس بات پر زور دیتے ہیں کہ مصور کے لیے حصول علم کی ضرورت لازمی  
ہے پھر وہ ان علوم کی مثالیں پیش کرتے ہیں۔ اس کے بعد مصوری کی تین تصویروں سے  
بحث کرتے ہیں پھر مصور کو مشاہد عالم کی کیا حاجت ہے اس پر زور دیتے ہیں۔ ایسے  
نظریاتی مباحث کے بعد ان کے بعد میں مصوری کی ترقی، ہندوستانی مصوری، مصوری اور تعالیٰ  
اور مذاق مصوری میں صحت عدم صحبت ان تمام باتوں کا تفصیلی جائزہ لیتے ہیں۔  
حیرت ہوتی ہے کہ امداد امام اثر کو پہلے ہی یہ احساس تھا کہ مصوری ایک قسم کی شاعری ہے۔



اس لیے کہ یہی رضا الہی کی نقل صحیح ہے۔ صرف فرق یہ ہے کہ یہ نقل نقوش اور قلم کاریوں کے ذریعہ سے ظہور میں آتی ہے۔ آج جب کہ رکنکریٹ شاعری (کو شاعری کے زمرے میں رکھا جا رہا ہے اور تصویروں کے ذریعہ شاعری کی جا رہی ہے یہ بات بخوبی سمجھی جاسکتی ہے کہ امداد امام اثر اس بات میں کتنے بایسدہ شعور کا ثبوت فراہم کرتے ہیں بہر حال کسی مصور کے لیے علوم کی ضرورت کے باب میں موصوف رقم طراز ہیں :-

” واضح ہو کہ علاوہ اس اعلیٰ درجہ کی استعداد خلقی اور طباعی کے جن کی حاجت شاعر اور ماہر موسیقی کو بھی ہے مصور کو پورے طور پر ایسے علوم سے جو عالم برونی اور عالم درونی سے متعلق ہیں حسب مراد واقف ہونا چاہیے علم حساب، جبر، مقابلہ، اقلیدس، علم مثلث، کیمسٹری، علوم معدنیات، نباتات عالم، ہیئت، حیوانات، علم مریا و مناظر وغیرہ وغیرہ اور کبھی جغرافیہ، تاریخ، میر، حکایات قصص، تمدن، معاشرت، ادب اور جمیع علوم متعلق ادب مجلس میں اسے کافی دستگاہ رکھنا واجب بات ہے اور علاوہ ان کے علوم ذہنیہ میں بھی اسے پوری مہارت درکار ہے اگر کسی مصور کو یہ علوم نصیب نہیں ہوئے ہیں تو وہ مصور نہیں ہے۔ رنگ ساز یا چتر اے گو کیسا ہی طباع اور کہنہ مشق ہو۔“

(کاشف الحقائق جلد اول ص ۴۴)

مصور کی تفصیلی بحث کے بعد امام اثر پھر شاعری کی طرف واپس آتے ہیں اور اپنی اس تعریف کی توثیق کرتے ہیں جو لکھ آئے ہیں۔ ان کے خیال میں اس دنیا کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک عالم خارج ہے اور دوسرا عالم باطن۔ عالم خارج سے مراد وہ عالم ہے جس کی ترکیب میں مادہ داخل ہے اور جس کی ترکیب میں مادہ داخل نہیں ہے وہ عالم باطن ہے۔ ان امور کی وضاحت کے بعد اثر شاعری کی تقسیم از روئے تقاضائے مضامین کرتے ہیں۔ ایسی شاعری جس کا تعلق ان کے الفاظ میں عالم خارج سے ہے اسے Objective شاعری کہتے ہیں اور جس کا تعلق فی من سے ہے اسے Subjective کہتے ہیں ان کے الفاظ میں :-

”اول قسم کی شاعری راقم خارجی رکھتا ہے ایسے بیانات پر مشتمل ہوتی ہے جن سے عالم فی الخارج کے معاملات پیش نظر ہو جاتے ہیں اس قسم کی شاعری میں اکثر بیانات، ارم، ہزم، جلوس، قنوج، تیزک، اتمشام، باغ، قصور، چمن، گلزار، سبزہ زار، لال زار، جبال، بحور، صحرا، دشت، بیاباں، ریگستان، خارستان، جنگل، برف، شفق، جوا، برق، باران، سیل،

چشمے۔ سحر۔ شام۔ روز، شب۔ شمس، قمر، سیارے، قلب، برون و دیگر خارجی اشیا کے متعلق ہوتے ہیں بعض شعرا میں اس قسم کی شاعری کی صلاحیت ایسی دیکھی جاتی ہے کہ ان کے بیان سے معاملات خارجیہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتی ہے اور جو لطف اعلا درجہ کے مصور کی قلم کاریوں سے اٹھتا ہے وہی لطف ان کے بیان سے پیدا ہوتا ہے۔ یورپ میں اس رنگ کے شاعر کی مثال انگریزی شاعروں میں سروالٹر اسکاٹ اور اردو شاعروں میں کسی قدر نظیر اکبر آبادی ہے۔ (کاشف المتخالف جلد اول ص ۷۷)

Subjective شاعری کی تعریف امداد امام اثر اس طرح کرتے ہیں۔

”جس کو راقم داخلی موسوم کرتا ہے تمام تر ایسے مضامین سے متعلق ہوتی ہیں جس کو ہر امر امور ذہنیہ سے سروکار رہتا ہے۔ یہ شاعری انسان کے قوائع داخلیہ اور واردات قلبیہ کی مصوری ہے۔ اس رنگ کے بھی ممتاز شعرا یورپ اور ایشیا میں گزرے ہیں من جلد ان کے انگریزی شعرا میں لارڈ ہائرن اور اردو شاعروں میں تقی اس رنگ کے شاعروں نے اگر عشق کی تصویر سامنے لا کر کھڑی کر دی ہے اسی طرح اگر انھوں نے غم، فہم، رنج، ملال، افسوس، حسد، بغض، رشک، محبت، عداوت، نفرت وغیرہ کو حوالہ فلم کیا ہے تو ایسے امور ذہنیہ کے بیان میں مصور کی قلم کاری کا لطف دکھایا ہے۔“

(کاشف المتخالف جلد اول ص ۷۷)

Subjective اور Objective شاعری کی یہ بحث امداد کی اولیات میں سے ہے ان سے پہلے شاعری کی اس واضح دو قسموں پر اردو میں کسی نے توجہ نہیں کی تھی یہ اور بات ہے کہ شاعری کی یہ بنیادیں یا سطحیں آج کی تنقید کی واضح جولان گاہ ہے۔ امداد اثر نے جو کچھ کہا ہے وہ فنی سرسری ہے اور جس قسم سے موضوعات تقسیم کر دیے ہیں وہ بھی آج قابل اعتبار نہیں ہے پھر بھی اتنی بات تو واضح ہے کہ داخلی اور خارجی شاعری کی گفتگو آج انتہائی گہرائی اور پیچیدگی کی سطح چھو چکی ہے۔ انجمنہ میں اٹھارویں صدی کے اواخر میں ہی یہ دونوں اصطلاحیں تواتر سے شاعری میں استعمال ہونے لگی تھیں میں ہے۔ اے۔ کوڈن J. A. Cuddon کا متعلقہ اقتباس من و عن درج کرتا ہوں۔

“The terms subjective and objective were imported into England from the Post-Kantian German Critics of the Late 18th C. and are in many ways, as Ruskin put it, two of the most objectionable words... ever coined by the troublesomeness of metaphysicians”. Subjectively when applied to writing, suggests



that the writer is primarily concerned with conveying personal experience and feeling.....

In fact, any writer of any merit is simultaneously subjective and objective. He is subjectively engrossed in his work and the quality and intensity of his personal vision will be dictated in a subjective way. At the same time he must be removed from and in control of his material. Thus he is involved in a paradoxical activity: an intellectually creative balancing act in which invention and judgment coalesce or co-ordinate to achieve and preserve equilibrium."

(A dictionary of literary terms : J. A. Cuddon)

ایکشن، پرسن ان سبکلوپیڈ یا آٹ پوٹری اینڈ پوٹکس میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ Subjective اور Objective کی بحث سترھویں صدی میں شروع ہو چکی تھی۔ اٹھارہویں صدی میں اس کا تعلق زیادہ سے زیادہ اخلاقیات سے جوڑا گیا لیکن بلیک نے ان دونوں کی حد فاصل ہی ختم کر ڈالی۔ اس طرح داخلیت اور خارجیت کی بحث مغرب میں بے حد نزاعی رہی ہے۔ بہترے جدید نقاد داخلیت کو Solipsism اور Self-indulgence کہتے ہیں ملاحظہ ہو۔ لکھنؤ اور دہلی اسکول کی شاعری کی بحث میں داخلیت اور خارجیت کے امور لازمی بن گئے ہیں یہ اور بات ہے کہ ابھی تک واضح طریقے پر ان دو اصطلاحوں کی وضاحت کے لیے کوئی مستقل تصنیف آج بھی اردو میں نہیں ملتی اور اردو کے نقاد بھی اپنے طور پر ان دونوں اصطلاحوں کے مفہوم کو برتتے رہے ہیں۔ یہاں اس کا موقع نہیں کہ ان باریکیوں میں داخل ہوا جائے۔ معاصرت یہ ہے کہ امداد امام اثر نے اس بحث میں پہل کی ہے۔ اس لیے ان کو فنی بھی داد دی جائے کم ہے۔

اثر نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ شاعری کا مدار اس بات پر ہے کہ شاعر کے خارجیہ اور امور ذہنیہ کس حد تک تیز ہیں۔ ایسے شعرا جنہوں نے داخلی و خارجی تقاضوں کو ملحوظ رکھا ہے اور جن کو جن کا صحیح ادراک ہے وہی اہم شاعر بن سکے ہیں۔ اس ذیل میں اثر نے ایک اور نکتہ اٹھایا ہے کہ شعر گوئی سے شعر فہمی مشکل ہے۔ ان کا خیال ہے کہ شعر فہمی کے لیے بڑے مذاق و صبر کی ضرورت ہے اور یہ اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ معاملات خارجیہ اور امور ذہنیہ کے تقاضوں سے مکمل آگاہی نہ ہو۔ اس سلسلے میں اثر نے جو پہلو اٹھایا ہے وہ انہیں کے الفاظ میں یوں ہے۔

"نخن فہم فطرت اللہ سے مصلانہ اطلاع درکار ہے۔ اس عدم اطلاع حضرات نادانف

عجیب عجیب طرح کے مغالطے میں پڑتے ہیں بعض اشخاص معاملات فطرت سے نادانف

رہنے کے باعث مجرذ شوکت لفظی کو شاعری سمجھنے لگتے ہیں اور اسی غلط خیالی میں ہمیشہ جتا رہ جاتے ہیں ظاہر ہے کہ مجرذ شوکت لفظی کوئی شے نہیں ہے۔ شاعری اپنے ہمار شوکت لفظی نہیں۔ شاعری کا مدار خوش خیالی پر ہے نہ شوکت لفظی پر۔ شاعری کی جان خوش خیالی ہے۔ شوکت لفظی شاعری کا کوئی جزو بدن نہیں ہے البتہ شوکت لفظی خلعت فاخرہ کا حکم رکھتی ہے تبھی خوشنما معلوم ہوتی ہے۔ (کاشف الخفا نق بلداول مراد)

یہاں یہ نکتہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ امداد اثر اس بات پر زور دیتے نظر آتے ہیں کہ محض شاندار اور بھرپور کیلئے الفاظ کے استعمال سے شعر پر تاثر نہیں بن جاتا ہر لفظ کی معنی کے اعتبار سے اپنی جداگانہ حیثیت ہوتی ہے اس لیے محض ایسے الفاظ کا استعمال جو بظاہر بہت اعلیٰ معلوم ہوتے ہوں اچھا شعر نہیں بنا سکتے۔ امداد امام اثر شعر اور الفاظ کی بحث کو طول نہیں دیتے لیکن اتنی بات تو واضح ہو ہی جاتی ہے کہ وہ ہر لفظ کو جانچ پرکھ کر استعمال کرنے پر زور دیتے ہیں حالی نے بھی اس باب میں اشارے کیے ہیں:-

خیالات کو صبر و تحمل کے ساتھ الفاظ کا لباس پہنانا۔ پھر ان کو جانچنا اور تولنا اور ادا سے معنی کے لحاظ سے ان میں جو قصور رہ جائے ان کو رفع کرنا۔ الفاظ کو ایسی صورت سے منظم کرنا کہ صورت اگرچہ نثر میں تمیز ہو۔ مگر معنی اس قدر پورے ادا کرے جیسے کہ نثر میں ادا ہو سکے: شاعر ہر شے کی شاعر ہو۔ اول تو وہ ان باتوں کا لحاظ وقت پر ضرور کرتا ہے اور اگر کسی وجہ سے بالکل اس کو زیادہ غور کرنے کا موقع نہیں ملتا تو پھر جب کہ وہ اپنے کلام کا طبعان کے وقت دیکھتا ہے اس کو ضرور کانٹ چھانٹ کرنی پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر بڑے بڑے شاعروں کا کلام مختلف نسخوں میں مختلف الفاظ کے ساتھ پایا جاتا ہے:

(مقدمہ شعر و شاعری ص ۹۵ مکتبہ جامعہ ملیہ)

اس کے بعد اثر رعایت لفظی، مبالغہ پر دازی، صنائع، پست خیالی، مکروہ مضامین، بد مذاقی جدید وغیرہ جیسے امور زیر بحث لاتے ہیں۔ موصوف کا خیال ہے کہ رعایت لفظی کا براہ راست شاعری سے کوئی تعلق نہیں ہاں اگر یہ بے تکلف طریقے پر کسی شعر میں پیدا ہو جائے تو اور بات ہے۔ مگر بے تکلف رعایت لفظی کا التزام صرف ناپسندیدہ ہی نہیں بلکہ سچی شاعری کے منافی ہیں۔ اسی طرح "غیر فطری مبالغہ پر دازی" بھی کوئی پسندیدہ امر نہیں۔ موصوف کا خیال ہے کہ فطری شاعری میں مبالغہ پر دازی کی کوئی حاجت نہیں۔ امداد امام اثر صنائع و بدائع کو بھی غیر ضروری سمجھتے ہیں ان کے اپنے الفاظ ہیں:-



”اہل مذاق سے پوشیدہ نہیں ہے کہ ایسے ایسے ڈھکوسلوں کو شاعری سے کوئی تعلق نہیں ہے؟“

امداد امام اثر نے پست خیالی کا ایک ضمنی عنوان قائم کیا ہے اور اس بات پر زور دیا ہے کہ بعض مضامین بذات خود پست خیالی کے حامل ہوتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ خیال اگر پست ہو تو شعر قابل لحاظ نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح وہ بعض مضامین کو مکروہ خیال کرتے ہیں اور انہیں شعر میں برتنے سے روکتے ہیں لیکن جدید تصور یہ ہے کہ خیالات بذات خود پست نہیں ہوتے اور نہ ہی کوئی مضمون اپنے آپ میں مکروہ ہے بلکہ دیکھنا یہ ہے کہ شاعر نے اسے کس طرح برتا ہے۔ جدید تنقید کے اعتبار سے امداد کے یہ خیالات وزنی نہیں معلوم ہوتے لیکن اس امر کو یہاں ملحوظ رکھنا چاہیے کہ اثر اپنی تمام تر نگارشات میں اس حد تک زور دیتے ہیں کہ وہ ایک لمحہ بھی شاعری کو اس سے الگ نہیں کر سکتے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعض مضامین ان کے آگے اس حد تک مکروہ بنے رہتے ہیں کہ وہ شعر میں داخل ہی نہیں ہو سکتے۔

اس کے بعد اثر شاعری کا یہ پہلو زیر بحث لاتے ہیں کہ کیا شاعری ایک امر طبعی ہے۔ ان کا جواب اثبات میں ہے کہ شاعری چونکہ فطری امر ہے اس لیے انسان سے کبھی الگ نہیں ہو سکتی۔ ہر زمانہ میں شاعری ہوتی رہی ہے یہاں تک کہ وحشی سے وحشی قوم بھی شاعری کا سرمایہ رکھتی ہے۔ اثر کہتے ہیں کہ تمام قوموں میں شاعری کا چلن ہے۔ گوہر قوم میں ہومر۔ ورجل۔ ملٹن۔ فردوسی۔ بابلیکی۔ میر انیس نہیں۔ لیکن گیت کسی۔ کسی صورت میں ہر قوم میں موجود ہے۔

امداد امام اثر اغراض شاعری سے بھی بحث کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ ”شاعری ایک امر فطری ہے تو اس سے اغراض انسانی کا کم و بیش طور پر تعلق رکھنا بھی خالی از فطرت نہیں ہے۔ لیکن وہ اس بات کا بھی احساس رکھتے ہیں کہ زمانہ کے لحاظ سے انداز شاعری میں فرق آتا رہا ہے اور اس کے اغراض بدلتے رہے اور وہ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ہر چہ کہ شاعری نے اپنے لباس بدل دیے ہیں اور اس کے خد و خال میں بھی فرق آگیا ہے لیکن وہ معزول نہیں ہوئی ہے۔ شاعری انسان کا جو کام پہلے کرتی تھی وہ آج بھی کر رہی ہے اور کرتی رہے گی۔ میں نے پہلے ہی اس بات پر زور دیا ہے کہ اثر اخلاقیات سے ہمیشہ وابستہ رہتے ہیں چنانچہ اغراض انسانی سے شاعری کے تعلق کی بحث میں بھی وہ اسی بات پر اصرار کرتے ہیں ان کا خیال ہے کہ جتنے معاملات اخلاقی ہیں شعر انہیں قلم بند کر چکے ہیں ان کی رائے ہے اور بہت واضح رائے کہ شاعری سے کوئی قوی تر آراء اخلاق آموزی کا کوئی دوسرا نہیں ہے۔ یعنی

شاعری بہترین اخلاق آموزی ہے۔ گویا امداد امام اثر شاعری کو اپنے آپ میں کوئی مقصد قرار نہیں دیتے بلکہ اسے اخلاق کی ترویج و اشاعت کا ایک ذریعہ مانتے ہیں، میرے خیال میں شاعری کے باب میں یا ایک مثالی تصور ہے جس کا رشتہ ایسے فلسفیوں سے مل جاتا ہے جن کے نقطہ نظر سے شاعری اور اخلاق ہم معنی چیزیں ہیں جدید تنقیدی نگاہ سے اس پہلو پر بحث کی جاسکتی ہے اور کی جاتی رہی ہے یہاں تفصیل میں جانے کا موقع نہیں لیکن اتنا اشارہ کرنا کافی ہے کہ شاعری کا منصب اور اس کی کارکردگی کی تفصیل گفتگو ایک کتاب کی متقاضی ہے۔ بہر حال اسی اخلاقی نقطہ نظر سے اثر نے تعلیم توحیدہ تمجید باری تعالیٰ، کلام امیر المومنین حضرت علیؑ وغیرہ کا جائزہ لیا ہے اور پھر اس پس منظر میں بعض صحیفہ کا ملہ پر نظر ڈالتا ہے۔ اس کے برخلاف خواجہ الطاف حسین حالی اخلاق کے بارے میں جو نقطہ نظر پیش کرتے ہیں وہ زیادہ متوازن معلوم ہوتا ہے وہ کہتے ہیں کہ شعر سے جس طرح نفسیاتی جذبات مشتعل ہوتے ہیں اسی طرح اس سے روحانی خوشیاں بھی طبع ملتی ہیں نیز یہ کہ انسان کی روحانی اور پاک خوشیوں میں صریح تعلق ہے لیکن وہ یہ بھی کہتے ہیں۔

”شعر اگرچہ براہ راست علم اخلاق کی طرح تلقین و تربیت نہیں کرتا لیکن از روئے انصاف

اس کو علم اخلاق کا نائب و مناب اور قائم مقام کہہ سکتے ہیں۔“ (مقدمہ شعر و شاعری ص ۱۳)

ہم سمجھوں کہ معلوم ہے کہ حالی بھی اخلاقیات پر کم زور دینے والی شخصیت نہ تھے لیکن وہ لکھنے پر مجبور ہوئے کہ شاعری کا تعلق براہ راست علم اخلاق کی تلقین و تربیت نہیں ہے جب کہ امداد اثر بہت کھلے الفاظ میں شاعری کو اخلاق آموزی کا موثر ذریعہ بتاتے ہیں۔

شعریات ایسی ضمنی بحثوں کے بعد اثر مختلف اقوام کی شاعری کا جائزہ لیتے ہیں سب سے پہلے وہ مصریہ بصرہ بحث بناتے ہیں۔ اس باب میں ان کا طریقہ کار یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے جغرافیائی امور زیر بحث لاتے ہیں مثلاً اس کے حدود کی نشاندہی کرتے ہیں۔ کچھ تاریخی احوال رقم کرتے ہیں۔ مشہور شہروں کا ذکر کرتے ہیں، یہاں تک کہ یہاں تک کہ دریا۔ ریگستان، چرند پرند یہاں کے لوگوں کے اطوار و کردار وغیرہ سے تفصیلی بحث کرتے ہیں اس کے بعد یہاں کے شعر و ادب کا جائزہ دیتے ہیں۔ میں ملو

سب سے پہلے امداد امام اثر اس بات کا احساس دلاتے ہیں کہ مصریوں کا قدیم ادب قابل لحاظ نہ تھا اور اہل بونان و روم کے لٹریچر سے مصریوں کے لٹریچر کا موازنہ کیا جائے تو وہ انتہائی پست نظر آئیگا بہر حال اس ضمن میں جو شعراء ادبا اور بادشاہ زیر بحث آتے ہیں وہ ہیں سکند بادشاہ مقدونیہ، بطلی نوس لیس



”بطلی نوس کلاریوس“ نہ تو بطلی نوس لیگس اور نہ ہی بطلی نوس کلاریوس کی نگارشات کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے اور نہ ہی ان کی کارکردگی پر۔ اثر صرف اتنی بات لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ شاہانہ مصر کے زمانہ میں مصر کا وہی لٹریچر تھا جو اہل یونان کا لٹریچر تھا جب مصر مسلمانوں کے ہاتھ آیا تو یہاں اسلامی لٹریچر جاری ہو گیا ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اہل مصر ادبی کارگزاریوں پر امداد اثر کی نگاہ اتنی گہری نہیں تھی یہی وجہ ہے کہ جغرافیائی احوال تو بہت تفصیل سے بیان ہوئے ہیں لیکن ادبی کوائف کا بیان انتہائی تشنہ ہے۔

اس کے بعد امداد اثر اہل یونان کی شاعری سے بحث کرتے ہیں اور اس بحث میں سب سے پہلے وہی فارم اختیار کرتے ہیں جو انھوں نے مصر کے بارے میں لکھا تھا یعنی یونان کا طول و عرض اس کا رقبہ، اس کے مختلف شہر۔ یہاں کی پیداوار یہاں کے طیور۔ یہاں کے بادشاہ وغیرہ۔ اب اس کے بعد وہ اس ملک کی شاعری کی طرف رجوع کرتے ہیں اس باب میں جو بات قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ موصوف نے یونان کے قدیم ترین شاعر ہومر پر خاصی روشنی ڈالی ہے۔ اس کے رزمیہ ”ایلیڈ“ اور ”اوڈیسی“ کا تذکرہ کیا ہے اور خبر بہم پہنچائی ہے کہ یہ دونوں کتابیں انگریزی میں ترجمہ ہو گئی ہیں ”ایلیڈ“ کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ اس کا ترجمہ ہنگالیوں نے ہنگلہ میں کر دیا ہے۔ امداد امام اثر اس بات پر اظہار افسوس کرتے ہیں کہ ہنگلہ زبان میں جتنا جو کچھ ہوا ہے اُردو اس سے بھی دامن ہے۔ اس بحث کو ہمیں چھوڑ کر امام اثر اہل یونان کی بابت خامہ فرسائی کرنے لگتے ہیں اور ان کی ذہانت، تدبیر بہت جفاکشی، علم دوستی اور شاعرانہ ذوق کے علاوہ حکمت، فلسفہ اور طب و تمدن کے لحاظ سے صناعت گنتری کرنے میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اثر اہل یونان سے خاصے متاثر ہیں اور یونانیوں کو داد دینے میں ذرا بھی نفل سے کام نہیں لیتے۔ انھوں نے یونان کے ذیل میں ”ایلیڈ“ کا ذکر کیا تھا اور اب اس کا پورا قصہ اختصار کے ساتھ رقم کرتے ہیں۔ حیرت انگیز طریقے پر اثر نے ایلیڈ کے اہم امور کو محض دو صفحات میں سمیٹ لیے ہیں۔ ایلیڈ کے اہم کردار مثلاً Priam پر ائم، بادشاہ میرلیس، ملکہ ہیلن، ہکٹر، اکیلیز ہیرس وغیرہ زیر بحث آگئے ہیں، ظاہر ہے کہ اس اختصار میں بعض جزوی باتوں کا ذکر محال تھا اس لیے وہ محض اشارہ پر اکتفا کرتے ہیں لیکن انھوں نے اس بات کا اظہار کر دیا ہے کہ

”ہومر نے اس قصہ کو شاعرانہ پیرایہ میں بہت طول دیا ہے طرفین کے بڑے بڑے بہادری

کے نام درج کیے ہیں اس ہنگامہ کی احوال ہنگامی میں دیوناؤں کی لکیں اور اعانتیں بھی بیان ہوتی گئی ہیں۔ طرح طرح کے غیر فطری معاملات اور بے سرو پا معتقدات کے مذکور آتے گئے ہیں اگر سب



ہور کی تفصیل کی جائے تو ایک عجیب کتاب تیار ہو جائے۔ (کاشف المتخلف بلداول ملکا)  
 اس کے بعد امام اثر ہومر کی قابلیت شاعر پر زور دیتے ہیں اور اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ہومر کی تعریف  
 ممکن نہیں وہ اسے "شاعر جادو بیان" کہتے ہیں انہیں اس کا بھی احساس ہے کہ ہومر معاملات خارجیہ  
 اور ذہنیہ دونوں کو ہی میں قادر تھا۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ امداد امام اثر ہومر کو انیس پر فوقیت دینے  
 کے لیے ہرگز تیار نہیں حالانکہ موصوف نے ورجل، فردوسی، ویاس اور بالیکی سمجھوں سے اسے افضل  
 بتایا ہے بلکہ اسے ابوالشعر جیسے لقب سے نوازتے ہیں ان کے اپنے جملے ہیں۔

"اگرچہ پوچھے تو ہومروس کی خوبیوں کو ورجل، فردوسی اور ملٹن بھی نہیں پہنچتے شعراے  
 ہنود میں ویاس اور بالیکی البتہ جواب ہومروس ہیں اور بدانت راقم ہومیروس۔ سے مرع اگر  
 کوئی شاعر ہیں تو میر انیس ہیں۔ (کاشف المتخلف اول، ص ۱۳۵)

میں یہاں میر انیس کے بارے میں کچھ نہیں کہوں گا جہاں میر انیس کی بابت اثر نے تفصیل سے  
 لکھا ہے وہاں تفصیل سے اس پہلو پر روشنی ڈالی جائے گی۔ بہر طور اثر نے ہومر کی دماغی قوت و صلاحیت  
 کو خوب ہی سراہا ہے اور بجا طور پر یہ لکھا ہے کہ مابعد کے شعرا کے لیے ہومر حضراۃ ثابت ہوا۔

اس کے بعد ہومر کے دوسرے ایک Epic اور ڈیسی کا قصہ اثر نے اختصار سے پیش کیا ہے۔  
 لیکن ان دونوں قصے کے تجزیہ میں جو چیز اثر کو پریشان کر رہی ہے وہ ہے ان کا غیر مذہبی اور غیر  
 اخلاقی پہلو چنانچہ ہومر کی تعریف و توصیف کے بعد بھی وہ لکھتے پر مجبور ہوتے کہ ان قصوں میں مذہبی تہمتی  
 اور اخلاقی "نقصانات" ہیں۔ یہاں دراصل اثر کا اخلاقی نقطہ نظر ان قصوں کے مواد سے براہ راست  
 ٹکرا رہا ہے۔ لیکن کش مکش یہ ہے کہ ایلبڈ اور اوڈیسی دونوں ہی شاعرانہ اعتبار سے ہومر کو پسند ہیں لیکن  
 اخلاقی طور پر ان کے اندر جو سستی ہے اس کا بھی انہیں احساس ہے۔ ہومر کی تمام بحث میں خود اثر کا نقطہ  
 نظر جو اخلاقیات سے متعلق ہے پارہ پارہ ہو گیا ہے لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ ہومر کی شاعرانہ عظمت  
 ان کے قلم پر کوئی روک نہ لگا سکی۔

رزمیہ شاعری کی بحث کے بعد امداد امام اثر (رزمی شاعری) کا ذکر چھیڑتے ہیں۔ رزمی شاعری سے ان  
 کی مراد یہ کس Lyrics جسے وہ غزل سرائی بھی کہتے ہیں ان کا خیال ہے کہ یورپ کے لیرکس کی وہی حالت  
 ہے جو غزل سرائی کی ہے Lyrics کے لیے وہ Subjective موضوعات کو ضروری سمجھتے ہیں اور اس  
 پہلو پر زور دیتے ہیں کہ اگر لیرکس Lyrics میں خارجی امور بھی آئیں تو اس میں داخلی آمیزش ہونی چاہیے  
 اثر کا خیال ہے کہ لیرکس Lyrics یا غزل سرائی کو عالم خارج سے بہت کم تعلق ہے اور ایسی شاعری



شخصی انداز رکھتی ہے، اس ضمن میں ان کے ذہن میں فارسی اور غزل گو شعرا در آتے ہیں اور وہ یہ لکھتے ہیں کہ حافظ، درد، میر تقی میر اور مومن کے کلام اس لیے پرتاثر ہیں کہ ان میں ان کے اپنے ذاتی واردات قلبیہ منعکس ہیں، وہ غزل سرائی یعنی لیرکس Lyrics کو رزمی شاعری یعنی Epic سے قطعی الگ کرتے ہیں اور اپیک Epic کے زمرے میں مثنوی کی بعض شکلوں کو شریک کرتے ہیں جیسے شاننامہ فردوسی، سکندر نامہ نظامی، حملہ حیدری وغیرہ یا بندات کی صورت میں جیسے بندات مرانی انیس و مرزا دبیر وغیرہ ان مباحث کے بعد امداد امام اثر ڈراما کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اس ذیل میں وہ یہ بتاتے ہیں کہ ڈراما نہایت اعلیٰ قسم کی شاعری ہے۔ رزمی شاعری اور ڈراما کی شاعری میں فرق کی وضاحت کرتے ہوئے اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ڈراما کی شاعری میں معاملات انسانی کے جذبات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ وہ کردار جو کسی ڈرامے سے متعلق ہوتے ہیں ان کے تمام جزوی افعال و اقوال پر نظر رکھنی پڑتی ہے۔ ڈراما میں قصہ، سبیل نقل و حکایت نہیں بیان ہوتا بلکہ اقوال و افعال سے۔ امداد امام اثر نے ڈراما کی غایت سے بھی بحث کی ہے لیکن اس ضمن میں چند جملوں پر اکتفا کیا ہے اور اس کے بعد ڈراما کی واضح قسمیں کامیڈی اور ٹریجیڈی کے حدود حال سے روشناس کرایا ہے۔ ڈراما کی ایک ضمنی بحث یہ بھی اٹھائی ہے کہ اسلامی شعرا میں عدم ڈراما نگاری کی وجہیں کیا ہیں۔ وہ لکھتے ہیں اس عدم توجہ کا سبب معلوم ہوتا ہے کہ اہل عرب اپنے کو شاعری کے معاملے میں کسی قوم سے کم نہیں سمجھتے تھے اس لیے غیر قوم سے اکتساب شاعری کو بیکار جانا یا یہ کہ چونکہ اہل اسلام اہل یونان کے مذاق بت پرستی سے بہت دور تھے اور اہل یونان کی شاعریاں اس مذاق سے ممنوع نہیں انھوں نے یونانی شاعری کی طرف توجہ کرنا خلاف مصالح مذہبی سمجھا۔

امداد امام اثر نے ایران میں ابتداء ڈراما نگاری کے بارے میں بھی چند سطور لکھے ہیں اور ایک اہم بات یہ لکھی ہے کہ اگر اہل فارس کو ڈراما نگاری کا مذاق پیدا ہوا تو امید قوی ہے کہ شعراے ہمارے کی نامطبوعہ مبالغہ پروازیاں بھی رخصت ہو جائیں گی۔

ڈراما نگاری کی بحث جاری رکھتے ہوئے اثر نے شعراے سنسکرت کی ڈراما نگاری کو زیر بحث لائے ہیں اس ذیل میں کالیڈاس کا تذکرہ بطور خاص کیا ہے وہ اسے شکسپیر کا ہم پلہ یا اس سے بلند تر بتاتے ہیں اثر کا خیال ہے کہ سنسکرت میں ڈراما نگاری ایسے اعلیٰ درجہ کی ہے کہ بہت سے محققوں کی رائے میں اب تک کسی قوم نے اس صنف میں اتنی ترقی نہیں کی۔ کالیڈاس کے علاوہ انھوں نے مہا بھارت کے مصنف ویاس کا ذکر کیا ہے اور بامیکی کی رامائن کی رزمی شاعری پر بھی نگاہ ڈالی ہے۔



امدادام اثر کا خیال ہے کہ کسی زبان میں بھی سنسکرت سے بہتر شاعری نہیں دیکھی جاتی خاص کر ڈراما نگاری تو اپنا جواب نہیں رکھتی۔ اس کی رزمی شاعری کا جواب کتر نظر آتا ہے۔ ہومر اور ملٹن، ویاس اور ہائی کی کے درجہ کے نہیں۔ یہاں بھی اثر نے میراثیں کو ان تمام لوگوں سے افضل قرار دینے کی کوشش کی ہے۔

کامیڈی اور ٹریجڈی کی بحث کو طول دیتے ہوئے امداد اثر اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ فارسی اور اردو کی مثنویاں کامیڈی اور ٹریجڈی کا پیرایہ رکھتی ہیں۔ اس باب میں انھوں نے جن مثنویوں کا تذکرہ کیا ہے ان میں مثنوی یوسف زلیخا، مثنوی میر حسن، مثنوی شیریں فراد، مثنوی سیل مثنویوں اور راسخ مثنوی راز و نیاز وغیرہ ہیں۔

یہ کس Epic ' Lyrics اور ڈراما سے بحث کرنے کے بعد اثر نے Didactic شاعری مدح و قدح کی شاعری سے گفتگو کی ہے Didactic شاعری کی تعریف کرتے ہوئے اس کا تعلق نصائح و پند وغیرہ سے بتایا ہے اثر لکھتے ہیں کہ ایسی شاعری کی مثالیں سعدی، سنائی، مولوی رومی وغیرہ کے یہاں کثرت سے ملتی ہیں حضرت علیؑ کے اشعار میں بھی یہ صورت دیکھی جاسکتی ہے انگریزی میں ورڈس ورثہ ڈرائیڈن، ایڈلسن اور پوپ کے یہاں اخلاقی شاعری ملتی ہے Pastoral شاعری کے باب میں بتاتے ہیں کہ اس کا تعلق کسان کی زندگیوں سے ہے۔ انگریزی شاعروں میں پوپ نے اس رنگ میں بہت سارے شعر کہے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بھی اس قسم کی شاعری کا مذاق تھا۔ امدادام اثر نے Hesiod ہسیوڈ کا خاص طریقے سے ذکر کیا ہے اور مدح و قدح کی شاعری اور مرثیہ کی شاعری کے بعد اسی شاعری پر خصوصی توجہ ڈالی ہے۔ اس کی کتاب Works and days کے بارے میں تفصیل گفتگو کی ہے۔ غالباً اردو میں ہسیوڈ Hesiod کا اتنا تفصیلی تذکرہ کہیں دوسری جگہ نہیں ملتا۔ اس کے اثر نے Saffo سافو کا ذکر چھیڑا ہے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ عورت چھ سو قبل مسیح باجیات تھی۔ اس کے کلام کی نشتر زنی، لطف زبان اور سلاست اور دل آویزی کی خاصی تعریف کی ہے۔ ان کے خیال میں سافو کی غزل سرائی غزل سراؤں کے لیے ہدایت نامہ ہے اس کے بعد اثر پندار کا ذکر کرتے ہیں اور اس کا اظہار کرتے ہیں کہ اس میں یہ کس Lyrics کی ہیئت کو وسعت دی اور اس سے Ode کی ایک نئی ہیئت پیدا کی ان کا جملہ ہے کہ اس نے غزل کے دائرہ کو وسعت دے کر قصیدہ کر ڈالا اس کے بعد اثر نے یونانی ڈراما نگاروں مثلاً اسکالس، سافو کلس کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور ان کے کلام پر تفصیل نگاہ ڈالی ہے۔ اتنا ہی نہیں سافو کلس کے ہم عصر یوریپائڈس Euripides ارسطوٹلس کے تذکرے کے بعد یونانی شاعری کا تذکرہ ختم کر ڈالا ہے۔



یونانی شاعری کی جو بحث بھی سامنے آئی ہے وہ خاصی روتنی دیتی ہے۔ ہیسوڈ کے کارنامے پر اکثر اُردو والوں کی نگاہ نہیں ہے میں سمجھتا ہوں کہ ترقی پسند تحریک کے حائزہ میں ہیسوڈ کی کتاب - "Works and days" کا تذکرہ ناگزیر ہے۔ غالباً محنت کشوں کی تفسیر و تعبیر کے ضمن میں جو شاعری سب سے پہلے ہوئی اس کا نمونہ Works and days ہی ہے اور اس طرح سوز و گداز، داخل کیفیات کی حامل شاعری میں سوفو Sopho کا جو رول رہا ہے اس پر ہماری نگاہ رہنی چاہیے۔ خواہ یونانی ڈراموں کے بارے میں اب اطلاعات تمام ہو چکی ہیں اور اس باب میں جتنی روشنی کاشف الحقائق میں ملتی ہیں وہ ابتدائی درجہ کی ہیں۔

.. یونانی شاعری کی بحث کے بعد ادا امام اثر لاطینی شاعری کی طرف توجہ مبذول فرماتے ہیں اور اپنے پرانے طریقہ کار کے مطابق ملک اطالیہ پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہیں پھر اہل روم کے بارے میں تفصیلات رقم کرتے ہیں۔ اس باب میں جن اہم شاعروں کا اثر نے ذکر کیا ہے ان میں نکریشس اور کٹلیس نہایت اہم ہیں۔ انھوں نے کٹلیس کا ایک مثنیہ بھی نقل کیا ہے جو اس نے اپنے بھائی کی موت پر قلم بند کیا تھا۔ اثر کا خیال ہے کہ شاعر نے بھائی کی قبر پر نوحہ خوانی کو اس طرح واضح کیا ہے کہ اس میں مبالغہ ہے نہ قطعی مضمون، اس کے بعد اثر رومی شاعر ورجل کا تذکرہ کرتے ہیں اور اس کا موازنہ ہومر سے کرتے ہوئے ساتھ ہی ساتھ ہی نکمہ دیتے ہیں کہ گرچہ رومی شعرا میں یہ سب سے ممتاز ہے لیکن ہومر سے اس کا کوئی مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ پھر انھوں نے اس کی مشہور تصنیف Aeneid کے بارے میں اپنے خیالات پیش کیے ہیں۔ موصوف کا خیال ہے کہ اس کی پہلی جلد ہومر کی "روڈی سی" کی طرح ہے پھر بعض حصوں کو الیسڈ کی طرح بتایا ہے اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ورجل نے ہومر کا نتیجہ کیا ہے۔ پھر بھی وہ اس نتیجہ میں بھی رومیوں کو ایک Epic دے گیا ورجل کے اثر نے روم کے دوسرے شاعر ہارس Hores سے بحث کی ہے اور اس بات کا اظہار کیا ہے کہ اس کی شاعری رزمی نہیں ہے بلکہ اس کے اشعار غزل اور قصیدہ کا رنگ رکھتے ہیں۔ اثر ہارس کی شاعری کو سفو اور پندار کے رنگوں سے مخروج بتاتے ہیں اور اس کے Odes پر تفصیلی بحث کی ہے۔ یہ بھی بتایا ہے کہ اس کے Odes قصائد کی تشبیہ سے مشابہت رکھتے ہیں اثر نے ہارس کے Odes میں مرزا صاحب کے کلام کا رنگ بھی دیکھا ہے اور حافظ سے بھی اس کا مقابلہ کیا ہے۔ اس کے بعد اثر نے روم کے دواہم شاعر بوکن "اور جونیل" سے بھی تعارف کروایا ہے اور ان کے کلام کے بعض پہلوؤں کی طرف روشنی ڈالی ہے خصوصاً جونیل کی بھونگاری کی طرف توجہ دی ہے اور اس کا مقابلہ مرزا سودا کے مزاج کی شوخی سے کی ہے



یہاں علی تنقید کا کوئی واضح رخ تو سامنے نہیں آیا لیکن اتنا تو اندازہ لگایا ہی جاسکتا ہے کہ اثر کا ذہن کن کن جہتوں سے موازنہ کے بارے میں سوچتا ہے۔

امداد امام اثر نے یورپ کے عہد جہالت کا بیان اور اس عہد کی شاعری کے ذیلی عنوان سے تقریباً چھ صفحات میں روشنی ڈالی ہے اور یہ بتایا ہے کہ اہل روم بھی اہل یونان کی طرح نیست و نابود ہو گئے اور ان کے علوم و فنون ان کے ساتھ رخصت ہو گئے اس باب میں جن قابل ذکر شاعروں کا واضح طور پر تعارف کروایا ہے وہ شاعر Dunte ڈینٹی یہ ان کے مطابق تیرھویں صدی میں زندہ تھا اور نہایت ہی خلاق مضمون نگار۔ اس کی زبان لاطینی تھی جو باقی نہیں رہی اور اس شاعر کے عہد میں لاطینی اطالوی زبان سے بدل گئی۔ اس کی تصنیف ”الفرنو“ Inferno کا خاص طریقہ سے اثر نے ذکر کیا ہے اثر نے اس کتاب کی خاصی تعریف کی ہے۔

اس کے بعد امداد نے اہل عرب کی شاعری کا جائزہ لیا ہے۔ سب سے پہلے ملک عرب اور اس کے صوبوں پر روشنی ڈالی ہے پھر اس ملک کی مختلف کیفیتوں مثلاً پہاڑ۔ چشے، ندیاں، اشجار، جانور، درخت، بچل وغیرہ پر بڑی جزئیات سے نظر ڈالی ہے یہاں تک کہ عرب کے خلعت اور جث سے بھی بحث کی ہے اور ان کے لباس اور غذا کا بھی تذکرہ کیا ہے پھر ان تمام امور پر روشنی ڈالنے کے بعد اسلام سے پہلے عرب کی شاعری کے بارے میں اظہار فرماتے ہیں کہ بعثت آنحضرتؐ کے پہلے اہل عرب کا ادب قابل لحاظ نہ تھا۔ عربوں کی شعر گوئی ایک محدود انداز کی تھی مگر ظہور اسلام کے بعد عربی لٹریچر ترقی پذیر ہوا یہاں تک کہ صرف و نحو بلاغت و عروض اور تاریخ سیرک اہم کتابیں لکھی گئیں۔ اثر کا خیال ہے کہ عرب کی شاعری بھی اس منزل پر نہ پہنچ سکی جس منزل پر ہومر اور جل فردوسی، ملتن، بالیکی، ویاس، میرانیس، شکسپیر، گوئے یا کایداس جگمن رسے ہیں ظہور اسلام سے قبل ایام جاہلیت میں عربی شعرا مضامین فسق و فجور بے باکانہ طور پر باندھا کرتے تھے اور انہیں اپنی بے حیائیوں پر فخر بھی تھا لیکن ترویج اسلام کے بعد یہ صورتحال ختم ہوئی۔ اس باب میں موصوف نے خاص طریقہ پر کلام امیر المومنین کا حوالہ دیا ہے اور اس کے اخلاقی پیرایہ کی نشاندہی کی ہے۔ عربی شاعری کے نمونے کے ضمنی سرخی میں اثر نے ایام جاہلیت کے انداز شاعری کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے کچھ اشعار سب سے معلقہ سے منتخب کیے ہیں اور اس کی وضاحت کر دی ہے کہ سب سے معلقہ سیاح قصائد پر مشتمل ہے یہی قصائد ہیں جو عہد جاہلیت میں خانہ کعبہ میں آویزاں کیے گئے تھے۔ موصوف یہ بھی لکھتے ہیں کہ فصحاء عرب کا یہ دستور تھا جب کوئی قصیدہ لکھتے

تو اسے نہایت کبہ میں اس مقصد سے آویزاں کر دیتے کہ اگر کوئی شاعر دعویٰ سخن کرے تو اس کا جواب بھی لکھے اثر لکھتے ہیں کہ ایام جہالت میں ان سات قصیدوں کا جواب کسی سے نہ بن پڑا اور نزول قرآن کے بعد یہ قصائد وہاں سے ہٹائے گئے۔ اثر نے امری القیس کے قصیدہ اولیٰ کے معنی و وضاحت سے قلم بند کیے ہیں اور پھر مضمون کی مطابقت سے میر تقی میر کا ایک شعر نقل کیا ہے، پھر مرزا غالب کا بھی قطع نقل کیا ہے دراصل اس سے مراد صرف اس قدر ہے کہ امری القیس کے قصیدے کے مضامین سے ان دو بالکمال اردو شعرا کا موازنہ کیا جائے۔ یہاں بھی تقابلی تنقید کی ایک صورت ابھری ہے اسی امری القیس کے دوسرے قصیدوں پر بھی نگاہ ڈالی ہے کسی نہ کسی اردو شاعر کی اس کا مقابلہ اور موازنہ کیا ہے یہ سلسلہ خواہاں طویل ہے اور بے حد قیمتی بھی ہے۔ طوالت مانع ہے ورنہ تمام امور پر تفصیلی روشنی ڈالی جاتی۔ آخر میں تمام قصیدوں کے جائزہ کے بعد تقابلی تنقید کا واضح رخ اختیار کرنے کے بعد امام اثربوں رقم طراز ہیں :-

” واضح ہو کہ قصیدہ نمونہ کے طور پر انتخاب ہوا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ تمام قصائد سب سے معلقے فصاحت و بلاغت اور حسن شاعری میں غالب ہے بہر حال اس قصیدے کے لحاظ سے حضرات ناظرین نبل بشت کی شاعری عرب کا اندازہ سمجھ جائیں گے، جاننا چاہیے کہ یہ سب قصائد فطری مذاق رکھتے ہیں اور بلاشبہ بہت سے عمدہ خیالات پر مشتمل ہیں ان قصائد میں بادشاہوں کی یا امیروں کی جھوٹی تعریفیں مندرج نہیں ہیں ہر شاعر اپنے جوش سے یا واردات قلب یا دیگر امور و ذہنیہ کو کہیں پر بیان کرتا ہے .... فارسی کے شعرا کی طرح بے سرو پا طور پر مضمون آفروشی نہیں کرتا۔“ (کاشف الحقائق جلد اول ص ۲۳)

اس کے بعد امام اثر نے کتاب حماسہ سے انتخابات کیے ہیں سب سے پہلے یہ بتایا ہے کہ حماسہ کے لغوی معنی شدت کے ہیں چونکہ اس کتاب میں لڑائیوں کے اشعار مجتمع ہیں اور لڑائیاں شدت سے خالی نہیں ہوا کرتیں اس لیے اس کتاب کا نام حماسہ رکھا گیا ہے، یہ بھی بتایا کہ اس کے مولف ”ابو تمام حسیب بن اوس الطائی“ ہیں اس کے بعد اشعار نقل کر کے اس کی تشریح و توضیح کی ہے۔ تشریح و توضیح کے علاوہ جہاں کوئی اہم نکتہ ابھرا ہے اس کی بھی وضاحت کر دی ہے اس سلسلے میں ایک قصیدہ متبنی کا بھی درج کیا ہے لکھتے ہیں کہ قصیدہ سے متبنی کی صلاحیت شاعری ظاہر ہو جاتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ امداد امام اثر متبنی کو مہمور، درجل، ملٹن، بالیکی گوئے، اور رکیں کی صف میں رکھنا چاہتے ہیں لیکن انہیں افسوس ہے کہ متبنی کی صلاحیتوں کا حقیقی استعمال نہ ہو سکا۔ نتیجہ یہ ہے کہ



اس کی جواہریت ہونی چاہیے وہ نہ ہو سکی۔ اثر مزید لکھتے ہیں کہ متنی کی تمام تصنیف قصائد مدحیہ سے ملو ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سوامدیہ گوئی کے اس شاعر نے کوئی دوسرا کام ہی نہیں کیا حالانکہ اس کی شاعرانہ صلاحیت ایسی تھی کہ اس کو ہر صنف شاعری میں کمال حاصل ہو سکتا۔

بہر حال متنی کی صلاحیت کا اعتراف کرتے ہوئے وہ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ وہ امری القیس یا دیگر شعرائے عرب سے کم نہیں ہیں انہیں افسوس اس امر کا ہے کہ وہ ایسے زمانہ میں پیدا ہوئے جس وقت شاعری اپنی حقیقی حالت پر قائم تھی وہ شستگی زبان، وہ سادگی انداز، وہ لطف و بے ساختگی، وہ ولولہ محبت، وہ جوش آزادی وہ زور استغنا اور کبھی دیگر خوبیاں جو اس امری القیس یا دیگر شعرائے قبل اسلام کو نصیب تھیں عہد متنی میں گام و خورد ہو چکی تھیں۔

متنی پر یہ اعتراض سراسر اخلاقی نقطہ نظر سے ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ امداد امام اثر اس کی شاعری کو اخلاقی قدروں پر پرکھنا چاہتے ہیں اس نقطہ نظر سے یقینی متنی کے اشعار انہیں پسند معلوم ہوئے لیکن آج جب کہ قدریں بدل گئی ہیں اور شعر کی عظمت کے بارے میں اخلاقیات اتنے اہم باقی نہیں رہے ہیں تو اس بات کی ضرورت ہے کہ متنی کی شاعری کا نئے انداز سے جائزہ لیا جائے۔ ایسی صورت میں شاید جو نتائج پیدا ہوں گے وہ ممکن ہے وہ نہ ہوں جن تک امداد امام اثر لازمی طریقے پر پہنچے ہیں۔

متنی کی شاعری پر تفصیل محاکے کے بعد اثر نے ایک نئی بحث چھیڑی ہے وہ یہ ہے کہ عرب کے شعرا اپنے عاشقانہ اشعار میں اپنے مخاطب کو ہمیشہ مونث قرار دیتے ہیں یعنی عربی کی عاشقانہ شاعری مرد کی طرف سے عورت کی جانب کی جاتی ہے۔ اردو میں صورت حال اس کے برعکس ہے۔ اکثر خیال ہے کہ اردو کا یہ محور ممکن ہے نئی روشنی کے لوگوں کے لیے درست نہ معلوم ہو لیکن انہیں اس باب میں کوئی قباحہ نظر نہیں آئی ہے اس سلسلے میں وہ فارسی شاعری کے طریقے پر بھی نگاہ ڈالتے ہیں اور حافظ کی غزلوں میں چند دوسرے شعرا کے اشعار کے تجزیہ کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ یہاں مرد پرستی کا اظہار نہیں ہے وہ اردو کی جانب پھر واپس آتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ زبان اردو میں ہر لفظ مذکر ہے یا مونث، محمود لفظ محشوق مذکر ہے اور حقینہ الفاظ محشوق کے معنی میں استعمال کیے جاتے ہیں مذکر میں جیسے یار جاناں، بت صنم وغیرہ وغیرہ پس ضرورت زبان کی وجہ سے جب کوئی کلام عاشقانہ رنگ میں قلم بند ہوتا ہے تو اس کا مخاطب بھی ضرور مذکر قرار پاتا ہے۔۔۔ یہ سارے امور اس لیے زیر بحث لائے گئے ہیں کہ متنی اپنے قصیدے کے ایک مطلع میں مونث باندھتا ہے اور یہی تمام تر



عربی شاعری کے چلن کے مطابق ہے، مثنوی کی شاعری کی بحث کاشف الحقائق میں تقریباً ۳۵ صفحات میں بکھری ہے اس لیے اندازہ ہوتا ہے کہ امداد امام اثر کے ذہن و دماغ پر شاعر کتنے گہرے اثرات رکھتا ہے لیکن اس کی ساری توصیف و تعریف کا پہلو وہیں مرجھا جاتا ہے جہاں اس کی شاعری ان کے اخلاقی موقف سے برسرِ پیکار ہو جاتی ہے جس کی بابت پہلے ہی لکھ چکا ہوں بہر طور اثر مثنوی کی شاعری کے تجزیہ کے بعد جناب امیر المومنین علی علیہ السلام کے بارے میں رقم طراز ہوتے ہیں، یہ قصہ بے حد طویل ہے اور ادبی سے زیادہ تاریخی اور سیر سے قریب ہے حضرت علیؑ کے اوصاف حمیدہ سلسلہ وار گنوائے گئے ہیں اور ان کی اہمیت، بزرگی اور فضیلت کے نکات تفصیل سے درج کئے گئے ہیں۔ پھر آپ کی شان میں قرآنی آیات بھی نمبر وار قلم بند کیے ہیں۔ یہ باتیں اتنے اہتمام سے لکھی گئی ہیں کہ حضرت علیؑ کی سیرت اور فضیلت کے اکثر گوشے نگاہوں کے سامنے ہوتے ہیں لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شعروادب کے باب میں ان امور کی نشاندہی کی کیا ضرورت تھی۔ اس کا جواب سیدھا اور صاف ہے کاشف الحقائق میں کتنے ہی امور ایسے ملتے ہیں جن کا تعلق براہ راست شاعری یا ادب سے نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ بعض جگہوں پر اس کتاب کے انتشار کی کیفیت بہت ابھرنی ہے۔ امداد امام اثر نے حضرت علیؑ کے باب میں جو کچھ لکھا ہے وہ اپنے عقیدے کے پس منظر میں لکھا ہے مجھے ان باتوں سے کہیں اختلاف نہیں ہے محض یہ کہنا ہے کہ اگر اتنے ہی صفحات حضرت علیؑ کی شاعری کی وضاحت میں صرف کیے جاتے تو اس کتاب کا تنقیدی وقار اور جہی نمایاں ہوتا۔ امداد اثر نے محض حضرت علیؑ کی اوصاف کی نشاندہی پر بس نہیں کیا بلکہ آگے کے صفحات کو مکمل طور پر تاریخ کا باب بنا ڈالا ہے مثلاً بڑی تفصیل اور اہتمام سے جنگ بدر، جنگ احد، جنگ خندق، جنگ خیبر اور جنگ جنین پر روشنی ڈالی ہے یہاں اس نقطہ نظر سے انتہائی اہم ہیں کہ ان جنگوں کے بارے میں کئی جگہوں پر اثر نے انفرادی تجزیہ کیا ہے اور حضرت علیؑ کی شخصیت مذکورہ جنگوں کے پس منظر میں بھی ابھارنے کی کوشش کی ہے اور وہ بلاشبہ اس مہم میں کامیاب ہیں۔ میں نے پہلے ہی اس کا اظہار کیا ہے کہ یہ تمام باتیں ایک خاص عقیدے کے تحت پیش کی گئی ہیں اس لیے کسی دوسرے عقیدے کے نفاذ کے لیے ان تجزیہ میں الجھن ہو سکتی ہے لیکن میرا ذاتی خیال ہے کہ ان ادراک کو اس نگاہ سے دیکھنا چاہیے کہ اثر نے واقعتاً کتنی تفصیل سے معلومات کا خزانہ اکٹھا کر دیا ہے اگر اس پورے حصے کو الگ سے چھاپ دیا جائے تو حضرت علیؑ کی باب میں ایک قیمتی کتاب عوام کے سامنے ہوگی۔ ان تفصیلات کے اندراج کے فرض سے سبکدوش ہو کر



امداد امام اثر امیر المومنین علی علیہ السلام کے دیوان کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اس کے کچھ بیش قیمت اشعار نقل کرتے ہیں اور پھر ان کے معنی بتاتے ہیں اس ضمن میں حضرت کے کلام نفی نسبت یعنی مدح علم دینی کے اشعار خاص طریقے سے نقل کر کے ان کے مفہوم و معنی پر روشنی ڈالتے ہیں پھر معنی پر روشنی ڈالتے۔ پھر تحذیر از مجالست جاہلماں و تنقیر از موانست عاقلماں کے عنوان کے تحت بھی بعض اشعار درج کر کے ان کا تجزیہ کرتے ہیں۔ اس طرح شکایت از روزگار غدار و حکایت دوستاں بے اعتبار کے ذیل کے اشعار کے اردو معنی رقم کرتے ہیں، یہاں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حضرت علیؑ کے کلام کے ساتھ پورا پورا انصاف نہیں کیا گیا ہے اس اختصار کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ حضرت علیؑ کے کلام کے اوصاف بھی ابھر کر سامنے نہیں آتے اور یہ معاملہ بحث طلب ہی تھا کہ اثر فرزدق کے ایک قصیدے کا جائزہ لینا شروع کر دیتے ہیں اس کا باعث یہ ہے کہ اس نے خاندان پیغمبرؐ کے باب میں انتہائی خلوص کا مظاہرہ کیا ہے اور ان کی عظمت کا بجا طور پر پاس رکھا ہے۔ شاید یہ قصیدہ فی البدیہہ کہا گیا تھا۔ اس سلسلے میں امداد امام اثر لکھتے ہیں:-

” واضح ہو کہ یہ قصیدہ فی البدیہہ کہا گیا تھا اسی لیے فرزدق کی طباعی کا موازنہ کرنا چاہیے واقعی یہ شخص بڑی قوت شاعری رکھتا تھا..... جو مضمون ہے وہ ایسا ہے کہ پیغمبر و خاندان کے معاملہ کے حسب حال ہے.... لاریب جس شاعر کو خاندان پیغمبرؐ کے ساتھ اس قدر تعلق نہ ہو گا وہ ایسا بہتر اثر قصیدہ نہیں کہہ سکتا۔“ (کاشف الحقائق جلد اول صفحہ ۴۹۰)

کاشف الحقائق کی جلد اول کے تفصیل جائزے سے کئی باتیں از خود واضح ہو جاتی ہیں مثلاً یہ کہ امداد امام اثر کا ذہن انسانی کلچر پیڈیاٹری تھا وہ قابل لحاظ ممالک کے شعری روایات سے آگاہ تھے اور ان کے اہم شعرا کی کارگذاریوں سے وہ باخبر تھے۔ یہ ممکن ہے کہ آج کی علمی و تنقیدی روشنی میں ان کے خیالات ورنہ معلوم ہوں یا ان کی اطلاعات معتبر نہ ٹھہریں پھر بھی جتنے امور پر انھوں نے نگاہ ڈالی ہے ان کا احاطہ تو آج بھی نہیں ہو سکا ہے۔ اس طرح شعریات کے ضمن میں ان کی رانیوں سے اختلاف کیا جاسکتا ہے بلکہ اختلاف کیا جائے گا ہی لیکن یہاں بھی انہیں داد دینی پڑے گی کہ انھوں نے بعض بنیادی امور پر توجہ کی بعض ایسے نکات بھی زیر بحث لائے جو حاکمی کے مقدمے میں بھی نہیں ملتے یہ ہر حال اب میں کاشف الحقائق کی دوسری جلد پر تنقیدی و تجزیاتی نگاہ ڈالتا ہوں۔

## ”کاشف الحقائق“ (جلد دوم)

معروف بہارتستان سخن کارنشن پریس مکسومیں بہ اہتمام فشی محمد نسیم مالک مطبع چھپ کر شائع ہوئی۔  
کاشف الحقائق جلد دوم فارسی اور اردو شاعری کی مباحثہ پر مشتمل ہے اور ان دونوں زبانوں کے اصناف سخن کا با تفصیل جائزہ لیا گیا ہے اور ان کے ارتقا پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ فارسی اور اردو کے قابل ذکر شعرا، زیر بحث آئے ہیں۔ کہیں کہیں فارسی اور اردو کے شعرا کا تقابلی و تجزیاتی مطالعہ بھی پیش کیا گیا ہے اس طرح کاشف الحقائق جلد دوم فارسی اور اردو شاعری کے مختلف صنفوں کے ارتقا کی ایک اجمالی تاریخ بن کر ہمارے سامنے آئی ہے۔

امداد امام اثر نے کاشف الحقائق جلد اول میں مصر، یونان، اٹلی اور عرب کی شاعری پر روشنی ڈالی ہے جب کہ دوسری جلد خالصتاً اردو اور فارسی شاعری کے مباحثہ کے لیے مخصوص کر دی گئی ہے۔ سب سے پہلے امداد امام اثر فارسی اور اردو شاعری کے اتحاد مذاق پر روشنی ڈالتے ہیں فرماتے ہیں۔  
”چونکہ دونوں زبانوں کی شاعریوں کا ایک ہی انداز ہے اس لیے ان دونوں کا ذکر اجمالی طور پر کیا جاتا ہے حقیقت حال یہ ہے کہ اردو کی موجودہ شاعری کے ساتھ بڑی مشابہت رکھتی ہے دونوں زبانوں کی شاعریاں اصناف کے اعتبار سے برابر ہیں اور خیالات رنگ تمام برابر ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اردو کے شعرا، فارسی کے شعرا کے ہمیشہ قبیع رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری باوجود اس کے کہ اس کو فروغ ہندوستان میں ہوا سنسکرت کی شاعری سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی؟“  
(کاشف الحقائق جلد دوم ص ۱)

امداد نے فارسی اور اردو شاعری کے اتحاد مذاق پر روشنی ڈالتے ہوئے اس امر پر بڑا ہی افسوس ظاہر کیا ہے کہ اردو شعرا نے سنسکرت کی شعری روایات کی طرف توجہ نہیں کی جس کی وجہ سے اس زبان میں وہ امتیاز نہیں پیدا ہو سکا جو ممکن تھا۔ اثر نے اس فارسی ادب سے قبیع کی وجہ بھی بنائی ہے موصوف کا خیال ہے کہ چونکہ اردو والے صرف فارسی میں مہارت رکھتے تھے اس لیے شعرا نے فارسی کے سوا انہیں اور کسی دوسری زبان کے قبیع کا موقع حاصل نہ تھا اگر شعرا اردو سنسکرت کی طرف رجوع کرتے تو کئی صنفیں اردو میں درآتیں۔ یعنی ڈراما نگاری کا فن اردو میں بھی ارتقا پذیر ہو جاتا۔ اردو کی ڈراما نگاری کی پستی کی وجہ اثر یہ بتاتے ہیں کہ فارسی میں ڈراما نگاری کا تصور نہ تھا چونکہ اردو کی اکثر صنفیں فارسی سے مستعار ہیں اس لیے ڈراما نگاری کی طرف خصوصی توجہ نہ دی جاسکی۔



امداد امام اثر نے ایک اور اہم نکتہ کی طرف توجہ دلائی ہے لکھتے ہیں کہ سنسکرت میں اعلیٰ درجہ کی رزمی شاعری ہے۔ رامائن اور مہابھارت جیسی رزمیہ شاعری کا جواب فارسی میں بھی نہیں ہے۔ شاہنامہ فردوسی بھی سنگین کتاب نہیں ہے ایسی صورت میں اگر شعرائے اردو سنسکرت سے قریب ہوتے تو پھر یقینی اردو میں رزمیہ شاعری داخل ہو جاتی یہاں اثر نے میرانیس کا خاص طور سے ذکر کیا ہے ان کے سلسلے میں رقم طراز ہیں :-

”اگر میرانیس صاحب کو شعرائے اردو کے زمرے سے نکال لیجے تو اردو کی شاعری فارسی کی شاعری سچت پیچے پڑ جاتی ہے۔ یہ صرف جناب غفران مآب کا کمال ہے کہ جس کی بدولت اردو کی رزمی شاعری کا پایہ بہت بلند نظر آتا ہے اور اس اعتبار سے اردو کی شاعری صرف فارسی کی رزمی شاعری سے اعلیٰ دکھائی دیتی ہے بلکہ یونانی لاطینی اور انگریزی شاعریوں سے بھی.....“

میرانیس کے بارے میں امداد امام اثر کا یہ خیال ان سے گہری عقیدت کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ یہی ہے کہ وہ ان کے مرثیہ کو رزمیہ کا درجہ دیتے ہیں اور صرف اس پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ بعض اہم شعرا سے انہیں بلند تر بتاتے ہیں۔ جہاں موصوف نے مرثیہ گوئی سے بحث کی ہے وہاں میرانیس کے بارے میں تفصیلی گفتگو بھی کی ہے لہذا میں بھی اپنی اس بحث کو ابھی یہیں چھوڑتا ہوں۔

اس کے بعد امداد اثر ملک فارس کا تفصیلی بیان درج کرتے ہیں اس کے مختلف حصوں پر نگاہ ڈالتے ہیں۔ یہاں کی پیداوار۔ معدنی پیداوار۔ یہاں کی کانیں۔ خرید و فروخت کے سامان، دست کاری آلات حرب، یہاں کی کاشت وغیرہ پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہیں۔ یہاں کے لوگوں کی خوش طبعی اور خوش خلقی کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ اس طرح ملک فارس کے خد و خال پورے طور پر نمایاں ہو کر رہائے سامنے آتے ہیں۔ اس کے بعد اثر اہل ایران کی شاعری کی طرف توجہ کرتے ہیں اور اس باب میں کچھ اہم تاریخی حقائق پر نگاہ ڈالتے ہیں۔ لکھتے ہیں :-

اہل ایران کو شاعری کی طرف میلان عظیم رہا ہے ان کی مضمون نگاریاں بھی ایسی ہیں کہ علمائے اہل یورپ لکھتے ہیں کہ ابھی تک ہم لوگوں کو مشرقی شاعری کی نازک خیالیوں سے کما حقہ آشنائی نہیں پیدا ہوئی ہے اور خیالات کے ایسے ایسے میدان پڑے رہ گئے ہیں کہ جہاں ہم لوگوں کا ابھی تک گزر نہیں ہوا ہے کوئی شک نہیں کہ اصناف شاعری میں سے بعض ایسی ہیں کہ ان کی ہوا بھی اہل یورپ کو نہ سگی ہے مگر فارسی شاعری کے نقصانات بھی اس درجہ کے ہیں کہ ان کی اصلاح کی بڑی حاجت ہے..... مبالغہ پر دازی کی بدولت بشیر فارسی

شاعری معیوب معلوم ہوتی ہے.... علاوہ اس کے عموماً فارسی شاعری میں ایک بڑا نقصان یہ پایا جاتا ہے کہ فطری خوبیوں سے بیشتر معرا ہے.... مولف کی دانست میں کوئی مثنوی فارسی زبان میں ایسی نہیں کہ سرواثر اسکاٹ کی لیڈی آف دی لیک Lady of the lake کی پوش فطرت نگاری سے کے..... (کاشف الخفا جلد دوم ص ۵)

یہاں یہ محسوس کیا جاسکتا ہے کہ امداد فارسی شاعری کی بعض خوبیوں کے اعتراف میں نخل سے کام نہیں لیتے لیکن ایک ماہر ناقد کی طرح اس کے عیوب پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ ان کی تحریروں سے اندازہ لگانا مشکل نہیں معلوم ہوتا کہ وہ فارسی اور اردو دونوں ہی زبان کی شاعری میں وہ خامیاں دیکھتے تھے جنہیں دور کرنا ان کے آگے ضروری تھا۔ ان باتوں پر کلیم الدین احمد نے زیادہ تفصیل سے گفتگو کی ہے جہاں اصناف شعر و ادب کا جائزہ لیا جائے گا ان نکات پر روشنی ڈالی جائے گی۔

اس کے بعد اثر ملک بندوستان کا بیان قدسے اختصار کے ساتھ کرتے ہیں۔ اور زبان کے بارے میں کئی اہم باتیں کہہ جاتے ہیں۔ اس کے بعد بندوستان پر عبد انگشیر پر تفصیل نگاہ ڈالتے ہیں۔ اس جائزے کے بعد فارسی کی نظم و نثر کے تاریخی حالات نقل کرتے ہیں۔ اس باب میں رزمی شاعری کا خصوصی تذکرہ کرتے ہیں پھر رزمی شاعری کی طرف توجہ کرتے ہیں یہاں یہ نکتہ قابل غور معلوم ہوتا ہے لکھتے ہیں :-

رزمی اور رزمی شاعریوں اور قصیدہ نگاریوں کے ساتھ ساتھ تصوف آمیز شاعری بھی زور پکڑتی گئی تصوف کا مذاق اہل اسلام میں اول اول ملک فارس کی طرف داخل ہوا مگر اس مذاق کے پیدا ہونے کا سبب بھی وہی شاہنامہ ہوا ہے فردوسی نے بہت مقاموں پر اخلاقی اور مصوفانہ مضامین حوالہ ظلم کیے ہیں۔ (کاشف الخفا جلد دوم ص ۱۳)

امداد اثر ابو سعید بن ابوالخیر مہانی کو تصوف کا پہلا شاعر تسلیم کرتے ہیں پھر ان کے خیال میں ناصر بن خسرو نے "مثنوی روشنائی نامہ" میں تصوف کے نکات واضح کیے۔ اس طرح علی بن عثمان نے کشف المحجوب لکھی ان کے علاوہ بھی اثر نے متعدد کتابوں کا تصوف کے باب میں ذکر کیا ہے۔ اثر کا خیال ہے کہ سجدی کی اکثر تحریریں اخلاق رموز ہیں اور اس مذاق کو تصوف کے مذاق سے خامی مشابہت ہے اس لیے ان کی تحریر تصوف نما ہوتی ہے۔ اثر نے شیخ کی مشہور کتاب میں گلستان اور بوستان کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ہے اور ان کتابوں کے تبحر میں جو کتابیں لکھی گئیں ان کی تفصیل درج کی ہے۔

ان امور کے بعد امداد اثر نے فارسی اور اردو کے اصناف شاعری کا جائزہ لیا ہے سب سے



پہلے غزل کی طرف توجہ کرتے ہیں لکھتے ہیں کہ غزل فارسی اور اردو کے سوا کسی اور زبان میں موجود نہیں۔  
علمی شاعروں جو زبان عربی میں کچھ غزلیں لکھی ہیں وہ صرف ان کا ایجاد ہی ایجاد ہے۔ اثر کے خیال میں عربی  
کو غزل گوئی کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں ہے۔ اثر انگریزی صنف سانٹ کا ذکر کرتے ہیں اور اس  
نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ سانٹ غزل سے مشابہت ہے ہر چند کہ اس پر غزل گوئی کا اطلاق نہیں کیا جاسکتا۔ ان  
کے الفاظ ہیں :-

”زبان انگریزی میں شاعری ایک صنف ہے جسے سانٹ Sonnet کہتے ہیں یہ صرف غزل گوئی  
سے مشابہت رکھتی ہے مگر اس پر غزل گوئی کا اطلاق نہیں کیا جاسکتا ہے کیونکہ سانٹ کو جو کچھ منشا  
غزل کے ساتھ ہے وہ اسی قدر ہے کہ مضامین زحیہ از قسم واردات قلبیہ وغیرہ میں قلم بند کیے  
جاتے ہیں مگر اس کا پیرایہ غزل سے علحدہ ہوا کرتا ہے۔ سانٹ کی ترکیب کچھ عشقیہ مثنوی کی ہوجاتی  
ہے کس واسطے کہ التزام قطعہ بندی غزلیت کی ترکیب ظاہری قائم رہنے نہیں دیتی :- (ص ۳ جلد دوم)  
میرا خیال ہے کہ سانٹ اور غزل سے کوئی نسبت ہی نہیں ہے سانٹ تو چودہ سطری ایک مربوط نظم  
ہوتی ہے جو واضح طور پر ہر دو حصے Octave اور Sytete میں بنی ہوئی ہے پھر اس کی سطروں کا کچھ  
مخصوص التزام بھی ہے ایسی صورت میں کسی بنیاد پر بھی غزل کو سانٹ سے قریب نہیں بتایا جاسکتا،  
کلیم الدین احمد کی کتاب ”اردو شاعری پر ایک نظر“ کے دیباچہ میں پروفیسر محمد فضل الرحمن نے غزل کو  
جاپانی شاعری کی ایک صنف ”ہاکو“ سے قریب بتایا ہے ان کے الفاظ ہیں :-

”جاپانی شاعری میں ہاکو ایک صنف ہے جس کی ان کے ادب میں ویسی ہی اہمیت  
ہے جیسی غزل کو اردو میں۔ ہاکو میں چار یا چھ مصرعوں سے زیادہ نہیں ہوتے اسی محدود سانچے  
میں منظر کشی بھی ہوتی ہے اور شاعر کے شخصی جذبات کا اظہار بھی۔ سرسری مطالعہ سے دونوں  
ایک دوسرے سے بے نیاز معلوم ہوتے ہیں اور ایک ظاہری بے ربطی پیدا ہو جاتی ہے جس سے  
غزل اور ہاکو میں بہت مشابہت معلوم ہوتی ہے.... مگر چہ ہاکو کے اثرات محدود ہیں لیکن اس  
میں وہ بے ربطی نہیں جو غزل میں ہمیشہ موجود رہتی ہے (دیباچہ اردو شاعری پر ایک نظر)  
بہر حال اس میں کوئی خاص بات نہیں کہ غزل کا کسی دوسری زبان کی شاعری کی صنف سے  
موازنہ کیا جائے اور اس کی متوازی صنف کی تلاش کی جائے۔ سانٹ اور ہاکو کے پہلو اس لیے زیر بحث  
لائے گئے ہیں کہ کبھی کبھی بعض ناقدین غزل سے ان کی قربت ظاہر کرنے پر اصرار کرتے ہیں۔  
- بہر طور اثر پہلے غزل کے لغوی معنی سے بحث کرتے ہیں پھر اس کے Subjective پہلو پر روشنی ڈالتے

ہیں اور اس کے بعد غزل گوئی کے لیے بعض ہدایت نامے دست کرتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ ہدایت نامے غزل گوئی کا منشور ہیں جنہیں ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ اثر کے نقطہ نظر سے غزل گوئی کے لیے ان کے دیے ہوئے بیس نکات ضروری ہیں۔ ان نکات پر الگ الگ بحث کی جاسکتی ہے لیکن جن امور پر انھوں نے خاصا زور دیا ہے وہ یہ ہیں کہ غزل گوئی کی زبان سلیس ہو، اسے صنائع و بدائع سے پاک ہونا چاہیے۔ تشبیہ و استعارے داخل نہ ہونے پائیں۔ مبالغہ پر دازی سے اجتناب کیا جائے بھپتی، ضلع جگت وغیرہ سے پرہیز کیا جائے، رعایت لفظی سے گریز کیا جائے غزل کے مضامین داخلی ہوں۔ عشقیہ مضامین ایسے نہ ہوں کہ ذہن مشتوقانہ بازاری کی طرف جائے۔ وصال و فراق کے مضامین فطرت کے احاطے سے باہر نہ جائیں اور بے حیائی کے ساتھ رقم نہ ہوں۔ ہوا۔ ہوس۔ حسرت۔ ملال۔ رشک۔ جنون۔ وحشت۔ غرور وغیرہ کی بندشیں ایسی نہ ہوں کہ مذاقِ صبح سے خارج قرار پائیں۔ کوئی خیال پستی کی طرف مائل نہ ہو۔ اگر غزل میں شوخی کا اظہار ہو تو اس میں بے حیائی کا عنصر نہ ہو مگر وہ مضامین کے استعمال سے اجتناب کیا جائے۔ وارداتِ قلبیہ کی بندش شاعر کے قلبی تقاضے کے مطابق ہو، تبعیت فطرت کو ملحوظ رکھا جائے۔ غزل کے مضامین حکمت آگیں ہوں۔ غزل گو کو عاشق مزاج ہونا واجبات سے ہے لیکن عاشق مزاجی فسق و فجور کے اظہار کا نام نہیں۔ غزل گو قریب سلطانی سے تاحد امکان کنارہ کش رہے وغیرہ یہ وہ نکتے ہیں جن کی تفصیلات سے اثر نے گنتگو کی ہے لیکن جدید نقید کے مطابق اس منشور یا ہدایت نامے کا کوئی نکتہ بھی اہم قرار نہیں دیا جاسکتا۔ غزل کی زبان سلیس ہو سکتی ہے اور بہت سے غزل گو شعر اغزلوں میں سلاست کے قائل ہیں لیکن ایسی مثالیں بھی سامنے ہیں کہ مشکل غزلیں بھی ہیں اور یہ نہیں کہا جاسکتا کہ غالب کی شہرت کی بنیاد میں ان کی مشکل غزلوں کا دخل نہیں ہے۔ صنائع و بدائع سے غزل کی شاعری کو کیسے عاری کرنا ممکن ہے نہ لازمی۔ ان کی اپنی اہمیت ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔ تشبیہ و استعارے سے اجتناب کے کیا معنی ہیں؟ غزل یا کوئی دوسری صنف شاعری تشبیہ و استعارہ کے بغیر نپ ہی نہیں سکتی۔ آج کی تنقید اس بات پر زور دیتی ہے کہ استعارے ہی بنیادی طور پر شاعری کے قوام ہیں۔ ایسی صورت میں ان سے اجتناب کے کیا معنی؟ رعایت لفظی کے باب میں اثر نے جو کہا ہے وہ سچ ہے کہ فطری انداز بیان کے ساتھ۔

اثر نے غزل کے مضامین سے خاص طریقے سے بحث کی ہے۔ ممکن ہے ابتداً غزل کے مضامین متعین ہوں لیکن آج اس باب میں کوئی حد قائم نہیں کی جاسکتی۔ غزل کا دامن اب خواہاں کشادہ ہو چکا ہے اور اس کے فوم میں کتنی ہی تمدنی، معاشرتی، مذہبی، سیاسی وغیرہ جیسے مضامین اشارے کئے



میں پیش کیے جاتے رہے ہیں۔ ایسی صورت میں اس کے مضامین کے بارے میں قید و بند لگانا درست نہیں ہے۔

انٹرنل کے عشیقہ مضامین پر بھی قدغن لگائے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کا افلاطونی ذہن ہر جگہ کام کرتا ہوتا ہے۔ قدروں کی شکست و ریخت کے بعد آج یہ بتانا مشکل ہے کہ کونسا مضمون طبیعت میں انتہائیں پیدا کر رہا ہے اور کونسا حفظ۔ ایسی صورت میں یہ کہنا کہ وہاں و فراق کے مضامین فطرت کے احاطے سے باہر نہ جائیں ضروری نہیں۔ اس لیے کہ فطرت کا احاطہ کیا ہے اور اس کی حد ختم کہاں ہوتی ہے ان باتوں کا فیصلہ کون کرے گا ہاں خیال کی پستی جس میں بے حیائی کا عنصر بہت واضح ہو یقینی رد کیا جاسکتا ہے۔ شوخی اور بے حیائی میں یقینی فرق ہے اور اس باب میں اترنے جو کچھ کہا ہے قابل قدر ہے۔

انٹرنل پر اس بات پر زور دینے میں کہ مکروہ مضامین سے اجتناب واجبات سے ہے اسی طرح ان الفاظ سے بھی احتیاط درکار ہے جو مکروہ مفہومات کے لیے موضوع کیے گئے ہیں۔ یہاں میں اس بات پر اصرار کروں گا کہ مضامین بذات خود مکروہ نہیں ہوا کرتے نہ ہی کوئی لفظ اپنے آپ میں مکروہ ہوتا ہے ایسی صورت میں دراصل شاعر کا برتاؤ کسی مضمون یا لفظ کو مکروہ یا دل فریب بنا دیتا ہے اس لیے یہ تقسیم درست نہیں ہے۔

انٹرنل کو کو عاشق مزاج ہونے پر اصرار کرتے ہیں اور عاشق مزاجی کی تعریف یہ کرتے ہیں کہ عالم فطرت کے حسن پر وہ محو رہے یہ محویت عشق مجازی ہے۔ جو شاعر کو فسق و فجور سے دور رکھتی ہے۔ انٹرنل یہ بھی کہتے ہیں کہ انسان کا عشق انسان کے ساتھ خلافت فطرت امر نہیں مرد کو عورت کے ساتھ اور عورت کو مرد کے ساتھ عشق پیدا ہو سکتا ہے لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انٹرنل عاشق کو جنس کے حدود میں لے جانا نہیں چاہتے یہی وجہ ہے کہ ایک طرح کے افلاطونی عشق کو مثالی بنا کر پیش کرتے ہیں۔ یہاں انھوں نے یونانی شاعرہ "سفو" کا ذکر کیا ہے خصوصاً اس کے مضامین عشیقہ کی بڑی داد دی ہے لیکن وہ کہتے ہیں کہ اس کے یہاں سوز و گداز اور نشتریت کی وجہ اس کا عشق صادق ہے۔ لیکن آج کی تقسیم غزل کے مضامین کے لیے افلاطونی عشق کو لازمی نہیں قرار دیتی بلکہ سچ تو یہ ہے کہ عشق و محبت کے جتنے رخ ممکن ہیں وہ آج کے غزل گو شعرا اپنی اپنی حیثیت کے مطابق برت رہے ہیں اور یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ایسی باتوں کو غزل کے علاقے سے نکال دینا چاہیے۔

اثر نے ایک طولانی بحث اس بات کی چھیڑی ہے کہ غزل گو کا فرض منہسی یہ ہے کہ کلمہ کمال قرب

سلطانی سے کنارہ کش رہے یہاں اس کا موقع نہیں کہ ان تمام باتوں کا جائزہ لیا جائے لیکن اس ضمن میں جو باتیں Objective اور Subjective کی شاعری کے ذیل کی ہیں وہ قابل لحاظ ہیں۔

اس کے بعد امام اثر فارسی شاعر خواجہ حافظ کی غزل گوئی کا جائزہ پیش کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ گو غزل گوئی میں ان کا کوئی حریف نہیں یہاں تک کہ سعدی بھی اس منزل کو نہیں پہنچتے؛  
اثر نے یہاں کئی شاعروں سے حافظ کا موازنہ کیا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ سعدی بھی غزل گوئی میں حافظ کے برابر نہیں ٹھہرتے۔ ان کی بحث بہت تفصیلی ہے اور کئی اردو شعرا بھی اس موازنہ کی صف میں لاکھڑا کر دیے گئے ہیں۔ بہر طور انھوں نے اپنے خیالات دلائل کے ساتھ رقم کیے ہیں اور حافظ کی غزل گوئی کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور ان کی غزلیں نقل کر کے اپنے بیان کی توثیق کی ہے۔

پھر امام اثر سعدی کی شاعری خصوصاً ان کی غزل گوئی نیران کے احوال و آثار پر بھی روشنی ڈالتے ہیں انھوں نے لکھا ہے کہ سعدی کی نسبت بعض نقیقین کا خیال ہے کہ وہ غزل کے موجد ہیں مگر یہ قول صحیح نہیں اس لیے کہ مولانا روم اور نظامی و بعض دیگر شعرا کی غزلیں بھی دیکھی جاتی ہیں اور یہ حضرات سعدی سے پہلے رحلت فرما چکے تھے۔

سعدی کی غزل گوئی کے باب میں وہ ان کی شوخی اور ملاحت کا خاص طور سے ذکر کرتے ہیں۔ انھوں نے اس بات کا بھی اظہار کر دیا ہے کہ یوں تو شیخ سعدی فلسفہ اخلاق کے ایک بڑے معلم تھے لیکن وہ اخلاقیات کو موثر طریقے پر غزل میں نہیں برت سکے۔ وہ یہاں پھر حافظ کا ذکر کرتے ہیں اور موازنہ کی ایک کیفیت پیدا کر دیتے ہیں مثلاً وہ لکھتے ہیں۔

بعض غزلیں حضرت سعدی کی نہایت حکیمانہ رنگ کے ساتھ بڑی غزیت سے مموں بھی جاتی

ہیں مگر دیوان کا دیوان خواجہ کے دیوان کی طرح انتخاب کا حکم نہیں رکھتا (جلد دوم)

بہر حال وہ سعدی کے کلام میں دلفریبی، تاثیر، سوز و گداز، شوخی، نمکینی اور شیرینی دیکھتے ہیں پھر اپنے دعوے کی صداقت میں ان کی چند غزلیں نقل کرتے ہیں۔ غزل گوئی کے باب میں انھوں نے جن شعرا کا ان متذکرہ شعرا کے علاوہ ذکر کیا ہے وہ ہیں جامی، فغانی، خسرو، اہل شیرازی، میمن، کلیم، حلّالی، علی حزیں، غالب اور صائب ہیں۔

جامی، فغانی، خسرو، اہل شیرازی، قلی خاں، میمن، ہمدانی، کلیم، حلّالی اور حزیں کی صرف ایک غزل نقل کی ہے اور چند جملوں میں ان کی غزل گوئی کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے



پھر انھوں نے خود لکھا ہے کہ ان شاعروں کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہندی وطن ہو کر فارسی میں بھی نام برآوردہ نظر آتے ہیں ان میں مشہور حضرات مرزا عبدالقادر بیدل، واقف میاوی، منظر جان جانا علی خاں آرزو قیقل اور غالب ہیں۔ اثر نے غالب کا ذکر قدرے تفصیل سے کیا ہے اور ان کی فارسی غزل گوئی کے اہم نکات زیر بحث لائے ہیں انتخابی نہیں انھوں نے حافظ اور غالب کے ہم قافیہ اشعار کی تقابلی تنقید کی ہے اور اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ

”اب موازنہ ہی مقبول ہے۔ ناظرین موازنہ کی زحمت سے عاجز کو معاف فرمائیں اے حضرات نکتہ داں حافظ کی شہرت بے وجہ نہیں ہے اگر کوئی شاعر دماغ حکیمانہ رکھنا ہو تو کبھی حافظ کی راہ میں قدم رکھے مجرد زبان ذاتی یا معلومات سے حافظ کی شاعری نقیب نہیں ہو سکتی“

(دکاشف الحقائق جلد دوم ص ۶۵)

اس طرح وہ غالب کی ایک غزل کا سہمی کی غزل سے موازنہ کرتے ہیں اور اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ

”کیوں حضرت غالب نے اس زمین میں غزل لکھی اس کی ضرورت معلوم نہ ہوئی“

(ص ۶۹ جلد دوم)

غالب کی غزل گوئی کے بحث کے بعد اثر نے مرزا صاحب کا جائزہ پیش کیا ہے نیز ان کا موازنہ حافظ سے کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ مرزا صاحب کی غزل سرائی میں محض شاعری کا خارجی پہلو ہے جب کہ حافظ کا داخلی پہلو دیدنی ہے، ان غزل گو یوں پر اپنا جائزہ ختم کرنے کے بعد وہ ایک ضمنی سرخی ”فارسی اور اردو کا مختصر بیان“ قائم کرتے ہیں اور اس ذیل میں کچھ لسانی امور قلم بند کرتے ہیں لسانی امور آت کے تحقیقی نقطہ نظر سے ممکن ہے کہ قابل لحاظ نہ ہوں پھر بھی اثر کے مطالعہ کا ایک رخ بھی واضح ہوتا ہے کہ وہ ملکوں کی تاریخ اور جغرافیائی احوال کے علاوہ اپنے حدود میں لسانی پہلوؤں پر غور و خوض کر سکتے تھے۔ اس مختصر لسانی جائزہ کے بعد اثر نے اردو کی نظم و نثر کی ایک مختصر تاریخ پیش کی ہے اس باب میں جو نمایاں خدمات انجام دی تھیں اس طرف بھی اشارہ کیا ہے اس ضمن میں سید محمد بخش حیدری، میر بہادر علی حسینی، میرامن لطف، حافظ الدین احمد، شیر علی افسوس، نہال چند لاہوری، کاظم علی جواں، ملو لال کوی، منظر علی ویلا اور اکرام علی کی دیگر نشات کی تفصیل درج کی ہے پھر موصوف اردو غزل گوئی کا ذکر کرتے ہوئے وکی دکنی پر روشنی ڈالتے ہیں اس زبان کی غزل گوئی کو درجہ امتیاز بخشنے والے نو نو رہے ہیں۔ اس سلسلے میں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اس وقت تک وکی سے قبل کے شعرا کا ان سے باضابطہ تعارف نہ تھا ورنہ دکن کے پہلے صاحب دیوان شاعر

قلمی قطب شاہ کا خیر و بری ذکر کرتے یا وجہی اور دوسرے شعر کی شاعری پر روشنی ڈالتے۔ بہر حال انھوں نے اپنے طور پر ولی کے کلام کے عناصر تلاش کیے ہیں اور اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ولی ایک قوی الدماغ شاعر تھے اور ان کے کلام میں درد، سودا، میر، مصحفی، ذوق، ناسخ، آئتش سبھی کے رنگ بکثرت موجود ہیں۔ ولی کے بعد اثر سودا کی شاعری کا جائزہ پیش کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ غزل گوئی میں بھی انہیں استاد کی کا درجہ حاصل تھا۔ سودا کے باب میں ان کا محاکر ہے۔

..... شاعری کے دو پہلو ہیں ایک خارجی اور دوسرا داخلی خارجی پہلو کو مرزا صاحب ایسا برتتے ہیں کہ زبان اردو میں سوائے میر تقی میر کے کوئی ان کا جواب نہیں ہے مگر داخلی پہلو پر ان کو ویسی قدرت حاصل تھی جن کے سبب وہ میر تقی صاحب میر سے غزل سرائی میں پیچھے نظر آتے ہیں۔ ص ۹۲

اثر کا خیال ہے کہ مرزا اگر انگلستان میں ہوتے تو شکسپیر ہوتے۔ سودا کی شاعری پر روشنی ڈالنے کے بعد اثر خواجہ میر درد کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ان کے بارے میں ان کا خیال ہے۔  
”سوز و گداز میں ان کے جواب یا میر تھے یا آپ اپنے جواب تھے۔ واردات قلبیہ کے مضامین ایسے باندھتے تھے کہ سودا ان تک نہ پہنچے تھے (ص ۹۲ جلد دوم)

ان کا خیال ہے کہ غزل سرائی کے اعتبار سے خواجہ میر درد ایک بڑے شاعر تھے اور ان کا نظیر سوائے میر تقی میر کے کوئی دوسرا نہیں۔ میر تقی میر کو اثر سلطان المتغزلین مانتے ہیں۔ یہ حیرت انگیز ہے کہ اثر میر تقی میر پر بھرپور تنقید بھی کرتے ہیں وہ ان کے چھ دیوانوں کا تذکرہ کرتے ہیں اور اس کے بعد لکھتے ہیں کہ ان میں بہت سے اشعار ایسے ہیں کہ ترک کر دینے کے قابل ہیں پست خیالی کے باعث بھی اور کم رتبہ ہونے کے باعث بھی لیکن وہ اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ میر تقی میر کا منتخب کلام ہی ذہن میں رکھنا چاہیے۔ انھوں نے ان کی غزلوں کے ذکر میں خواجہ میر درد کا بھی تذکرہ کیا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ درد کے کلام میں میر کے کلام کے اعتبار سے خستگی کم ہے لیکن سوز اور درد خواجہ کا میر سے بڑھ کر نظر آتا ہے۔ میر نے خیال میں آج یہ راے وزنی نہیں معلوم ہوتی۔ درد اور نشتریت کے اعتبار سے بھی آج کوئی نہیں یہ کہتا کہ درد کا کلام میر سے افضل ہے۔ لیکن حیرت انگیز امر یہ ہے کہ اثر خود اپنے بیان میں تضاد کے شکار ہو گئے ہیں۔

”میر صاحب کے کلام میں دل گرفتگی، مخزونی، اور نشتریت خواجہ صاحب کے

کلام سے زیادہ ہے؟ (ص ۹۲ جلد دوم)



تیمبر کی شاعری کے تفصیلی جائزہ کے بعد امداد اثر مومن دہلوی کی غزل گوئی سے بحث کرتے ہیں اور ان کے رنگ کی خاص خاص باتوں کا تفصیل سے جائزہ لیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ مومن کی غزل سرائی دہلی کی غزل سرائی کا طور رکھتی ہے۔ وہ ان کا موازنہ درد اور میر کے ساتھ کرتے ہیں اور اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ان دو شاعروں کی پرتاثری ان کے یہاں موجود نہیں۔ وہ مومن کے کلام کی ”کوچہ گردی“ کا خاص طریقہ پر ذکر کرتے ہیں۔ لیکن یہ بھی لکھتے ہیں کہ تہذیب کی عنان ان کے ہاتھ سے کبھی بھی نہیں چھوٹنی۔ وہ مومن اور خواجہ آتش کی ایک ہی زمین کی غزلوں کا تقابلی مطالعہ کرتے ہیں اور اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ خواجہ کی ساری غزل واردات قلبیہ اور امور ذہنیہ سے یہ مراحل دور ہیں۔ مومن کی شاعری سے بحث کرنے کے بعد وہ ذوق کے کلام کی طرف توجہ کرتے ہیں اور ان کے خارجی مضامین کی طرف خصوصی توجہ ڈالتے ہیں ان کا خیال ہے کہ چونکہ خارجی مضامین غزل سرائی کے تقاضوں کے مطابق نہیں ہوتے اس لیے ذوق کا کلام بھی اسی پس منظر میں دیکھا جاسکتا ہے پھر بھی وہ ذوق سے تھوڑی بھر دی رکھتے ہیں۔ ان کے حبلے میں۔

”ہر چند عموماً غزل سرائی میں ذوق خارجی شاعری برتتے ہیں مگر ان میں ایک خاص بات یہ ہے کہ خارجی مضامین کو کسی قدر قلبی اور ذہنی امور کے ساتھ مزوج کر دیتے ہیں۔“

(صفحہ ۱۱ جلد دوم)

وہ ذوق کی ایک ایسی غزل بھی نقل کرتے ہیں جن میں ان کے خیال کے مطابق داخلی مضامین ہیں۔ ذوق کی شاعری کے عناصر تنقیدی نگاہ ڈالنے کے بعد وہ غالب کی اردو غزل گوئی کا خاصی تفصیل سے جائزہ لیتے ہیں اور بہت ہی محنت سے غالب کے کلام کے خاص عناصر تلاش کرتے ہیں کہ واقعی جو سوز و گداز، حسرت، درد، نشریت، بلند پروازی، نازک خیالی، بھکنت، متانت، جلالت، تہذیب، شوخی، غالب کے کلام میں ہے بہ امتسنائے درد و میر کسی استاد کے کلام میں نہیں۔ انھوں نے غالب کی بارہ غزلیں نقل کی ہیں اور ان غزلوں کے بارے میں یہ محاکمہ دیا ہے۔

فیر کی دانست میں اگر کوئی شاعر اپنی تمام عمر میں صرف گیارہ غزلیں جو بالا میں رقم ہوئیں تصنیف کرے تو اسے صاحب دیوان جمیم ہونے کی حاجت نہیں۔ یہ غزلیں اعلیٰ درجہ کی غزل سرائی سے خبر دیتی ہیں؟ (صفحہ ۱۲ جلد دوم)

اثر نے غالب کی ایک غزل جس کا مطلع ہے

شمار سجد مرغوب تب مشکل پسند آیا      نماشاے بیک کف بڑوں عدل پسند آیا

نقل کی ہے اور اس کے بارے میں یہ رائے دی ہے کہ ان اشعار میں غزلیت کا کوئی مزہ نہیں ہے  
 دراصل امداد امام اثر چونکہ سلاست ہی کو غزل کی جان تصور کرتے رہے ہیں اور استعارے اور  
 تشبیہوں کو غزل کے منافی سمجھتے ہیں اس لیے شاید انہیں غالب کی کوئی غزل پسند نہیں آتی جن میں  
 شکل پسندی اختیار کی گئی ہے یا جن میں تشبیہ و استعارے اچھوتے ہیں۔  
 ناسخ کے ضمن میں اثر نے جو کچھ لکھا ہے وہ انتہائی اہم ہے میں اس سلسلے کا ایک ضروری  
 اقتباس نقل کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

”شیخ امام غنیش ناسخ زبان اردو کے مسلح گذرے ہیں... شیخ نے اردو کو تراش خراش کر ایسا  
 درست کر دیا کہ اب اس کی لطافت اور صفائی فارسی سے کچھ کم نہیں معلوم ہوتی۔ ذوق نے صرف  
 مضمون آوری کی طرف توجہ مبذول رکھی اور اصلاح زبان پر مطلق مائل نہ ہوئے مومن کو بھی  
 اس جانب کچھ میلان نہ ہوا اور غالب نے تو فارسی کی اس قدر آمیزش کر دی کہ اردو پر فارسی کا  
 مشبہ ہونے لگا.... اس کے برخلاف شیخ نے گو الفاظ فارسی سے اجتناب نہ کیا مگر ترکیب  
 ایسی ملحوظ رکھی کہ اردو اردو رہ گئی۔“ (صفحہ ۱۳۵ جلد دوم)

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اثر کو اس بات کا احساس تھا کہ زبان کی ترویج و اشاعت میں بلکہ اس کی  
 تہذیب و تزیین میں شعرا کے فرائض کچھ کم نہیں۔ یہ باتیں تو انھوں نے اس طرح تو نہیں کہیں لیکن  
 ان کے جملوں کے تجزیہ سے یہی مفہوم نکلتا ہے بہر حال وہ ناسخ کے رنگ غزل کے قائل نہیں لیکن انہیں  
 استادوں کا استاد ضرور مانتے ہیں اور ان کے نامور ہونے میں شبہ نہیں کرتے ایک جگہ وہ حیرت انگیز جملہ یہ  
 لکھ جاتے ہیں۔

”حضرت ناسخ حضرت غالب سے قابلیت شاعری میں کم نہیں ہیں مگر خارجی پہلو برتنے  
 کے باعث ان کی غزل غزلیت کا مزہ نہیں دیتی۔“ (صفحہ ۱۳۵ جلد دوم)

بہر حال وہ ان کا مقابلہ غالب اور ذوق سے بھی کرتے ہیں اور اپنے طور پر کہیں کہیں ان کی تعریف  
 توصیف میں خاصہ غلو کرتے ہیں۔

آتش کی غزلوں کے جائزہ میں وہ ان کے خارجی پہلو کی نشاندہی کرتے ہیں اور متغزلین لکھنؤ کا  
 انہیں پابند بتاتے ہیں۔ آتش کے بارے میں بھی ان کا خیال ہے کہ قابلیت شاعری میں وہ غالب  
 سے کم نہیں مگر خارجی عوامل کی وجہ سے ان کی غزلوں میں وہ تاثیر نہیں لکھتے ہیں کہ جب وہ داخلی  
 رنگ اختیار فرماتے ہیں تو غضب کی طبیعت داری دکھا جاتے ہیں۔ آتش کے بعد وہ رند کی چند



غزلیں نقل کرتے ہیں اور ان کے کلام کے چند عمومی رنگ کی وضاحت کرتے ہیں۔

غزل کی بحث یہیں ختم ہو جاتی ہے اور اب وہ سہرا کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ یہ واضح کرتے ہیں کہ اس کی عروضی ترکیب تمام تر غزل کی ہوتی ہے سہرا کے موضوعات کی نشاندہی کرتے ہیں اور غزل سے اس کے مزاج کے اختلاف کے تذکرہ کے بعد غالب اور ذوق کا مشہور سہرا نقل کرتے ہیں اور ان دونوں کا تقابلی مقالہ پیش کرتے ہیں ان کا محاکرہ ہے کہ ذوق نے غالب سے کہیں بہتر سہرا لکھا۔ انھوں نے جہاں ذوق کے سہرا کی تعریف کی ہے وہاں غالب کے اس قطعہ کا بھی تذکرہ کیا ہے جو ان سہروں کے پس منظر میں غالب نے قلم بند کیا تھا۔ اس کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ غالب کا یہ قطعہ داخلی رنگ رکھتا ہے کہ منذرت خوابی خود ایک داخلی امر ہے،

صنف سہرا پر گفتگو کرنے کے بعد سلام کی عروضی ترکیب کا ذکر کرتے ہیں اور اس کے موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں اس کے بعد پھر میر تقی میر، میاں دلیگر، میر انیس، اور میر تونس کے سلام نقل کرتے ہیں۔ اثر نے اس ضمن میں لکھا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل فارس کو سلام گوئی کا مذاق کم ہے اس لیے کہ کوئی خاص دل خواہ سلام انہیں فارسی کا دستیاب نہیں ہوا۔

سلام کے بعد وہ صنف قصیدہ کی طرف اپنی توجہ مبذول فرماتے ہیں اس کی عروضی ترکیب غزل سے اس کا فرق، اس کے مضامین داخلی و خارجی وغیرہ کی تفصیل پیش کرتے ہیں اور اس کے بعد فارس کی قصیدہ گوئی کی تفصیلات زیر بحث لاتے ہیں اس باب میں جن فارسی قصیدہ نگاروں کا ذکر ہے وہ ہیں رودکی، فردوسی، سنائی، انوری، خاقانی، سعدی، غرانی، اور قاضی۔

ان قصیدہ نگاروں کے خصائص سے اثر نے خاصی دلچسپ بحث کر کے ان کی انفرادیت کے نمایاں کیا ہے۔ رودکی کو قصیدہ کا وہ پہلا شاعر تسلیم کرتے ہیں۔ جدید تحقیق بھی اثر کے اس خیال کو رد نہ کر سکی۔ ڈاکٹر محمود انبی اپنی کتاب اردو کی قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ میں لکھتے ہیں کہ

”رودکی سے پہلے اور خود اس کے زمانہ میں بہت سے قادر الکلام شاعر رہے ہوں گے

لیکن ان کی تخلیقات پر وہ خفا میں ہے بہر حال رودکی کے بارے میں تمام مذکورہ نویس متفق

ہیں کہ اس نے سب سے پہلے فارسی میں دیوان مرتب کیا۔ محمود شیرانی رودکی کو فارسی قصیدہ

نگاری کا موجد قرار دیتے ہیں (صفحہ ۱۵۵) اردو کی قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ،

کاشف الحقائق میں فارسی قصیدہ پر جس تفصیل سے مواد کیا گیا ہے اس موضوع پر بعض اہم

تصانیف بھی اس حد تک مواد فراہم نہیں کرتیں البتہ کسی حد تک شبلی نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف

شعر اجم جلد پنجم میں قصیدہ نگاری پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے مگر اس کے باوجود کاشف الغنائی کی اہمیت و انفرادیت آج بھی مسلم ہے۔

فارسی کے قصیدہ پر روشنی ڈالنے کے بعد امداد امام اثر اردو قصیدہ کلمبائزہ لیتے ہیں۔ یہ جائزہ بھی سرسری نہیں ہے۔ اس میں بھی وہی التزام رکھا گیا ہے کہ پہلے اس صنف کی بابت ضروری امور قلم بند کر دیے گئے ہیں اثر نے ابتدا میں اس کی وضاحت کر دی ہے کہ اردو قصیدہ گوئی کا انداز وہی ہے جو فارسی قصیدہ کا ہے۔ مگر انہیں احساس ہے کہ اس صنف کو وہ فروغ حاصل نہ ہو سکا جو اسے فارسی میں ہوا ہے۔ اس کی وجہوں پر بھی اثر نے توجہ کی ہے اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ :-

”المختصر اردو کی قصیدہ گوئی کو فارسی قصیدہ گوئی کے ساتھ مقابلہ کی کوئی صورت حاصل نہیں ہے اردو میں نہ سحر اور سنائی کے درجہ کا خلاق آموز کوئی قصیدہ گو گذرا ہے اور نہ خاقانی و انوری و قاتانی وغیرہ کی ترکیبوں کا برتنے والا پیدا ہوا ہے“ (صفحہ ۲۰ جلد دوم)

اثر نے یہ صاف صاف نکتہ دیا ہے کہ اردو میں مذہبی اغراض کے قصائد درباری اغراض کے قصائد سے بہت کم ہیں۔ انہوں نے اردو قصیدے کی ماہیت اور اس کے منہا میں پرکھی رنگا ڈالی ہے اور اس کے بعد وہ اردو قصیدہ گوئیوں کی طرف متوجہ ہوئے ہیں۔ جن قصیدہ گوئیوں کا اثر نے تفصیل سے تنقیدی جائزہ لیا ہے وہ ہیں مزار فنی سودا اور شیخ ابراہیم ذوق۔ انہوں نے مومن خاں اور غالب کے قصیدوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ بہر حال سودا اچھے قصیدے نقل کر کے ان کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ ”قصیدہ درجہ واسپ“ کی بحث میں وہ لکھتے ہیں کہ سودا کی قابلیت شاعری اس سے آشکار ہے کوئی مضحک بات گھوڑے اور سوار کی نسبت چھوٹ نہیں رہی ہے یہاں انہوں نے انگریزی شاعر Swift کا زور اٹھائی شاعر جو نیل کا خاص طریقے سے ذکر کیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ بحجۃ نگارشات کتنے اہم ہو سکتے ہیں۔ سودا کے بارے میں اثر کا خیال ہے کہ ذہانت، ذکاوت، طبیعت داری،

نخن آفرینی اور سہ دانی سودا پر ختم ہے ان کا خیال ہے کہ ان صفات سے متصف سحری نتھی یا شکسیر سودا کے بعد ہی وہ ذوق کی قصیدہ گوئی کے حسن موقع پر رنگا ڈالتے ہیں اور ضمناً بحث میں ایک بات بھی کہہ جاتے ہیں کہ ایک فن جسے انگریزی میں Criticism کہتے ہیں فارسی اور اردو میں مروج نہیں ہے یہ وہ فن ہے جو نخن بنوں کی کیفیت کلام سے بحث رکھتا ہے یہاں اردو کی تقریظ نگاری وغیرہ سے بھی بحث کی گئی ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کلیم الدین احمد سے بہت پہلے امداد اثر کو



کو یہ احساس تھا کہ اردو میں تنقید معشوق کی لاہوم کر ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ بہت تفصیل سے اس امر پر روشنی نہیں ڈال سکے، بہر طور امداد اٹرنے ذوق کے متعدد قصیدے نقل کر کے ان کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔

اس کے بعد وہ فارسی کی قطعہ نگاری کی طرف رجوع کرتے ہیں اور ابن کمین، سعدی، فردوسی، نظامی، سنائی اور غالب کے قطعات درج کرتے ہیں اور ہر قطعہ نگار کی انفرادیت چند جملوں میں نمایاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر وہ اردو کی قطعہ نگاری کی بحث شروع کرتے ہیں اور اس ذیل میں ذوق اور غالب کے قطعات کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں قطعہ کا باب انتہائی مختصر ہے اور اس سے تشنگی کا احساس ہوتا ہے اس کے بعد وہ صنف رباعی کی غرضی صورت حال کا سرسری جائزہ لیتے ہیں اور فارسی کے رباعی نگار شعرا فردوسی، رومی، خاقانی، انوری، عمر خیام اور سعدی کی رباعیوں کو نقل کر کے ان کے امتیازی وصف کی نشاندہی چند جملوں میں کرتے ہیں پھر وہ اسی انداز سے اردو میں رباعی نگاری کا جائزہ لیتے ہیں اور اس باب میں درد، مومن، میر انیس اور دبیر کے رباعیات نقل کرتے ہیں۔ یہاں تنقیدی حصہ ہے ہی نہیں اور اس بات کی کوشش نہیں کی گئی کہ رباعی نگاروں کے امتیازی اوصاف کیا ہیں رباعی کے وہ صنف ثنوی پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اس کے خدو خال بیان کرتے ہیں اور خاص طریقے سے اس کے موضوعات سے واقف کراتے ہیں۔ ثنوی میں کیا کچھ مضامین جوتے ہیں انہیں اثر نے نمبر وار نقل کرنے کی کوشش کی ہے، مثلاً رزمی مضامین۔ بزمی مضامین حکمت آموز مضامین۔ تصوف آموز مضامین اور متفرق مضامین۔

رزمی مضامین کے ذیل میں اثر نے دنیا کے اہم شعراء کے نام گنوائے ہیں نشانہ نام۔ انگریزی میں، پیراڈائن لاسٹ، یونانی میں ایلیڈ اور اوڈی سی، لاطینی میں "انڈ" اور سنسکرت میں رامائن اور مہا بھارت وہ لکھتے ہیں کہ اردو میں کوئی ثنوی ان کتابوں کے رنگ کی نہیں ہے اور عربی میں تو یہ صنف ہے ہی نہیں۔

بزمی مضامین کے ذیل میں جن اہم ثنویوں کے نام لیے ہیں فارسی میں یوسف زلیخا، بلی جہنوں۔ انگریزی میں لارڈ بائرن، سروالڈ اسکاٹ، ٹیپو، مور وغیرہ کی ثنویاں۔

حکمت آموز مضامین کی ثنویوں میں بوستاں کا نام لیا ہے اور تصوف آموز مضامین کی ثنویوں میں ثنوی مولانا روم کا ذکر ملتا ہے۔

ثنوی کے مضامین کی تخصیص کے بعد فردوسی کے شانہ نام پر اثر نے تفصیلی نگاہ ڈالی ہے۔ یہاں

انہوں نے اس امر کا التزام کیا ہے کہ ہومر کی ایلیڈ سے اس کا تقابلی جائزہ کم از کم کیرکڑ تک لیا جائے۔ ان کا محاکمہ ہے کہ جس وضاحت امتیازی کے ساتھ ہومر نے اپنے فساد کے افراد کا بیان حوالہ قلم کیا ہے۔ فردوسی اپنی تصنیف کے افراد کو اس قدرت کے ساتھ احاطہ تحریر میں نہیں لاسکے ہیں۔ اثر کا خیال ہے کہ فردوسی کا شاہنامہ کردار نگاری کے اعتبار سے اہم نہیں ہے اگر فردوسی شاہنامہ میں اچھی کردار نگاری کر سکتا تو فارسی میں پھر ڈراما روانہ پا جاتا لیکن پھر بھی وہ فردوسی کے یہاں جنگ وغیرہ پر سردھنٹے نظر آتے ہیں۔ لیکن فردوسی کو کسی لحاظ سے ہومر کے قریب نہیں پھٹکنے دیتے۔

برزئی مثنویوں کی بحث دوران وہ امیر خسرو، خواجہ کرمانی، جامی، ہانفی، مکتبی، بلانی، طرغی، فیضی کا ذکر کرتے ہیں۔ لیکن ان کی مثنویوں پر بحث نہیں کرتے صرف مولانا نظامی کی خسرو شیریں اور جامی کی زلیخا سے کچھ اشعار نقل کرتے ہیں اور ان کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں اس طرح حکمت آموز مثنویوں میں سعدی کا خصوصی تذکرہ کرتے ہوئے ان پر ان کی دو منظوم حکایتیں نقل کرتے ہیں۔

تصوف آمیز مثنویوں کے باب میں مولانا ارم اہمیت پر روشنی ڈالتے ہیں اور ان کے اشعار بھی نقل کرتے ہیں اس کے بعد اردو کی مثنویاں زیر بحث آجاتی ہیں۔

اثر کو اس بات کا احساس ہے کہ اردو میں کوئی رزمی مثنوی فردوسی کے شاہنامہ یا نظامی کے سکندر نامہ کے درجہ کی نہیں ہے ان کے جملے ہیں۔

”ابھی تک اردو کے کسی شاعر نے اپنی فکر سے کوئی اہلی مثنوی جو کسی واقع بزرگ پر مشتمل

ہو نہیں لکھی ہے ظاہراً اردو میں میر انیس یا مرزا دبیر کے سوا کوئی شاعر بھی فردوسی یا نظامی کی فکر

و قابلیت کا نہیں گننا ہے مگر ان بزرگوں نے مثنوی نگاری کی جانب میلان فرمائیں تو اردو سے (رزمی)

مثنویوں کی ناداری کا دلغ مٹ جائے (ص ۳۱۱ جلد دوم)

یہ وہ احساس ہے کہ جو تمام نقادوں کو ہمیشہ کھٹکاتا رہا ہے واقعہ تو یہ ہے کہ اردو میں آن سبک

کوئی نہیں لکھی گئی اور اب تو ایسا احساس ہوتا ہے کہ مستقبل میں بھی نہیں لکھی جاسکے گی۔

بہر حال امداد امام اثر نے جن اردو مثنوی نگاروں کا تجزیہ کیا ہے وہ ہیں میر تقی میر، مومن، میر حسن، دیا شنکر نسیم، مزار فیح سودا، غالب وغیرہ

اس باب میں سب سے اہم بات جو ابھر کر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اثر نے میر حسن کی مثنوی

نگاری خاصی پسند کی ہے اور اس پر انتہائی تفصیل سے نگاہ ڈالی ہے مثنوی بدرمینیہ کے تمام تر محاسن کو

احاطہ تحریر میں لے لیا ہے غرض کہ یہ میر حسن پر نگاہ ڈالی ہے اور ہر حصہ پر الگ الگ تنقید کی ہے۔



کاشف الحقائق کا یہ حصہ اپنے آپ میں ایک مکمل کتاب ہے جس میں میر حسن کی مثنوی کے منتخب حصے بھی اتنے ہی تفصیل کے ساتھ آگئے۔ اثر کے نقطہ نظر سے جس قسم کی خوبی یا خانی نظر آتی ہاں انہوں نے اسے قلم بند کر لیا ہے، کہیں کہیں اس کا انگریزی کی نگارشات سے موازنہ بھی کیا ہے اسی طرح یہ جائزہ اپنے آپ میں سیر حاصل ہے اور متعلقہ مثنوی کے خدوخال پر کبیر محیط ہے، اس کے برخلاف پنڈت دیانند کشنم کی مثنوی گزرا نیک بحث اتنی طولانی نہیں ہے ویسے اثر نے اس کا لحاظ رکھا ہے کہ اس مثنوی کی بھی اہم باتیں اختصار کے ساتھ احاطہ تحریر میں آجائیں۔ اثر نے چند مجموعی مثنویوں پر بھی نگاہ ڈالی ہے اور ان کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔

مثنوی پر روشنی ڈالنے کے بعد اثر نے بڑے اختصار سے مخمس، مسدس اور واسوخت کی مصنفی حیثیت اور عرضی حد بندیوں پر نظر ڈالی ہے، ان کے سلسلے میں اہم نکات زیر بحث آگئے ہیں۔ اس کے بعد مرثیہ کا باب ہے اور اسی باب پر کاشف الحقائق کی دوسری جلد تمام ہوئی ہے۔

امداد امام اثر لکھتے ہیں کہ میر ضمیر کے عہد سے پہلے مرثیہ کی عرضی ترکیب مربع اور مخمس کی ہوا کرتی تھی لیکن عہد انیس تک آتے آتے یہ صنف خاصی پیچیدہ ہو گئی، لیکن نہ معلوم کیوں اثر نے مرثیہ کے خدوخال سے بہت کم بحث کی ہے اس کی ابتدائی روشنی کے احوال رقم نہیں کیے ہیں اس صنف کے ابتدائی شعرا سے بھی دامن کشاں گذر گئے ہیں اور ساری توجہ میر انیس کے مرثیوں کے تجزیہ پر صرف کر دی ہے یہ جائزہ تقریباً ستر صفحات پر محیط ہے اس لیے خاصاً تفصیلی ہے نتیجے کے طور پر کئی اہم مباحث در آئے ہیں، میں طوالت کے خوف سے چند اہم نکات کی نشاندہی پر اکتفا کروں گا۔

اثر میر انیس کے مرثیوں کو ایک کہتے ہیں اور انہیں ایک پوینٹ، مانتے ہیں، سب سے پہلے وہ ایک ضمنی سرفی 'میر انیس کے معاملات شاعری سے قائم کرتے ہیں اور اس کا اظہار کرتے ہیں کہ بلاشبہ و شک میر صاحب وہ البامی شاعر گرامی ہیں کہ تا یغنی کے بغیر میر صاحب کا کمال کوئی نبی آدم پیدا نہیں کر سکتا ہے: ۱۴

غرض کہ امداد امام اثر میر انیس کے مرثیوں کو البامی بتاتے ہیں اسی صورت میں خود انہیں موقع نہیں کہ وہ سوائے تعریف و توصیف کے کوئی تنقیدی کام سرانجام دے سکیں۔ بہر حال انہوں نے انیس کی رزمی شاعری کی رفعت و بلندی پر خاصا زور دیا ہے لیکن اس کو شمس میں اکثر توازن و اعتدال قائم نہیں رکھ سکے ہیں اثر نے یہ لکھا ہے کہ ہومر نے ایک ایسی زبان میں 'ایپک' لکھی جو زبان بایسدہ تھی یہی حال ورجل کی لاطینی زبان کا تھا یا ملٹن کی انگریزی کا یا فردوسی کی فارسی

کایا بالیکی کی سنسکرت کا لیکن انیس کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ایک ایسی زبان زمیہ میں لکھی جو ابھی ابتدائی مرحلے میں تھی اور متذکرہ بالا زبانوں کے مقابلے میں ناپختہ تھی۔ یہ تو ایک الگ بحث ہے بنیادی سوال یہ ہے کہ انیس کے مرثیوں کو ایک کبہ بھی سکتے ہیں یا نہیں، کبھی کبھی جواب اثبات میں بھی ملتا ہے ویسے یہ الزماں اور احتشام حسین مرثیہ میں کسی حد تک ایک کے خصائص دیکھتے ہیں:

”یہ بات بھی جانتے ہیں کہ چاہے ہومر ہو یا فردوسی، بالیک ہو یا کالیداس ان میں سے

کوئی بھی ایک کے شرائط سے واقف نہ تھا، غالباً انہوں نے کوئی EPIC پڑھی بھی نہیں تھی

شاہنامہ کمار سمجھ بالکل مختلف ہے لیکن پھر بھی ان دونوں کو EPIQ قرار دیا جاتا ہے.....

یہی بات دور عروج کے مرثیوں پر بھی صادق آتی ہے.... پروفیسر احتشام حسین کا خیال بھی اسی

ملتا جلتا ہے: (اردو مرثیہ کا ارتقا صفحہ ۴۲)

بہر کیف امداد امام اثر نے میر انیس کے مرثیوں میں خارجی مضامین کی مثالیں قلم بند کی ہیں اور پھر ان پر تفصیلی تنقید کی ہے، خارجی مضامین کے جتنے اوصاف ان کی نگاہ میں تھے وہ سب کے سب میر انیس کے مرثیوں کے باب میں پیش کر دیے ہیں اسی طرح داخلی مضامین کی تین تفصیلی مثالیں درج کی ہیں اور اس سلسلے میں بھی خوب خوب داد دی ہے، فرماتے ہیں کہ فطرت نگاری میر انیس کا حصہ ہے، اثر نے جو بند داخلی مضامین کی مثالوں میں قلم بند کیے ہیں ان میں ڈرامائی کیفیت بھی بتائی ہے، ایسے تمام مباحث کے نتیجے میں اثر رقم طراز ہیں کہ میر انیس کے مرثیوں میں مضامین کے خارجی اور داخلی دونوں پہلو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ حوالہ قلم ہوتے گئے ہیں مگر ان کی آمیزش نے اور بھی مزہ پیدا کر دیا ہے: ص ۵۵

مناظر قدرت سے متعلق بند کا جائزہ لیتے ہوئے وہ اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ مناظر قدرت کی طرف حسب مراد طور پر توجہ کرنے کی پہلی مثال میر انیس صاحب ہیں۔ ”وہ غرض کہ میر انیس کے معاملے کی ساری بحث جہاں اپنے اندر چند قیمتی نکات رکھتے ہیں وہاں غلو بھی ہے، مثلاً میر انیس کی کردار نگاری کے بارے میں اثر کا خیال ہے کہ وہ دنیا کے عظیم ایک لکھنے والے سے بہتر ہیں، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے اس ضمن جو کچھ لکھا ہے نفس غنیہ کی بنیاد پر لکھا ہے۔

میر انیس پر روشنی ڈالنے کے بعد اثر دیر کی مرثیہ نگاری کا جائزہ لیتے ہیں لیکن یہاں اختصار اور غایت اختصار کو راہ دی ہے، اثر کی نگاہ میں دیر سلطان الذاکرین ہیں دیر کو وہ ایک اہم مذہبی شاعر مانتے ہیں، انہوں نے میر انیس اور مرزا دیر کے مرثیوں کا سرسری طور پر موازنہ بھی کیا ہے،



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## صَلِّ عَلَى أَحْمَدَ وَآلِ كَرِيمٍ

مقدمہ بخدا کی کرامت کے لئے اور اللہ کی کرامت کے لئے  
فی کلّ بکدہ و محتومہ بہا الکلمہ

اما بعد راقم الحروف بندہ سید امداد امام متخلص بہ اثر خدمت حضرات باصدق وصفائیں  
عرض پرداز ہے کہ بہیچدان ابتدائے سن شعور میں بھی شاعری کی طرف میلان طبعی رکھتا تھا۔  
ہر چند اُسے شاعری کی قوت نہ تب حاصل تھی اور نہ اب ہے۔ تو بھی شاعری کی پُر تاثیر کا  
اُس وقت بھی ویسا ہی معترف تھا جیسا کہ اس وقت ہے۔ اسی میلان طبعی کے تعانے سے یہ فقیر  
عہد طالب علمی میں شعرائے یورپ و ایشیا کی تصانیف کو استادوں سے بر غبت تمام پڑھا کرتا  
تھا اور بعد مُنتفیعی ہونے اُس عہد کے بھی حتی الامکان کتب بینی کے ذریعہ سے اپنی واقفیت  
شاعری کو بڑھاتا رہا۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ کسی قدر شعرائے یورپ و ایشیا کے طرز کلام اور  
انداز مذاق سے آشنا ہو گیا۔ یورپ کے اکثر شعرا کی تصانیف سے مطلع ہونے کی یہ صورت ہوئی  
کہ اس فقیر کو ساہا سال اسکو لوں اور کالجوں میں پڑھنے کا مشغلہ رہا جس کے ذریعہ سے  
علوم جدیدہ کے علاوہ یورپ کے بہت سے شعرائے نامی کی تصانیف کے درس لینے کا  
موقع ملا۔ اس سلسلہ وار تعلیم کے بعد کتب بینی کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ مختصر یہ کہ اسی طرز  
فقیر کو یورپ کی شاعری سے از وقت ہو مبر دس تا عہد ثنیس کم دبیش طور پر اطلاع کی شکل پیدا ہوئی  
اس انگریزی تعلیم کے ساتھ ایشیائی شعرا کی تصانیف سے بھی مطلع ہونے کے سامان میسر آئے  
اس کا یہ طور ہوا کہ جناب والد ماجد شمس العلماء سید وحید الدین خان بہادر اعلیٰ اللہ مقامہ  
فی الجنہ۔ خوش حالی کے ساتھ علوم یورپ سے بہرہ وافر رکھتے تھے۔ حضرت غفران قاب نے

حتی المقدور اس ناچیز کی تعلیم میں کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھی۔ خود بہت سی عربی و فارسی کی کتابیں پڑھائیں اور جب ہجوم کار سے عظیم الفرست رہنے لگے تو باوقات مختلف چند معلم یکے بعد دیگرے مقرر فرماتے گئے۔ جن سے علاوہ معقولات و منقولات کی تحصیل کے فقیر اکثر شعرائے عرب کی تصانیف کے درس لینے کا بھی موقع ملا۔ پھر کتب بینی اور صحبت علمائے با مذاق سے بھی مستفیع ہوتا رہا۔ تعلیم عربی کے ساتھ فارسی کی بھی تعلیم ہوتی رہی اور اکثر شعرائے عجم کے دواوین وغیرہ نظر سے گذرے۔ عربی اور فارسی کی تحصیل کے زمانہ میں بعض اردو کے شعرا کے بھی کلاموں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ بعد ازاں اکثر دواوین و تذکرے سے رفتہ رفتہ اطلاع ہوتی گئی۔ عہد طالب علمی کے منقضی ہونے کے بعد فقیر کو بذریعہ ترجمہ وغیرہ کے قدیم شعرائے ہند کی تصانیف کو دیکھنے کا اتفاق ہوا اور بعد ازاں اہل جاپان و برہما و چین کے شعرا کے مذاق بھی دریافت میں آتے گئے۔ بالمشق اس فقیر کو آج تک شاعری کی طرف میلان سابق باقی ہے۔ اب بھی جب احباب با مذاق کی صحبت نصیب ہو جاتی ہے تو کچھ نہ کچھ شعر و شاعری کا ذکر چھڑ ہی جاتا ہے۔ دم تحریر فقیر کی آنکھوں میں بہت سی ایسی صحبتیں پھر رہی ہیں جنہیں یورپ و ایشیا کے شعرا کا مذکور گھنٹوں رہا ہے۔ کبھی زبان فرنگ کی صحبتوں میں ہو مراد، درجہ، شیکسپیر، ملٹن، بائرن، شیلی، ٹینس وغیرہ کے کلام پڑھے گئے ہیں۔ کبھی حضرات علمائے با مذاق کے جلسوں میں حماسہ، سبہ مطلقہ، دیوان ہیر وغیرہ سے اشعار خوانیاں ہوتی ہیں اور کبھی مجالس احباب با خبر و با مذاق میں فردوسی، ظہیر، خاقانی، سنائی، انوری، مولوی رومی، سعدی، حافظ، جامی، صائب، قاضی، مرزا نوشہ، عمر خیام، ابن یسین وغیرہ کی طبایعوں سے روح کو حظ وافر نصیب ہوا ہے اور کبھی مجمع سخن و سبناں میں میر تقی میر، میر درد، مرزا اسودا، میر حسن، ذوق، مومن، مومن، خواجہ آتش، نواب سید محمد خاں، زند، صبا، سحر، قلع، سحر کے کلاموں نے جان کو تازگی بخشی ہے۔ یہ سب صحبتیں خواب سی معلوم ہوتی ہیں اکثر احباب با مذاق جن کی صحبتیں ذریعہ لذات روحانی تھیں راہی ملک بقا ہو گئے۔ خدا ہی جانے کہ برسوں کا ساتھ چھوڑ کر کہاں گئے اور کیا ہوئے۔

شکوہ ہے رفتگان مقام بعید کا ایسے گئے کہ خط بھی نہ بھیجا رسید کا  
اس قسم کی صحبتوں میں جب کبھی فقیر کو اپنے اُن خیالات کو جو فن شاعری سے متعلق ہیں بعض احباب سے عرض کرنے کا اتفاق ہوا۔ تو ان حضرات نے ان کے مدون کرنے کی ہدایت فرمائی۔ بہت روزوں تک توارادہ ہی کرتا رہا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ کثرت مشاغل سے اس کام کے انجام کی



فرست بھی نہیں ملی۔ حتیٰ کے آخر کار جناب برادر معظم و محترم حکیم سید محمد لقمان حیدر صاحب دمام مجدد نے اُن خیالات کی تدوین پر اصرار بلیغ فرمایا ناچار بجا آوری ارشاد میں کوشاں ہوا جس کا نتیجہ یہ رسالہ نکلا ہے۔ حضرات ناظرین بآتمکین اس قلم فرسائی سے یہ زہنہا خیال نہ فرمائیں کہ فیر اپنے کو شاعری کا محقق سمجھتا ہے شاعری کا محقق وہی ہو سکتا ہے جو استعداد کافی اور قابلیت وانی کے ساتھ اپنی تمام عمر عزیز کو تحقیق و تدقیق فن شاعری میں بسر کر ڈالے۔ فیر کو تو با اطمینان اس فن کے ساتھ ہشتم حصہ زندگانی کے صرف کرنے کا بھی موقع نہیں ملا ہے۔ بس دعوا تحقیق و تدقیق سے اس فن سے فیر کو کیا علاقہ، ایسی حالت میں ناظرین کا ملین سے امید ہے کہ صفت ستاری کے تقاضے سے فیر کی عیوب پوشی فرمائیں گے اور اُس کی خطاؤں سے بغوائے اذا مروا بالغومر واکراماً درگزر فرمائیں گے۔ والعد عند کرام الناس مقبول

## غرض تصنیف ہذا

یہ رسالہ نہ بسبیل تذکرہ لکھا جاتا ہے اور نہ علم عروض سے اس کو کسی طرح کا تعلق ہے۔ اس رسالہ کے ملاحظہ سے حضرات ناظرین پر روشن ہو گا کہ شاعری کیا شے ہے اس کی کئی قسمیں ہیں۔ ہر قسم کا کیا تقاضا ہے۔ فطری غیر فطری شاعری میں کیا فرق ہے اور دونوں سے کیا نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ قصیدہ، شنوی، عزل، رباعی، مرثیہ وغیرہ کا کیا انداز ہونا چاہیے۔ یہ بھی اس رسالہ کے ملاحظہ سے ہویدا ہو گا کہ ہر نظم حکم شاعری کا نہیں رکھتی بلکہ شاعری کے لیے نظم کی پابندی کچھ ضروری نہیں۔ یعنی یہ بخوبی ممکن ہے کہ ایک کتاب منظوم ہو اور لطف شاعری سے بالکل معزا ہو اور دوسری ایسی ہو جو نثر ہو مگر مذاق شاعری سے متاثر ملو ہو۔ فیر جو شاعری کے اصول قائم کرتا گیا ہے اُن سے حضرات حق بین کو شعرا کی وہی اور کسی قابلیتوں کے موازنہ کا بھی موقع ملے گا اور ان کی تصانیف کے حسن و قبح آسانی کے ساتھ درک میں آئیں گے۔ مگر نسرود ہے کہ پہلے فیر کے قائم کردہ اصول صحیح مان لیے جائیں۔ ظاہراً یہ اصول بعد استقرار تصنع بلیغ کے قائم ہوئے ہیں اور بنائ ان کی محض فطرت پر واقع ہوئی ہے۔ اگر فیر سے قوانین فطرت کے سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے یا استقرار تصنع میں خطا لاحق ہوئی ہے تو البتہ ایسی حالت میں وہ اصول قائم کردہ بھی غلط ہوں گے۔ بہر حال حضرات اہل انصاف سے امید ہے کہ طرفداری حق میں کوشاں ہوں گے اور اگر ان اصول کو قرین حق ملاحظہ فرمائیں گے تو اُن سے جو مسائل مستخرج



ہوں گے اُن کو بھی دیدہ حقّین سے معائنہ فرمائیں گے۔

شاعری کی تعریف آئندہ آتی ہے۔ مگر یہاں چند امور جو شاعری سے متعلق ہیں اندراج پاتے ہیں۔ ارباب واقفیت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ شاعری کا احاطہ اس قدر وسیع ہے کہ اُس کے اندر مضامین اللہ و ماسوائے اللہ سب کی گنجائش دیکھی جاتی ہے۔ اسی سے شاعری کی عظمت اور لمبہ پائیگی عیاں و آشکارا ہے۔ شاعری کو ایسے ایسے مضامین سے جسے تعجید، عدل ذات، صفات، وجود، عدم، قدم، حدوث، کون، فساد، جبر و اختیار، تقدیر و تدبیر، بقا و فنا، جزا و سزا، حشر، نشر، جعل و خلق۔ زمان و مکان، صورت، میوئی، جوہر، عرض، روح، جسم، ثواب، عذاب، عقبی، حافظہ، خیال، وہم، عقل، ہوش، ایمان، خلوص، حیا، وفا، قہر، غضب، حلم، صبر، رضا، شکر، ہمت، شجاعت و سخاوت، مروت، حسد، بغض، جبن، بخل، حرص، طمع، ہوا، حسرت، عشق، جنون، رنج، ملال، رغبت، نفرت، رشک، غرور، شمس، قمر، کواکب، ثوابت، سیار، قوس، قزح، بروج، قطب، ہوا، برق، باران، حیا، بکور، سبزہ زار، دشت ہامون، صحرا، وحوش طیور، حجر، شجر وغیرہ وغیرہ ہیں کافی طور پر مطلع رہنا چاہیے۔ بس جب اس طرح کے مختلف انداز کے مضامین احاطہ شاعری میں داخل ہیں تو ضرور ہے کہ ایسے مضامین کی تقسیم کوئی علمی طور پر عمل میں لائی جائے تاکہ معلوم ہو سکے کہ اگر کسی شاعر نے کسی مضمون کو باندھا ہے تو وہ ازادی تقسیم کے کس سمت میں داخل ہوتا ہے اور جب مختلف اقسام کی شاعری کا مختلف تقاضا ہے تو اُسی تقسیم کی رو سے یہ امر بھی دریافت میں آسکے گا کہ آیا وہ مضمون اُس قسم شاعری کے تقاضے کے مطابق اپنے محل پر بندھا ہے یا نہیں۔ اس تقسیم کو سمجھنے کے لیے ضرور ہے کہ ماسوائے اللہ یعنی مخلوقات خداوندی پر ہم لوگ غور کریں اور دیکھیں کہ ماسوائے اللہ کی خلقت کس نہج پر واقع ہوتی ہے چنانچہ جب ہم فلسفی پر آنکھ سے ماسوائے اللہ کو دیکھتے ہیں تو مخلوقات خداوندی کو دو نہج پر واقع پاتے ہیں۔ ایک نہج میں صفت ابعاد ثلاثہ یعنی طول و عرض و عمق کو داخل پاتے ہیں اور دوسری قسم میں اس صفت کو بالکل مفقود دیکھتے ہیں۔ اول عبارت عالم مادی سے ہے جس سے صفت ابعاد کی کسی حالت میں منفک نہیں ہو سکتی، دوم سے مراد عالم غیر مادی ہے جسے اس صفت سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ مثلاً جب ہم کسی شے فی الخارج جیسے انگور کی طرف اشارہ کریں تو انگور کو کسی حال میں ابعاد ثلاثہ سے خالی نہیں پائیں گے۔ برخلاف اس کے اگر ہم حلم، قہر، محبت، عداوت وغیرہ کا جو واردات قلبیہ



نہیں ذکر کریں تو اُن کو ہر حال میں ابعادِ ماضی سے بری پائیں گے مخقر یہ کہ مخلوقات خداوندی پر لحاظ کرنے سے عالم مادی اور غیر مادی کا فرق دریافت میں آجاتا ہے اور اس فرق کو سمجھنے سے اُن مضامین کا فرق بھی ہے جو اُن سے متعلق ہیں۔ آسانی کے ساتھ ذہن میں درآتا ہے۔ اس تقسیم کے مطلع رہنے سے فوراً سمجھ سکتا ہے کہ کس شاعر نے اپنے کلام میں کس قسم کے مضامین کو دخل دیا ہے یعنی آیا اس نے امور عالم خارج کو یا امور فی الذہن کو جو اقلیم کیا ہے۔ اس اطلاع سے شاعر کے کلام کی حقیقت آسانی کے ساتھ منکشف ہو جاسکتی ہے۔ ہمارے معلوم ہو جائے گا کہ اُس کا کلام موقع اور محل سے درست ہے یا نہیں یعنی جس قسم کی شاعری اُس شاعر نے اختیار کی ہے اُس کا کلام اُس شاعری تقاضے کے مطابق ہے یا نہیں۔ ارباب اطلاع سے پوشیدہ نہیں ہے کہ بعض شاعری کا تقاضا یہ ہے کہ اُس میں معاملات خارجیہ کو داخل ہونا چاہیے اور بعض شاعری متقاضی اُس کی ہے کہ اس میں امور ذہنیہ جگہ پائیں اور بعض میں دونوں کی آمیزش درکار ہوتی ہے۔ پس تقسیم مضامین کے واقف رہنے سے ہر شخص شاعر کی مناسبت و موزونی طبیعت کا اندازہ آسانی کے ساتھ کر سکتا ہے یعنی مجوز آسانی کے ساتھ تجویز کر لے سکتا ہے کہ آیا وہ شاعر معاملات خارجیہ کے بیان کی قدرت زیادہ رکھتا ہے یا امور ذہنیہ کے بیان پر زیادہ قادر ہے یا دونوں کے بیان کی اُسے یکساں قدرت حاصل ہے۔ آئندہ معلوم ہوتا جائے گا کہ بعض شعرا ایسے ہیں کہ معاملات خارجیہ کے بیان کی زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں اور بعض نے اس کے برعکس صلاحیت پائی ہے۔ اس اختلاف صلاحیت کو تمیز کرنے سے اُن کی شاعری کا رنگ بخوبی سمجھ میں آجائے گا اور یہ بات بھی آسانی ذہن میں درآئے گی کہ اُن کا رنگ بتقاضائے موقع و محل حسب مراد ہے یا نہیں۔ تقسیم بالا کو ملحوظ رکھنے سے جب شعرا کی صلاحیتوں کا اندازہ معلوم ہوتا جائے گا تو بین طور پر یہ بات بھی تحقیق کو پہنچے گی کہ بہت کم ایسے شاعر گذرے ہیں کہ معاملات خارجیہ اور امور ذہنیہ دونوں کے بیان پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ لیکن جن کو ایسی صلاحیت مودع تھی وہ لاریب شاعر کامل الحیار اور نادر روزگار تھے۔ علاوہ امور بالا کے اس کتاب کے معائنہ سے اُن حضرات کو جنہیں وسعت اطلاع کی حاجت ہے مختلف مسائل علمیہ کی دانست کی شکل پیدا ہوگی۔ واضح ہو کہ اس کتاب میں جن ملکوں کی شاعری کا ذکر آیا ہے وہاں کے حالات بھی جو وہاں کے جغرافیہ، تاریخ و تمدن، اخلاق، مذہب و معاشرت وغیرہ سے متعلق ہیں۔



حوالہ قلم کیے جائیں۔ ظاہر ہے کہ ان باتوں کے نہ جاننے سے کوئی شخص کسی ملک خاص کی شاعری کے حسن و قبح کو بخوبی نہیں سمجھ سکتا ہے۔ لاریب تقاضائے ملک و قوم سے ناواقف رہ کر کوئی شخص کسی ملک کی شاعری سے حظ کامل اٹھا نہیں سکتا۔ بلاشبہ اقتاد ملک و قوم کی شاعری میں بڑا دخل ہے۔ اس واسطے راقم نے جن ملکوں کی شاعریوں کا ذکر اس کتاب میں کیا ہے وہاں کی ملکی و قومی حالتوں کے بیان کو بھی بقدر ضرورت بسبیل التزام ملحوظ رکھا ہے تاکہ مختلف اقوام کا شاعرانہ مذاق اور ان کے اسباب ہویدا ہو جائیں

## تعریف شاعری و مجانست شاعری باموسیقی و مصوری

واضح ہو کہ شاعری حسب خیال راقم رضائے الہی کی ایسی نقل صحیح ہے جو الفاظ بامعنی کے ذریعہ سے ظہور میں آتی ہے۔ رضائے الہی سے مراد فطرت اللہ ہے اور فطرت اللہ سے مراد وہ قوانین قدرت ہیں جنہوں نے حسب مرضی الہی نفاذ پایا ہے اور جن کے مطابق عالم درونی و بیرونی نشوونما پائے گئے ہیں۔ پس جاننا چاہیے کہ اسی عالم درونی و بیرونی کی نقل صحیح جو الفاظ بامعنی کے ذریعہ عمل میں آتی ہے شاعری ہے۔ جب شاعری کا ایسا تقاضا ہے تو ضرور ہے کہ جو شاعر ہو وہ رضائے الہی کی نقل پوری صورت کے ساتھ الفاظ بامعنی کے ذریعہ سے اُتارے۔ ورنہ اُس کی شاعری فطرت اللہ کے مطابق نہ ہوگی جو شاعری کے لیے ایک بہت بڑا عیب ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ وضاحت کے ساتھ شاعری کی بحث آئندہ حوالہ قلم ہوگی۔ مگر قبل اُس کے مناسب ہے کچھ حالات اُن دونوں کے بھی اندراج پائیں۔ جو شاعری سے مجانست رکھتے ہیں اور جو درحقیقت شاعری کی قسمیں ہیں۔ اول ان سے علم موسیقی ہے جو رضائے الہی کی نقل صحیح بذریعہ اصوات موزوں کے بنے۔ دوم مصوری ہے رضائے الہی کی نقل صحیح بذریعہ نقوش و قلم کاریوں کے ہے الغرض شاعری و موسیقی و مصوری یہ تینوں شریف اور نفیس فن رضائے الہی کی نقل صحیح ہیں اور دار و مدار ان تینوں فنون کا تبعیت فطرت اللہ پر ہے۔ پس جو شخص قوانین فطرت کی خوبیوں اور باریکیوں کو درک نہیں کر سکتا اور مشاہدات عالم درونی و بیرونی کی صلاحیت نہیں رکھتا ہے اور بعد مشاہدات صحیحہ کے رضائے الہی کی نقل صحیح الفاظ بامعنی یا



اصوات موزوں یا نقوش قلم کاریوں کے وسائل سے نہیں کر سکتا ہے تو ایسا شخص نہ شاعر ہے نہ ماہر موسیقی نہ مصور کہلا سکتا ہے۔

## موسیقی

راقم کو اس رسالہ میں پورے طور پر اس فن کو حوالہ قلم کرنے کا موقع نہیں ہے۔ لیکن جس قدر امور متعلق موسیقی ہیں اور جو اس رسالہ کے مباحث سے تعلق رکھتے ہیں بسبیل اختصار عرض کرنا ہے۔ جانا چاہیے کہ خدائے تعالیٰ نے کمال حکمت سے اصوات کو کیفیتیں موزوں اور غیر موزوں کی بخشی ہیں اور انسان بلکہ بعض حیوانات کی قوت سمع کو بھی اس موزوں کی قوت تمیز علی القدر مراتب عطا فرمائی ہے۔ پھر یہ قوت تمیز مختلف بنی آدم میں مختلف درجہ کی پائی جاتی ہے۔ اصوات کی موزوں اور غیر موزوں کی پوری تمیز بہت کم اشخاص کو وہب ہوتی ہے۔ بہر حال جس قدر انسان میں یہ قوت زیادہ حاصل رہتی ہے اُسی حساب سے اُس میں مذاق موسیقی بھی موجود رہتا ہے جیسا کہ بحث بالا سے ظاہر ہوا ہوگا۔ موسیقی بھی ایک قسم شاعری کی ہے۔ یہ شاعری اُن قوانین فطرت کی تبعیت ہے جن پر موزوں اصوات کا مدار ہے۔ جو شخص اصواتی قانون فطرت سے واقف ہے اور اس سے بھی باخبر ہے کہ کیا کیا کوائف مطبوع اس کے ذریعہ سے پیدا ہو سکتی ہیں۔ وہ علم موسیقی کا عالم کہا جاسکتا ہے۔ پھر وہ شخص جو اصواتی قانون فطرت سے مطلع ہو کر اور اصوات کی کوائف سے باخبر ہو کر اصوات موزوں کو طرح طرح پر طباعی کے ساتھ برت سکتا ہے۔ اسے عالِ موسیقی کہنا بجا ہوگا۔ لیکن جو شخص اس بلور پر اصوات موزوں کو برت سکتا ہے اور اجتہادات کی قوت بھی رکھتا ہے تو ایسا ماہر موسیقی درحقیقت شاعر موسیقی ہے۔ موسیقی علم الاصوات کا ایک جزو ہے۔ مگر اس فن سے وہی اصوات متعلق ہیں جو قوانین فطرت کے مطابق موزونیت کا حکم رکھتی ہیں اور بھی جو قانون فطرت کی رو سے سامع باخبر کے امور اندرونی اور واردات قلبیہ اور قوائے داخلیہ پر ایک خاص حسبِ مراد اثر پہنچا سکتی ہیں موسیقی کا کیوں کر اور کیا اثر انسان اور بعض حیوانات پر پیدا ہوتا ہے۔ ایک بیان وسیع کا طالب ہے۔ جس کی گنجائش پوری طور پر اس رسالہ میں نہیں ہے۔ لیکن بسبیل اختصار یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ انسان میں چند قوتیں ایسی مودعہ ہیں جو انسان کے وسائل مسرت و غم ہوا کرتی ہیں اور ان قوت پر امور خارجیہ کا اثر پیدا ہوا کرتا ہے۔ منجملہ امور خارجیہ کے اصوات یہی ہیں۔ اگر اصوات

قانونِ فطرت کی مطابقت کے ساتھ موزونیت سے خالی نہیں ہوتی ہیں تو جو کچھ اُن اصوات کا تقاضا ہوتا ہے اُس کے مطابق اُن قوائی اندرونی پر اثر پیدا ہوتا ہے اور اُسی درجہ اثر کے اعتبار سے انسانی کیفیت سرور غم کو حاصل کرتا ہے۔ اس پر اُن حیوانات کو بھی جو کن رس ہوتے ہیں قیاس کرنا چاہیے سامع میں سرور غم کی کیفیت پیدا کرنے کے واسطے اصوات کی فطری تقاضوں سے واقفیت رکھنا ضروری ہے۔ کوئی آواز اردوئے فطرت سرور پیدا کرنے کی اور غم پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ عالمِ موسیقی کی آوازوں کو برتنے کے وقت ان کی کیفیتوں پر لحاظ رکھنا واجبات سے ہے۔ ورنہ نتائج حسبِ مراد پیدا نہ ہوں گے۔ مثلاً اگر کوئی گویا کسی خوشی کی تقریب میں شہانا کے عوض میں بردے کی سروں میں کسی گیت کو گانا اختیار کرے تو سرور کے عوض سامعین کے دلوں میں غم کے انداز پیدا ہوں گے اور اسی طرح جہاں بردا کے گانے کا موقع ہو وہاں شہانا گانے لگے تو سامعین حسبِ مراد متکلیف نہ ہوں گے۔ یہ عالم موسیقی کا فرضِ منہبسی ہے کہ علاوہ اصوات غم و سرور کے ہر کیفیت کی آواز سے اطلاع رکھے اور ان کے برتنے پر پورے طور سے قادر ہو۔ ورنہ لطفِ موسیقی کا کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔ میرے ایک دوست سید عالی نسب والا حسبِ نے جو فنِ موسیقی میں کمال رکھتے تھے بلکہ اس فن کے امام تھے آواز پر ایسی قدرت بہم پہنچائی تھی کہ آواز سے سرور، غم، رنج، راحت، محبت، عداوت، دلیری، بزدلی، وفاداری، بے وفائی، امید و بیم، عشرت، عسرت، رحم، قہر، درشتی، نرمی وغیرہ وغیرہ کی کیفیتیں سامعین کے دلوں پر پیدا کر دیتے تھے۔ پس جس طرح شاعر الفاظِ بمعنی سے اور مصور نقوش و قلم کاریوں سے جو کام لیتا ہے میرے دوست میر درد مغفور اصوات کے ذریعہ سے کام لیتے تھے اور اپنے زورِ کمال سے موسیقی کو شاعری اور مصوری کے ہم درجہ کر کے دکھا دیتے تھے۔ واضح ہو کہ یہ امر بعید از عقل نہیں ہے۔ جب کہ درحقیقت موسیقی یا ایک قسم شاعری اور مصوری کی ہے اور جب صرف فرق اس قدر ہے کہ موسیقی رضائے الہی کی نقل بذریعہ اصوات موزوں کے ہے اور شاعری و مصوری ویسی ہی نقلیں بذریعہ الفاظِ بمعنی اور نقوش قلم کاریوں کے ہیں۔ اب رہا کہ کیا اثر موسیقی کا انسان اور بعض حیوانات پر پیدا ہوتا ہے اس کا بھی کسی قدر بیان ضروری ہے۔ یہ حکیم بامذاق کا

لے فرانسسی علامت نگار شاعر لو دلیر کا خیال ہے کہ تمام فنون کی غایت یہ ہے کہ موسیقی بن جائیں۔ - د- ۱



کام ہے کہ شرح و بسط کے ساتھ اُن اثروں کا بیان کرے۔ جنہیں موسیقی انسان میں پیدا کر دے سکتی ہے۔ راقم کو اتنی اطلاع حاصل نہیں کہ حکیمانہ طور پر موسیقی کی تاثیر کیفیتوں کو حوالہ قلم کرے البتہ حسی طور پر موسیقی کا جو اثر مزاج انسان پر پیدا ہوتے دیکھا جاتا ہے۔ اُسے کسی قدر عرض کر سکتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ سنگ دلی اس سے دور ہوتی ہے۔ مزاج میں رحیمی آتی ہے۔ صبر و رضا کی صفیں پیدا ہوتی ہیں۔ خیال ایذا رسانی اور حق تلفی کا دور ہوتا ہے۔ اپنی بے حقیقتی، بے چارگی، بے ایگی ہویدا ہو جاتی ہے۔ میلان شروفساد جاتا رہتا ہے۔ افسار تحمل، فروتنی، عجز، مروت، حق پسندی، وفاداری، بے غرضی، سیرجشی، شجاعت، مردانگی، محبت، درمندی، خلوص اور بھی دیگر صفات حمیدہ دل میں جگہ کرتے ہیں۔ خشونت، رعونت، اعداوت، خود شنائی، خود غرضی، تکبر، تشنج وغیرہ جو ذیل کیفیات بشریہ ہیں اُن کی اصلاح میسر طور سے ظہور میں آتی ہے۔ لیکن وہ شے جسے عوام موسیقی کہتے ہیں اور جس سے نفس حرام کاری، فسق و فجور، رندی اور باشی وغیرہ کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ وہ زہار موسیقی نہیں ہے۔ وہ درحقیقت غنا ہے اور یہ وہی شے ہے کہ جسے اہل تقویٰ اشد من الزنا سمجھتے ہیں۔ بگنہ یہی حالت شاعری کی بھی ہے کہ جو شے درحقیقت حکم شاعری کا رکھتی ہے وہ بجائے خود عبادت ہے۔ جسے قصائد، حمد، نعت، محامد اہل بیت دائرہ معصومین علیہ السلام یا وسیلہ تہذیب نفسی، و تزکیہ روحی ہے۔ مگر وہ شے جسے عوام شاعری کہتے ہیں اور جس کا تقاضا یہ ہے کہ قوائے شہوانیہ کو حرکت میں لائے نفس کو بدی کی طرف مائل کرے اور انسان کو از کتاب محصیت پر آمادگی دلائے وہ زہار شاعری نہیں ہے۔ ایسی شاعری وہی ہے جسے شیطان خبیث مزاجوں کے دلوں میں القا کرتا ہے اور جس کی مثالیں شعرائے امام جاہلیت میں بہت دیکھی جاتی ہیں علیہم وعلیہم۔ واضح ہو کہ سچی موسیقی جو ایک قسم شاعری کی ہے نہایت پر تاثیر شے ہے اور بغیر برآمدگی کے اس میں انسان دستگاہ نہیں پیدا کر سکتا ہے۔ اس کے حصول کمال کے لیے نہایت اعلا درجہ کی استعداد درکار ہیں۔ یہی حال شعر گوئی کا بھی ہے کہ بغیر برآمدگی اور دفور استعداد کے کوئی شخص شاعر نہیں ہو سکتا ہے۔ موسیقی کا اثر تب ہی حسب مراد پیدا ہوتا ہے جب انسان فطرتی قوانین اصوات سے بہرہ وافر رکھتا ہے۔ قوانین اصوات سے اطلاع کافی رکھنے کے لیے بہت سے علموں میں ماہر درکار ہے۔ حتیٰ کہ بے عالم ریاضی اور حکیم دانادل ہوتے تو کوئی شخص ماہر علم الاصوات نہیں ہو سکتا۔ المختصر موسیقی کا مدار بڑی



قابلیت علمی پر ہے اور یہی سبب ہے کہ فن موسیقی کسی انسان کی بربادی کا سبب نہیں ہوتا ہے۔ برخلاف غنا کے ذریعہ سے سینکڑوں امیرزادے بد حال بد اوقات پریشان روزگار افلاس زدہ مبتلائے تکہمت ہو جاتے ہیں۔ یہ امیرزادے ناز پروردہ اتنی مصیبت کب گوارہ کر سکتے ہیں کہ تحصیل صرف و نحو و ادب و معقولات و ریاضی کے بعد علم الاصوات کی طرف توجہ فرمائیں اور اس علم کے دشوار مسائل کو ذہن نشین کرنے میں دل و دماغ کو ایذا پہنچائیں۔ راقم کو آج تک اپنے وطن کے کسی ایسے امیرزادے صاحب سے شرف نیاز کی حصول کی صورت نہ ہوئی جو اتنا بھی واقف ہوتے کہ صوت کیا شے ہے تموج ہوا کا کیا طور ہوتا ہے۔ کس طرح ہوائے متموج صماخ گوش میں داخل ہو کر طبل گوش پر ضرب لگاتی ہے۔ اندرونی گوش کی ساخت کس طرح وضع واقع ہوتی ہے۔ جس سمع کا فعل کس طرح ہوتا ہے۔ اصوات بسیطہ کیا ہیں اور ان بسایط سے مرکبات کیوں کر شکل پکڑتے ہیں۔ علم موسیقی کی کتائیں یورپین زبانوں کے علاوہ عربی میں بھی ہیں۔ شیخ الرئیس کی تصنیف علم الاصوات اور فن موسیقی میں موجود ہیں۔ شفا کی جلد راجع اس علم میں ہے مگر حضرات عیش مزاج عیش طلب کو ان سرزنشوں سے کیا علاقہ۔ ان بے چاروں نے موسیقی اُسی لایعنی شے کو سمجھ لیا ہے کہ بی فلان بی فلان برتا کرتی ہیں۔ اگر کاش ان امیرزادوں میں موسیقی کا سچا مذاق رہتا تو زنان بازی کی غنا پردازیلوں پر جان و مال نثار نہ کرتے اور خسران دنیا و عاقبت کے مصداق نہ بنتے۔ صحیح مذاق موسیقی کا رکھ کر کب کوئی بد اوقاتی اختیار کر سکتا ہے۔ مگر اس صحیح مذاق کے بیدار کرنے کے لیے بڑی کد و کاوش درکار ہے اور یہ نا عاقبت اندیش حضرات سے ظہور میں آنا معلوم۔ پس بہ تقاضائے بے ہنری لہو و لعب میں۔ عرضائع کر ڈالتے ہیں اور اکثر بے زری، بد حالی، بد معنی میں مبتلا ہو کر انواع طرح کی تکالیف جسمانی و روحانی اٹھاتے رہتے ہیں۔ اللہم احفظنا من ذلک اگر ایسے حضرات موسیقی کا صحیح مذاق پیدا کیے ہوتے تو لاریب یہ روز سیاہ اُن کو دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ کس واسطے کہ موسیقی کے مذاق صحیح کا یہی تقاضا ہے کہ ارباب غنا اور ارباب لہو و لعب سے منفرد پیدا کرے۔ اہل واقفیت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ موسیقی کا مذاق صحیح قوانین فطرت پر مبنی ہے۔ فطرتی قوانین کی دانست یا پیروی سے انسان تباہ و خراب نہیں ہو سکتا ہے۔ میرے دوست مرحوم جن کا ذکر سابق میں آچکا ہے اکثر مجھ سے فرماتے تھے کہ موسیقی اور غنا دو شے ہیں اور موسیقی زہار محتاج غنا نہیں ہے موسیقی کی لطافت تک غنا کی رسائی ناممکن



ہے۔ ایک بار موسیقی اور غنا کے فرق ثابت کرنے کا جناب میر صاحب کو ایک خوبصورت موقع ملا۔ اتفاق وقت سے یہ بات معلوم ہوئی کہ ایران کے ایک حضرت مجتہد صاحب مجلس سوز خوانی کی شرکت سے اس بنیاد پر انکار فرماتے ہیں کہ ہندیوں کی مجلس سوز خوانی غنا کا حکم رکھتی ہے اس پر مرحوم نے وعدہ فرمایا کہ مجلس سوز خوانی اس انداز پر انجام پائے گی کہ غنا کا کچھ لگاؤ نہ ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ جناب مجتہد صاحب کو عند التجربہ اقرار کرنا پڑا کہ ایسی سوز خوانی زہار غنا کا حکم نہیں رکھتی۔ بعد ازاں ارباب تمیز سے یہ بات دریافت میں آئی کہ میر صاحب نے غنا سے الگ رہنے کے لیے موسیقی کی دشوار راہیں اختیار کی تھیں۔ اور تمام تر گشگری اور تان وغیرہ سے احتیاط فرماتے گئے تھے۔ فیر نے بھی چند بار اس ماہر موسیقی کو اسی طور پر سوز خوانی کرتے دیکھا تھا۔ واقعی مرحوم کی سوز خوانی غنا سے الگ ہو کر ایک عجیب پاکیزگی پیدا کرتی تھی کہ جس کے سننے سے خدا یاد آ جاتا تھا۔ اور تمام نامشروع نغمے قابل تنفر معلوم ہوتے تھے۔ ظاہر ہے کہ بے کمال موسیقی کے کوئی شخص ایسا اثر دل سامعین پر پیدا نہیں کر سکتا ہے۔ جو میر صاحب کرتے تھے۔ وہ اعلا درجہ کی علم الاصوات کے اصول سے متعلق تھے اور تمام تر قوانین فطرت کے ساتھ تطابق رکھتے تھے اسی باعث سے سامعین پر ایک اثر خاص پیدا ہوتا تھا۔ جناب مرحوم یہ فرماتے تھے کہ اگر موسیقی کا علم قوانین فطرت پر مبنی نہ ہوتا تو روح انسانی کو زہار اس سے حظ نہیں ملتا اور واقعی امر یہ ہے کہ موسیقی کو لذائذ حسی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ برخلاف غنا کے سراپا لذت حسی سے متعلق ہے اور ہرگز شایان روح پاکبازان نہیں ہے۔ ارباب اطلاع سے پوشیدہ نہیں ہے کہ عموماً جو گانا گویہ وغیرہ گایا کرتے ہیں وہ علم موسیقی کے احاطہ سے گذر کر غنا کے دائرہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ حالانکہ فن موسیقی زہار محتاج اُن ترکیبوں کا نہیں ہے۔ جس کو گروام مغنی دیکھے جاتے ہیں مثلاً ماہر موسیقی گشگری اور جڑے کی تان وغیرہ کو داخل فن موسیقی نہیں جانتے اور بالکل ایسی چیزوں سے احتیاط کرتے ہیں چونکہ موسیقی رضائے الہی کی نقل صحیح ہے، ماہر موسیقی کو فطرت اللہ کی تبعیت کرنا واجبات سے ہے فطرت اللہ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ فطرتی اصول موسیقی کیا ہیں۔ معر ان نواسنج میں خلقی خوبیاں موسیقی کی مودعہ ہیں۔ فطرت کے گویے یہی طور نغمہ سرا ہیں۔ آدمی نواسنج پیدا نہیں ہوا ہے۔ مگر نواسنجی کسب کی صلاحیت رکھتا ہے۔ پس ان فطرتی گویوں کی تبعیت سے بہت کچھ حاصل



کر سکتا ہے اور جو ان سے حاصل کرے گا اُسی کو لب لباب موسیقی سمجھنا چاہیے۔ اور چونکہ یہ حاصل کردہ انسان کا تمام تر مطابق قانون فطرت کے ہوگا تو ضرور ہے کہ جو شئی مطابق قانون فطرت ہو وہ سبب الشراح روح بھی ہو اسی غرض سے میر صاحب مرحوم بہت سے طیور خوش نوا اقسام شام، پدا، بولوتہا، کوئل، پیپیا، بلبل وغیرہ اپنے پاس رکھتے تھے اور ان کی نوا سنیوں کو عالم موسیقی کے کانوں سے سنا کرتے تھے۔ میرے بہشت نصیب دوست تو بڑے ماہر موسیقی تھے اور خدا جانے کیا کیا نکات موسیقی کے لغز ہائے طیور سے نکالتے تھے۔ لیکن کیا کہیے ان کی تھوڑی صحبت سے فقیر کو بھی فطرتی نغموں سے متلذذ ہونے کا مذاق پیدا ہو گیا ہے۔ چنانچہ آخر شب کو اکثر بیدار ہو کر مرغان سحر کی خوش آوازیوں سے ایک خاص طرح کی لذت روحی اٹھاتا ہے۔ سوائے ان مرغان سحر کے اور بھی نوا سنج طیور ہیں۔ جن کے نغمے سرمایہ مدہوشی ہیں۔ اس عاجز کی ایک دن کی سرگزشت یہ ہے کہ حسب عادت ایک جنگل میں مصروف شکار تھا۔ اتفاق وقت سے سابروں کی تلاش میں ایک طرف کو جاکھلا ایک اور بھی شکاری دوست ساتھ تھے۔ ادھر ادھر نظر ڈال رہا تھا کہ اتنے میں کسی طائر نغمہ زن کی ایسی صدائے دلکش کانوں میں پہنچی کہ دل ہاتھ سے جاتا رہا۔ ہمہ تن گوش ہو گیا۔ راتفل ہاتھ سے جدا ہو گئی۔ جب تک وہ صدائے ہوش رہا کانوں تک پہنچا کی دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہیں رہی۔ میرے ساتھی دوست کی بھی وہی حالت ہوئی جو میری ہوئی۔ خدا جانے چند منٹ تک ہم دونوں کس عالم میں رہے آج تک بھی جو اُس فطرتی نغمہ کے تلمذ ذرو حی کو یاد کرتے ہیں تو طبیعت ہاتھ سے جلنے لگتی ہے۔ اسی طرح کو ہی جھاڑیوں میں بہت سے چھوٹے چھوٹے طیور پائے جاتے ہیں۔ جن کے نغمے نہایت دردناک ہوتے ہیں۔ بہت مرتبہ ان خورد مقدار فطرتی مطربوں نے ایسے نغمہ ہائے دلکش سنائے کہ اپنے شغل صیدا فگنی میں کچھ نہ کچھ خلل لاحق ہوتے گئے ہیں۔

سوائے انسان کے بعض حیوانات پر بھی موسیقی کا اثر میز طور سے پیدا ہوتا ہے۔ سانپ کو تلمذ خاصی موسیقی سے حاصل ہوتا ہے خوش آئند آواز کا اثر اس موذی جانور پر بہت ہوتا ہے اور جب تک خوش آئند آواز سے مست رہتا ہے مائل ایذا ہی نہیں ہوتا کبھی یہ جانور تو شب کا وقت پازیب کی جھنکار سن کر پاپا یہ مبر سے درگزر تا ہے یہ کوئی مبالغہ نہیں ہے موت خوش آئند سے موذی کا دل بھی بھرا آتا ہے۔ اونٹوں پر حدی خوانی کا اثر جیسا ہوتا ہے زائرین اس کی شہادت دے سکتے ہیں۔ حضرت شیخ سعدی علیہ الرحمہ نے جو فرمایا ہے کہ



”اشریہ شعر عرب در حالت سست و طرب“ ایک امر واقعی ہے اسی طرح آہواں کشتی بھی مست نغمہ ہو جاتے ہیں اور اثر نغمہ سے اُن کی ساری وحشت بھی ہو جاتی ہے مصنف ثنوی سحر البیان یعنی میر حسن غیب اللسان نے جو لکھا ہے کہ

جہاں بیٹھ کر وہ بجاتی تھی بین تو سننے کو آتے تھے آہوئے چین  
ہوا بندھ گئی اُس گھڑی اس احوال بسیرا گئے جانور اپنا بھول

زہنا قانون فطرت کے خلاف نہیں ہے۔ سوال جانوروں کے مولف کی اطلاع ذاتی میں اور بھی جانور ہیں جن پر موسیقی کا اثر واضح طور پر ہوتا ہے۔ مثلاً خرگوش صحرائی وغیرہ اور حتیٰ کہ عنکبوت کہ ستار اور بین کی آواز سے دیوار پر مضطربانہ دوڑنے لگتا ہے اور کبھی مطربوں کے پاس مشتاقانہ پہنچ جاتا ہے۔ نغمہ خوش آئندہ سے مرغان نواسنج کا مست ہو کر چپکنا ہر شخص کو معلوم ہے محتاج بیان نہیں ہے کتابوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جانور ان سبائی پر بھی موسیقی کا اثر نمایاں طور سے ظاہر ہوتا ہے چنانچہ محققین نے لکھا ہے کہ ایک ایسے ملک میں جہاں بھیر یوں کی کثرت رہا کرتی تھی اتفاقاً ایک بوڑھا گویا شب کے وقت کسی گاؤں کی طرف بغرض شریک ہونے کسی جلسہ کے چلا جا رہا تھا۔ رات زیادہ آگئی تھی اور راہ بسبب بھیر یوں کے محدودش ہو رہی تھی۔ نصف راہ جب طے کر چکا تھا کہ اس نے بھیر یوں کی آواز سنی اور سمجھا کہ وہ سب اُس کی طرف آرہے ہیں۔ خوف جان سے بھاگ نکلا مگر جب مفر کی صورت نظر نہ آئی تب ایک شکستہ مکان کی چھت پر چڑھ گیا۔ اتنے میں بھیر یے آ پہنچے اور وہ سب بھی اُس چھپر چڑھنے کی مستعدی ظاہر کرنے لگے۔ جب اُس گویے نے یہ دیکھا کہ اُن موزیوں سے وہاں بھی جان بچنی نظر نہ آتی ہے تب اس نے فوراً بغل سے سارنگی نکال کر بجانا شروع کی۔ جتنے بھیر یے تھے اُس ساز کی خوش آئند صدا سن کر محو ہو ہو گئے اور جو جہاں تھے وہیں رہ گئے۔ امتحاناً جب گویا سارنگی بجانا موقوف کرتا تو پھر ان کی درندگی عود کر آتی اور وہ سب اُس کے پکڑنے کا قصد کرتے۔ لیکن وہ فی الفور اُن کو جادوئے نغمہ سے جس کر دیتا۔ اسی طرح دو گھنٹے کامل گذر گئے۔ اتنے میں کچھ لوگ اُس طرف کو آ پہنچے اور بھیر یے ان کو دیکھ کر فرار ہو گئے۔

## موسیقی اور غنائ پر مذہبی پہلو سے نظر

واضح ہو کہ اہل اسلام عموماً موسیقی کو حرام جانتے ہیں اور علمائے اہل اسلام کے فتاویٰ بھی اس کی حرمت میں دیکھے جاتے ہیں راقم کو ان فتاویٰ سے یہ نہیں ثابت ہوا کہ حکم علمائے اعلام کا موسیقی کی نسبت ہے یا غنا کی نسبت۔ اگر غنا کی نسبت ہے تو بہت بجا ہے۔ بدیں وجہ کہ غنا اکثر معاصی کا سبب ہوتا ہے۔ خاص کر ایسے لوگوں کو جو بد اوقات نا عاقبت اندیش اور نفس پرست ہوتے ہیں۔ لیکن اگر موسیقی کی نسبت بھی وہی حکم ہے تو اس کی حرمت کا کوئی سبب معقول بھی حضرات علمائے ضرور سمجھ لیا ہو گا ورنہ بے سمجھے بوجھے ایسے حکم شرعی کا جاری کرنا چرخی دارد۔ اب سوال یہ ہے کہ وقت استغنا حضرات علماء کو موسیقی اور غنا کا فرق سمجھایا گیا تھا یا نہیں۔ یا یہ کہ حضرات علماء خود موسیقی اور غنا کے مفہوم سے خبر رکھتے تھے یا نہیں۔ دونوں شکلوں میں حضرت مفتی یا حضرت مجتہد کو موسیقی اور غنا کے فرق سے لاعلمی تھی تو عقلاً کوئی حکم مفتی زماں یا مجتہد عصر کا جو ایسی لاعلمی کے ساتھ نفاذ پایا ہو دل میں جگہ نہیں کر سکتا۔ یہ تکلیف اس حکم کی نسبت مرد عاقل اقرار باللسان کر سکتا ہے۔ مگر بالقلب ایسے حکم کی پابندی طاقت انسانی سے باہر معلوم ہوتی ہے۔ فقیر کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرات علماء نے جو حرمت موسیقی کا صادر فرمایا ہے زہار موسیقی اور غنا کے فرق کو ملحوظ رکھ کر نہیں فرمایا ہے۔ جیسا مستغنی کا سوال تھا ویسا ہی اُس کا جواب ملا۔ ظاہراً موسیقی کے حرام ہونے کی وجہ معلوم نہیں ہوتی ہے۔ اسلام ایسے عقلی مذہب میں موسیقی حرام سمجھا جائے محض تعجب ہی تعجب ہے۔ اسلام بالیقین معین و موید و محافظ علوم ہے ایک آتنا بڑا علم جس کا مدار بہت سے علوم پر ہوا ایسے سرسری طور سے بلا وجہ کافی حرام کر دیا جائے اہل عقل کی سمجھ سے بہت بعید ہے۔ علم موسیقی ایک جزو علم الاصوات کا ہے اور علم الاصوات کا اصول علم طبیعیات و علم ریاضی پر مبنی ہے۔ عالم موسیقی ہونے کے لیے بہت بڑا شخص محصل ہونا چاہیے پس ایسے علم کو جس کے حصول کے لیے ایک بھاری تحصیل علمی کی حاجت ہو اسلام کا حرام کر دینا تمام تر عقل انسانی سے باہر ہے۔ عقلاً اگر دیکھیے تو موسیقی کا حرام کر دیا جانا عجیب حیرت خیز معلوم ہوتا ہے۔ جن چیزوں کو اسلام نے حرام کیا ہے اُس کی حرمت کی وجہیں نہایت کافی اور وافی نظر آتی ہیں۔ انہیں عقل کہے دیتے ہیں کہ حرام ہونا چاہیے۔ چنانچہ



بعض غیر اہل اسلام جو اپنے کو پابند عقل سمجھتے ہیں وہ بھی اُن کی حرمت قابل پسند یلگا سمجھتے ہیں۔ برخلاف حرمت موسیقی کے کہ جس کے واسطے کوئی وجہ کافی کسی پہلو سے نظر نہیں آتی ہے۔ اور واقعی نہایت تعجب خیز امر یہ ہے کہ موسیقی ایسا علم ہے جس پر علم کی تعریف پورے طور پر صادق آتی ہے اور جس کو سوائے مرد عاقل فلسفی یا حکیم کے اور کوئی شخص حاصل نہیں کر سکتا ہے۔ بڑے شد و مد کے ساتھ حرام سمجھا جائے ضرور ہے کہ ہمارے حضرات علماء کو موسیقی سے اطلاع نہیں ہوئی ہے۔ ورنہ ایسی شدت کا حکم اس علم کی نسبت صادر نہ فرماتے۔ ظاہراً مذہب اسلام ایسا مذہب نہیں ہے کہ اس کا پیر و نعمت ہائے الہی سے محروم کیا جائے اگر اسلام کی وسعت تمتع پر لحاظ کیجیے تو اس امتداد وسیع ہے کہ اس سے اس کا دائرہ تب ہی وسیع تر ہو سکتا ہے کہ جب اشیائے ضارہ اس کے احاطہ تمتع میں درآویں۔ مگر جہاں تک تمتع بلا ضرر کا احاطہ ہے۔ وہاں تک اسلام کی پوری اجازت دیکھی جاتی ہے اسلام نے زبان کے ذریعہ سے تمتع ہونے کو منع نہیں فرمایا جو لطیف و خوشگوار لذیذ طیب غیر ضار چیزیں کہ انسان ذائقہ کر سکتا ہے سب اس دین نے حلال کر دیں۔ حرام اُسی کو کر دیا ہے کہ جس سے صحت بدنی میں فرق آسکے جیسا کہ سور شراب یا اور اشیائے ضارہ و ناپاک جن سے خرابی جسمانی یا روحانی مترتب ہو۔ اسی طرح اسلام نے قوت بسر سے تمتع ہونے میں کوئی امتناعی حکم صادر نہیں فرمایا۔ آدمی پابندی اسلام کے ساتھ تمام رنگ برنگ کی مخلوقات خداوندی کو جو احاطہ بسر میں آسکتی ہیں بلا خوف محصیت دیکھ سکتا ہے۔ البتہ اسلام نے انھیں چیزوں کے دیکھنے کو منع فرمایا ہے کہ جن کا دیکھنا بے حیائی سے خالی نہیں ہے۔ یا جن کے دیکھنے کا حق دیکھنے والے کو نہیں ہے، اگر اسلام نے ایسی چیزوں کے دیکھنے کی ممانعت فرمائی تو کیا بجا کیا۔ عاقل آدمی اسلام کی ایسی ہدایت کو ضرور تسلیم کرے گا۔ پھر اگر قوت شم سے تمتع ہونے کو خیال میں لائے تو پوری وسعت تمتع اسلام کی رُو سے اس کے پیر کو حاصل ہے۔ البتہ اسلام ایسے سم قاتل کو شتم کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا ہے جس سے قتل نفس منتج ہو سکے۔ یا جس کے شتم کرنے کا شتم کرنے والے کو حق حاصل نہ ہو۔ اسی پر قوت لمس کے تمتع کو بھی خیال کرنا چاہیے۔ پیر و اسلام جائز طور سے ہر شے کو لمس کر سکتا ہے البتہ اس قوت کو ایسے طور پر استعمال نہیں کر سکتا ہے کہ جو طور منافی عقل و شرم ہو۔ اسلام کا حکم تمتعات حسی کے نسبت بہت وسیع ہے اور عجب انداز اعتدال رکھا ہے۔ اسلام نے



جورہانیت کو حرام کر دیا ہے وہ بھی اسی وسعت تمتع کے اصول پر مبنی ہے۔ یہ عقل کے بہت خلاف ہے کہ انسان جائز طور پر لذت مواصلت سے محروم رہے۔ پس تمتع کا دائرہ اس قدر وسیع ہے تو نہایت عجب انگیز امر یہ ہے کہ انسان اس صورت میں کہ فحش و بے حیائی و مفزرات جسمانی سے بچ کر حس سمع سے بشکل تمتع پیدا کرے۔ تو یہ تمتع اُس کا فعل حرام سمجھا جائے۔ جس سمع ایک نہایت شریف قوت انسان کو دیا گیا ہے۔ یہ قوت انسان کے لیے شرف بالعرفت کا ذریعہ ہے۔ اگر یہ قوت مودعہ نہ ہوتی تو انسان کسی حال سے صاحب علم و دانش نہ ہوتا یہ وہ قوت ہے کہ جس پر تمام تعلیمات روحانی کا مدار ہے۔ پس ایسی قوت سے اُس چیز کا تمتع جس کو علوم مختلفہ سے تعلق عظیم ہو کیوں کر ایک ایسے مذہب کی رو سے (جیسا کہ فی الواقع اسلام ہے) حرام مانا جاسکتا ہے۔ موسیقی کو فحش و بے حیائی مفزرات جسمانی و روحانی سے کوئی تعلق نہیں ہے نہ موسیقی کسی طور سے محرک شہوات نفسانی ہے بلکہ برخلاف اس کے مصلح اخلاق و مفید صحت جسمانی و معین لذات روحانی ہے۔ ان خوبیوں کے ساتھ ایسی شے جیسی موسیقی کو اسلام ایسے عقلی مذہب کی رو سے حرام سمجھی جائے خالی از حیرت نہیں ہے۔ ان سب باتوں کو خیال کر کے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے حضرات علمائے موسیقی پر بحیثیت موسیقی توجہ مبذول نہیں فرمائی ہے۔ ورنہ ایسا حکم موسیقی کی نسبت صادر نہ فرماتے۔ علما سے کسی شے کی نسبت حکم مناسب حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ یا خود علما شے استفتاء طلب سے مطلع ہوں یا واضح طور پر کسی اہل اطلاع سے واقف فرماتے جائیں۔ جب دونوں میں ایک بھی شکل موجود نہ ہو حکم صحیح کے صدور کی کیا توقع ہو سکتی ہے۔ بخیاں راقم حضرات علما سے جس قدر استفتاء اس بارے میں ہوتا گیا وہ اس طور پر ہوتا گیا ہے کہ فرق موسیقی اور غنا کا خدمت حضرات علما میں نہیں عرض کر دیا گیا ہے۔ اگر موسیقی اور غنا کا فرق اتنا بھی عرض کر دیا جاتا کہ موسیقی ایک علم ہے کہ علم الاصوات کا ایک جزو ہے اور بحیثیت علمی نہایت دشوار اور قابل توجہ ہے اور چند ایسے قوانین اصوات پر مبنی ہے کہ جو تمام تر فطرتی انداز کہتے ہیں جس سے قوت سمع کو فطرتی تلمذ حاصل ہوتا ہے۔ جن سے قوائے اخلاق خراب نہیں ہوتے ہیں جن سے خواہشات نفسانیہ کو میجان نہیں ہوتا ہے۔ جن سے انسانوں کو پست خیالی اور پست حوصلگی مترتب نہیں ہوتی ہے اور جن سے صحت جسمانی کو نقصان کی صورت نہیں



پیدا ہوتی ہے بلکہ اس کے عوض انسان میں صفیں دردمندی، ہمدردی، خلوص، انکسار، فروتنی، تعبد وغیرہ وغیرہ کے پیدا ہوتے ہیں۔ اور غنا وہ شے ہے کہ مخرب اخلاق اور سرمایہ لہو و لعب ہے اس سے قوت شہوانیہ حرکت میں آتے ہیں اور انسان مرکب معاصی ہوتا ہے۔ اور آخر کار بد حالی و بداوقات ہو کر خسار دنیا و العاقبت کا مصداق ہو جاتا ہے۔ تو راقم کو اس کا یقین کامل ہے کہ ہمارے علمائے دین کوئی حکم سخت موسیقی کی نسبت صادر نہ فرماتے موسیقی موزونی اصوات کا دوسرا نام ہے۔ موزونی اصوات سے خرابی جسمانی و روحانی منتج ہوا اس کا ادراک احاطہ عقل سے باہر ہے۔ محفل حضرات نے فقیر سے حرمت موسیقی کے بارے میں یہ تقریر فرمائی ہے کہ چونکہ موسیقی ذریعہ ہیجان قوائے شہوانیہ ہے اور اس سے ارتکاب معاصی کا ظہور میں آنا قرین قیاس ہے اس واسطے ایسی شے کو جو ایسا ہیجان پیدا کرے ضرور حرام ہونا چاہیے۔ اول تو یہ دلیل ہی غلط ہے۔ اگرچہ یہ دلیل حرمت غنا کے لیے پیش ہوتی تو درست تھا۔ دوم یہ کہ موسیقی کو مجرد ذریعہ ہیجان قوائے شہوانیہ قرار دے کر حرام کہنا کوئی دلیل حرمت نہیں معلوم ہوتی ہے۔ بہت سی چیزیں حلال ایسی ہیں کہ جن کے استعمال سے قوائے شہوانیہ کو موسیقی کے اعتبار سے زیادہ ہیجان ہوتا ہے۔ جیسے دماغ عصفور و گوشت مرغ و گوشت تیترو حلوائی مصطلگی و شہد خالص و ورق طلا وغیرہ وغیرہ تو یہ سب اشیاء جن کی فہرست ایک کیف مبسوط بن جاسکتی ہے حرام قرار دی جائیں گی۔ عقلاً ایسی ایسی دلیلیں کوئی وزن نہیں رکھتی ہیں۔ ہاں اگر کوئی نص قرآنی یا حدیث نبوی معلوم موسیقی کے بارے میں موجود ہے تو اس کو رد سے موسیقی کی حرمت ایک امر مقبول مقصور ہے۔ مگر باطلاع فقیر موسیقی کی نسبت کوئی حکم خداوندی معلوم نہیں ہوتا ہے۔ اگر کوئی حکم خداوندی خلاف میں ہے تو غنا کے خلاف میں ہے اور وہ یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ قول روز کی مدح فرماتا ہے۔ قول روز سے مراد کوئی شخص لی جائے تو یہی غنا ہے۔ مگر چونکہ موسیقی اور غنا کا فرق عموماً نہیں کیا جاتا ہے پس جو حکم غنا کے لیے پایا جاتا ہے وہی حکم موسیقی کے لیے بھی قرار دیا گیا ہے۔ یہ امر ویسا ہی ہے کہ جیسے کوئی شخص ناواقفیت کے باعث سرکہ اور شراب کے فرق کو امتیاز نہیں کر کے شراب کے حکم میں سرکہ کو بھی داخل سمجھے۔ بہر حال قول زور کا مقدوح ہونا ایک امر نہایت قرین حق ہے۔ فقیر نے اس قول کی اصلیت کو یوں سمجھا ہے کہ کفار عرب جو بڑے بت پرست تھے بتوں کے سامنے شراب پی پی کر جلاجل بجاتے تھے اور بتوں کے مناقب گاتے تھے



اور اسی طرح وہیات گیتوں سے نفس کو شاد کرتے تھے۔ خدائے تعالیٰ نے اُن کو ایسے گانے بجانے کو قول زور قرار دیا۔ اور واقعی خوب قول زور قرار دیا۔ کس واسطے کہ انھوں نے خدائے تعالیٰ کی جگہ پر بتوں کو قائم کیا تھا۔ یہ امر ایک امر زور تھا۔ پس جو مناقب وہ لوگ اُس زور کی نسبت گاکر بڑھتے تھے۔ سوائے قول زور کے اور کیا ہو سکتا تھا۔ اب حضرات ناظرین انصاف فرمائیں کہ موسیقی کیوں کر قول زور کہی جاسکتی ہے۔ عالم موسیقی نہ خدا کی جگہ بتوں کو قائم کرتا ہے اور نہ ان کے مناقب جلاجل کے ساتھ گاتا ہے۔ عالم دہا ہر موسیقی کو تو صرف چند اصوات موزوں سے تعلق ہے جنہیں وہ بشكل بسط و مرکب برتا ہے۔ اگر اصوات موزوں کا برتنا حرام قرار دیا جائے تو اسلام کے مذہب عقلی ہونے میں گفتگو لاحق ہوتی ہے۔ یہ بات عجیب نظر آئے گی کہ جس ذائقہ کے لیے کھانا جو پکائے تو نمک مرچ گھی دھنیا پیاز ادراک دہی دودھ معری ایک وزن مناسب کے ساتھ داخل کریں تو یہ موزونی کس طرح پر سبب حرمت نہ قرار دی جائے۔ لیکن اگر جس سمع کے لیے اصوات موزونی کو ملحوظ رکھیے تو یہ فعل حرام سمجھا جائے۔ جس ذائقہ کو جس سمع پر کیا نفوق حاصل ہے۔ دریافت طلب امر ہے ظاہراً تو جس سمع جس ذائقہ سے اشرف معلوم ہوتا ہے۔ کس واسطے کہ جس ذائقہ کا فعل محض لذائذ سے تعلق رکھتا ہے۔ برخلاف جس سمع کے کہ ایک بہت شریف ہے۔ اور ذریعہ تشریف بالمعرفت ہے اور معاملات روحانیہ سے بہت تعلق رکھتا ہے۔ پس کیا سبب ہے کہ ایک ارذل جس کی خاطر داری تو اس قدر کی جادے کے جو اُس کے تلمذ کی عقلی امور ہوں اُن میں کوئی قید نہیں لگائی جائے اور جس سمع جو اشرف ہے اُس سے متمتع ہونا تقاضائے عقل کے خلاف حرام قرار دیا جائے۔ فقیر کو اس مسئلہ موسیقی میں بہت شکوک لاحق ہیں اور خاص کر اُس روز سے اس کی نسبت فقر کے خیالات بہت انقلاب پذیر ہو گئے جس روز فقیر کو حضور میں جناب مجتہد قبلہ و کعبہ حضرت شمس العلماء مولانا مفتی میر عباس صاحب اعلیٰ اللہ مقامہ فی الجنۃ کے ایک قصیدہ کے سننے کا اتفاق ہوا اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ ایک روز فقیر خدمت ممدوح میں حاضر تھا۔ جناب ممدوح نے فقیر کی طرف مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا کہ تو نے میرے اس قصیدہ کو جسے میں نے منقبت حضرت امیر المومنین علیہ السلام میں لکھا ہے سنا ہے۔ فقیر اس قصیدہ کو چند روز ہوئے سن چکا تھا مگر جناب ممدوح نے اُسے ایک صاحب کو جو قریب بیٹھے ہوئے تھے پڑھنے کے لیے ارشاد فرمایا انھوں نے



حسب ایما ممدوح اسے پڑھنا شروع کیا۔ جب تک وہ پڑھتے رہے سامعین کو حیرت رہے  
 حق تو یہ ہے کہ انھوں نے خوب پڑھا کہ اس وقت بھی اس کی لذت دل میں موجود ہے۔ اور  
 پھر جس سمع اُس کے سننے کا طالب ہے۔ خدا پھر ویسا سننا نصیب فرمائے۔ یہ امر بدیہی ہے کہ  
 پڑھنے والے صاحب اُس قصیدہ کو حضور میں جناب حضرت مجتہد صاحب کے پیرایہ غنا میں  
 نہیں پڑھا تھا۔ اگر غنا کے طور پر پڑھتے تو حضرت ممدوح کب اُس کو گوارہ فرما سکتے تھے  
 اور بھی دیگر حضار مجلس جو صاحب ورع و تقویٰ تھے کب اُن کو سُن سکتے تھے۔ اور خود پڑھنے  
 والے صاحب ارباب احتیاط سے تھے کب غنا پر دازی کے مرتکب ہو سکتے تھے اور حقیقت  
 حال بھی یہی ہے کہ اُن کا پڑھنا غنا سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا تھا۔ بہر حال جس رنگ سے  
 انھوں نے پڑھا وہ ضرور کوئی ایسا رنگ تھا کہ حکم فقہ کے خلاف نہ تھا۔ جب حکم فقہ کے خلاف  
 نہ تھا تو معلوم ہوا کہ ایسا پڑھنا اسلام میں مجاز ہے۔ اب اُس پڑھنے کی کیفیت فقیر سے  
 پوچھیے کہ کیا تھی۔ حضرات ناظرین با تمکین کیفیت یہ تھی کہ تمام قصیدہ کو پڑھنے والے صاحب  
 نے سندہ کافی کی دھن میں نہایت نچستگی کے ساتھ پڑھا۔ البتہ تان گسگری کہیں بھی انھوں  
 نے نہ لی مگر سُر، لے۔ تال میں کہیں بھی سر مو جھول نہ آیا۔ ہر لفظ کو پوری طور پر ادا فرمایا۔  
 مخارج الفاظ میں کہیں نقصان لاحق ہونے نہ دیا۔ نام کو بھی کوئی لفظ کہیں سے نہ کٹا چونکہ  
 پڑھنے والے صاحب آدمی خوش آواز بھی تھے اُن کی نچستگی اور موزونی اُن کی خوش آواز کی  
 کو بڑا جلوہ دے گئی۔ اگر سُردوں پر اُن کو ایسا اختیار نہ ہوتا تو مجرد خوش آوازی ایسا اثر  
 مطلوب سامعین پر پیدا نہیں کر سکتی تھی۔ مختصر یہ کہ جو سچی موسیقی کا تقاضا ہے اُس  
 کے مطابق بلاشبہ وہ قصیدہ پڑھا گیا۔ اشخاص ناواقف اُس پڑھنے کو لحن وغیرہ سے  
 تعبیر کریں تو کریں مگر حقیقت حال یہ ہے کہ جس طور سے وہ قصیدہ پڑھا گیا تھا وہ اہل  
 اطلاع کے نزدیک سچی موسیقی کا حکم رکھتا ہے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ اُن صاحب کے  
 پڑھنے کا وہی طور تھا جس کو ہزار درجہ اور بھی زیادہ عمدگی کے ساتھ جناب میر بندہ حسین  
 صاحب غفران مآب سوز خوانی میں برتا کرتے تھے۔ اور یہ طور وہی ہے کہ ماہران موسیقی  
 دھرت کے گانے میں ملحوظ رکھتے ہیں اور برخلاف غنا کے صرف سُر لے تال سے کام لیتے  
 ہیں۔ الفاظ کو تان گسگری سے خراب نہیں کرتے ہیں۔ مخارج الفاظ کا پورا لحاظ رکھتے  
 ہیں اور جو فطرتی تقاضے اصوات کے ہیں۔ اُن کے مطابق کار بند ہوتے ہیں۔ بال مختصر



اُس روز کی قصیدہ خوانی سے فقیر کے دل پر یہ بات جم گئی کہ موسیقی ممنوعات شرع نہیں ہے۔ یعنی اگر کوئی قصیدہ بشرطیکہ فحش اور بد آموز نہ ہو سندھ کافی میں بطرز بالا پڑھا جا سکتا ہے تو سیلو، جنگلا بروا وغیرہ میں بھی اُس کا یا اُس کے ایسے قصائد کا پڑھنا حرام نہ ہوگا۔ واضح ہو کہ فقیر کو حلت موسیقی پر اصرار نہیں ہے۔ اگر حضرات علما، اُس کو حرام سمجھتے ہیں تو بسم اللہ اقتدا یت بھذا الامام۔ ہم بھی حرام سمجھتے ہیں۔ مگر اپنی تشفی و تسکین کے لیے دلیل کافی ڈھونڈتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ موسیقی کے استعمال بد سے ضرر جسمانی و روحانی پیدا ہونا مقصور ہے تو ہزاروں چیزیں حلال ایسی ہیں کہ اُن کا استعمال بد سبب ضرر دنیا و دین ہو سکتا ہے۔ تو یہ کوئی دلیل حرمت موسیقی کے لیے کافی نہیں ہو سکتی ہے۔ اگر ایسی دلیلوں پر بھروسہ کیا جائے تو زندگی کرنا انسان کے لیے دشوار ہو جائے۔ ایسی صورت میں تو پھر کاہے کو کوئی مسلمان شیرہ انگور پی سکتا ہے۔ کس واسطے کہ اس کا استعمال بد شراب کی شکل میں پیدا کر سکتا ہے۔ اگر بد عقلی سے کوئی شخص موسیقی کا استعمال بد کرے تو اس میں موسیقی کا کیا قصور ہے۔ موسیقی سے تو بہت عمدہ عمدہ کام لیے جاسکتے ہیں۔ سوز خوانی، منقبت خوانی نہایت عمدہ کام ہیں ان کی پر تاثری اور عمدگی میں کیا گفتگو ہو سکتی ہے۔ وہی سلام، مرثیہ یا قصیدہ کوئی غیر پابندی موسیقی کے ساتھ پڑھنے اور انہیں چیزوں کو باقاعدہ موسیقی پڑھے دونوں کا فرق محتاج بیان نہیں ہے۔ تعجب ہے کہ فن موسیقی جو ایک عمدہ ذریعہ گد اخستگی طبیعت و نرمی دل کا ہے بلاوجہ معقول حرام سمجھا گیا ہے۔ وہ سوز خوانی یا منقبت خوانی جو غنا سے علیحدہ ہو کیوں حرام سمجھی جاسکتی ہے۔ البتہ اگر موسیقی بتوں کے مناقبت و محامد میں استعمال کی جائے تو یہ اُس کا استعمال بد قیاس کیا جائے گا۔ مگر اس سے بنفسہ اُس کی حرمت ثابت نہیں ہوتی ہے۔ تلوار کا استعمال نیک یہ ہے کہ کسی بے گناہ کا سر اتار لے تو وہ تلوار اس شراب کی طرح حرام نہیں سمجھی جاسکتی ہے۔ یہی کیفیت شاعری کی بھی ہے کہ شاعری کا استعمال بد امر مقدوح ہے اور اگر شاعری سے بت پرستی کی اشاعت غرض ہے تو یہ اُس کا استعمال بد یقیناً حرام ہے۔ لیکن اس سے شاعری کا بنفسہ حرام ہونا ثابت نہیں ہوتا ہے۔ کس واسطے کہ اگر شاعری بنفسہ ایک شے مدوح یا حرام ہوتی تو پیغمبر خدا صلعم حسان ابن ثابت کی اس قدر توقیر نہ فرماتے اور یوم غدیر حسان قطعہ مبارکباد جس کا پہلا مصرع یہ ہے۔ بنادینکم یوم الغدیر بنہم



پڑھنے نہ پاتے مصوری کی نسبت بھی بہت باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ مصوری کا استعمال بد تو سوا حرام کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ مثلاً بتوں کی تصویریں پرستش کے لیے بنانا لیکن اگر اس سے علم حیوانات وغیرہ کی ترقی مراد ہے تو اسلام ایسا مذہب نظر نہیں آتا ہے کہ کسی طور پر مانع ترقی علوم ہو۔ آئندہ جو رائے حضرات علمائے اعلام فقیر کو آرائے حضرات علمائے کوئی مجال گفتگو نہیں ہے۔

## مصوری

یہ بھی ایک قسم شاعری کی ہے اور جیسا کہ راقم اس کی تعریف لکھ چکا ہے یہ فن بھی رنگا الہی کی نقل صحیح ہے۔ صرف فرق یہی ہے کہ یہ نقل نقوش اور قلم کاریوں کے ذریعہ سے ظہور میں آتی ہے۔ صفحہ کاغذ کے یا کاغذ کی ایسی سطح اشیا۔ پر جو اظہار اس فن کا کیا جاتا ہے اُسے مصوری کہتے ہیں اور سنگ و آہن و چوب گل وغیرہ کے ذریعہ سے جو نقل فطرت اللہ کی کی جاتی ہے وہ بت سازی ہے۔ مؤلف دونوں قسم کی دستکاریوں کے لیے اس رسالہ میں مصوری کے لفظ کو استعمال کرے گا۔

## مصور کے لیے علوم کی ضرورت

مصوری کی حقیقت کو بیان کرنے کے لیے مناسب یہ ہے کہ کچھ ایسے امور اندراج پائیں کہ جن سے معلوم ہو جائے کہ مصور کو کن کن صفات سے متصف ہونا چاہیے۔ واضح ہو کہ علاوہ اس اعلا درجہ کی استعداد خلقی اور طباعی کے جن کی حاجت شاعر اور ماہر موسیقی کو بھی ہے مصور کو پوری طور پر ایسے علوم سے جو عالم برونی اور عالم درونی سے متعلق ہیں حسب مراد واقف ہونا چاہیے۔ علم حساب، جبر، مقالہ، اقلیدس، علم مثلث، کسٹری، علوم معدنیات، نباتات، علم حیوانات، علم ہیئت، علم مرایہ و مناظرہ وغیرہ اور بھی جغرافیہ، تواریخ، سیر حکایات، قصص، تمدن، معاشرت، ادب اور جمیع علوم متعلق آداب مجلس میں اُسے کافی دستگاہ رکھنا واجبات سے ہے۔ علاوہ اس کے علوم ذہنیہ میں بھی اُسے پوری مہارت درکار ہے۔ اگر کسی مصور کو یہ علوم نصیب نہیں ہوئے ہیں تو وہ مصور نہیں ہے۔ رنگ سازی یا چیرا ہے۔ گویا کیسا ہی طباع اور کہنہ مشق ہو ان علموں کی کیا ضرورت مصور

کو ہے۔ عوام اس کو بخوبی نہیں سمجھ سکتے مگر تفہیم عوام کی نظر سے ہم چند مثالیں عرض کرتے ہیں۔ جن سے بعض ان علوم کی ضرورت ظاہر ہوگی۔ فرض کیجیے کہ ایک ایسا منصور ہے جو کسری نہیں جانتا ہے۔ ایسا منصور الوان کو حسب ضرورت کیونکر مرکب کر سکتا ہے۔ یارنگوں کی ترکیبوں کو کیونکر جان سکتا ہے۔ یارنگوں پر جو اسباب خارجی از قسم شعاع شمسی وغیرہ سے اثر کیا پیدا ہوتے ہیں کیونکر سمجھ سکتا ہے۔ خود اصول کسری کے جاننے کے لیے حساب جبر و مقابلہ و طبیعیات وغیرہ میں دستگاہ ایک ضروری امر ہے۔ اسی طرح اگر کوئی منصور جغرافیہ سے ناواقف ہے اور اس سے یہ فرمائش کی جائے کہ کوہ لبنان کی ایک تصویر کھینچ لاؤ تو ناواقفیت جغرافیہ سے وہ بیچارہ سخت پریشان ہوگا۔ اس لیے کہ اسے کیا معلوم کہ وہ کوہ کس ملک میں واقع ہے اور وہ ملک آیا سرد ہے یا کہ گرم، اُس کوہ پر برف باری ہوتی ہے یا نہیں۔ اگر گرم ہے تو خط استوا سے کس فاصلہ پر ہے اُس کا مزاج بلدان کیا ہے نباتات کی روئیدگی کا اُس پر کیا طور ہے۔ کس طرح کے جانور اس میں مسکن گزین ہیں ترکیب اُس کی آتش نشاں ہے یا کیا ہے آیا کسی وقت میں خود آتش نشاں تھا یا نہیں۔ اگر اب بھی آتش نشاں ہے تو اُس کی آتش نشانی کس انداز کی ہے۔ اُس کی آتش نشانی موقوف ہو گئی ہے تو اُس موقوفی کو کتنے روز گذرے اور اس موقوفی سے ہیئت موجودہ اُس کی کیا ہے۔ خلقت اُس کی پتھروں کی طبقی ہے یا غیر طبقی ہے۔ اور اسی طرح کی بہت سی باتیں ہیں جن کا یہاں پر ذکر خالی از طویل کلام نہ ہوگا بہر حال اگر ان موٹی باتوں سے بھی کوئی منصور بے خبر ہے تو کیا مسوری کی داد دے سکے گا۔ علوم اطلاع تاریخی سے جو نقص منور منصور ہے اُس کی مثال یہ ہے کہ اگر اُس سے یہ فرمائش کی جائے کہ قیصر اول کی تصویر کھینچ دو تو لاریب یہ بیچارہ سخت مبتلائے پریشانی ہوگا۔ جب اس جاہل کو یہ نہیں معلوم کہ قیصر اول کس قوم کا بادشاہ تھا اُس کی قوم کس ہیکل اور قومی و شکل و شمایل کی تھی اُس کی قوم کے بادشاہوں کا لباس کیا تھا اور اُس کے خاص لباس کا کیا طور تھا۔ سر پر وہ تاج رکھتا تھا یا دستار کمر میں خنجر باندھتا تھا یا تلوار۔ تو ان سے لاعلم منصور سے کیا صناعی کی امید ہو سکتی ہے۔ اسی طرح اگر اس جاہل سے یہ کہا جائے کہ تم اُس جنگ کی تصویر جو سو برس بعد حضرت مسیحؑ کے قسطنطین اور مخالفین مذہب عیسائی کے درمیان واقع ہوئی ہے اور جس کا تاریخی نام پل والی لڑائی ہے کھینچو تو وہ منصور فرط جہالت سے ممکن ہے کہ ایک ایسی خیالی تصویر



کھینچ دے کہ جو اس پانی پت کی لڑائی سے جس میں احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کو شکست دی تھی مشابہ معلوم ہو۔ علوم سیر و تمدن و معاشرت و آداب مجلس کی عدم اطلاع سے جو نقصانات مصور کی مصوری میں لاحق ہو سکتے ہیں اُن کی کچھ مثالیں ذیل میں عرض کی جاتی ہیں۔ فرض کیجیے ایک مصور علم سیر سے واقف نہیں ہے اور اس سے یہ کہا جائے کہ تم قوم ثمود اور عاد کی انداز معاشرت کو بذریعہ مصوری کے دکھلاؤ۔ یا فرعون و فرعون قوم کی حسرات و بے عنوانیوں کا نقشہ کھینچو۔ یا غیبت حضرت موسیٰ میں جو بنی اسرائیل نے حضرت ہارون سے نافرمانی کر کے گاؤں سالہ بنایا تھا اور اُس کی پرستش شروع کی تھی اس کی تصویر بناؤ تو ظاہر ہے کہ وہ مصور جاہل تعمیل فرمائش نہ کر سکے گا۔ اسی طرح اگر نا تعلیم یافتہ مصور سے یہ کہا جائے کہ تم ایران کے صدر اعظم کے کسی جلسہ تمدنی کی تصویر کھینچو یا انگلستان کی پارلیامنٹ کی تصویر بناؤ یا چین کے شاہنشاہ کے دربان کا نقشہ تیار کرو تو وہ عدم اطلاع کے سبب سے بجا آوری حکم میں قاصر رہے گا۔ ممکن ہے کہ ایسا لایعلم مصور ایران کے صدر اعظم کی شکل اکبر شاہ کے رفیق بیربر کسی اپنی سنی سنائی اطلاع کے مطابق کھینچ دے۔ اور انگلستان کے ممبران پارلیامنٹ کے منہ سے بڑے بڑے جواہر نگار تھے لگا دے۔ اسی طرح چین کے بادشاہ کو بھی کسی شیخ عرب کی طرح اونٹ پر سوار دکھلا دے۔ جاہل مصور سے ایسی غلطیوں کا سرزد ہونا بعید از قیاس نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ مصور کے لیے نہایت اعلا درجہ کی اطلاع علمی اور تعلیم یافتگی درکار ہے۔ بلکہ مصور کو شاعر اور ماہر موسیقی کی طرح رتبہ حکیم کا حاصل رہنا ضروریات سے ہے تاکہ وہ اپنی وفور دانست کے ذریعہ سے فطرت اللہ کی نقل صحیح اتارنے میں کسی طرح عاجز نہ ہو۔ اسی طرح علم ذہنیات کی عدم واقفیت سے مصور جاہل واردات قلبیہ و دیگر امور ذہنیہ کی نقل صحیح اتارنے میں قاصر رہے گا۔ مصور کا فرض منصبی ہے کہ کیفیات اندرونی از قسم محبت، نفرت، عداوت، رحم و کرم، غضب، قہر، رشک، حسد، بغض، مروت، سخاوت، شجاعت، انکسار، خاکساری، غرور، کبر، نخوت، فخر، بزدلی، ندامت، سقاہت، حماقت، سرور، غم، الم، عشق، جنون، وحشت، لینت، خشونت، مہر، شکر، رضا، قناعت، حلم، راست بازی، حق پسندی، مکر، حیلہ، فریب، دغا، وفا، جفا، خوف، تلون، استقلال، تحمل، زودرنجی، پشیمانی، حرص و ہوس، طمع، صدق، کذب، حیا، بے حیائی، امید، بیم، یاس، بے تابانی، حراماں، انتظار، امتثار، اطمینان، خوش دلی



بے دلی، وہم، خیال، حافظہ، یقین، انکار، اصرار، عقیدت، اعتبار، بے اعتباری، زہد و تقویٰ، ایمان، کفر، توحید، عدل، شرک، الحاد، سفاکی، بے دردی، ہمدردی، الہام، علم، چہل، سیرچشی، تنگ چشمی، جود، بخل، صفا، کدورت، عصمت، عفت، فسق، آلودگی، شرافت، نجابت، احتیاط وغیرہ وغیرہ کو علمی قواعد کے ساتھ جانے ورنہ داد مصوری نہیں دے سکے گا۔ ظاہر ہے کہ سوائے ایسے حکیم دانا کے جس نے ایک اچھا حصہ عمر عزیز کا علم ذہنیات کی تحصیل میں بسر کیا ہو گا دوسرا شخص ان امور ذہنیہ سے خبر نہیں رکھ سکتا ہے۔ شاعر کو بھی اسی طرح ان سے با علم ہونا چاہیے۔ خواہ با علمی اُس کی ایک امر الہامی خواہ کیسی ہو، بہر حال مصور کو بھی شاعر کی طرح علوم ذہنیہ سے با خبر ہونا واجبات سے ہے ورنہ اُس کی بے علمی اُس کے نقص فن کا سبب ہوگی۔ جاننا چاہیے کہ مصور کا کمال اسی میں ہے کہ جو شخص دلیر ہے اُس کی دلیری کو اور جو بزدل ہے اس کی بزدلی کو اور جو عاشق ہے اس کے عشق کو اور جو فاسق ہے اس کے فسق کو اور جو کاذب ہے اس کے کذب کو اور جو صادق ہے اس کے صدق کو اور جو حاسد ہے اس کے حسد کو اور جو قانع ہے اس کی قناعت کو اور جو جریس ہے اس کے حرص کو اور جو غصہ ور ہے اس کے غصہ کو اور جو رحیم ہے اُس کی رحیمی کو اور جو غضبناک ہے اس کی غضبناکی کو اور جو دوست ہے اُس کی دوستی کو اور جو دشمن ہے اُس کی دشمنی کو اور جو راست باز ہے اس کی راست بازی کو اور جو گویا ہے اس گویائی کو اور جو الکن ہے اُس کی لکنت کو اور جو صاحب شرم ہے اُس کی شرمگینی کو اور جو بے حیا ہے اُس کی بے حیائی کو اور جو بادہ پرست ہے اس کی بادہ پرستی کو اور جو حسن پرست ہے اُس کی حسن پرستی کو اور جو زبردست ہے اُس کی زبردستی کو اور اسی طرح کی دیگر کیفیات اندرونی کو جو مختلف بنی آدم میں پائی جاتی ہیں زور قلم کاری سے اس طور پر دکھا دے کہ ذرہ بھر بھی تقاضائے فطرت کے خلاف نہ ہو۔ راقم کو دم تحریر میں تیس برس یاد آگئی ہیں جو کمال مصوری کا نمونہ تھیں اور جس کے بیان سے کسی قدر معلوم ہو جائے گا کہ مصور کو علم ذہنیات سے واقف رہنے کی کیا ضرورت ہے۔

تیس برس کا عرصہ ہوا ہو گا کہ فقیر بمرکاب جناب والد ماجد اعلیٰ اللہ مقامہ فی الجنۃ کے کلکتہ گیا ہوا تھا۔ اس وقت راقم بجا پگیور کے سرکاری اسکول میں کسی نیچے درجہ میں پڑھتا تھا مگر میلان طبعی سے کسی قدر مصور شناسی کی صلاحیت رکھتا تھا۔ جناب غفران مآب فقیر کی مذاق مصوری سے خبر رکھتے تھے۔ اور خود بھی و فور عام عربی و انگریزی و لاطینی وغیرہ کے ساتھ اس



فن کے بھی بڑے قدردان جو ہر شناس تھے۔ قیام کلکتہ ایک روز یہ ارشاد فرمایا کہ تین تصویریں ایک جگہ قابل دید ہیں۔ چلو دیکھو اور انسان کی قدرت صناعتی کا مشاہدہ کر کے قدرت خداوندی پر غور و فکر کرو۔ حسب ارشاد نحیف ہر کاب حضرت نہایت مشتاقانہ وہاں پہنچا جہاں وہ تینوں تصویریں تھیں۔ مالک اُن تصویروں کا کوئی انگریز تھا۔ جو نہایت تکلف کے ساتھ ان تصویروں کو ایک وسیع اور محفوظ جگہ میں مقفل رکھتا تھا اور ان کے دکھانے کی اجرت فی شخص ایک روپیہ لیا کرتا تھا۔ یہ تصویریں بقرینہ غالباً بارہ فٹ طول میں اور آٹھ فٹ عرض میں ہوں گی۔ یہ تصویریں مضامین کتب سیر کے مطابق کھینچی گئی تھیں۔ چنانچہ ایک تصویر ایسی تھی کہ جس میں مسور نے کمال صناعتی سے حضرت آدم و حوا کی اس حالت کو دکھلایا تھا جب وہ دونوں حکم خدا سے باغ عدن میں قیام رکھتے تھے۔ دوسری تصویر کا منشا یہ تھا کہ باغ عدن کے قیام کے زمانہ میں حضرت حوا حضرت آدم کو گندم کھلانے پر آمادہ کر رہی ہیں۔ تیسری تصویر نافرمانی حکم خدا کی وجہ سے حضرت آدم کے مبتلائے غضب الہی ہونے کی تھی۔ جس وقت راقم کی نظر ازل اُن تصویروں پر پڑی تو یہ تصویریں کسی مسطح شے پر کھینچی نظر نہ آئیں بلکہ اُن پر اصنام ہونے کا دھوکا ہوا۔ مسور کی کمال صناعتی نے ان تصویروں میں ایسا ابھار پیدا کیا تھا کہ سطحی کیفیت کے عوض ان میں صنمی اجسام کا انداز پیدا تھا۔ مثلاً ناک حضرت آدم کی صاف صفحہ کاغذ سے ایسی ابھری معلوم ہوتی تھی جیسے واقعی انسان کے چہرے میں ابھری ہوا کرتی ہیں۔ اسی طرح اپنا ہاتھ جو حضرت آدم پیشانی پر رکھے ہوئے تھے تو ہاتھ کا ابھار ایسا تھا کہ جیسے آدمی کا ہاتھ پیشانی پر رکھنے کے وقت سینہ گردن اور منہ سے الگ نظر آتا ہے۔ پھر مسور نے اس خلا کی تصویر کمال صناعتی کے ساتھ کھینچی تھی۔ جو ایسی حالت میں درمیان ہاتھ، سینہ، گردن اور رُخ کے نظر آتا ہے۔ اسی پر دیگر اعضا کے ابھاروں کو قیاس کرنا چاہیے اور ان کی اعتباری دوریوں کو بھی جسے بزبان انگریزی پرسپیکٹو PERSPECTIVE کہتے ہیں۔ اب ہم ہر تصویر کی مختصر کیفیت علیحدہ علیحدہ لکھتے ہیں۔ گوراقم کے قلم میں اس قدر زور نہیں ہے کہ اُن کی تمام خوبیوں کے درجہ پر قادر ہو۔

### پہلی تصویر

پہلی تصویر جو حضرت آدم و حوا کے قیام بہشت عدن کی تھی اس سے حضرت آدم و حوا



کاقد اتنا بلند معلوم ہوتا تھا جتنا کہ فطرتی طور پر مرد و عورت کو بلند و بالا ہونا چاہیے۔ اُن کے قد کے وہ ولایتی اشخاص ہوا کرتے ہیں جن کو کوتاہ قدی سے فطرت نے محفوظ رکھا ہے بقیاسِ فیر اس تصویر میں حضرت آدم کا قد ۶ فٹ ۶ انچ یا اس سے کچھ زیادہ دکھلایا گیا تھا اور اسی حساب سے حضرت حوا کا قد تناسب کے ساتھ کم قرار دیا گیا تھا۔ بہر حال دونوں کو قدر کشیدہ مصوّر نے کھینچا تھا۔ یہ تصویر مصوّر کی برائے خود اس کی خوش مذاقی اور واقفیت علمی سے خبر دیتی ہے۔ دونوں کی صورتیں نہایت پاکیزہ جمیل کھینچی تھیں اور دونوں کے چہروں سے شرافت اور نجاست کے آثار عیاں تھے۔ ان کو دیکھ کر بے اختیار طبیعت کہہ اٹھتی تھی کہ بلاشبہ انسان کے اوّل باپ ماں ایسے ہی ہوں گے۔ دونوں کے تناسب اعضا ان کی عمدگی خلقت کی گواہی دے رہے تھے۔ حضرت آدم و حوا کے شمول میں ان کے قیام گاہ کی تصویر مصوّر نے کھینچی تھی۔ کسی مکان یا خیمہ کا نقشہ کہیں موجود نہ تھا۔ فطرتی حالت میں انسان جس طرح بسر کرتا ہے اس کا بیان قلم کاری کے ذریعہ سے ظہور میں آیا تھا۔ اشجار بھی فطرتی نشوونما رکھتے تھے اور سوائے فطرتی اشیا کے ارد گرد حضرت آدم و حوا کے کوئی شے مصنوعی نہیں دکھلائی گئی تھی فطرتی وسائل اور رمائے الہی کی تبعیت سے جو انسان کو خوشی ہو سکتی ہے اس کے سب آثار و اندازان دونوں حضرات کے چہرہ پاک و مقدس سے نمایاں تھی۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ حضرت آدم و حوا اطاعت خداوندی کی بدولت غایت آرام و روحی سے متمتع ہو رہے ہیں۔ چہرے ان کے کہے دیتے تھے کہ وہ خدا سے راضی ہیں اور خدا ان سے راضی ہے۔ اور دونوں کے نفس مطمئنہ نصیب ہوا ہے۔ طاعت خدا اور تبعیت فطرت سے جو تملذذ روحانی انسان کو میسر آسکتا ہے۔ اس کی پوری کیفیت ان کے ہر انداز سے ہویا تھی بشرۃً ابوالبشر سے یہ امر ظاہر تھا کہ خداوند تعالیٰ نے کوئی خوشی اُن کے واسطے اٹھا نہیں رکھی ہے۔ کسی شے کی اُن کو محتاجی باقی نہیں رہی ہے۔ طلب سے ان کے دلوں کو استغنا حاصل ہے۔ فکر و تردد جس سے ان کی اولاد مبتلائے آلام ہو رہی ہے ان کے واسطے مخلوق ہی نہیں ہوئے تھے۔ اس آرام روحی کے میسر آنے کی شکل مصوّر نے یوں دکھلائی تھی کہ ارد گرد حضرت آدم کے تمام معاملات فطرت ہی کو جگہ دی تھی کہیں پر کو جھلک بھی گزر ہونے نہیں دیا تھا۔ جاننا چاہیے کہ تبعیت فطرت ہی ذریعہ انشراح روحی ہے۔ جنت میں اگر صفت کو دخل ہو تو جنت دنیا کی طرح دارالمحزن ہو جائے۔ روحی تملذذ انسان کو فطرت ہی کی بدولت نصیب ہو سکتا ہے۔ اگر کچھ بھی فطرت میں



صفت کی شرکت لاحق ہو جائے تو کمال تلذذ روحی میں نقصان پیدا ہو جائے گا۔ ملٹن  
 MILTON شاعر انگلستان نے اپنی کتاب پیراڈائز لاسٹ PARADISE LAST میں  
 بڑی خوبصورتی اور قابلیت شاعرانہ کے ساتھ حضرت آدم کے حالات منظوم کیے ہیں۔ باغ عدن  
 کے سب معاملات کو کہ محض اصول فطرت پر مبنی ہیں دکھلایا ہے۔ اس حیرت خیز شاعر نے یہ  
 لکھا ہے کہ بہشت عدن میں حضرت آدم و حوا کی معاشرت کا طور بالکل فطرتی طریق پر تھا۔ آدم  
 اور حوا دعائے صبح و شام پڑھا کرتے تھے اور اوقات معینہ میں تسبیح و تہلیل کا مشغلہ رکھتے تھے۔  
 اس یاد الہی کے ذکر کرنے کی یہ ضرورت تھی کہ یاد الہی ذریعہ انشراح روح ہے جو شخص یاد الہی  
 سے غافل ہوتا ہے یا متدہر یا لمد ہوتا ہے زہنہارا ایسے کو روحی خوشی نصیب نہیں ہو سکتی ہے۔  
 روحی خوشی نصیب ہونے کے لیے انسان کو تعبد کی حاجت ہے۔ جب بندہ خدا کو یاد کرتا ہے  
 تو خدا بھی اپنے یاد کرنے والے بندے کو یاد کرتا ہے۔ پس جب خدا کسی بندے کو یاد فرماوے  
 تو پھر اس بندے کے واسطے اس سے زیادہ اور کیا دوسری خوشی متصور ہو سکتی ہے۔ عبادت  
 کے اصول محض قانون فطرت پر مبنی ہیں۔ عقل کہتی ہے کہ مخلوق خالق کو مانے اور اس کی عبادت  
 تہ دل سے کرے۔ بالتحق ملٹن نے کمال طباعی سے حضرت آدم و حوا کی لذائذ بہشت سے تمتع  
 اٹھانے کے وسائل میں منہمک تعبد کو پیش نظر رکھا ہے۔ پھر اس کے ساتھ معاشرت کا طور ابوالہر  
 کے ایسا دکھلایا ہے کہ جس میں تصنع کو کسی طرح دخل نہیں دیا ہے۔ حضرت آدم کے قیام کے  
 واسطے نہ کسی ایوان کا ذکر کیا ہے نہ باورچی خانہ، غسل خانہ، توشہ خانہ، مودی خانہ، شفاخانہ  
 شمارخانہ، انبارخانہ، اصطبل، خیمہ، خرگاہ، شہ نشیں، نمگیرا، شامیانہ کی حاجت دکھلائی ہے  
 لشکر، سوار، پیادے، پالکی، نالکی، ہاتھی، گھوڑے، فٹن، یروش، لینڈ و آفس جان، بجھی،  
 ٹم ٹم، میز، کرسی، آئینہ، چھپر کھٹ، مسہری، چھری، کانٹے، رکابی، گلاس، کٹورے، پیالے  
 اور دنیا کے جتنے بھیرے جن سے راحت نصیب ہونے کے عوض اہل دنیا ہمیشہ مبتلائے  
 رنج و افکار رہتے ہیں۔ کہیں بھولے سے بھی حضرت آدم کے لگاؤ سے یاد نہیں کیے گئے

لے انگریزی کا مشہور شاعر جون ملٹن، پیدائش ۱۶۰۸ء اور وفات ۱۶۷۴ء  
 پال ہاروے کی آکسفورڈ کینین ٹوانگشس لٹریچر دچو تھا ایڈلشن کے مطابق پیراڈائز لاسٹ  
 کے پہلے خاکے کی تاریخ ۱۶۳۲ء متعین کی جا سکتی ہے (صفحہ ۵۴۵)۔ ۱-۳



ہیں۔ حتیٰ کہ حضرت آدم کے لیے ضروریات لباس کی بھی نہیں دکھلائی گئی ہے۔ اسی طرح حضرت  
 حوا کے لیے بھی کوئی تکلف انگریز سامان کا نقشہ نہیں کھینچا گیا ہے۔ اگر حضرت حوا کو مجرد لباس  
 کا شوق دیا جاتا تو حضرت آدم میلنرز MILLINERS یعنی زنان لباس سازی کی بلینا ادا  
 کرتے کرتے اور حضرت حوا کی لباسی فرمائشوں کو بجالاتے لاتے آخر کار گھبرا کر باغ عدن  
 سے کسی اور طرف نکل جاتے۔ جہاں ہوسناک تن پرور سرف عورتوں کا گزر نہ ہو سکتا  
 اور باتیں ایک طرف لباس کی پابندی نیشن یعنی وضعداری سے تو عورت اپنے شوہر کے روح  
 پر قبائے جسم کو تنگ کر دے سکتی ہے۔ اگر کاش حضرت حوا کو پورا مذاق اس زمانہ کی خاتون  
 فرنگ FRENCH کا ہوتا تو خدا جانے حضرت آدم کس عذاب شدید میں مبتلا رہتے۔ بس  
 اس نظر سے کہ حضرت آدم کو بہشت عدن میں تلمذ روحانی نصیب تھا اس کے دکھلانے  
 کے لیے شاعر نے ایسے تمام امور کو جس میں صفت انسانی کو دخل ہے بہشت عدن کے  
 بیان میں داخل ہونے نہیں دیا ہے۔ اگر ذرہ بھی صفت کو خلل انداز فطرت ہونے دیتا  
 تو بہشت عدن کی صورت دوزخ سے مبدل ہو جاتی۔ یعنی پھر وہی بکھیرے جو خاص کر اس  
 زمانہ کے ہیں اور علی الخصوص جس کے مبتلا اس زمانہ کے زن و مرد ہو رہے ہیں بہشت عدن  
 میں دخل پاتے تو بہشت عدن دارالعاقت ہونے کے عوض دارالمن ہو جاتا۔ پس شاعر نے  
 نہایت بامدائی کے ساتھ حضرت آدم کی معاشرت کا طور محض فطرت کے مطابق دکھایا ہے۔ اُس  
 کے شاعرانہ بیان کے مطابق حضرت آدم نہایت آزادانہ طور پر زندگی بسر کرتے دیکھے جاتے  
 ہیں۔ جہاں چاہتے ہیں جس طرف چاہتے ہیں ٹہلتے پھرتے ہیں۔ حسب خواہش چشموں سے  
 پانی پیتے ہیں۔ درختوں سے پھل توڑ کر کھا لیتے ہیں۔ ہزاروں رنگ کے گلہائے خود رو کا  
 تماشا دیکھتے ہیں۔ نہ غم دزدہ غم کالا ہر طرح سے افکار دنیاوی سے محفوظ نظر آتے ہیں صرف  
 ایک مرتبہ تنہائی سے متوحش ہوتے تھے کہ اُن کی وحشت تنہائی کو دور کرنے کے واسطے  
 خدائے تعالیٰ نے اُن کے لئے حضرت حوا کو پیدا کر دیا اور اسی قدر سامان فطرت میں جو  
 نقصان رہ گیا تھا وہ بھی پورا کر دیا گیا۔ اس آزادی اور بے نگرانی کے ساتھ کسی محبوب  
 موافق و دلکش کے ساتھ اوقات بسر کرنا اگر جنت نہیں ہے تو پھر اور کس کو جنت کہیں گے  
 اگر ایسی جنت کے علاوہ اور کوئی جنت ہے تو کسی ملامت کی جنت ہوگی بامذاتوں کی نہ ہوگی۔  
 تو و طوبیٰ و ما و قامت یار فکر ہر کس بقدر ہمت اوست



واضح ہو کہ اس تصویر میں مصوّر نے قلم کاری کے ذریعہ سے یہ سب کیفیات ایک مسلح پردہ کھلائی تھیں۔ جنہیں ملٹن اور بھی دیگر میز مصنفین نے اپنی اپنی کتابوں میں حوالہ قلم کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصوّر بھی ایک قسم شاعری کی ہے اور دونوں میں جو فرق ہے وہ اسی قدر ہے کہ ایک رضائے الہی کی نقل و نقوش اور قلم کاریوں کے ذریعہ سے عمل میں آتی ہیں اور دوسری وہی رضائے الہی کی نقل الفاظ بامعنی کے ذریعہ سے ظہور میں آتی ہیں۔

## دوسری تصویر

دوسری تصویر یہ تھی کہ حضرت حوا قیام بہشت عدن کے زمانہ میں حضرت آدم کو گندم کھلانے کی ترغیب دے رہی ہیں۔ یہ تصویر بھی سراپا قلم کاری کی صفتوں سے معمور تھی اور اگر پوری کیفیت اُس کی خوبیوں کی لکھی جائے تو کلام طولانی ہو جائے گا۔ اس واسطے راقم اس تصویر کے صرف منشا کے بیان پر قناعت کرتا ہے۔ اس تصویر میں مصوّر نے اپنا کمال قلم کاریوں کے ذریعہ سے اس طرح پردہ کھلایا تھا کہ جس سے ہویدا تھا کہ ترغیب کی اشے بے عورت کی ترغیب دہی کس درجہ تک پہنچ سکتی ہے۔ عورت کی ترغیب دینے کا اثر مرد پر اور وہ بھی مرد عاقل اور مستقل مزاج پر کیا ہو سکتا ہے۔ ترغیب اور اصرار کے وقت عورت کی آنکھوں کا عنوان کیا ہو جاتا ہے اور اس کی تمام حرکات جسمانی اس کے عنوان چشم کی کیوں کر مدد گاری کرتے ہیں۔ محبوبہ کے اصرار و ترغیب کے وقت مرد عاقل اور مستقل مزاج کی آنکھیں اندیشہ و تفکر اور سوچ کے ساتھ کس طرح پر رفتہ رفتہ پایہ عقل و حزم و استقلال سے گزرنے لگتی ہیں۔ اس تیس برس کے عرصہ کے بعد بھی راقم کی آنکھوں میں حضرت حوا اور حضرت آدم کی آنکھیں پھر رہی ہیں۔ باوجود اس مدت مدید کے بھی مصوّر کی کمال صناعت کا اثر آج تک فقیر کے دل پر تازہ ہو رہا ہے۔ بلکہ مرد و ایام اور افزائش اطلاع سے اُس اثر میں ترقی ہوتی جاتی ہے۔ راقم اس لطف تصویر کو بھول نہیں سکتا کہ حضرت حوا اپنی محبوبیت کے اعتماد پر کہ حضرت آدم اُن کا کہا نہ اٹھائیں گے، مشغول اصرار و ترغیب ہو رہی ہیں۔ اُن کی آنکھوں سے یہ کیفیات ٹپک رہی ہیں ہاتھ میں گندم کے جو خوشے ہیں وہ اس انداز سے حضرت حوا لیے ہوئی ہیں کہ بجائے خود گلدستہ ترغیب ہو رہے ہیں۔ حضرت حوا کی آنکھیں کہہ

رہی ہیں کہ یہ عورت کی آنکھیں ہیں۔ جن کو عافیت اندیشی سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ آنکھیں نہیں ہیں مجسم ترپاہٹ ہیں۔ اُسی کے برخلاف حضرت آدم کی آنکھیں اظہار تفکر آل اندیشی کر رہی ہیں اور عجیب کشمکش کا عالم دکھا رہی ہیں۔ خدا کی نافرمانی کا خوف حوا کی آزر دگی کا خیال عجب مرکب کیفیتیں آنکھوں میں پیدا کیے ہوئے ہیں۔ پھر حوا کی سر دست بے دلی کا اندیشہ آئندہ کی ناخوشخودی خدا پر غلبہ دکھلا رہا ہے۔ اے حضرات ناظرین بآئین اس عاجز کو اس قدر اطلاع علمی کہاں ہے کہ اُس مصوّر عالم کی پوری تعریف کر سکے جس نے کمال صناعی کے ساتھ دشوار دشوار امور ذہنیہ کو اس طور پر حوالہ بقلم کاری کیا تھا بلاشبہ وہ مصوّر علاوہ علوم مختلفہ کے علوم ذہنیہ میں بھی مہارت تامہ رکھتا تھا۔ ورنہ ایسی عالمانہ مصوری کا جلوہ خاص و عام کو کس طرح دکھا سکتا۔ اس تصویر کے دیکھنے سے شعر ذیل کی کوئی عظمت راقم کی آنکھوں میں باقی نہیں رہی ہے۔

گر مصوّر صورت آں جان جاں خواہد کشید حیرتم این ست نازش را چیاں خواہد کشید  
معلوم ہوتا ہے کہ یہ شعر اُس عہد کا ہے کہ جب فن مصوری حال کے درجہ کمال کو نہیں پہنچا تھا ورنہ اس زمانہ میں ناز معشوق کے کھینچنے والے بہت اہل فنون موجود ہیں۔

## تیسری تصویر

تیسری تصویر بھی دونوں تصویر بالا سے نفاست اور صناعی میں کم نہ تھی اس تصویر کا منشا یہ تھا کہ گندم خوری سے حضرت آدم پر کیا گزری اور ان کی حالت میں کیا انقلاب پیدا ہوا معاملات خارجہ کا جو کچھ نقشہ مصوّر نے کھینچا تھا۔ اس کا بیان طوالت سے خالی نہیں ہے۔ مگر اس نافرمانی خدا سے جو پشیمانی بعد حالی، بے قراری، بے چینی وغیرہ حضرت آدم کو لاحق ہوئیں اُن کی نسبت اتنا عرض کر دینا ضرور ہے کہ اُن کے چہرے سے یہ کیفیتیں ایسی نمایاں تھیں کہ اُن کیفیتوں کا بیان زبان کے ذریعہ سے بھی خالی از وقت نہیں ہے۔

## مصوّر کو مشاہدہ عالم کی حاجت

علوم خارجہ و ذہنیہ کی دانست کے علاوہ مصوّر کو چاہیے کہ وسعت نظر کے ساتھ



صحیح طور پر عالم کا مشاہدہ کیے ہو ملک ملک پھرا ہو طرح طرح کے بیابان، صحرا، جنگل، بحور، جبال کو اپنی آنکھوں سے دیکھے ہو ہر قسم کے جانوروں کو ان کی صحرائی اور پروردہ حالتوں میں معائنہ کیے ہو اقوام مختلفہ کی اوضاع و عمارات کہن و حال کو ملاحظہ کیے ہو۔ اور جتنی چیزیں اس عالم میں فطرتی اور مصنوعی ہیں۔ بحد طاقت بشریہ یہ ان سے ذاتی اطلاع رکھتا ہو۔ فطرتی اشیا میں قابل مشاہدہ ایسی ایسی چیزیں ہیں مثلاً ملک ملک کی شفق رنگ آسمان فصل بہار، فصل خزاں، سمندروں کا جوش، طوفان، برف باری، ژالہ باری، بروت باران، قوس و قزح اردر اور یالس، یعنی شفق شمالی، ریگستان، گرد باد، بادِ سموم، نیستان، مرغزار، سبزہ زار، چراگاہیں، دشت، صحرا، کوہ، آتش فشاں، پہاڑوں کی چوٹیاں، دامان کوہ۔ دریاؤں کا پہاڑوں سے نکلنا۔ ان کا بلندیوں سے نشیب کی طرف جست کرنا۔ اُن کا پہاڑوں سے گذرنا۔ ان کا پہاڑوں کو پھاڑ کر بہہ نکلنا ان کا میدانی حصوں میں کج و کا دک راہوں کا اختیار کرنا۔ چشموں کا ابلنا، بڑی بڑی جھیلیں جیسے دلیک، کومو وغیرہ، اور طرح طرح کے اشجار و اثمار، وازنار و طیور و ادب وغیرہ مصنوعی چیزوں میں قابل دید بڑے بڑے شہر، بادشاہوں کے محل ان کے دیوان عام و خاص قلعہ جات، سفارت خانے امرا کے دیوان، مساجد، مندر، گرجے، مقابر، روضے، خانقاہیں۔ مدارس، رصدین۔ منارے، باغ و غارے، مہمان سرائے۔ پیادے اور سواروں کی بارکیں، پریٹین، توپ خانے، جہاز جنگی، جہاز تجارتی، بندرگاہیں، تجارت گاہیں۔ تجارتی چیزوں کی کارگاہیں وغیرہ ہیں۔ بالآخر جب علوم مختلفہ کے ساتھ معاملات عالم کا مشاہدہ صحیح مصور کو حاصل ہو گا تب اس کی صنعت اہل اطلاع کے نزدیک قابل توجہ تصور ہوگی۔ اس زمانہ میں مصوری کا فن اس درجہ ترقی کر چکا ہے کہ اگر بہزاد دمانی قبر سے اٹھ کر آئیں تو سر جیشوار نیلڈ، اوین وینڈک اور ان کے برابر کے مصوروں کی صنایاں دیکھ کر خود تصویر بر حیرت ہو جائیں۔ اب مصوری اس بلند پائیلی کو پہنچ گئی ہے کہ مصور حکم حکیم کا رکھتا ہے۔ اس زمانہ کے مصوروں کی صنایعوں کو سمجھنے کے لیے انسان کو خود بھی جامع علوم پر مادہ و طباع ہونا چاہیے۔ بے اعلا درجہ کی تعلیم یا فستگی کے مصوری کے نکات سمجھ میں نہیں آسکتے ایک ایک تصویر اس عہد کی ایسی ہے کہ برائے خود اہل نظر کی وسعت اطلاع جہاں دیدگی باریک بینی، صحیح مذاق، مضمون رسی، خوش پسندی، قوت دماغی کی آزمائش ہے۔ سچ یہ ہے کہ اس وقت کے



یہ ہے کہ مصور اپنے وفور علم اور طبیعت اور قوت معنی رس سے صحیح تصویریں مخلوقات خداوندی کی کھینچ سکتا ہے۔ نقال سے ممکن نہیں کہ اس کام کو کر سکے۔ اگر کیسا ہی کہن مشق ہوگا تو بھی نقال نقال ہے۔ ایسا شخص اصول فطرت کے مطابق اپنے ذہن کے زور سے معاملات خارجیہ یا امور ذہنیہ کا تماشا نقوش و قلم کاریوں کے ذریعہ سے نہیں دکھلا سکتا ہے۔ نقال شاعر کی بلند پائیگی نہیں رکھتا ہے۔ برخلاف اس کے مصور شاعر مصوری ہوتا ہے۔ اور شاعر کا اہم رتبہ مصور ہے۔ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ مصور ان ہندوستان کو سچی مصوری کی دانست مطلق حاصل نہ تھی۔ جتنی پرانی پرانی تصویریں فقیر کی نظر سے گزری ہیں کہ کوئی بھی نقص پر سپکٹو سے خالی نہ تھیں مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدیم مصوروں کو کسی شبیہ کسی میں دخل تھا۔ مگر اس شبیہ کشی کی بھی یہ حالت معلوم ہوتی ہے کہ بادشاہان اور امرا کی بد مذاقی سے اکثر مصورین شبیہ کشی سے احتراز کرتے تھے اور کچھ نہ کچھ منعموں کی رضامندی کی نظر سے مبالغہ کو راہ دے جاتے تھے۔ شبیہ کشی کے لیے منعم اور مصور دونوں کو مذاق صحیح حاصل رہنا درکار ہے۔ لارڈ چرامول LORD CHAMWELL نے جب اپنی تصویر کھینچنے کے لیے مصور کو حکم دیا تو مصور کو پر زور لفظوں میں یہ فہمائش کی کہ میں جیسا ہوں میری تصویر ویسی ہی کھینچو اگر میرے چہرے تلواروں کے داغوں کو جن سے میرا چہرہ بد نما ہو رہا ہے۔ چھوڑ دو گے تو میں تمہیں ایک کوڑی نہ دوں گا۔ مگر اس مذاق کے خلاف لوگ اس وقت بھی دیکھے جاتے ہیں۔ چنانچہ میری صورت آشنا ایک حضرت ہیں جنہوں نے ایک مصور کو اپنی شبیہ کا حکم دیا۔ مصور بے چارہ ان کے مذاق سے واقف تھا سمجھا کہ اگر حضرت کی تصویر میں آبلہ روی، بد لونی وغیرہ نے جگہ پائی تو ساری محنت رائیگاں ہو جائے گی اور ایک خرہرہ نہیں ملے گا۔ پس اس نے ایک ایسی تصویر کھینچی جو سبب وجاہت و جمال کے کبھی ان کی شبیہ ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ تصویر کو اس طور پر خوب صورت بنانے کے علاوہ مصور نے حضرت کے خرق اقدس پر خاندان تیموریہ کا ایک تاج بھی چڑھا دیا۔ جس سے اس تصویر میں دلی کے شاہزادوں کا انداز پیدا ہو گیا تھا۔ جائے لحاظ ہے کہ جب ہندوستان کے خوشحال عوام کا یہ مذاق ہے تو سابق کے مصور یا اختیار بادشاہان و نوابان و عمائد کی پوری شبیہیں کھینچنے میں بہت سی حالتوں میں مضائقہ کرتے ہوں گے، اس پر بھی ان مصوروں کی قلم کاریوں سے عیاں ہے کہ ان کو



بلاشبہ کس قدر شبیہ کشی میں دخل تھا اور اکثر سابق زمانہ کے میزاشخاص اپنی شبیہ کھنچوایا کرتے تھے چنانچہ فقیر کے پاس بھی بعض بزرگوں کی تصویریں اس وقت میں موجود ہیں۔ جن سے سابق کے مصوروں کی صنای کا اندازہ دریافت میں آجاتا ہے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ عہد سابق کے اکثر والیان ملک و اہل حکومت فن مصوری کا مذاق صحیح نہیں رکھتے تھے۔ جس کے سبب سے مصوروں کا مذاق بھی خراب ہو جاتا تھا اور اس خرابی مذاق کے باعث ان کو اپنے فن میں ترقی کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی تھی۔ یہی حال ایشیائی شعرا کا بھی دیکھا جاتا ہے۔ تقرب سلطانی اور تقاضائے سلطنت سے ان کو فطرت اللہ کی تبعیت کا خیال باقی نہیں رہتا تھا اور اپنے مروجین کی خوشامدوں سے اپنی شاعری کو بد مذاق کا نمونہ کر ڈالتے تھے۔ انشا اللہ تعالیٰ شعرا کی بد مذاق کی بحث آئندہ بسط کے ساتھ حوالہ قلم ہوگی۔ الغرض اس وقت جو عہد مسلمانان کی مصوری کے آثار پائے جاتے ہیں ان سے مصوروں کی خوش مذاق کی توجیہ بعض ناواقف اشخاص نے یوں کی ہے کہ تصویر مسلمانوں کے مذہب کے رد سے ایک ممنوع امر ہے۔ اس واسطے عہد مسلمانان کی مصوروں میں بد مذاق کا نقص دیکھا جاتا ہے۔ ظاہراً یہ توجیہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے اور غیر محصل شخص کو دھوکے میں ڈال سکتی ہے۔ مگر جو حضرات واقف حقیقت ہیں وہ اس توجیہ کو سراپا غلط سمجھیں گے۔ کس واسطے کہ اگر اسلام کے تقاضائے ممانعت سے مصوران ہند میں نقص بد مذاق وغیرہ پایا جاتا ہے تو ضرور تھا کہ عہد ہنود کے مصور بہ تقاضائے بت پرستی و صنم سازی اسلامی مصوروں سے بہتر ہوتے۔ حالانکہ معاملہ برعکس دیکھا جاتا ہے۔ چنانچہ میرے اس دعوے کے معین القسٹون صاحب مصنف صاحب ہند کی تحریر ہے جو فرماتے ہیں کہ ہنود اگرچہ تقاضائے مذہب سے صنم پرست ہیں اس پر بھی اسلامی مصوروں پر ترجیح نہیں رکھتے۔ بہر حال عہد مسلمانان کی مصوری کا جو نقص ہے اس کا اعظم سبب فرمانروایوں کی بد مذاق ہے۔ چنانچہ اہل سلطنت کی بد مذاق کی مثال ایک یہ ہے کہ سو بہ میسور میں ایک باغ ٹیپو صاحب کا آراستہ کیا ہوا ہے۔ اُس کی حفاظت اور مرمت آج تک سرکار انگلشیہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ اس باغ میں ایک پختہ مکان بھی ٹیپو صاحب کا تعمیر کردہ ہے اس مکان کے ایک کمرہ کی دیوار پر ایک جنگ کی تصویر کھینچی ہوئی ہے جو ٹیپو صاحب اور انگریزوں کے درمیان واقع ہوئی تھی اور جس میں ٹیپو صاحب کی فوج چیر دست رہا تھی اس دیواری

تصویر کا منشا یہی ہے جو ابھی عرض ہوا۔ مگر مصور کی صناعی پر غور درکار ہے۔ ظاہراً ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مصور نے کبھی فطرت اللہ پر غور نہیں کیا تھا۔ ساری تصویر تبعیت فطرت اللہ سے معرپاتی جاتی ہے۔ اول تو ٹیپو صاحب کے گھوڑے کا رنگ شہابی دکھلایا گیا ہے۔ دوم یہ کہ ٹیپو صاحب کا گھوڑا ان کے لشکریوں سے پابندی تناسب دو گونہ جسم معلوم ہوتا ہے۔ علاوہ ٹیپو صاحب اور ٹیپو صاحب کے گھوڑے کے ان کے سواروں کے گھوڑے کوئی آسانی کوئی زنگاری کوئی کاسنی کوئی بیگنی کوئی دھانی رنگ وغیرہ نظر آتے ہیں۔ ماشا اللہ ہاتھیوں میں بھی عجب انقلاب نمایاں ہے۔ کوئی ہاتھی عبیری کوئی گلابی کوئی نارنجی کوئی زعفرانی رنگ کا دکھائی دیتا ہے۔ اس جنگ میں انگریز میدان جنگ سے بھاگتے دکھلائے گئے ہیں۔ مگر نہ ان کا رنگ نہ ان کا لباس نہ ان کی صورت کو ان کے واقعی حالت سے کوئی علاقہ معلوم ہوتا ہے۔ انگریزوں کے ساتھ ان کے خاندان خدمت گار بھی بھاگتے نظر پڑتے ہیں۔ مگر ان خاندان خدمت گار کی شناخت صرف دو چیزوں سے ہوتی ہے یعنی ایک تو شراب کی بوتلیں اور دوسری چائے کی بڑی بڑی کیتلیاں۔ خدا جانے عین میدان جنگ میں یہ کم بخت خاندان خدمت گار کیا کرتے تھے اور ان کی وہاں ضرورت کیا تھی۔ اس قسم کی غیر فطرتی مصوریوں کی اور بھی بہت مثالیں ہیں جن کے اعادہ کی یہاں حاجت نہیں۔ یہی ایک اظہار مطلب کے واسطے کافی ہے۔

واضح ہو کہ بالا میں بہت سے امور جو راقم نے مصوری کے متعلق بیان کیے ہیں ان کو شاعری سے بھی تمام تر تعلق ہے۔ جو جو امور صحیح مذاق شاعری کے لیے درکار ہیں وہی امور صحیح مذاق مصوری کے لیے بھی درکار ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مصوری اور شاعری میں اس قدر مجانست ہے کہ جب انسان کا مذاق مصوری صحیح ہوتا ہے تو شاعری کا مذاق بھی درست ہوتا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ مصوری کا مذاق صحیح ہو اور شاعری کا مذاق غلط ہو۔ جب ہوں گے تو دونوں فنون کے مذاق صحیح ہوں گے یا دونوں کے غلط ہوں گے۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ ایک فن کا مذاق صحیح ہو اور دوسرے کا غلط ہو۔ موسیقی کا بھی یہی حال ہے۔ اب فقیر شاعری کی حقیقت کی طرف حضرات با مذاق کی توجہ کا خواستگار ہوتا ہے۔



## شاعری

راقم شاعری کی تعریف سابق میں عرض کر چکا ہے کہ یہ رضائے الہی کی ایسی نقل ہے جو الفاظ بامعنی کے ذریعہ سے ظہور میں آتی ہے۔ رضائے الہی سے مراد فطرت اللہ ہے اور فطرت اللہ سے مراد وہ قوانین فطرت ہیں جنہوں نے حسب مرضی الہی نفاذ پایا ہے اور جن کے مطابق عالم درونی و بیرونی نشوونما پائے گئے۔ پس جاننا چاہیے کہ اس عالم درونی و بیرونی کی نقل صحیح جو الفاظ بامعنی کے ذریعہ سے عمل میں آتی ہے وہ شاعری ہے۔

## بیان عالم مادی و غیر مادی

واضح ہو کہ عالم دو نہج پر واقع ہے۔ ایک عالم خارج ہے اور دوسرا عالم باطن۔ عالم خارج سے مراد وہ عالم ہے جس کی ترکیب میں مادہ داخل ہے اور مادہ وہ شے ہے کہ جس سے صفت ابعاد ثلثہ کی منفک نہیں ہو سکتی جیسے شجر، حجر، شمس و قمر وغیرہ جس سے طول و عرض و عمق منفک نہیں ہو سکتے اور یہ عالم مادی وہی عالم ہے جس پر حواس خمس کا فعل ہوا کرتا ہے۔ اس علم کے وسائل درک یہی حواس خمس ہیں۔ اگر یہ قوائے ظاہرہ ہم لوگوں کو عطا نہیں ہوئے ہوتے تو ہم لوگ عالم خارج سے مطلع نہیں ہو سکتے تھے۔ اس عالم خارج کی وسعت پر غور کیجیے تو عجب حیرت دامن گیر ہوتی ہے۔ تحقیق بلوغ کے بعد بھی اس عالم کی ابتدا اور انتہا کو کوئی دریافت نہیں کر سکا۔ اگر آسمان کی طرف دن کو نظر اٹھا کر دیکھیے تو صرف ایک ہی آفتاب دکھائی دیتا ہے۔ اس آفتاب پر اگر علمی نگاہ ڈالیے تو یہ دریافت میں آتا ہے کہ یہ آفتاب صاحب نظام ہے۔ خود مرکز ہے اور اس کے گرد قریب قریب تین سو سیارے گردش کرتے ہیں کسی سیارے کے ساتھ ایک قمر کسی کے ساتھ چاند اور کسی کے ساتھ سات قمر بھی گردان ہیں۔ اس نظام کے قوانین عجائب و غرائب ہیں۔ ان کی تحقیق کسی قدر علما کرتے گئے ہیں۔ یہ ہماری دنیا بھی اسی آفتاب کی فدیویان سے ہے اور بمقابلہ مشتری و زحل کے ایک مختصر سیارہ ہے اور خود یہ مشتری و زحل جسامت و عظمت آفتاب کے مقابلہ مختصر اجرام ہیں۔ مجرد اس نظام پر فکر و غور کرنے سے جب اس ارمن کی بے حقیقتی عیاں ہوتی ہے اور پھر ان اشیا کو جو اس کرہ سے متعلق ہیں کیا وزن ہو سکتا

ہے۔ ان علمی مسائل کے دریافت کرنے سے کیا کیا حیرت نہیں پیدا ہوتی ہے۔ مجرد آفتاب کی عظمت جتنے اور اس کے گرد اس قدر سیاروں کی کثرت ایک حیرت خیز بات معلوم ہوتی ہے لیکن جب ان کروڑی اجسام کے نظام گردش کے لیے کس قدر وسعت کی حاجت ہے اس کو خیال کیجیے تو ایک فضاۓ عظیم کا تصور دل میں جگہ کرتا ہے۔ جس سے ایک سخت تحیر منبج ہوتا ہے۔ یہ تو اس آفتاب کا نظام ہے جس کو ہم لوگ دن کو تاباں اور درخشاں دیکھتے ہیں اور جو دن کے ظہور کا سبب ہے۔ جب رات آتی ہے اور آسمان میں ہزاروں بظاہر خرد مقدار تاباں کروڑی اجسام جو ثوابت کہلاتے ہیں اور جو درحقیقت آفتاب ہیں اور ہمارے آفتاب سے جسامت میں بزرگ تر میں نمایاں ہوتے ہیں تو بصورت حاصل رہنے علم فلکیات کے یہ تعجب گزرنے لگتا ہے کہ خداوندان کو تو صرف ایک آفتاب نظر آتا ہے جس کو دیکھ کر حیرت دامن گیر ہوتی ہے۔ اب تو ہزاروں آفتاب دکھائی دیتے ہیں اور کوئی بھی ان شمسوں سے ہمارے شمس سے چھوٹا نہیں ہے۔ پس اس قدر شمسوں کے نظام در نظام کے لیے کس قدر وسعت فضا در کار ہوگی۔ لاریب عقل مرد محصل کی ان خیالوں سے قبلائے تحیر ہوتی ہے اور بے اختیار چلا اٹھتی ہے کہ الہی یہ کارخانہ عالم مادی کا کیسا ہے کہ جس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا معلوم ہوتی ہے کہ اس وقت کوئی اس دنیا کو خیال میں لائے اور سوچے کہ یہ کرہ غیر محدود عالم خارج کا کیا جزو و بے مقدار ہے اسی طرح بدرجہ دنیا کی چیزوں پر اگر غور کرتے جاتے تو ایک سے چھوٹی دوسری چیز نظر آئے گی یہاں تک کہ اجسام خرد مقدار کے مس کرنے کے لیے خرد بین شیشوں کی ضرورت ہوگی۔ جاننا چاہیے کہ جس طرح دوربین آلات رصد کے وسیلوں سے بڑے بڑے اجرام فلکیہ کے عجائبات سے کسی قدر اطلاع کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح ان کلاں بینوں کے ذریعہ سے اشیا خرد مقدار کے عجائبات دریافت میں آتے ہیں اور عقل ان خرد مقدار اجسام کے درک سے ویسی ہی حیرت زدہ ہوتی ہے جیسے کہ شمس و دیگر اجرام فلکیہ کے دریافت سے متحیر ہوتی ہے۔ المختصر عالم مادی برائے خود ایک ایسا تعجب خیز عالم ہے کہ جس کے تصور سے انسان کا دماغ چکر میں آنے لگتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ عقل انسانی ایک محدود شے ہے اور زہار اس کو اتنی صلاحیت حاصل ہے کہ عالم مادی اور اس کے متعلق کے قوانین کا حسب مراد اندازہ کر سکے۔ اس وقت تک جو کچھ محققین نے دریافت کیا ہے وہ بہت قلیل ہے۔ ان کی تحقیقات سے صرف ان کے عجز



کا اظہار متصور ہے۔ یہ تو حالت مادی کی ہے۔ اب عالم ذہن پر غور کیجیے۔ تو اس کی دریافت حقیقت میں عقل انسانی اور بھی مجبور ہے۔ یہ عالم بالکل ہی جدا گانہ ہے۔ عالم مادی سے اس کو کوئی مناسبت ہی نہیں ہے۔ اس عالم میں تمام ایسے امور ذہنیہ داخل ہیں جن کو مادیت سے کوئی سروکار نہیں ہے اور جو ابعاد ثلثہ سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے۔ یہ عالم عالم الوہیت سے قریب ہے اور اسی لیے عالم مادی سے اشرف ہے۔ اس عالم کی برتری کے آگے تمام اجرام فلکیہ وغیرہ کی بزرگی ہوا ہو جاتی ہے۔ اسی عالم کے ذریعہ سے انسان کی رسائی خدا تک ہوتی ہے اور اسی عالم کو معرفت الہی کا ذریعہ قیاس کرنا چاہیے۔ انسان کو اسی عالم کے تزکیہ اور تصفیہ کی فکر لازم ہے۔ افسوس ہے کہ اس عہد میں اس عالم کی طرف علمائے زمانہ نے توجہ یک قلم موقوف کر دی ہے۔ خاص کر علمائے یورپ کہ بالکل میٹرلسٹک MATERIALISTIC

خیال اور مذاق کے ہو رہے ہیں اور جو کچھ ترقیاں کرتے ہیں۔ عالم مادی کے متعلق کرتے ہیں۔ کوئی شک نہیں کہ علمائے یورپ نے مادیت میں بڑی ترقی کی ہے اور کرتے جاتے ہیں۔ مگر عالم روحانی سے غفلت اختیار کرنا خالی از ضرر نہیں ہے۔ اس عالم مادی کی ترقی نے اہل یورپ کو روحی معاملات میں سست بنا رکھا ہے۔ مذہب بھی ایک جز معاملات ذہنی کا ہے اور بہت کچھ قابل توجہ ہے۔ افسوس ہے کہ مادی مذاق کے اہل یورپ مذہب کو توجہ کی نظر سے نہیں دیکھتے ہیں۔ خیر جو کچھ بھی اہل یورپ کی حالت ہو عالم ذہن ایک بہت قابل لحاظ امر ہے اس عالم ذہن کو جس طرح پر خالصانہ خدا نے سمجھا ہے اس سے فقیر کو کوئی اطلاع نہیں ہے۔ مگر جو کچھ تفحص کے ذریعہ سے اس عالم کے معاملات دریافت میں آتے ہیں اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم میں ایک شے مادی ایسی ہے کہ جس طرف اناجن کی نسبت کی جاتی ہے۔ اور وہ شے جو منسوب اناجن ہے اس کو چند طرح کے قوی فطرت نے بنائے ہیں۔ اور یہ قوی مختلف کام کے لیے دیے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک کا کام یہ ہے کہ جو اس خمرہ کے ذریعہ سے عالم فی الخارج کو درک کرے۔ دوسرے کا کام یہ ہے جو اس سبیل سے اشیائے فی الخارج کے صور فی الذہن قائم ہوں ان کو اپنی حفاظت میں رکھے۔ تیسرے کا کام یہ ہے کہ ان محفوظ صور کو آپس میں ترکیب دے اور ان سے صور مرکبہ قائم کرے جو تھے کا کام یہ ہے کہ ان صور کو ایک دوسرے سے تمیز کرے۔ پانچویں کا کام یہ ہے کہ تمیز کے بعد ان میں تجویز کو دخل دے۔ اسی طرح مختلف قوی کے مختلف خدمتیں ہیں سوائے

ایسے قوائے فاعلیہ کے قوائے اخلاقیہ ہیں اور یہ قوائے اخلاقیہ یا حمیدہ ہیں یا ذمہ ، علاوہ ان قوائے اخلاقیہ کے واردات قلبیہ ہیں جن سے قوائے دماغیہ کو کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور ان واردات قلبیہ سے اہم امور روحی متعلق ہیں۔ اور ان واردات قلبیہ کی وسعت اس قدر ہے کہ وحی والہام تک اس کے احاطہ کے اندر آتے ہیں۔ اور دیگر معاملات الہی کو تمام تر اس سے تعلق ہے۔ مثلاً، اقرار، توحید، ایمان جو انہیں واردات قلبیہ میں داخل ہیں اور انہیں واردات قلبیہ کی ترقی سے انسان رفتہ رفتہ مقرب ذات ایزدی ہو جاتا ہے۔ اس تقرب سے اسرار خداوندی اس پر کشف ہوتے ہیں اور آخر کار یہی واردات قلبیہ عالم اکبر دکھائی دیتے ہیں۔ جن میں عالم اصغر یعنی عالم فی الخارج مادیت سے بری ہو کر شامل ہو جاتا ہے اور بھی وہی عالم اکبر محل و گذر گاہ ذات باری قرار پاتا ہے۔ یعنی ذات و صفات باری تعالیٰ کا جلوہ گاہ قرار پا کر عرش اللہ تعالیٰ ہو جاتا۔

لمؤلفہ۔

کیوں کعبہ دل میں نہ رکھیں تجھ سے صنم کو      جلوہ نے ترے ایک کیا دیو و حرم کو  
ہم نے وہ صنم خانہ بنایا ہے کہ جس میں      ہو دخل نہ زاہد ترے تقویٰ کے صنم کو  
دل ہے جو گذر گاہ خدا کعبہ ہی ہے      اسے شیخ ترا کعبہ نہیں چاہیے ہم کو  
المختقران باتوں سے عالم باطن کی عظمت کو خیال کرنا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ  
عالم باطن عالم خارج سے کس قدر اشرف ہے خیران دونوں عالم کی کیفیت تو اس طرح پر  
واقع ہے جیسا کہ فقیر نے بسبیل اختصار سابق میں ان کے بیان کو حوالہ قلم کیا ہے۔ مگر اب  
یہ جاننا چاہیے کہ یہ دونوں عالم یعنی عالم خارج و عالم باطن جو رضائے الہی کے مطابق ظہور  
میں آئے ہیں۔ انہیں کی نقل معجم الفاظ بمعنی کے ذریعہ سے شاعری کا حکم رکھتی ہے۔

## شاعری کی تقسیم از روئے تقاضائے مضامین

پس جب عالم دو منہج پر واقع ہے یعنی مادی اور غیر مادی تو مضامین بھی جو ان سے متعلق  
ہوں گے ضرور ہے کہ ہم رنگ نہ ہوں چنانچہ حقیقت حال بھی یہی ہے کہ جو مضامین اشیائے  
فی الخارج سے تعلق رکھتے ہیں ان کا رنگ جدا ہے اور امور ذہنیہ سے متعلق ہیں ان کی کیفیت  
کچھ علاحدہ ہے اسی فرق رنگ کے اعتبار سے شاعری دو قسم پر تقسیم پاتی ہے۔ یعنی شاعری



متعلق عالم خارج جسے بزبان انگریزی آبجیکٹو OBJECTIVE کہتے ہیں اور شاعری متعلق بعالم دریا جسے بزبان انگریزی سبجیکٹو SUBJECTIVE کہتے ہیں۔ اول قسم کی شاعری جس کا نام راقم خارجی رکھتا ہے۔ ایسے بیانات پر مشتمل ہوتی ہے جن سے عالم فی الخارج کے معاملات پیش نظر ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کی شاعری میں اکثر بیانات رزم، بزم، جلوس، فوج، تزک، احتشام، بساتیں، باغ، قصور، چین، گلزار، سبززار، لالہ زار، جبال، بحور، صحرا، دشت، سیابان، ریگستان، خارتان، جنگل، آبستان، چشے، ہوا، برق، باران، سیل، برف، شفق، سحر، شام، روز، شب، شمس، قمر، سیارے، ثوابت، قطب، بروج و دیگر خارجی اشیا کے متعلق ہوتے ہیں۔ بعض شعرا میں اس قسم کی شاعری کی صلاحیت ایسی دیکھی جاتی ہے کہ ان کے بیان سے معاملات خارجیہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتی ہے اور جو لطف اعلا درجہ کی مصوٰر کی قلم کاریوں سے اٹھتا ہے۔ وہی لطف ان کے بیان سے پیدا ہوتا ہے۔

یورپ میں اس رنگ کی شاعری کی مثال انگریزی شاعریوں میں سردالٹراسکاٹ اور اردو شاعریوں میں کسی قدر نظیر اکبر آبادی ہے۔ یورپ اور ایشیا دونوں میں اس رنگ کے کچھ شعرا گزرتے گئے ہیں کہ اگر انھوں نے کسی معاملہ رزم کو حوالہ قلم کیا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ معاملہ رزم آنکھوں کے سامنے ظہور میں آ رہا ہے۔ اسی طرح اگر انھوں نے جبال و بحور و صحرا وغیرہ کے حالات موزوں کیے ہیں تو موجودات فی الخارج پیش نظر معلوم ہوتی ہیں۔ اس طرح کی واقعہ نگاری پر قادر ہونا آسان امر نہیں ہے۔ جب تک کہ شاعر کو معاملات خارجیہ پر غور اور فطرت اللہ کی تبعیت کی صلاحیت بدرجہ اتم حاصل نہ ہوگی۔

اپنے بیانات میں تصویر عالم نہیں پیدا کر سکے گا۔ دوسری قسم شاعری جس کو راقم داخلی پر موسوم کرتا ہے۔ تمام تر ایسے مضامین سے متعلق ہوتے ہیں جس کو سرا سرا امور ذہنیہ سے سروکار رہتا ہے۔ یہ شاعری انسان کے قوائے داخلیہ اور واردات قلبیہ کی کیفیتوں کی مصوری سے اس رنگ کے بھی ممتاز شعرا یورپ اور ایشیا میں گزے ہیں مجملہ ان کی شاعری انگریزی شعرا میں لارڈ بیرن LORD BYRON ہے اور اردو شاعروں میں میر تقی میر اس رنگ کے شاعروں میں

لے انگریزی شاعر اور ممتاز ناول نگار، پیدائش ۱۷۷۱ء اور وفات ۱۸۱۲ء - و۔ ۱

۳۰ جارج گورڈن بائرن انگریزی کا معروف اور ممتاز شاعر پیدائش ۱۷۸۸ء اور وفات

اگر عشق کو بیان کیا ہے تو عشق کی تصویر سامنے لا کر کھڑی کر دی ہے۔ اسی طرح اگر انھوں نے غم، غصہ، رنج، ملال، افسوس، حسد، بغض، رشک، محبت، عداوت، رغبت، نفرت، وغیرہ وغیرہ کو حوالہ قلم کیا ہے تو ایسے ایسے امور ذہنیہ کے بیان میں مصوّر کی قلم کاری کا لطف دکھایا ہے۔ بہر حال ان دونوں رنگوں کے شعرا کے کلام مختلف زبانوں میں موجود ہیں جن کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان میں کسی معاملات خارجیہ کے بیان پر قدرت حاصل تھی اور کسی کو امور ذہنیہ کے اظہار کوائف صلاحیت دے تھی۔ علاوہ ان کے کچھ ایسے شعرا بھی اقوام مختلفہ میں دیکھے جاتے ہیں کہ دونوں رنگ کی شاعری پر یکساں قدرت رکھتے تھے اور اسی دو بڑی قابلیت کی وجہ سے ان کی شہرت آج بھی برقرار ہے بلکہ ترقی علوم و فنون کے ساتھ ترقی کرتی جاتی ہے۔ اس جامعیت کی مثال، ہومرئس، ورجل، فردوسی، شیکسپیر، ملٹن، گرٹا، میرانیس، بالیکی، ویاس اور کالیداس ہیں۔ انشا اللہ تعالیٰ آئندہ اقسام بالا کے شعرا کا مذکور زیادہ تفصیل کے ساتھ آئے گا۔ جس طرح سے فقیر مضامین بالا کی تصریح اور بھی واضح طور پر ہو جائے گی۔

جاننا چاہیے کہ شاعری کے مذاق صحیح و غیر صحیح کا مدار انھیں معاملات خارجیہ اور امور ذہنیہ کی دانست پر ہے۔ جن شعرا نے عالم درونی و بیرونی کے تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر مضمون بندی کی ہے ان کی شاعری مذاق صحیح سے خالی نہیں ہو سکتی۔ عالم خارج و داخل کے تقاضوں پر لحاظ رکھ کر کار بند ہونا جمعیّت فطرت ہے۔ پس جب کوئی شاعر جمعیّت فطرت کی پابندی

---

لے ہومر، ایران کا مشہور شاعر، کہاں اور کب پیدا ہوا؟ ان مسائل پر اب تک اتفاق نہ ہو سکا، کبھی کبھی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہومر کسی زمانے میں تھا ہی نہیں۔ بہر حال دنیا کے عظیم ایک رزمی، اوڈسی اور ایلیڈ اسی کے نام منسوب ہیں۔ ہیرودوٹس اس سے نویں صدی قبل از مسیح کا شاعر سمجھتا ہے، روایتی طور پر اس کی جائے پیدائش تیوس اور سمرنا بتائی جاتی ہے دیکھیے ہاروے کی آکسفورڈ کینین ٹوکلاسیکل لٹریچر ۴، ۱۹۶ کا ایڈیشن صفحہ ۲۱۲) و-۱

۲۔ مشہور رومی شاعر ورجل پیدائش ۱۰، ق م اور وفات ۱۹، ق م، اندس میں پیدا ہوا ایلیڈ اس کی مشہور ایک ہے۔ و-۱

۳۔ معلوم نہیں یہ کس زبان کا شاعر تھا؟ ہاروے ایک شاعر گراشیس کا ذکر کرتا ہے جس نے شکار کے موضوع پر ایک نظم کہی تھی اوڈاسے اپنا ہم عصر بتاتا ہے۔ و-۱



کے ساتھ مضمون بندی کرے گا تو عام اس سے اس کی شاعری کا انداز خارجی ہو یا داخلی اس کی شاعری ضرور فطرتی ہوگی۔ اسی فطرتی شاعری کو مذاق صحیح کا مصداق سمجھنا چاہیے۔ برخلاف اس کے اگر کوئی شاعر معاملات خارجیہ و ذہنیہ کے تقاضوں سے انحراف کرے۔ یعنی تبعیت فطرت نہ کرے تو اس کی شاعری مذاق غیر صحیح کا نقشہ پیدا کرے گی۔ اسی اصول پر سخن فہموں کے مذاق کو بھی قیاس کرنا چاہیے اور حق یہ ہے کہ سخن فہم کو معاملات خارجیہ اور امور ذہنیہ کی دانست اور ان کے تقاضوں کی اطلاع خود شاعر کے برابر یا شاعر سے بھی زیادہ درکار ہے۔ اگر زیادہ نہ ہو تو خود شاعر کے برابر تو ہو۔ کس واسطے کہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ فطرتی مضامین شاعر کو تبعیت فطرت کے قصد کے بغیر سبیل الہام تفویض ہوتے ہیں اور خود شاعر اپنے کلام کی خوبیوں سے شعر گوئی کے وقت آگاہ نہیں رہتا ہے بلکہ بہت سے ایسے مضامین اس کے قلم سے الہامی طور پر نکل آتے ہیں کہ سخن فہموں کو اس کی خوبیاں بعد فکر و غور کے درک میں آتی ہیں اور خود شاعر ان کے اطلاع سے تادم آخر محروم رہ جائے۔ پس ایسی صورت میں ضرور ہے کہ سخن فہم معاملات خارجیہ اور امور ذہنیہ کے نہایت وسیع اطلاع رکھے۔ ورنہ شعر فہمی میں عاجز رہے گا۔ اسی لیے ذی فہموں نے کہا ہے کہ شعر گوئی سے شعر فہمی مشکل ہے۔ یہ قول اگر تمام تر صحیح نہ مانا جائے، اس پر بھی کوئی شک نہیں ہے کہ شعر فہمی ایک دشوار امر ہے۔ کس واسطے بڑی مذاق صحیح کی ضرورت ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ شعر فہمی کا مذاق صحیح کسی کو نہیں حاصل ہو سکتا ہے۔ جب تک کہ معاملات خارجیہ اور امور ذہنیہ کی دانست اور ان کے تقاضوں سے آگہی بدرجہ اتم حاصل نہ ہو۔ جب تک انسان بے حد امکان اس کی واقفیت پیدا نہ کر لے۔ زہنہار دعویٰ سخن فہمی نہ کرے۔ کیا تعجب کی بات ہے کہ بعض اشخاص جو عالم مادی اور عالم ذہنی کا فرق تک نہیں سمجھتے ہیں۔ شعر کی نسبت رائے زنی کے لیے مستعد ہو جاتے ہیں اور بے محابہ جو کچھ منہ میں آ جاتا ہے فرما جاتے ہیں۔ ایسے حضرات سے جب چاہیے سن لیجیے کہ فلاں شاعر نے خوب غزلیں لکھی ہیں۔ فلاں شاعر نے خوب قصیدے لکھے ہیں۔ فلاں شاعر نے خوب مثنویاں کہی ہیں۔ حالانکہ یہ بھی ان حضرات کو نہیں معلوم کہ غزل کو کس قسم کے مضامین سے تعلق ہے اور قصیدے اور مثنویوں کے لیے کن اقسام کے مضامین درکار ہیں۔ یعنی انھیں اس کی کوئی خبر نہیں کہ غزل و قصیدہ و مثنوی کے لیے معاملات خارجیہ یا امور ذہنیہ کے متعلق مضامین درکار ہیں یا دونوں کے مضامین کی آمیزش کی حاجت ہے پس جب کسی شخص کو

ان باتوں کی تمیز نہ ہوگی تو وہ فطرتی اور غیر فطرتی شاعری کے پہلو کیا سمجھے گا پھر ایسے شخص سے سخن فہمی اور شاعروں کی قدر دانی کی کیا امید کی جاسکتی ہے۔ سخن فہم کو فطرت اللہ سے وفور اطلاع کی بڑی حاجت ہے۔ ایسے شخص کی اطلاع کو بہت وسیع ہونا چاہیے ضرور ہے کہ ایسا شخص معاملات خارجیہ اور امور ذہنیہ سے پوری واقفیت رکھتے اور واقفیت اس کی مصلانہ طور کی ہو مصلانہ سے مراد حکیمانہ ہے یعنی یہ نہیں کہ عدم ترتیب کے ساتھ ہزاروں امور سے واقفیت رکھتا ہو مگر اس بے ترتیبی کے سبب سے اپنی دانست سے کوئی کام نہ لے سکے۔ مرد محصل کے خیالات سلسلہ وار اور منظم ہوتے ہیں اور فطرت اللہ کے سمجھنے کے لیے۔ اس ترتیب و انتظام کی بڑی ضرورت ہے۔ المختصر شعر فہمی حکیم کا کام ہے اور شعر کی نسبت رائے زنی آسان امر نہیں ہے۔ پس مناسب نہیں ہے کہ غیر محصل اشخاص رائے زنی کی تکلیف کو اپنے اوپر گوارا کریں۔

جیسا کہ سابق میں عرض ہوا کہ سخن فہم کو فطرت اللہ سے مصلانہ اطلاع درکار ہے۔ اس عدم اطلاع سے حضرات ناواقف عجب عجب طرح کے مغالطہ میں پڑتے ہیں بعض اشخاص معاملات فطرت سے ناواقف رہنے کے باعث مجرد شوکت لفظی کو شاعری سمجھنے لگتے ہیں اور اسی غلط خیالی میں ہمیشہ مبتلا رہ جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ مجرد شوکت لفظی کوئی شے نہیں ہے۔ شاعری زہار شوکت لفظی نہیں شاعری کا مدار خوش خیالی پر ہے کہ شوکت لفظی پر شاعری کی جان خوش خیالی ہے شوکت لفظی شاعری کا کوئی جزو بدن نہیں ہے۔ البتہ شوکت لفظی خلعت فاخرہ کا حکم رکھتی ہے اور تب ہی خوشنام معلوم ہوتی ہے کہ قطع برید سے درست ہے اور جس مضمون کو پہنائیں وہ جامہ زیب بھی ہو ورنہ شعر سعدی صادق آئے گا ہے

گر بود بر عروس نازیباً بدین سایہ دہشتی و دیبا

اس میں شک نہیں کہ اگر موقع کی شوکت لفظی ہوتی ہے تو اس سے شاعری میں ایک دبدبہ پیدا ہوتا ہے۔ لیکن شوکت لفظی یہ فریگی کے ساتھ ہے یعنی فطرت اللہ کی تبعیت کے ساتھ نہیں ہے۔ تو ایسی شوکت لفظی شخص محصل کی آنکھ میں بدنام معلوم ہوگی۔ گو اس سے غیر محصل اور ناقص التعليم کا چکا چوند ملے جائے۔ اگر شوکت لفظی اس قسم کی ہوتی ہے کہ حکیم اس سے نافر اور جاہل اس کی طرف راغب ہوتا ہے۔ کتر شوکت لفظی ایسی دیکھی جاتی ہے کہ تبعیت فطرت کے ساتھ اس سے کسی مضمون عالی کی بندش ظہور میں آتی ہو۔ جاننا چاہیے کہ مسائل



محققہ اور امور فطرتی کبھی محتاج شوکت لفظی کے نہیں ہیں۔ وہی شعرا اس سے کام لیتے ہیں جو اپنے غیر فطری اقوال کو پر از شان و شکوہ دکھانا چاہتے ہیں۔ فطرت کا تقاضا سادگی ہے اور جب کلام تبعیت فطرت کے ساتھ ہوگا ضرور اس میں سادگی ہوگی۔ سہ  
 تکلف سے بری ہے حسن ذاتی قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے  
 ولمؤلفہ

حسن کے واسطے درکار نہیں آرایش ماہر و یان حسین کے لیے گہنا ہے گہن  
 شوکت لفظی کے مارے عوام ہی نہیں ہیں بعض خواص بھی اس کے مبتلا نظر آتے ہیں۔ ایسے  
 مصنفین بہت ہیں جنہوں نے شوکت لفظی کو اپنا شیوہ بنا لیا ہے۔ آئندہ اس کی تصریح  
 مثالوں کے ساتھ آتی ہے۔ اہل انصاف سے راقم کو تمام تر امید ہے کہ محض منصفانہ نگاہ سے  
 فقیر کے بیانات کو ملاحظہ فرمائیں گے اور بے لوثی تحریر کی داد دیں گے۔

المختصر جانا چاہیے کہ بے موقع شوکت لفظی نہایت نامطبوع امر ہے اور اس لیے قابل  
 حذر ہے۔ جب بے موقع اس کا استعمال ہوگا تو کچھ تقاضائے فطرت کے مطابق نہیں  
 ہوگا اور جب تبعیت فطرت کی باقی نہیں رہی تو حکیمانہ دماغ کو ایسے پر شکوہ غیر فطرتی  
 کلام سے حظ بھی حاصل نہ ہوگا۔ شوکت لفظی کی مثال مصوری کے پیرایہ میں یہ ہے کہ اگر کسی  
 مصور کو کہا جائے کہ تم ایک عربی گھوڑے کی تصویر کھینچ لاؤ اگر مصور صاحب مذاق صحیح  
 ہے یعنی مرد محصل ہے تو اپنی اطلاع کے مطابق جیسا کہ عربی گھوڑا ہوتا ہے ویسے ہی اس کا  
 تصویر کھینچ لائے گا۔ لیکن اگر بد مذاق ہے یا جان بوجھ کر فطرت اللہ سے عداوت رکھتا ہے تو  
 ترقی شان و شوکت کی نظر سے تصویر کشی میں جس قدر فطرت اللہ سے انحراف ممکن ہے انحراف  
 کرے گا۔ مثلاً گھوڑے کے بدن کو دھانی رنگ دے گا سم لعل کے۔ کان یا قوت کے۔ آنکھیں  
 نیلم کی۔ منہ فیروزہ کا، پیشانی پکھراج کی، دم مقیش کی بنادے گا۔ بلکہ اس پر قناعت نہیں  
 کر کے دو پر بھی جو اہر نگار لگا دے گا۔ گھوڑے کی ایسی تصویر عالم فطرت کو جیسی مکروہ ہوگی  
 محتاج بیان نہیں ہے۔ مگر غیر محصل شخص تو ایسے بوقلمونی الوان و مرصع کاری کو دیکھ کر  
 جان و دل سے محو و سہو ہو جائے گا۔ یہی حال نا تعلیم یافتہ آدمی کے ہر قسم کے مذاق کا  
 ہے۔ شخص غیر محصل لباس وہی اختیار کرتا ہے جو رنگارنگ اور زرد آلود ہو۔ گھوڑے،  
 ہاتھی، لڑکے، بالے، نوکر، چاکر سب کی آراستگی اسی نامطبوع ترکیب سے پسند کرتا ہے۔

مکان اسی مذاق کے ساتھ تعمیر کرتا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ جو کچھ کرتا ہے جاہلانہ شان و شکوہ کے ساتھ کرتا ہے۔ خیر راقم نے جو مصوری کے پیرایہ میں مثال بالا عرض کی اس میں چنداں مبالغہ کو دخل نہیں ہے۔ غیر محصل اشخاص کا مذاق ایسا ہی ناپسندیدہ انداز کا ہوتا ہے۔ جس کی واقعی مثال اس تصویر میں ملے گی جس کا بیان مصوری کی بحث میں آیا ہے۔ یعنی جہاں راقم نے ٹیپو سلطان کے باغ کی اس تصویر دیواری کا ذکر کیا ہے جس میں ہاتھی گلابی، گھوڑے سبز، زرد، آسمانی، دھانی رنگے ہوئے آج تک موجود ہیں۔ بہر حال یہ مثال تو مصوری کے پیرایہ میں تھی اگر شعرا ایشیا کے کلاموں میں ایسی مثال ڈھونڈیے تو بے شمار ملتی ہیں۔ واقعی شعرا نے ایشیا نے ملک و امرا کو عجب تماشے کا گھوڑا بنا رکھا ہے۔ اگر گھوڑے کو بلند دکھایا ہے تو اس کی بلندی کو آسمان سے بھی زیادہ رفیع دکھلایا ہے۔ چنانچہ ظہیر ناریابی نے اپنے ممدوح کے گھوڑے کو اس قدر بلند دکھایا ہے کہ عرش اللہ بھی اس سے کچھ نیچا نظر آتا ہے۔ فرماتے ہیں۔ شعر

نہ کرسی فلک نہ داندیشہ زیر پا      تابوسہ برکاب قزل ارسلان دہر  
اس شعر کی بے کی محتاج بیان نہیں ہے۔ مگر سعدی کی شاعری کا مذاق صحیح رکھتے تھے۔ نہایت تبصیر فطرت کے ساتھ فرماتے ہیں۔ شعر  
چہ حاجت کہ نہ کرسی آسمان      نہی زیر پائے قزل ارسلان

## رعایت لفظی

شوکت لفظی کے علاوہ عوام رعایت لفظی کو جان شاعری قیاس کرتے ہیں۔ حالانکہ رعایت لفظی بجائے خود کوئی شے نہیں ہے اور شاعری سے اس کو کوئی تعلق ضروری نہیں ہے اگر بے تکلف کسی شعر میں رعایت لفظی کی صورت پیدا ہو جائے تو ایسی رعایت لفظی خالی از لطف مقصور نہیں ہے۔ مگر بے تکلف رعایت لفظی کا التزام صرف ناپسندیدہ ہی نہیں بلکہ سچی شاعری کے بہت منافی ہے۔ بعض شعرا کو رعایت لفظی کا مرض ہوتا ہے اور غیر محصل اشخاص ان کے کلام کو مجرد رعایت لفظی کے خیال سے پسند کرتے ہیں۔ رعایت لفظی تب ہی لطف دیتی ہے یا خود یا الفاظ میں معنوی تعلق موجود ہو۔ ایسی صورت میں رعایت لفظی انتخاب الفاظ مناسب و مربوط کے اصول پر مبنی ہوتی ہے۔



## مبالغہ پردازی

مبالغہ بد مذاقیوں کے غیر فطری مبالغہ پردازی بھی ایک نہایت ناپسندیدہ امر ہے۔ اس کے مرتکب ایشیائی شعرا بہت دیکھے جاتے ہیں۔ ان شعرا کی اس بد مذاقی کا سبب بیشتر بادشاہان اور امرا ہوتے گئے ہیں۔ اقرب سلطان نے اکثر عالی دماغ اور عالی خیال شعرا کو بھی برباد کر ڈالا ہے۔ عوام مبالغہ پردازی کو عین شاعری سمجھتے ہیں حالانکہ فطرتی شاعری میں مبالغہ پردازی کی کوئی حاجت نہیں ہے۔

## صنائع و بدائع

سوائے ان لغویات کے غیر محصل اشخاص بہت سے صنائع بدائع کو ضروریات شاعری شمار کرتے ہیں۔ لیکن اہل مذاق سے پوشیدہ نہیں ہے کہ ایسے ایسے ڈھکوسلوں کو شاعری سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ انشا اللہ تعالیٰ ان امور کی تفریح مثالوں کے ساتھ آئندہ حوالہ قلم ہوگی۔

## پست خیالی

اس مقام پر ایک اور بھی بد مذاقی کا اعادہ ضروری معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ شعرا کبھی کبھی پست خیالی کو اپنے کلام میں جگہ دیتے ہیں۔ شاعری کے لیے پست خیالی سخت عیب ہے۔ بعض اسانڈے سے بھی ایسی غلطی سرزد ہوتی گئی ہے اور انھیں اسانڈہ کو دیکھ کر اس وقت کے بعض زندہ شعر گو بھی اسی عیب کو اختیار کرتے گئے ہیں۔ زندہ شعر گو یوں کے ایسے کلام کو تو مثلاً ہم اس غرض سے عرض نہیں کر سکتے کہ ان کے ایسے کلام کا اعادہ ان کی دل شکنی کا سبب ہوگا۔ مگر حقیقت حال یہ ہے کہ بعض زندہ شعر گو ایسے ہیں کہ فطرت کی رو سے پست خیال ہیں اور ان کی طبیعت ہمیشہ پستی کی طرف میلان رکھتی ہے۔ راقم ایسے حضرات کو شاعر کے معزز خطاب کے قابل نہیں سمجھ کر ان کو شاعری سے فسق کرنے کی نظر سے ان کو شعر گو کے لقب سے یاد کرتا ہے۔ ایسے حضرات بلا تامل زنان بازی کے مناقب لکھنے کے لیے تلے رہتے ہیں۔ اور خاص کر غزل سرائی میں انھیں فواحش

کو معشوق قرار دیتے ہیں اور کلام کی ترکیب ایسی بری رکھتے ہیں کہ جس سے معشوق بازاری سوا  
معشوق حقیقی مراد لیا جا ہی نہ سکے۔ اسی طرح جوش جوانی کا بیان اس بد مذاق کے ساتھ کھتے  
ہیں کہ جس سے دلی تنفر پیدا ہوتا ہے۔ کچھ شک نہیں کہ عہد جوانی بہت جوش انگیز وقت  
ہوتا ہے اور سوائے اولیا مادر زاد کے اکثر بشر کے دل میں کچھ نہ کچھ ناپاک خیال پیدا ہوتے  
ہیں اور تقاضائے بشریت سے ناجائز امور کی طرف طبیعت کو میلان بھی ہوتا ہے۔ مگر جوانی  
کے ایسے معاملات زہنہار اس قابل نہیں ہیں کہ شاعر ان کو بڑے ذوق و رغبت کے ساتھ شعروں  
میں باندھے۔ اور وہ شعرا نو پر ہاتھ مار مار کر پڑھے جائیں۔ کیوں نہ ہو جیسے کہنے والے خوبصورت  
ویسے پڑھنے والے خوبصورت انھیں شعروں کے کلاموں میں سراپا وغیرہ کے متعلق بھی ایسے  
مضامین دیکھے جاتے ہیں کہ جن سے طبیعت کو کراہت پیدا ہوتی ہے۔ بہر حال زندہ شعروں  
کے بد مذاق اشعار کے اعادہ کے عوض راقم مثلاً صرف دو معروف شعر دو بڑے شاعروں کے  
ذیل میں عرض کرتا ہے۔ شعر

نہ انگیا نہ کرتی ہے جانی تمھاری      نہیں پاس کوئی نشانی تمھاری  
یہ مطلع نواب سید محمد خاں زند کا ہے۔ زند عموماً نفیس گو شاعر ہے۔ اتنے بڑے شاعر  
کو ایسا شعر کہنا زیبا نہ تھا۔ اس شعر کا مذاق بہت پست ہے۔ شعر

چنال بردو آورد دو آورد و برد      کہ دایہ ز حسرت پس پرده مُرد  
فردوسی سے ایسی بد مذاق کا سرزد ہونا محض امر اتفاق ہے۔ مگر راقم کو تعجب ہے ان  
حضرات سے کہ جو اس شعر کو غایت بد مذاق کی وجہ سے بڑی واہ واہ کے ساتھ پڑھتے ہیں۔  
اہل مذاق صحیح سے پوشیدہ نہیں ہے کہ یہ شعر باوجود اس کے کہ اس کی زبان نہایت عمدہ  
ہے اور مضمون نیچرل طور پر بندھا بھی ہے مگر زہنہار اس قابل نہیں ہے کہ شاہنامہ ایسی  
با وقعت کتاب میں جگہ پا سکے

## مکر وہ مضامین

مکر وہ مضامین سے حتی الامکان اجتناب واجب بات سے ہے۔ مجرد نیچرل ہونے سے کوئی  
مضمون شاعر کے اختیار کرنے کے قابل نہیں ہوتا ہے۔ ہزاروں مضمون ایسے ہیں کہ جو نیچرل  
یعنی فطرتی ہیں۔ مگر اس سے ضرور نہیں کہ شاعر یا ناولسٹ ان کو حوالہ مقلّم کر ڈالے پسٹی خیالات



سے احراز پہلا کام شاعر اور ناولسٹ کا ہے۔ اردو کے ایک انوکھے ناولسٹ نے یہ سمجھ لیا ہے کہ جو مضمون نیچرل ہے عام اس سے کہ کیا ہی کمزور و بدقرینہ ہو اس کو اختیار کر لینا ناولسٹ کا کام ہے۔ چنانچہ وہ ناولسٹ نہایت بد مذاق کے ساتھ ایک عورت کے قضاے حاجت کے مضامین کو محض نیچرل امر سمجھ کر حوالہ قلم کرتا ہے۔ اس بد مذاق نے یہ نہ سمجھا کہ آداب تحریر کیا ہیں اور عورت کی مستوریت کے کیا کیا تقاضے ہیں۔ بلاشبہ جو مصنف با مذاق ہو گا عورت کو درکار مرد کی اس طرح کی ضروریات کا ذکر زبان قلم پر نہیں لائے گا۔ افسوس ہے کہ راقم کو ایسے ایسے مضامین کی طرف رسالہ میں رجوع لانا پڑا۔ مگر چونکہ اس سے اصلاح بد مذاق منظور تھا ناچار ایسے متفرخیزامروں کو حوالہ قلم کرنا گوارہ کیا۔

## بد مذاق جدید

سابق میں جو بد مذاقیوں کو حوالہ قلم ہوئیں بیشعراں میں اوپر سے چلی آتی ہیں اور امراض قد سے شمار کی جاسکتی ہیں۔ مگر اس زمانہ میں ایک نئی بیماری پیدا ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اکثر ادھورے انگریزی خوانوں کے دماغ میں اس خیال فاسد نے جگہ کر لی ہے کہ ساری خوبیاں یورپ پر ختم ہو گئی ہیں۔ ایشیاء کو خوبی کا کوئی حصہ ملا نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس زمانہ میں یورپ نے مادیات میں بڑی ترقی کی ہے یہاں تک کہ اکابر علمائے یورپ خدا سے بھی مستغنی نظر آتے ہیں۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے علوم مادیات کا یہی تقاضا ہے کہ انسان تدبیر اختیار کرے۔ چنانچہ یہ امر محقق ہے کہ انسان جس قدر مادیات میں ترقی کرتا جاتا ہے روحانیت سے دور پڑتا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ آخر کار خدا اور تمام روحانیت سے منکر ہو بیٹھتا ہے۔ خیر جو کچھ یورپ تدبیر کی حالت میں مبتلا ہو رہا ہے اس کی مادی ترقیوں سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ مگر اس سے یہ بات نہیں ثابت ہوتی ہے کہ اگر یورپ ساری خوبیوں سے معمور ہے تو ایشیاء تمام خوبیوں سے محروم ہے۔ قصور معاف اکثر ہمارے نئی روشنی والے حضرات کا تو ایسا ہی خیال معلوم ہوتا ہے۔ وہ ایشیائی خیالات اوضاع و معاملات کو یک قلم قابل نفرت سمجھتے ہیں۔ یورپ کے ہر امر پر عام اس سے کہ معقول ہو یا غیر معقول جان دینے دیتے ہیں اور اپنے اقوال و افعال سے عجب طرح کی نادیدگی ظاہر کرتے ہیں۔ جاوید بجا ہر قدم پر اہل یورپ کے متبع پرست رہتے ہیں معلوم ہوتا ہے۔ خذ ما صفا و دع ما کدر کا مضمون ان کے گوش مبارک تک

کبھی پہنچا ہی نہیں۔

ان حضرات کی دلدادگیاں معاملات یورپ کی نسبت اس درجہ کو پہنچ گئی ہیں کہ ایشیائی شاعری بھی ان کی نظر میں ذلیل و محقر معلوم ہوتی ہے۔ حالانکہ خود اہل یورپ اس کے مقرب ہیں کہ ابھی تک انہیں ایشیائی خیالات شاعرانہ سے آشنائی پیدا نہیں ہوئی ہے۔ اور بہت کچھ ان کو معلوم کرنا ہے۔ چنانچہ اس وقت تک جو کچھ ایشیائی شاعری سے اطلاع کی شکل پیدا ہوئی ہے وہ پایہ اعتبار نہیں رکھتی ہے۔ اس پر بھی جس قدر وہ مطلع ہو چکے ہیں اس حساب سے ایشیائی شاعری کی وقعت ان کے دلوں میں پیدا ہو چکی ہے حضرات ناظرین راقم کی اس تحریر سے یہ نہ سمجھیں کہ ایشیائی شاعری تمام معائب سے پاک ہے۔ اس پر بھی قابل نفرت نہیں ہے۔ مگر نئی روشنی والے حضرات نے اس کو تسلیم کر لیا ہے کہ جو معائب ہیں ایشیائی شاعری میں ہیں اور یورپین شاعری تمام معائب سے مبترا ہیں۔ میں آئندہ انشا اللہ تعالیٰ یورپین شاعری کی معائب بھی دکھلاؤں گا۔ جس سے معلوم ہو جائے گا کہ یورپین شاعری ایسی نہیں ہے کہ آنکھ بند کر کے شعرا یورپ کا متبع کیا کریں اس میں شک نہیں کہ فارسی اور اردو کی شاعریاں معائب رکھتی ہیں مگر ان معائب سے ایشیائی شاعر یاں ایسی ذلیل نہیں ہیں کہ کسی حکیم یا مرد تحصیل کے قابل توجہ نہ ہوں راقم جب ان نئی روشنی والوں کو یورپ کی شاعری کا ذکر کرتے سنتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے خیال میں یورپین شاعری تمام معائب سے پاک مقصور ہے اور ایشیائی شاعری اس کے برخلاف سراسر عیب ہی عیب ہے۔ بدانت راقم اس تنگ چشمی کا سبب نادیدگی ہے۔ یا یہ کہ یورپین شاعری بسبب ایک امجدیہ ہونے کے پُر لذت معلوم ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یورپین شاعری کی آگاہی سے ہم ایشیائیوں کی شاعری کو بہت کچھ فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ اسے نئے معنوں دستیاب ہو سکتے ہیں۔ مگر یہ فائدہ یورپین شاعری کو بھی ہماری ایشیائی شاعری سے پہنچ سکتا ہے۔ اس واسطے کہ بہت نازک خیالیاں ایشیائی شاعری میں ایسی ہیں کہ جن سے شعرائے یورپ کے دماغ کو بھی آشنائی پیدا نہیں ہوئی ہے۔ اس امر سے اعتراف خود اہل یورپ اور اہل امریکہ کو ہے۔ بہر حال اہل یورپ کو ایشیائی خیالات سے مناسبت پیدا کرنے کے لیے ضرور ہے کہ یا پوری طرح اردو فارسی، عربی سیکھیں۔ یا ان زبانوں کے شعرا کی تصانیف کو نہایت صحت کے ساتھ ترجمہ کراڈالیں۔ اسی طرح ہم لوگوں کو ترقی فن شاعری کے لیے دوامد درکار ہیں۔ ایک یہ کہ جو



معائب ایشیائی شاعری کے ہیں اُن سے متنبہ ہو کر ان کے ازالہ کی فکر کریں۔ دوم یہ کہ جو خوبیاں یورپین شاعری میں ہیں ان کو حسب ضرورت اپنی شاعری میں داخل کرنے کی صورتیں نکالیں۔ انشا اللہ تعالیٰ آگے ان دونوں امروں کا بیان اپنے محل پر آئے گا۔ لیکن یہاں ایک بات یورپین شاعری کی خوبی کی نسبت عرض کر دینا مناسب ہے یہ ایسی بات ہے کہ جس سے ہمارے ایشیائی شعرا مردم معلوم ہوتے ہیں۔ یعنی شعرائے یورپ اپنی تصانیف میں ہزاروں امور کو جو متعلق جغرافیہ اور تواریخ کے ہیں داخل کرتے ہیں۔ برخلاف اس کے ایشیائی شاعر ان امور سے خاص کر امور جغرافیہ سے نہایت نا بلد معلوم ہوتے ہیں۔ چند معمولی شہر و دریا کو وہ کا ذکر بھی جو کرتے ہیں تو آگاہی علم جغرافیہ سے ان کے ذکر کا تعلق نہیں معلوم ہوتا ہے۔ بلاشبہ جب ہمارے ملک کے طبیعت داروں کو اہل یورپ کا یہ مذاق صحیح معلوم ہو جائے گا تو حسب مراد تاریخ و جغرافیہ کی اطلاع کی صورت پیدا کریں گے۔ اور اس ذریعہ سے بہت نئے نئے مضامین ایشیائی شاعری میں داخل ہو جائیں گے۔

## شاعری ایک امر طبعی ہے

دائم ہو کہ شاعری ایک امر طبعی ہے اور جز و فطرت ہونے کے باعث کسی حال میں انسان سے منفک نہیں ہو سکتی۔ جیسے کہ تاریخ و وسائل سے انسان کے حالات کا پتا لگتا ہے۔ ہر ملک و ہر قوم و ہر وقت میں شاعری نثر یا نظم کے پیرایہ میں جلوہ گر رہی ہے۔ وحشی سے وحشی قوم پر لحاظ کیجیے تو کچھ نہ کچھ شاعری اُس قوم میں پائی جائے گی۔ اس قوم کی شاعری ہو میر و س، درجل، فردوسی، بابلی، میرانیس کے درجہ کی شایستگی اور بلند خیالی کے اعتبار سے نہ ہی کوئی قوم دنیا میں ایسی نہیں ہے کہ جس میں کچھ نہ کچھ گیت نہ گائے جاتے ہوں۔ یہی گیت قومی شاعری سے خبر دیتے ہوں۔ اگر انھیں وحشی اقوام کو تعلیم یافتگی نصیب ہو تو ان کے شعرا میں بھی ہو میر و س وغیرہ کی عالی خیالی پیدا ہو سکتی ہے۔ مختصر یہ کہ چونکہ شاعری داخل فطرت انسانی ہے جہاں انسان کا وجود پایا جاتا ہے وہاں شاعری بھی موجود رہتی ہے۔ گو وہ شاعری کسی درجہ ابتداء کی ہو اس سے شاعری کا ایک امر فطری ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اگر شاعری کی ذہنی تعلق پر غور کیجیے تو شاعری سے ایک قلبی کیفیت درک ہوتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعری تب ہی انسان سے منفک ہو سکتی ہے جب کہ خود قلب

معدوم و مفقود ہو جائے۔ البتہ مختلف انسانوں کو مختلف درجہ کی صلاحیت قلبی بخشی گئی ہے اور گو بہت سے انسان بظاہر شاعری سے بے لگا و معلوم ہوتے ہیں مگر کبھی ایسا نہیں ہے کہ قلب انسان کو دیا گیا ہو اور قلب واردات قلبیہ سے خالی ہو۔ جاننا چاہیے کہ یہی واردات قلبیہ شاعری کے تخم ہیں۔ عام اس سے کہ ان سے شاعری کا درخت اُگے یا نہ اُگے۔ فقیر کی دانست میں ہر صاحب واردات قلبیہ کچھ نہ کچھ شاعر ہے۔ گو اس نے کبھی ایک مصرعہ بھی نہ کہا ہو ایسا شخص اپنے لیے تو ضرور شاعر ہے گو اپنی شاعری کا اثر دوسرے تک بسبب موانع کے نہیں پہنچا سکتا ہے۔ فقیر شاعر نہیں ہے مگر اپنے واردات قلبیہ پر جو لحاظ کرتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ واردات قلبیہ ایک ایسا عالم رکھتی ہے جس کے گرد کو بھی عالم مادی نہیں پہنچ سکتا ہے۔ حقیقت واردات قلبیہ کا ایک ایسا عالم معلوم ہوتا ہے کہ تمام عالموں سے مستغنی ہے اور اگر اس عالم میں ترقیاں پیدا ہوں تو قلم پورا عالم اکبر کا عالم دکھلا سکتا ہے۔ یہاں پر یہ امر قابل ذکر ہے کہ قلب سے مراد وہ صنوبری شکل مضغہ گوشت نہیں ہے جو انسان کے سینہ کے اندر جانب چپ میں واقع ہے۔ قلب سے مراد وہ لطیفہ ربانیہ ہے کہ جس کو خدا نے اپنی جلوہ گاہ بنایا ہے اور جس سے متعلق روحانیت کو کر دیا ہے۔ پس جاننا چاہیے کہ شاعری اس لطیفہ ربانیہ کا جوش ہے۔ عام اس سے کہ اس کا اظہار نطق یا قلم سے ہو۔ یا واردات قلبیہ کی طرح دل ہی دل میں رہ جائے جب شاعری کو اتنا بڑا تعلق قلب سے ہے تو شاعری کے فطری ہونے میں کیا عذر ہو سکتا ہے۔

## اغراض شاعری

جب شاعری ایک امر فطرتی ہے تو اس سے اغراض انسانی کا کم و بیش طور پر تعلق رکھنا بھی بحالی از فطرت نہیں ہے۔ چنانچہ عند التفحص یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ شاعری اگلے زمانوں میں اپنا جلوہ دکھاتی رہی ہے اور آج بھی اس کی وہی رونق باقی ہے۔ اور تا بقائے نوع انسان اس کی رونق سابق کی طرح رہے گی۔ قدیم اہل مصر و اہل یونان و اہل روم و اہل ہند اور بھی بعثت آنحضرت صلعم سے پہلے کے عرب کے درمیان میں شاعری ایک قومی آلہ تمدن و مذہب سمجھی جاتی تھی۔ بعد بعثت کے بھی اس کا زور شور قائم رہا۔ گو انداز شاعری میں بہت فرق آتا گیا۔ اور اس کے اغراض کے پہلو بدلتے گئے۔ کتب تواریخ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی بادشاہوں نے شاعری کو بہت عزیز رکھا ہے۔ گو ان کی توجہ سے



مصورانِ یورپ فنِ مصوری کو خوب جانتے ہیں اور ان کی مصفوں کو ان کے ملک کے لوگ بھی خوب سمجھتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ جس درجہ کی تعلیم یافتگی یورپ کے مصورین رکھتے ہیں ان کے ملک والے بھی اسی درجہ کی تعلیم یافتگی رکھتے ہیں۔ اہل ہند کو مصوری کا مذاق بہت کم ہے۔ اور جن لوگوں کو ہے بھی تو انہیں اہل یورپ کی بدولت ہے۔ ایک وقت میں دہلی کے مصور مشہور دیار و امصار تھے اور اب بھی مصور پیشہ لوگ دہلی میں موجود ہیں۔ فوٹو گرافی کے رواج پکڑنے کے پہلے دہلی کے مصوروں کو اعتباری دوا یون یعنی پرسپیکٹو کی تمیز مطلق نہ تھی۔ عہدِ ظفر شاہ تک کی تصویریں جو فیرنے دیکھی ہیں ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مصورانِ دہلی کو پرسپیکٹو کے قاعدے کچھ نہیں معلوم تھے مثلاً اگر کوئی تصویر ایسی ہے جس کا منشا یہ ہے کہ بادشاہ تخت پر بیٹھے ہوئے ہیں اور اراکینِ دولت چپ و راست کھڑے ہیں۔ اور تخت کے پشت کی جانب یعنی بیک گراؤنڈ BACK GROUND میں کوئی عمارت اور باغ ہے۔ تو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ تخت کا پایہ ہوا میں معلق ہے یا کسی رکنِ دولت کے سر پر قرار ہے۔ عمارت کا فیلیپا یہ قریب ہے۔ یا باغ کا سرد در ہے۔ مختصر یہ کہ تمام تصویریں پرسپیکٹو کا لحاظ ہی نہیں رکھا گیا ہے۔ نزدیک کی چیز اور دور کی چیز ایک یا سب چیزیں برابر فاصلہ پر نظر آتی ہیں۔ مگر جب سے فوٹو گراف نے رواج پکڑا اور مصورانِ دہلی فوٹو کی نقلیں اتارنے لگے تو ان کو پرسپیکٹو کی طرف ناچار توجہ کرنی پڑی۔ جس سبب سے اعتباری رویوں کا تصور میں لحاظ رکھنا آگیا۔ اب مصورانِ دہلی بلکہ تمام مصورانِ ہند جو فوٹو کی نقلیں اتارتے رہے ہیں فوٹو کی مدد سے اچھی تصویریں بسبیل نقالی کھینچتے ہیں اور ہندوستانی ولایتوں سے اس نقالی کے ذریعے خوب مستفیع ہوتے ہیں۔

## مصوری اور نقالی

واضح ہو کہ نقالی اور مصوری دو شے ہیں۔ مصور کو علوم مختلف سے بڑا بہرہ درکار ہے اور اُسے مشاہدۂ عالم نہایت وسعت اور محنت کے ساتھ حاصل رہنا چاہیے۔ علاوہ اس کے اسے بڑا ہی طباع، ذہین، اخلاق، مضمون معنی رس اور صاحبِ اجتہاد ہونے کی حاجت ہے۔ نقالی کے لیے مشق اور فہم معمولی کے سوا اور کوئی قابلیت نہیں درکار ہے۔ نقالی پر نقلِ راجہ عقل، کامضمون تمام تر صادق ہے۔ ایک ادنا فرق مصور اور نقال کے درمیان

نفسِ شاعری کو ضرر بھی بہت پہنچا گیا ہے۔

شاعری صرف شاہانِ اسلام میں ممتاز صورت نہیں رہی ہے۔ بلکہ عیسائی شاہانِ یورپ بھی اس کے قدردان رہے ہیں۔ یورپ اور ایشیا دونوں براعظم میں اس کی یکساں توفیر رہا کی ہے اور جو اس کی قوتِ سابق میں تھی آج تک باقی ہے۔ مؤلفہ جیسا تھا حسن یا رہا باقی ہے وہی اگلی بہار باقی ہے

## شاعری کا زور جیسا تھا اب بھی ہے

فرق صرف اس قدر ہے کہ اب شاعری کے عنوان بدل گئے ہیں۔ ورنہ نفسِ شاعری اپنے حال پر ہے اور اس سے برنگِ سابق تمدنی، اخلاقی اور مذہبی کام لیے جا رہے ہیں۔ عامیانہ خیال کا آدمی پوچھ سکتا ہے کہ اس انیسویں صدی میں تو نہ یورپ نہ ایشیا میں شاعری کو کسی قسم کا فروغ نظر آتا ہے۔ پھر شاعری کی سابق قوت سے اعتراف کیوں کر کیا جاسکتا ہے ظاہراً شخصِ نادانِ قاف کا اعتراض بہت بجا معلوم ہوتا ہے۔ واقعی اس وقت میں کہاں ہو میروس، ورجل، شیکسپیر، ملٹن، گوٹیا، فردوسی، سعدی، حافظ، کالیداس، بالیکی، وغیرہ کے ماثِل لوگ ہیں۔ جن سے شاعری کے فروغ کی صورت قیاس کی جاسکتی ہے۔ اس عہد میں ظاہراً شاعری کی رونق تو کہیں بھی دیکھی نہیں جاتی ہے۔ لیکن جب نفسِ شاعری کے فروغ پر لحاظ کیجیے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ شاعری انسان کی داخلِ فطرت ہونے کے باعث اسی قدر فروغ پر ہے جس قدر سابقِ ام کے وقت میں تھی۔ البتہ شاعری نے لباس بدل دیا ہے۔ ورنہ شاعری معزول نہیں ہو گئی ہے۔ انسان کا جو کام شاعری پہلے کرتی تھی اس صدی میں بھی کرتی ہے اور زمانہ آئندہ میں بھی کرتی رہے گی۔ گو اس کے پیرائے انقلاب پذیر ہوتے چلے جائیں گے

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش من آں اندازِ قدرامی شناسم

لے انگریزی کا مشہور شاعر اور قابلِ تذکرہ سائنس دان، پیدائش 1749ء اور وفات 1832ء اس کی ڈرامائی نظم فاؤسٹ بہت معروف ہے۔ ہاروے نے لکھا ہے کہ اس نے خواجہ حافظ کے متبع میں شاعری کی اور اپنے مجموعہ شاعری کا نام 'دیوان' رکھا۔ آکسفورڈ کینین ٹرانگلش لٹریچر صفحہ 339، 340۔



اس عہد میں البتہ ممتاز اقوام دنیا بہ لباس نظم شاعری سے کم کام لیتی ہے۔ مگر شاعری کو اتنے رنگوں سے برتتے ہیں کہ ائم سابقہ نے نہیں برتا ہے۔ شاعری فی زمانہ مختلف پیرایہ زبان و قلم میں برتی جاتی ہے اور مختلف فنون کے لباسوں میں درآ کر اپنی قوت دکھلاتی ہے۔ مختلف پیرایہ زبان و قلم کی مثال یہ ہے کہ عہد جدید کے فصحاء و بلغا کا اسپچیں عام اس سے کہ تمدنی یا اخلاقی یا مذہبی عنوان رکھتی ہوں وہ کام کرتی ہیں جسے قوی ترین شعرائے عہد سابق ہی نہیں کر سکے ہیں۔ برک BURKE اور شیرڈن SHERIDAN اور ان کے عہد سے آج تک کے فصحاء و بلغائے یورپ نے نطق کے وہ تماشے دکھلائے ہیں کہ مجرد جن کے خیال سے عقل دنگ نظر آتی ہے۔ ان فصحاء کے نطق نے سلطنتیں قائم کی ہیں اور سلطنتیں معدوم کی ہیں۔ ملکوں کو خوں ریزی سے بچایا ہے اور ملکوں کو خوں ریزی میں مبتلا کیا ہے۔ ظلم کی بنیادیں ڈالی ہیں اور ظلم کی بنیادیں کھودی ہیں۔ بادشاہوں کو تخت سے اٹھایا ہے اور تخت پر بٹھایا ہے۔ مختصر یہ کہ قوموں کو جس راہ پر چلایا ہے قومیں اس راہ پر چلی ہیں۔ کیا فصحاء و بلغا کے نطق شاعری سے خالی تھی۔ درحقیقت ان کے نطق میں عین شاعری تھی جو ان سے ایسے ایسے حیرت خیز اثر قوموں پر پیدا ہوتے گئے ہیں۔ اسی طرح نطق کے ذریعہ سے فرقہ اہل قانون عجیب و غریب تماشے دکھلاتا ہے۔ واقعی اس عہد کے بیرسٹران نامی ایک رنگ کے شعرا ہیں۔ ان کے کمال نطق کا اثر یہ ہوتا ہے کہ سامعین پر عالم حیرت طاری ہوتا ہے۔ بہت بار ایسا ہوا ہے کہ سامعین کو اشکباری کی نوبت پہنچی ہے اور بہت بار منہسی کو روکنا دشوار ہو گیا ہے غرض یہ ہے کہ جادوئی نطق سے ہنسا نالانا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ کوئی بے گناہ شخص مآخوذ جرم ہو کر عدالت کے سامنے لایا گیا ہے۔ اس کو اپنی بے گناہی کا پورا یقین ہے مگر جب اس کے خلاف میں بیرسٹر نے بحث شروع کی اور اس کی مجروریت کو دکھلانا شروع کیا تو بے چارہ مآخوذ باوجود جسم

لے ایڈمنڈیرک پیدائش ۱۷۲۹ء اور وفات ۱۷۹۷ء۔ متعدد کتابوں کا مصنف اور معروف

سیاست دان، اس کی شعبدہ بیانی کے سبھی قائل ہیں۔ د-۱

مے رچرڈ برنسل شیرڈن، پیدائش ۱۷۵۱ء اور وفات ۱۸۱۵ء، ڈرامہ نگار اور اداکار، اس کے

ڈرامے رائج اور اسکول فور اسکینڈل وغیرہ مشہور ہیں۔ د-۱

ہونے کے اپنے مخالف کی اسپچ کی نظر سے اپنے کو مجرم سمجھنے لگا ہے۔ چنانچہ وارن، میسٹنگنر WARREN  
 HASTINGS لکھتے ہیں کہ جس وقت میرے خلاف میں اسپچیں مجبور ممبران پارلیمنٹ ہونے لگیں  
 تو ہر چند میں بے گناہ تھا مگر مخالف کے زور و نطق کا اثر ہمارے دل پر پیدا ہوا کہ ہم اپنے کو مجرم سمجھنے  
 لگے۔ ایسی ایسی پرتاثر اسپچیں اگر شاعری نہیں ہیں تو کیا ہیں۔ علاوہ فرق اہل قانون کے عظیم  
 و مقررین جو طرح طرح کی تاثیریں سامعین کے دلوں پر پیدا کیا کرتے ہیں شاعری کی داد اگر  
 نہیں دیتے تو کیا کرتے ہیں۔ لسانی شاعریوں کے سوا مورخین و ناولسٹ جو کام کرتے ہیں  
 وہ عین شاعری نہیں ہے تو کیا ہے۔ مورخین تاریخ کے پردہ میں شاعری کے عجیب عجیب جلوے  
 دکھاتے ہیں۔ اور ناولسٹ نے تو درحقیقت نظم کی راہ شاعری کو چھوڑ کر نثر کی راہ شاعری کو اختیار  
 کیا ہے اور اپنی طباعی اور خلاقی سخن کی رو سے ان کی شاعرانہ نثر منظوم شاعری سے کسی  
 بات میں کم نہیں معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح اور بھی طرح طرح کی شاعرانہ نثر کی تحریر میں نثران  
 یورپ نے حوالہ قلم کی ہیں۔ جن کو منظوم شاعری کے ہم پہلو قیاس کرنا حتی پسندی ہے۔  
 مثلاً، ادیسن، میکالے، دکار لاپل وغیرہ کی نثر اعلا درجہ کی شاعری کے سوا اور کیا سمجھی جاسکتی  
 ہیں۔ علاوہ تقریری اور تحریری شاعری کے فنون کے وسائل سے شاعری سے کام لیے جا  
 رہے ہیں۔ مثلاً اس عہد میں مصوری بہت ترقی پزیر ہوئی اور موسیقی نے جو شاعری  
 کی صورتیں نکالی ہیں انہیں اعلا درجہ کی شاعری نہیں کہیں گے تو کیا کہیں گے۔ بالخصوص  
 یہ عامیہ خیال کہ اس عہد میں شاعری رخصت ہو گئی ہے بالکل غلط ہے۔ البتہ اس کی  
 منظوم شکل میں جو کچھ کسی لائق ہو گئی ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا ہے۔ لیکن  
 اس نے اور شکلوں میں جو زور پکڑا ہے اس سے شخص محصل انکار نہیں کر سکتا۔ درحقیقت  
 بڑی تنگ بینی ہے کہ انسان جب شاعری کو تصور کرے تو صرف منظوم پیرایہ میں تصور کرے  
 نفس امر کے لیے پیرایہ کیا شے ہے۔ ایک ہی شراب و قسم کے ظروف میں رکھی جاسکتی ہے  
 اس سے اس کی خمریت میں فرق نہیں آسکتا یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ جب تک شراب شیشہ  
 کے ظروف میں رہے گی شراب رہے گی اور جب سونے کے ظرف میں منتقل ہو جائے گی تو  
 شراب نہیں رہے گی۔ شراب ہر حیثیت سے اس وقت تک شراب ہے جب تک اس کی  
 ماہیت نہ بدل جائے۔



## اغراض انسان سے شاعری کا تعلق

شاعری کو اغراض انسانی سے بڑا تعلق ہے۔ ہر زمانہ میں شاعری انسان کے تمدنی، اخلاقی اور مذہبی معاملات میں تاثر رساں اور بکار آمد ہوتی رہی ہے۔ تمدنی معاملات پر شاعری کے کیا کیا اثر پیدا ہوتے رہے ہیں اس کی مثالیں مستند کتب تاریخ یونان و روم، عرب وغیرہ میں موجود ہیں۔ زمانہ جدید بھی اس کے اثر سے خالی نہیں ہے۔ یورپ قدیم اور جدید کی شاعری تو زیادہ تمدنی ہے یا ایسی ہے کہ زیادہ تر تمدن سے تعلق رکھتی ہے۔ یہی انداز عرب میں بعثت آنحضرت صلعم کے قبل کی شاعری کا معلوم ہوتا ہے کہ تقاضائے ملک کے مطابق تمدنی مذاق سے خالی نہیں ہے اگر نام بنام یورپ قدیم و جدید اور بھی عرب قدیم کے شعرا کے تمدنی خیالات لکھے جاویں تو دس جلدیں بھی ان کے بیان کو مکنتی نہیں ہو سکتی ہیں۔ بہر حال اہل واقفیت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ انسان کے معاملات تمدن میں شاعری کو دخل رہا ہے اور انسان کے تمدنی اغراض شاعری سے کم و بیش طور پر ہر عہد میں متعلق رہے ہیں۔

## معاملات اخلاقی

اخلاقی معاملات انسان سے شاعری کو کیا تعلق ہے اس کے لیے اس قدر عرض کر دینا کافی ہے کہ جتنے معاملات اخلاقی ہیں شعرا قلم بند کر چکے ہیں۔ بدانت راقم شاعری سے کوئی قوی تر آلہ اخلاق آموزی کا دوسرا نہیں ہے۔ کیا امیر المومنین علیہ السلام اور سعدی کے اشعار سے کوئی زیادہ پر تاثر اخلاق آموزی کا آلہ نشان دیا جاسکتا ہے۔ کیا اخلاق کی معروف کتابیں یہ تاثری قوت رکھتی ہیں ہرگز نہیں۔ لاریب شاعری بہترین ذریعہ اخلاق آموزی کا ہے بغیر سچی شاعری کے انسان کے قوای اخلاقیہ ترقی نہیں کر سکتے۔ شاعری میں فلسفہ اخلاقی ہے۔ راقم اس وقت ایک ایسی جگہ کی روداد کو عرض کیا چاہتا ہے جس سے شاعری کا اعتلا درجہ پر اخلاق آموز ہونا ثابت ہوتا ہے۔ چالیس ہینتالیس برس کا عمر گزرا ہو گا کہ کپتان ڈی۔ ال، ریچرڈ سن صاحب کلکتہ کے سرکاری کالج میں علم و ادب یعنی لٹریچر کا درس دیتے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ اس وقت کلکتہ میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے

خود شاعر بھی تھے اور شعرائے یورپ کی تصانیف سے غایت درجہ کی اطلاع رکھتے تھے۔ فقیر کے زمانہ سے بہت پہلے ان کا زمانہ گزرا ہے۔ لیکن فقیر نے ان کی اور جیم تالیف کو جس میں انھوں نے از وقت چاسر CHAUCER تمام شعرائے انگلستان کے کلاموں کو نہایت خوبصورتی اور مذاق کے ساتھ منتخب کیا ہے۔ اپنی زندگی کے مختلف حصوں میں چند بار معائنہ کیا ہے۔ کپتان مدوح کے درس یافتہ طلباء اب بہت کم رہ گئے ہیں۔ ان میں سے ایک صاحب نے جو ایک وقت میں فقیر کے پرائیوٹ ٹیوٹر یعنی ریخ کے معلم تھے اور اعلا درجہ کی مناسبت ادبیہ رکھتے تھے۔ شاعری کی قوت اخلاق آموزی کے تذکرہ میں اس جلسہ کی روداد جس کا ابھی اوپر حوالہ ہوا ہے یوں بیان کی ہے کہ کچھ متعصب عیسائیوں نے یہ اعتراض کیا تھا کہ شیکسپیر کے کلام مخرب اخلاق ہیں اس لیے اس کی پڑھائی سرکاری کالجوں سے اٹھادینا چاہیے جب یہ بات کپتان کے گوش گزار ہوئی تو کپتان صاحب نے فرمایا کہ میری دانست میں اگر ایک پلے PLAY شیکسپیر کا طلباء کو اچھی طرح پڑھایا جائے اور اچھی طرح انھیں ذہن نشین ہو جائے تو ہزار واعظین کے مواعظ سے زیادہ اخلاق آموز ہے۔ خیر دو چار روز کے اندر ایک جلسہ انعقاد پایا اور بڑے بڑے حکام اور اہل علم اعتراض بالا کے حق و ناحق تجویز کرنے کے لیے کالج میں جمع ہوئے۔ کپتان صاحب نے فرمایا کہ ہم اس کتاب کی نیک آموزی میں کوئی بحث نہیں کریں گے۔ مگر ہم آپ حضرات کے سامنے ایک جماعت طلباء کو اس کتاب کے دو ایک ورق پڑھائیں گے میرے درس کے بعد آپ حضرات جو رائے قائم فرمائیں گے ہم اسی کی تبعیت کریں گے۔ چنانچہ باجارت صدر انجمن جو اس وقت کے صدر دیوانی عدالت کے چیف جسٹس تھے اور بڑے ذی علم اور محصل شخص تھے۔ کپتان صاحب نے درس دینا شروع کیا۔ ایک صفحہ کا نصف بھی نہیں پڑھایا تھا کہ چیف صاحب مع دیگر ممبران انجمن جیبوں سے رومال نکال کر آنکھوں سے آنسو پونچھنے لگے اور جب ضبط وقت نہ کر سکے تو میز پر سر ڈال کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے اس بدافانگی کو دیکھ کر کپتان صاحب طلباء سے فرمانے

لے جو فری جو سر پیدائش کی امکانی تاریخ 1345 ۶ اور وفات ۱4۰۰ ۶۔ اس کی نظم۔

کینٹبری ٹیلز بہت مشہور ہے۔



لگے کہ اب ہم درس موقوف کرتے ہیں عدالت عالیہ کے صدر اور ممبران جلسہ کی حالت قابل توجہ ہو رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی شورش کے بعد چیف جسٹس صاحب اور دیگر حضرات کو شیکسپیر کی پُر تاثیر اخلاق آموزی میں کیا گفتگو کی جگہ باقی رہی تھی۔ سب ممبران نے بالاتفاق اس اعتراض کو جو متعصبانہ اشخاص نے پیش کیا تھا محض بے معنی اور مہمل قرار دیا اور شیکسپیر کی پڑھائی اپنے حال پر قائم رہی۔ اس واقعہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ہر ملک و ہر قوم میں ملائے خشک موجود ہیں۔ سوائے ملائے خشک کے کس کو یہ سوچ سکتی ہے کہ شیکسپیر یا میر حسن کی ثنوی نہ پڑھائی جائے۔ ثنوی میر حسن کا ذکر انشا اللہ تعالیٰ آئندہ آتا ہے۔ جس سے اس کتاب کی ندرت اور عظمت ثابت ہوگی۔ خیر روداد بالاراقم کی چشم دید نہیں ہے۔ مگر شیکسپیر کیا کتاب ہے اس کی شہادت فقیر بھی کسی قدر دے سکتا ہے۔ اس عاجز شیکسپیر کے چند پلے اپنے کالج کے زمانہ میں ایسے ایسے استادوں سے جیسے مسٹر مکرنڈل۔ MR. MEANDLE مسٹر گریفتہ

MR. GRIFFITH تھے پڑھے ہیں۔ میں اپنی واردات قلبیہ سے سمجھ سکتا ہوں کہ شیکسپیر کے کلام کیا تاثیر رکھتے ہیں اور ان کو اخلاق آموزی میں کیا دخل ہے۔ واضح ہو کہ انسان کی طبیعت سے خستہ دفع کرنے کا وسیلہ شاعری سے بہتر کوئی دوسرا طریقہ نہیں ہے۔ شاعری مزاج انسان میں عجب ملاست پیدا کرتی ہے۔ جن کو شاعری کا مذاق صحیح اذروئے فطرت حاصل رہتا ہے اُن کی طبیعت تو یقیناً خستہ سے پاک واقع ہوا کرتی ہے۔ بلاشبہ شاعری خراط کا کام کرتی ہے۔ کندہ نائراش کو بھی تھیل چھال کر درست کر دیتی ہے۔ یہ بات عند التجربہ پایہ ثبوت کو پہنچی ہے کہ جن کو خلقت میں صفات خمیدہ بہ سبیل فطرت داخل ہیں بلاشبہ شاعری کا مذاق صحیح ان کی خلقی خوبیوں کو افزوں کر دیتا ہے اور جب ناہموار مزاجوں پر شاعری اپنا اثر کچھ نہ کچھ پیدا ہی کرتی ہے تو کیا تعجب ہے کہ اچھوں کو اس سے حسب مراد نتائج مترتب ہوں۔ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ سچی شاعری کا احاطہ بہت وسیع ہے۔ اس کے اندر اللہ و ماسوا اللہ کے متعلق جو مضامین ہیں گنجائش پاتے ہیں۔ پس جس فن کا احاطہ اس قدر وسیع ہو اور اس وسعت کے ساتھ پراز لطافت و نزہت بھی ہو تو ایسے فن سے کیوں کر تعلیم و تہذیب کی صورت نہیں پیدا ہو سکتی ہے۔ پس اس فن کو اخلاق آموز سمجھنا نہایت قرین از انصاف ہے اور اس حیثیت سے یہ فن ایک اہم غرض انسانی سے تعلق رکھتا ہے۔ جو حضرات شاعری کو اس نگاہ سے نہیں دیکھتے ہیں انھوں نے شاعری کی حقیقت کو نہیں سمجھا ہے اور لاریب بہت



ممد و خیال کے آدمی ہیں۔

انسان کے مذہبی اغراض سے شاعری کو کس قدر تعلق رہا ہے کتب تاریخ و سیر سے اس کی تحقیق دشوار نہیں ہے۔ علمی تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ قدیم سے مشرک و موحد اقوام دونوں مذہبی معاملات میں شاعری سے کام لیتی رہی ہیں۔ اہل یونان و اہل روم مشرک قومیں تھیں اور ان کے دیوتاؤں کی کوئی حد نہیں معلوم ہوتی ہے کوئی پہاڑ کوئی جنگل کوئی تجار کوئی دریا، کوئی پتھر کوئی درخت دیوتا سے خالی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ علاوہ ان کے بہت سے آسمانی اور ارضی دیوتا تھے ان میں کچھ مذکر کچھ مونث مانے جاتے تھے۔ ان دیوتاؤں کے محامد اور مناقب کے لیے شاعری استعمال میں لائی جاتی تھیں۔ اسی طرح قبل بعثت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل عرب بت پرست تھے اور بتوں کی پرستشوں میں شاعری سے کام لیتے تھے اور ان کے مناقب کو جلاجل وغیرہ پر گاتے تھے۔ جیسا کہ اس وقت ہنود اپنے دیوتاؤں کے بھجن جھانج وغیرہ پر گاتے بجاتے ہیں۔ ہنود جن کا سلسلہ شائیت کی یونانیوں سے بھی قدیم تر نظر آتا ہے۔ ساری مذہبی تعلیمات کو حوالہ شاعری کے ہوئے تھے اور آج تک بھی ان کی مذہبی کتابیں شاعرانہ پیرایہ میں دیکھی جاتی ہیں۔ چنانچہ ان کی مذہبی کتابیں رامائن، مہا بھارت جو معروف خاص و عام ہیں بہت اعلا درجہ کی شاعری سے خبر دیتی ہیں۔ علاوہ ان کے ہزاروں اشلوک ہیں جو محض مذہبی پیرایہ رکھتے ہیں اور مذہبی تعلیم کی نظر سے پڑھائے جاتے ہیں۔ اگر بت پرست اقوام میں شاعر، بادل داخل اس زور و شور کے ساتھ دیکھا جاتا ہے تو موجودہ قوموں کی مذہبی کتابیں بھی مذاق شاعری سے خالی نہیں نظر آتی ہیں۔ عتیق معینوں میں علی الخصوص زیور یعنی ادعیہ حضرت داؤد و حضرت سلیمان علیہ السلام بہترین نمونہ شاعری ہیں۔ صوف جدیدہ میں جس قدر اقوال حضرت مسیح علیہ السلام کے پائے جاتے ہیں کس قدر پاک مذاق شاعری کا رکھتے ہیں مثلاً آپ فرماتے ہیں کہ اگر تم کو کوئی ایک نکال میں طہا چا مارے تو تم دوسرا نکال بھی پیش کر دو۔ اس قدر یہ قول شاعرانہ ہے کہ آج تک ان کی کسی امت سے اس کی تعمیل نہ ہو سکی۔ بلکہ ان کی امت اس کے برخلاف انس بانس کے اصول کی پابند رہتی چلی آئی۔ لیکن اگر نفس قول پر لحاظ کیجیے تو سبحان اللہ کیا یہ قول ہے کہ جس سے بڑی نفس کشی کی تعلیم مراد ہے۔ میں بہت اس طرح کے پیارے اقوال اس جناب کے پیش کر سکتا ہوں مگر خوف تطویل کا مام سے قلم رکب لیتا ہوں اور اب میں بسبیل اختصار شاعری کے اسلامی تعلق کو عرض کیا چاہتا ہوں۔



یہ امر مسلم ہے کہ ہم مسلمانوں کے تمام امور تمدنی و مذہبی کا دار و مدار قرآن پر ہے اور یہ کتاب مقدس جس کو ہم مسلمان ام الکتاب کے لقب کے ساتھ یاد کرتے ہیں کچھ ایسی ہی مبرک اور بزرگ شے ہے کہ اس کا ذکر رسول خدا نے اپنی عزت پاک کے ساتھ اپنے آخر عہد حیات میں فرمایا۔ چنانچہ اس قول کے صحت کی حدیث انی تارک فیکم فی الثقلین کتاب اللہ ورتی ہے۔ اب جو ہم قرآن کو دیکھتے ہیں تو اس میں اس درجہ کی شاعری پاتے ہیں کہ لاعین دأت ولا اذن سمعت۔ کا مضمون پیش نظر ہو جاتا ہے۔ واقعی اس کی فصاحت و بلاغت اور لطافت شاعریہ کی انتہا نظر نہیں آتی ہے۔ کوئی تعجب نہیں کہ اس کی آیات نے شعرائے عرب کی شاعری کو بھلا دیا۔ اس کتاب خدا کے اجزا کچھ تورات موسویہ کی طرح احکامات پر مشتمل ہیں کچھ قصص سے اور کچھ وعدہ و وعید و عظمت تو حید و تمجید عبادات ادعیہ وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ احکامات بھی فصاحت و بلاغت سے جو ضروریات شاعری ہیں خالی نہیں ہیں۔ مثلاً خدا تعالیٰ حکم صادر فرماتا ہے کہ اگر کوئی شخص خون کرے تو قاتل مستحق قصاص ہے۔ اس قصاص کی ضرورت کو خدا کس شاعرانہ خوبصورتی کے ساتھ سمجھاتا ہے۔ بقولہ تعالیٰ۔ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا اُولِی الْاَلْبَابِ یعنی تم لوگوں کے واسطے قصاص میں زندگی ہے۔ اے سمجھ رکھنے والو! واقعی اس قول کی بلاغت کی کوئی حد نہیں معلوم ہوتی ہے لفظ تو تھوڑے ہیں مگر کس قدر معنی خیز ہیں۔ ظاہر ایہ معلوم ہوتا ہے کہ قصاص میں حیات کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ کس واسطے کہ جس شخص پر حکم قصاص جاری کیا جاتا ہے اس کی زندگی تمام ہو جاتی ہے۔ برعکس اس کے اگر قول تعالیٰ سے معلوم ہوتا ہے کہ قصاص ذریعہ حیات ہے۔ لیکن اگر غور سے دیکھیے تو واقعی قصاص میں حیات ہے۔ اول تو قصاص ذریعہ حیات اس شخص کے لیے ہے کہ جو جرم قتل کا مرتکب ہو یعنی اگر اس سے قصاص نہیں لیا جائے تو مقتول کا خون اس کی گردن پر رہ جائے گا اور بعد مردن جو عالم حیات ابدی کا پیش آنے والا ہے۔ وہ اس کے لیے بدتر از موت کی شکل پیدا کرے گا اور حقیقت پوچھیے تو حیات ابدی ہی حیات ہے اور جس حیات کو ہم لوگ حیات کہتے ہیں ایسی ہی حیات ہے کہ اس کے پیچھے موت لگی ہوئی ہے۔ دوم یہ کہ قاتل کے قصاص پانے سے اور بنی آدم کی حیات متصور ہے۔ اگر قاتل کو سزائے موت نہیں دی جائے تو امن کی صورت قائم نہیں رہ سکتی ہے۔ ہر انسان کی حیات معرض خطر میں در آ سکتی ہے کس واسطے کہ جب قاتل کو سزا پانے کا خوف نہیں رہا تو اگر اس نے



آج ایک آدمی کو مارا ہے تو کل دس کو مارے گا۔ پھر اس کو خوں ریزی میں مطلق العنان دیکھ کر اور اشخاص بھی خوں ریزی میں مبتلا ہونے لگیں گے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام معاملات تمدنی و اخلاقی و مذہبی برہم ہو جائیں گے۔ جس کے سبب سے بقائے نوع انسانی کی کوئی صورت قائم نہیں رہے گی۔ جو حصے قرآن مجید کے قصص سے متعلق ہیں ان کے بیان کی خوبی کی کوئی حد نظر نہیں آتی ہے۔ حضرت یوسف کا قصہ کس پتے مذاق شاعری کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ تورات میں بھی یہ قصہ موجود ہے۔ مگر وہی قصہ کس خوبصورتی جدت اور پلاغت کے ساتھ قرآن میں دہرایا گیا ہے۔ جامی کی کتاب منظوم معروف بہ یوسف دزلیغا گو ہزار شاعرانہ خوبیوں سے آراستہ ہے مگر قرآنی لطافتوں کی اس کو ہوا بھی نہیں لگی ہے۔ راقم کو اس رسالہ عجالہ میں اس سورہ کی شاعرانہ خوبیوں کے بیان کا موقع نہیں ہے۔ تحریر طولانی ہو جائے گی۔ اس واسطے ناچار قلم روک لیتا ہے۔ اسی طرح سورہ مریم کی بھی خوبیاں قابل ذکر تھیں مگر اسی خوف سے وہ بھی حوالہ قلم نہیں کی جاتی ہیں کہ۔ بالآخر اگر قرآن کے ان اجزا پر لحاظ کیجیے جو وعدہ وعید موعظت توحید تجید عبادات ادعیہ وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں تو یہ سب کے سب نہایت اعلا درجہ کی لطافت شاعرانہ سے خبر دیتے ہیں۔ چنانچہ جہاں خدائے تعالیٰ نیک کاروں کو جزائے خیر کی بشارت دیتا ہے تو نفہیم عوام کی عرض سے معاملات روحیہ کو حسیات کی شکل میں بڑی ندرت کے ساتھ بیان فرماتا ہے۔ اسی پر اس کے وعدوں کو بھی قیاس کرنا چاہیے کہ اسی پیرایہ میں مذکور ہوتے گئے ہیں۔ موعظت کے ایسے انداز ہیں کہ افصح واعظ بھی اس انداز کو نہیں اٹھا سکتا اور جو ان موعظت کے مضامین ہیں۔ اخلاق کے ایسے جید اصولوں پر مبنی ہیں کہ فلاسفر اخلاقی ان کے تبعیت سے فائدہ بے شمار حاصل کر سکتا ہے۔

## تعلیم توحید

توحید کی تعلیم تو وہ تعلیم ہے کہ پیر و محمد بانگ بلند سے ساکنان دنیا کو پکار کر کہہ سکتا ہے کہ اے اقوام مختلفہ آؤ اور ہم سے توحید کا سبق لو۔ اس انیسویں صدی کے موجدین جو اپنے توحیدی مذہب کے ایجاد پر فخر و مبامات کرتے ہیں درحقیقت خوشہ چیں اسلام کے ہیں۔ اس زمانہ کے دعوہ دعویداران توحید نے معاملہ توحید میں کوئی بات توحید قرآنی سے ایک خس کے برابر بھی زیادہ نہیں پیدا کی ہے۔ لا الہ الا اللہ۔ ایک ایسا قول زبردست



ہے کہ اس سے زیادہ کوئی دوسرا زبردست قول معاملہ توحید میں ہو نہیں سکتا۔ یہ دعویٰ لانا توحید کیا ایجاد توحید کریں گے بہت دعویٰ دارن توحید کے حالات مالی و ملکی سے فقیر کو ذاتی اطلاع ہے کہ خیر یہ کیا ہیں توحید موسوی تو توحید محمدی کے برابری نہیں کر سکتی۔ پھر اور کوئی مذہب و ملت کی توحید تو کیا توحید محمدی کو پہنچے گی۔ جن حضرات نے پانچوں صحیفے حضرت موسیٰ کے آنکھ کھول کر پڑھے ہیں اور قرآن کو بھی تامل کے ساتھ پڑھا ہے وہ توحید محمدی میں تمیز کر سکتے ہیں۔ راقم کو اس سے زیادہ یہاں لکھنے کا موقع نہیں ہے۔ بہر حال توحید کی تو یہ ندرت ہے۔

## تمجید باری تعالیٰ

اب تمجید باری تعالیٰ کے مضامین کو دیکھیے تو انصاف یہی کہتا ہے کہ قرآنی تمجید کی نظیر کسی کتاب دینی یا دنیوی میں نہیں ہے۔ کوئی شخص کسی تمجید کی ایک آیت بھی صحت سابقہ سے یا ایک مصرعہ بھی کسی شاعر کی تصنیف سے دکھلا دے جو قولہ تعالیٰ هو الله الذی لا اله الا هو الملک القدوس السلام المؤمن المہیمن العزیز الجبار المتکبر کا جواب ہو یا کسی کتاب میں آیۃ الکرسی کے برابر کوئی تمجیدی تحریر کا نشان دے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان آیتوں کے برابر توحیدی اور تمجیدی مضامین اس وقت تک کہیں دیکھے نہیں گئے اور تاقیامت نہیں دیکھے جائیں گے۔ عبادات کے مضامین بھی لطافت شاعرانہ سے خالی نہیں ہیں اور ادعیہ کے مخ عبادت ہیں۔ اس شاعرانہ پیرایہ کے ہیں کہ جن کے آگے تمام دنیا کی دعائیں بددعائیں معلوم ہوتی ہیں المختصر قرآن شریف تمام تر سچی شاعری کا نمونہ ہے اس کی شاعری کہیں داخل یعنی سبجیکٹو SUBJECTIVE اور کہیں خارجی ابجیکٹو OBJECTIVE اور کہیں دونوں قسم کی آمیزش کے ساتھ واقع ہوتے ہیں۔ عبارت کی رو سے قرآن شریف گو نظم نہیں ہے مگر سچے مذاق کی شاعری کے لیے جیسی عبارت چاہیے اس کا عبارت کامل ہے۔ یہی سبب ہے کہ عرب کے شعرا و فصحا و بلغا ترکیب عبارت سے الگ عاجز آئے اور عالی خیالی اور بلند پروازی سے الگ مغلوب ہے۔ ناچار بعضوں کو کہنا پڑا کہ قرآن کلام بشر نہیں ہے اور بعض اپنی شاعری کی بے حقیقتی کے معترف ہو کر حلقہ اسلام میں در آئے۔

## کلام حضرت امیر المومنین علیؑ

ظاہر ہے کہ جو کچھ اس ام الکتاب کے شاعرانہ مذاق کا ذکر بالا میں حوالہ تلم ہوا وہ واقعی بہت  
 قلیل اور مختصر طور پر ہوا ہے۔ بہر حال اب عترت رسول اللہ صلعم کے بعض حضرات کے مذاق  
 شاعری پر بہت غور درکار ہے۔ بلاشبہ بحیثیت و نور علم و فضل عترت رسول اللہ کے سردار  
 علیؑ ابن ابی طالب ہیں حضرت کے سچے مذاق شاعری کی تعریف ہو ہی نہیں سکتی۔ حضرت  
 کا دیوان حضرت کے شاعرانہ عالی مذاق کا گواہ ہے۔ سوا اس کے حضرت کے خطبات کس قدر  
 سچے مذاق شاعری سے خبر دیتے ہیں۔ سوائے ان خطبات کے جو نہج البلاغہ میں موجود ہیں۔  
 بہت سے خطبات آپ کے ایک کتاب میں مدون ہیں۔ جن سے ان جناب کی عالی درجہ  
 کی قوت شاعریہ عیاں ہے۔ روزانہ کے کلام حضرت کے کیا کم رتبہ شاعریہ رکھتے ہیں علاوہ  
 ان کے حضرت کی ادعیہ حضرت کے کمال درجہ کے توحیدی اور تجسیدی مذاق سے خبر دیتی  
 ہیں۔ منجملہ اور ادعیہ کے حضرت کے دعائے صبح کس قدر پر تاثیر مذاق شاعری کا نمونہ ہے۔  
 اس دعا کو پڑھ کر کون انسان ہے جس پر عالم وجد نہیں طاری ہو سکتا ہے۔ یہ دعا انسان  
 کو خدا کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیتی ہے۔ داعی کو صاف درک ہوتا ہے کہ مدعو کے حضور میں  
 حاضر ہے۔ اب اس سے بڑھ کر اور کیا توحیدی اور تجسیدی شاعری ہو سکتی۔ علاوہ اس جناب  
 کے دیگر حضرات خاندان پیغمبری بھی نہایت سچا مذاق شاعری رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ حضرت خاتون  
 جنتؑ چنانچہ وہ شعر حضرت کا جسے اپنے پدر بزرگوار کی رحلت میں مرثیہ کے طور پر فرمایا ہے۔  
 کس قدر سچے مذاق شاعری سے مملو ہے۔ وہ شعر کس قدر اعلا درجہ کی واردات قلبیہ سے  
 خبر دیتا ہے اور اس تعلق کو کس عمدگی سے دکھلاتا ہے۔ جو کسی بے حد پیاری بیٹی کو اپنے  
 بے حد پیارے باپ کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس شعر کی مرثیت حضرت آدم کے اس شعری مرثیت  
 سے بڑھی ہوتی ہے۔ جسے حضرت ابوالبشر نے بابل کے غم میں ارشاد فرمایا تھا۔ اس طرح  
 کے اشعار مرثیہ کا شمار اگر مذہبی شاعری میں کیا جائے تو خلاف عقل نہیں ہے کس واسطے کہ  
 جو کلام مذہبی سرداروں کے ہیں بہت مناسب ہے کہ مذہب سے متعلق سمجھے جائیں۔



## شاعرانہ ادعیہ صحیفہ کا

خیر اب ہم ان ادعیہ کا ذکر کرتے ہیں جو مندرج صحیفہ کاملہ ہیں۔ یہ کتاب زبور آل محمد ہے اور یہ دعائیں اما ابن اما ابن امام حضرت سجاد زین العابدین سے ہیں جن کو امام مدوح اور ان کے بعد کے ائمہ پڑھا کرتے تھے۔ اور آج تک فریقین کے غیر متعصب ارباب عبادت پڑھا کرتے ہیں۔ ان ادعیہ کی توحیدی اور تجیدی شاعری اس اعلا درجہ کی ہے کہ ان کے مضامین سے عجب تازگی اور سچا جوش عبادت پیدا ہوتا ہے۔ میرے اس قول کی گواہی وہی حضرات دے سکتے ہیں جو اس صحیفہ مقدس کو پڑھا کرتے ہیں۔ کیا دنیا میں ایسا کوئی مذہبی مزاج کا آدمی ہے کہ صحیفہ کاملہ کی دعاؤں کو بیٹھے اور متاثر نہ ہو۔ ان ادعیہ کو خلوص دل سے پڑھنے کے وقت صاف فرق داعی و مدعو، خالق و مخلوق، عابد و معبود کا قلب درک کرنے لگتا ہے۔ اس سے بڑھ کر کیا توحیدی و تجیدی شاعری ہو سکتی ہے۔ علاوہ ان ادعیہ کے ائمہ کے بہت سے منظوم و غیر منظوم ایسے کلام ہیں جو توحیدی اور تجیدی شاعری کے عیار ہیں۔ ان سرداران دین کے اقوال و کلام کے سوا شعرائے عرب و فارس کے بہت سے کلام ہیں۔ جو مذہبی شاعری کے عمدہ نمونے ہیں مثلاً قصیدہ بردہ، قصیدہ فرزدق، قصیدہ غلامہ مغربی، قصائد خاقانی، و سنائی، ثنوی مولانا روم ہفت بند کاشی وغیرہ علاوہ شعرائے اسلام کی کہ عیسائی شعرا میں بھی مذہبی شاعری کا رواج دیکھا جاسکتا ہے۔ انگلستان کے گرامی ترین شاعر یعنی ملٹن کے کلاموں کا زیادہ حصہ مذہبی پیرایہ رکھتا ہے۔ بلکہ جس تصنیف نے ملٹن کی شہرت شاعری کو منتہائے اوج کو پہنچایا تمام تر مذہبی پیرایہ رکھتے ہیں۔ یہ تصنیف ملٹن کی دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ایک حصہ میں حضرت آدم کے جنت کے کھونے کے احوال مندرج ہیں۔ دوسرے میں ان کو پھر جنت کے پانے کے احوال رقم ہوئے ہیں۔ ملٹن نے حصہ اول میں شیطان کو ان کے جنت کے کھونے کا سبب دکھلایا ہے اور حصہ ثانی میں حضرت مسیح کو ان کے پھر جنت کے پانے کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ المختصر راقم کی تحریر بالا سے حضرات ناظرین بامکین پر روشن ہوا ہوگا کہ شاعری کو مذہبی اغراض انسانی میں کس قدر دخل رہا ہے۔ ہر مذہب نے عام اس سے کہ انداز اس کا مشرکانہ یا ہودا ہو شاعری سے تعلق رکھا ہے اور ہر قوم عام اس سے کہ قدیم یا جدید ہو کچھ نہ کچھ شاعری

سے کام لیتی رہی ہے۔

## مختلف اقوام کی شاعری پر ریویو

یہ ظاہر ہے کہ اس رسالہ عجاہ میں طول و بسط کے ساتھ اقوام دنیا کی شاعری پر ریویو کو گنجائش نہیں دی جاسکتی ہے مگر چونکہ مرکز خاطر راقم یہ ہے کہ ایسے حضرات کو جن کو اپنی دیسی شاعری کے علاوہ کسی اور ملک کی شاعری کے انداز مذاق کو دریافت کرنے کا موقع نہیں ملا ہے فقیر کی تحریر سے کچھ اطلاع کی شکل پیدا ہو جائے۔ اس لیے بسبیل اختصار اقوام مختلف کی شاعری کے عنوان و انداز کو ذیل میں عرض کرتا ہے۔ اس اطلاع دہی سے اول عرض راقم یہ ہے کہ حضرات ناواقف پر نفس شاعری کی وسعت منکشف ہو جائے۔ دوم یہ ہے کہ ہماری دیسی شاعری کی حیثیت دریافت میں آئے۔

واضح ہو کہ مصر براعظم افریقہ کے ملکوں سے ایک مشہور ملک ہے ہمارے ایسے ناظرین جن کو ملائے طریقہ تعلیم کے سبب سے علم جغرافیہ کی تحصیل کا اتفاق نہیں ہوا ہے ان کی خدمت میں بہ نظر تفہیم مضمون براعظم گذارش یہ ہے کہ علم جغرافیہ کی رو سے دنیا کی تقسیم چند بڑے حصوں میں عمل میں آتی ہے۔ ان ہر حصہ کو براعظم کہتے ہیں اور اس کا لفظ مترادف زبان کاٹینیٹ CONTINENT ہے۔ یہ بڑے بڑے حصے پانچ ہیں۔ اولہ اور وہ براعظم ایشیا، براعظم یورپ، براعظم افریقہ، براعظم امریکہ اور براعظم اوشینا ہیں۔ ہر براعظم میں کئی ملک داخل ہوتے ہیں۔ جیسا کہ براعظم ایشیا میں، جاپان، چین، ملاکا، سیام، برہما، ہندوستان، تبت، تاتار چین، روس، کابل، فارس، عرب، عراق، عرب، ایشیائے کوچک داخل ہیں اور جو اقوام کے ان ملکوں میں رہتی ہیں انہیں ایشیائی کہتے ہیں۔ اس تقسیم کی رو سے ہم لوگ جو ہند کے رہنے والے ہیں ایشیائی ہوتے ہیں۔ اہل جاپان و چین و فارس و عرب وغیرہ کے برابر ہیں۔ اسی طرح براعظم یورپ میں چند ملک داخل ہیں۔ جسے ناروے، سویڈن، جرمنی، ڈنمارک، انگلستان، اسکاٹ لینڈ، آئر لینڈ، روس، پرتگال، سوئٹزر لینڈ، یونان و ترکی جسے اہل اسلام کہتے ہیں اور جس کا دارالسلطنت قسطنطنیہ ہے۔ براعظم افریقہ کے ملک بہت ہیں بخوف طوالت کلام صرف بعض درج کیے جاتے ہیں اور وہ بعض یہ ہیں کہ یعنی مصر، بربر، بارکا، ٹری پول، ٹیونس، الجزائر، فزان



مورا کو، حبش، کیپ وغیرہ، براعظم افریقہ شمال و جنوبی میں بھی اسی طرح ملک بہت ہیں۔ امریکہ شمالی سے ملکوں سے نیو فونڈ لینڈ، کنیڈا، مکر کو وغیرہ ہیں اور امریکہ جنوبی کے چلی، برازیل وغیرہ ہیں۔

جاننا چاہیے کہ جو اقوام جن ملکوں میں رہتی ہیں وہ علاوہ ان ناموں کے جو ان کے ملک کا ہے ان براعظم کے نام سے یاد کی جاتی ہیں۔ جن براعظم میں وہ ملک واقع ہوتے ہیں مثلاً جو لوگ کابل میں وطن رکھتے ہیں کابل اور شام میں وطن رکھتے ہیں شامی اور جو چین میں وطن رکھتے ہیں چینی کہلاتے ہیں تو علاوہ ملکی ناموں کے یہ اقوام ایشیائی بھی کہلاتی ہیں۔ اس سبب سے یہ ملک سب براعظم ایشیا میں واقع ہیں۔ اسی طرح جو اقوام مختلف بلاد یورپ میں رہتی ہیں۔ ملکی نام کے علاوہ یورپین کہلاتی ہیں۔ چنانچہ جرمن، انگریز، فرانسیسی، اسپینی، پرتگالی، روسی وغیرہ پر یکساں لفظ یورپین دلالت کرتا ہے۔ یوروپین بزبان انگریزی اہل یورپ کو کہتے ہیں اور اس کا اطلاق تمام ملک ہائے یورپ کے سکنا پر یکساں طور سے ہوتا ہے۔ اسی طرح ملک ہائے افریقہ کے رہنے والے افریقی کہلاتے ہیں۔ عام اس سے کہ کوئی قوم مضر میں رہتی ہو یا حبش یا بربر میں یا الجزائر میں اسی طرح ملک ہائے امریکہ شمالی و جنوبی کے ملکوں کے رہنے والے امریکن یعنی امریکہ کہلاتے ہیں۔ ان امور متعلق جغرافیہ کو ذہن نشین کرنے سے حضرات ناواقف کو فائدہ یہ ہوگا کہ جن ملکوں کی شاعری کا بیان اس کتاب میں آتا جائے گا ان حضرات کو معلوم ہوتا جائے گا کہ وہ ملک سب دنیا کے کس حصہ میں ہیں۔ بڑی غضب کی بات ہے کہ آدمی ملکوں کے سمت و جہات و عام حالات سے واقف نہ ہو اس وقت ملائی تعلیم کا تو یہی تقاضا معلوم ہوتا ہے کہ انسان دنیا کے ضروری معاملات برسی و بحری سے ناواقف رہے پرانے طریقہ تعلیم کے پابند حضرات سے فقیر کو کوئی ایسے صاحب نہ ملے جو دنیا کے ملکوں کے نام و سمت و جہت سے سرسری طور پر واقفیت رکھتے ہوں۔ گھر بیٹھے ہوئے جو کبھی چین و ماچین کا نام لیتے ہیں تو اس سے ان صاحب کو اس کی کبھی اطلاع نہیں ہے کہ ان کے دولت خانہ سے چین و ماچین کچھم واقع ہے یا یورپ۔ اتر واقع ہے یا دکھن، دس و تدریس میں ختا و ختن بول جاتے ہیں مگر موضوعی اطلاع کچھ نہیں رکھتے ان کے علم جغرافیہ میں صرف چند ملک و شہر ہیں جیسے تبت، تاتار، کابل، فارس، عراق



حضرات تو ملک و شہر میں فرق نہیں کرتے۔ غرض عجب طرح کی لاعلمی میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ اس پر اگر علم جغرافیہ کی ضرورت کو ایسے حضرات سے بیان کیجیے تو اس علم کو شاید کسی قسم کی عہد قیاس کر کے برہم ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ علم ایک وقت میں عین مسلمانوں کا علم تھا۔ ہائے شامت کہ اس وقت یہ علم صرف بے ضرورت ہی قیاس نہیں کیا جاتا ہے۔ بلکہ کوئی ایسا امر قبیح سمجھا جاتا ہے کہ جو پرانی تعلیم والوں کی برا فروختگی کا سبب ہوتا ہے۔ راقم زہن ہمارے مبالغہ پر دازی کے پیرایہ میں ان باتوں کو عرض نہیں کرتا ہے۔ فقیر پر یہ سانحہ گزر چکا ہے اور صرف ایک نہیں چند بار مجملہ ان الم خیز واقعات کے ایک واقعہ یہ ہے کہ ایک حضرت ارباب علم و فضل سے سکندر نامہ کا درس دے رہے تھے اور اسی طرح ہر روز کتب عربیہ و فارسیہ کا درس دیا کرتے تھے اور انہیں نہیں معلوم عمر بھر میں کئی بار سکندر نامہ وغیرہ درس دے چکے ہوں گے میں نے اس طالب علم سے جو اس وقت سکندر نامہ پڑھ رہا تھا پوچھا کہ سکندر کا وطن کہاں تھا وہ کچھ نہ بتا سکا پھر میں نے پوچھا کہ سکندر کی قومیت کیا تھی اس کا بھی کوئی جواب نہ ملا۔ پھر میں نے پوچھا کہ سکندر کے ظہور کو کتنا عرصہ ہوا ہوگا اس کا جواب بھی خاموشی کے سوا کچھ نہ تھا۔ معلوم ہوا کہ مدرس صاحب نے ان باتوں کی طرف توجہ کو مبذول نہیں فرمایا تھا۔ بے چارے طالب کا کوئی تصور نہ تھا۔ بعد ازاں جو مدرس صاحب سے بسبیل تذکرہ ان باتوں میں گفتگو پیش آئی تو معلوم ہوا کہ مدرس صاحب کے نزدیک علم جغرافیہ یا علم تاریخ کوئی شے نہیں ہے۔ واقعی سر پٹینے کی بات ہے جو ہمارے حضرات اہل علم کے ایسے خیالات ہو رہے ہیں۔ جائے غور ہے کہ اس زمانے کے یا ایسے ملایانہ خیالات ہیں یا ایک ایسا وقت مسلمانوں کا تھا کہ علاوہ اور علوم کے علم جغرافیہ اور علم تاریخ میں اہل اسلام اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔ اہل یورپ جو اس وقت ان علموں میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں مسلمانوں کے رستہ دکھاتے ہوئے ہیں۔ کیا تماشا ہے کہ یہ علم سب اغیار میں چلے گئے اور ہم سے صرف رخصت ہی نہیں ہو گئے بلکہ ہم کو اپنے سے نفرت بھی دلا گئے۔ تاکہ پھر ہم لوگ ان کے کبھی خواستگار نہ ہوں واضح ہو کہ اہل یورپ نے علم جغرافیہ اور علم تاریخ کو اس قدر ضروری سمجھا ہے کہ اپنی شاعری اور عام لٹریچر میں ان علموں کو اس طرح پر مخروج کیا ہے کہ اس وقت ان کا لٹریچر کیا نظم کیا نثر ایسا ہو رہا ہے کہ بے علم جغرافیہ و علم تاریخ کے کوئی شخص نہ ان کے لٹریچر کو بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ اور نہ ان کے لٹریچر سے کچھ حظ اٹھا سکتا ہے۔



ہر چند امور بالا کی تحریر کی حاجت اس کتاب میں نہ تھی مگر ملکی ضرورتوں کو لحاظ کر کے راقم نے مضامین بالا کو حوالہ القلم کرنا مناسب سمجھا۔ خیر اب جو امور ضروری بیان مصر سے متعلق ہیں اس کی طرف حضرات ناظرین توجہ فرمائیں۔ جیسا کہ بالا میں ذکر ہوا ملک مصر بر اعظم افریقہ میں واقع ہے۔ اہل یورپ اس ملک کو ایجیپٹ EGYPT کہتے ہیں۔ اس کی جانب شمال میں بحر مغرب یعنی میڈیٹرینین سی MEDITERRANEAN SEA اور خاکنائے سویر واقع ہے۔ شمال میں ملک نیوپیا واقع ہے اور مغرب میں صحرائے ہائے ریگستان جو ملک فزان تک چلے گئے ہیں۔ اس ملک کا عرض ۴۵۰ اور رقبہ ۱۱۰۰۰ میل ہے اس ملک میں صرف ایک دریا ہے جس کا نام نیل ہے۔ یہ بڑا دریا ہے اور بہت دور سے نکل کر مصر سے گذرتا ہوا بحر عرب میں گرا ہے۔ تخمیناً اس دریا کا طول ۱۵۰۰ میل۔ یہ دریا مصر کی زراعتی آبادی کا سبب ہوتا ہے۔ اگر یہ دریا نہ ہوتا تو مصر ایک غیر آباد ملک ہوتا۔ اس ملک میں پہاڑ بھی واقع ہیں۔ مگر بہت مرتفع نہیں ہیں۔ علاوہ پہاڑوں کے چند وسیع جھیلیں بھی ہیں۔ آب و ہوا اچھی ہے۔ مگر جوست غالب پائی جاتی ہے۔ جو اشخاص مبتلائے امراض بارہ ہوتے ہیں ان کے مزاج کے ساتھ یہ ملک موافقت کرتا ہے۔ اس کے بعض حصوں میں بارش کی فصل ۱۳ روز سے زیادہ نہیں ہوتی ہے بیشتر ہوائے گرم چلتی ہے۔ ریگستانی حصوں میں باد سموم بہت آزدہ ہوتی ہے۔ امراض و بانی بھی پیدا ہوتے ہیں اور اکثر اشخاص عوارض چشم میں مبتلا ہوتے ہیں۔ جانوران وحشی اس ملک کے ببر گفتار، گرگ، آہوناس، جاموس، گھوڑے، گدھے، مگر اور ہیپوپوٹیس ہیں۔ واضح ہو کہ ببر ایک شیر کی قسم ہے اور یہ وہی جانور سباعی ہے جسے انگریزی میں ٹائیگر TIGER کہتے ہیں اور یہ جانور ہمارے ملک ہندوستان میں کثیر الوجود ہیں۔ اہل ہند اسے سیلا یا سلوہا باگھ کہتے ہیں۔ اس کے جسم پر لابی لابی سیاہ دھاریاں ہوتی ہیں۔ یہ جانور نہایت قوی پنجہ عظیم الجثہ اور خونخوار ہوتا ہے۔ جو اشخاص علم حیوانات سے اطلاع نہیں رکھتے وہ ببر کو مترادف اس کا سمجھتے ہیں۔ اور ببر کو محل اسد میں استعمال کرتے ہیں۔ حالانکہ اسد ایک اور جانور سباعی ہے۔ جس کے سر اور گردن میں بڑے بڑے بال ہوتے ہیں اور جس کی کنیت ابوالحارث ہے۔ یہ جانور براعظم افریقہ میں پوری نشوونما پاتا ہے۔ گو اس کی خرد پیکر قسبیں ایران و گجرات و راجپوتانہ وغیرہ کی اطراف میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اسد کو افریقہ سے ویسی ہی خصوصیت ہے جیسا کہ ببر کو ہندوستان و برہما وغیرہ سے ان ملکوں کے سوا بر جہاں جہاں دیکھا جاتا ہے وہاں



خرد مقدار پایا جاتا ہے۔ ہیپوپوٹیمس ایک ایسا آبی جانور ہے کہ برو مجرد دونوں سے تعلق رکھتا ہے اور مثل گینڈے کے عظیم پیکر ہوتا ہے یہ بھی ایک خشین اور قوی جانور ہے اور اہل افریقہ اس کا گوشت رغبت کے ساتھ کھاتے ہیں۔ بطور اس ملک کے شتر مرغ، عقاب، باز، بط وغیرہ ہیں۔ ایک اور بھی چڑیا ہوتی ہے جسے اہل یورپ آئیس IBES کہتے ہیں۔ اس چڑیا کے طور کی ایک چڑیا ہندوستان میں بھی دیکھی جاتی ہے جسے شکاری منڈل کہتے ہیں۔ اس چڑیا کو قدیم معمر نہایت مقدس و متبرک سمجھتے تھے اور مذہبی حکم کے مطابق اس کی پرستش کرتے تھے۔ حشرات الارض اس ملک میں بہت اقسام کے پائے جاتے ہیں۔ منجملہ ان کی ایک قسم سانپ کی ہوتی ہے۔ جس کے سر پر چھوٹے چھوٹے دو سینگ ہوتے ہیں۔ اس سانپ کا زہر نہایت قاتل ہوتا ہے علاوہ اس کے ایک اور سانپ کنجہ دار ہوتا ہے۔ جس کو پنجا کہتے ہیں۔ یہ ہمارے ملک کے گھن سانپ سے مشابہت رکھتا ہے۔ اور نہایت زہریلا ہوتا ہے۔ مصر کی زراعتی پیداوار بھٹا، گیہوں، دھان، پیاز، ترہر، خیار، شکر، افون، تمباکو، پٹواروئی، اسی اور نیل ہیں۔ مصر کی زرخیزی کا دار و مدار دریائے نیل کے جوش پر ہے۔ جب فصل برشکال آتی ہے تو اس دریا کی ہر دو جانب کی اراضی پر کوسوں نئی مٹی کی سطح جم جاتی ہے جو زراعت کے حق میں کھاد کا کام کرتی ہے اور جس کے سبب سے پیداوار حسب مراد ظہور میں آتی ہے۔ اس ملک میں پھل بھی بہت قسم کے ہوتے ہیں۔ بستانی چیزیں بھی کثرت سے پیدا ہوتی ہیں۔ یہاں کے اثمار، نارنگی، کوئے، لیموں، انجیر، کھجور، بادام، کیلے اور بیر ہیں۔ نباتی چیزوں میں ایک شے ہوتی ہے جسے اہل یورپ پپرس PAPARUS کہتے ہیں۔ اس شے سے پہلے پہل کاغذ بنایا گیا تھا۔ انگریزی میں کاغذ کو پیپر PAPER کہتے ہیں۔ وجہ تسمیہ پیپر کی یہی ہے کہ اس نباتی شے سے شروع شروع بنایا گیا تھا۔ علاوہ اس کے اس ملک میں نیلوفر بھی اقسام طرح کا بکثرت پیدا ہوتا ہے۔ معدنی اشیا از قسم، سونا، چاندی وغیرہ نہیں پیدا ہوتی ہیں۔ مگر چند طرح کے پتھر جو عمارت سازی کے کام کے ہوتے ہیں کثیر الوجود ہیں۔ انھیں اقسام سنگ میں ایک سرخ رنگ کا پتھر دیکھا جاتا ہے جس سے احرام مصری بنائے گئے۔ جواہرات میں صرف زرد پایا جاتا ہے اور اس پتھر کی کانیں ان پہاڑوں میں دیکھی جاتی ہیں جو ساحل بحر احمر کے قرب میں واقع ہیں۔ اس ملک کی تجارتی اشیا دندان فیل، آبنوس، مشک، عنبر، شتر مرغ کے پر اور قہوہ ہیں۔ کتب سابقہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک وقت



میں مصر اور ہندوستان کے درمیان تجارتی کاروبار جاری تھا اور جناب مسیح علیہ السلام سے قبل اور بعد بھی مصری جہاز ہندوستان کو آتے جاتے تھے۔ مصر کی عمارات کہیں بھی قابل لحاظ ہیں۔ سب سے پہلے توجہ طلب وہاں کے احرام ہیں۔ یہ عمارتیں جو مربع شکل اور نہایت مرتفع ہیں اپنے دیکھنے والوں پر عجب حیرت پیدا کرتی ہیں۔ جوان میں سے ارفع ہیں وہ قریب پانچ سو فٹ کے بلند ہے۔ یہ عمارت تعمیر کردہ چیا پس CHEAPS کی ہے جو فراعین مصر سے ایک قوی بادشاہ تھا۔ اس کے عہد کو قریب چار ہزار برس کا زمانہ گزرا ہوگا۔ اتنے عرصے کے بعد بھی یہ عمارت ایسی معلوم ہوتی ہے کہ گویا آج بنی ہے۔ حرمان مصر کی تعمیر کی غرض یہ معلوم ہوتی ہے کہ اہل مصر قدیم کا یہ عقیدہ تھا کہ جب تک بعد مات لاش کی شکل قائم رہتی ہے تب تک روح بھی فنا پذیر نہیں ہوتی ہے۔ اس غرض سے مرنے کے بعد وہ اپنے مُردوں کی لاشوں میں ایسی دوائیں جو مانع بوسیدگی ہوتی ہیں داخل کرتے تھے اور ان لاشوں کو محفوظ جگہوں میں رکھتے تھے۔ فراعین مصر بھی جو اس عقیدہ کے شریک تھے غرض بالا سے احرام بناتے گئے تاکہ بعد مات ان کی لاشیں محفوظ رہیں۔ اسی خیال کی پابندی سے چند بادشاہوں نے یکے بعد دیگرے یہ عمارتیں جو درحقیقت ان کے مقابر ہیں تعمیر کیں۔ ان عمارتوں کو دیکھ کر یہ تعجب گزرتا ہے کہ ان کی تعمیر کیوں کر ظہور میں آئیں۔ کس واسطے کہ ان کی تعمیر میں اتنے بڑے بڑے پتھر ایسی ایسی بلندیوں پر چڑھائے گئے ہیں کہ جن کو دیکھ کر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس زمانہ کے مصریوں کو جرّ ثقیل کا اور کوئی علم معلوم تھا یا سبب ظاہر اس زمانہ کا علم جرّ ثقیل کسی طرح بکار آمد نہیں ہو سکتا ہے۔ خدا جانے کے وہ قوم کیسی تھی اور کیا کرتی تھی۔ علاوہ ان عمارات حیرت انگیز کے اس قوم کے معابد بھی موجود ہیں۔ جن کی عمارتیں ان احرام کے برابر مرتفع تو نہیں ہیں مگر منائی کا وہ تماشہ دکھلاتی ہیں کہ جو کسی اور ملک کی عمارات کہیں کو نصیب نہیں ہے۔ علاوہ ان احرام معابد کے ایک شہر جس کا نام تھیبس THE BUS تھا اب ویران پڑا ہوا ہے۔ دس میل کے اندر تک اس کی عمارتیں مبتلائے بد حالی نظر آتی ہیں۔ اس کے سینکڑوں سنگی پائے ہیں جن پر بڑے بڑے سنگی شہتیر دھرے ہوئے ہیں۔ ابھی تک کھڑے ہوئے ہیں۔ یہ پائے ایک ڈال کے ہیں اور ان کے طول و عرض و عمق کو دیکھ کر عقل دنگ ہوتی ہے کہ وہ کہاں سے آئے اور کیوں کر کھڑے کیے گئے۔ اندر سومیل کے تو کوئی پہاڑ بھی نہیں ہے۔ جہاں سے ان کا لایا جا یا قیاس کسا جائے۔ ان باتوں کو دیکھ کر مضمون قرآنی ذات العباد کا پیش نظر

ہو جاتا ہے اور عبرت مجسم آگے اکھڑی ہوتی ہے اے جبارین زمانہ ہوش میں آؤ تو دیکھو تو وہ کیسی امت تھی جس کے آثار اس امت کی گذشتہ قوت و حشمت کو کن حسرتوں کے ساتھ ثابت کر رہے ہیں۔ وہ امت کیا ہو گئی اور تم کیا ہو جاؤ گے۔ اس چند روزہ زندگی پر یہ بے اعتنائیاں اگر مرتے نہیں تو کیا نہیں کرتے۔ اے متاع دنیا کے خریدارو اگر دولت دنیا کی نے تمہارے دماغ میں خلل پیدا کیے ہیں تو اس شہر ذات العباد کے ویرانوں کی سیر کر آؤ۔ وہاں پہنچ کر تم کو معلوم ہو جائے گا کہ تم کیا ہو اور تمہاری حقیقت کیا ہے۔ تمہاری ثروت کیا حقیقت رکھتی ہے اور تمہاری جاہ و چشم و جاہ و چشم عنقریب کیا ہو جانے والے ہیں۔ ان حیرت انگیز ویرانوں کو دیکھ کر کیا کوئی دنیا پر ناز کر سکتا ہے۔ مصرعہ۔ کہ بسیار کس چوں تو پرورد و گشت۔

اس کا دوا می دہند ہے دنیا کیا اس کی ثروت کیا اور اس ثروت پر ناز کیا۔ انجہ دیر نپاید دبستگی را نشاید اگر تم کو خدا نے عروج دنیاوی بخشا ہے تو سر کو سجدہ شکر میں ڈالو احسان منعم حقیقی کو مانو تم کو گردن کسی کا کیا موقع ہے۔ تم نے خود کیا کیا ہے۔ کہ جس پر تم کو اس قدر ناز و تبخیر ہے اور بالغرض اگر یہ سب کیا تمہارا ہی ہے تمہارے اس آقا کا نہیں ہے جس نے تم کو معدوم سے موجود کر دیا ہے تو پھر تمہارا عرصہ زندگی ہی کیا ہے اور اگر زندگی دراز بھی ہے تو زندگی موجود میں کون بڑی خوبیاں ہیں کہ مرد حقیقت بین و عافیت اندیش کو محو سہو کر ڈالیں۔ مؤلفہ

سبب شور و شغف اہل جہاں کا کیا ہے	مرد و روزہ کو نا فہموں نے سمجھا کیا ہے
پوچھیے تارک دنیا سے برائی اس کی	کیا خبر طالب دنیا کو کہ دنیا کیا ہے
ہائے بن بن کے بگڑ جاتی ہیں شکلیں کیا کیا	مطلب اس عالم فانی کا خدایا کیا ہے
لذت ہستی اندازہ لذت معلوم	اور کچھ روز جنیں اس کی تمنا کیا ہے
دل گرفتہ نہونا سازی دنیا سے اثر	ہے غلام شہہ مردان تجھے پردا کیا ہے

### مصریان سابق کا لٹریچر

واضح ہو کہ ان قدیم مصریوں کے حالات اہل یورپ کی تحقیقات و تفتیشات سے کسی قدر معلوم ہو گئے ہیں۔ مگر ان مصریوں کے لٹریچر کی نسبت راقم کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم اپنے وقت میں بہت کچھ برسر ثروت تھی مگر اس قوم کا لٹریچر میں ممتاز شکل نہ تھا۔ جو نوشتے



ان کے عہد میں موجود ہیں ان میں اہل یونان و اہل روم کے لٹریچر کی خوبیاں نام کو پاؤں نہیں جاتی ہیں۔ ان مصریوں کے زوال کے بعد ملک مصر کیانی شاہان ایران کے زیر حکومت در آیا۔ پھر اہل یونان کو ہاتھ لگا۔ چنانچہ شہر اسکندریہ جو مصر کے شمالی جزیرہ میں واقع ہے سکندریہ یونانی کا یادگار ہے۔ یہ سکندر بادشاہ مقدونیا MACEDOINE کا تھا۔ اس نے تھوڑے ہی عرصہ میں جہاں کو زیر و زبر کر ڈالا۔ وفات سکندر کے بعد اس کے مفتوحہ اور مقبوضہ ممالک اس کے چار میر لشکروں پر تقسیم ہو گئے۔ ان چاروں میں ایک شخص بطلمیوس لیگس PTOLEMY LAGUS نامی تھا یہ شخص جو فیلقوس پدرا سکندر کے لطف سے تھا۔ پہلا یونانی بادشاہ مصر کا قرار پایا۔ پھر اس سے شاہی خاندان بطلمیوس مصر میں جاری ہوا۔ ان بطلمیوس میں ایک بادشاہ گزرا ہے کہ جس کا نام بطلمیوس کلازیوس PHILAMY OHAUDAS ہے یہ شخص بڑا عالم ریاضی تھا اور کتاب محبتی اسی کی تصانیف سے ہے۔ اس بادشاہ کا وہ نظام شمسی ہے جو نظام بطلمیوس کہلاتا ہے اور جس نظام کی پیروی ہمارے ہندی ملاقاتی ہیں اور جو کتابیں علم ہیئت کی ہندوستان میں پڑھائی جاتی ہیں۔ ان شاہان مصر کے زمانے میں مصر کا وہی لٹریچر تھا جو اہل یونان کا لٹریچر تھا۔ بعد یونانیوں کے اہل روم مالک مصر ہوئے۔ رومیوں کے وقت کا لٹریچر وہی تھا جو رومیوں کا لٹریچر تھا۔ پھر تھوڑے ہی روز ظہور اسلام کے بعد ملک مسلمانوں کے ہاتھ آگیا اور اس وقت بھی یہ ملک اہل اسلام کے متعلق ہے۔ بعد فتح اہل اسلام کے ملک میں اہل اسلام کا لٹریچر جاری ہوا اور اس وقت بھی اسلامی لٹریچر جاری ہے اور وہاں علوم و فنون کی تعلیم خوش اسلوبی کے ساتھ ہوتی ہے۔ بہر حال سب سے قدیم شایستگی کی رو سے اہل مصر تھے۔ ان کی قدامت کی شریک اگر کوئی قوم تھی تو ہندو سابق تھے جن کا تذکرہ انشا اللہ تعالیٰ آئندہ اپنے موقع پر کیا جائے گا۔ ہندو سابق کی شاعری سے محققین بخوبی اطلاع رکھتے ہیں۔ مشاہیر شعرائے ہند کے کلام بکثرت اس وقت موجود ہیں۔ ان کے نام اور ان کے حالات سے ہر تعلیم یافتہ شخص کو اطلاع ہے اور ان کی شاعری اس درجہ کمال کی ہے کہ آج تک شائستہ ترین اقوام دنیا ان سے حظ وافر اٹھاتی ہیں۔ مگر مصریان بعد العصر کی شاعری سے کسی کو حسب مراد اطلاع نہیں ہے۔ اس قوم کے کسی شاعر کا ذکر فقیر نے کسی کتاب میں نہیں دیکھا۔ مگر کتابوں کے دیکھنے سے یہ معلوم



ہوتا ہے کہ اس قوم میں نوشت و خواند کار و ادب کسی قدر تھا اور جو قدیم کتابیں اس قوم کے حال میں موجود ہیں۔ ان سے دریافت ہوتا ہے کہ مصریان سابق قصص و حکایات کا مذاق بہت رکھتے تھے۔ یہ قدیم کتابیں تین ہزار برس سے ادھر کی نہیں ہیں۔ بلکہ بعض اس قدر قدیم ہیں کہ جناب مسیح علیہ السلام کے بھی دو ہزار برس قبل لکھی گئی تھیں۔ مگر ان کتابوں سے اہل مصر سابق کا مذاق شاعری کچھ دریافت میں نہیں آتا ہے۔ اس قوم کے قصص و حکایات خاص رنگ کے ہیں۔ مگر اسی رنگ کے کہانی قفسے اور اقوام مابعد میں بھی دیکھے جاتے ہیں۔ جس سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ ان مابعد اقوام نے مصریان سابق سے انہیں لیے ہیں۔ بہر حال اس قوم کی شاعری کا کوئی معقول اندازہ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس واسطے کہ کوئی ایسی کتاب اس قوم کے عہد کی جو اس کے مذاق شاعری سے خبر دے سکے۔ اقوام جدیدہ تک نہیں پہنچی ہے۔ قیاس راقم ایسا ہے کہ یہ قوم بہت شاعر مزاج نہ تھی۔ اگر کاش ہوتی تو یونانیوں کی طرح کچھ نہ کچھ اپنی شاعری کی ممتاز یادگار چھوڑ جاتی اس عہد تک جو مصریان سابق کے شاعرانہ کلام پہنچے ہیں وہ بیشتر بھجن وغیرہ ہیں۔ جو اقوام مابعد کے مراتب شاعری کو نہیں پہنچتے ہیں۔ علاوہ ان کلام کے اہل مصر حیوانات کے قفسے نظم کیا کرتے تھے۔ یہ منظوم کہانیاں ہم سبھوں تک نامر لوط طور پر پہنچتی گئی ہیں۔ ان کہانیوں کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مابعد کے اقوام میں جو حیوانات کی کہانیاں مروج تھیں ان کا ماخذ وہی اہل مصر کی کہانیاں تھیں۔

## شاعری اہل یونان

### بیان ملک یونان

ملک یونان جسے اہل یورپ گریس GREECE کہتے ہیں۔ براعظم یورپ کے ملکوں سے ہے اس ملک کی جانب شمال یورپین ٹرکی EUROPEAN TURKEY یعنی ملک روم جس کا دارالسلطنت قسطنطنیہ ہے اور جانب مغرب میں بحر ایونیئن IONIAN SEA و جزائر ایونیئن اور جانب جنوب میں بحر مغرب یعنی میڈیٹیرینیئن سی MEDI TERRANEAN SEA اور جانب مشرق میں بحر ایجین AEGEAN SEA واقع ہیں۔ یہ ملک طول میں ۲۱۰ اور عرض میں ۱۶۰ میل ہے اور اس کا مجموعی ۱۵۰۰۰ میل ہے۔ مگر اس



مگر اس رقبہ میں یونانی جزائر بھی شامل ہیں۔ چنانچہ اس ملک کے ارد گرد سمندر بیشتر واقع ہے۔ یہ ملک جہاز رانی کی اغراض کے لیے بہت مناسب ہے۔ اس ملک میں بہت کچھ واقع ہیں اور افتاد اس جنگی اعتبارات سے ایسی ہے کہ غنیم کو اس ملک میں داخل ہونا دشوار تصور ہے۔ صرف راہ قلب اس ملک میں داخل ہونے کی ہے جس کا نام درہ تھریپیلی ہے۔ اس کا طول پانچ میل ہے اور جہاں یہ درہ تنگ ہے عرض میں صرف پچاس گز ہے اس درہ میں لیونیدس LEONIDAS بادشاہ یونانی نے تین سو جوان سے ایران کے مور و بلخ لشکر کو روک رکھا تھا۔ یہ واقعہ ۴۸۰ برس قبل حضرت مسیح علیہ السلام کے ظہور میں آیا تھا۔ اس ملک میں چند دریا اور جھیلیں بھی ہیں آب و ہوا اس ملک کی نہایت معتدل اور روح پرور ہے۔ الاچند ترائیوں کی جو کثرت رطوبت کے سبب سے بغایت بعد آب و ہوا ہیں اس ملک کے صحرائی جانور خرس، گرگ، شغال، اور آہو ہیں پُروردہ جانور گدھے، بکریاں اور بھیڑ ہیں۔ بار برداری کے جانور گدھے کے سوا کوئی نہیں ہے۔ دودھ، دہی، گھی، صرف بکری بھیڑ کے ذریعہ سے دستیاب ہوتے ہیں۔ جنگل کی کثرت ہے۔ یہاں کے ممتاز اشجار اوک، پابن، اخروٹ، چسٹ ہیں۔ پیداوار زراعتی بھٹا، روئی، ریشم، پشم اور تنباکو ہیں۔ ہر چند یونان ایک زراعتی ملک ہے مگر فی الحال اس کی زراعتی حالت اچھی نہیں ہے۔ عہد قدیم میں یہ شکل زراعت کی نہ تھی۔ کس واسطے کہ اس زمانہ کے زراعتی آثار جو تھسلی

THESSALY

اور مخد و نیا MACADAM میں پائے جاتے ہیں۔ ان سے اس عہد کا فروغ کاشت نمایاں ہے۔ اثمار یہاں کے انجیر، بادام، کھجور، کولے، لیموں و تر بوز ہیں۔ مگر ان سبھوں سے زیادہ زیتون کی کثرت دیکھی جاتی ہے۔ واضح ہو کہ ملک یونان، عہد قدیم میں چند حصوں پر منقسم تھا اور ہر حصہ کا ملکی انتظام علاحدہ تھا۔ پہلے ہر حصہ میں ایک بادشاہ حکمران رہتا تھا۔ مگر آخر میں تمام حصوں میں جمہوری سلطنتیں قائم ہوئی گئیں۔ الا مخد و نیا میں کہ جہاں شخصی سلطنت بحالت خود قائم رہ گئی۔ فیلقوس اسی مخد و نیا کا بادشاہ تھا اور اس کا بیٹا سکندر اعظم ایک بڑا نامی بادشاہ نکلا۔ جس نے اس وقت کی اکثر سلطنتوں کو زیر و زبر کر ڈالا۔ یہ وہی سکندر ہے جس کا ذکر شاہنامہ میں فردوسی اور سکندر نامہ میں نظامی کرتے ہیں۔ جاننا چاہیے کہ اہل یورپ کو اہل گریس یعنی اہل یونان کو مختلف ناموں



سے یاد کرتے ہیں۔ مثلاً کبھی اس کو اکینس ACHAEAN اور کبھی ارجینس ARGEANS ڈالویس DOLOPES ہیلینز HELLES آئی اولس IONS معلوم ہوتا ہے کہ اہل عرب میں اہل گریس آخر نام سے مشہور تھے۔ کس واسطے کہ آئی اولس اور یونانی میں بہت مشابہت ہے۔ اور حقیقت حال یہ ہے کہ یونان مغرب آئی اولیا IONS کا ہے۔ جو جزائر گریس سے ہے۔ ملک یونان ہر چند طول و عرض میں نہایت مختصر ہے مگر علم و فضل و عقل و ہنر و شجاعت وغیرہ میں شہرہ آفاق رہا ہے۔ یہاں کے لوگ ہر فن سے مناسبت رکھتے تھے طباعی ان پر ختم تھی۔ فلسفہ، منطق، طبابت، ریاضی وغیرہ نے اس ملک میں ظہور کیا۔ علاوہ ان علوم کے شاعری نے بھی یہاں ابتدا کی اور درجہ کمال کو پہنچی۔ اہل یونان کی نظم و نثر کو دیکھ کر صاف معلوم ہوتا ہے کہ اہل یونان اعلیٰ درجہ کا مذاق رکھتے تھے اور ان کے تتبع سے یورپ کی کوئی قوم خالی نہیں نظر آتی ہے۔ ایک عرصہ تک اہل یونان برسر ثروت رہے لیکن آخر کار اقبال نے ان سے منہ موڑا اور رومیان سابق ان پر غالب آئے اور ان کی سلطنتیں برباد ہو گئیں۔ ہر کمالے راز وال دنیا کا عروج ایسا ہی ہوتا ہے۔ لکن شئی اذا ماتم نقصان۔ بعد رومیوں کے ۱۷۱۸ء میں ترک عثمانی اس ملک کے مالک ہوئے۔ ان کے قبضہ سے بھی یہ ملک ۱۸۱۹ء میں نکل گیا اور یہاں ایک خود سر عیسائی سلطنت قائم ہوئی۔

## شاعری اہل یونان

اہل یونان کے عروج کا زمانہ اہل مصر کے بعد ہے۔ اس قوم کی شاعری صرف اپنے زمانہ میں پایہ عالی نہیں رکھتی تھی۔ بلکہ اس وقت بھی اس کا وہی رتبہ قائم ہے جو اپنے وقت میں تھا۔ واضح ہو کہ اہل یونان کی شاعری کو کسی طرح پر تتبع سے تعلق نہیں ہے۔ سرزمین یونان میں پیدا ہوئی اور اسی سرزمین میں نشو و نما پا کر نہایت سربرآوردہ ہوئی اور اس کا کمال اس درجہ کو پہنچا کہ اقوام مابعد کی شاعری کو اس سے برابر فائدہ پہنچا گیا۔ تتبع یا اعانت بیرونی سے شاعری کیونکر وجود میں آسکتی ہے۔ اس کی مثال اردو کی شاعری ہے شعرائے اردو ہر طرح کے خیالات کو فارس اور کبھی کسی قدر عرب کے شعرا سے اخذ کرتے گئے۔ اور آخر کار اردو کی شاعری تتبع کے ذریعے سے ایک موقر رتبہ کو پہنچ گئی۔



یہ کیفیت یونانی شاعری کی نہیں ہے شعرائے یونان کسی ملک کے شعرائے متبع نہ ہوئے نہ کسی ملک کی شاعری سے خیالات کی اعانت لی اور نہ کسی ملک کی شاعری کا مذاق اختیار کیا۔ اہل یونان فن شاعری کے خود موجد ہوئے اور اپنی طبیعت داری سے اس فن کو منتہائے کمال کو پہنچا دیا۔ یونانی شاعری کا کمال اسی سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ یورپ کے اقوام مابعد صد ہا سال یونانی شاعری کی تقلید کرتی چلی آئیں۔ شعرائے یونان کی رزمی شاعری SYRRES ان کی رزمی شاعری EPIC اور ان کے ڈرامے کو شعرائے مابعد برابر ہدایت نامہ سمجھتے رہے اور حقیقت یہ ہے کہ یورپ کی شاعری مابعد نے جو کچھ فروغ پایا ہے ان کے فروغ کی بنا یونانی شاعری پر واقع ہے۔ بعد یونانیوں کے رومیوں کا زمانہ آیا۔ رومیوں نے شعرائے یونان کا تمام تر متبع اختیار کیا۔ متاخرین شعرائے یورپ بھی اس متبع سے خالی نہیں ہوئے ہیں۔ چنانچہ ملٹن MILTON ایسا شاعر بھی اس متبع سے بری نہیں دکھائی دیتا ہے۔ ملٹن نے اپنی کتاب پیراڈائز لاسٹ کی ابتدا ہومیروس کی تقلید کے ساتھ کی ہے اور بہت جگہوں میں اس کی تصنیف کے اندر ہومیروس کے متبع کے آثار ہویدا ہیں۔ اب راقم ذیل میں شعرائے یونان کی بعض تصانیف کا ذکر کرتا ہے۔ جس سے کسی قدر اہل یونان کی شاعری کا اندازہ مقصور ہے۔

## ہومیروس

یونان کا قدیم ترین شاعر ہومیروس ہے اس کی دو تصنیفیں منظوم آج تک یونانی زبان میں موجود ہیں۔ ایک کا نام ایلید ILIAD اور دوسرے کا نام اڈیسی ODYSSEY ہے یہ دونوں کتابیں انگریزی زبان میں ترجمہ ہو گئی ہیں اور طرز یہ ہے کہ ایلید کو علم پروران بنگالہ نے بھی اپنی بنگالی زبان میں ترجمہ کر ڈالا ہے۔ کہاں ہوا اے اردو کے خیر خواہ کیا اردو کا لٹریچر ایسا ہی متا قیامت رہے گا۔ اپنی جواہری قوم کو دیکھو ستر اسی برس

لے ہومر کی اسی ایک میں ۲۴ کتابیں ہیں کہتے ہیں کہ تقسیم ARISTARCHUS نے کی ہے ایلید کو عنوان ILION سے اخذ ہے۔ ٹرائے کا دوسرا نام ایون تھا۔

لے اڈیسی میں بھی ۲۴ کتابیں ہیں اس کی تقسیم کے بارے میں بھی اسرار کس ہی کا نام لیا جاتا ہے۔

کے اندر اس نے اپنے لٹریچر کو ایک مخقر حالت سے موقر درجہ کو پہنچا دیا ہے۔ اس وقت کسی قسم کی شاعری نہیں ہے جو بنگلہ زبان میں نہیں ہے افسوس ہم پر کہ ہم جہاں تھے ابھی تک وہاں ہی ہیں۔ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھے ہیں۔ خیر ہومیروس کے کلام کی عمدگی اسی شخص کو کامل طور پر معلوم ہو سکتی ہے کہ جو اہل یونان کے مذہب، رواج، ملکی عادات قومی، طریقہ معاشرت، معاملات تمدنی و اخلاقی وغیرہ سے واقفیت رکھتا ہے۔ بغیر اس طرح کی واقفیت کے کوئی شخص کسی ملک کی شاعری کے حسن و قبح کو درک نہیں کر سکتا ہے۔ ہومیروس کے لطف کلام کو بیان کرنے کے قبل ضرور ہے کہ اہل یونان کے کچھ حالات اور ان کتاب کے قلمی حضرات ناواقف کے مطلع کرنے کی نظر سے بیان کیے جائیں۔

### بیان اہل یونان

واضح ہو کہ اہل یونان خلقت کی رو سے ذہین، مدبر، جری، جفاکش، علم دوست گویا، طباع اور صنائع تھے۔ جس طرح شاعری کا مذاق رکھتے تھے ویسی ہی مناسبت اور فنون سے انھیں حاصل تھی۔ فن بت تراشی اور بت سازی کی طرف ان کو خلعت میلان تھا اور موسیقی کا مذاق بھی خوب رکھتے تھے۔ رفتہ رفتہ اہل یونان نے حکمت و فلسفہ، طب و تمدن میں بھی بڑی شہرت پیدا کی۔ انتظام ملک خوب کرتے گئے۔ قوانین طرح طرح کے ترتیب دیے۔ سپہ داری بڑے قاعدے کے ساتھ کی لشکر آرائی میں یگانہ روزگار نکلتے۔ جہاز رانی میں اس وقت کے حساب سے دست گاہ حاصل کی۔ مخقر یہ کہ اہل یونان اپنے وقت کے شایستہ ترین لوگ تھے اور ان کے علم و قابلیت کے سامنے ان کے ہم عصر قومیں سوائے اہل ہند کے کچھ وقعت نہیں رکھتی تھیں۔ مذہب کی رو سے اہل یونان مشرک اور بت پرست تھے اور اس قدر خداؤں کے قائل تھے کہ ان کے دیوتاؤں کی فہرست طولانی ہے۔ علاوہ احرام فلکیہ کے طرح طرح کے مذکر اور مؤنث خداؤں کی پرستش کرتے تھے۔ ہر شجر جھاڑ پہاڑ دریا چشمہ کسی نہ کسی دیوتا کا محل قیاس کیا جاتا تھا۔ طرح طرح کی خیالی اشیا پوجی جاتی تھیں۔ طرح طرح کے خیالی جانور مانے جاتے تھے۔ طرح طرح کی پریاں دیوزاد عفاریت



داخل عقائد تھے۔ طرح طرح کے جادو کرشمے طلسم جزم و معتقدات تھے۔ دوزخ کا وجود تحت الشریٰ سمجھا جاتا تھا۔ بہشت کا مضمون گویا ندارد تھا۔ دیوتاؤں کی یہ کیفیت تھی کہ انسان کی طرح خواہش ہائے نفسانی رکھتے تھے۔ بعض مذکر خداؤں کو جو روئیں بھی تھیں۔ بعض تیر اندازی پر اوقات کرتے تھے۔ کبھی مذکر خدا عورتوں پر تصرف کر بیٹھتے تھے اور اس ہیوند سے اولاد بھی ہوتی تھی۔ کبھی مونث دیوتا کو نوجوان مرد حسین کا حمل بھی رہ جاتا تھا اور اس طرح کی مواصلت سے جو جنس لڑکے پیدا ہوتے تھے وہ آدھے دیوتا سمجھے جاتے تھے۔ غرض یہ کہ مذکر و مونث ہر دو طور کے خدا لوگ طبیعت داری سے خالی نہ تھے۔ خواہش نفسانی ان کی سرشت میں داخل تھی۔ بلکہ کبھی ان کی خواہش نفسانی کو اس قدر جوش ہوتا تھا کہ اگر کوئی عورت بھیڑ بکری چراتی ہوئی مل جاتی تو بالجبر بھی رنج ضرورت کر لیتے تھے۔ اہل یونان خود بھی نسوانی معاملات میں ایک خاص انداز رکھتے تھے گوان کی عورتیں عموماً صاحب عصمت ہوتی تھیں اور زنان کی قوم میں ایک امر نادر و سمجھا جاتا تھا مگر عورت کی نسبت ان کے خیالات اہل اسلام اور دیگر اہل کتاب کی طرح کے نہ تھے اس وقت میں کوئی شایستہ قوم اس دنیا میں نہیں ہے جس میں ایسا رواج ہو کہ جو در قرض دی جاتی ہو مگر تاریخ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وقت ضرورت اہل یونان ایسا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک بار بہت سے یونانی جوان کسی لڑائی پر گئے اور وہاں ان کو بہت غصہ تک رہنا پڑا۔ اس غیر حاضری کے نتیجہ کو خیال کر کے ان جوانوں نے بذریعہ پیغام سلام کے مناسب اشخاص کے ساتھ جو روں کا میعاد دی بند و بست کر ڈالا۔ علاوہ ایسے قبیح امور کے یونان کے بعض حصہ کے باشندے جو رو کو اس نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے جس نگاہ سے ان کے مابعد کے شایستہ قومیں دیکھتی چلی آتی ہیں۔ اہل یونان چوری کو کبھی جرم اسی وقت سمجھتے تھے کہ جب کسی کی چوری پکڑی جاتی تھی۔ لیکن کوئی ایسی چوری جو پکڑی نہ جائے وہ قابل تحسین و آفریں سمجھی جاتی تھی۔ اس قدر اہل یونان کے انداز قومی کو لکھ کر اب راقم پہلے ہو میروس کی ایلیڈ کے قصہ کو مختصر طور پر گزارش کرتا ہے اور بعد ازاں آڈیسی کے قصہ کو بھی اپنے موقع پر عرض کرے گا۔



## قصہ ایلید

واضح ہو کہ ایلید کا قصہ بیشتر ایسے مضامین سے تعلق رکھتا ہے جنہیں راقم نے بالا میں حوالہ قلم کیا ہے۔ اگر پورا قصہ تفصیل وار عرض کیا جائے تو بہت کچھ مضامین بالا سے مطابقت دیکھی جائے گی۔ مگر اس رسالہ عجلہ میں اتنی گنجائش کہاں کہ اس کے بیان کو اس قدر طوالت دی جائے۔ بہر حال ایلید کا مختصر قصہ یہ ہے کہ ٹرائے TROY کہ جس کا دوسرا نام ایلین ILLION بھی ہے ایک شہر تھا جو ایشیائے کوچک کے ساحل پر واقع تھا۔ اس شہر کا ایک بادشاہ تھا جسے پرائم PRIAM کہتے تھے۔ تخت و دولت کے سوا اس کے پچاس بیٹے بھی تھے۔ ان میں سے ایک شہزادہ جس کا نام پیرس تھا۔ اتفاق وقت سے یونان کے بادشاہ مینلس MENELAUS کا ہمان ہوا۔ اس بادشاہ کی ملکہ جوٹن HELLEN نامی تھی جس میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔ اس کے شوہر کے عقبیت میں پیرس اسے نکال کر اپنے باپ کے ملک میں لے گیا اور جب واپس دینے پر راضی نہ ہوا تو تمام اہل یونان نے یکدل ہو کر شہر ٹرائے پر لشکر کشی کی یونانیوں کے سیکڑوں جنگی جہاز ساحل ٹرائے پر آ لگے۔ محاصرہ شہر کے ساتھ ہنگامہ جہاں و قتال برپا ہوا۔ یہ شہر قلعہ بندی کے قاعدے سے نہایت مستحکم تھا۔ اس کی شہر پناہ نہایت مضبوط تھی اور سامان جنگ بھی افراط کے ساتھ فراہم تھا۔ علاوہ اس کے پرائم بادشاہ کا پسر اکبر جس کا نام ہکٹر HEETOR تھا۔ بہادری اور شجاعت کے ساتھ معاملات جنگ سے پوری خبر رکھتا تھا۔ جب لشکر یونان نے محاصرہ کیا اور لڑائیاں ہوتی گئیں تو اہل ٹرائے نے یونانیوں کو بار بار شکست دی۔ یونانیوں کے اس طور پر مغلوب ہونے کی اصل وجہ ہوئی کہ ان کا آئجے سردار اکیلزس ACHILLES رنجیدہ ہو کر چلا گیا تھا۔ اس سردار کی خلقت مجنس واقع ہوئی تھی۔ کیونکہ اس کا باپ کوئی دیوتا تھا اور ماں بنی آدم سے تھی۔ اس حیرت انگیز آمیزش کے علاوہ اسفندیار کی طرح وہ روئیں تن بھی تھا۔ تیر تیر کسی آلہ حرب کا اثر اس کے بدن پر نہیں ہوتا تھا۔ بہر حال اس کے ناراض ہو کر چلے جانے سے اہل یونان برابر شکستیں اٹھاتے رہے جس کے سبب سے انہیں بہت نقصانات جانی و مالی لاحق ہوتے گئے۔ مگر آخر کار جب اکیلزس واپس آیا تو اس نے لڑائی کے دھار کو پھیرا۔ اہل ٹرائے کے بہت سے سرداروں



کو مارا۔ ہکڑ بھی اسی کے ہاتھوں کشتہ ہوا۔ اکیلے نے اس کی لاش کو اپنی جنگی گاڑی سے باندھ کر میدان جنگ میں گھسیٹنا شروع کیا۔ مقتول کا بوڑھا باپ اپنے گرامی فرزند کی لاش کی بے حرمتی دیکھ کر اکیلے کے پاس آیا اور نہایت عاجزانہ طور پر اس سے پسری کی لاش مانگی۔ پر اتم لاش لے کر واپس گیا تو اہل ٹرائے نے بڑی توفیر کے ساتھ اس لاش کو دفن کیا۔ بعد ازاں اکیلے کو پیرس نے مارا۔ ہر چند اکیلے روئیں تن تھا مگر اس کی اینٹری میں کوئی مقام تھا جو عام بنی آدم کی ساخت رکھتا تھا۔ اس راز سے کوئی شخص واقف نہ تھا الا اینی پیرس جس نے اپنی اطلاع کی وجہ سے اس اسفندیار وقت کا کام تمام کیا۔ بہر حال یونانیوں نے دس برس تک اس شہر کا محاصرہ قائم رکھا۔ اور آخر کار اسے فتح کر کے خاک سیاہ کر ڈالا۔ ایلید میں اس پورے محاصرہ کا ذکر نہیں دیکھا جاتا ہے۔ لیکن ہومیر دس کے عنوان کے بیان سے اس لشکر کشی کے ماقبل اور مابعد کے بہت سے احوال نہایت خوبصورتی کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں۔ ہومیر دس نے اس قصہ کو شاعرانہ پیرایہ میں بہت طول دیا ہے۔ طرفین کے بڑے بڑے بہادروں کے نام درج کیے ہیں۔ اس ہنگامہ کے احوال نگاری میں دیوتاؤں کی مکلیں اور اعانتیں بھی بیان ہوتی گئی ہیں۔ طرح طرح کی بری اور بحری پٹریاں خیالی جانور اور طرح طرح کے غیر فطرتی معاملات اور بے سرو پا معتقدات کے مذکور آتے گئے ہیں۔ اگر سب امور کی تفصیل کی جائے تو ایک حجم کتاب تیار ہو جائے۔ بہر حال اب ہومیر دس کی قوت شاعری کو خیال کرنا چاہیے کہ اس شاعر نادر و زکار نے ایک مختصر تاریخی معاملہ کو کس طرح پر شاعری کے پیرایہ میں بیان کیا ہے اور اس بیان میں یونانیوں کے بیچ در پیچ معاملات و معتقدات وغیرہ کو کس کس استادی کے ساتھ پیش نظر کر دیا ہے۔ اگر اس قصہ کی وقعت پر نگاہ کیجیے تو برائے خود یہ ایک مہمل قصہ ہے۔ اس قصہ میں عظمت و بزرگی و شرافت و بجانب کا مادہ بہت کم ہے۔ نہ یونانیوں کی جانب کوئی بڑی جلالت کی بات دیکھی جاتی ہے۔ نہ اہل ٹرائے کی طرف کوئی امر قابل تعظیم پایا جاتا ہے۔ یہ قصہ ابتدا سے انتہا تک اخلاقی پیرایہ سے علاحدہ نظر آتا ہے۔ ابتدا اس کی ایک ایسے شخص کے نخل سے ہوتی ہے جس کی فطرت میں دغا بازی اور محسن کشی داخل تھی۔ اس شخص نے اپنے اس میزبان کے ناموس پر نظر ڈالی جو غایت تواضع اور مہمان نوازی کے ساتھ پیش آیا تھا اور جس نے تمام تر اپنے مہمان کی خوش اطواری پر تکیہ کیا تھا۔ یہ مہمان بدقولیت



تساہزادہ پیرس تھا جو مرتکب ایسی سخت دغا بازی کا ہوا۔ پھر اس عورت کے فعل پر لحاظ کیجیے جو اپنے ایک ممتاز اور عمدہ شوہر کو چھوڑ کر ایک مکار، بے آبرو، بدکار شخص کے ساتھ نکل گئی۔ یہ ملکہ ہیلن بادشاہ میناس کی جو ردھتی جس نے کچھ بھی اپنے بلند پایہ خوش خصال شوہر کی آبرو کا خیال نہ رکھا۔ بہر حال یہاں تک تو یہ قصہ دغا بازی، محسن کشی، مکاری، بے حیائی، بد فعلی سے خبر دیتا ہے۔ لیکن آئندہ بھی اسے دیکھیے تو بہت کم اخلاقی پیرایہ اس کو حاصل ہے۔ چنانچہ جب پیرس اپنے محسن کی جو رو کو نکال کر لے گیا تو اپنے باپ کے شہر میں لے گیا۔ باپ صاحب نے بھی یہ طرفہ کام کیا کہ ایسے محسن کش غاصب اور موذی کو اپنے سایہ عاطفت میں پناہ دی اور وہ نابکار عورت یعنی ہیلن ٹرائے کے شاہزادے اور شاہزادیوں میں ہم چشتی کے ساتھ رہنے پائی۔ پیرس کے بھائیوں نے اس عورت کے داخل خاندان ہونے میں کوئی عذر نہیں کیا۔ الغرض کسی کی نگاہ میں پیرس کی دغا بازی محسن کشی اور ہیلن کی مکاری، بد فعلی، قبیح نہیں معلوم ہوئی۔ پیرس کی اس حرکت پر یونانیوں کا باہم متفق ہو کر لشکر آرائی کرنا بہت بجا تھا۔ لیکن اس لشکر کشی سے صرف یہ مراد نہیں تھی کہ اہل ٹرائے اپنے حق کو پہنچیں۔ بلکہ یہ بھی مرکزِ خاطر تھا کہ وہ ناپاک عورت یعنی ہیلن اس کے شوہر میناس کو واپس لے۔ ظاہر ہے کہ ایسی بازیابی زوجہ کی ایک امر نہایت مقدوح ہے کوئی شریف مزاج آدمی اس طرح کی بے وفا بے آبرو عورت کو واپس لینے کا خیال بھی نہیں کر سکتا۔ لاجول ثم لاجول۔ خیر اہل یونان کی لشکر کشی پر اہل ٹرائے کا فرض منصبی یہ تھا کہ میناس کی مظلومیت پر خیال کر کے پیرس کو مع ہیلن یونانیوں کے حوالے کر دیتے۔ بالفرض اگر پیرس کو اہل یونان کے حوالے نہیں کرتے تو اسے نفی بلا ذکر ڈالتے اور ہیلن کو اس کے شوہر کو واپس دیتے۔ وہ جس طرح برتاؤ اس بے وفا اور غدارہ کے ساتھ پسند کرتا کر گزرتا۔ اس کے برخلاف اہل ٹرائے نے پیرس ایسے ظالم اور فاسق کا ساتھ دیا اور مقادمت کے لیے یونانیوں کے ساتھ جو پایہ حق پر تھے آمادہ جنگ ہوئے اور ناحق کا پلہ اختیار کر کے ایک مدت مدید تک خونِ خلافت بہاتے رہے اور آخر کار اپنے جان و مال سب کو تباہ کر چھوڑا۔ تماشہ ہے کہ اس ہنگامہ کے شریک طرفین کے دیوتا بھی ہوتے گئے۔ یہ دیوتا فریقین کے بہادر روں کو بہت دلاتے تھے اور بڑے جوش سے فریقین کو لڑاتے تھے جیسی قوم ہوتی ہے ویسا ہی اس قوم کے دیوتا بھی ہوتے ہیں۔ کیوں نہ ہو یہ دیوتا بھی جو کوئی مذکر اور کوئی مؤنث تھے۔ پیرس



اور بہن سے طبیعت داری میں کم نہ تھے۔ ان دیوتاؤں کے قصے دیدنی ہیں۔ چونکہ یہ دیوتا  
 آمیزش بنی آدم سے بندے بھی پیدا کرنا جانتے تھے ان کے جنے آدھے دیوتا مانے جاتے تھے  
 منجملہ ان سے مجنس افراد کے اکیلے بھی تھا جو سر آمد شجاعان یونان سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ اس کے  
 ہاتھ سے لڑائے کو بڑے صدمے پہنچتے گئے۔ اگر اس شخص کی شجاعت پر غور کیجیے تو اس  
 کی شجاعت کچھ بھی اخلاقی پیرایہ نہیں رکھتی تھی اس کی مغلوب الغیظی کی کوئی حد نہیں  
 معلوم ہوتی ہے۔ اور اس کی بے رحمی حد سے گزری ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اس کی  
 شجاعت درندوں کی سی تھی۔ انسانیت سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی تھی۔ اس نے جو  
 ہکڑ کو مارا تو اس کی لاش کو اپنی جنگی گاڑی میں باندھ کر گھسیٹنا شروع کیا۔ اس  
 بد اخلاق کے دل میں یہ بھی خیال نہ گزرا کہ ہم نبرد کشتہ کے ساتھ ایسا فعل کسی مذہب  
 میں جائز ہو سکتا ہے۔ اور ہم نبرد بھی وہ کہ جوئی الحقیقت ایک سچا بہادر اور صاحب  
 وقعت شخص تھا۔ المختصر ایلید کا قصہ تو ہر پہلو سے اس طرح کا ناپاک اور مہل ہے مگر  
 ہومیر دس کے حسن طبیعت نے اس کو عجب جلوہ دیا ہے کہ بخیاں راقم جس کسی نے ایلید  
 کو نہیں پڑھا اس نے کوئی شاعری کا لطف اٹھایا ہی نہیں۔ بے ایلید کے پڑھے کوئی  
 شخص دیان، بالیکی، فردوسی، ملتن اور میرانیس کا قدرداں ہو ہی نہیں سکتا۔ بہر کیف  
 یہ قصہ جو کچھ اخلاقی لحاظ سے برا ہو۔ ہومیر دس نے زور طبیعت سے اسے ایسا خوب بنا رکھا  
 ہے کہ زبان اس کی تعریف و توصیف سے قاصر ہے۔ اس شاعر جادو بیان نے اس نظم  
 مبسوط کی ترتیب میں آبجکٹو OBJECTIVE سبجکٹو SUBJECTIVE یعنی خارجی  
 اور داخلی دونوں قسم کی شاعری کا لطف دکھلایا ہے۔ معاملات خارجیہ اور ذہنیہ دونوں  
 کو بڑی تبعیت فطرت کے ساتھ حوالہ قلم کیا ہے اور جہاں جہاں آبجکٹو اور سبجکٹو مضامین  
 کی آمیزش کی حاجت پڑی ہے وہاں عجب ندرت کے ساتھ دونوں کو مرکب اور مخرج  
 کیلے۔ لڑائیوں کے نقشے ایسے کھینچے ہیں کہ اہل یونان کی سپہ گری اور لشکر آرائی کا  
 زمانہ پیش نظر معلوم ہوتا ہے۔ فریقین کے اشخاص نامی کے انداز مزاج و کردار ایسی خوبصورتی  
 کے ساتھ بیان کیے ہیں کہ جس سے اعلا درجہ کی مردم شناسی کا اظہار متصور ہے۔ جہاں  
 معاملات خارجیہ کو امور ذہنیہ کے ساتھ ترکیب دیا ہے وہاں عجب پر تاثیر سماں دکھلایا ہے  
 مثلاً وہ مقام جہاں ہکڑ اور اس کی زوجہ آپس میں کلام کر رہے ہیں۔ ہکڑ کی زوجہ کا نام



اندرومیکی ANDROMACHE ہے یہ عورت علاوہ حسن و جمال کے نہایت فہمیدہ نیک مزاج اور عقیقہ تھی۔ ایسی عورت کو اپنے شوہر سے جو کچھ تعلق قلبی نہ ہو توڑا ہے۔ پھر شوہر بھی کیسا کہ کمالات صوری و معنوی سے بھرا ہو۔ قلم میں اتنی قوت کہاں کہ ہومیروس کی اس قوت شاعری کی داد دے سکی۔ جو کہڑا در اندرومیکی کے باخود ملکی گفتگو سے آشکارا ہے۔ ہومیروس نے ان دونوں کو آپس میں گفتگو کرتے دکھلایا ہے اور اس بیان میں شاعری کے آبجکٹ اور سبکٹو دونوں پہلوؤں کا خاتمہ کر ڈالا ہے۔ سبحان اللہ کیا شاعری ہے۔ شاعری نہیں ہے سحر ہے۔ سحر بھی نہیں ہے خدا جانے کیا ہے۔ راقم کو اس قدر موقع حاصل نہیں ہے کہ پورا ترجمہ اس بیان کا یہاں پر خدمت ناظرین میں پیش کرے۔ اگر کاش پورا ترجمہ درج ہوتا تو کچھ اندازہ ہومیروس کی جادو بیانی اور شیریں زبانی کا ممکن تھا۔ بہر حال کسی قدر کہڑا در اندرومیکی کی ہکلامی کا خلاصہ ذیل میں عرض کیا جاتا ہے جس سے ہومیروس کی مضمون آفرینی خوش مذاقی، طباعی اور فطری زور شاعری کا نا تمام طور پر اظہار مقصود ہے۔

### ہم کلامی کہڑا در اندرومیکی

جب اکیلز ناراضی کی وجہ سے یونانیوں کو چھوڑ کر میدان ٹرائے سے چلا گیا تو اس کی عقبیت میں اہل ٹرائے یونانیوں پر فتیاب رہا کیے۔ ہر مقابلہ میں یونانیوں پر غالب آتے گئے اور کثرت فتح سے یونانیوں کو ششدر کر ڈالا۔ مگر جب اکیلز واپس آیا اور شریک کارزار ہوا تو اس وقت سے اہل ٹرائے کو شکست پر شکست ہونے لگی۔ بہر حال چونکہ کہڑا ایک نہایت بہادر شخص تھا اس لیے کوئی بے دلی ظاہر نہیں کی اور حتی الوسع ٹرائے کے محفوظ رکھنے میں کوشاں رہا۔ مگر یونانیوں کا غلبہ بڑھتا ہی گیا۔ اسی حالت میں کہ ٹرائے پر مغلوبیت غالب تھی۔ کہڑا اپنے محل کی طرف گیا اور اپنی زوجہ کو تلاش کیا۔ اندرومیکی کو محل میں نہ پایا تو تلاش کرتا ہوا وہاں پر پہنچا جہاں وہ تھی۔ وہ ٹرائے کے لشکر کی بد حالی کو دریافت کر کے ٹرائے کے ایک دروازہ پر جس کا نام ایلیں تھا کھڑی ہوئی بڑی تعلق خاطر کے ساتھ انداز جنگ کو تجویز کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ ایک دایہ بھی تھی جس کی گود میں ایک طفل شیر خوار تھا اور جو بطن اندرومیکی سے کہڑا کا پسر اصغر تھا۔ اسی جگہ پر زن و شوہر میں ملاقات ہوئی تو کہڑا کے جنگی حالات اس آن میں محبت و شفقت کے ساتھ مبدل ہو گئے۔ مگر جو واقعہ کہڑا کو پیش



آنے کو تھا۔ اندرویکی کے ہاتھ میں بھر گیا اور دل کے بھر آنے پر باچشم نم اس نے شوہر سے یوں خطاب کیا۔ اے شہزادے تو بے حد دلیر ہے تجھ کو زن و فرزند تک کا خیال نہیں رہتا۔ اس طرح کی شجاعت شعاری طول عمر سے خبر نہیں دیتی ہے۔ کیا تجھ کو نہیں معلوم ہے کہ تیرے مرنے سے ہم بیوہ اور یہ لڑکا یتیم ہو جائے گا۔ تیری صفات حمیدہ تیرے قتل کا سبب ہوگی۔ تو بڑا بہادر ہے مگر جب تک تجھ سے دلیران یونان فرداً فرداً جنگ آزما ہوئے ہمیشہ مغلوب رہے۔ اب سب کے سب ایک باریورش کرنے لگے اس طرح کی یورش میں تو تیری جانبی دشوار نظر آتی ہے۔ اے دیوتا قبل اس کے کہ میرے ہکڑ پر ایسا واقعہ گزرے مجھے تم اٹھا لو کہ مجھے ایسا روز سیاہ دیکھنا نصیب نہ ہو۔ اگر ایسا واقعہ تجھ پر گذرا تو میری زندگی جس تلخی کے ساتھ شروع ہوئی تھی اسی تلخی کے ساتھ ختم ہوگی۔ اب نہ میرے باپ ماں ہیں اور نہ کوئی بھائی۔ میرا باپ تھیب THEBES کا بادشاہ تھا۔ اسی اکیلے نے اس کا اور میرے بھائیوں کا خاتمہ کیا جس غم میں میری ماں مر گئی۔ ابھی تک ہم کو یہ تشفی کی صورت ہے کہ میرا ہکڑ زندہ ہے۔ اسی ہکڑ میں باپ، ماں، بھائی، عزیز و اقارب سب کے بدل کی شکل پیدا ہے۔ اگر کہیں اے ہکڑ تو مارا گیا تو یہ سب عزیزان میرے دوبارہ سر نو مارے جائیں گے۔ تیرے زن و فرزند سب کے سب اس وقت تیرے درد کے شریک ہیں تو ہم لوگوں کا حق ادا کر۔ میدان جنگ میں جانے کے عوض شہر پناہ کے اُس حصہ کی محافظت کر جہاں پر تو دیکھتا ہے کہ اک انجیر دشتی کا درخت قائم ہے۔ اُس جانب بار بار یونانی افواج حملہ آور ہوا کی ہے اور ہو رہی ہے۔ بڑی مصلحت ہے کہ تو اندر شہر پناہ کے رہ کر شہر کی محافظت کرے۔ اپنی بیگم کی اس گفتگو کو سن کر ہکڑ نے جواب دیا کہ ہم اس جانب کی شہر پناہ کی حفاظت کریں گے اور نہ اس کی بلکہ جتنے معاملات جنگ ہیں سب پر اپنی توجہ مبذول رکھیں گے۔ اس وقت میدان جنگ سے میرا کنارے رہنا ہمارے آبائی نام و نشان کے منافی ہوگا۔ اس میں ٹرائے کی سخت بے آبروئی متصور ہے ہم نے بچپن سے فوجی تعلیم پائی ہے جدال و قتال کی زحمت میرے سامنے کیا ہے ہماری شجاعت ہم کو میدان جنگ کی طرف کھینچ کر لے جاتی ہے اور یہ ہمارا فرض منصبی ہے کہ ہم اپنے باپ اور اپنے اولوالعزمی کی شہرت کو قائم رکھیں۔ اگر میرے نصیب میں مارا جانا ہے تو کوئی ہم کو موت سے بچا نہیں سکتا۔ مگر اس بات کو خیال کر کے البتہ دل بھر



آتا ہے کہ ٹرائے برباد ہو جائے گا اس کے شجاع مارے جائیں گے اور اس کے جلال و ثروت کا خاتمہ ظہور میں آئے گا۔ ہم اپنے بوڑھے باپ ماں کی مصیبتوں کو بھی خیال کرتے ہیں مگر میرے غم کی حد اس وقت کچھ نہیں معلوم ہوتی ہے کہ جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ ہمارے بعد تو گروہ اسارا میں داخل ہوگی۔ تو لرزاں نالاں گریاں رہے گی اور تجھے انداکشاں کشاں لے جائیں گے۔ اسیری کی حالت میں دشمن تجھے چرخیہ کتوائیں گے۔ کپڑے بنوائیں گے اور ان کپڑوں پر ان لڑائیوں کی تصویریں کشیدہ کرائیں گے اور جو آلام کے ہم پر گذر رہے ہیں اور جن آلام کی تو شریک اعظم ہو رہی ہے ان سب معاملات اندوہ و غم کے سماں تجھ کو منقش کرنے کو کہیں گے۔ تجھ سے پانی بھی بھر دائیں گے اور جس وقت تو ایسی سخت زندگی کے بار کٹے کراہے گی۔ اعدا طعن سے پکار پکار کر کہیں گے کہ دیکھو دیکھو مکھڑ قوی پنجا کی یہی جو رو ہے۔ اس طور پر جب کوئی اہل یونان سے ہمارا نام لے گا تو تجھے شرم پیدا ہوگی۔ ہزار رنگ سے غم و الم تیرے سامنے آکھڑے ہوں گے۔ اپنی یہی دعا ہے کہ ہکڑ کو ایسا دن دیکھنا نصیب نہ ہو اور ایسا ہی ہو گا کہ اے اندرو میکسی تیرا ہکڑ اس وقت کے کب نہ پہلے خواب عدم میں آرام کر چکے گا۔ راقم اس قدر لکھنے پر اکتفا کرتا ہے۔ حضرات ناظرین اس قلیل سی ہومیروس کی جادو بیانی کا موازنہ فرمائیں کہ یہ شخص کس قدر کا شاعر تھا۔ اہل یورپ اسے ابوالشعرا بے وجہ نہیں کہتے ہیں۔ اول تو یورپ میں اس شاعر سے پہلے کوئی شاعر نہیں گذرا دوم یہ کہ اس کی شاعری اس درجہ کی ہے کہ اس تک کم کسی شاعر رزمی کی شاعری پہنچی ہے۔ اگر سچ پوچھیے تو ہومیروس کی خوبیوں کو درجہ فردوسی اور ملن بھی نہیں پہنچتے ہیں۔ شعرائے ہنود میں ویاس اور باللیکی البتہ جواب ہومیروس ہیں۔ اور بدانت راقم ہومیروس سے مزج اگر کوئی شاعر ہے تو میرانیس ہیں۔ انشا اللہ تعالیٰ آئندہ ان اساتذہ کا ذکر آئے گا۔ جس سے راقم کے قول بالا کی تصدیق ہو جائے گی۔

راقم نے جس قدر ایلپیڈ کی نسبت مضامین بالا درج کیے ہیں اور ان سے ہومیروس کی شاعری کا اندازہ پورے طور پر نہیں ہوتا ہے۔ مگر حضرات ناظرین معاف فرمائیں گے اس لیے کہ اس سے زیادہ اس رسالہ میں گزارش کا موقع حاصل نہ تھا۔ بہر حال کتاب ایلپیڈ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہومیروس شاعرانہ صلاحیت کے ساتھ بہت وسیع اور قوی دماغ رکھتا تھا۔ اسی قوت دماغی کی بدولت اس شاعر



نے ایک نامزد قصہ کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ حکمت آموز پیرایہ بخشا ہے۔ بلاشبہ اس نے اس قصہ کے معائب سے خوبیوں کی شکلیں پیدا کی ہیں۔ ایک کم صلاحیت شاعر اس قبیح قصہ کو قبح شکل بنا ڈالتا۔ واقعی ہومیروس نے یہ بڑا کمال دکھلایا ہے کہ ایک بڑے قصہ کو باوجود لاحق رہنے مذہبی، تمدنی اور اخلاقی نقصانات کے اس قدر صاف اور پاکیزہ صورت بخشی ہے۔ ایلید ایک بڑے بکھڑے کی کتاب معلوم ہوتی ہے۔ اس کی پریشانی خیالات کی کوئی حد نظر نہیں آتی ہے۔ یہ ہومیروس ہی کا کام تھا کہ اس نے اس قدر اُنچھے خیالات کو سلجھایا ہے۔ اور نامربوط غیر منظم مضامین میں ربط و نظم پیدا کیا ہے۔ ہومیروس کی شاعری کی تعریف میں یہ کہنا بس ہے کہ یورپ کے بعد کے شعرا کے لیے ہومیروس خضر راہ ہوا ہے۔ اور واقعی ایسا ہی ہے کہ ہر پہلو سے ایلید کی شاعری استاد کا جلوہ دکھلاتی ہے۔

## قصہ آڈیسی

ہومیروس کی دوسری تصنیف جس کا نام آڈیسی ODYSSEY ہے۔ ایلید کے بعد لکھی گئی ہے۔ ہر چند یہ کتاب بہت کچھ لطف شاعری رکھتی ہے مگر ایلید کے پایہ شاعری تک نہیں پہنچتی ہے۔ آڈیسی کا قصہ بھی برے خود مربوط اور منظم انداز کا نہیں ہے مگر ہومیروس کی شاعری نے اسے بہت کچھ قابل توجہ بنا ڈالا ہے۔ آڈیسی میں یولیس کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہنگامہ ٹرائے کے بعد یولیس اپنے جزیرہ ایٹھا کا ITHACA کو جس کا وہ بادشاہ تھا واپس آنے لگا تو اس کو عجیب پریشانیاں اور سرگرداخیال نصیب ہوتی گئیں سات برس تک وہ جزیرہ اوگیجیا OGGOJI میں ایک دریائی پری کا جس کا نام کیلیپسو CALYPSO تھا قیدی رہا۔ اس عرصہ میں اس کے اہل وطن نے یہ سمجھا کہ یولیس فوت ہو گیا اور اس قیاس کی بنیاد پر اس کی زوجہ پنیلوپ PENELOPE سے بیاہ کرنے کے لیے سو سے زیادہ اشخاص نے آمادگی ظاہر کی۔ ان خواستگار ازدواج میں ہمیشہ باہم جھگڑے برپا رہتے تھے اور پنیلوپ کا گھر دارالفساد ہو رہا تھا۔ یہاں تک کہ قید ہفت سالہ کے بعد یولیس آہنچا اور تمام مفسدوں کو ہلاک کر کے اپنے گھر کو نئے دشر سے پاک کر ڈالا۔ مختصر قصہ

آڈیسی کا یہی ہے اس میں بھی دیوتا اور پری کے بیانات دیکھے جاتے ہیں۔ جیسا کہ ایلید میں ایسے بیانات بکثرت موجود ہیں۔ خیر یہ قصہ جو کچھ نامربوط یا نامطبوع رنگ رکھتا ہو، ہو میردس کی شاعری نے اس کو بھی نہایت دلچسپ پیرایہ بخشا ہے اور لاریب یہ کتاب بہت کچھ اصل فن کی توجہ کے قابل ہے۔

واضح ہو کہ ایلید کی شاعری رزمی انداز رکھتی ہے۔ جیسا کہ دیگر شعرائے یورپ مثلاً ورجل VIRGIL ملٹن MILTON یا ایشیائی شعراء فردوسی، میرانیس، ویاس ہلکی۔ رزمی شاعری کا جلوہ دکھلاتے گئے ہیں۔ ان رزمی شعرا کے حالات اور کلام کے مذکور آئندہ آئیں گے مگر یہاں پر چونکہ یونانی شعرا کا ذکر پیش ہے اور یہ یونانی شعرا کوئی رزمی اور کوئی بزمی اور کوئی ڈرامہ نگار DRAMATIST گزرے ہیں اس لیے ضرور ہے کہ کچھ ان اقسام شاعری کا بیان سر دست کیا جائے۔

### بزمی شاعری پر مشتمل بر لیرکس یعنی غزل سرائی

پس جاننا چاہیے کہ ان شاعریوں میں سے ایک قسم شاعری کی ہے جسے لیرکس LYRICS کہتے ہیں۔ اس قسم کو فارسی اور اردو کی غزل سرائی سے اک گو نہ نسبت ہے۔ بلکہ درحقیقت جو تقاضائے اہل یورپ کے لیرکس کا ہے وہی ہم لوگوں کی غزل سرائی اور تمام دنیا کی اس شاعری کا ہے جس کے لگاؤ میں سرانیدن کا لفظ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ بہر حال جاننا چاہیے کہ لیرکس کا تقاضا یہ ہے کہ اس میں ایسے مضامین داخل رہیں کہ یعنی جو داخلی سبجکٹو SUBJECTIVE انداز رکھتے ہیں اور خارجی OBJECTIVE رنگ رکھتے بھی ہوں تو داخل انداز سے آمیزش پاتے ہوں۔ اگر لیرکس میں شاعر اس آمیزش کے ساتھ خارجی مضامین کو حوالہ نہ کرے گا تو اس کا کلام بے مزہ ہوگا۔ یہی سبب ہے کہ بعض فارسی اور اردو شعرا کی غزل سرائی مطبوع نہیں معلوم ہوتی ہے۔ ایسے غزل سراؤں نے برخلاف تقاضائے غزل سرائی مضامین خارجی کو بلا آمیزش رنگ داخلی اپنے کلام میں جگہ دی ہے۔ جس کے سبب سے ان کی اکثر غزلیں روکھی سوکھی درد سے خالی بے اثر اور محض بے کیف معلوم ہوتی ہیں۔ لیرکس اور غزل سرائی کے لیے ضرور ہے کہ واردات قلبیہ اور پرتاثر امور ذہنیہ حوالہ قلم کیے



جائیں۔ اس طرح کی شاعری کے لیے شاعر کو اپنا عالم درونی کافی ہوتا ہے۔ اسے کوئی حاجت نہیں ہے کہ اپنے احاطہ ذہنیہ سے باہر جائے۔ اس کا ذہن ہی اس کی دنیا ہوتی ہے۔ اسی کے اندر وہ سب کچھ دیکھتا ہے اور جو کچھ دل کی آنکھ سے دیکھتا ہے اسے حوالہ نقل کرتا ہے۔ جتنے اس کے کلام ہوتے ہیں اس کے واسطے کلیات کا حکم رکھتے ہیں۔ گو اس کے وہ کلام کلیات کے طور پر دیگر افراد انسانی کے امور ذہنیہ اور واردات قلبیہ پر بھی صادق آئیں۔ بالمنقصر لیرکس یا غزل سرائی کو عالم خارج سے بہت کم تعلق ہے۔ اس کی شاعری شخصی انداز رکھتی ہے۔ یعنی جو کچھ شاعر پر گزرتی ہے یا جو کچھ اس کی واردات قلبیہ ہوتی ہیں انہیں قلمبند کرتا ہے۔ اور شروع سے آخر تک اس کا کام یہ ہے کہ خود سرائی کو ہمیشہ پیش نظر رکھے اور جو کچھ موزوں کرے اس میں اپنے کو نہ بھولے۔ اپنے شخص پر غیر شخص کو قائم نہ کرے۔ ورنہ اس کا کلام بے تاثیر ہوگا۔ اسی صلاحیت کی بدولت حافظ، خواجہ میر درد، میر تقی میر، مومن اور غالب کے کلام اس قدر پر تاثیر دیکھے جاتے ہیں کہ اگر یہ شعرا اپنی ذاتی واردات قلبیہ کو نہیں تحریر کیے ہوتے تو اس قدر ان کے کلاموں میں مقبولیت نہ ہوتی۔ ان شعرا کا ایک ایک مصرع بول اٹھتا ہے کہ میں حافظ ہوں، میں درد ہوں، میں میر ہوں، میں مومن ہوں، میں غالب ہوں، فطرت نے ان کو اور ان کے ایسے شعرا کو غزل گو بناتے وقت ان کے کانوں میں غزل گوئی کا گراں لفظوں میں سکھلا دیا تھا کہ غزل سرائی کا دوسرا نام خود سرائی ہے۔ برخلاف اس کے رزمی شاعری EPIC ہے کہ جس میں شاعر کو اپنی ذاتی حیثیت سے بہت کنارے ہونا پڑتا ہے اور کلیات سے جزئیات کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ ہم لوگ ایشیائی اہل اسلام ہیں یہ شاعری بیشتر مثنوی کی شکل میں دیکھی جاتی ہے۔ جسے شاہنامہ فردوسی، سکندرنامہ نظامی، حملہ حیدری وغیرہ یا بندات کی صورت میں جسے بندات مرانی میر انیس و مرزا میر دبیر علی اللہ مقابہ فی الجنبہ بہر حال ایک شاعری میں شاعر کو جس قدر مضامین عالم خارج سے لینا ہوتا ہے اسی قدر اسے عالم درونی سے بھی اختیار کرنا پڑتا ہے۔ پھر دونوں کی آمیزش بھی اسے کرنا ہوتا ہے۔ مختلف افراد انسانی کے جیسے شخصی تقاضے ہوتے ہیں انہیں ملحوظ رکھنا رزمی شاعری کا کام ہے۔ رزمی شاعری اس کی متقاضی ہوتی ہے کہ شاعر خودی کو جہاں تک ممکن ہو بھول جائے۔ اور اپنے شخص پر غیر اشخاص کو قائم کرے۔ جیسا کہ ہومیرس



نے ایلیڈ میں تمام تر اپنے کو اپنی ذاتی حیثیت سے کنارہ کیا ہے۔ اور جتنے اشخاص کا ذکر کیا ہے ان کے جزئی اور مختص حالات درونی و برونی کو قلم بند کیا ہے یعنی ہر شخص کی تصویر جیسی درکار تھی کھینچی ہے۔ مثلاً اگر اکلینز کو بیان کیا ہے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اکلینز ایک شخص محض علاحدہ انداز کا پولیس وغیرہ سے ہے۔ اور جہاں ہن کو بیان کیا ہے تو وہ اندرونی سے بالکل ایک جوہر انداز کی عورت معلوم ہوتی ہے۔ اسی طور پر ہر خاص شخص کے خاص معاملات کو اس طور پر کھلایا ہے کہ وہ معاملات خواہ درونی یا خواہ برونی ہوں سوا ایک شخص خاص کے دوسرے شخص پر صادق نہیں آتے ہیں۔ اس طرز بیان کو کیرکٹرنگاری کہتے ہیں۔ کیرکٹر CHARACTER زبان انگریزی میں ایسے طور و اطوار کو کہتے ہیں جو ایک دوسرے کو دوسرے شخص سے میز کر دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہی کیرکٹرنگاری ہے جس نے میرانیس کی شاعری کو بے حد ممتاز بنا رکھا ہے۔ یہی کیرکٹرنگاری ہے کہ جس نے بالیکی اور دیاس کو مشہور عالم کیا ہے۔ اور یہی کیرکٹرنگاری ہے کہ جس کی عدم موجودگی سے فردوسی کی شاعری ہومیروس، ورجل، ملٹن، دیاس، بالیکی اور میرانیس کی شاعری کو نہیں پہنچتی ہے۔

## ڈراما

وامنغ ہو کہ ہومیروس کی کیرکٹرنگاری اس درجہ کی نظر آتی ہے کہ جو نہایت اعلا درجہ کی ڈراما نگاری کے لیے درکار ہے۔ ڈراما DRAMA بزبان انگریزی نامک کو کہتے ہیں یہ ایک نہایت اعلا قسم کی شاعری ہے۔ رزمی شاعری اور ڈراما کی شاعری میں فسرق یہی ہے کہ رزمی شاعری سے زیادہ ڈراما کی شاعری میں جزئیات معاملات انسانی کا لحاظ رکھنا درکار ہوتا ہے۔ اور افراد انسانی جو کسی ڈراما سے متعلق ہوتے ہیں ان کے پورے کیرکٹر کو ان کے مہر جز و افعال و اقوال کے مطابقت کے ساتھ حوالہ قلم کرنا ہوتا ہے علاوہ اس کے رزمی شاعری میں شاعر کو کسی قصہ کو بسبیل نقل حکایت بیان کرتا ہے اور جہاں تک ممکن ہوتا ہے اس قصہ کے افراد انسانی کے کیرکٹروں کو ملحوظ رکھ کر اپنے بیان کو جلوہ دیتا ہے۔ ڈراما میں وہی قصہ بسبیل نقل و حکایات نہیں بیان ہوتا ہے۔ بلکہ وہی افراد انسانی جو اس قصہ سے متعلق رہتے ہیں نا وسعت تعلق ذاتی اپنے اقوال و افعال سے اس قصہ کو خود



بیان کرتے ہیں۔ قوت تخیل سے شاعر اپنے کو ہر افراد کا قائم مقام بناتا ہے اور جیسے وہ افراد ہوتے ہیں ویسا ہی اپنے کو قولاً و فعلاً دکھلاتا ہے۔

## غرض ڈراما

غرض ڈراما یہ ہے کہ انسان کو اعلا درجہ کی تعلیم نصیب ہو و عظم و عظمت سے بھی وہ کام نہیں نکل سکتا ہے جو اس شاعر سے ظہور میں آسکتا ہے۔ شاعر ڈراما نگار کا یہ کام ہے کہ کوئی ممتاز قصہ حکایات یا واقعہ اس طرح بیان کرے جیسا کہ فطرت اس کے بیان کی متقاضی ہے۔ تاکہ اس کے بیان سے معاملات عالم کا فطری اندازہ ہو پیدا ہو سکے۔ ڈراما منہائے شاعری سے اور کوئی شخص ڈراما نگار نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ جزئیات معاملات دنیا سے فطری اصول کے ساتھ باخبر نہ ہو۔ ڈراما کے لیے قصہ یا حکایت یا واقعہ کا اس قدر اہم ہونا ضروری ہے کہ وہ معمولی حیثیت کے معاملات سے ارفع ہو اور خاتمہ اس کا کوئی نتیجہ معقول جو خواہ مسرت خیز اور خواہ الم انگیز ہو پیدا کر سکے۔ جو ڈراما مسرت خیز نتیجہ پیدا کرتا ہے اسے بزبان انگریزی کامیڈی COMEDY کہتے ہیں۔ اس کی مثال شکسپیر کا وہ پلے ہے اس کا نام کامیڈی آف ایررس ERRORS ہے پلے بزبان انگریزی PLAY ایک ایسے پورے قصہ کو کہتے ہیں جو بشکل ڈراما لکھا گیا ہو۔ اس خاص پلے کا خاتمہ مسرت و انبساط پر ہوا ہے۔ لیکن وہ ڈراما جس کا نتیجہ الم انگیز ہوا ہے بزبان انگریزی ٹریجڈی TRAGEDY اس کی مثال شکسپیر کا وہ پلے ہے جس کا نام ہیمیلٹ HAMLET ہے۔

## اسلامی شعرا میں عدم ڈراما نگاری

چونکہ زبان عربی و فارسی میں ڈراما نگاری نہیں دیکھی جاتی ہے اس واسطے کوئی مثال

لے شکسپیر کا مشہور فرنیہ ڈراما اس کی پہلی اشاعت ۱۶۰۳ء میں ہوئی، لیکن یہ اشاعت اس لیے ناقص تھی کہ اس میں مکمل ڈراما نہیں تھا، ۱۶۰۸ء میں پورا ڈراما شائع ہوا۔ اس کی کہانی SAXO GRAMMATICUS میں ہے۔

رب لامکاں کا صد شکر ہے کہ اس نے ہمیں توفیق دی کہ ہم اردو ادب کی کتب کو سافٹ میں تبدیل کر سکے۔ اسی صورت میں یہ کتاب آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ مزید اس طرح کی عمدہ کتب حاصل کرنے کے لئے ہمارے گروپ میں شمولیت اختیار کریں۔

اتکامیہ برقی کتب

گروپ میں شمولیت کے لئے:



محمد ذوالقرنین حیدر: +92-3123050300

اسکالر سدرہ طاہر صاحبہ: +92-334 0120123



کسی پلے کی نہیں پیش کی جاسکتی ہے افسوس ہے کہ یہ صنف شاعری ایشیائی مسلمانوں میں نہیں پائی جاتی ہے۔ علاوہ افسوس کے بہت جائے تعجب ہے کہ اہل اسلام نے یونان کے تمام علوم و فنون کو اختیار کیا۔ مگر ان کی شاعری کی طرف توجہ نہیں کی۔ اگر کرتے تو ضرور یونانی ڈراما نگاروں کے طریقہ شاعری کو اختیار کرتے۔ اس عدم توجہ کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل عرب اپنے کو معاملہ شاعری میں کسی قوم سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ اس واسطے غیر قوم سے اکتساب شاعری کو بے کار جانا۔ یا یہ کہ چونکہ اہل اسلام اہل یونان کے مذاق بت پرستی سے بہت دور تھے۔ اور اہل یونان کی شاعریاں اس مذاق سے مملو تھیں۔ انھوں نے یونانی شاعری کی طرف توجہ کرنا خلاف مصالح مذہبی سمجھا۔ خیر جو سبب ہو اہل عرب نے معاملہ شاعری میں کسی طرح کی اعانت بیرونی کو روانہ رکھا تو اہل فارس نے بھی اپنی ملکی انداز شاعری پر قناعت کی۔ پھر بے چاری اردو جو فارسی کی محض متبع ہے۔ کیا انحراف درزی اختیار کرتی۔ اہل اسلام کا ڈراما نگاری کو اختیار کرنا افسوس انگیز امر ہے۔ بلاشبہ انھیں اس صنف شاعری کے اختیار کرنے کا موقع برابر ملتا گیا۔ اس پر بھی وہ اس کی طرف مائل نہ ہوتے۔ اول تو انھیں علوم یونان سے سابقہ پڑا۔ دوم یہ کہ اہل اسلام ہندوستان میں آئے اور حکمران ہندوستان ہو کر ہندوؤں سے شیر و شکر ہوئے۔ اور ان کے محصل اور ممتاز اشخاص جیسے فیضی اور عبدالرحیم خاناناں اور علامہ بدایونی وغیرہ علوم سنسکرت سے بہرہ ور ہوتے گئے۔ اس پر بھی ان میں سے کسی نے ڈراما نگاری کی طرف توجہ نہیں کی۔ حالانکہ سنسکرت کی ڈراما نگاری اس درجہ کمال کو پہنچی ہوئی تھی کہ اہل یونان کی ڈراما نگاری کا جواب ہو رہی تھی۔ بلکہ اس سے بھی شیئاً زائد بڑھی ہوئی تھی اور اس لیے بلا گفتگو بہت قابل متصور تھی۔ لاریب اہل اسلام اس صنف شاعری کو رواج دینے کے مواقع برابر پاتے گئے۔ مگر افسوس ہے کہ کسی عہد ماضی میں اس کی طرف مائل نہ ہوئے۔ اگر کاش اس کی طرف اپنی توجہ مبذول کیے ہوتے تو اس وقت اسلامی شاعری اہل یونان یا اہل روم یا اہل ہند کی شاعری سے بلند یا سبکی میں کم نہیں ہوتی۔ بہر حال اب جائے مسرت یہ ہے کہ اب ملک ایران میں ڈراما نگاری کی ابتدا ہوتی ہے اور خوب ہوتی ہے اگر شعرا نے۔ حال کے اس صنف شاعری کی طرف متوجہ ہونے سے فارسی کی شاعری کا مکملہ ظہور میں آئے۔ واضح ہو کہ ڈراما نگاری کے بغیر کسی زبان کی شاعری درجہ کمال کو نہیں



پہنچ سکتی ہے۔ اگر اہل فارس کو ڈراما نگاری کا مذاق پیدا ہوا ہوتا تو امید قوی ہے کہ شعرائے فارسی کی نامطبوع مبالغہ پردازیاں بھی رخصت ہو جاتیں۔ کس واسطے کہ ڈراما نگاری میں جمعیت فطرت کی بڑی ضرورت ہے اور ظاہر ہے کہ تبعیت فطرت منافی مبالغہ پردازی ہے۔ فارسی کی شاعری جو مبالغہ پردازیوں کے باعث معیوب ہو رہی ہے نہایت اصلاح کی حاجت رکھتی ہے۔ اس کی اصلاح ڈراما نگاری کے بغیر ممکن الواقع ہے۔ خیر اگر اب بھی اہل اسلام ڈراما نگاری کی طرف میل فرمائیں تو بہت غنیمت ہے کہ اس وقت تک ان کی نا تو جہی بہت حیرت خیز امر ہے۔ جاننا چاہیے کہ ڈراما نگاری شاعری کا خاتمہ ہے۔

## شعرائے سنسکرت کی ڈراما نگاری

زبان سنسکرت میں ڈراما نگاری ایسے اعلا درجہ کی دیکھی جاتی ہے کہ بہت محققوں کی یہ رائے ہے کہ اب تک کسی قوم نے چہ ماضی و چہ حال اس صنف شاعری میں اس کے برابر ترقی نہیں کی ہے۔ یورپ میں بلکہ تمام دنیا میں شیکسپیر شاعر انگلستان بہترین ڈراما نگار سمجھا جاتا ہے اور واقعی اس کی ڈراما نگاری کچھ ایسے الہامی درجہ کی معلوم ہوتی ہے کہ اس کے کمالات کو دیکھ کر عقل انسانی مبتلائے حیرت ہوتی ہے۔ مگر اب بعد تحقیق ایسا معلوم ہونے لگا ہے کہ زبان سنسکرت کا ڈراما نگار شاعر کالی داس یا شکسپیر کا ہم پہلو ہے یا شکسپیر سے بھی بلند تر رتبہ رکھتا ہے۔ اسی سے سنسکرت کی شاعری کا رتبہ قیاس کرنا چاہیے کہ اس زبان میں کالی داس سا ڈراما نگار دیکھا جاتا ہے اور بیاس مصنف مہا بھارت اور بالیسکی مصنف رامن سے رزمی شاعری پائے جاتے ہیں۔ بنیال مؤلف کسی زبان میں سنسکرت سے بہتر شاعری نہیں دیکھی جاتی ہے۔ خاص کر ڈراما نگاری کہ کہیں جواب نہیں رکھتی ہے۔ اس کی رزمی شاعری کا بھی جواب کمتر نظر آتا ہے۔ ہومر اور ملٹن، بیاس اور بالیسکی کے پورے جواب نہیں ہیں۔ ہاں اگر کوئی شاعر جواب میں پیش کیا جاسکتا ہے تو میر انیس ہیں۔ کاش اگر کوئی ڈراما نگار اردو کا شاعر اُسی درجہ کا جس درجہ کے میر انیس رزمی شاعر گذرے ہیں زبان اردو میں ظہور کیے ہوتا تو لاریب دنیا میں سنسکرت کی شاعری کے بعد اردو کی شاعری کا درجہ ہوتا۔ اس صنف شاعری کی معدومی سے عربی، فارسی اور اردو کی شاعریاں نامکمل حیثیت رکھتی ہیں۔ بالخصوص معدومی



ڈراما نگاری سے کامیڈی اور ٹریجڈی کی مثالیں ڈراما کی صورت بد عربی، فارسی اور اردو کی شاعریوں سے پیش نہیں کی جاسکتی ہیں لیکن کامیڈی اور ٹریجڈی کے انداز کو سمجھانے کے واسطے بعض مثنویوں کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔ کہ جو اگر بوضع ڈراما لکھی جائیں تو کامیڈی اور ٹریجڈی کی شکلیں پیدا کرتیں۔ مثلاً مثنوی یوسف زلیخا کہ جس میں ایک ایسے قصہ کا بیان ہے کہ جس کا نتیجہ مضامین مسرت انگیز پر مشتمل ہے۔ یعنی وہ قصہ پہلے حضرت یوسفؑ کی پریشانیوں کو اور حضرت یعقوبؑ کے مبتلائے رنج و آلام ہونے کو بیان کرتا ہے اور آخر کار حضرت یوسفؑ کے ثروت کو پہنچنے اور حضرت یعقوبؑ کے ملنے سے خبر دیتا ہے۔ ایسا قصہ کے جس کا خلاصہ یہ ہو کہ

پیرے بود پیرے داشت گم کردہ بود بازیافت

سوائے مسرت انگیز ہونے کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ اسی پر مثنوی میر حسن کے قصہ کو بھی قیاس کرنا چاہیے کہ وہ بھی ایک پیرایہ خاص میں حضرت یوسفؑ اور حضرت یعقوبؑ کا قصہ ہے اور اسی لیے اس قصہ کا خاتمہ بھی خوشی اور مسرت پر ہوتا ہے۔ بخلاف اس کے قصہ شیریں و فریاد ہے جو پوری شکل ٹریجڈی کی رکھتا ہے۔ اور جس سے حزن و ملال کے سوا کوئی دوسری کیفیت منبج نہیں ہو سکتی ہے۔ لیلیٰ مجنوں کے قصہ کا بھی یہی انداز ہے اور راسخ کی وہ مثنوی جس کا نام راز و نیاز ہے۔ یہی پیرایہ رکھتی ہے۔

## ڈائی ڈکٹیک شاعری

لیک LYRIC ایک EPIC اور ڈراما DRAMA کے علاوہ شاعری کی ایک قسم ہے جو بشکل مثنوی ہوتی ہے اور اس سے مراد اخلاق آموزی ہے۔ اس شاعری کو بزبان انگریزی ڈائی ڈکٹیک DIDACTIC کہتے ہیں۔ اس شاعری سے نصائح پند وغیرہ متعلق ہوتے ہیں۔ اس کی مثالیں سعدی و سنائی و مولوی رومی علیہم الرحمہ کے کلاموں میں افراط کے ساتھ موجود ہیں۔ امیر المومنین علیہ السلام کے اشعار بھی بیشتر یہی رنگ رکھتے ہیں۔ انگریزی شعرا میں درڈسورٹھ WORDSWORTH ڈرائیڈن DRYDEN اڈلین ADDISON پوپ POPE وغیرہ بھی یہی ڈائی ڈکٹیک یعنی اخلاق آموز مذاق رکھتے ہیں۔ یہاں پر قابل ذکر شاعری کی وہ قسم بھی ہے جسے بزبان انگریزی

پیسٹورل PASTORAL کہتے ہیں۔ اس شاعری کا تقاضا یہ ہے کہ وہی طریقہ زندگی کا بیان عمل میں آئے۔ یعنی کسان و چوپان کس طور پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کے ارادات و خواہشات کیا انداز رکھتے ہیں۔ یہ باتیں اس صنف شاعری میں حوالہ قلم ہوتی ہیں۔ شاعر ایسے معاملات کو کسان و چوپان کے پیرایہ میں ظاہر کرتا ہے۔ اس قسم کی شاعری کی مثالیں یورپ کے شاعروں کے کلام میں بہت ہیں۔ انگریزی شاعروں میں پوپ POPE نے اس رنگ میں بہت شعر کہے ہیں۔ یہ مذاق قبل بعثت آنحضرت صلعم کے شعرائے عرب میں بھی دیکھا جاتا ہے اہل عرب میں اس مذاق کا موجود ہونا کوئی تعجب نہیں ہے کس واسطے کہ بیشتر اہل عرب تقاضائے ملکی سے چوپان پیشہ تھے۔ اور اب بھی ہیں۔ اس صنف شاعری سے ایک گونہ مناسبت وہ شاعری بھی رکھتی ہے جو زراعتی اور باغبانہ مذاق رکھتی ہے۔ یونانیوں میں اس مذاق کا شاعر ہیزئڈ HEZIOD تھا۔ جس کا بیان آئندہ آتا ہے اور اس صوبہ بہار میں دو طبیعت دار زراعت پیشہ شخص تھے۔ جو کھاگ اور ڈاگ کے نام سے مشہور ہیں۔ ان دونوں کے زراعتی کلام آئندہ منقول ہوں گے۔

منجملہ اقسام شاعری کی مدح اور دوسری قدح ہے ان دونوں صنف شاعری کی مثالیں ہر زبان میں بکثرت موجود ہیں۔ اردو میں ان دونوں قسم کی شاعریاں مرزا رفیع سودا سے بڑھ کر کسی نے نہیں کی ہیں۔ آئندہ ان صنفوں کی بحث تفصیل کے ساتھ حوالہ قلم ہوگی۔ لیکن اس جگہ یہ عرض کر دینا ضرور ہے کہ شاعر مدح میں ایسی مبالغہ پردازی کو راہ نہ دے کہ اس کا کلام احاطہ فطرت سے باہر معلوم ہو اور نہ قدح میں اس درجہ نا مہذب پیرایہ اختیار کرے کہ طبیعت کو تنفر پیدا ہو۔ اگر مرزا سودا ان دونوں باتوں کو مدح و قدح میں مد نظر رکھتے تھے ان کی مدح گوئی اور جو گوئی کا جواب ہمیں دنیا میں نہیں ملتا شعرائے یورپ بھی طریقہ مدح و قدح کو اختیار کرتے گئے ہیں۔ مگر فحش سے ان کی تحریریں کمتر آلودہ نظر آتی ہیں۔

## مرثیہ نگاری

اصناف شاعری سے مرثیہ نگاری ایک نہایت عمدہ صنف ہے۔ مرثیہ نگاری سے مراد صرف وہ مرثیہ گوئی نہیں ہے کہ دوستانہ ارادان پیغمبر مصائب المیت علیہم السلام



کو شاعرانہ پیرایہ میں بیان کرتے ہیں بلکہ تمام دیگر ایسے منظوم و غیر منظوم بیانات جو سربلہ رنج و الم ہونے کے باعث اظہار غم و مسرت کے ساتھ احاطہ تحریر میں در آئے ہیں۔ مثلاً شاعر اپنے کسی دوست کے مرنے کا اور کسی شخص کے مبتلائے آفات ہونے کا مرثیہ لکھ سکتا ہے یا کسی غم انگیز معاملہ کو جیسے جہاز کا ڈوبنا مکان میں آگ لگنا وغیرہ ہے قلم بند کر سکتا ہے۔ اس طرح کے مرثیے شعرائے یورپ اور ایشیا اکثر لکھ گئے ہیں گرے GRAY شاعر انگریزی نے ایک مرثیہ ایک دیہات کے گورغریباں کے بیان میں لکھا ہے۔ یہ مرثیہ دیدنی ہے۔ اسی طرح حکیم قافا نے ایک مرثیہ ایک امیرزادی ناکتہ کی وفات میں نہایت سوز و درد کے ساتھ موزوں کیا ہے۔ دو شعرا اس مرثیہ کی ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔ ان کی پرتاثری محتاج بیان نہیں ہے

بہر بار گل از زہر گل بر آرد سر      گلے برفت کہ باید بعد بہار دیگر  
گلے برفت کز امر و تابدا من حشر      گلاب اوست کہ جاری بود ز دیدہ تر

واضح ہو کہ یوں تو مرثیہ نگاری ہر زبان میں دیکھی جاتی ہے۔ اور مذہبی مرثیہ نگاری بھی ہر قوم میں کم و بیش طور پر مروج رہی ہے۔ لیکن مرثیہ نگاری جیسی اس وقت اردو میں موجود ہے کسی زبان میں نہیں پائی جاتی ہے۔ ہر چند اردو فارسی کی خوشہ چین کہی جاتی ہے مگر اس صنف شاعری میں بہت زیادہ ترقی کر گئی ہے۔ یہ حالت ہے کہ فارسی کی شاعری کا تو کیا ذکر۔ اس مرثیہ نگاری کی بدولت اردو کی شاعری اہل یونان اہل روم اہل ہند اہل انگلستان کی شاعرانوں کا سامنا کرنے کو مستعد نظر آتی ہے اس ترقی عظیم کے باعث میرانیس ہوتے ہیں جن کی بدولت زمین شاعری آسمان سے بھی بلند تر دکھائی دیتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت مرحوم کی ذات پاک قدرت خداوندی کی پوری نشانی تھی۔ خوشا نصیب ان حضرات کے جنہوں نے ان حضرات کے کلام کو دیدہ حق میں سے مطالعہ فرمایا ہے۔ بلاشبہ جناب میر صاحب کی شاعری کچھ ایسی ہی ندرت رکھتی ہے کہ جب تک اس کا موازنہ ہو میر و س درجل، فردوسی، ملٹن، بالیسکی اور بیاس کی شاعریوں کے ساتھ نہ کیا جائے تب تک اس کی خوبیوں سے اطلاع پانا بیرون از امکان ہے۔ جن لوگوں نے مختلف اقوام کی شاعرانوں پر نظر غور نہیں ڈالی ہے۔ وہ میر صاحب کے کمالات کو سمجھ نہیں سکتے ہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ میر صاحب کے کمالات کا بیان اپنے موقع پر آتا ہے۔ یہاں



پراس سے زیادہ گذارش کا موقع نہیں ہے۔ اس لیے ذیل میں کچھ شعرائے اہل یونان کا ذکر پیش کیا جا رہا ہے۔

اصناف بالا کی شاعریوں کو ملحوظ رکھ کر اب حضرات ناظرین ہومیروس کے مابعد کے شعرائے یونان کے حالات پر اپنی توجہ مبذول فرمائیں۔ کتابوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہومیروس کی ایک نگاری یعنی رزمی شاعری نے یونان کے دلوں میں شاعری کے دلولے پیدا کیے تھے۔ چنانچہ اسی معاملہ ٹرائے TROY کو چند یونانی شعرا پے درپے ہومیروس کے نتیجے میں منظوم کرتے گئے ہیں۔ مگر ان میں سے کوئی شاعر بھی ہومیروس کی عمدگی کو نہیں پہنچتا ہے۔ بہر حال ہومیروس کے بعد ایک شاعر ہیزید HESIOD

نامی یونان میں پیدا ہوا۔ مگر اس نے یونانی شاعری نہیں اختیار کی۔ اس نے ہومیروس سے شاعری کی ایک علاحدہ راہ نکالی۔ یہ شاعر آٹھ سو برس قبل حضرت مسیح علیہ السلام کے زندہ تھا اور اس کی مشہور تصنیف جو اس وقت موجود ہے اس کا نام درکس اینڈ ڈیزز WORKS DAYS ہے۔ یہ نام بھی بزبان انگریزی ایک مترجم نام ہے۔ اردو میں ان لفظوں کا ترجمہ مشاغل و ایام کے ساتھ کیا جاسکتا ہے۔ خیر اس شاعر نے زراعتی معاملات منظوم کیے ہیں۔ مثلاً کب قلم رانی اور کب تخم ریزی کرنا چاہیے۔ ہل کے لیے کیسی لکڑی درکار ہوتی ہے اسی طرح پر اس نے بہت زراعتی امور حوالہ قلم کیے ہیں اور باغبانی کی ہدایتوں کے ساتھ اخلاقی تعلیم کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔ یہ شاعر بیوشیا BEOSIA کا جو ملک یونان کا ایک حصہ ہے رہنے والا تھا۔ اس کی شاعری ہومیروس کی شاعری کی طرح بہت تخیلی نہیں ہے بلکہ روزمرہ کے معاملات کو مد نظر رکھتی ہے۔ جس کے اور دنیا میں وہ بکار آمد قیاس

لے یہ یونانی شاعر دنیا کا پہلا کسان شاعر ہے، دیہی زندگی کی عکاسی میں اپنی مثال آپ ہے، اس طرح ترقی پسند تحریک کا پہلا امام ہزروڈ ہی کو کہا جاسکتا ہے درکس اینڈ ڈیزز کے تھیوگونی، کیٹلاگ آف وین، اور 'امی ادای' اس کے نام منسوب ہیں۔ لیکن محققین اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ صرف درکس اینڈ ڈیزز اس کی کتاب ہے۔ ہزروڈ کو ادوی میں قتل کر دیا گیا اور اس کا سبب زنا بتایا جاتا ہے۔ دیکھیے ہاروے کی کلاسیکل لٹریچر



کی جاتی ہے۔ ہیزڈ کی تصنیف سے کچھ اس کے ایسے مضامین ذیل ہوتے ہیں جن سے کیفیت سرا کا اظہار متصور ہے۔

جنوری کے مہینے سے خبردار ہوا ان ضرر رساں دنوں سے خبردار ہو کہ جن کی تیزی کے ساتھ سرایت کرنے والی ہوا بیلوں کی کھالیں کھینچے ڈالتی ہے۔ در حالیکہ برف باری آفتیں ڈھاتی ہے۔ زمین کو تنگ بستہ کر ڈالتی ہے۔ اور ہوا کے ہر جھونکے کو برسن بخشی ہے۔ باد شمالی تھریشیا THRACE کی طرف سے جہاں صبار قنار گھوڑوں کا کھیت ہے تیز و تند آتی ہے۔ اور سمندر میں پہنچ کر موج عظیم پیدا کرتی ہے۔ اس کی ضربت سے گھنے جنگل اور رمل گونج اٹھتے ہیں اور یہ معلوم ہونے لگتا ہے کہ گویا زمین نالہ و نغاں کر رہی ہے۔ یہ ہوا شدید ضربیں لگا لگا کر پہاڑ کی چوٹی پر کے قوی ہیکل درخت پائن PINE کو پھاڑ ڈالتی ہے اور عظیم پیکر درخت ہائے اوک OAK کو اکھاڑ کر دامن کوہ میں پھینک دیتی ہے۔ تب یکایک بالائے کوہ سے تندہی اور تیزی کے ساتھ بگولہ زمین کی طرف رخ کرتا ہے۔ پس اس وقت طوفان کا شور بلند ہوتا ہے۔ اور تمام جنگل صدائے پر خروش سے بھر جاتا ہے۔ ایسے وقت میں دواب لرزاں ترساں دم دبائے رہا کرتے ہیں اور سرد ہوا کے جھونکوں سے کوکڑ کر بھراتے رہتے ہیں۔ ہر چند ان جانوروں کی جلدیں بال سے بھری رہتی ہیں اور گوان کی پشیمیں دراز ہوتی ہیں اس پر بھی ہوائے زمہری اُن میں سرایت کر ہی جاتی ہے ایسے وقت میں بیل اپنی موٹی کھال سے بھی فائدہ اٹھا نہیں سکتا اور نہ پشیم والی بکری اپنے کو ایسی ہوائے سرد سے محفوظ رہ سکتی ہے۔ البتہ اس شمالی ہوا سے بھڑ کو ضرر نہیں پہنچتا ہے۔ جن کے گھنے بال ان کے جسموں کی پوری حفاظت کرتے ہیں۔ ایسے زمانہ میں شاخدار و غیر شاخ دار دونوں طرح کے جانور جو جنگلوں میں وطن رکھتے ہیں بھوک سے اپنے جگر بڑے بجاتے ہیں اور سردی سے ٹھٹھ کر کانپتے ہوئے پہاڑ کی کھوہوں کی طرف جہاں قد کشیدہ اوک کے درخت اُگے ہیں بھاگ نکلتے ہیں بعض کوہی تھار یوں میں جا پھپھتے ہیں اور بعض سنگی ماندوں میں گھس کر امن لیتے ہیں۔ جس طرح معمر اشخاص ناتوانی کے مارے سر جھکائے عصاؤں پر ہلتے ڈولتے آہستہ آہستہ چلتے ہیں ویسے ہی دواب کی رفتار معلوم ہوتی ہے۔ جو رینگتی ہوئی چالوں کے ساتھ اپنے کو برف باری کے صدمہ سے بچایا چاہتے ہیں۔

واضح ہو کہ سرما کا بیان بالابیانوں کی شدت سرما کی پوری تصویر ہے۔ یہ بیان ایسا ہے کہ واقعات کے ساتھ تمام تر مطابقت رکھتا ہے۔ اور فطری مذاق سے مملو ہے۔ بیان بالا کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے سرما کی کیفیتوں پر غور کو راہ دیا ہے۔ اس فصل کے تقاضوں کو خوب سمجھا ہے۔ اور قدر و واقعات سے مضامین دستیاب کیے ہیں کہ اسے مبالغہ پر داری کی کوئی حاجت نہیں ہوتی ہے۔

سفو SIPPHU یونان کی غزل گو شاعرہ ہے۔ یہ عورت چھ سو برس قبل جناب مسیح علیہ السلام کے بقید حیات تھی۔ اس کی غزل سرائی ایسی پر تاثیر تھی کہ اہل یونان اس کے کلام کے مفتوں و شیدا تھے۔ معاملات عشقیہ کے بیان پر نادر قدرت رکھتی تھی۔ خود کسی نوجوان پر عاشق تھی اس لیے اس کا کلام تمام تر عاشقانہ رنگ رکھتا تھا۔ لیکن کسی شخص نے اہل یونان سے اس شاعرہ سے بہتر نہیں لکھا۔ افسوس ہے کہ اس کے کلام بہت ضائع ہو گئے۔ اس عہد تک جو کچھ پہنچے ہیں وہ بہت قلیل رہ گئے ہیں۔ مگر ان سے لطف زبان سلاست اور دل آویزی آشکارا ہے۔ سفو کی غزل سرائی غزل سراؤں کے لیے ہدایت نامہ ہے۔ تمام اصناف شاعری سے غزل گوئی ایک دشوار شے ہے۔ اس کے لیے دل پر درد درکار ہے جس کو فطرت نے قلبی نعمتوں سے محروم رکھا ہے زہار غزل گوئی کا قہر نہ کرے۔ اس صنف شاعری کے لیے میر تقی میر صاحب کی خستگی اور مرزا نوشہ کی نشتریت درکار ہیں۔ یوں تو ہر شخص غزل گوئی کر لیتا ہے مگر واقعی غزل گوئی کیا ہے اس کو دل جانتا ہے زبان بیان نہیں کر سکتی۔ بہت سے حضرات غزل لکھنے بیٹھتے ہیں اور قصیدہ کہہ کر اٹھتے ہیں۔ ماشاء اللہ ایسے حضرات کا کیا کہنا۔ زور طبیعت ہے کہ انہیں کہاں سے کہاں لے جاتا ہے حقیقت حال یہ ہے کہ یہ حضرات کوئی فطرت نے

لے باروے کی کتاب کمین تو کلاسیکل لٹریچر صفحہ ۳۸۱ کے مطابق سفو کا عہد سات سو برس قبل از مسیح تھا۔ امداد امام اثر نے نہ معلوم کیوں اس کی شاعری کو غزل گوئی سے تعبیر کیا ہے۔ سفو کی جائے پیدائش میٹاکن یا ایروس بتائی جاتی ہے جو ملک ۶ میں کا شہر تھا۔ مشہور ہے کہ ایک شخص سے اسے محبت تھی جو اس کے لیے وفادار ثابت نہ ہو سکا اس کی شاعری میں سوز و گداز کا سبب بھی یہ بتایا جاتا ہے لیکن یونانی ادب کے محققین کو عشق کے واقعے کی حقیقت سے انکار ہے۔ ذرا



نعمت ہائے قہر سے محروم رکھا ہے یا ان کو ابھی تک اپنے نعمت ہائے قلبی سے متعمق ہونے کا موقع نہیں ملا ہے۔ اہل واقفیت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ غزل گوئی محض بے اختیار شئے ہے۔ ہر شاعر غزل گو نہیں ہو سکتا، خود کوئی سپاسگر غزل گو ایسی قدرت رکھتا ہے۔ جب چاہے غزل گوئی کر لے۔ اشعار موزوں کر لینا اور ہے اور سچی کیفیت قلبیہ کے ساتھ کچھ کہہ لینا اور ہے۔ انشا اللہ تعالیٰ آئندہ اصناف شاعری کی بحثیں آتی ہیں۔ اپنی جگہ پر پوری حقیقت غزل گوئی کی عرض کی جائے گی۔

پینڈار PINDAR یونان کا شاعر قصیدہ گو ہے۔ یہ شخص قریب چار سو پچاس برس قبل حضرت مسیح علیہ السلام کے زندہ تھا۔ اس شخص نے لیرکس LYRICS کے احاطہ کو وسیع کرنے کے لیے اڈہ ODE کی صورت پیدا کی ہے۔ یعنی غزل کے دائرہ کو وسعت دے کر قصیدہ کر ڈالا ہے۔ اس شاعر کے قصائد جو دیوتاؤں کے محامد و منہ ہیں ابھی تک موجود ہیں۔ ان سے زور طبیعت، حسن بیان اور لطف زبان آشکارا ہے۔ اس شاعر نے مرثیہ نگاری بھی کی ہے اور اس کی مرثیہ گوئی بھی لطافت شاعریہ سے مملو ہے۔ یہ شخص صوبہ بوشیا BEOTIA کا رہنے والا تھا۔ اس صوبہ کے لوگ برخلاف دیگر صوبہ جات کے یونان کے نہایت کند ذہن اور ابلہ مزاج ہوتے تھے۔ مگر پینڈار اپنے ہم وطنوں میں مستثنیٰ تھا۔ اس کے تمام ہموطنوں کے عوض طبیعت داری اسی کو محبوب ہوتی تھی۔ آج تک بھی جو کسی ملک کے لوگ کند ذہن یا کم فہم ہوتے ہیں تو اس ملک کو بوشیا کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے صوبہ بہار کو بھی بعض اہل رائے نے بوشیا کے خطاب سے یاد فرمایا ہے لیکن اب ممتاز طور سے یہ صوبہ علمی ترقی کرنے لگا ہے۔ اور اس صوبہ میں کچھ لوگ پینڈار کی فہم و فراست کے نظر آنے لگے ہیں۔ حقیقت حال یہ ہے کہ صوبہ بہار کے سکنا ذہن و ذکا میں کوئی خلقی نقصان نہیں رکھتے ہیں۔ مولانا محب اللہ بہاری صاحب، مسلم فہرست و سیدل اسی صوبہ کے آدمی تھے۔ مگر کیفیت یہ ہے کہ اس صوبہ کے سکنا عہد انگلیشیہ میں بہت عرصہ

لے ہاروے کے مطابق پینڈار کی پیدائش کا سال یا تو ۵۱۸ ق م ہے یا ۵۲۲ ق م۔ یہ شخص کے نزدیک ایک گاؤں میں پیدا ہوا اور اس کا تعلق اسپارٹا کے معزز خاندان سے تھا، اس کا انتقال ۴۷۸ برس کی عمر میں آگ میں ہی ہوا۔ و۔ ۱

کے بعد علوم یورپ کے حاصل کرنے کی طرف مائل ہوتے۔ اس واسطے اہل بنگالہ کے مقابلہ میں پسپا معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن بیس برس کے اندر جو کسی قدر اہل بہار علم اندوزی کی طرف متوجہ ہوئے ہیں تو اب ان کی توجہ کا اثر بخوبی میسر ہوتا ہے اور جس انداز سے اب اہل بہار ترقی کر رہے ہیں اس سے امید کی جاتی ہے کہ نصف صدی کے اندر اہل بنگالہ سے پیچھے نہیں رہیں گے۔ خیر پندار یونان کا ایک نامی شاعر ہے۔ اس کے زور طبیعت نے اس کے عہد کی شاعری میں ایک انقلاب پیدا کیا تھا۔ تمام اہل یونان نے اس کا رنگ اختیار کیا اور پندار کا رنگ قومی شاعری کا رنگ مانا جانے لگا۔ حقیقت حال یہ ہے کہ پندار کے زور طبیعت خلاق سخن نے یونان میں ڈراما کا تخم بویا۔ چنانچہ بعد پندار کے یونان میں ڈراما نگاری نے ظہور پکڑا اور اس کے مروج ہو جانے نے یونانی شاعری کو درجہ کمال کو پہنچا دیا۔ یونانی ڈراما نگاری سے ممتاز اشخاص اسکاتیلس Aeschylus سفاکلز Sophocles یورپائیڈیز Euripides اور ارستوفینز Aristophanes ہیں۔ ان میں پہلے تین شاعر ٹریجڈی نگار ہیں۔ اور آخر ان کا کامیڈی نگار ہے

۵۲۵ ق م اور وفات ۴۵۶ ق م، یونان کا مشہور حزنیہ شاعر، اتھنز کے قریب پیدا ہوا اور سسلی کے شہر گیلہ میں فوت ہوا۔ کہتے ہیں کہ اس نے نوے ڈرامے قلم بند کیے لیکن ان میں صرف سات ہم تک پہنچے ہیں Aeschylus اسکاتیلس کو یونانی المیہ ڈرامے کا بانی تسلیم کیا جاتا ہے۔ ڈرامے میں دوسرا کردار اسی نے پہلے پہل لایا۔

۴۹۴ ق م اور وفات ۴۰۶ ق م۔ اسکاتیلس کے بعد اسی کا درجہ ہے، یہ بھی اتھنز کے قریب پیدا ہوا، اس کے بھی سات حزنیہ ڈرامے خاصے معروف ہیں۔ اس نے ڈرامے میں تیسرا کردار لایا۔ تیسرا زمان کا تیسرا اہم ترین حزنیہ ڈراما نگار، پیدائش ۴۸۰ ق م اور وفات ۴۰۶ ق م۔ اس کے اٹھارہ ڈرامے ملتے ہیں۔

۴۴۸ ق م اور وفات ۳۸۵ ق م، اس کی حیثیت کا مک شاعر کی بھی ہے ۴۴۸ ق م میں پیدا ہوا۔ وفات کی تاریخ ۳۸۵ ق م ہے۔ اس نے سیاسی ڈرامے بھی لکھے۔ انگریزی ڈرامے پر خصوصاً بن جولین پر اس کے اثرات کافی ہیں۔



## اسکائیلس

اسکائیلس AESCHYLUS چار سو بیس برس قبل حضرت مسیح علیہ السلام کے زندہ تھا۔ اس کی ڈراما نگاری نے شاعری کی ایک نئی دنیا پیدا کر دی۔ اس شاعر کی ستر ٹریجڈیوں سے اس وقت صرف سات ٹریجڈیاں موجود ہیں اور بہت کچھ ارباب مذاق کی توجہ کے قابل ہیں۔

## سفاکلیز

سفاکلیز SOPHOCLES چار سو پچاس برس قبل مسیحی کے بقید حیات تھا۔ اس شاعر نے معاملات انسانی کو انواع پہلو سے حوالہ قلم کیا ہے۔ اس شاعر کے کچھ کلام کا ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ یوں تو بہت چیزیں عجیب و غریب ہیں۔ مگر انسان اعجب العجائب ہے۔ وہ اس قدر دلیر ہے کہ عین طوفان کی حالت میں ایسے سمندر میں چلا جاتا ہے کہ جہاں مدام ہر طرف موجوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ دھرتی کو جو سب دیوتاؤں سے زبردست باقی اور پائدار ہے سال بسال اپنے مصرف میں آتا ہے۔ ہل ہرمت چلا چلا کر اس کے ڈھیلوں کو توڑتا ہے اور روزمرہ کا کام ہمیشہ اپنے گھوڑوں سے لیتا ہے۔

واضح ہو کہ سفاکلیز نے اپنے کلام بالائیں انسان کا اعجب ہونا بیان کیا ہے۔ امر قبحی بھی یہی ہے کہ انسان اعجب مخلوقات الہی سے لاریب اس کے افعال و حرکات نہایت تعجب خیز ہیں۔ مگر اس شاعر نے صرف خارجی تعجبات انسانی کو حوالہ قلم کیا ہے۔ اس کے اندرونی تعجبات کی طرف توجہ نہیں کی ہے۔ مگر امیر المومنین علی علیہ السلام نے اپنے کلام ذیل میں جامعیت حقیقت انسانی کو ارشاد فرماتے ہیں۔

دعاءك فيك وما تشعر دعاءك منك وما تبصر

وتحبب انك جرم مغير فيك انطوى العالم الاكبر

یعنی تیری دعا تجھ میں ہے اور تو نہیں جانتا اور تیرا درد تجھ سے ہے اور تو نہیں دیکھتا تو سمجھتا ہے کہ تو ایک جسم صغیر ہے۔ درحالیکہ تجھ میں متمول عالم اکبر ہے۔



ارباب حقیقت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ ان دونوں شعر میں حضرت نے انسان کی حقیقت سے خبر دی ہے۔ اور آگاہ فرمایا ہے کہ انسان اگر اپنی حقیقت سے واقف ہو جائے تو جزو دکل وہی ہے۔ اس کے سوا پھر کوئی دوسرا نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کلام انسان کے اعجب امور کو ظاہر کرتا ہے۔ سبحان اللہ کیا پاکیزہ خیال ہے اور کس قدر اخلاقی اور دینی تعلیم اس سے ہویدا ہے۔ انصاف یہی ہے کہ حضرت اقبال عجب تعلیمی پیرایہ رکھتے ہیں اور فی الواقع معاملات اخلاقی اور امور روحانی میں روئے زمین پر آپ کا نظیر نہیں ہے۔ آپ کا ہر کلام کلام الامیر۔ امیر الکلام کا مصداق ہے۔ کیوں نہ ہو جب درحقیقت آپ قرآن ناطق ہیں اور زبان آپ کے ترجمان حق ہے۔ انشا اللہ تعالیٰ آئندہ آپ کے کچھ کلام اپنے موقع پر درج تالیف ہذا ہوں گے۔ بہر حال اس جگہ پر سفاکیز کے مضامین بالاکسی نسبت یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ اس کا کلام بالابھی اپنے موقع پر خوب ہے۔ اس کے اشعار کا یہ مطلب ہے کہ انسان اپنے کو ایک شے بیکار نہ سمجھے۔ وہ بہت دشوار کاموں کے کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اسے بڑی قوتیں عطا ہوئی ہیں۔ اگر اپنی صلاحیتوں سے کام لے تو بہت کچھ کر سکتا ہے۔ البتہ اس شاعر کا رخ دنیوی امور کی طرف ہے۔ مگر ترقی دنیاوی اگر حق طور پر ہو تو ہرگز مذموم نہیں ہے۔ الدنیا صرعة الاخرة۔ بلا گفتگو ترقی دنیاوی ایک نہایت توجہ طلب امر ہے کہ دین دنیا تو ام ہیں اور تقاضائے اسلام بھی یہی ہے کہ انسان کا دین و دنیا بخر ہو۔ اسلام کی فرمائش یہ زہنہار نہیں ہے کہ دنیا کی خرابی کے ساتھ عافیت سنورے۔ لمولفہ دنیا کی خرابی ہو نہ عقبی کی مضرت پیدا کرے اوقات کی صورت بشرابی جن لوگوں نے یہ شیوہ اختیار کر لیا ہے کہ بے ہاتھ پاؤں ہلائے دوسروں کی محمولہ بر بلا استحقاق اوقات کرتے ہیں ہرگز اسلام کے حکم تعمیل نہیں کرتے اسلام کا حکم یہ ہے کہ اپنے قوت بازو سے سامان رزق بہم کرو۔ تجارت کرو کھیتی کرو، نوکری کرو جس سبیل حلال سے اکتساب معاش کی صورت ہو اس میں کوشاں ہو۔ یہ کبھی اسلام کی فرمائش نہیں ہے کہ اپنے کو اپا بج، نکتا، نکھو، افلاس زندہ، دست نگر بنا ڈالو دوسروں کی کمائی میں بے ہاتھ پاؤں ہلائے شریک ہو جاؤ۔ دھوکہ دھاڑی سے روٹی حاصل کرو۔ اپنی تقدس مآبی ثابت کر کے یو قوفوں کو جوڑو اور لوٹو۔ اس طرح کے شیوے جو مذہبی پیرایہ



میں مروج دیکھے جاتے ہیں۔ یہ سب فواحدات ہیں۔ اس کو نہ پیغمبر صاحب کرتے تھے نہ خلفا اور نہ مجتہدین علی مرتضیٰؑ اجرت پر کنویں سے پانی نکالتے تھے اسی طرح بزرگان دین محنت کر کے اوقات فرماتے تھے۔ مولانا شمس الدین ناخوری جو ایک درویش خدارسیدہ تھے۔ مزدوروں کے ساتھ دیوار اٹھا کر رزق حاصل کرتے تھے۔ اگر کوئی مفت خوری کوئی اچھی بات ہوتی تو یہ حضرات بارکات بھی جھونس جھانس پر زندگی کا رآمد رکھتے۔ اعوذ باللہ من ذلک۔ المنحقر جن لوگوں نے اپنے کو ایسا بیکار محض بنا رکھا ہے ان سے کب یہ ممکن ہے کہ سفر بحری اختیار کریں۔ زمین کو جوتیں یا کسی طرح کی ریاضت کریں۔ جس کی وجہ سے وہ اپنے کو سفاکلینز کے قول کا مصداق بنا سکیں۔ پس جب وہ اتنی بھی صلاحیت نہیں رکھتے تھے ان سے کیا امید ہے کہ مجاہدہ نفسی کی بدولت اپنے کو اس درجہ معرفت کو پہنچائیں کہ اپنے میں عالم اکبر کا تماشا دیکھیں

## یورپائیڈیز EURIPIDES

یورپائیڈیز  
سفاکلینز کا ہم عصر تھا۔ اس شاعر کے کلام میں درد پایا جاتا ہے۔ مگر اس کی شہرت میں ارسطوفینز ARISTOPHANES کے ہجو نگاری سے خلل واقع ہو گیا ہے۔ درنہ خود یہ شاعر ممتاز پایہ رکھتا ہے۔

## ارسطوفینز ARISTOPHANES

ارسطوفینز ARISTOPHANES ایک بڑا شوخ مزاج شاعر ہے۔ اس کی طبیعت ہجو میں خوب لڑتی تھی اس نے بہت سی ہجویں لکھی ہیں۔ سقراط کی ہجو اس نے لکھی تھی۔ اس حکیم نامی کی ہلاکت کا سبب یہی شاعر ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے ارسطوفینز کو ہجو کی طرف میلان طبعی تھا۔ چنانچہ وابل اٹھنس ATHENS کی جو اس کے ہم وطن تھے۔ چالیس برس تک ہجویں لکھتا رہا۔ اس شاعر کو خلاقی مضامین کی عجیب و غریب قوت حاصل تھی اور اس کے کلام پر تاثر ہوتے تھے۔

یہ ظاہر ہے کہ یونانی شاعری کے حالات اس مختصر کتاب میں مفصل طور پر درج نہیں ہو سکتے۔ اگر تفریع کے ساتھ ہر شاعر کے احوال و اقوال و القلم ہوں تو یہ کتاب بہت

طولانی ہو جائے گی۔ مثل ہے کہ رات بھوڑی اور سانگ بہت ناچار راقم قلم کو روک لیتا ہے۔ اور حضرات ناظرین سے خواستگار ہوتا ہے کہ اب لاطینی شاعری کی طرف مبذول فرمائیں۔ عند الملاحظہ یہ بات ظاہر ہوگی کہ لاطینی شاعری یونانی شاعری کا انداز رکھتی ہے۔ بلکہ تمام تر متبع یونانی شاعری کی ہے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح پر اردو کے شعرا فارسی کے شعرا کا متبع کرتے رہے ہیں لاطینی شعرا یونانی شعرا کے متبع رہے ہیں اور جس طرح پر اردو کی شاعری فارسی کی شاعری تک بہت باتوں میں نہیں پہنچ سکی ہے وہی حال لاطینی شاعری کا بھی پایا جاتا ہے۔

## لاطینی شاعری

### بیان ملک ایتالیہ

ملک ایتالیہ ITALY بشکل جزیرہ نمایاں ہے۔ اس کے شمال میں ملک جرمنی اور سوئٹزرلینڈ، مغرب میں ملک فرانس اور بحرِ عمان، جنوب میں بحرِ یونان اور مشرق میں بحرِ ایڈریاٹک اور بھی کاربنو لاجو ملک آسٹریا کا ایک صوبہ ہے واقع ہیں۔ طول اس ملک کا ۵۸۰ میل ہے اور عرض ۳۱۰۔ مگر جہاں پر اس کا عرض کم ہے وہاں ۱۵۰ میل سے زیادہ نہیں ہے۔ اس ملک کو بحری مواقع بہت ہیں۔ اس کے متعلق بہت سے جزائر بھی ہیں۔ مثلاً سسلی، سارڈینیا، الباکارہیکا، مالٹا وغیرہ یہ ملک نہایت پرفنا اور خوش آب و ہوا ہے۔ خالق نے اسے فطرتی اسباب سے بڑی خوش سوا دی بخشی ہے۔ ہر طرح کے پہاڑ موجود ہیں۔ کوئی بہت رفیع جیسے سلسلہ آپس کوئی پست جیسے چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ہوتی ہیں۔ ان میں سے کوئی سبز و گل میں چھپا ہوا ہے اور کوئی روئیدگیوں سے تمام تر معرا ہے کہیں چشمے ابل رہے ہیں اور کہیں جھرنے جاری ہیں۔ ندیاں رواں ہیں۔ کہیں دریا پہاڑ کو کاٹتے نکل گئے ہیں۔ کہیں پانی بلند دی سے نشیب کی طرف زوروں سے گر رہا ہے۔ دامن کوہ میں ہزار ہا اشجار قد کشیدہ نظر آ رہے ہیں۔ وادیوں کی صورت گلہائے صحرائی سے عجب رنگ دکھلا رہی ہے۔ سہانے سہانے جنگل پوری شادابی کے ساتھ نادر سماں پیدا کر رہے ہیں۔ مختصر یہ کہ خوشنمائی کے فطرتی اسباب اس کثرت سے مہیا ہیں کہ ایتالیہ کے



نہایت دلچسپ ہونے میں کوئی گفتگو نہیں کی جاسکتی ہے۔ شاعر و مصور دونوں کے لیے یہ ملک خلقت کی رو سے موزوں ہے۔ عالم موسیقی بھی اس رائے سے اختلاف نہیں کر سکتا ہے۔ کس واسطے کہ راگنیاں ایسے دیس کے سوا اور کہاں رہنا پسند کر سکتی ہیں۔ آب و ہوا بھی اس ملک کی نہایت مطبوع ہے سوا ایسے مقامات مرطوب کے جو نیپال کی تری کا انداز رکھتی ہے یہاں کے مشہور دریاؤں سے پو PO اور ٹائبر TIBER ہیں۔ حیوانات صحرائی، خوک، ہرن، بجر، بجال، بڑ کوہی، سیاہ گوش، گرگ، اشتال، رویا، اور خرگوش ہیں اور طیور میں اغراض صید کے جانور کبیرت میسر آتے ہیں۔ اس ملک کی پیداوار قابل توجہ ہے۔ انگور، زیتون، انجیر، سیب و دیگر میوہ جات خوب پیدا ہوتے ہیں۔ وہاں ہر طرح کی دالہن، مکئی، روٹی، ریشم اور اقسام رنگ کی ترکاریوں اور سبز یوں کی کوئی کمی نہیں ہے مولشی بھی کثرت سے پروردہ کیے جاتے ہیں اور ان کی پرورش میں آسانی اس سبب سے ہوتی ہے کہ بڑی بڑی چراگا ہیں دریا ئے پو کے قریب میں واقع ہیں۔ یہاں ایسا عمدہ پتھر بنتا ہے کہ روئے زمین پر اس کا نظیر نہیں دیکھا جاتا ہے۔ ملک ملک بسبیل تجارت جاتا ہے۔ اور ملکوں کے لوگوں نے بھی اس کی نقل اتارنی چاہی۔ مگر ویسا کبھی نہ بن سکا۔ واضح ہو کہ مولشی کے دودھ میں چری کو بڑا دخل ہے۔ جہاں اچھی چری نہیں ملتی وہاں کے مولشیوں کے دودھ اچھے نہیں ہوتے۔ ہندوستان کے آباد حصوں میں اب جانوروں کو چری کا عمدہ موقع کم رہا ہے۔ اس لیے آباد مقاموں میں اچھا دودھ نہیں ملتا ہے۔ یہ امر ایسا ہے کہ بھی خواہاں زراعت کو اس کی طرف توجہ کرنا چاہیے۔ بہر حال علاوہ پیداوار زراعت کے اس ملک میں سنگ مرمر اور بعض دیگر بیش قیمت پتھروں کی کاٹیں بھی دیکھی جاتی ہیں۔ پٹھری، تانبا اور لوہے کے معدن موجود ہیں۔ الغرض کافی پیداوار اس ملک کی اچھی ہے۔ واضح ہو کہ اہل ایطالیہ موسیقی کا مذاق خوب رکھتے ہیں اور اچھے گانے والوں کی اس سرزمین میں کوئی کمی نہیں ہے جس بھی اس ملک کا دل آویز ہے۔ مختصر یہ ہے کہ ارباب مذاق کے لیے یہ ملک تمام تر مناسب ہے۔ ایسے ملک کو اگر شاعری، مصوری اور موسیقی سے مناسبت نہ ہو تو پھر کس ملک کو ہو سکتی ہے۔ چنانچہ ان تینوں نفیس فن میں یہ ملک ممتاز رہا ہے۔

ارباب علم کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک ایطالیہ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ایک

بادشاہ ایتالیہ نامی ملک آرکیڈیا کی طرف سے آکر یہاں اقامت گزریں ہوا تھا۔ جس کے سبب سے یہ ملک اسی کے نام سے موسوم ہوا۔ بعض محققین کا یہ بھی بیان ہے کہ ایتالیہ مشتق ہے لفظ ایتالیں سے جس کے معنی بیل ہے۔ چنانچہ اس ملک میں گائے بیل کثیر الوجود ہیں اس واسطے اس کا نام ایتالیہ قرار پایا۔

## بیان اہل روم

جاننا چاہیے کہ زبان لاطینی اس قوم کی ہے جو سابق متوطن ملک ایتالیہ کی تھی۔ اس ملک کا دارالسلطنت شہر روم تھا یہ شہر اب بانی نہیں ہے۔ اور وہ شہر جو اُس کی موجود ہے روم جدید ہے اور جو زبان اس وقت وہاں بولی جاتی ہے اُسے ایتالین کہتے ہیں۔ روم سابق کی مختصر تاریخ یہ ہے کہ اس شہر کی بنا ڈالی ہوئی دو شخصوں کی ہے۔ جو ایک شہزادی کے بطن سے تھے۔ ان دونوں بھائیوں کا نام رامولس ROMULUS اور ریمس ہے کہتے ہیں کہ ان دونوں بھائیوں کو ایک گرگ مادہ نے پالا تھا۔ ان کے افسانہ نما احوال کو پلوٹارک PLUTARCH مورخ نے وضاحت کے ساتھ لکھا ہے۔ اور اس عجیب معاملہ کو ابو الغدا نے اپنی تاریخ المختصر فی احوال البشر میں درج کیا ہے۔ آدمی کے بچوں کو ایک گرگ کا پالنا ظاہراً قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا ہے۔ عموماً کم تر کوئی شخص ایسے قصہ کو مطابق فطرت سمجھے گا۔ اور ایک عرصہ تک راقم بھی اس کو ناممکن الوقوع سمجھتا رہا۔ مگر جب سنے کرنیل سلیمن COL. SLEMAN صاحب کی رپورٹ دیکھی اور متواتر دو تین ایسے واقعات کی سچی خبریں راقم کو پہنچی گئیں تب اس بات کا یقین ہوا کہ آدمی کے بچے کو بھیڑیوں کا پالنا ممکن الوقوع ہے۔ بہر حال یہ دونوں بھائی شہر روم کے بانی کہے جاتے ہیں۔ اس شہر کی بنا سات سو پچاس برس سے کچھ اوپر قبل مسیح کے قرار دی جاتی ہے۔ شہر کی بنا ڈالنے کے بعد دونوں بھائیوں میں اختلاف پیدا ہوا، چنانچہ بڑے بھائی یعنی رامولس نے ریمس کو مار ڈالا اور اپنی حیات تک اس شہر کا بادشاہ رہا۔ بعد ازاں چند شخص یکے بعد دیگرے اس کی جگہ پر بادشاہ ہوتے گئے۔ آخر کار شخصی سلطنت کا طریقہ اُٹھا دیا گیا اور جمہوری سلطنت قائم ہوئی۔ چند صوبوں تک رومیوں کی سلطنت اسی شکل پر قائم رہی۔ یہاں تک کہ جولیس سیزر



JULIUS . CAESAR نے اس انتظام سلطنت کو درہم برہم کر کے پھر شخصی سلطنت قائم کر دی اور اسی وقت سے ایک سلسلہ شہنشاہوں کا جاری ہوا جس کا پہلا شاہنشاہ خود جولیس سیزر تھا۔ لفظ قیصر سیزر کا معرب ہے۔ اور اب یہ لفظ بمعنی شاہنشاہ استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ شخص سو برس قبل مسیح کے پیدا ہوا تھا۔ اور تینتالیس برس قبل اس حضرت کے مقتول ہوا۔ یہ شخص نہایت مرد مہصل تھا۔ اور اس کی تحریریں آج تک اس کے اعلا ورجہ کے قابلیت کی شہادت دیتی ہیں۔ واضح ہو کہ رومیان سابق اپنی ابتدائی حالت میں نا تعلیمتہ انداز کے لوگ تھے اور ان کی نا تعلیم یافتگی ان کے روز افزوں اقبال کے ساتھ بھی ایک عرصہ تک برقرار رہی۔ لیکن جب ان رومیوں کو اہل یونان سے سابقہ پڑتا گیا۔ تو یونانیوں سے انھوں نے اکتساب علم کرنا شروع کیا۔ بہر حال جس وقت رومیوں کا اقبال ترقی کر رہا تھا۔ یونانیوں پر ادبار آ رہا تھا۔ کچھ عرصہ میں یہ نوبت پہنچی کہ رومیوں نے یونانیوں کو شکست دے کر بد حال کر دیا۔ یہاں تک کہ یونان روم کا ماتحت سمجھا جانے لگا۔ اس وقت میں ہر چند یونانیوں سے اقبال رخصت ہو چکا تھا اس پر اہل یونان اپنی فاتح قوم سے علوم و فنون میں غالب تھے۔ مگر تقاضائے اقبال سے رومیوں نے یونانیوں سے علم اندوزی کرنا نہ چھوڑا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یونانی علوم رفتہ رفتہ رومیوں میں مروج ہو گئے۔ منجملہ بہت سے علوم و فنون کے اہل مذاق شاعری نے بھی رومیوں کے دلوں میں جگہ پیدا کی۔ یونانی شعرا کی تصانیف بزبان لاطینی ترجمہ ہوتی گئیں۔ ایلپیڈ کا ترجمہ بھی لاطینی میں تمام کو پہنچا۔ پھر اس زبان میں شعرائے نامی پیدا ہوتے گئے۔ جن کا ذکر آئندہ آتا ہے۔ ان رومی شعرا کے کلام میں یونانی مذاق تمام تر ہویدا ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ رومی شعرا یونانی شعرا کے متبع ہیں۔ پس وہی نسبت جو اردو شاعری کو فارسی شاعری کے ساتھ ہے لاطینی شاعری کو یونانی شاعری کے ساتھ پیدا ہے۔ درمیان سابق بھی یونانیوں کی طرح بتدرست تھے۔ اور جو انداز یونانیوں کے اصنام پرستی کے تھے وہی رومیوں کے بھی تھے۔ اسی لیے اور مضامین کے علاوہ رومیوں کی شاعری بھی دیوتاؤں اور ہیروؤں وغیرہ کے بکھرے سے خالی نظر نہیں آتی ہے۔ بشر بھی دونوں قوموں کی ایک ہی انداز رکھتی ہے اور حق یہ ہے کہ مضامین بتدرست پرستی کو چھوڑ کر ہر دو قوم کو نشر و نظم خوش اسلوب اور مرغوب پیرایہ رکھتے ہیں۔ حال کا لڑیچہ جو اہل یورپ کا ہے انھیں دو قوموں کا نمونہ ہے۔ گویا ان دونوں

قوموں کا لٹریچر حال کے اہل یورپ کے لٹریچر کے ہادی و رہبر ہوئے ہیں اس زمانہ کا لٹریچر جو اہل یورپ کا ہے نہایت حیرت خیز ہے۔ زبان اس کے بیان سے قاصر ہے۔ افسوس ہے کہ اہل فارس نے عمدہ مذاق لٹریچر کا پیدا نہیں کیا۔ نظم فارسی کی تو خیر کچھ ہے بھی نثر کا مذاق تو بہت کچھ قابل اعتراض ہے۔ اہل انصاف ارشاد فرمائیں کہ سہ نثر ظہوری، مینا بازار اور حکیم تہائی کے کلام منشور وغیرہ میں کیا خوبی ہے۔ بلکہ جو کچھ اگلے لوگ کچھ مذاق پیدا کر گئے تھے ان متاخرین نے اسے خراب کر ڈالا ہے۔ اسی طرح اردو کا لٹریچر بھی خراب ہو چکا تھا۔ مگر مذاق بدلتا نظر آتا ہے۔ خدائے تعالیٰ اپنا فرض شامل حال رکھے۔ ظاہراً مقفع مسیح لکھنے والے حضرات تو لٹریچر کا خاتمہ کر چکے تھے۔ مگر اس ناپرساں زبان پر اللہ نے رحم فرمایا کہ کچھ لوگ مولوی نذیر احمد صاحب وغیرہ سے پیدا ہوئے جنہوں نے عوام کے خیالات میں انقلاب پیدا کیے ہیں۔ انشا اللہ تعالیٰ عربی و فارسی اور اردو کے لٹریچر کی بحث آئندہ لکھوں گا۔ جس سے بد مذاق مصنفوں کی لٹریچر کشی ظاہر ہوگی۔ خیر حضرات ناظرین ان جملہ ہائے معترفہ کو معاف فرمائیں۔ اب میں پھر رومیوں کی شاعری کی طرف رجوع لاتا ہوں اور یہ گزارش کرتا ہوں کہ چونکہ یونان و روم کی شاعریوں کا ایک ہی انداز ہے رومیوں کے مذاق شاعری کی بحث کو طول دینا ضروری نہیں معلوم ہوتا۔ بہر حال ذیل میں چند شعرائے رومی کے حالات و اقوال حوالہ قلم کر دیے جاتے ہیں۔ جن سے کسی قدر حضرات ناواقف کو اطلاع کی صورت متصور ہے۔

## لکریشنس

لکریشنس LEONETINS روم کے شعرائے متقدمین کا سرآمد ہے۔ یہ شاعر بانوے برس قبل ظہور حضرت مسیحؑ کے پیدا ہوا تھا۔ اس کی شاعری کا رنگ تہایت حکیمانہ ہے۔ اس کی تصانیف مضمون سے ایک کتاب ہے جس کا نام حقائق الاشیا

۱۔ اس فلسفی شاعر کی امکانی تاریخ پیدائش ۹۹ ق م اور وفات ۵۵ ق م بتائی جاتی ہے۔ سینٹ جیروم کے مطابق اس کا سال پیدائش ۹۳ ق م ہے اور وفات ۵۰ ق م جس کتاب کا امداد امام اثر حوالہ دے رہے ہیں اس کے چھ حصے ہیں۔ اس رومی شاعر نے اہل روم کے دینی اعتقادات پر خاصی ضرب لگائی ہے۔



ON THE NATURE OF THINGS ہے یہ کتاب سراپا فلسفہ ہے یہاں پر یہ امر قابل ذکر ہے کہ یونانیوں کا مذاق فلسفہ رومیوں کے مذاق فلسفہ سے بالکل علاحدہ تھا۔ گورومیوں نے فلسفہ کی دولت یونانیوں سے پائی تھی۔ اہل یونان کو علم ذہنیہ کی طرف میلان تھا۔ برخلاف اس کے اہل روم علوم مادیہ پر زیادہ توجہ رکھتے تھے۔ مگر یہ شاعر برعکس اپنے قومی مذاق کے تمام تر یونانی مذاق کا پابند تھا۔ اور وہ اسی مذاق کے ساتھ امور اخلاقی اور مذہبی کو حوالہ قلم کرتا ہے۔ کیا افسوس ہے کہ ہمارے ملک کے شعرا کم تر یونانی اور رومی شعرا اور ان کی شاعریوں سے خبر رکھتے ہیں۔ اگر ہمارے ملک کے موزوں طبیعت حضرات کو ان اقوام گذشتہ کی شاعریوں سے اطلاع کی صورت پیدا ہو تو یقیناً ایک انقلاب عظیم ہماری دیسی شاعری میں نمایاں ہو۔

## کٹیئاس

کٹیئاس KATELLAS بھی روم کے شعرائے متقدمین سے ہے۔ یہ شاعر چون برس قبل سن مسیحی کے بقید حیات تھا۔ اس کے کلام میں بڑا درد پایا جاتا ہے۔ واقعی اس کا انداز بیان ایسا ہی ہے کہ خواہ مخواہ دل پر چوٹ لگتی ہے۔ اس پر دردی کے ساتھ اس کی شاعری فصاحت و بلاغت سے خالی نہیں ہے۔ بیشتر اس شاعر کے کلام عاشقانہ رنگ ہونے کے باعث غزل سرائی کا پیرایہ رکھتے ہیں۔ علاوہ اس کے مرثیہ نگاری کی طرف بھی اس کا میلان تھا۔ جاننا چاہیے کہ غزل سرائی کی صلاحیت ہر شاعر کو نہیں ہوتی ہے۔ واقعی جن کی طبیعت عاشقانہ رنگ یا گداختگی نہیں رکھتی ہے وہ کبھی غزل گو ہو نہیں سکتا۔ ہمارے ہلکی شاعروں میں اس وقت بھی حضرات موجود ہیں کہ غزل گوئی کے لیے وہ مخلوق نہیں ہوئے تھے اس پر بھی غزل گوئی کی جان نہیں چھوڑتے۔ اپنے خلقی نقصانات سے باخبر ہونا بھی ایک بڑی نعمت ہے۔ اگر انسان میں اتنی تمیز موجود ہے تو بہت سی حماقتوں سے بچ سکتا ہے۔ بہر حال کٹیئاس کا کلام بلاشبہ بہت پُر درد ہے اس کے کچھ اشعار کا ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

لے CATULLUS سال پیدائش ۸۴ ق م اور وفات ۵۴ ق م۔ درونیاں پیدا ہوا اور ۶۲ ق م میں روم آیا۔ کہتے ہیں کہ یہی ایک اور حزن زدہ ڈرامہ کی بیچ کی کڑی یعنی تپلوں کا موجد ہے۔ بن جونس بھی اسی سے متاثر تھا۔

اس سے اس کے طبیعت کی خستگی کا کسی قدر موازنہ متصور ہے۔ یہ اشعار اس نے اپنے برادر متونی کے لیے مرثیہ یا نوحہ کے طور پر لکھے تھے۔

## مرثیہ

اے بھائی میں تیری دور افتادہ قبر پر مراسم عزاکا اداکاری کے لیے بہت سے سمندوں کو طے کرتا ہوا اور بہت سے دریا غیر معروف سے گذرتا ہوا آیا ہوں۔ اور تیری بے صدا خاک کے نزدیک کھڑا رہتا ہوں میں تجھے بیکار پکار رہا ہوں۔ تیرہ وقار تحت النریٰ سے کیا جواب ملے۔ اے بھائی اے بھائی زندگی کا کوئی لطف نہ رہا۔ جب بے رحمی کے ساتھ تو مجھ سے چھین لیا گیا۔ ایک دن آئے گا جب ہم تجھ سے ملیں گے اس وقت مجھ سے وہ عطیہ قبول کرے جس سے ہم لوگوں کے اجداد مقدس اور محترم ہاتھوں سے اپنے ان عزیزوں کی قبر پر چڑھاتے تھے۔ جن سے وہ عین حیات میں محبت رکھتے تھے۔ یہ نذریں بھائی کے آنسوؤں سے نم ہو رہی ہیں۔ اب میں رخصت ہوتا ہوں سلام تجھ پر اور تمام ہر اس دیم سے تجھ کو امان۔

دراغ ہو کہ اس شاعر نے بھائی کی قبر پر نوحہ خوانی کے انداز کو خوب دکھلایا ہے۔ اس میں نہ کوئی مبالغہ ہے اور نہ کوئی غیر فطرتی آہنگ، مضامین بالا کہے دیتے ہیں کہ بھائی کا غم بھائی کو کس طور پر ہونا چاہیے یعنی بڑا در متونی کے غم کا کیا تقاضا ہے۔ اگر کوئی غیر فطرتی مذاق کا شاعر ہوتا تو ایسے محل میں آسمان سے خون برساتا اور سے آنسو گروتا۔ اور اسی طرح کے برقرینہ مضامین سے نوحہ کی تمام تاثیروں کو کھودیتا۔ یہاں شاعر نے اظہار غم کے فطرتی رنگ کو اختیار کیا ہے۔ جس کے سبب سے دل کو جوٹ لگتی ہے۔ جاننا چاہیے کہ غیر فطرتی انداز کے مضامین سے حظ کا اٹھنا ممکن نہیں ہے۔ جب تک کہ مذاق سامع شاعر کے مذاق کی طرح خراب نہ ہو۔ غیر فطرتی شاعری مطبوع نہیں ہو سکتی۔ ہمارے عہد کی ویسی شاعری بہت اصلاح طلب ہو رہی ہے۔ نامطبوع استعارات و مبالغہ پرداز یوں نے وہ بے لطفی پیدا کر رکھی ہے کہ ایسی شاعری کا کوئی اثر دل پر پیدا نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے ہندی شاعری دیکھی جاتی ہے۔ ہندی کے دہے، گیپتس وغیرہ جو بیشتر استعارات مبالغہ پرداز یوں اور بے معنی خیالیوں سے معرا ہوتے ہیں عجب تاثیر رکھتے ہیں۔ ان کی سادگی اور فطرتی خوبیاں نشر کا کام کرتی ہیں۔ جو حال اردو کی شاعری کا ہے وہی فارسی کی شاعری کا



بھی ہو رہا ہے۔ اگر سادگی اور فطرتی انداز بیان میں دلربائی نہ ہوتی تو بے چارے سعدی، حافظ کو کون پوچھتا۔ میر صاحب کو کون مانتا۔ افسوس ہے بہت سے شعرائے فارسی وارد نے فطری خوبیوں سے انحراف کر کے شاعری کو سوہان روح بنارکھا ہے۔ انشا اللہ تعالیٰ آئندہ وضاحت کے ساتھ بد مذاق شعرا کے حالات حوالہ قبلم ہوں گے۔ جن سے شاعری کی صحت مذاق کی حقیقت منکشف ہوگی۔

## ورجل رومی شاعر

ورجل VIRGIL سرآمد شعرائے روم ہے۔ اور رومی شاعروں میں ہو میر و س کا درجہ رکھتا ہے۔ گوئی نفسہ کسی طور پر ہو میر و س کا ہم پہلو مانا نہیں جاسکتا ہے۔ شاعر کی قوت کا فرق ان دونوں میں وہی ہے جو فردوسی اور نظامی میں پایا جاتا ہے۔ یہ شاعر ۱۹ برس قبل جناب مسیح علیہ السلام کے زندہ تھا۔ ورجل عہد قیصر آگستس AUGUSTUS کا شاعر ہے۔ اس عہد میں رومیوں کا لڑیچہ پختگی کو پہنچ چکا تھا۔ اس قیصر کے زمانے میں سلطنت روم ہر طرح کے خرخشہ سے پاک ہو کر مامن و مزج خلافت ہو رہی تھی۔ اہل فن اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔ نثر نگاری اور شاعری دونوں عروج کو پہنچ چکی تھیں چنانچہ اس بادشاہ کا عہد ترقی لڑیچہ کی وجہ سے ضرب المثل ہو گیا ہے۔ اہل فرنگ جب کسی ایسے زمانہ کا ذکر کرتے ہیں کہ جس میں لڑیچہ کی میسر ترقی دیکھی جاتی ہے یا جس میں شعرا اور نثار بکثرت دیکھے جاتے ہیں تو ایسے زمانہ کو عہد آگستس کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔ انگلستان کی ملکہ این ANNE کا زمانہ بھی عہد آگستس کہلاتا ہے۔ اس لیے کہ اس ملکہ کے عہد حکومت میں بڑے بڑے ناظم و نثار مثلاً اڈلین ADDISON اسٹیل STEEL پارنل PARNELL پوپ POPE ٹکل TICKELL وغیرہ موجود تھے۔ بہر حال ورجل نے ایسا زمانہ پایا ہے کہ جس میں ہر طرح کا امن و امان حاصل تھا۔ سلطنت روم ترقی تھی۔ ہر طرح کے فتنہ و فساد فرد ہو چکے تھے۔ تمام تر حفظ و امان کی شکل پیدا تھی قومی جاہ و شتم منتہائے اوج کو پہنچ چکا تھا۔ چنانچہ ورجل کی شاعری سے یہ سب معاملات آشکارا ہیں۔ اس شاعر کی مشہور تصنیف منظوم اینیڈ AENEID ہے یہ کتاب بارہ ابواب یا مقالات سے مشتمل ہے اور اس میں اس نے اینس AENEAS کی سرگزانی

اور نبرد آزمائی کے حالات حوالہ قلم کیے ہیں۔ اس کتاب کی پہلی چھ جلدیں آڈیسی کا انداز رکھتی ہیں۔ کس واسطے کہ جس طرح آڈیسی میں یولیسس کی سرگرائیوں کے احوال رقم ہیں۔ اسی طرح ان چھ جلدوں میں اینیس کی سرگرائی کے احوال رقم ہیں۔ باقی چھ جلدوں میں اینیس کی نبرد آزمائیاں ویسی ہی درج ہیں کہ جیسے ایلید میں اہل ٹرائے اور اہل یونان کی جدالی و قتال کے احوال تحریر ہیں۔ پس سمجھنا چاہیے کہ درحل نے جو اپنی زبان میں ہومیروس کے رنگ کی کتاب لکھی ہے اس کی ترتیب ہومیروس کی ایلید کے برعکس رکھی ہے۔ یعنی ہومیروس نے پہلے ایلید لکھی ہے۔ بعد ازاں آڈیسی تصنیف کی ہے۔ مگر درحبل نے پہلے آڈیسی تب ایلید لکھی ہے۔ بہر حال یہ شاعر ہومیروس کے تتبع سے خالی نہیں ہے۔ تتبع درکنار بہت مقاموں میں مضامین کی موافقت گمان سرقہ پیدا کرتی ہے۔ خیر جو کچھ تتبع یا سرقہ کا الزام درحبل پر عاید کیا جائے اس شاعر نے اپنی زبان میں ایک ممتاز کتاب رزمی شاعری کی تصنیف کی ہے جس سے اس کی اور اس کی قوم کی بقائے نام کی شکل قائم ہو گئی ہے۔ یہ شاعر اپنی طباعی، خوش بیانی اور موزوں طبعی کی بدولت اکابر شعرائے عالم سے شمار کیا جاتا ہے اور تمام تر ہومیروس، فردوسی، ملن، بیاس، بالیکی، میرانیس کے ساتھ یاد کیے جانے کا استحقاق رکھتا ہے۔ اس تصنیف مذکور کے متعلق جو قصہ ہے وہ یہ ہے۔

جب اہل یونان نے ٹرائے Tray کا محاصرہ کیا اور آخر کار اس شہر کو غارت کر ڈالا تو اینیس Aeneas کسی طرح وہاں سے بچ کر کوہ آئیدا Ida کی طرف بھاگ نکلا۔ اس شخص کے ٹرائے میں رہنے کی وجہ یہ تھی کہ پرایم Priam بادشاہ ٹرائے کی بیٹی اس کے جالہ نکاح میں درآئی تھی۔ بہر حال ٹرائے سے بھاگنے کے وقت اس نے کاندھوں پر اپنے بوڑھے باپ کو اٹھالیا۔ اپنے بیٹے کا ہاتھ پکڑ لیا اور زوجہ سے کہا کہ ساتھ ساتھ پیچھے پیچھے چلی آ۔ اس شکل سے جب وہ اس پہاڑ تک پہنچا تو اس نے وہاں جہاز بنائے اور جائے مناسب میں بسنے کی غرض سے سفر دریا اختیار کیا۔ ورجل لکھتا ہے کہ جب وہ جزیرہ سسلی SICILY سے ایتالیہ کو جا رہا تھا اس کے جہاز بہک کر ساحل افریقہ سے جا لگے۔ شہر کارتھج CARTHAGE جب لب ساحل واقع تھا۔ اس زمانہ میں اس کی ملکہ ڈائیٹس



DIDO تھی اُس ملکہ نے اینس کو بہت تواضع اور مدارات کے ساتھ اپنا مہمان کیا۔ اینس نے بطور تحفہ اسے ہین HELEN کی کوئی پوشاک دی۔ اس کے قیام کے زمانہ میں ڈائیڈا اس پر فریفتہ ہو کر اس سے مناکحت کی خواستگار ہوئی۔ مگر دیو تائوں نے اینس کو اس بیوند کی اجازت نہ دی۔ یہاں سے جب اینس روانہ ہوا تو مقام کیومی CUMA میں پہنچا یہاں سایل SYBIL نے اینس کو دوزخ کی سیر اس غرض سے کرائی تاکہ اینس اپنے پدر متوفی سے اپنے حالات آئندہ کو دریافت کرے۔ یہاں سے اینس بہت سی سرگردانیوں کے بعد دیگے ماسٹر TEHER میں داخل ہوا۔ جیسا کہ اوپر رقم ہو چکا ہے۔ یہ دریا ملک ایتالیہ میں ہے۔ اس وقت ایتالیہ کا بادشاہ لیٹس LITMUS تھا اس بادشاہ نے اینس کی بڑی خاطر داشت کے ساتھ مہمانداری کی اور اپنی بیٹی سے جس کا نام لوینیا LANINEA تھا بیاہ کر دینا چاہا۔ مگر لوینیا کی ماں نے اس لڑکی کو قبل میں ٹرنس TURNUS سے جو ایک بادشاہ تھا منسوب کرنا چاہا تھا۔ اسی سبب ٹرنس اینس کے ساتھ آمادہ کارزار ہوا۔ بہت سی لڑائیوں کے بعد یہ بات تجویز پائی کہ یہ دونوں دلاور باخود ہا نبرد آزمانی کریں تاکہ ہنگام خدا کشت و خون سے محفوظ رہیں۔ اس نبرد آزمانی میں ٹرنس اینس کے ہاتھ پر مارا گیا اور اینس نے لوینیا سے شادی کر لی۔ اپنے خسر کے انتقال کے بعد اینس ایتالیہ کا بادشاہ ہوا۔ مگر تھوڑے ہی عرصے کے بعد راہی ملک بقاء ہو گیا۔

واضح ہو کہ رومیان سابق اپنے کو اینس کی اولاد کہتے تھے اور اپنا تعلق ٹرائے کے ساتھ بوضع بالا بیان کرتے تھے۔ چنانچہ درجل نے عالی نبی کے اثبات میں بیان بالا کو اختیار کیا ہے۔ اینس کی نسبت اہل روم کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ وہ شاہزادہ اینکائیس ANCHISES کا بیٹا بیض زہرہ سے تھا۔ زہرہ ایک مؤنث دیوتا مانی جاتی تھی اور عام زنان کی طرح اس سے اجزائے نسل کی شکلیں ممکن تھیں۔ یونانیوں اور رومیوں کے معتقدات کو دیکھ کر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ باوجود حاصل رہنے علم و فضل کے یہ قومیں حد درجہ کے توہمات کی مبتلا تھیں۔ ان کی شاعریاں بھی اسی واسطے تمام تر اوہام وغیرہ سے بھری نظر آتی ہیں اور دانش



امریہ ہے کہ جو شخص ان قوموں کے مذہبی اخلاق اور تمدنی معاملات سے مطلع نہیں ہے ان کی شاعریوں سے حتماً اٹھا نہیں سکتا۔ بہر حال وہی خیالات کو علاحدہ کر کے بھی ان کی شاعریوں میں اس قدر لطف اور ندرت ہے کہ اگر ایشیائی زبانوں میں ان کے ترجمے ہو جائیں تو بہت کچھ تو وسیع خیالات شاعرانہ کی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ افسوس ہے کہ اکثر ہمارے ملکی شعرا یونان اور روم کے مشاعروں سے حسب خواہ اطلاع نہیں رکھتے ہیں۔ اس واسطے ان کے قدم ان کے محدود دائرۂ شاعری سے باہر نہیں پڑتے ہیں ویسے شاعری کے غیر خواہوں کا یہ فرض منصبی ہے کہ فائدہ رسال کی نظر سے ہو میروس، ورجل و دیگر شعرائے یونان کے کلاموں سے افادت کے سامان پیدا فرمائیں۔

## ہارس شاعر رومی

ورجیل کے بعد روم کا نامی شاعر ہارس HORACE ہے یہ شاعر ورجل کی طرح لذی نہیں ہے۔ اس کے اشعار غزل اور قصیدہ دونوں کے رنگ رکھتے ہیں۔ مؤلف کے خیال میں اس شاعر کا کلام سفاک شاعر اور پنڈار کے رنگوں سے محروج معلوم ہوتا ہے۔ ہارس نے بیشتر اوڈ لکھے ہیں۔ جو قصائد کی نشیب سے مشابہت رکھتے ہیں۔ اس کے کلام کا کچھ ترجمہ ذیل میں عرض کیا جاتا ہے۔ کلام ذیل ایک اوڈ ہے جس میں ہارس اپنی معشوقہ پیرا کی بیوفائی اور تلون مزاجی کی شکایت کرتا ہے اور یہ عورت جو ایک درباری عورت تھی اسے سمندر سے تشبیہ دیتا ہے تشبیہ سمندر کے ساتھ اس مشابہت سے دیتا ہے کہ سمندر جب تھیر رہتا ہے تو مسطح شکل ہوتا ہے اور اس سے باسباب ظاہر کوئی خطرہ نہیں معلوم ہوتا ہے۔ مگر چشم زدن میں متموج ہو جاتا ہے۔ اور ہلاکت کا نقشہ دکھانے لگتا ہے۔ ویسی ہی

۱۷ ہورس کا سال پیدائش ۶۵ ق م اور وفات ۸ ق م ہے۔ اس کی تعلیم روم اور ایٹلی میں ہوئی اس نے مسٹر (طرن) اور اوڈس لکھے ہیں، اس کے EPISTLE میں تین ادبی مضامین بھی ہیں، اسی سلسلے میں اس کی کتاب آرس پونییکا بھی آتی ہے۔



پیرا کی کیفیت ہے کہ پہلے نہایت مطبوع انداز دکھلاتی ہے مگر تھوڑے ہی عرصے کے بعد اس کے تلون کا سمندر موجزن ہونے لگتا ہے اور عاشق کی جان پر آبنی ہے اس تشبیہ کے بعد اپنی معشوقہ کو خطاب کر کے کہتا ہے کہ ہم بھی تیرے فریب کے سمندر میں ڈوب چکے تھے۔ مگر کسی طرح بچ نکلے اگر اس کی تصدیق درکار ہو تو کوئی جا کر دیکھ لے میری تصویر اور بھیگی پوشاک خدائے بچور کے مندر میں آویختہ ہیں یہ بیان قصہ طلب ہے اور وہ یہ ہے کہ اہل روم جیسا کہ بالا میں ذکر ہوا ہے بڑے بت پرست تھے۔ منجملہ انواع و اقسام کے دیوتاؤں کو ایک بہت بڑا دیوتا مانا جاتا تھا کہ جس کا نام نیپچون NEPTUNE تھا۔ یہ دیوتا سمندروں کا مالک تھا اور تمام معاملات بحری اس سے متعلق سمجھے جاتے تھے۔ اس دیوتا کے لیے ایک بہت بڑا مندر بھی تعمیر کیا گیا تھا۔ اور اہل حاجت وہاں پرستش اور پرستاری کی نظر سے جایا کرتے تھے۔ منجملہ اور رسومات مذہبی کے رومیوں کا یہ بھی دستور تھا کہ اگر کوئی رومی سفر بحری اختیار کرتا تھا اور اتفاق وقت سے اس کا جہاز تباہ ہو جاتا تھا اور وہ خود کسی صورت سے بچ کر وطن کو واپس آتا تھا تو ادائے سپاس کی نظر سے وہ نجات یافتہ شخص نیپچون کے مندر میں حاضر ہوتا اور ایک تصویر اس میں آویزاں کر آتا اس تصویر میں اس شخص اور اس کے جہاز کی صورت کھینی رہتی تھی۔ مراد اس تصویر آویزاں سے یہ تھی کہ خدائے بچور نے تصویر کے آویزاں کرنے والے پر رحم کیا ہے اور ہلاکت سے نجات دی ہے۔ اس واسطے ادائے سپاس کی نظر سے ایسی تصویر کا آویزاں کرنا ضرور ہوا۔ ایسے وہی مراسم سے رومیوں کی مذہبی عقل کا انداز خوب کھلتا ہے باوجود افراط عقل و دانش کے یہ قوم مذہبی خیالات کی صفائی مطلق نہیں رکھتی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عقل دنیا اور عقل دین دو شے ہیں۔ اس زمانہ میں بہت سی عاقل قویں دیکھی جاتی ہیں۔ جو باوجود پیدا کرنے ہر طرح کی دنیاوی ترقیوں کے مذہبی معاملات میں عاجز نظر آتی ہیں۔ یہ قویں ہزاروں علمی طریقے دنیا حاصل کرنے کے جانتی ہیں اور اس وقت علوم و فنون میں درجہ کمال حاصل کر چکی ہیں۔ مگر مسئلہ توحید سے تمام تر بے خبر ہیں۔ خدائے واحد کی پرستش کا معنوں ان کے سمجھ میں آتا ہی نہیں ہے۔ خیر اہل یونان اور اہل روم یا اور بھی بہت سی موجود قویں جو دنیاوی



شایستگی کا نمونہ سمجھی جاتی ہیں۔ اگر بت پرستی سے خالی نہیں تو نہ ہوں تعجب ہے۔ ان اہل اسلام سے جو خواجہ خضر کا بیڑا یا کاغذی کشتی بنانے والے ہیں۔ ہر سال ہزاروں جہاں زبانی توحید کے قائل، برسات کے دنوں میں گنگا، کانگی، سون، پین پن اور اسی طرح کی ندیاں اور نالوں میں کاغذی کشتیاں دھوم دھام سے حضرت خواجہ خضر کی نذر کیا کرتے ہیں۔ اَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ۔ بہر حال ہارس کے اوڈ کا مفہوم راقم ذیل میں رقم کرتا ہے۔ امور بالا کے عرض کر دینے سے یہ غرض تھی کہ قصہ طلب مضامین کے بیان سے کلام شاعر آسانی کے ساتھ ذہن نشیں ہو جاسکے۔ کس واسطے کہ ہر ملک کی شاعری کچھ نہ کچھ رسوم ملکی سے متعلق ہوا کرتی ہے اور ناواقفیت کی حالت میں نہ سمجھ میں آ سکتی ہے۔ اور نہ سامع کے دل کو لذت یاب سخن کر سکتی ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص اس رسم سے واقف نہ ہو کے ایک وقت میں یہ دستور تھا کہ جو کوئی فریادی ہوتا تھا وہ داد خواہی کی غرض سے پیرا بن کاغذی پہنتا تھا تو ایسا شخص مرزا نوشہ کے اس مطلع کو یعنی ہے

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا کاغذی ہے پیرا بن ہر پیکر لقوہ ر کا  
نہ سمجھ سکتا ہے اور نہ کوئی اس سے لطف سخن اٹھا سکتا ہے۔ خیر حضرات ناظرین اب ہارس کے اوڈ کی طرف توجہ فرمائیں گو ترجمہ سے اس کے اصلی کلام کا لطف حاصل نہیں ہو سکتا۔

### خطاب بہ پیرا

اے پیرا تو کس جوان حسین کو جو عطریات میں ڈوبا ہوا ہے خلوت کدوں میں ہم آغوش کیے رہتی ہے۔ کس کے لیے تو اپنی زلفیں اس سادگی کے ساتھ سنوارا کرتی ہے۔ ہزار حیف کہ وہ تیری طرف سے مطمئن ہو رہا ہے۔ اسے کیا معلوم کہ اسے تیری بے وفائی کی بدولت کیا کیا نہ اشک ریزی کرنی ہوگی۔ اسے اس کی کیا خبر ہے کہ تو ابھی کیا سے کیا ہو جانے والی ہے۔ وہ بیچارہ کیا جانتا ہے کہ تو وہ سمندر ہے کہ جو ہر موج ہوا کے ساتھ کیفیت گونا گوں پیدا کرتا ہے۔ اے پیرا جس نے تجھ پر اعتماد کیا ہے کہ تو اس کی ہو رہی ہے اس کو ہوا کی غیر استقلالی سے تمام تر بے خبری ہے۔



کم بخت وہ ہیں جن کی آنکھوں میں تو بھلی لگتی ہے۔ مگر انہیں تیری حقیقت سے اطلاع نہیں ہے۔ میری سرگزشت تو میری اس تصویر سے ظاہر ہے جو خدائے بخور کے مندر کی دیوار پاک سے آویزاں ہے اور ان ترکپڑوں سے جو وہاں لٹکے ہوئے ہیں۔ یہ چیزیں اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ ہم غرق ہونے سے بدشواری بچ نکلے ہیں۔ واضح ہو کہ ہر س اپنے کلام بالا میں اسی مضمون کو شرح و بسط کے ساتھ حوالہ قلم کرتا ہے جس کو مرزا صاحب نے مطلع ذیل میں باندھا ہے ۛ

جو می بینم کسے از کوئے تو دل شادی آید فریبے کز تو اول خوردہ بودم یا دمی آید  
مگر معشوقہ خود کام سے نجات پانے کے مضمون کو حافظ علیہ الرحمۃ نے نہایت خوبصورتی اور پُر تاثیر کے ساتھ غزل ذیل میں فرمایا ہے ۛ

دوش وقت سحر از غصہ تجا تم دادند	دندران ظلمت شب آب حیاتم دادند
بنخود از شمشیر پر تو ذاتم کردند	بادہ از جام تجملے نصیاتم دادند
چہ مبارک سحرے بود چہ فرخندہ شبے	آں شب قدر کہ ایں تازہ براتم دادند
چو من از عشق خوش بنخود و حیراں گشتم	خبر از واقعات و مستاتم دادند
من اگر کام روا گشتم و خوش دل چہ عجب	مستحق بودم و ایں رہ برکاتم دادند
بعد از ایں روئے من و آئینہ حسن نگار	کہ درینجا خبر از جسلوہ ذاتم دادند
ہاتف آں روز بمن مژدہ ایں دولت داد	کہ نیاز از غمت صبر و شباتم دادند
اہنبہ قند و شکر کہ سخنم می ریزد	اجر میری ست کزاں شاخ نباتم دادند
بمیات ابدان روز رسایند مرا	حظ آزادگی از حسن مماتم دادند
عاشقم آندم کہ بلام سر زلف تو فتاد	گفت کز بند غم و غصہ نباتم دادند
شکر شکر بشکرانہ بیفشال لے دل	کہ نگار خوش و شیریں حرکاتم دادند

ہمت حافظ و انقاس سحر خیزاں بود

کہ ز بند غم ایام نباتم دادند

واضح ہو کہ خواجہ حافظ علیہ الرحمۃ کے عہد شباب کی معشوقہ شاخ نبات تھی۔ جس کا نام غزل بالا میں آیا ہے۔ یہ عورت لولیان شیراز سے تھی۔ مگر حسن و جمال ایسا رکھتی تھی کہ شاہزادگان و امرا زادگان اس کے اوپر جان دیتے تھے۔ اتفاق وقت سے

حافظ علیہ الرحمۃ اس کے گھر پہنچے وہ عورت ان کے انداز عاشقی کو دیکھ کر کہنے لگی کہ بغیر نقش و دم کوئی عمل کارگر نہیں ہو سکتا۔ حضرت والدہ نے تھے مگر کچھ عرصہ میں زندگانی ہم کر کے پھر اس کے گھر گئے۔ اس بار حسب طریق زنان بازاری وہ نہایت اخلاق سے پیش آئی۔ مختصر یہ ہے کہ اس کے گھر شب بسر کرنے کی ٹھہری۔ صحبت اغیار سے پاک تھی اور عشق خواجہ زور دل پر تھا۔ اس عورت سے قریب نصف شب گئے ہم کلام رہے۔ جب اس نے استراحت کی طرف میل دکھلایا۔ خواجہ کو اس وقت ایک بات یاد پڑی۔ جو اس شب کو عمل میں لایا کرتے تھے۔ اتفاق سے وہ شب شب آدینہ تھی۔ شب آدینہ کو خواجہ کا یہ معمول تھا کہ دو شمع مومی لے کر مصلائے شیراز کو جاتے اور وہاں قبر پر ایک امام زادے کے جو وہاں آسودہ ہیں نہایت خلوص دل سے ان دو شمعوں کو روشن کرتے۔ یہ خدمت خواجہ سے کبھی ترک نہ ہوتی تھی۔ الا اس شب میں کہ شاخ نبات کے زور فریفتگی میں فراموش ہونے کو تھی۔ جس وقت خواجہ حسب درخواست اس عورت کے باہل استراحت ہونے کو تھے کہ وہ خدمت قدیمہ امام زادے کی یاد آئی۔ یہ سوچ کر کہ مصلائے شیراز بہت دور نہیں ہے دو گھنٹے کی تو بات ہے فوراً پھر کمر چلا آؤں گا۔ شاخ نبات کے نزدیک سے اٹھنا چاہا شاخ نبات نے آستین پکڑی مگر خواجہ نہیں مایا۔ گھر آکر دو شمع مومی لے کر مصلائے شیراز کی طرف روانہ ہونے اور قبر حضرت امام زادے پر روشن کیا اس جوش و خلوص کا یہ اثر ہوا کہ شاخ نبات کی آرزو بالکل دل سے جاتی رہی اور مزاج پاک میں کچھ ایسا دلولہ عشق حقیقی پیدا ہوا کہ دنیائے دون اور اس کے کئی متعلقات کی بوس دل سے جاتی رہی۔ واقعی یہ ان کی پاک خیالات کا اثر ہے کہ ان کا کلام اس قدر مقبول عالم ہو رہا ہے۔ شاعر بوس باز و ناپاک خیال میں یہ حسن قبول کہاں سے حاصل ہو سکتا ہے۔ خواجہ کا یہ شعر ہے

اے ہمہ شہد و شکر کز سخنم می ریزد ابر صبریت کزاں شاخ نباتم دادند  
ان کی پاکبازی کی بخوبی شہادت دیتا ہے۔ واقعی خدمت  
امام زادہ بہت کام آئی اور کیوں نہ ہو دوست داری خاندان پیغمبر کا اگر اتنا بھی صلہ  
نہ ملے تو اس خاندان کی دوست داری سے کیا فائدہ متصور ہے۔ بہر حال خواجہ کو



شاخ نبات کے بکھڑے سے ویسی ہی نبات ملی جیسا کہ ہارس کو پیرا کے دام فریب سے۔ مگر دونوں کے کلام کو موازنہ کرنے سے خواجہ کا معاملہ ہارس کے معاملے سے بہت زیادہ روحانی انداز رکھتا ہے۔ حضرات ناظرین کے آگے اس کے بیان کی حاجت نہیں ہے۔

جاننا چاہیے کہ یہ شاعر آٹھ برس قبل ظہور حضرت مسیح علیہ السلام کے زندہ تھا۔ اس کے کلام مقبول خاص و عام ہیں اور یورپ میں اس کا نام ابھی تک زندہ ہے۔

## لوکن شاعر رومی

ہارس کے بعد رومیوں میں لوکن LUCAN بھی ایک نامی شاعر گذرا ہے۔ یہ شاعر ۶۰۰ء میں مر گیا۔ مگر افسوس ہے کہ نبیؐ وقت کے دین کے قبول کیے راہی ملک بقا ہوا۔

## جوینل شاعر رومی

مبطلہ قابل ذکر شعرائے روم سے جوینل JUVENAL بھی ہے شاعر جو گو تھا۔ جو گوئی سے اس کی مراد اصلاح بنائے زمانہ تھی۔ اس کے عہد میں اس کے ملکی لوگ مبتلائے بے اعتدال ہو رہے تھے۔ ذیل میں اس کے کلام کا کچھ مفہوم درج کیا جاتا ہے۔ یہ شاعر ۱۳۰ء میں راہی ملک عدم ہوا۔ اس کے زمانہ میں رومیوں کے اندر نشر نے

---

لے لوکن ۶۳۹ء میں پیدا ہوا اور اس کی وفات ۶۶۵ء میں ہوئی۔ اس کی تعلیم روم میں ہوئی۔ اس کا رزمیہ PHARASOLIA بہت مشہور ہے، ورجیل کی اینیڈ کے بعد ہی اس کا درجہ ہے۔ پراسر نے اوس آف فیم، میں اس کا ذکر کیا ہے۔

میں نے یہ جملہ اسی طرح لکھا ہے، مفہوم کا کچھ پتہ نہیں ملتا۔ و۔ ۱

میں روم کا مشہور طنز نگار، اس کی پیدائش اور موت کی تاریخوں کے بارے میں محض قیاساں ہیں اور وہ یہ کہ اس کی پیدائش ۶۶۰ء یا ۶۷۰ء کے درمیان ہوئی۔ اس کے سولہ سائز ہیں جنہیں پانچ کتابوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔

زور پکڑنا شروع کیا تھا اور نظم کو زوال آنے لگا تھا۔

## مضامین، جو

کوئی کیوں تیکھے اشعار سے نہ دفتر بھرے جب سڑکوں پر ایسی خلقت سے دوچار ہونا پڑتا ہے کہ کوئی تو ایسا ہے جلیہ ہونے پر بھی ہوا دار ہونے پر بھی چہر غلاموں کے کاغذوں پر سوار دن دوپہر کمال وقامت کے ساتھ منظور عام میں نظر آتا ہے۔ یہ وہ شخص ہے کہ جس کا عروج ایک طرہر چھوٹی تاریخ لامنون ہے۔ اس بد کرداری پر بھی اس کی آنکھیں شرم سے علاقہ نہیں رکھتی ہیں اور وہ بے تکلف نہایت اطمینان کے ساتھ **MAGENUS** مسینس کی طرح شہر سے گذر کرتا ہے واضح ہو کہ مسینس ایک نہایت عمدہ سرشت پاک طینت اور خوش مزاج رومیوں سے تھا۔ یہ شخص قیصر اغطس کے زمانہ میں نیک نامی کے ساتھ زندہ تھا، پھر ان خلقت سے کوئی ایسی مالدار خاتون ہے کہ جس نے شوہر کو زہر دے کر ہلاک کر ڈالا ہے اور اس کی دولت پر قابض ہو بیٹھی ہے اس کم بخت نے جو لوکسٹا **LACUSTA** سے بھی زیادہ حراذہ ہے شوہر کو حالت تشنگی میں ایسی مشراب پلا دی کہ جس میں زہر ہلاہل ملا رکھا تھا۔ یہ نافر جام ابھی تک اس لیے زندہ ہے کہ اپنے ملک کی عورتوں کو زہر آمیزی کا نسخہ سکھائے۔ اس عورت کی بے حیائی کو دیکھئے کہ ہر چند اس پر بر سر شاہراہ بر طرف سے لعنت ملامت کی لوچھاڑ پڑتی ہی رہی ہے۔ مگر شوہر کی زہر خوردہ داغدار لاش کو بے خوف دہرا اس نصف النہار میں شہر ہو کر اٹھوالے گئی۔

اس زمانہ میں اگر کسی کو عروج منظور ہے تو طالب عروج کو لازم ہے کہ بے دھڑک جرائم کی بنیاد پر ثروت کی عمارت قائم کرے۔ اس زمانہ میں نیکی نہیں پھیلتی واہ کیا کہنا ہے بد کاریوں کے وسیلہ سے کیا کیا سامان عشرت میسر نہیں آتے ہیں۔ تخت و تاج، جام زریں، ظروف بیش بہا، ایوان بلند مال و عقار سب ہی نصیب ہوتے ہیں۔ ایسے عہد میں کسے چین آسکتا ہے اور کسے زندگانی کا مزہ مل سکتا ہے۔ جب حال یہ ہے کہ باپ بیٹوں کے حریص جوروں کو بھر پیٹ ملغوبہ کھلانے میں کوئی پس پیش نہیں کرتے۔ واضح ہو کہ اس طرح کے مضامین جو ہر زبان میں دیکھے جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک



اردو کا شاعر اپنے شہر آشوب میں سامانِ عشرت کے حاصل ہونے کو اس طور سے لکھتا ہے۔

ہمشیر کے وسیلہ سے ملتا ہے شیر مال  
دولت تو ماں بہن کی بدولت نصیب ہے  
اسی طرح دوسرے شاعر نے کسی مثنوی ہجو میں لکھا ہے۔  
ہوا ————— اس فتوے کا مفتی  
بیک زن باپ بیٹے کر لیں جفتی

یہ سب اشعار جو خیل کا رنگ رکھتے ہیں۔ اور ہر زبان میں ہجو کا رنگ قریب قریب ایسا ہی ہوتا ہے البتہ شاعر کو اتنا لحاظ رکھنا ضرور ہے کہ تحریر محض فحش نہ ہو جائے افسوس ہے مرزا رفیع سودا کبھی کبھی اس کا لحاظ نہیں رکھتے تھے اور دائرۂ اعتدال سے ان کی شاعری کا قدم باہر چلا جاتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ فحش سے لطف کلام جاتا رہتا ہے۔ مرزا سودا کی شوخی مزاج ایسی تھی کہ ان کو فحش کی طرف مائل ہونے کی کوئی حاجت نہ تھی۔ ایسا ظریف شاعر کیوں کر مائل فحش گوئی ہو ا خالی از تعجب نہیں ہے۔ بے اعانت فحش جو وہ کہہ جاتے ہیں اس کا جواب اردو کے علاوہ اور کسی زبان میں بھی کم تر دیکھا جاتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرزا سودا کبھی کبھی محض ناچاری سے فحش گوئی اختیار کرتے تھے۔ یعنی اگر وہ فحش گوئی پر آمادگی نہ دکھلاتے تو ان کے اعدا ان سے بھی زیادہ فحش کے معمل ہوتے۔ ایسی صورت میں ناچار مرزا سودا کو فحش گوئی اختیار کرنا پڑی۔ جس کی وجہ سے وہ نہ صرف دشمنوں کے داروں کو روک سکے بلکہ دشمنوں پر ان کا رعب بھی قائم ہو گیا۔ بہر حال جاننا چاہیے کہ فحش گوئی احاطہ شاعری سے باہر ہے اور یہ طریقہ تمام تر واجب الاجتناب ہے۔ اردو یا جس کسی زبان کے شاعر نے جس قدر فحش گوئی اختیار کی ہے اس قدر اس کا کلام زہار قابل توجہ نہیں ہے۔ ہجو گوئی اسی قدر شاعری کا حکم رکھتی ہے کہ جو فحش گوئی سے پاک ہے۔

## یورپ کے عہدِ جہالت کا بیان اور اس عہد کی شاعری

واضح ہو کہ اہل روم بھی اہل یونان کی طرح آخر کار نیست و نابود ہو گئے اور ان کے علوم و فنون ان کے ساتھ رخصت ہو گئے۔ رومیوں کی بربادی کے بعد چند صوبوں تک یورپ مبتلائے جہالت رہا عیسائی راہبوں کے سوا کسی کو معمولی لکھنا پڑھنا تک نہیں آتا تھا۔ یہ راہب اکثر چھوٹی چھوٹی حکومتیں رکھتے تھے اور اپنے اپنے کلیسا میں بیٹھے ہوئے ہمارے بعض ملاؤں کی طرح کسی کو اپنے سوا قابلِ نجات نہیں سمجھتے تھے۔ ایسے وقت میں تمام یورپ میں ظلمت جہالت چھائی ہوئی تھی اہل اسلام علوم پروری میں شہرہ آفاق ہو رہے تھے۔ ان کی سلطنتیں اسفین وغیرہ میں زوروں پر تھیں۔ ایک شہر قرطبہ میں صد ہا مدارس تھے۔ ان مدارس میں عیسائی طلبہ دور دور ملکوں سے آکر مسلمان طلباء کے ساتھ پڑھا کرتے تھے اور علوم حاصل کرنے کے بعد اپنے اپنے ملکوں کو واپس جاتے تھے۔ اپنے اپنے وطن جا کر ملکی لوگوں کو علوم و فنون سکھاتے تھے۔ یہ سلسلہ علم اندوزی کا عیسائیوں میں ایک عرصہ تک قائم رہا۔ جس کے سبب سے مختلف قومیں یورپ کی تعلیم یافتہ ہو گئیں اور حصولِ علوم کے ساتھ ان میں ہر قسم کی قوت بھی آتی گئی۔ جاننا چاہیے کہ علم کے ساتھ قوت کو ایک خاص مناسبت حاصل ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ علم ہی قوت ہے۔ چنانچہ انگریزی ضرب المثل ہے کہ نالچ از پاور KNOWLEDGE IS POWES یعنی العلم قوۃ اور فردوسی کا یہ قول کہ

مصرعہ۔ تو انا بود ہر کہ دانا بود۔ اسی ضرب المثل کی تائید ہے۔ بالتحق جب اہل یورپ اس طرح پر مسلمانانِ اسفین کی بدولت صاحبِ علم اور صاحبِ قوت ہو گئے اور روز بروز ان میں ہر رنگ کی ترقیاں پیدا ہونے لگیں اور آخر کار یورپ اس پایہ شائستگی کو پہنچ گیا کہ جس کو آج ہم لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ اہل واقفیت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ عیسائیوں یورپ کی فلاح کے سبب مسلمانانِ اسفین ہوئے ہیں۔ اگر یہ مسلمانانِ اسفین یورپ کے ایامِ جہالت میں علم پروری کو ملحوظ نہیں رکھتے تو آج تک یورپ مبتلائے جہالت رہتا۔ اب اسفین دیپرنگال وغیرہ میں اسلامی سلطنتیں باقی نہیں ہیں عرصہ ہوا کہ عیسائیوں یورپ نے تعلیم یافتہ ہو کر اپنے



اسلامی محسنوں کو ان کے علاقوں سے نکال دیا۔ مگر ان کے علوم کے آثار مختلف اقوام یورپ میں موجود ہیں۔ ابن الرشد جسے اہل یورپ آوروں AVERROES کہتے ہیں۔ علمائے یورپ ابھی تک نہیں بھولے ہیں۔ ایک وقت میں اس حکیم اسلامی کا فلسفہ تمام یورپ میں صبح مانا جاتا تھا۔ اور اب تک اس کے فلسفہ سے حکمائے یورپ اطلاع رکھتے ہیں۔ اسی طرح یورپ کے لٹریچر میں مسلمانانِ اسفین کے لٹریچر کی بویائی جاتی ہے۔ اور دوسو برس قبل کی شاعریاں اسلامی اثر سے خالی نہیں معلوم ہوتی ہیں۔ عموماً اس عہد جہالت کی شاعریاں وہی یونانی اور رومی شاعریوں کا انداز رکھتی ہیں۔ اس عہد کے شاعر بیشتر شعرائے یونان اور روم کے متبع نظر آتے ہیں۔ تمام اقوام یورپ تجدید علوم کے ساتھ شاعری کی طرف بھی متوجہ ہوتی گئیں اور شاعری کو مختلف ملکوں میں فروغ ہوتا گیا۔ اس عہد کے شعراء میں کوئی شاعر ہو میروس، درجل کے رتبہ کا نظر نہیں آتا ہے۔ بہر حال یہاں پر قابل ذکر شاعر ڈینیٹی DANTE ہے جو تیرھویں صدی مسیحی میں زندہ تھا اور واقعی نہایت ہی خلاق مضمون تھا۔ اس شاعر کا مولد شہر فلارنس FLORENCE ہے جو ملک ایتالیا میں واقع ہے اس کے عہد میں ملک ایتالیا کی زبان رومیان سابق کی زبان جولین LATIN یعنی لاطینی تھی۔ باقی نہیں رہی تھی۔ وہاں اس شاعر کے عہد میں ایتالین ITALIAN مردج ہو چکی تھی۔ جو زبان کے اس وقت بھی بولی جاتی ہے۔ مگر یہ شخص زبان قدیم یعنی لاطینی میں بڑا ماہر تھا۔ ایک بہت ممتاز شاعر ہونے کے علاوہ ڈینیٹی فلبنڈرس کے مدیران ملک سے بھی تھا اور مرد سپاہی ہونے کے باعث کسی طرح کی ملکی خدمتوں میں اسے مجبوری لاحق نہ تھی۔ اس شاعر کے نام سے دنیا کا ہر بڑھا لکھا آدمی واقف ہے۔ اس کی قوت شاعری ایک نہایت اعلیٰ درجہ کی ہے اور اس کا شمار بڑے بڑے اساتذہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ منجملہ اس کی تصانیف منظوم کے ایک اس کی تصنیف

---

۱۷ سال پیدا لیش ۱۶۲۶۵ء اور وفات ۱۶۳۲ء۔ بیڑس نام کی ایک خاتون سے اس کا عشق مشہور ہے۔ ۳۱ عشقیہ نظمیں کسی نہ کسی طرح اس کے معروف عشق سے متعلق بتائی جاتی ہیں۔ اس کی ڈیوائن کامڈی خاصی مشہور ہے۔

ہے جس کا نام انفرنو INFERNO ہے اس کی تصنیف سے تمام تعلیم یافتگان یورپ و ایشیا اطلاع رکھتے ہیں۔ اس مثنوی میں ڈینی نے جہنم کے معاملات نہایت شاعرانہ پیرایہ میں حوالہ قلم کیے ہیں۔ ڈینی کی یہ تصنیف اس کی بڑی قوت تخیل سے خبر دیتی ہے۔

یورپ کی قدیم شاعریوں کو لکھ کر ظاہراً مناسب تھا کہ راقم اس براعظم کی جدید شاعریوں کو حوالہ قلم کرنا شروع کرتا۔ اس سبب سے کہ اس وقت جو وہاں کی تین سو برس کے اندر کی شاعریاں ہیں وہ تمام تر یونان و روم کی شاعریوں کا رنگ رکھتی ہیں۔ اختلاف جو کچھ ہے وہ مذاق شاعری کا اختلاف نہیں ہے صرف اسباب شاعری کا اختلاف ہے۔ اسباب اختلاف مذہب و معاشرت و تمدن وغیرہ واقع ہوتے ہیں۔ نقش شاعری میں کوئی اختلاف نہیں پڑا ہے۔ مثلاً ہومیر و س اور ورجل کے عہد میں رزمی اشعار میں دیوتاؤں وغیرہ کا ذکر دیکھا جاتا ہے۔ اب اس کی جگہ مسیح اور ملائکہ وغیرہ کا بیان قائم ہوتا گیا ہے۔ اسی پر اور باتوں کو قیاس کرنا چاہیے۔ بالمشعر یورپ کی قدیم اور جدید شاعریوں میں بنفسہ اختلاف مذاق نہیں ہے اور اگر اس وجہ سے یورپ کی جدید شاعریوں کا بیان اس قدیم شاعریوں کے بعد احاطہ تحریر میں در آتا تو سلسلہ بیان پورے طور پر قائم رہتا مگر چونکہ اہل عرب کو رومیوں کے بعد ہی فروغ حاصل ہوا اس واسطے مناسب معلوم ہوا کہ ہندوستان سے جانب مغرب میں جتنی نام بر آوردہ قویں گذرتی گئی ہیں۔ ان کا ذکر زمانہ کے التزام کے ساتھ درج ہذا کیا جائے۔ اس واسطے رومی شاعری کے بعد اہل عرب کی شاعری کا بیان حوالہ قلم کیا جاتا ہے۔ اور اس کے بعد اہل فارس کی شاعری کا بیان عرض کیا جائے گا۔ اہل فارس کی شاعری کے ساتھ اردو کی شاعری کی حقیقت بھی تحریر ہوگی۔ اس واسطے کہ فارسی اور اردو کی شاعریاں مذاق شاعری کے اعتبار سے محض شے واحد ہیں۔ خیالات دونوں کے ہر رنگ و ہم انداز ہیں۔ صرف دو زبان کا فرق ہے۔ ورنہ درحقیقت دونوں ایک ہیں۔ بعد ان بیانات کے یورپ جدید کی شاعریوں کا سلسلہ بیان شروع ہوگا اور اس میں بیشتر انگریزی شعرا کے انداز کلام سے خبر دی جائے گی۔ اس کے بعد سنسکرت کی شاعری



سے بحث کی جائے گی اور اس کے ذیل میں حتی الامکان بھاشائیں جو شعریاں ہیں بیان ہوں گی۔ اسی کے شمول میں کبت، دوہرے اور گیتوں کے مذکور آئیں گے آخر میں چین و جاپان و برہما کی شاعریوں کے مختصر احوال رقم ہوں گے۔ انہیں بیانات کے اندر نظم و نشر کے متعلق جو ضروری امور ہوں گے اندراج ہوں گے۔ حضرات ناظرین سے التجا ہے کہ فقیر کی خطاؤں سے درگزر کر کے اسے دعائے خیر کے ساتھ یاد فرمائیں گے۔

ہر چند نیم لائق بخشایش تو بر من منگر بر کرم خویش نگر

## اہل عرب کی شاعری

واضح ہو کہ عرب کا ملک فطری اسباب و معاملات کے رو سے یونان و روم بلکہ تمام ان دیار اور اہوار سے جہاں شاعری کو فروغ ہوا ہے ایک علاحدہ انداز رکھتا ہے۔ یہ امر بدیہی ہے کہ کسی ملک کی شاعری کے حسن و قبح پر کوئی شخص اطلاع نہیں پاسکتا ہے۔ جب تک کہ اسے اس ملک کے تقاضائے فطرت اور معاملات مذہب اخلاق، تمدن و معاشرت وغیرہ سے اطلاع کی شکل حاصل نہ ہو لے۔ پس قبل اس کے کہ راقم اہل عرب کی شاعری کی کیفیتوں کو بیان کرے۔ ضرور ہے کہ کچھ خود ملک عرب اور اہل عرب کے ان حالات کو جو امور بالا سے تعلق رکھتے ہیں عرض کرے۔ تاکہ وہ حضرات جو ان سے واقفیت نہیں رکھتے ہیں واقف ہو جائیں اور اس واقفیت کے ذریعہ سے عرب کی شاعری کے انداز کو سمجھ سکیں۔ تحریر ذیل سے کسی قدر امور بالا کا انکشاف متصور ہے۔

## ملک عرب اور اس کے صوبے

عرب براعظم ایشیا کا ایک وسیع ملک ہے۔ اس کی نامہوار طور پر مستطیل ہے اور اس کا زیادہ حصہ بحور سے محاط ہے۔ اسی لیے اسے جزیرہ نما کہتے ہیں۔ یہ ملک براعظم ایشیا کے مغربی حصہ میں واقع ہے اور اس میں ارد گرد کے ملک فارس، عراق، عرب اور شام ہیں۔ مصر جو براعظم افریقہ کا ایک مشہور ملک ہے۔ بہت قریب اس کے جانب مغرب میں واقع ہے۔ ان دونوں ملکوں کو بحر احمر نے

ایک دوسرے سے جدا کر دیا ہے اور اگر یہ چھوٹا سا سمندر درمیان میں لاحق نہ ہوتا تو ان دونوں ملکوں کی زمین ایک دوسرے سے مماس ہوتی۔ جاننا چاہیے کہ اہل یورپ ملک عرب کو تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک حصہ جو زرخیز اور شاداب ہے اسے عربیہ فلکس ARABIA FELIX یعنی عرب آباد۔ دوسرے حصہ کو جو کوہستانی ہے عربیہ پیٹریا ARABIA PETRAEA یعنی عرب جبالی اور تیسرے حصہ کو جو ریتلا ہے عربیہ ڈزرت ARABIA DESERT یعنی عرب ریگستانی کہتے ہیں۔ خود اہل عرب اس ملک کو ان ناموں پر تقسیم نہیں کرتے ہیں۔ ان کی تقسیم کی رو سے ان حصوں کا نام بہ ترتیب بالا حجاز، یمن اور نجد ہے۔

## کیفیت ملک عرب

ملک عرب عام طور سے آباد و شاداب نہیں ہے۔ بہت حصے اس کے ریگستانی ہیں۔ جبال بھی بہت ہیں۔ ایک سلسلہ کوہی بحرا حمر سے مکہ معظمہ کے قریب ہوتا ہوا بحیرہ فارس تک چلا گیا ہے۔ علاوہ اس سلسلہ کے ایک سلسلہ اد بھی ہے جو آہنائے باب المندب سے بحیرہ عقابہ تک جنوباً و شمالاً مغربی ساحل عرب کے تمام طول ہو کر گذرا ہے۔ اسی بحیرہ عقابہ کے قرب میں طور سینا واقع ہے جس کا ذکر کتب سمدیہ میں آتا گیا ہے۔ یہ وہی پہاڑ ہے جس کو ہمارے دیسی شعرا میشر غزلوں میں باندھا کرتے ہیں۔ یہ پہاڑ خاکنائے سوئز کے جوازیں ہے اور دریائے حمر سے بہت دور نہیں ہے۔ زرخیز اور شاداب خطے صرف یمن، حضرموت عمان اور لحفہ میں علاوہ ان کے ساحلوں کے کنارے بھی شاداب ٹکڑے پائے جاتے ہیں۔ ایسی جگہوں میں اشجار حسب مراد نشوونما پاتے ہیں اور اثمار بھی پیدا ہوتے ہیں۔ ملک عرب میں کوئی ایسا دریا نہیں ہے جس میں کشتی چل سکے۔ کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے چشمے ہیں وہ بھی فصل گرما میں خشک ہو جاتے ہیں۔ جھیلیں بھی کہیں نہیں ہیں۔ جنگل بھی جیسے کہ ہندوستان یا فارس میں موجود ہیں، نہیں پائے جاتے ہیں۔ بارش بعض حصوں میں تمام سال میں ایک بار بھی نہیں ہوتی۔ جانوران صحرائی بھی صرف چند اقسام کے ہیں۔ گرگ، شغال، پلنگ، فتنار صحراؤں میں دیکھے



جاتے ہیں اور پہاڑوں میں ایک قسم کی بکریاں ہوتی ہیں۔ جن کو اہل عرب شکار کرتے ہیں۔ علاوہ ان کے دو چار قسم کے آہو بھی پائے جاتے ہیں۔ جو بیشتر اس ملک کے شاداب حصوں میں رہتے ہیں۔ ان اقسام آہو ان سے ایک قسم ہوتی ہے۔ جس کی ناف میں مشک ہوتا ہے۔ اسے اہل عرب ظبار المسک کہتے ہیں۔ پروردہ جانوروں میں گائے، بیل، دنبے، گھوڑے اور اونٹ ہیں۔ یہ آخر کے دو جانور اس ملک کے شہرہ آفاق ہیں۔ جیسے گھوڑے اس ملک میں ہوتے ہیں روئے زمین پر کہیں نہیں ہوتے۔ مگر اہل عرب کے لیے بکار آمد ترین جانور اونٹ ہے۔ طیور میں عقاب، باز، گدھ وغیرہ اکثر دیکھے جاتے ہیں۔ اور تیر، کبوتر، مرغ وغیرہ بھی آباد حصوں میں بکثرت دستیاب ہوتے ہیں۔ مزاج اس ملک کا حار با پس ہے مگر جہاں کوئی مقامات ہیں وہاں کی آب و ہوا معتدل المزاج ہے۔ صحراؤں میں ایسی لوطیت ہے کہ آدمی کا ہلاک ہو جانا کوئی دشوار امر نہیں ہے۔ ایک ہوا چلتی ہے جسے بادِ سموم کہتے ہیں۔ یہ غضب کی ہوا ہوتی ہے کہ کارواں کے کارواں کو بد حال کر ڈالتی ہے۔ اس ہوا کے ساتھ ریگ اس قدر اڑتی ہے کہ آدمی اور حیوان اس میں چھپ جاتے ہیں اور سخت ایذاؤں اٹھاتے ہیں۔ پیداوار ملک، کھجور، شہد، گیہوں، جو، تنباکو، نیل، قہوا، قند، شرمندی اقسام مصالح، صنم عربی، مصطلکی رومی، امیران، انار، انگور، کشمش، زہرہ وغیرہ وغیرہ ہیں چند قسم کی معدنی اشیا بھی دستیاب ہوتے ہیں۔ مگر ابھی تک ملک عرب کے معدنیات کی تحقیق کافی طور پر نہیں ہوئی ہے۔

## اہل عرب کا بیاں

اہل عرب قامت اور جثہ کی رو سے اوسط درجہ کے لوگ ہوتے ہیں۔ اکثر ان میں میانہ قد اور لاغر اندام دکھائی دیتے ہیں۔ رنگ ان کا میل بہ تیرگی ہوتا ہے۔ مگر ان کی عورتیں صاف رنگ اور خوش رو ہوتی ہیں۔ ان کے گزران کا طور بہت سادہ ہے۔ لباس اور غذا کا طور سادگی سے خالی نہیں ہوتا۔ الا شہر والے عرب جو خوش لباسی اور غذائی کو محبوب رکھتے ہیں۔ عموماً اہل عرب کی غذا شیر شتر ہے۔ شتر کے گوشت کم تر استعمال میں لاتے ہیں۔ الا شہروں میں کہ جہاں شتر یا دنبہ کا

گوشت کثرت سے میسر آتا ہے۔ بدویان عرب خاریطہ، موش، سوسمار، مڈی، نیول وغیرہ بے تکلف کھاتے ہیں۔ اسی کشف خواری کی وجہ سے ایرانیوں نے جب معلوم کیا کہ اہل عرب ان کے ملک کے خواہاں ہیں تو حقارت کی راہ سے کہا تھا کہ اسی منہ سے ملک ایران کی تمنا رکھتے ہیں۔ چنانچہ صاحب شاہنامہ لکھتے ہیں ے

ز شیر شتر خوردن و سوسمار      عرب را بجائے رسیدست کار  
کہ ملک بعم را کنند آرزو      تقو تو برلے چرخ گرداں تقو

سوائے شہریوں اور قصبائیوں کے بیشتر قبائل عرب خیموں میں اوقات کرتے ہیں اور اپنے گلوں کو چراتے ہوئے صحراؤں میں جہاں جہاں چری کے سامان میسر آسکے ہیں۔ پھرا کرتے ہیں۔ یہ لوگ پورے خانہ بدوش ہیں۔ تقاضائے ضرورت سے ایک جگہ بولدوباش اختیار نہیں کر سکتے۔ یہ صحرائے عرب تھوڑے میں اوقات کر لینا جانتے ہیں ان کی غذا لباس اور طریقہ معاشرت سے تمام تر سادگی عیاں ہے۔ ان کا تمدن بھی دنیا کے تمدن سے علاحدہ انداز رکھتا ہے۔ قبیلہ قبیلہ کا شیخ ہی ان کا بادشاہ یا حاکم ہے ان کو شائستہ اقوام دنیا کے معاملات تمدن سے کوئی علاقہ نہیں۔ یہ لوگ یورپ کی پالیسیوں سے نہ خبر نہ کوئی سروکار رکھتے ہیں۔ ان کے کانوں تک بسمارک اور گلیڈسٹن GLADSTONE کے نام تک نہیں پہنچے ہیں خصال کی رو سے یہ بادیہ نشیناں عرب جنگجو، مہمان نواز، کینہ آور اور سنگ دل ہوتے ہیں۔ ان کی اوقات گزاری کا ذریعہ لوٹ مار ہے آج تک بھی سفر حجاز ان بدویوں کے باعث منظور ہو رہا ہے حرم درپیش و حرامی درپس سعدی علیہ الرحمۃ کا ایسا قول ہے کہ جس سے ہر زائر کعبہ خوب مطلع ہے بعثت آنحضرت صلعم کے پہلے ان مردانہ صحرائی کے جو انداز تھے وہ اب بھی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان وحشیوں کو کوئی ردی فائدہ اسلام سے نہ ہوا یہ لوگ جیسے ایام جاہلیت میں تھے ویسے آج بھی ہیں ے

گر نہ بیند بروز شپہ چشم      چشمہ آفتاب را چہ گناہ  
یہ بہت تعجب خیز امر ہے کہ اسلام کی بدولت فارس، ہندوستان،  
کابلستان، عراق، عرب، شام، مصر، روم اور بنظر انصاف دیکھیے تو تمام یورپ



نے قائدہ عمل اٹھایا مگر بدویان عرب کی جہالت اپنی حالت پر رہی خیر اگر اسلام کا اثر ان بدویوں پر نہ ہوا تو نہ ہوا لیکن اس دین پاک نے شہری اور قبضاتی عربوں میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ اہل واقفیت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ آنحضرت صلعم کے بعثت کے پہلے ان عربوں کی تمدنی اخلاقی اور مذہبی معاملات نہایت اصلاح طلب ہو رہے تھے۔ مگر تھوڑے عرصہ میں اسلام نے انہیں دوسری قوم بنا ڈالا مذہب ان کا بدترین شرک و کفر کا نمونہ ہو رہا تھا۔ بتوں کا شمار ایسا نہ تھا کہ کوئی شخص ان کو انگلیوں پر گن کر بتا دے سکتا۔ خانہ کعبہ میں تین سو ساٹھ بت سال کے ہر روز کے حساب سے موجود تھے۔ مشہور بتوں سے لات عزا اہل صفا کا یلہ منا تھے۔ آفتاب، ماہتاب، کواکب سب کی پرستش ہوتی تھی۔ بتوں پر جانور چڑھائے جاتے تھے۔ آدمی کی قربانی بھی کوئی تکلف خیز بات نہ تھی۔ خدائے واحد کی کوئی پرستش نہیں کرتا تھا۔ تمدنی حالت یہ تھی کہ ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کا دشمن تھا۔ آپس میں بے دھرمک تلواریں چلا کرتی تھیں۔ عام قانون کوئی نہ تھا۔ قانون وہی سمجھا جاتا تھا جو کسی شخص یا کسی قبیلہ زبردست کی رائے ہوتی تھی۔ اخلاقی معاملات کو کیا کوئی بتائے کہ کیا تھے۔ کوئی گناہ یا بد اطواری رٹے زمین پر نہیں ہے جس کے مرتکب ایام جاہلیت کے عرب نہ ہوتے تھے۔ شراب خواری، قمار بازی، خوں ریزی، زنا کاری، غارت گری و دختر کشی مروج عام تھی۔ ان کے ہر روز کا مشغلہ ارتکاب معاصی تھا۔ الفرض ان کے جو افعال تھے اخلاقی تمدنی اور مذہبی نقصانات سے پاک نہ تھے۔ اور سراسر اصلاح طلب ہو رہے تھے جانا چاہیے کہ وقت ظہور اسلام عرب میں تین مذہب جاری تھے۔ ایک تو مذہب کفار عرب کا تھا جس کا مذکور بالا میں آچکا ہے۔ یہ مذہب بدترین مشرکانہ انداز رکھتا تھا۔ اس میں دین ابراہیمی کا کچھ بھی اثر پایا نہیں جاتا تھا۔ دوسرا مذہب عیسائی تھا جو نقصان تلیث کے علاوہ تمام تر پیرایہ شرک رکھتا تھا۔ تیسرا مذہب موسوی تھا۔ جو دولت توحید کو گم کر کے ہر دو مذہب بالا کی طرح خراب ہو رہا تھا۔ مذہبی خرابیوں کے سوا ان تینوں مذہب کے پیرو یکساں طور پر معاملات اخلاقی میں پسا ہو رہے تھے۔ مگر صدی ہفتم میں جو اسلام نے ظہور فرمایا تو عرب

میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہوا۔ بانی اسلام صلعم نے بت پرستی کو جو تمام معصیت کی جڑ ہے جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ شرک کی جگہ توحید سکھائے۔ شراب خوری، قمار بازی، زنا کاری، خوں ریزی، غارت گری، دختر کشی کا استیصال کر ڈالا۔ مختلف قبائل عرب میں آشتی کے انداز پیدا کر دیے۔ ان میں مواخات قائم کی معیشت کے آداب بتلائے۔ تجارت کے رستے دکھلائے حق و ناحق کی تمیز دلائی۔ دنیا کے ساتھ عاقبت کی راہ سنجائی۔ غرض وہی اہل عرب جو مذہبی، تمدنی، اخلاقی نقبانات میں ڈوبے ہوئے تھے۔ صاف ستھرے ہو کر ایک پاکیزہ قوم ہو گئے۔ راقم کی دانست میں ایسے برے وقت میں اسلام کا ظہور اسلام کے برحق ہونے کی ایک قوی دلیل معلوم ہوتی ہے۔

## عرب کی شاعری قبل و بعد بعثت صلعم

واقع ہو کہ مذہبی، تمدنی اور اخلاقی انقلاب کے ساتھ ہر قوم کے لٹریچر میں بھی ایک انقلاب پیدا ہوتا ہے۔ ارباب واقفیت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ بعثت آنحضرت صلعم کے پہلے اہل عرب کا لٹریچر کچھ بھی نہ تھا۔ ان کے لٹریچر کا دائرہ شعر گوئی سے باہر نہ تھا اور ان کی شعر گوئی بھی ایک محدود انداز کی تھی۔ مگر ظہور اسلام کے بعد بتدریج عربی کا لٹریچر ترقی کر کے ایک اعلا درجہ کو پہنچ گیا۔ اس وقت جو کتابیں صرف و نحو و بلاغت، عروض، تارتخ و سیر وغیرہ کی موجود ہیں۔ اہل عرب کی ترقی لٹریچر پر گواہ ہیں۔ شاعری نے بھی پر بدلا۔ گو عرب کی شاعری کبھی اس درجہ کو نہیں پہنچ سکی۔ جس درجہ پر ہومیروس، ورجل، فردوسی، ملن، بالیگی، ویاس، میرانیس، شکسپیر، گوئتا یا کالی داس کی شاعریاں دیکھی جاتی ہیں۔ اس پر اسلام نے عربی شاعری کے مذاق کی ایک معنی کر کے بڑی اصلاح کر دی اور وہ یہ کہ ایام جاہلیت میں شعرا جو مفناہین فسق و فجور کو بیباکانہ طور پر باندھا کرتے تھے اور اپنی بے حیائیوں پر فخر و مباہات کیا کرتے تھے۔ یہ بدقرینگی عہد اسلام میں یک قلم مفقود ہو گئی اور اگر مفقود نہیں ہوئی تو وہ اسلام کی رو سے ممنوع سمجھی جانے لگی لاریب اسلامی شاعری نے تہذیبی پایہ اختیار



کیا بلکہ اخلاقی راہ اس مضبوطی سے اختیار کی کہ اس کی نظیر کم تر اور کسی ملک کی شاعری میں دیکھی جاتی ہے۔ چنانچہ امیر المومنین کا ایسا اخلاقی پیرایہ ہے کہ اس تبعیت پر ملک کے اخلاق آموز کے لیے ضرور معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ سعدی علیہ الرحمۃ جو ایک بڑے ولی اللہ اور اخلاق آموز گذرے ہیں بہت کچھ خرمین معنایں مرتضوی کے خوشہ چیں نظر آتے ہیں۔ بہر حال اب حضرات ناظرین تحریر ذیل پر توجہ فرمائیں۔ جس سے مختصر طور پر اہل عرب کی قبل و بعد بعثت کی شاعرانہ لہجوں کے انداز ظاہر ہوں گے۔

یہ امر بدیہی ہے کہ عرب تقاضائے فطرت سے ایسا ملک نہیں ہے کہ جو شاعری کے واسطے مخلوق ہوا ہو اس کو شام، فارس، ہندوستان، مصر، روم، یونان، ایتالیا وغیرہ کی فطرتی خوبیاں نصیب نہیں ہوئی ہیں۔ جیسی جیسی خوش سوادیاں و امہب الفاظ پانے ان ملکوں کو بخشی ہیں ان کا ہشتم حصہ بھی تفویض نہیں فرمایا ہے اگر ان ملکوں میں جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ فطرت نے بہت زیادہ توجہ کے ساتھ اپنی بخششیں ان کے حال پر مبذول رکھے ہیں۔ ان ملکوں کو سبزہ و گل سے آراستہ کیا ہے شادابی کے لیے کثرت سے چشے بلکہ بڑے بڑے دریا ہر طرف بہائے ہیں پہاڑوں کو اشجار و اثمار سے زینت دی ہے جنگلوں کو قبائے سبز سے مخلع کیا ہے۔ میدانوں کو فرش زمرہ میں بنا رکھا ہے۔ بڑی بڑی جھیل اور آبستان سے میدانی اور کوہی مقامات کو تازگی بخشی ہے۔ طرح طرح کے مرغان نواسخ پیدا کیے ہیں اور اسی طرح کی ہزاروں نعمتیں ہیں۔ جن سے ان ملکوں کو جنت کا نمونہ کر دکھلایا ہے۔ برخلاف اس کے اگر ملک عرب میں اس کی ایک حد سے دوسری حد تک چلے جاتے تو سوائے بڑی بڑی صحرائی ریگستانی پتھر لے ٹیلے اور جلے بھنے پہاڑوں کے بیشتر کچھ نظر نہ آئے گا۔ یہاں کوئی جھیل لیک کو مو LAKE COMO کی کیفیت کی دکھائی نہ دے گی۔ کوئی پہاڑ دار جلنگ، منصوری، شملہ، نمینی تال کے رنگ کا نظر سے نہ گزرے گا۔ کوئی دریا ڈیو پ، نیل، فرات، دجلہ، جیوں، سیحون، آرس، گنگا، جمن سون کی حیثیت کا نہ پایا جائے گا۔ اس ملک میں نہ کوئی میدان یا کوہ ایران و کشمیر کی طرح پر از لالہ و نازان ہے۔ نہ یہاں بلبل، قمری، ناخستہ، طوطی، شاما، کوئل، پدا، بھنگراج وغیرہ کی صدائے دلکش کانوں میں آتی ہے۔ مختصر یہ ہے کہ ملک عرب



اپنی ساخت کی رو سے ایسا ملک نہیں ہے کہ شاعری کے واسطے مخلوق ہوا ہو۔ لاریب یہاں شاعری کو میدان وسیع حاصل نہیں ہے۔ پس ضرور ہے کہ ایسے ملک کی شاعری محدود صورت ہو۔ چنانچہ اہل عرب کی شاعری جو ایام جاہلیت کی ہے۔ ایسی ہے تمام ان شعرائے عرب کے خیالات ایک تنگ دائرہ کے اندر واقع نظر آتے ہیں ان کے تمام شاعرانہ خیالات کا خلاصہ یہ ہے کہ شاعر اپنی معشوقہ کے حسن و جمال کا تذکرہ کرتا ہے یا اپنے عشق و معشوق کی کیفیت کو بیان کرتا ہے یا شراب کی خوبی اور میکشی کے لطف کو حوالہ قلم کرتا ہے ایسے مضامین کے علاوہ اپنی ذاتی شجاعت یا قومی بہادری کا اظہار کرتا ہے یا اپنے کسی مطبوع گھوڑے یا اونٹ کو یاد کرتا ہے۔ انہیں اقسام کے مضامین کے ساتھ شیلے۔ ریگستان، صحرا وغیرہ کی باتیں موزوں کرتا ہے۔ لیکن واضح رہے کہ ہر چند قبل بعثت آنحضرت صلعم کی شاعری عرب کا دائرہ محدود نظر آتا ہے۔ تاہم شعرائے ایام جاہلیت کے کلام بہت فطرتی انداز رکھتے ہیں اور مجرد اس تبعیت فطرت کی بدولت بہت کچھ قابل توجہ ہیں۔ زبانی عربی برائے خود بہت کچھ وسعت بیان رکھتی ہے اور جب اس کا استعمال تبعیت فطرت کے ساتھ کیا جاتا ہے تو اس کی وسعت لسانی بہت خوبیاں پیدا کرتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ وسعت زبان اور تبعیت فطرت کی بدولت یہ شعرائے عرب اپنی شاعری کے محدود دائرہ میں بہت کچھ لطف مضامین دکھلاتے ہیں۔ ان کی شاعری کی برلطف ہونے کی ایک وجہ یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ اہل عرب مزاج گرم رکھتے تھے جو زور آور شاعری کے لیے ایک ضروری ہے ان شعرائے عرب کے کلام سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ اگر وہ اپنی معشوقہ کی تعریف کرتے ہیں یا اپنے عشق کو بیان کرتے ہیں یا اپنی شجاعت ذاتی یا قومی کا ذکر کرتے ہیں یا اسی طرح جو کچھ موزوں کرتے ہیں اُسے کیفیت قلبی کے ساتھ حوالہ قلم کرتے ہیں۔ تصنع یا کمزوری دل کو ان کے کلام میں دخل نہیں معلوم ہوتا ہے چنانچہ سب سے معلقہ کی شاعری یہی انداز رکھتی ہے۔ واضح ہو کہ قبل بعثت کی شاعری کا یہی انداز دیکھا جاتا ہے جیسا کہ بالا میں عرض ہوا مگر بعد بعثت شاعری کا دوسرا نقشہ بندھا ظہور اسلام کے بعد اہل عرب کو اقوام مختلفہ سے سابقہ کی شکل پیدا ہوئی۔ مسلمانوں کی سلطنتیں مختلف ملکوں



میں پھیلیں جس کے سبب سے عرب کی شاعری میں، بین انقلاب نمایاں ہونے لگا۔ عہد بنی امیہ سے مذاق غم اہل عرب کی شاعری میں داخل ہونا شروع ہوا اور عہد بنی عباس میں تو عرب کی شاعری ابھی طرح سے غمی شاعری ہو گئی۔ زبان تک بدل گئی وہ بے ساختگی اور بے تکلفی وہ سادگی وہ تمہییت فطرت جو ایام جاہلیت کے شعرا کو حاصل تھی۔ رخصت ہو گئی۔ جس خلوص جس جوش جس گداز سے شعرائے قبل بعثت شعر کہتے تھے وہ باتیں مفقود ہو گئیں۔ سلطنت کے تقاضے سے درباری شعرا پیدا ہوتے گئے۔ شاعری ذریعہ رزق سمجھی جانے لگی۔ شعرا نے مدح گوئی کا پیشہ اختیار کیا۔ اس عہد میں جو دکلا اور بیرسر کماتے ہیں اس کا وہ چند شعرا کمانے لگے۔ ایک ایک شعر پر لاکھ لاکھ روپیے پانے لگے۔ تجارتی لونڈیوں کو شعر گوئی سکھلائی اور خلفاء و امرا سے ہزاروں ہزار پیدا کیے غرض کہ یہ تقاضائے وقت سے شاعری جو ایک امر روحانی ہے حکم مزخرفات میں در آئی۔ ان زمانوں کے شعرا کے کلام سے صاف نمایاں ہے کہ ان کی شاعری جبارین وقت کے آگے دست سوال کیے ہوئے ہیں۔ ان درباری شعرا کی کوئی حد نہیں معلوم ہوتی ہے۔ ہر نامی خلیفہ کے وقت میں ان اجرت طلب شعرا کی بہ کثرت تھی کہ ان کے ناموں کو یاد رکھنے کے واسطے ایک نہایت قوی حافظہ درکار ہے۔ بہر حال ان کے کلام سے یکساں پورے زربستگی ہے اور یہ ایسا امر قبیح ہے کہ سچی شاعری کے بہت منافی ہے۔ بالتحقر بعد بعثت شاعری عرب نے ایک بڑا انقلاب پیدا کیا۔ مگر بدانت راقم اس انقلاب سے نقش شاعری کو کوئی فائدہ نہ ہوا۔ بلکہ اہل عرب کے فطرتی مذاق میں ایک نقصان عظیم لاحق ہو گیا۔ اہل اطلاع سے پوشیدہ نہیں ہے کہ شاعری کو روحانیت سے تمام تر تعلق ہے اور حقیقت یہ ہے کہ سچی شاعری خلوص جوش سوز و گداز سے عبارت ہے۔ پس جہاں زراں دوزی، شکم پروری اور ہوسناکی کو دخل ہو وہاں پھر سچی شاعری کہاں۔ ان خلفائے عرب کے زمانوں کی شاعریاں بیشتر ایسی ہی ہیں کہ ان کو شاعری سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ اس طرح کی جتنی شاعریاں ہیں دراصل طواریہ مذاقی ہیں۔ افسوس ہے کہ اہل عرب نے اپنے عہد حکومت میں باوجود ہر طرح کی علمی ترقیوں کے شاعری میں کوئی سہارا نہ دیا اور نہ ہی اس کی ترقی کی۔



ترقی کر گیا اور شعر گوئی کا طوفان بھی ایک عرصہ دراز تک بہا رہا۔ مگر نقش شاعری کو کوئی ترقی نہیں ہوئی بلکہ جب تک ان کی سلطنتیں قائم رہیں شاعری زوروں کے ساتھ مبتلائے بد مذاقی رہی اگر خلفائے عرب خوش مذاق ہوتے تو شاعری کو درجہ ابتذال کو نہیں پہنچا دیتے۔ ایسی صورت میں نہ درباری شاعروں کی کثرت ہوتی اور نہ احاطہ شاعری کا اس قدر محدود رہ جاتا۔ اگر عربی شاعری کے احاطہ پر نظر ڈالیے تو اس کا احاطہ فارسی کی شاعری سے بھی زیادہ محدود دکھائی دیتا ہے۔ اہل عرب کی شاعری قصائد و قطعات و رباعیات میں محدود معلوم ہوتی ہے۔ زبان عربی میں ایک کتاب بھی بمشکل مثنوی جیسے شاہنامہ، سکندر نامہ، یوسف و زلیخا وغیرہ ہیں نظر نہیں آتی ہے۔ نہ اہل عرب میں غزل گوئی کا مذاق دیکھا جاتا ہے کوئی عرب کا شاعر سعدی حافظ، جامی وغیرہ کا جواب نہیں معلوم ہوتا مثنوی عرب کی شاعری کا دائرہ بہت تنگ ہے اور زیادہ افسوس اس سبب سے ہوتا ہے کہ اپنے عہد حکومت میں اہل عرب کو دائرہ شاعری کے وسیع کرنے کا موقع کامل طور پر حاصل تھا۔ جس طرح اہل عرب مختلف علوم کو زبان یونانی سے اپنی زبان میں لے آئے۔ اگر اہل یونان کے مذاق شاعری کو بھی اپنی طرف منتقل کر لیتے تو مثنوی نگاری اور ڈراما نگاری عربی شاعری میں داخل ہو جاتی۔ اگر کاش یہ مذاق آجاتا تو عرب کی شاعری یونان، روم، انگلستان اور سنکرت کی شاعری کے ہم پہلو ہو جاتی۔ تعجب ہے کہ اس طرف خلفائے عرب نے توجہ مبذول نہیں کی اور شاعری کو اپنی مدحت سرائی کے واسطے مخصوص جانا لاریب عہد خلفائے دمشق و بغداد کی شاعری نمونہ بد مذاقی ہے۔ اسی عہد کے شاعر کا اثر ہے جو فارسی اور اردو کی شاعری کو بھی گھرے ہوئے ہے اور دونوں زبانوں کی شاعریوں کی بد مذاقی کا سبب واقع ہوا ہے۔ اہل واقفیت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ ہر ملک کی پسیمی شاعری کا مذاق صحیح رکھتے تھے۔ درباری شاعر ہو کر خراب ہوتے گئے۔ انگلستان میں بھی آج تک ایک شخص درباری شاعر ہوا کرتا ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ جب کوئی خوشی کی تقریب خاندان شاہی میں ہو تو مبارکباد لکھے اور جب خلاف اس کے کوئی امر ظہور میں آئے تو مرثیہ لکھے۔ یہ خدمت انگلستان کے عہد جہالت کو یاد دلاتی ہے۔ ایک زمانہ انگلستان کا بھی ایسا تھا کہ اس طرح کے درباری شعرا



کثیر الوجود تھے۔ ارباب تحقیق پر روشن ہے کہ سچا شاعر قرب سلطانی کا جویا ہونہیں سکتا۔ یہ کام نا شاعر کا ہے کہ سلاطین و امرا کی جوتیاں جھاڑتا پھرے۔ اس شیوہ کو سعدی و حافظ نے کبھی اختیار نہیں کیا اور بعض سچے شاعروں میں فردوسی اور لارڈ ٹینیسن LORD TENYSON وغیرہ نے اختیار کی بھی تو بشکل مجبوری اختیار کیا۔ مگر اس تقرب سلطانی پر بھی جاہ طلبی سے دور رہے اور اپنے فن کی شرافت اور عظمت کے آگے دنیا کے آگے مال و منال کو لاشے سمجھتے رہے۔ انفرن تقرب سلطانی کا بڑا اثر سچی شاعری پر پڑتا ہے۔ بہت سے عمدہ شاعر گزرے ہیں کہ اگر ان کو تقرب سلطانی حاصل نہ ہوتا تو ان کی صحت مذاق میں خلل واقع نہیں ہوتا۔ اس کی مثال متنی ہے۔ جو واقعی بہت بڑا طباع شخص ہے۔ مگر اس کا کام یہی ہے کہ سیف الدولہ کا نور وغیرہ کی مدحیں لکھا کرے اس میں، آزادی، راستی، خلوص۔ گداز کی صفیں کیوں کر باقی رہ سکتی ہیں۔ ایسا شخص اگرچہ کیسا ہی شریف مزاج طبیعت دار خوش مذاق صاحب حیا اور راست باز ہو تو بھی اس طرح کا ذلیل پیشہ اختیار کرنے سے آخر کرایہ کا ٹٹو ہو جائے گا۔ راقم کو متنی کی قسمت پر بہت افسوس آتا ہے کہ ایسے صاحب ذہن و ذکا کو تقدیر نے ایسی ذلیل خدمت سپرد کر دی۔ یہ بیچارہ ہمیشہ مدح گوئی کیا کرتا تھا اور جب مدح سرائی میں کچھ کمی کرتا تو مورد عتاب ہوتا تھا۔ چنانچہ سیف الدولہ کے رفع آزدگی کے لیے جو اشعار کہے ہیں اس کا مطلع یہ ہے۔

اری ذلک القرب ملاذودارا امار طویل السلام اختصارا

کوئی شک نہیں کہ تمام اشعار بڑی ذہانت اور طبائی سے خبر دیتے ہیں۔ مگر سچے شاعر کا یہ کام نہیں ہے جو متنی کو کرنا پڑتا تھا۔ اگر اس کے ممدحین شاعری کا مذاق رکھتے تھے تو ایسے طباع شخص سے شاعری کے عمدہ عمدہ کام لیتے اگر مجرد شاعری کی قابلیت

لے متنی: ”پیدائش ۳۰۳ھ اور وفات ۳۵۴ھ۔ ابو طیب احمد بن حسین متنی کوفہ میں نادار والدین کے ہاں پیدا ہوا، اس کا باپ کوفہ میں بہشتی کا کام کرتا تھا۔۔۔۔۔۔ متنی معنی آفریں شاعروں میں سے ہے، اس نے شعر و فلسفہ کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کیا اور اپنی بیشتر توجہ معنی پر صرف کی۔“ تاریخ ادب عربی از زیات صفحہ ۴۰۶-۴۱۰



پر لحاظ کیجیے تو متبنی سخن آفرینی اور طباعی میں کبھی ہومیر و س'ورجل وغیرہ سے کم نہیں ہے مگر افسوس یہ ہے کہ اس نے شاعری کے اعتبار سے نہ مناسب زمانہ نہ مناسب ملک پایا۔ سلطنت کی بد مذاقی کے باعث یہ حیرت افزا شاعر بیکار عالم وجود میں آیا۔ بلکہ ہزار حیف کہ دنیا سے درباری شاعر کا پورا نمونہ بن کر راہی ملک بقا ہوا۔ علاوہ متبنی کے بہت سے اور بھی درباری شعرا ہیں جن کا بیان خالی از طوالت نہیں ہے۔ خلفائے بغداد کے درباران سخن فروشوں سے بھرے رہتے تھے۔ کہاں تک کوئی ان کے نام لے۔ یہ شعرا بیشتر حصول مال و منال کے لیے شعر کہتے تھے۔ ان لوگوں کو شاعری کے مذاق صحیح ہے کیا علاقہ ان لوگوں نے شاعری کو ایک کثیر النفع روزگار سمجھ لیا تھا اور زرا ندوزی کی نظر سے شعر کہا کرتے تھے۔ بعض جب شکل منفعت نہیں دیکھتے تو شاعری کو خیر باد کہہ کر کوئی دوسرا دھندا اختیار کرتے تھے۔ چنانچہ کثیر سے جو لوگوں نے پوچھا کہ اب شعریوں نہیں کہتے تو اس نے جواب میں کہا کہ جوانی گزر گئی، غزہ مر گئی۔ عبدالعزیز نہ رہا اب نہ وہ منگ ہے نہ ولولہ نہ کوئی امید صمد پھر کون سی شے باقی ہے جو مجھ سے شعر کہلوائے۔ ایسا جواب سوائے ناشاعر کے اور کون دے سکتا ہے۔ اہل انصاف ملاحظہ فرمائیں کہ شاعری میں جوانی و پیری کو کیا دخل ہے۔ بلکہ شاعری تب ہی جوان ہوتی ہے جب شاعر پیر ہوتا ہے۔ جوانی کے اشعار بھی ہوتے ہیں۔ بیشتر اس عمر کے ایسے ہی اشعار ہوتے ہیں کہ خود شاعر معمر ہو کر ان کی اصلاح کرتا ہے یا انہیں ضائع کر ڈالتا ہے۔ علاوہ اس کے شاعری کو دل سے تعلق ہے اور معاملات دلی جو واقعی معاملات دلی ہوتے ہیں جوانی اور پیری سے بخت نہیں رکھتے۔ یہ کیسا خیال ہے کہ جب جوانی گئی تو شاعری بھی رخصت ہو گئی۔ سچا شاعر یا شاعری کا سچا مذاق رکھنے والا جوانی اور پیری میں یکساں شاعری کا دوستدار ہوتا ہے۔ بلکہ سچی شاعری کہیے تو یہ کہنا نہایت صحیح ہے کہ عمر کا اثر اس پر کچھ نہیں ہوتا۔ بلکہ سچا شاعر نہ پیر ہوتا ہے اور نہ مرتا ہے۔ سدا جوان و زندہ رہتا ہے۔ کس واسطے کہ شاعری کی وہ آگ جو اس کے قلب میں خدا کی جانب سے ڈالی جاتی ہے۔ اس کو نہ بوڑھا ہونے دیتی ہے اور نہ مرنے دیتی ہے۔ برگزینمیر و آنکہ دلش اندہ شد بعشق ثبت ست بر جریدہ عالم دوام ما دوسرا سبب شاعری کے ترک کا جو کثیر نے غزہ کے مرنے کا قرار دیا یہ بھی



ایک بے معنی امر ہے اگر کثیر سپاس شاعر ہوتا تو اس کی شاعری اس واقعہ سے اور ترقی کر جاتی۔ اس کا کلام اور مرزہ دار ہو جاتا۔ معشوقہ کا مرنا سچے شاعر کے لیے نہایت مضمون خیز امر ہے۔ اس حادثہ سے شاعری کا ترک ہو جانا چھ معنی دار پہلے اگر کثیر غزہ کے عشق میں غزل سرائی کیا کرتا تھا تو اب اس کے مرثیے لکھتا۔ جیسا کہ مومن خاں دہلوی نے مرگ معشوقہ پر ایک نہایت پر درد مرثیہ لکھا ہے۔ مگر بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ کثیر غزہ کے ساتھ ویسا ہی تعلق تھا جیسا کہ ہوسنا کوں کو ہوا کرتا ہے۔ قیسرا سبب یہ کہ عبدالعزیز نہ رہا۔ البتہ اجرت طلب شاعر کے لیے ایک امر عظیم تھا۔ درباری شاعر کو جب یافت کی صورت باقی نہیں رہی تو پھر کیوں شعر گوئی کی تکلیف گوارا کرنے لگا۔ یہ آخر قول کثیر کا درباری شعر کی حقیقت حال سے خبر دیتا ہے۔ سچے شاعر کو بادشاہ کے وجود و عدم سے کیا مطلب۔ شاعری نہ ہوئی گدائی ہوئی جب تک شاعر سلاطین و امرا سے فارغ نہ ہو بیٹھے پھر شاعر کیا ہے۔ حق یہ ہے کہ درباری شاعر دل کا مذاق شاعری ہی نہیں خراب ہو جاتا ہے بلکہ ان کے تمام قوائے اخلاقیہ ماؤف ہو جاتے ہیں اور یہ خرابی مجدد شاعروں کو لاحق نہیں ہوتی گئی ہے۔ بلکہ تقرب سلطانی کی بدولت بہت سے علمائے ادب بھی درباری مزاج ہو گئے تھے۔ ہر صحبت کا ایک اثر خاص ہوتا ہے۔ دربار خلفائے بنی امیہ اور بنی عباس بیشتر ایسے تھے جہاں خلق محمدی کا نشان دشواری سے ملتا تھا اور دین محمدی یا نثار دتھا یا اہل غرض کی دست اندازوں سے بہت کچھ اپنے مرکز سے تجاوز کر گیا تھا۔ بیشتر خلفا شراب خوار، مردم آزار، بدکار، ظلم سرشت، خوشامد دوست، دشمن عقل تھے۔ ان کے درباری بھی بیشتر بغض و اوائی الناس علی دین منکر کھرا اسی عقل و دین کے لوگ تھے۔ پس ایسے درباروں کے متعلق جو شاعر یا ادیب تھے ان سے صلاح و تقویٰ کی کیا امید کی جاسکتی تھی۔ ایسے شعرا و علما ادب کے اخلاق حمیدہ کیوں کر درست رہ سکتے تھے۔ ان شعرا و علما کو خوشامد اور ظرافت سے چارہ نہ تھا۔ اگر خلفا اور امرا کے خوش کرنے کے لیے مستعد نہ رہتے تو روپیے کیوں کر ملتے۔ اکتساب معیشت کے لیے انہیں سب کچھ کرنا پڑتا تھا۔ پھر آپس میں بغض و حسد کو راہ دیا کرتے تھے۔ اور ایک دوسرے کی تفضیح میں مضائقہ نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ اہم معنی جو ایک مشہور ادیب ہے اور شاید



اس کا جواب کم کوئی ادیب ہوگا۔ ایک روز امین الرشید کے وزیر فضل بن ربیع کے پاس موجود تھا اس وقت ابو عبیدہ بھی جو اس کا ہم پلہ ادیب سمجھا جاتا تھا وہاں حاضر تھا۔ اہمٹی نے ایک گھوڑے کی نسبت عربی اشعار پڑھے ابو عبیدہ اس طرح کے اشعار خوانی سے قاصر رہا۔ فضل نے وہی گھوڑا اہمٹی کو دیدیا۔ اہمٹی کہتا ہے کہ جب ہمیں ابو عبیدہ کو چھیڑنا منظور ہوتا تھا تو اسی گھوڑے پر سوار ہو کر ہم ابو عبیدہ سے ملنے جاتے تھے۔ اس حکایت سے ہویدا ہے کہ اہمٹی باوجود ایک بڑے ادیب اور محقق فن ہونے کے سراپا درباری مزاج کا ہو گیا تھا۔ اتنے بڑے شخص کا ندیم دزد و امیر ہونا ایک حیرت انگیز امر ہے۔ اس پر سے طرہ یہ ہے کہ حریف کو پھیڑنے میں اس روش کو اس نے اختیار کیا جو عوام کا لامقام کی عموماً ہوا کرتی ہے۔ مخفیہ ہے کہ درباری شاعری سچی شاعری سے برا حل دور ہوا کرتی ہے اور درحقیقت شاعری کا حکم نہیں رکھتی ہے۔ بہر حال اب راقم اس شاعری کا ذکر پیش کرتا ہے جو مذاق صحیح سے خبر دیتی ہے اور یہ وہ شاعری ہے کہ ہر ملک اور ہر زمانہ میں قابل قدر اور قابل تعظیم ہوا کرتی ہے اس کی عمدگی سے ہر قوم اور ہر شخص کو اعتراف ہوتا ہے اور وہ ایسے اقوال منقہ سے مشتمل ہوتی ہے جس کی مقبولیت کبھی معرض گفتگو نہیں ہوتی۔ یہ شاعری تمام تر رضائے الہی کی نقل صحیح ہوتی ہے اور اس سے سچی خوشی روح کو مرتب اور اس انشراح کی بدولت قوائے اخلاقیہ ترقی کر جاتے ہیں اور اخلاق ذمہ اخلاق حمیدہ سے مبدل ہو جاتے ہیں۔ زبان عربی میں ایسی شاعری کی قلت نہیں دیکھی جاتی ہے۔ گو درباری شاعری سے عربی شاعری کے انداز ظاہر ہوں گے اور حضرات ناظرین ان انتخابات کو فیکر کی تحریرات بالا کی مضامین سے مطابقت پائیں گے۔

## عربی شاعری کے نمونے

واضح ہو کہ ایام جاہلیت میں بہت شعر اُگزرے ہیں اس زمانہ میں جو شخص شاعر ہوتا تھا وہی تعلیم یافتہ اور محصل سمجھا جاتا تھا شاعری ہی تمام کمالات کی دلیل سمجھی جاتی تھی۔ راقم ایام جاہلیت کے انداز شاعری کو دکھلانے کے لیے کچھ اشعار کتاب



سب سے معلقہ سے انتخاب کر کے خدمت حضرات ناظرین میں پیش کرتا ہے۔ یہ کتاب سات قصائد سے مشتمل ہے اور یہ وہ قصائد ہیں جو عہد جاہلیت میں خانہ کعبہ میں آویزاں کیے گئے تھے۔ فصحاء عرب کا یہ دستور تھا کہ جب کوئی قصیدہ انشا کرتے تھے تو اسے خانہ کعبہ میں اس غرض سے لٹکا دیتے تھے کہ اگر کوئی شاعر دعویٰ سخن رکھتا ہو تو اس کا جواب لکھے۔ یہ سات قصیدے ایسے تھے کہ جن کا جواب ایام جاہلیت کے کسی شاعر سے نہ ہو سکا تھا۔ چنانچہ یہ قصائد یوں ہی معلق رہے یہاں تک کہ اسلام نے ظہور فرمایا اور فصاحت و بلاغت قرآنی کے سامنے ان قصائد کا کوئی وزن باقی نہ رہا اور تب یہ قصائد خانہ کعبہ سے دور کیے گئے

قفابک من ذکرى جیب ومنزل بسقط اللوی بین الدخول مخومل  
معنی۔ اے ہر دو ہم نشینان میرے، مٹھڑو تاکہ ہم یاد میں جیب ومنزل جیب کے جو ایک ایک تودہ پر درمیان دخول اور حول کے واقع ہے روکیں۔

ارباب واقفیت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ ہر ملک کی شاعری کا ایک رنگ خاص ہوتا ہے اور اس کا سبب یہی ہوتا ہے کہ ہر ملک کی افتاد ایک خاص رنگ کی ہوتی ہے۔ ملک عرب کی شاعری خاص کر اس عہد کی کہ جب اہل عرب کو اقوام مختلفہ سے مخالفت کی نوبت نہ پہنچی تھی اہل عرب کے طریقہ گزران سے پوری خبر دیتی ہے۔ چنانچہ یہ شعر اس قوم کی ملکی انداز کو خوب دکھاتا ہے۔ اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی رتیل زین پر کبھی معشوقہ شاعر کا قیام تھا یہ قیام بے وجہ نہ تھا وہ معشوقہ ایسے قبیلہ کی تھی کہ جو مویشی کی چری کے خیال سے اس جگہ میں مقیم تھا اور جب وہاں چری کی صورت باقی نہیں رہی کسی اور طرف چلا گیا پس ایسے قبیلہ کے ساتھ معشوقہ بھی روانہ ہو گئی۔ شاعر جواب اس موضع پر پہنچا تو جیب اور منزل جیب کی یاد سے اس کا دل بھر آیا۔ اس واسطے اپنے دو ساتھیوں کو جو اس کے ہمراہ تھے کہنے لگا کہ اے ہمدو مٹھڑ جاؤ۔ کہ ہم یہاں اشک فشان کر لیں۔ اس کلام سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ شعرائے عرب جو شیلا مزاج رکھتے تھے۔ جو شیلے مزاج والے بیشتر شاہد باز ہوتے ہیں اور اشک ریزی پر تلے رہتے ہیں۔ ایسے مزاج والوں کا گذر ایسی جگہوں پر جہاں انھوں نے کبھی لطف زندگانی اٹھائے ہوں



اور اب وہ جگہیں ویران دکھائی دیتی ہیں جس قدر توحش و اندوہ ان کے دلوں میں پیدا کرے بجا ہے۔ صحبت گذشتہ کو یاد کرنا ایک امر فطرتی ہے۔ کوئی شخص ایسا نہیں ہے کہ جودل رکھتا ہو اور خوشی کے وقتوں کو یاد کر کے آہ حسرت نہ کھینچے۔ اس شعر سے امر القیس کی بڑی طبیعت داری کا اظہار مقصود ہے۔ یہ شعر ایک پر درد معاملہ قلبی سے خبر دیتا ہے۔ سامع کے لیے بھی ضرور ہے کہ واردات قلبیہ کے تقاضوں سے باخبر ہو۔ تاکہ اس کی پنجرل خوبیوں کو حسب مراد درک کر سکے۔ لطف گذشتہ کے مضمون کو میر تقی صاحب نے بھی خوب باندھا ہے آپ فرماتے ہیں۔

جہاں آگے بہاریں ہو گئی ہیں وہاں اب خارزاریں ہو گئی ہیں  
یہ دو مصرعے بہت کچھ واردات قلبیہ سے خبر دیتے ہیں اور توحش و اندوہ پیدا کرنے کے قوی آلے ہیں۔ مرزا نوشہ کا قطعہ بھی اس جگہ قابل ذکر ہے۔

ای تازہ واردان بساط ہوائے دل زہارا گر تمہیں ہوس نائے نوش ہے  
دیکھو مجھے جو دیدہ عبرت نگاہ ہو میری سنو جو گوش نصیحت نبوش ہے  
ساقی بجلوہ دشمن ایمان و آگہی مطرب بہ نغمہ رہزن تمکین و ہوش ہے  
یاشب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشہ بساط دامان باغبان و کف گل فروش ہے  
لطف خرام ساقی و ذوق مدائے جنگ یہ جنت نگاہ وہ فردوس گوش ہے  
یا صبح دم جو دیکھیے آکر تو بزم میں نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے  
داغ فراق صحبت شب کی حبلی ہوئی اک شمع رہ گئی ہے سودہ بھی غموش ہے  
سبحان اللہ کیا انداز کلام ہے۔ بلاشبہ اردو کی شاعری ایسے حضرات شعرا کی

بدولت ایک بڑے درجہ کو پہنچ گئی ہے۔ یہ کلام معجز نظام ہر ملک کے ارباب کیفیت و دانست کو وجد میں لانے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ اپنے قصیدہ میں امر القیس نے صحبت گذشتہ کے مضمون کو نہایت پسندیدگی کے ساتھ حوالہ قلم کیا ہے اور واردات قلبیہ کی کیفیتیں زور بیان سے خوب دکھلائے ہیں مگر امور دلی کو حضرت غالب نے قطعہ بالا میں بڑی دردناکی اور گداز کے ساتھ قلم بند فرمایا ہے اور واقعی عمر رفتہ اور صحبت گذشتہ کے مضامین ایسے ہی ہیں کہ ان کا



بیان بھی ایسے ہی حسرت انگیز اور پُر جوش انداز سے کہا جائے بعض حضرات جو شاعر طبیعت نہیں ہیں اور کچھ ضرورت سے زیادہ غلط بلغم اپنی ترکیب جہانی میں رکھتے ہیں۔ ان کو ایسے کلام سے کوئی لطف حاصل نہیں ہوتا۔ ایسے لوگ با واردات قلبیہ سے بالکل معرا ہیں یا ان کی مرطوب مزاجی کے باعث ان پر واردات قلبیہ کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ خدا جانے حقیقت حال کیا ہے اگر فقیر کو بعض ایسے حضرات سے سابقہ ہوا ہے کہ جو ایسے اشعار سے کسی طرح کا حظ نہیں اٹھا سکتے۔ چنانچہ ایک روز کی سرگزشت یہ ہے کہ فقیر حسب عادت ایک شکار گاہ میں خیمہ زن تھا۔ اس شکار گاہ میں فقیر کا آنا برسوں کے بعد ہوا تھا۔ بار اول میں جو صاحب تشریف رکھتے تھے ان میں سے ایک صاحب بھی اس جلسہ شکار کے شریک نہ تھے۔ کچھ تو ان میں بقید حیات نہ رہے تھے اور کچھ متفرق ہو کر جہاں تہاں چلے گئے تھے۔ اس وقت یہ حسرت دہنگر ہوئی کہ یا خدا یہ چشمے یہ پہاڑ یہ جنگل تو پندرہ برس پہلے تھے اب بھی ویسے ہی دکھائی دیتے ہیں۔ مگر یہ مجلس وہ نہیں ہے جو پہلے تھی اس وقت یاران رفتہ یاد آتے گئے اور جو جلسہ سابق میں لطف ہوتے گئے تھے دل کی آنکھ کے سامنے پھر لگے اس گہری طبیعت بھر آئی اور فقیر نے شعر بالا امری القیس کا پڑھا اور کچھ اردو فارسی اشعار بھی پڑھے۔ اس کے بعد صحبت صادق کے متعلق کچھ پُر حسرت باتیں بھی زبان پر آگئیں۔ ایک شریف شخص راقم کے قریب بیٹھے ہوئے تھے یہ حضرت نہ شاعری سے غرض اور نہ شکار افگنی سے کوئی مطلب رکھتے تھے کسی غرض خاص سے شکار گاہ تک چلے آئے تھے۔ میرے حسرت آلود کلام کو سن کر نہایت لا پرواہی سے بول اٹھے کہ دنیا کا یہی طور ہے۔ اس میں شک نہیں کہ دنیا کا یہی طور ہے مگر دل کا بھی یہی طور ہے کہ صحبت گذشتہ اور یاران رفتہ کو یاد کر کے محزوں ہو۔ ایسا شخص جو واقعی اسباب غم سے محزوں نہ ہوا بہت اعلیٰ درجہ کا فلسفی ہے یا اقسام سنگ و خشت سے ہے۔

فتوحہ بالمقراۃ لمعرفہ رسمہا لما نسجتہا من جنوب و شمال

معنی۔ وہ منزل حبیب واقع ہے درمیان دخول و حوصل اور درمیان توضیح اور مقراۃ کے اور نشان منزل حبیب ابھی تک باقی ہے اس لیے کہ زمین حبیب منزل کی

سطح ہے اس پر اگر باد جنوبی خاک ڈالتی ہے تو باد شمال اس خاک کو اڑالے جاتی ہے۔ اس سبب سے منزل حبیب کا نشان باقی رہ گیا ہے اور وہ منزل خاک میں پوشیدہ نہیں ہو گئی ہے۔ شاعر نے یہ شعر کہہ کر منزل حبیب کے حدود اربعہ کو پورا کر دیا اور اس سے بھی خبر دی کہ اس کا نشان محو نہیں ہو گیا ہے۔ یہ بقائے نشان دل میں ولولے غم پیدا کرنے کے واسطے کافی ہے۔ نشان سرائے دوست کیا کیا لطف گزشتہ نہیں یاد دلا سکتا۔ ایسی حالت میں اگر آنکھیں اشک حسرت نہ بہائیں تو کیا کریں۔

واضح ہو کہ امری القیس نے ان اشعار میں شاعری کے داخلی اور خارجی دونوں پہلو کو نہایت با مذاق کے ساتھ قائم رکھا ہے۔ خارجی امور کی اگر اچھی تصویر کھینچی ہے تو داخلی امور کی بھی اچھی بندش دکھلائی ہے۔ یعنی منزل حبیب کا بیان اگر اچھے طور پر کیا ہے تو منزل حبیب کے دیکھنے سے جو واردات قلبیہ پیدا ہوتی ہے ان کو بھی پرتائیسری کے ساتھ موزوں کیا ہے اور لطف یہ ہے کہ ان واردات قلبیہ کو صرف دو تین لفظوں کے ذریعہ سے ظاہر کیا ہے۔ مگر یہ دو تین لفظ ایسے ہیں کہ ایک دفتر کا حکم رکھتے ہیں۔ خاص کر ایسے حضرات کے لیے جو معاملات قلبی سے اطلاع رکھتے ہیں۔

لے تہ معزز خاندان کا نجیب الطرفین بچہ تھا، اس کا باپ بنو اسد کا بادشاہ اور شاہان کندہ کی نسل سے تھا۔ ماں کلیب و مہیل کی بہن تھی، بچپن نہایت ناز و نعم میں گذرا، سرداری کے مہول میں بڑھا، آگے بڑھ کر اس کی عادتیں بگڑ گئیں اور سے نوشی، عشق بازی کھیل کود اور شعر و شاعری میں لگ گیا۔ وہ ۶۵۶۰ میں جبل عیب میں دفن ہوا۔

امرو القیس گویمنی تھا لیکن اس کی تربیت اور پرورش نجد میں ہوئی تھی..... تمام جاہل وعدہ کے شاعروں کا امام و قائد تھا....

اس کی منقولہ شاعری کا سب سے بہترین حصہ وہ معلقہ ہے جو لوگوں میں ضرب المثل بن گیا ہے یہ معلقہ اس نے لکھنڈ ہجاز ادب میں عیزہ کے مشہور واقعہ پر نظم کیا تھا....

مدرسہ اعلیٰ عربیہ از استاد احمد حسن زلیات صفحہ ۱۰۵-۱۰۸



تری بعد الارام فی عرصا تھا و قیعا نہا کما نہ حب فلفل  
معنی۔ اے مخاطب دیکھ تو منزل حبیب کی فضاؤں اور کشادہ گویوں میں آہوان سفید  
کی منگینوں کو گویا کہ وہ دانہ فلفل ہیں۔

شاعر کہتا ہے کہ یا منزل حبیب ایسی تھی کہ ایک نہایت آباد جگہ تھی اس  
میں معشوقہ قیام رکھتی تھی یا اب وہاں آہوان صحرائی رہتے ہیں اور وہ جگہ غیر آباد بڑی  
ہے۔ شاعر منزل حبیب کی ویرانی کو بیان کرتا ہے اور ذکر آہوان صحرائی کا اس  
واسطے کرتا ہے کہ یہ جانور سر پانمونہ وحشت ہوتے ہیں اور مدام بیابان میں رہتے  
ہیں۔ جب تک کوئی جگہ پوری طرح ویران نہ ہوئے یہ وہاں قیام اختیار نہیں کرتے  
بلکہ گفتگو یہ شعر نہایت نیچرل رنگ رکھتا ہے اور ایشیائی مبالغہ سے تمام تر پاک  
ہے۔ فیر نے شغل شکار افگنی میں اپنی آنکھوں سے آہوان صحرائی کو ایسے مقاموں میں  
قیام اختیار کرتے دیکھا ہے جو ایک وقت میں نہایت آباد ہوں گے مگر اب اس قدر  
وہ جگہیں غیر آباد ہو رہی ہیں کہ بے تکلف وحوش وحشی وہاں خواب و خور کرتے ہیں۔  
یہ شاعر کے قول کا لطف تب ہی سامع کو پوری طور پر نصیب ہوتا ہے جب وہ  
معاملات عالم سے ذاتی خبر رکھتا ہے۔ فیر اس شعر کے لطف کو عرض نہیں کر سکتا۔  
کس قدر یہ شعر نیچرل ہے اس کی تعریف نہیں ہو سکتی اس وقت ہندوستان  
میں بہت مقامات ایسے ہیں کہ جو امراد و نوابان و راجگان سابق کے قلعے اور قصور تھے  
مگر وہ افتادہ ہیں اور ان میں گرگ و پلنگ سانبر نیل چیتل وغیرہ رہتے ہیں اور  
اب وہ عمارتیں شکار گاہ کا حکم رکھتی ہیں۔ فیر نے بارہا ایسی عمارتوں کو دیکھ کر  
بے اختیار اشک ریزی کی ہے اور ہر شخص جو انہیں دیکھے گا ضرور متاثر و متالم ہوگا۔  
شاعری کے واسطے ہر طرح کی اطلاع درکار ہے۔ شاعر شاگرد فطرت ہوتا ہے۔ اس  
کے کلام کے سمجھنے کے واسطے فطرت اللہ سے باخبر ہونا واجبات میں سے ہے وہ شخص  
جو گھر کے اندر بیٹھا ہوا شعر کہتا ہے یا اس شے کی کے ساتھ استادوں کے کلام کو سمجھنا  
چاہتا ہے وہ ایسے نیچرل اشعار کے لطف کو کیا پاسکتا ہے۔ ممکن نہیں کہ ایسے خائیشیں  
عنکبوت سیرت شخص کو نیچرل بیانات سے حظ کامل ہو سکے۔ سبحان اللہ امری القیس  
نے شعر بالا میں مضمون ویرانی کو خوب باندھا ہے۔ عشرت سرائے محبوب میں جو

انقلاب عظیم پیدا ہوا ہے اسے بڑی قابلیت شاعرانہ کے ساتھ دکھلایا ہے فخر المتأخرین  
حضرت غالب نے بھی خانہ ویرانی کے مضمون کو عجب جدت کے ساتھ باندھا ہے۔  
آب فرماتے ہیں ے

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا  
ہر چند یہ شعر خود شاعر کی خانہ ویرانی کا اظہار کرتا ہے اور منزل حبیب سے کوئی  
علاقہ نہیں رکھتا۔ تاہم اس سے غایت ویرانی کا مضمون بڑی ندرت کے ساتھ ظاہر  
ہوتا ہے۔ اس شعر میں بھی امری القیس شاعر کے دونوں پہلو کو ملحوظ رکھا ہے۔ اگر  
الفاظ خارجی معاملات واضح طور پر بیان کرتے ہیں تو اسی کے ساتھ ان خارجی معاملات  
سے جو واردات قلبیہ شکل پکڑتی ہے وہ بھی خوبصورت طور سے معنایان ہو جاتی  
ہیں۔ یعنی شاعر نے الفاظ سے منزل حبیب کی موجودہ حالت بیان کی ہے۔ مگر  
ہنچ بیان ایسا اختیار کیا ہے کہ جس سے اندوہ و توحش کا عالم پیدا ہوتا ہے۔ ظاہر  
ہے کہ ایسے انقلاب کو دیکھ کر کیوں کر کوئی آنسو نہ بہائے پس شاعر کا پہلے شعر  
میں یہ کہنا کہ اے میرے ہمدرد یہاں ٹھہر جاؤ کہ ہم منزل حبیب کی یاد میں رو لیں۔  
نہایت قرن فطرت ہے۔ ایسے معاملات تو الم خیز اور حسرت انگیز ہوتے ہی ہیں۔  
کیوں کر دل نہ بھر آئے اور آنکھیں پر آب نہ ہو جائیں۔ فقیر کا ایک قطعہ بھی اسی  
رنگ کا ہے باجاست حضرت ناظرین آتم اسے ذیل میں عرض کرتا ہے ے

اب نہ گل ہیں نہ وہ چمن شاداب بلبلوں کا جہاں ترانا تھا  
سنے ہیں وہ شجر بھی سوکھ گیا جس پہ صیاد آستیان تھا

کافی غداۃ البین يوم تحملو

لدى سمات الحی نایف حنظل

معنی۔ گویا کہ میں فراق کی صبح کو جس روز کہ یاروں نے کوچ کیا سمرا ت جی کے نزدیک  
حنظل کو شکستہ کر رہا تھا۔

سمرات درخت طلع کو کہتے ہیں اور جی عبارت ہے قبیلہ سے اور حنظل کو  
شکستہ کرنے مراد ہے زار زار رونا۔ حنظل ایک نہایت تلخ پھل ہے جو شخص حنظل  
کو توڑتا ہے اس کی آنکھوں سے بہت آنسو رواں ہوتا ہے۔ اسی طرح جیسا کہ پیاز



کے پینے والے کی آنکھ سے بہت پانی گرنے لگتا ہے۔ پس مراد شاعر یہ ہے کہ جس دن صبح کے وقت یاروں نے کوچ کیا میں قبیہ کے درخت طلع کے پاس زار زار رو رہا تھا۔ یہ شعر معاملات خارجی کے اعتبار سے تمام تر عربی مذاق رکھتا ہے۔ درخت طلع کا قریب زمین سکھنے کے ہونا ملک عرب کے گائوں کا نقشہ دکھاتا ہے۔ اگر صوبہ بہار کا کوئی شاعر اس رنگ میں شعر کہتا تو درخت طلع کی جگہ درخت نیب یا درخت برگد وغیرہ کا ذکر کرتا۔ کسی ملک خاص کے کلام سے لطف اٹھانے کے واسطے سامع کو اس ملک کی حالتوں سے باخبری و اجبات سے ہے۔ لیکن مضمون شعر ایسا طبعی ہے کہ ہر ملک کے شاعر نے یار کے وقت سفر کے مفاہین کو مختلف رنگوں سے موزوں کیا ہے۔ مرزا نوحہ فرماتے ہیں

جب بمقرب سفر یار نے تحمل باندھا      پیش شوق نے ہر ذرہ پہ اک دل باندھا  
کسی کا یہ شعر بھی خالی درد سے نہیں ہے گوزبان پرانی ہو گئی ہے  
ارے مانجھی لگا کشتی مرا محبوب جاتا ہے      کبھی انکھیاں بھرتی ہیں کبھی دل ڈوب جاتا ہے  
ظاہر ہے کہ اس طرح کے معاملات خارجی کے ساتھ عرب کی پیداوار اور موطن شاعر مضمون سفر کو نہیں باندھے گا کس واسطے کہ اس کے تمام دیار میں کوئی ایسا دریا نہیں ہے کہ جو سفر بحری کے قابل ہو یہ شعر ملک ہندوستان کے معاملات خارجی سے تعلق رکھتا ہے اور اہل ہند کے نہایت حسب حال ہے۔ استاد فن شیخ امام بخش ناسخ بھی مضمون مفارقت کو یوں باندھتے ہیں

وہ ادھر رخصت ہوا اٹھا ادھر طوفان اشک      تیرا جاتا تھا اس قاتل کا تو سن آب میں  
ہر چند اس شعر میں نیچرل انداز قائم نہیں رہا ہے تو بھی اس کے شیخ غفران آب کے زور طبیعت کا انداز ظاہر ہوتا ہے۔  
مولفہ

ہوتے ہوئے رخصت تجھے اے یار نہ دیکھا      رقت رہی مجھ کو ترے وقت سفر ایسی  
نہیں ہم کو معلوم کب وہ گئے      ہوئے ہوش میں ان کی رخصت کے بعد

وَقُوْنَا هَا مَجْبِي عَلَيَّ مَطِيْهَم  
يَقُوْنُوْنَ لَا تَهْلُبُ اَسَى وَ تَجْمَلُ  
وَ اِنْ شَغَانِي عَبْدًا مُّهْرَاتَةً

فَعَلَّ عِنْدَ رَسَمٍ دَارِيسٍ مِّنْ مَّعْوَلٍ  
 كَذَّائِكَ مِّنْ أُمِّ الرِّبَابِ بِمَا سَبَلٍ  
 إِذْ قَامَنَا تَفْتَوَعُ الْمَسْكُ مِنْهُمَا  
 نَسْرًا لِّصَبَاحِ جَاءَتْ بَوَيَّا الْقِرْنُفَلِ  
 فَفَاضَتْ دُمُوعَ الْعَيْنِ مَعْنَى صَبَابَةٍ  
 عَلَى الْخِزْيَانَةِ بَلَدٍ مَّعْنَى مَحْمَلٍ

معنی۔ میرے احباب اس جگہ میرے آگے اپنے ناقہ ہائے سواری کو استادہ کر کے  
 مجھ سے کہتے ہیں کہ غم سے اپنے کو ہلاک نہ کر ڈال اور صبر اختیار کر۔ حالانکہ میری  
 بیماری کی صورت شفا اشک ریزی ہے پس اس منزل ویران شدہ کے نزدیک  
 کوئی ایسا شخص ہے جو میری نالہ زنی کا شریک ہو رونے سے منع کر کے پھر احباب  
 میرے حال پر ترس کھا کر یہ بھی کہتے ہیں کہ تیرا طور عشقِ عینزہ میں ویسا ہی ہے جیسا  
 کہ قبل میں ام حویرث کے عشق میں تھا اور بھی ام حویرث کی اس ہمسایہ کے عشق  
 میں تھا جس کا نام ام الرباب اور جس کا مقام کوہ ماسل تھا۔ یہ دونوں معشوقہ ایسی  
 تھیں کہ جب وہ نقل و حرکت کرتی تھیں تو ان سے بوئے مشک نکل کر پھیلی تھی۔  
 اسی طور پر جیسے نسیم بوئے قرنفل لے آتی ہے۔ پس جب احباب نے مجھ کو رونے  
 سے منع کیا اور یہ کہا کہ عشقِ عینزہ سے تجھ کو کوئی فائدہ حاصل نہ ہوگا جیسا کہ عشق  
 حویرث اور عشقِ ام الرباب سے کوئی فائدہ نہ ہوا تو جاری ہو گئے آنسو میری  
 آنکھوں سے سوزشِ عشق کی وجہ سے اور بہ نکلے میری ہنسل پر یہاں تک کہ میرے  
 اشکوں نے میری دواں شمشیر کو تر کر ڈالا۔

دافع ہو کہ اشعار بالا سے صاف عیاں ہے کہ سوائے ملکِ عرب کے شاعر  
 کے اس رنگ کے اشعار کوئی دوسرے ملک کا شاعر نہ کہے گا یہ اشعار معاملات  
 عرب سے خوب خبر دیتے ہیں۔ اونٹوں کی سواریاں، عادتِ شاہد پرستی جو شیلان  
 حارمزاجی، خوبرویوں کی طرف میلان، خلقی عطریات کا طبعی شوق، بہادرانہ  
 عشق بازی یہ جتنی باتیں ہیں اصلِ عرب کے خصوصیت رکھتی ہیں۔ حتیٰ کہ بیان  
 فطریہ میں دواں شمشیر کا مضمون فرو گذاشت نہ ہوا۔ بنگالہ کا شاعر گریہ و شمشیر



یہ کیا شکل مرابطت پاتا۔ جوان دونامر لو طہ چیزوں کو بہم کر دیتا بہر حال علاوہ ملکی خصوصیتوں کے یہ اشعار بہت نیچرل انداز رکھتے ہیں۔ گو اخلاقی پایہ ان اشعار کا بہت عالی نہیں معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ان سے پورے عشق کا انداز نہیں ٹپکتا ہے۔ یعنی جس عشق بازی کو شاعر نے حوالہ قلم کیا ہے وہ ہوسناکی سے خالی نہیں دکھائی دیتی ہے اور یہ کچھ تعجب کی بات نہیں ہے۔ اس واسطے کہ اہل جاہلیت کے عرب نسوانی معاملات میں کسی اصول معقول کے پابند نہ تھے۔ بہر کیف یہ اشعار فطرتی لطف سے خالی نہیں ہیں۔ احباب کا دوستانہ سمجھانا اور صبر کی ہدایت کرنا اور اس فہمائش سے غم عشق کا ترقی کرنا اور بے قراری سے اشکوں کا جوش مارنا نیچرل کیفیتوں سے خبر دیتا ہے۔ واقعی عشق میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ کہ نصیحت گر کی نصیحت سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا بلکہ آتش عشق تیز ہو جاتی ہے اور ناصح کو چپ ہو جاتا پڑتا ہے بقول استاد غزل موئن خاں دہلوی

نالہ بیہم سے یاں فرصت نہیں حضرت ناصح کریں ارشاد کیا  
فقر کے چند اشعار فارسی جو حسب حال ہیں ذیل میں پیشکش حضرات ناظرین  
ہوتے ہیں۔

لمود

ناصح تو جلوہ رخ جاں ندیدہ	زلف سیاہ و کاکل پیچاں ندیدہ
واعظ حدیث خوبی طوبی براہ شوق	زاں میکنی کہ سر و خرا مان ندیدہ
بر کفر من بجز ردی طعنہ مزین	چشمش کہ بہت دشمن ایماں ندیدہ
پیشتم مگوز سختی روز جزا سخن	رنج و معیبت شب ہجران ندیدہ
طوفان نوح شمع طوفان اشک بہت	اے ابرجوش دیدگا گراں ندیدہ

دوسرا امرطبی جو امری القیس نے حوالہ قلم کیا ہے وہ یہ ہے کہ گریہ سے غم میں تسکین ہو جاتی ہے۔ اس واسطے وہ کہتا ہے کہ مجھے گریاں دیکھ احباب صبر کی فرمائش کرتے ہیں حالانکہ رونا وہ شے ہے کہ مریض غم کے لیے عین شفا ہے افراط غم میں ضبط گریہ ایک خوف انگیز امر ہے جو لوگ ضبط کو راہ دیتے ہیں یا ضبط پر مجبور ہو جاتے ہیں ان کا غم جلد ازالہ پذیر نہیں ہوتا بلکہ ممکن ہے کہ ضبط سے ہلاکت متج ہو حالت غم میں رونا ایک امرطبی ہے فطرت نے گریہ کو غم و بانی کا ذریعہ بنایا ہے یہ عوام کا خیال محض غلط ہے کہ

اسلام کی رُو سے گریہ کرنا امر ممنوع ہے۔ اس تنگ چہمی کا متقاضی کبھی اسلام نہیں ہے اسلام میں کسی غیر فطرتی امر کی فرمائش نہیں ہے۔ جب انسان کو غم ہوگا تو ضرور روئے گا۔ اسلام ایک امر فطرتی کا کیوں مانع ہونے لگا۔ خود پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہؓ کے دفن ہونے کے وقت اشکباری کی ہے۔ اشک ریزی تو موتی کا حق ہے۔ فطرتی طور پر اس حق کی اداکاری کیوں کر ممنوع ہونے لگی۔ نادانوں نے صبر کے معنی یہ سمجھ لیا ہے کہ چشم پر آب ہونا نہیں چاہیے اس غیر فطرتی فرمائش کا ایک بین نتیجہ تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ ایسے خیالات کے پابند جو لوگ ہوتے ہیں ان میں ایک میز درجہ کی سنگدلی آجاتی ہے۔ خدا نے بے وجہ آنسو کو مخلوق نہیں کیا ہے۔ اس کی خلقت کا مطلب یہی ہے کہ دل کو نرم رکھے بس جس کے آنسو غیر فطرتی جذب سے خشک ہو گئے ہوں اس سے نرم دلی کی کیا توقع کی جاسکتی ہے۔

تیسرا امر طبعی جس سے شاعر نے اپنے کلام کو زینت دی ہے وہ یہ ہے کہ تقاضائے فطرت سے انسان حالت غم میں اپنے درد کا شریک ڈھونڈتا ہے پس یہ قول امری القیس کا کہ ہل عند رسم دار میں من معول نہایت فطرتانہ لطف رکھتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ یہاں کوئی ایسا ہے جو میری آہ و زاری کا شریک ہو لہذا اب سید محمد خاں زند فرماتے ہیں

اے عندلیب ملکہ کر۔ آہ و زاریاں تو ہائے گل پکارے تو ہم ہائے دل بلاشبہ یہ دونوں نیچرل مذاق رکھتے ہیں۔ غم کی حالت میں کسی ہمدرد کا نہ ہوتا غم کی مصیبت کو ذہ گونہ بڑھا دیتا ہے۔ پس شدت غم کو ظاہر کرنے کے لیے امری القیس نے نہایت با مذاق کے ساتھ اس سوال کے پہلو کو اختیار کیا ہے۔ جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا ایسا کوئی غموار نہیں ہے جو اس کی تسکین خاطر کا سبب ہو۔

الْأَذْبَ يَوْمَ كَانَ مِنْهُمْ صَالِحٌ  
وَلَا سَيْمًا يَوْمَ إِدَارَةِ جُلْجُلٍ  
وَيَوْمَ عَقَّتْ لِلْعَذَارَى مَطْيَبُ  
فَنَاجِبًا مِنْ كَوْرِهَا الْمُتَحَشِّلِ



## نفل العذارى یوتین بلحیہا وشحیر کھداب الد مقس المفتل

معنی۔ آگاہ ہو کے بہت سے خوشی کے دن ان معشوقوں کے وصل میں بسر ہوئے ہیں۔  
بالخصوص وہ دن کہ دارجلبل میں گذرا اور وہ دن کہ جب میں واسطے زنان دوشیزہ  
کے اپنے ناقہ سواری کو ذبح کر ڈالا اور میں نہایت تعجب کرتا ہوں اس کے پالان سے  
کہ اُن عورتوں نے باخود بار کر لیا تھا پس جب میں نے اپنے ناقہ سواری ذبح کر  
ڈالا تو اس روز وہ زنان دوشیزہ اس کے گوشت بریان کو ایک دوسرے کے سامنے  
ڈالنے لگیں اور بھی اس کی تلی ہوئی چربی کو جو بٹے ہوئے تھے ریشم کی طرح نرم تھیں۔  
ان اشعار کے مضامین قصہ طلب ہیں اور وہ یہ ہے کہ زنان قبیلہ دارجلبل کو گئی  
تھیں۔ مگر ان کے وہاں پہنچنے سے پہلے امری القیس پہلے سے پہنچ کر وہاں چھپ  
رہا تھا۔ اسے یہ معلوم تھا کہ جب وہ عورتیں موضع آب میں پہنچتی ہیں تو وہاں غسل  
ضرور کرتی ہیں۔ چنانچہ وہ زنان دوشیزہ جن میں غیزہ بھی شامل تھی موضع آب  
میں پہنچ کر آمادہ غسل ہوئیں پانی میں اترنے سے قبل سبھوں نے اپنے کپڑے اتار  
ڈالے اور عریاں ہو کر داخل آب ہوئیں۔ امری القیس کہ اپنی گھات میں تھا ان کے  
سارے کپڑوں پر قابض ہو بیٹھا اور یہ قسم کھائی کہ زہار ان کی پوشاکیں اس وقت  
تک نہ دوں گا جب تک وہ سب پانی سے نکل کر بحالت عریانی اس سے فردا فردا  
اپنی پوشاک کی خواستگار نہ ہوں۔ اس پر وہ عورتیں اس سے جھگڑنے لگیں مگر اس  
نے کچھ نہ سنا۔ ناچار ان عورتوں سے ایک جو زیادہ شوخ تھی پانی سے نکل کر اس  
کے سامنے گئی اور خواستگار پوشاک ہوئی۔ امری القیس نے اس کا پیرا اس کے  
حوالہ کر دیا۔ پھر اسی طرح سے سب آتی گئیں اور رفع عریانی کرتی گئیں۔ مگر غیزہ جو اس  
کی معشوقہ تھی پانی سے باہر نہ آئی اور امری القیس کو کپڑا دینے کی قسم دی اس نے کہا  
کہ جس طرح اور عورتوں نے کیا تو کیوں نہیں کرتی آخر کار جب بہت مجبور ہوئی تو  
پانی سے باہر آئی اور طالب پوشاک ہوئی۔ امری القیس نے اسے اچھی طرح سے  
عریاں دیکھ کر اس کی پوشاک بھی اس کے حوالے کر دی جب سب عورتیں کپڑے پہن  
چکیں سبھوں نے امری القیس کو ملامت کرنا شروع کیا اور کہنے لگیں کہ تو نے لاحق



ہم سبھوں کو بھوکا رکھا ہے۔ اور گھر جانے میں مانع ہوا اس پر اس نے کہا کہ اگر ہم اپنے ناقہ سواری کو ذبح کر ڈالیں تو تم سب تناول کرو گی سبھوں نے کہا ہاں۔ امری القیس نے اپنے ناقہ کو ذبح کر ڈالا۔ ان عورتوں نے لکڑی جمع کر کے اس کے گوشت کو بھنا اور خوب کھایا۔ امری القیس کے ساتھ ایک مشکیزہ شراب کا بھی تھا۔ اس نے انہیں مے بھی پلائی۔ جب کھاپی کروہاں سے روانہ ہونے لگیں تو ان عورتوں نے امری القیس کے ناقہ سواری کے پالان اور اس کے اسباب کو اپنے اونٹوں پر بار کر لیا اور خود امری القیس کو ان عورتوں کی سفارش سے عینزہ کے اونٹ پر درمیان اس کے کوہان اور اس کی گردن کے جگہ ملی۔

واقع ہو کہ یہ اشعار ایام جاہلیت کے اہل عرب کی عشق بازی کی پوری تصویق ہیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی شخص پابند اسلام ایسی حرکات کو کب جائز سمجھے گا۔ اسلام میں عورتوں کو اس طرح دیکھنا فعل حرام ہے ہر چند یہ کہ اشعار لفظاً فحش نہیں ہیں مگر معناتاً تمام تر فحش ہیں۔ یہ اسی قسم کی شاعری ہے جسے اسلام نے ممنوع کر دیا ہے۔ علاوہ تقاضائے اسلام کے اس وضع کی حرکتیں تمام دنیا کے قانون اخلاق کی رو سے ناپسندیدہ ہیں ان اشعار سے تمام تر فسق و فجور کے انداز مترشح ہیں۔ ان معذوح معاملات کو عشق بازی سے کیا علاقہ ایسے ایسے افعال سوائے لچے غنڈوں اور کس سے صادر ہوں گے۔ بہر حال ان اشعار سے اہل عرب کے عہدِ جہالت کے انداز اخلاق کا خوب پتا لگتا ہے۔ بلا گفتگو اس عہد کے اہل عرب کی صحبت نہایت نامطبوع اور قابل اصلاح تھی۔ ایسے ہی معاملات پر غور کرنے سے صاف ہویدا ہوتا ہے کہ اسلام کے ایسے دین کی کیا ضرورت تھی خیر یہ اشعار امری القیس کے اخلاقی پایہ سے جو کچھ زشت رویوں ہوں مگر ان سے ملکی خصوصیات کا اظہار بخوبی متصور ہے۔ سوائے اہل عرب کی طبیعت داری کے کاہے کو کسی ملک کے عیاش کو اپنی سواری کے جانور کو معشوق کے واسطے ذبح کرنے کی نوبت پہنچی ہوگی۔ نہ اس خواہش اور رغبت کے ساتھ کسی ملک کے معشوق نے اونٹ کے گوشت سیر ہو ہو کر چکھے ہوں گے۔ اور نہ کسی عاشق کو معشوقہ کے اونٹنی کی گردن پر سوار ہونے کا اتفاق ہوا ہوگا۔ البتہ اس طرح پر نہاتی ہوئی عورتوں کے کپڑوں پر تالین



ہو بیٹھنے کا قصہ ہندوستان میں کنہیا جی کی نسبت کہا جاتا ہے اور کسی ملک میں تو اس کی نظیر راتم کو نہیں ملی ہے۔ مگر کنہیا جی کا قصہ ساختہ معلوم ہوتا ہے۔ تاریخی ثبوت نہیں رکھتا ہے۔

دیومدخلت الحمد ر خدر عینزہ  
فقال لك الويلات انك محبل  
لقول وقد مال الغبيط بنامعا  
عقرت بعیریا امری القیس فاقول

معنی۔ اور وہ بھی خوشی کا دن تھا کہ جب میں عنیزہ کے محل میں داخل ہوا۔ پس اس نے مجھ سے کہا کہ وائے تجھ پر تو مجھے پیادہ کر دینے والا ہے۔ د یعنی تیرے سوار ہونے سے میرا اونٹ زخمی ہو جائے گا اور قابل رفتار نہ رہے گا۔ پھر مجھے پیادہ چلنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہے گا۔ جب میں داخل محل ہو گیا اس وقت وہ کہنے لگی در حالیکہ ہم دونوں کے بارے ہو دج کج ہو گیا۔ کہ تو نے میرے اونٹ کو زخمی کر ڈالا۔ اے امری القیس ہو دج سے اتر اور چلا جا۔

اخلاقی پہلو ان اشعار کا محتاج بیان نہیں ہے۔

فقلت لها سیری وازجی زمامہ ولا تبعدینی من حناک المعلن  
فمثلا حبلی قد طرقت وصرضع فالهتما عن ذی تمائم محول  
اذا ما بکی من خلفها انصرفت له بشقی وتحتی شقها لم محول

معنی۔ جب عنیزہ نے اپنے اونٹ سے اتر جانے کو کہا تو ہم نے اس سے کہا کہ اونٹ کو چلا اور اس کی مہار کو ڈھیل دے اور مجھے اپنے میوہ رسیدہ سے محروم نہ رکھ پس بہت بار تیری ایسی زن حاملہ کے پاس میں شب کے وقت گیا ہوں اور دودھ پلانے والی عورت کے پاس بھی اور باوجود اس مرضعہ ہونے کے اُسے اس کے یکساں بچے سے جو اس عمر میں تعویذات پہنے رہتا ہے۔ پھر کر اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے۔ پس جب اس کا بچہ اس کی پیٹھ کے پیچھے رونے لگتا ہے تو وہ آدھے دھڑ سے اس کی طرف مڑتی۔ در حالیکہ اس کا دوسرا آدھا میرے تحت میں تھا اور اس کو بحالت خود رہنے دیتی۔

شاعروں نے اس کو فحش صریح سے بچانے کے لیے اس کا معنی یوں بتلایا ہے کہ جب اس کا لڑکا رونے لگتا تو وہ اس کی جانب پھرتی۔ اور گوشہ چشم سے دیکھتی در حالیکہ ایک رخسارہ اس کا میرے زیر دین تھا اور اسے وہ میری جانب سے نہیں پھیر لیتی تھی۔ اس ناول پر بھی یہ اشعار اخلاقی پایہ سے بہت کچھ گرے ہوئے ہیں۔ عاشق کا اپنی معشوقہ سے یہ کہنا کہ شب کے وقت ہم بہت سی زنان حاملہ اور مرضعہ کے پاس گئے ہیں۔ اور ہر چنڈ ایسی عورتوں کو مرد کی طرف میلان نہیں ہوتا مگر ہم ایسے مرد ہیں کہ ان عورتوں کو بھی ہماری طرف میلان ہوا۔ اور تو تو نہ حاملہ نہ نہ مرضعہ ہے تجھ کو مرد کی خواہش کیوں نہ ہو گی کچھ عجب مضمون ہے خود یہ کیا کم فحش ہے جو شارح کو فحش سے بچنے کی شکل پیدا کرنے کی صلاحیت ہوتی۔ کوئی صاحب عشق معشوق سے ایسی ناپاک گفتگو نہیں کرتا۔ یہ تو محض شہدوں کی سی بات چیت ہے۔ اور اس کو عاشقانہ مذاق سے کیا علاقہ۔ ایسی ہی خیالات ناپاک نے شاعری کو بدنام کر رکھا ہے۔ اور بلاشبہ ایسی ہی شاعری اسلام کی زد سے ممنوع ہے۔ یہ اشعار مرزا شوق لکھنوی کے کلام کا انداز رکھتے ہیں۔ جنہوں نے چار مثنویاں تصنیف فرمائی ہیں۔ اور جن کے یہ سب مثنویاں پایہ اخلاقی سے گزری ہوئی ہیں۔ یہاں تک کہ حکم گورنمنٹ سے ان کی اشاعت روک دی گئی ہے۔

وَيَوْمًا عَلَىٰ أَظْهَرَ كَيْتَبٍ تَعَذَّرْتُ عَلَىٰ دَائِلَتِ خَلْقَةٍ لَمْ تَحْلَلْ

معنی۔ اور وہ بھی دن خوب تھا کہ جب پشت ریگ تودہ پر عینزہ نے مجھ پر سختی کی اور مجھ سے اک رہی۔ اور میری مواصلت اور ملاقات سے قسم کھائی اور ایسی قسم کھائی کہ جس میں انشاء اللہ نہ کہا اور اس کا کہنا ایسا ہوتا ہے کہ جس سے قسم باطل ہو جاتی ہے۔ یعنی عینزہ نے ایسی قسم کھائی کہ وہ اٹھ نہیں سکتی تو میں نے اس سے تقریر ذیل کی جو بہت سے اشعار سے مشتمل ہیں۔

أَفَاطِمُ قَهْلًا بَعْضُ هَذَا التَّدَلَّى وَانْ كُنْتَ قَدْ اِزْمَعْتَ مَرْمِي فَاجِلْ

معنی۔ اے فاطمہ چھوڑ بعض اپنے ناز و کرشمے کو اور اگر تو نے مفارقت پر آمدگی کی تو مجاہلت کو راہ دے یعنی کوئی شدت کی کاروائی نہ کر۔

أَعَزَّ لِي مَنِيَّ أَنْ حَبْلَكَ قَاتِلِي وَأَنْتَ مَهْمَا تَأْمُرِي الْقَلْبَ يَفْعَلْ



معنی۔ تو اس بات پر مغرور ہو رہی ہے کہ تیرا عشق درجہ کمال کو پہنچ کر میسر  
قاتل ہو رہا ہے۔ اور اس بات پر بھی مغرور ہو رہی ہے تو جو کچھ ہم کو حکم دیتی ہے میرا  
دل اسے بجالاتا ہے۔ یعنی اس یقین سے کہ تیرا عشق ہم پر غالب ہے اور جو کچھ تو  
کہتی ہے ویسا ہی تیرا دل کاربند ہوتا ہے۔ تو ناز کر شمع کرتی ہے اور مفارقت کی سناٹ  
ہے یہ بات اچھی نہیں ہے۔ عاشق سے کنارہ خوب نہیں۔

وَانْ قَلْتَ قَوْشَاءَ نَمْلِكَ مِنْ خَلِيفَةٍ      فَنُلِي بِشَايٍ مِنْ شِيَابِكَ شَنْسَلٍ  
معنی۔ اور اگر میرا کوئی خلق تجھے ناپسند آیا ہو تو مفارقت اختیار کر تیری خوشی عین  
میری خوشی ہے۔ میں یہ کب گوارہ کر سکتا ہوں کہ کوئی بات تیری مرضی کے خلاف ہو۔  
یہ شعر بڑی کسر نفسی اور بے غرضی سے خبر دیتا ہے رضائے دوست کے مقابل  
میں اپنی آرزو کا خون گوارہ رکھنا عین عاشقی ہے۔ صلاح ماہرہ آنست کان صلاح شہاست  
مگر یہاں امری القیس ویسے بے لوث اور پاک عشق کو پیش نظر نہیں رکھتا  
ہے۔ یہ تقریر خود غرضی سے خالی نہیں ہے۔ کبھی اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ عزیزہ اس  
سے کسی طور پر مفارقت قبول کرے۔ اگر یہ ہوتا تو اسی قدر کہہ کے رہ جاتا۔ آئندہ  
کے کلام کہہ دیتے ہیں کہ ایسے اظہار بے غرضی سے معشوق فریبی مراد تھی۔

وَمَا ذِفْتَ عَيْنَاكَ إِلَّا لَتَضُرِّي      بَسْهَيْلِكَ فِي أَعْيَارِ قَلْبٍ مُقْتَلٍ  
معنی۔ تیری آنکھوں سے آنسو نہیں جاری ہوئے۔ الا اس غرض سے کہ اپنے دونوں  
تیروں سے یعنی ہر دو ہائے نگاہ سے میرے عشق کے مارے ہوئے دل کو تو مجروح کرے۔  
واضح ہو کہ یہاں شاعر نے معشوقہ کے رونے کے مضمون کو نہایت تبصیر فطرت  
کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ عورت کے پاس قوی ترین آلہ جس سے وہ مرد پر غالب آیا  
کرتی ہے آنسو ہے غزالہ المتاخرین حضرت غالب خوب فرماتے ہیں

کرے قتل لگاؤٹ پیرار و دینا      تری طرح کوئی تیغ ننگہ کو آب تو دے  
وَبَيْضَةٍ خِدْدٍ لَا بُرَا مَحْجَبًا هَا      تَمَتَّعَتْ مِنْ لَهْوِهَا عَبْدٌ مَعْجَلٍ

معنی۔ بہت سی ایسی زنانہ حسین، صاف رنگ و پردہ نشین ہیں کہ ان کے خیمہ کی  
طرف قصد نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس سبب سے کہ وہ عورتیں صاحب رتبہ اور بڑی قوم  
والا ہیں۔ اس پر بھی میں نے ایسی عورت کے ساتھ لعب بازی کی اور وہ بھی عجلت کے

ساتھ نہیں، بلکہ بے خوف ہو کر۔

تجاوزت احراً ساءلہا ومعشراً علیٰ جہراً صا لولیس دن مقتل

معنی۔ عین اس وقت تک یعنی اس وقت تک یعنی اس زن پردہ نشین تک پہنچ گیا پاسبانوں کو ٹپ کر۔ اور بھی ایسے لوگوں کو جو پوشیدہ طور پر میرے مقتل کے خواہاں تھے۔ یعنی ہر چند اس زن پردہ نشین کے خیمہ کی محافظت پاسبان کرتے تھے اور ایسے لوگ بھی نگہبان تھے جو میری شجاعت شعاری کی وجہ سے بر ملا طور پر میرے قتل پر اقدام نہیں کر سکتے تھے۔ تاہم میں اس زن پردہ نشین تک پہنچ گیا اور محافظین سے کچھ نہ ڈرا شعر آئندہ میں شاعر پردہ نشین تک پہنچنے کے وقت کو بیان کرتا ہے واضح ہو کہ معشوقہ کے ساتھ اس وضع کی گفتگو کہ میں ایسا عیاش دیر ہوں اور میں اعلا درجہ کی عورتوں کے ساتھ اس طور پر پیش آیا ہوں اور یہ کہا اور وہ کہا ہے۔ سچا مذاق عشق بازی سے بعید ہے۔ ظاہراً ان سب باتوں کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اے عینزہ اگر تو مجھ سے کنارہ کشی پر آمادہ ہے تو یہ خوب نہیں ہے۔ ہم ایسے بہادر عیاش ہیں کہ اپنا جواب نہیں رکھتے۔ تو میرے عشق کی قدر اور مجھ سے مفارقت روانہ رکھ۔

اذا ما التریا فی السماء تعرضت تعرض اثناء الوشاح الفصل

معنی۔ میں اس زن پردہ نشین تک اس وقت پہنچا کہ جس وقت پردین نے آسمان میں اپنے کراۓ و ناجیہ کو آشکارا کیا۔ مثل آشکارا کرنے اس جمیل کے جس کے دو موتیوں کے درمیان کچھ زر کی چیز حائل رہتی ہے۔ اپنے کراۓ و ناجیہ کو۔

واضح ہو کہ یہاں ثریا کو تشبیہ کمرزب کے ساتھ دی گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اہل عرب کمرزب موتیوں سے بنا لیتے تھے۔ اور جب موتیوں کو رشتہ میں پروتے تھے تو موتیوں کے درمیان زر کے تار دیتے تھے۔ یا زریں دانے داخل کرتے تھے۔ تو جس طرح پردین کے تارے ایک دوسرے سے فرق معلوم ہوتے ہیں کمرزب کے موتی بھی ایک دوسرے سے علاحدہ نظر آتے تھے۔ لاریب ہر تشبیہ نہایت خوب اور مرغوب ہے۔ مختصر یہ کہ شاعر اپنے جانے کے وقت کو بیان کرتا ہے کہ میں اس وقت اس زن پردہ نشین کے پاس پہنچا کہ جب عقد ثریا آسمان میں نمودار ہوا۔



فَجِئْتُ وَقَدْ نَفَضْتُ لِيَوْمٍ ثِيَابَهَا لَدَى الْآبَسَةِ الْمُتَفِصِّلِ

معنی۔ پس آیا میں اس محبوبہ کے پاس درحالیکہ وہ بغرض خواب اپنے کپڑے سوائے جامہ شب خوابی کے پردہ کے پاس اتارے ہوئے تھی۔ یعنی سونے کی طرف مائل ہو چکی تھی۔ اس واسطے جامہ شب خوابی پہنے ہوئی تھی۔ اور اپنے معمولی پوشاک کو پردہ کے پاس اتار کر کے رکھ دیا تھا۔

واضح ہو کہ یہ معاملہ امری القیس کی بڑی ڈھٹائی سے خبر دیتا ہے۔ اور یہ ایک ایسے سین کی تصویر ہے کہ سوائے ایک بہادر طبیعت دار کے کسی بودے ہوس باز آدمی کو ایسے سین دیکھنے کا اتفاق ہو ہی نہیں سکتا ہے۔ بہادر قوم کی عاشقی بھی بہادرانہ انداز رکھتی ہے ایسے عشقہ معاملات کو انہیں اقوام سے تعلق ہوتا ہے جن کی خلقت میں بہادری داخل رہتی ہے۔ اس سین کو ایک گونہ شکسپیر کے رومیو جولیٹ کی اس سین سے مشابہت ہے کہ جہاں رومیو جولیٹ کے ایوان میں جان پر کھیل کر گیا ہے اور جولیٹ اس سے پوچھتی ہے کہ کس طرح اس کا وہاں گذر ہوسکا۔ اور کیوں کر اسے اعدا کا خوف نہ آیا اور کیوں اسے جان عزیز بھاری پڑی ہے۔

فَقَالَتْ يَمِينَ اللَّهِ مَا لَكَ حِيلَةً وَمَا اِنْ اَرَى عَنْكَ الْغُبَايَةَ يَخْلُ

معنی۔ پس کہا اس محبوبہ نے کہ بخدا تیرے پاس کوئی حیلہ نہیں ہے یعنی تو جہاں آیا ہے تو اب تیرے واسطے کوئی صورت جاں بری کی نہیں ہے۔ ضرور تو مارا جائے گا اور میں دیکھتی ہوں کہ تجھ سے جہالت عشق دور نہ ہوگی تو عشق میں ایسا دیوانہ ہو رہا ہے۔ کہ سودائے عشق تیرے سر سے جانے والا نہیں ہے۔ لمولف

سرجائے توجائے مگر اے حضرتِ ناصح اس زلف سیہ نام کا سودا نہیں جاتا

خَرَجْتُ بِمَا تَمَنَّى تَبَحُّرُ وَرَائِنَا عَلَى اَثَرِ نَاذِيلِ صَوْبِ مُرَجَّتِلِ

معنی۔ میں باہر لایا اس محبوبہ کو درحالیکہ وہ چلتی تھی اور کھینچتی تھی۔ پیچھے ہم دونوں کے نقش ہائے قدم پُر امن کو اپنے کلیم نقش کے۔ یعنی ہم اسے اس کے خیمہ سے باہر لائے اور جب وہ چلی تو اپنے کلیم کو زمین پر گھیسٹی چلی۔ تاہم دونوں کے نقش پا ناپدید ہو جائیں۔ اور پہچان میں نہ آسکیں۔

واضح ہو کہ اہل عرب نقش پا سے دوست و دشمن کو پہچان لیتے تھے۔ اور آسانی

سے شخص مفرور کا سراغ لگا لیتے تھے۔ بہت سی حکایات ایسی ہیں کہ جن میں آثارِ پا سے مفرورین کا تعاقب کیا جانا منقول ہے۔ اور اس طرح کی پہچان اہل عرب ہی پر موقوف نہیں ہے۔ براعظم افریقہ اور براعظم آسٹریلیا وغیرہ میں بھی بہت سی وحشی اقوام ہیں جو نقشِ پا کو خوب پہچانتی ہیں۔ اور مفرور کا تعاقب منزلوں تک کر کے اسے گرفتار کر لیتی ہیں۔ ان اقوام کو نقشِ پا کی ایسی پہچان ہے کہ پتھر ملی زمینوں پر سے بھی جو مفرور گذر کرتا ہے اور جہاں بظاہر اس کا نقش پا نام کو بھی تمیز میں نہیں آتا ہے وہاں بھی اپنے مشقِ شناخت سے پورا کام لیتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایسی مشق آدمی کو تب ہی بہم پہنچتی ہے۔ جب وہ ابتدائے سن شعور سے اس کی طرف توجہ کرتا ہے۔ زیادہ سن میں اس کی مشق کمال کو نہیں پہنچ سکتی ہے۔ فقر نے اس کو امتحان کر کے دیکھا ہے۔ اور اس طرح پر کہ شغلِ صید انگلی میں جانور ان کو ہی ودشتی کے نقش پا کو پہچانتے کی بڑی حاجت ہوتی ہے اور ہر چند فقیر اس کی شناخت کسی قدر رکھتا ہے۔ مگر نہ اس قدر جتنا کہ مردمان کو ہی ودشتی وغیرہ رکھتے ہیں۔ یوں تو ہر شکاری جانوروں کے طرح طرح کے نقش پا کو پہچانتا ہے مگر ان کو ایسے سنگی مقاموں پر تمیز کر لینا جہاں اسبابِ ظاہر کوئی نقش پا محسوس نہ ہو آسان کام نہیں ہے۔ ایسی شناخت تب ہی حاصل ہوتی ہے جب کوئی شخص عہدِ طفولیت سے کوہِ ودشت میں رہ کر اس کی مشق کا سلسلہ جاری رکھتا ہے۔ فقیر کے رسالہ صید کے ملاحظہ سے یہ امور وضاحت کے ساتھ دریافت میں آ سکتے ہیں۔ یہاں تقریر کو طول دینے کا موقع نہیں ہے۔

فَلَمَّا أَجَزْنَا سَاحَةَ الْحَيِّ وَانْتَحَى بَابَ بَطْنِ خُبَيْثٍ ذِي جِقَانٍ عَقْنَقَلٍ

معنی۔ پس جب کہ فضاے آبادانی سے ہم لوگ باہر نکل آئے اور پہنچے زمینِ پست میں کہ جس میں کج اور منتشر تو دہائے ریگ واقع ہیں۔ یعنی آبادی سے نکل کر ایک دیر لگا جگہ میں پہنچے جہاں خوفِ اعدا کچھ نہ تھا تو حالتِ اطمینان میں نے یہ کہاجو بیت ذیل میں ذکر ہوتا ہے۔

هَضْرَتٌ بِغَوْرِيٍّ رَاسِمًا نَمَايَلَتْ عَلَى هَفِيمٍ أَلَكَشَجٍ رِيًّا الْمُخْلَتْحَلِ

معنی۔ کھینچا میں نے اپنی طرف دونوں کا کل سرِ محبوبہ کو پس وہ میری طرف مائل ہوئی درحالیکہ وہ محبوبہ باریک میان اور پُر گوشت ساق ہے۔



واضح ہو کہ محبوبہ کا باریک میان اور پُر گوشت ساق ہونا محبوبہ کے خوش اندام ہونے سے خبر دیتا ہے اور اس سے شاعر کی خوش مذاقی کا اظہار متصور ہے۔  
 مُهْفَهَةٌ بَيْضَاءُ غَيْرُ مَفَاضَةٍ تَرَاءُ بِهَآ مَصْقُولَةٌ كَالشَّجَنِجَلِ  
 معنی۔ وہ معشوقہ نازک میان درنگ صبیح رکھتی ہے اور اس کا پیٹ فرہ اور بد گوشت نہیں ہے اور اس کا سینہ آئینہ کی طرح صقل کردہ ہے۔

یہ سب اوصاف بھی محبوبہ کی جسمانی خوبیاں ظاہر کرتی ہیں اور شاعر کے خوش پسند ہونے پر دال ہیں۔ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ اہل عرب بھی اقوام یورپ و سکنائے شام، عراق، ایران و کابلستان کے مانند سفید رنگ کو محبوب جانتے ہیں۔ سانولا یا سیاہ رنگ کو پسند نہیں کرتے۔ چنانچہ تمام اہل یورپ اور بھی ان ملکوں کے شعرا محبوب کے رنگ کو جب بیان کرتے ہیں، تو تیرگی سے میرا دکھلاتے ہیں۔ مگر ہندوستان میں گو سفید یعنی گورا رنگ نامحود نہیں سمجھا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی سانولا رنگ خالی لطف سے نہیں تصور کیا جاتا ہے۔ ظاہراً سبب اس کا یہی معلوم ہوتا ہے کہ اہل ہند کے دلوں تا شری کرشن جی سانولا رنگ رکھتے تھے۔ مگر ملک حبش میں سوائے رنگ سیاہ کے کوئی دوسرا رنگ محبوب و مطبوع قیاس نہیں کیا جاتا ہے۔ چنانچہ جب اہل فرنگ پہلی بار ملک حبش میں گئے تو اہل حبش ان کے سفید رنگ کو دیکھ کر بہت ہنسے اس واسطے کہ آدمی کا گورا ہونا ان کے آنکھوں میں نہایت مذموم متصور تھا۔ یہ ہم لوگوں کے لیے کوئی تعجب کی بات نہیں ہے اس لیے کہ قومی مذاق میں اعتبارات ملکی کو ہمیشہ دخل ہوا کرتا ہے۔

كَبْكُو الْمَقَانَاةِ الْبَيَاضِ بِصَفْرَةٍ غَذَاهَا نَهْمُ الْمَاءِ غَيْرُ حُلَلٍ

معنی۔ وہ محبوب مانند اس دریکتا کے ہے جس کی سفیدی میں زردی شامل ہوتی ہے اور جس کی تربیت ایسے صاف پانی سے ہوتی ہے کہ جو پانی فرد گاہ مردمان نہیں ہوتا۔ یعنی جس محل آپ پر آدمی نہیں اترتے اور اس سبب سے وہ پانی گدلا نہیں ہوتا ہے۔ یہاں شاعر نے اپنے محبوبہ کو گوہر پر صفا سے تشبیہ دی ہے۔ اور وجہ نسبت وہی صفا ہے نہ رنگ گوہر۔ بلاشبہ یہ تشبیہ نہایت لطیف انداز رکھتی ہے۔ اور کسی ملک کے تعلیم یافتہ اور با مذاق شخص کو اس شخص کو اس تشبیہ کی عمدگی میں عذر ہو نہیں سکتا۔



تَصَدَّقْ بِدَى عَنْ اَسِيْلٍ تَمْتَقِي      بِنَظَرَةٍ مِنْ دَحْشٍ وَجَرَةٍ مُطْفِلٍ

معنی وہ محبوبہ منہ پھیرتی ہے مجھ سے اور اس منہ پھرنے میں اپنے رخسارہ کشیدہ کو ظاہر کرتی ہے۔ اور وقت نگاہ کرنے کے درمیان میرے اور اپنے اپنی آنکھ کو حائل کرتی ہے۔ جو صحرائے وجرہ کے ان آہوان سے مشابہت رکھتے ہیں۔ جنہوں نے نئے نئے چنے جنے ہیں۔

وجرہ ایک صحرا ہے جو درمیان نگہ اور لبصرہ کے واقع ہے اور نئے پچہ دینے کی یہ تخصیص ہے کہ اس وقت میں مادہ آہو ضعیف ہوا کرتی ہے۔ پس چونکہ آنکھ کی تشبیہ عموماً آہو کے ساتھ دی جاتی ہے۔ اور شعرائے عرب و عجم آنکھ کو ضعیف و بیمار بھی لکھا کرتے ہیں اس واسطے شاعر نے وقت تشبیہ وہی اس تخصیص کو ملحوظ رکھا ہے۔ بہر حال آنکھ کی تشبیہ ہرن کے ساتھ ایک معقول تشبیہ ہے۔ اور تمام تعلیم یافتہ ملکوں میں یہ تشبیہ ایک امر مسلم ہے۔ ہندوستان میں بھی یہ تشبیہ معروف عام ہے چنانچہ مرگ نین ایک مشہور مقولہ ہے۔

وَجِدِ الْجَنِّدَ الرَّيْبَ لَيْسَ بِنَاحِشٍ      اِذَا هِيَ نَصَتْهُ دَلًا بِمُعْطَلٍ

معنی۔ اور وہ محبوبہ اپنی گردن آشکارا کرتی ہے جو گردن آہو کی طرح ہے۔ اور گردن آہو کا یہ طور ہوتا ہے کہ جب آہو اپنے گردن کو اٹھاتا ہے تو اس کی گردن کا حسن درجہ اعتدال سے گذر نہیں جاتا ہے۔ اور یہ خالی پیرایہ خوبی سے ہوتا ہے

دائم ہو کہ گردن مفتول کی تشبیہ گردن آہو کے ساتھ شعرائے عرب کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہے۔ اور کسی ملک کی شاعری میں ایسی تشبیہ کمتر دیکھی گئی ہے۔ مگر یہ تشبیہ لطف سے خالی نہیں ہے۔ معنایا خبر دیتی ہے کہ معشوق کو بلند گردن ہونا چاہیے۔ کوتاہ گردن ہونا معشوق کا تو درکنار کسی آدمی کا کوتاہ گردن ہونا خالی از قبح نہیں ہے۔ شعرائے فارسی و اردو بھی گردن کے بلند ہونے کو ممدوح جانتے ہیں گو عموماً اہل ہند کا یہ مذاق نہیں معلوم ہوتا ہے۔ اہل فرنگ بھی گردن بلند کو لوازم حسن سے شمار کرتے ہیں۔ اور گردن معشوق کو گردن سوان سے تشبیہ دیتے ہیں۔ سوان ایک قسم قازبط کی ہے اور اس کی گردن نہایت بلند اور خوبصورت ہوتی ہیں۔ فارسی اور اردو کے شعرا جو گردن کو گردن صراحی دار باندھتے ہیں اس کا سبب یہی ہے کہ صراحی



کی گردن بلند اور خوشنما ہوتی ہے۔ اور واقعی گردن بلند عجب دل آویزی رکھتی ہے۔ اور بلاشبہ انسان کی خوش ترکیبی سے خبر دیتی ہے۔ شاید تمام دنیا میں خاتونان انگلستان بہترین گردن رکھتی ہیں۔ جن حضرات کو صاحب نظر کے طور پر ان کے مشاہد کا اتفاق ہوا ہو گا فیر کی رائے سے موافقت فرمائیں گے۔

وَفَوْعَ يُزِينُ الْمَتْنَ اسْوَدَ فَالْجِمِ اَشْبَثُ كَقِنُو النَخْلَةَ الْمُتَعَثِلُ

معنی۔ اور وہ محبوب اپنے موئے دراز کو آشکارا کرتی ہے کہ جو اس کی پشت کو زینت دیتے ہیں۔ اور بال اس کے نہایت سیاہ کثیر اور پیچیدہ ہیں۔ مثل خوشہ ہلے اس نخل کہ جو نہایت بار آور ہوتا ہے۔

واضح ہو کہ شعرائے نارسہ اور اردو کے کلام میں ایسی تشبیہ نہیں دیکھی جاتی ہے۔ مگر کچھ شک نہیں کہ ایک نہایت عمدہ تشبیہ ہے اور تمام تر موفقی فطرت ہے۔

غدا نرھا مستشفراتُ اِلَى الْعُلَى نَفْسُ الْعِقَاصِ فِي مَتْنِيْ وَهْوُ سِبِلْ

معنی۔ گیسوئے نافہ اس کے بلند کیے گئے ہیں۔ برتری کی طرف یعنی دھلگے سے سر کے اوپر بندھے ہوئے ہیں۔ اور بالوں کی یہ کثرت ہے کہ موئے گرہ زدہ گم ہو جاتے ہیں۔ اس کے موئے نافہ اور نافہ میں۔

ان دونوں اشعار بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ زنان اہل عرب چند طور سے بالوں کو سنوارا کرتی تھیں اور ان کے بال فطرت کی رو سے بھی اچھے انداز کے ہوتے تھے۔ لیکن اس زمانہ میں خاتونِ دیورپ کے بال اتنی شکلوں سے سنوارے جاتے ہیں کہ خدا کی پناہ۔ فیشن کی کوئی حد ہی نہیں معلوم ہوتی ہے۔ بہت سے فیشن تو ایسے ہیں کہ ہم لوگ بیچارے ہندوستانیوں کو ان کا مطلب ہی سمجھنا دشوار ہے۔ قدر دانی تو درکنار۔

وَكَشِجَ لَطِيفٍ كَالْجَدِيلِ مُحْضِرٍ وَمَسَاقٍ كَالْبُنُوبِ الشَّقِي الْمَذْثَلِ

معنی۔ اور وہ محبوب آشکارا کرتی ہے ایسی تہی گاہ کو جو مثل مہار شتر کے لطیف ہے اور نازک بھی ہے۔ اور آشکارا کرتی ہے ایسے ساق کو کہ مانند ابر سیراب شدہ اور رام کردہ کے ہے۔

وَتَفْجِي فَيْتِ الْمَسْجِدِ فَوْقَ فَرَا شَهَا وَفَمَا لَفْجِي لَمْ تَنْطِقْ عَنْ تَفَضُّلِ

معنی۔ جب وہ محبوبہ صبح کو سو کر اٹھتی ہے تو اس کے بستر پر زہرہ ہائے مشک پائے جاتے ہیں۔ یعنی اس کے سونے سے بستر معطر ہو جاتا ہے۔ اور وہ خواب میں رہتی ہے تا وقت چاشت اور بعد جامہ شب خوابی پہننے کے اپنی مکر نہیں باندھتی یعنی امیر زادی ہے اسے اس کی حاجت نہیں ہوتی کہ وقت سحر بیدار ہو اور کام دھندے میں لگے۔ اور بعد پہننے جامہ شب خوابی کے مکر باندھ کر کسی کی خدمت کرے۔

واضح ہو کہ محبوبہ کی بوبائی سے بستر یا قالین یا دریا یا ہوا کا بویا ہو جانا فارسی اور اردو کے شعرا باندھتے گئے ہیں۔ فرق اسی قدر ہے کہ اہل عرب محل بوبائی میں مشک کو یاد کرتے ہیں اور فارسی واردو کے شعرا گل کو۔ ناسخ فرماتے ہیں ۛ

مطر اس کے نہانے سے بسکہ آب ہوا      جناب بحر ہر اک شیشہ گلاب ہوا

ایضاً

بیٹھ جائے جو گل اندام ہمارا اک دم      عطر کھینچیں ابھی عطار گل قالین کا

وَلْعَطُوبُ بِرَحِصٍ غُلُوشِينَ كَانَهُ      اساریع ظبی وَمَسَاوِيكُ اسْجَلْ

معنی۔ اور وہ محبوبہ چیزوں کو انگشت ہائے نرم سے پکڑتی ہے اور انگلیاں نام کو سخت نہیں ہیں گویا کہ وہ انگلیاں یا مانند اس کر مک وادی ظبی کے ہیں۔ کہ جن کو اسرور کہتے ہیں۔ یا مانند مسواک ہائے درخت اسکل کے ہے۔

واضح ہو کہ محبوبہ کی انگلیوں کا نرم ہونا ایک بڑی صفت ہے۔ اکثر وہ عورتیں جو محنت یا مزدوری کیا کرتی ہیں ان کی انگلیاں سخت ہو جاتی ہیں۔ شاعر یہاں انگلیوں کی نرمی کو بیان کر کے محبوبہ کی اس صفت کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ کہ وہ ایک اعلا درجہ کی عورت ہے جو ناز و نعم میں پالی گئی ہے۔ اس سبب سے اس کی انگلیاں سخت نہیں ہو گئی ہیں۔ بلکہ کمال درجہ کی نرمی رکھتی ہیں۔ پھر شاعر محبوبہ کی انگلیوں کو اسرور سے تشبیہ دیتا ہے۔ یہ ایک کیڑا ہوتا ہے جس کا سرخ اور بدن نہایت نازک اور نرم ہوتا ہے یہ کیڑا وادی ظبی میں جو ملک عرب کی ایک مشہور وادی ہے پایا جاتا ہے۔ دوسری تشبیہ انگلیوں کی شاعر نے مسواک ہائے اسکل سے دی ہے یہ ایک درخت ہے جس کی شاخیں نہایت نرم ہوا کرتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ تشبیہیں محض لوکل یعنی موضعی ہیں۔ اور ایسی نہیں ہیں کہ بغیر اطلاع سابق کے ہر ملک کا آدمی ان



تشبیہوں سے لطف اٹھا سکے۔ مگر مطلب شاعر کا ایسا ہے کہ تمام دنیا کے آدمی اس کے ساتھ اتفاق کریں گے۔ یعنی محبوبہ کی انگلیوں کا نازک و نرم ہونا ایک بڑی صفت ہے۔

تَفْنِيْ اَنْطِلَامِبًا لِّعَشَّةٍ كَا نَهْمًا      صِنَارُهُ مَمْسِي رَاهِبٍ مُّتَبَدِّلٍ  
معنی۔ وہ محبوبہ روشن کرتی ہے تاریکی کو اپنے چہرہ سے گویا کہ وہ محبوبہ راہب یا خدا بیوگستہ کی شمع شام ہے۔ یعنی محبوبہ کے رخسار روشن سے سیاہی ویسی ہی دور ہو جاتی ہے جیسا کہ راہب کے چراغ شام سے تاریکی دفع ہوتی ہے۔ راہبوں کا دستور ہے کہ شام کے وقت جائے بلند پر ایک تیز روشنی اس غرض سے کر دیتے ہیں کہ اگر کوئی مسافر راہ گم کر دہ ہو تو راہ پر آجائے۔

شاعر یہاں محبوبہ کی شمع ردئی کو چراغ راہب سے تشبیہ دیتا ہے اور بلاشبہ یہ تشبیہ نہایت خوب و مرغوب ہے۔ یہ ایسی تشبیہ ہے کہ علاوہ شعرائے فارسی و اردو کے اس کے ساتھ تمام اہل یورپ اور بھی تمام دہاں کے لوگ جہاں محبوب کی شمع ردئی کو ایک امر مقبول جانتے ہیں۔ اتفاق رکھتے ہیں۔

اَلِیْ مَثَلِهَا بَوْنُ الْحَلِیْمِ صَبَابَةً      اِذَا مَا اسْكَبْتُ بَيْنَ دَرْعٍ وَ مِجْوَلٍ  
معنی۔ ایسی محبوبہ کی طرف جس کے اوصاف بالائیں بیان ہوئے مرد کامل العقل بھی سوز و گرمی عشق کے ساتھ نظر کرتا ہے۔ جب کہ وہ اس سن کو پہنچتی ہے۔ جو سن درمیان سن زنان جوان و سن دختران نابالغہ کے ہوتا ہے۔ یعنی جب محبوبہ ابتدائے سن بلوغ کو پہنچتی ہے تو اس وقت عاقلوں پر آفت آجاتی ہے۔ ان کی ساری عقل ہوا ہو جاتی ہے۔ واضح ہو کہ یہ شعر نہایت فطرتی انداز رکھتا ہے۔ اور شاعری کے پیرایہ میں حسن کی پُر تاثیر سے خبر صحیح دیتا ہے۔ اس رنگ کے اشعار فارسی و اردو میں بہت موجود ہیں۔

تَسَلَّتْ غَمَایَاتُ الرِّجَالِ عَنِ الْقُب      دَلِیْسَ فَوَادِیْ عَنْ هَوَاۤءِ مُمِیْلٍ  
معنی۔ دور ہوئیں مردوں کی جہالت انقضائے کودکی کے بعد لیکن میرے دل سے تیرا عشق جوانی کے بعد بھی زائل نہ ہوا۔

یہ شعر عجب لطف رکھتا ہے۔ عشق کا تقاضا ہی یہ ہے کہ کبھی زائل نہ ہو جو عشق



زائل ہو جائے وہ عشق نہیں ہے ہوسنا کی ہے۔ اگر امری القیس اپنی آوارگی اور بے اعتدالی کے قہے نہیں کہے ہوتا تو یہ شعر جو بشکل خطاب عزیزہ کی طرف ہے سامع میں عرفانی حالت پیدا کر دینے کی صلاحیت رکھتا ہے مگر چونکہ اوپر میں یک گونہ بد مذاقی کے ساتھ برروئے عزیزہ امری القیس اپنی جوانانہ حرکت کا اعادہ کرتا گیا ہے اس کا یہ خطاب عزیزہ کی طرف سامع کے دل پر پورا اثر پیدا نہیں کرتا ہے۔ اگر کاش وہ یہ دکھلائے ہوتا کہ اسے بہت سے محبوبوں سے سامنا ہوا۔ مگر کسی کے ساتھ اس کے دل کو تعلق نہیں پیدا ہوا اور پھر عزیزہ کی طرف یوں خطاب کرتا کہ صرف تو ہی معشوقان عالم ہے ایک معشوق یہ ہے جس کا تعلق میرے دل کو ہے اور یہ ایسا تعلق ہے کہ اس میں شباب و شیبہ کو کوئی دخل نہیں ہے۔ تو اس سے عشق صادق کا نقشہ ہویدا ہوتا۔ اور اس بیان کی تاثیر ہی علاحدہ ہوتی۔ بہر حال یہ شعر برائے خود ایک عجیب عاشقانہ رنگ رکھتا ہے اور یاد رکھنے کے قابل ہے۔

الْأَرْبُ خَصِيمُ فِيلِكِ أَوْ لَوْ رَدَدْتُ نَصِيمٌ عَلَى تَعْدَالِهَا غَيْرُ صَوْتٍ

معنی۔ آگاہ ہو کہ بہت سے ایسے ناصح کو جو تیرے عشق میں مجھ سے نکو ہش کے ساتھ پیش آنے والے ہیں اور سختی کے ساتھ مجھے عشق سے منع کرنے والے ہیں میں نے رد کیا یعنی ایسے ناصح کی ایک نہ سنی اور تیرے عشق میں استوار رہا۔

ناصر کا مضمون ناری اور اردو کی شاعری میں مختلف یورپین شاعریوں کے کثرت کے ساتھ دیکھا جاتا ہے۔ اور شک نہیں کہ لطف سے خالی نہیں ہے۔

وَلَيْلٍ كَمَوْجِ الْبَحْرِ خِي سُدُّ وَلَدٍ عَلَى بِأَنْوَاعٍ أَلْهُمُومٍ لِيُبَسِّلَ

معنی۔ اور بہت سی راتیں ہیں کہ جنہوں نے مانسہ موج بحر کے اقسام اندوہ کے ساتھ اپنے پردہ ہائے تاریکی کو مجھ پر ڈال دیا۔ تاکہ مجھے آزمائیں۔ کہ آیا مجھ میں طاقت شکستہائی ہے یا نہیں۔

فَقُلْتُ لَمَّا تَمَطَّى بِصُلْبِهِ وَازْدَفَ اعْجَازًا وَنَاءً بِكَلْبِكِ

معنی۔ پس کہا میں نے ایسی رات کو کہ جس کا ذکر بالا میں ہوا جب کہ اس نے اپنی پیٹھ دراز کی اور یکے بعد دیگرے اپنے سرین کو لائی اور سینہ کو دور کیا یعنی جب رات دراز ہوئی اند میں یہ سمجھا کہ اب رات کا آخری حصہ پہنچا تو پے در پے حصہ ہائے شب



آتے گئے۔ اور گوجھہ اول جو آغاز شب تھا در بھی ہو گیا۔ تو بھی وہ شب انتہا کو نہ پہنچی پس میں نے رات کا یہ رنگ دیکھ کر اس سے یہ کہا جو مندرجہ ذیل ہوتا ہے۔  
 إِلَّا آيَهُمَا أَيْلُ الطَّوِيلُ إِلَّا أَنْجَلَ بِصُحُومِهِمَا إِلَّا صَبَاحُ مِنْكَ بِأَمْثَلٍ  
 معنی۔ آگاہ ہوا ہے شب دراز اور اپنی تاریکی کو نور صبح کے ساتھ تبدیل کر ڈال تاکہ مجھے رنج سے رہائی ہو۔

واضح ہو کہ شب غم بہت بھاری ہوتی ہے اور انسان گھبرا کر یہی چاہتا ہے کہ کسی طرح صبح ہو جائے پس شاعر تمنائے صبح کا اظہار کرتا ہے۔ اور رات کی طرف خطاب کر کے کہتا ہے کہ اے شب دراز صبح ہو جاتا کہ مجھ کو تیری ظلمت سے نجات ہو۔ اور اس وجہ سے تخفیف غم کی صورت پیدا ہو۔ مگر اسی کے بعد کہتا ہے کہ اے شب مجھے صبح کی تمنا ہے مگر میرے واسطے صبح تجھ سے خوب تر نہیں ہے اس واسطے کہ میرا غم ایسا ہے کہ صبح کے نمودار ہونے سے کوئی فرق اس میں پیدا نہیں ہوگا۔ جیسا کہ میرا غم اس وقت ہے صبح کے ظاہر ہونے پر بھی ویسا رہے گا۔  
 فَبِالْكَفِّ مِنْ لَيْلِي كَأَنَّ جُحُومَهُ بِأَمْرِ اسِ كَتَانٍ إِلَى مِمَّ جَنْدَلٍ  
 معنی۔ پس تو عجب رات ہے کہ جس کے ستارے گویا رسن ہائے کتان سے سنگ سخت میں بندھے ہوتے ہیں یعنی اپنی جگہ سے کھستے ہی نہیں۔

درازی شب کا مضمون ہر زبان میں دیکھا جاتا ہے۔ ہر زبان کے شعرا نے اس کو باندھا ہے۔ سعدی فرماتے ہیں۔

سعدیا نوبتِ امشب دہلِ صبح نہ کوفت یا مگر صبح نباشد شب تنہائی را

مولف

من غم و پردائے روز حشر جوں دارم کہ چون با سحر ربطی نمی بند و شب یلدائے من بہر حال اس شعر میں بھی یہ مضمون بڑی خوش اسلوبی سے بندھا ہے۔ اور فطرتی انداز سے خالی نہیں ہے اور اس میں معلوم ہوتا ہے کہ تارے اپنی جگہ سے کھستے نہیں ہیں بخلاف شب سرت کے چاند تارے دم کے دم میں رخصت ہو جاتے ہیں۔ اور صبح دن سے آپہنچتی ہے۔ یہی کیفیت دن کی صیام میں ہوتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب کو کسی نے کھونٹے میں باندھ رکھا ہے۔ کسی طرح پرشام ہوتی ہی

نہیں ہے۔

وَقَرِيبَةً اَقْوَامٍ جَعَلْتُ عِصَامَهَا عَلَى كَاهِلِ مَنِي ذُلُوبٍ مَرَحَلٍ  
معنی - اور بہت سی مشکیں قوموں کی ہیں۔ کہ میں نے ان کے دوال کو اپنے فرماں بردار اور مرحل یعنی کوچ کنائیندہ درش پر رکھا ہے۔

مطلب شعر یہ ہے کہ ہر چند میں بادشاہوں سے ہوں تاہم خدمت دوستاں وہماں کی نظر سے ان کی مشکوں کو اپنے کاندھے پر اٹھاتا ہوں۔ یہاں شاعر اپنی مدح کرتا ہے۔ اور دکھلاتا ہے کہ خدمت احباب کی بجا آوری میں وہ پسپا نہیں ہوتا۔ اس قول سے اس کی شرافت، انکساری اور عمدگی طبیعت کا اظہار مراد ہے آدمی کو چاہیے کہ درجہ عالی حاصل رہنے پر بھی خدمت خلق کو ملحوظ رکھے یعنی یہ بھول بدولت برسی مست نہ گردی مردی

بلند پایگی کا تقاضائے صحیح یہی ہے کہ خدمت قوم میں کبھی قاصر نہ ہو اور امر واقعی بھی یہی ہے کہ سردار قوم خادم ہوتا ہے۔ ادائے حقوق کرنا اس کا کام ہے اور اسی میں اس کی خوبی ہے۔

تَوَاضِعُ زُكُورٍ فَرَا زَا اِنْ كُوسَتْ  
وَوَادِجُ كُؤُفٍ الْعِيْرِ قَفَرٌ قَطَعَتْهُ  
بِهِ الذَّنْبُ يَعْوِي كَالْعَلْيَقِ الْمُعْتَلِ  
معنی - اور بہت وادی ہیں مانند شکم گور کے جس سے کوئی نفع حاصل نہیں ہوتا اس واسطے کہ شکم گور سے دودھ نہیں ملتا۔ اور وہ وادی بیابان بے آب و دانہ ہیں۔ کہ جنہیں میں نے قطع کیا۔ ان وادی میں بھیڑ یا چلاتا ہے۔ مانند ایسے ہارے ہوئے جواری کے جو عیال کثیر رکھتا ہو یعنی جہاں بھیڑ یا غایت گرسنگی سے نالہ و فریاد کرتا ہے۔

یہاں شاعر اپنے تحمل اور دلیری کو صحرا نوردی کے پیرایہ میں ظاہر کرتا ہے۔ اور واقعی یہ امر ہے کہ تحمل اور دلیری لوازم عشق سے ہیں۔ عاشقی آسان کام نہیں ہے یہ کام بہادروں کا ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔

نَازِئِينَ رَاعِشَتِي زَيْبِدَةً هَرَّكَ جَانَنِي  
فَقُلْتُ لَنَا لَمَّا عَوَى اِنَّ مَثَانَنَا  
مِثْرُ مِرْدَانٍ بَلَكَشِ يَادِرِينَ غَوَا نَهْنَدُ  
تَلِيلُ الْعَيْنِ اِنْ كُنْتَ لَمَّا تَمَوَّلُ



معنی۔ پس کہا میں نے اس بھر پیے سے جب وہ چلایا کہ یہ تحقیق میری شان بھی ناداری کی ہے اگر تو مالدار نہیں ہے یعنی تو جو گرسنگی سے چلاتا ہے۔ تو یہاں میرے پاس کچھ نہیں ہے۔

واضح ہو کہ یہ رنگ بیان فارسی یا اردو کی شاعری میں نہیں دیکھا جاتا ہے۔ یہ بیان کے طریقے ان اقسام سے ہیں جو کسی ملک خاص سے مختص ہوتے ہیں اور دوسرے ملک میں تقاضائے ملکی سے رواج نہیں پاسکتے۔

بَلَا نَا اِذَا اَمَانَال سَيِّئًا اَفَاتَا وَمَنْ يَخْتَرِثُ حَرْفِي دَحْرَثَكَ يَهْتَزَلْ  
معنی۔ دونوں ہم لوگوں سے اگر کسی نے کوئی چیز پائی تو اسے ضائع کر ڈالا۔ یعنی اے گرگ میں اور تو دونوں کی یہ حالت ہے کہ اگر ہم سے کسی نے مال حاصل کیا تو اسے خرچ کر ڈالا۔ اور جو شخص میری اور تیری طرح کوشش و سعی کرے لاغر ہو جائے گا۔ یعنی میری اور تیری طرح کوشش کرنے والا محتاج و فقیر ہو جائے گا۔

ظاہر ہے کہ یہ انداز بیان فارسی اور اردو میں کم تر دیکھا جاتا ہے۔

وَقَدْ اَعْتَدِي وَالطَّلَاقُ نِيْلًا تَهَا بِمُجَرَّدِ قَيْدِ الْاَوَابِدِ هَيْكَلْ

معنی۔ اور میں اول سحر میں جاتا ہوں درحالیکہ بطور اپنے اشیانوں میں رہتے ہیں۔ ہمراہ اسپ کم موکے جو بند و حشیاں اور دراز ہے و قوی ہیکل ہے۔ یعنی میں علی الصباح ایسے وقت میں سوار اسپ ہوتا ہوں کہ اس وقت بطور اپنے اشیانوں سے باہر نہیں آتے اور وہ گھوڑا ایسا ہے کہ کم مو ہے جو دلیل ہے تیز رفتاری کی اور ایسا ہے کہ جو دوش صحرائی کو گرفتار کر لینے کی قدرت رکھتا ہے۔ اور ایسا ہے درازی اور قوی ہیکل ہے۔ واضح ہو کہ اہل عرب چونکہ گرم ملک کے رہنے والے ہیں تقاضائے آب و ہوا

سے ان کا مزاج مجرور واقع ہوا ہے۔ جو شیلپن لوازمات مجرور المزاجی سے ہے پس ان کا میلان عورتوں کی طرف یا ان کی رغبت اسلمہ اور گھوڑوں کی جانب ایک امر طبعی ہے۔ امرئ القیس نے اپنی مردانہ صفتوں کو بیان کر کے اب اپنی شہسوار اور اپنے گھوڑے کی مدح کرتا ہے۔ یہ مدح نہایت فطرتی انداز رکھتی ہے۔ اور ہر چند اس کا پہلو شاعرانہ ہے مگر فارسی اور اردو کے شعرا کی نامطبوع صفت خوانی سے تمام تر پاک ہے۔ شعر بذا اور ذیل کے اشعار میں جو صفتیں گھوڑے کی مندرج ہیں

یقیناً ایسی ہیں کہ عمدہ گھوڑے میں وہ صفتیں موجود رہتی ہیں۔ واقعی اچھا گھوڑا ایسا ہی ہوتا ہے۔ کہ اس کی صفت میں مبالغہ پردازی کی کوئی حاجت نہیں ہوتی۔ ان اشعار سے صاف ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر خوب جانتا ہے کہ گھوڑے کو کیسا ہونا چاہیے اور شک نہیں کہ اہل عرب اس بات کو خوب جانتے ہیں۔ ان اشعار میں گھوڑے کی تعریف اس رنگ پر کی گئی ہے کہ جو حضرات سخن سنی کا مذاق میسر رکھتے ہیں۔ بہت کچھ لذت یاب سخن ہو سکتے ہیں۔ یہ اشعار ویسے نہیں ہیں جیسا کہ عرفی ذوق وغیرہما کے ایسے شعرائے فارسی وارد نے اپنے مہدوح کے گھوڑوں کو تماشے کا گھوڑا بنا رکھا ہے۔ ان دونوں شاعروں کے کچھ کلام جو گھوڑے کی تعریف میں ہیں بغرض ظاہر کرنے ان کی بد مذاقی کے ذیل میں عرض کیے جاتے ہیں۔ انہیں پران کے دیگر شعرا کے کلام کو بھی قیاس کرنا چاہیے۔

## بسم اللہ

### عرفی

آں بسکیر کہ چوں گرم عنانش سازی      از ازل سوئے ابد و زابد آید بہ ازل  
قطرہ کش دم رفتن چسکد از پیشانی      شبنم آساش نشیند گہ رجعت بہ کفل  
ایضاً

نہ تو سن تو عرق بر زمین فسر و ریزد      صبا ز طرف چمن یا سمین فسر و ریزد

### ذوق

آسیا وار پھرے کیوں نہ فلک گرد زمین      تیرے تو سن کی جو کاوے کی اوڑا جائے پھرت  
ایضاً

جلد اتنا کہ جہاں عرصہ جولاں اس کا      عہد مستقبل و ماضی کا وہاں ہے اک حال  
اس فلک سیر کو جولان جو کرے تو تو یہ ڈر      مرزے سبز فلک ہو نہ مبادا پامال  
ظاہر ہے کہ یہ سب اشعار بیعت فطرت سے تمام تر معرا ہیں۔ اول در حقیقت



کوئی لطف نہیں رکھتے لیکن ایسے شعرا کی طرف سے یہ معذرت پیش کی جاسکتی ہے کہ اس وضع کے اشعار یہ لوگ ردی کی غرض سے کہا کرتے تھے۔ تب یہ تعجب گدردنے لگتا ہے کہ خدایا کیا ان کی مدوحیں اس درجہ تنزل دماغی کو پہنچے ہوئے تھے کہ ان سے ایسے بے معنی اشعار کہلایا کرتے تھے اور ایسے نامربوط کلام سے خود لذت یاب ہوئے تھے۔

مَكْرُومٌ مَّغْرُوبٌ مُفْتَبِلٌ مُدْبِرٌ مَعًا كَجَأْمُودٍ ضَخِرَ حَطْمُهُ السُّبُلُ مِنْ عِلٍّ

معنی۔ اس پند کو نہایت حملہ کرنے والا ہے اور نہایت بھاگنے والا ہے۔ گویا کہ بیک وقت منہ سامنے لانے والا ہے۔ اور منہ پھیرنے والا ہے۔ مانند ایک بڑے سخت پتھر کے جس کو سیل نے بندی سے نیچے کی طرف ڈھلکایا ہو۔

یہ ایک پنجرل تعریف گھوڑے کی ہے جو ایسا گھوڑا ہوتا ہے وہ میدان جنگ اور شکار افگنی کے قابل ہوتا ہے۔ ایسے ہی گھوڑے کی پیٹھ سے نیزہ بازی کرتے ہیں۔ جس گھوڑے میں یہ صفیں نہیں ہوتیں وہ نہ لڑائی کے کام کا ہوتا ہے نہ اس سے اغراض شکار افگنی نکلتے ہیں۔ ایسے گھوڑے کی قدروں ہی لوگ کر سکتے ہیں جنہوں نے میدان جنگ میں ایسے گھوڑے سے کام لیا ہے جنہوں نے چوگان یعنی پولو کھیلے ہیں یا جنہوں نے نیزے سے سوراخوں، گوزن، یا ہرن مارے ہیں۔

كَيْفَ يُزَلُّ اللَّبِيدُ عَنْ حَالٍ مُتَنَةٍ تَحَاذَلَتْ الصَّفْوَاءُ بِالْمَشْنُورِ

معنی۔ اس پند کو ایسا کیت ہے کہ اس کے بدن کی صفائی کے باعث زمین اس کی پیٹھ سے پھسل جاتا ہے۔ جس طرح پر کہ آب باراں سنگ براق پر سے گر پڑتا ہے۔

سبحان اللہ کیا تعریف گھوڑے کی شاعر نے کی ہے کمال اطلاع سے گھوڑے کے رنگ کو کیت لکھا جانا چاہیے کہ بہترین رنگ گھوڑے کے لیے رنگ کیت ہے اس رنگ کے گھوڑے کا بدن سرخ ہوتا ہے، دم سیاہ ہوتا ہے اور چاروں پاؤں سیاہ یا مان بہ سیاہی ہوتے ہیں۔ گھوڑے کے لیے یہ نہایت پختہ رنگ ہے۔ اس رنگ کے گھوڑے بیشتر مضبوط تیز رفتار، شائستہ اور نیک طینت ہوتے ہیں۔ دیکھنے میں بھی آنکھوں کو بھلے لگتے ہیں۔ شاعر نے اپنی اطلاع کی رو سے اس پند کو کیت کہا۔ ناواقف شاعر کوئی اور رنگ لکھ دیتا۔ جیسے سمندر

سزنگ، سبزا، مشکی، چال، ابلق، گڑا، تلاء، چینا، سُرخا وغیرہ جو کیت کے برابر نہیں سمجھے جاتے ہیں۔ فیکر کی دانست میں فارسی یا اردو کے کم کسی شاعر نے گھوڑے کی تعریف میں اس کے رنگ کو کیت لکھا ہے۔ چونکہ واقعہ نگاری کا مذاق اکثر ان زبانوں کے قصیدہ گو شعرا نہیں رکھتے ہیں۔ حقیقت حال کی طرف ان کے ذہن کو میدان نہیں ہوتا۔ بے سروپا باتوں کو حوالہ قلم کر جاتے ہیں۔ ان کی ترکیبیں کہے دیتے ہیں کہ صرف مبالغہ پر دازی کو انھوں نے شاعری کی جان سمجھا ہے۔ البتہ میر انیس صاحب کے کلام میں فطرتی انداز بہت موجود رہتے ہیں۔ گو کبھی کبھی ان کی شاعری بھی ملکی تقاضوں کے باعث دائرہ واقعہ نگاری سے قدم باہر رکھ جاتی ہیں۔ اس پر بھی ان کے کلام میں جہاں انھوں نے گھوڑے کی تعریف لکھی ہے ایسی نیچرل خوبیاں پائی جاتی ہیں کہ سامع کو حیرت دامن گیر ہوتی ہے۔ صاف ان کے کلام سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ گویا انھوں نے مجرد گھوڑے کے حالات کی تحقیق میں اپنی عمر عزیز بسر کی ہے۔ نہ ندرت نہ کسی فارسی اور نہ کسی اردو کے شاعر میں پائی جاتی ہے۔ ہاں البتہ میر حسن مصنف مثنوی سحر البیان جو ایک بڑے نیچرل شاعر ہیں انھوں نے گھوڑے کی تعریف میں کچھ شعر کہے ہیں۔ جو قابل توجہ ہیں۔ مگر یہ اشعار کہے دیتے ہیں کہ شاعر نے ہندوستانی خیالات کو وقت شعر گوئی ملحوظ رکھا ہے۔ یہ بھی ایک نیچرل رنگ ہے۔ جو ہندوستانی مذاق سے خبر دیتا ہے۔ اور یہ وہ خیالات ہیں جن کے پابند عموماً اہل ہند ہیں۔ اشعار ذیل میں ایک کل کے گھوڑے کے بیان میں ہیں۔

کہا مادہ رخ نے کہ تھے تیرے بخت	کہ بخشا تجھے میں سیماں کا تحت
جو اترے تو کل اس کی یوں جوڑیو	جو برعکس چاہے تو دوں موڑیو
زمین سے لگا اور تا آسماں	جہاں چاہیو حبابیو تو وہاں

### داستان گھوڑے کی تعریف میں

کہوں کیا میں اس اسپ کی خوبیاں	پزندوں میں کب ہوں یہ محبوبیاں
ذرا کل جو موڑی نلک پر ہوا	جو کہیے تو کہیے اے باد پا
نہ کھاوے نہ پیوے نہ سوئے کبھی	نہ ٹاپے نہ بیمار ہوئے کبھی



نہ حشری نہ قمری نہ شب کور وہ      نہ وہ کہنہ لنگ اور منہ زور وہ  
 نہ ہڈوں کا نہ موٹروں کا خلل      نہ پیشانی اوپر ستارہ کا بل  
 نہ ساپن نہ ناگن نہ بھونری کا ڈر      ہر ایک عیب سے وہ غرض بے خطر

ظاہر ہے کہ میر حسن نے ہندوستانی خیالات کی پابندی بھونریوں کے بیان میں کی ہے۔ اس کے پابند ہمارے ملک کے ہر طبقہ کے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ درحقیقت یہ خیالات بے معنی ہیں۔ اور عند التجربہ محض مہمل ثابت ہوتے گئے ہیں۔ فیر نے دیدہ و دانستہ ایک ہڑاؤں گھوڑا لیا تھا۔ جب تک وہ اپنے پاس رہا کسی طرح کا آسیب فیر کو نہ پہنچا۔ یہ گھوڑا اس بھونری کے ساتھ کوئی ایسی دوسری بھونری بھی نہیں رکھتا تھا۔ کہ جس سے یہ قیاس کیا جاتا کہ وہ ہڑاؤں کے اثر کو زائل کرنے والی تھی۔ اسی طرح فیر کے ایک عالی رتبہ عزیز بھونری کا ایک جانور رکھتے تھے۔ جو ستارہ پیشانی تھا۔ جب ان سے کوئی کہتا کہ یہ گھوڑا ستارہ پیشانی ہے اسے دفع فرمائیے تو وہ ہنس کر فرماتے کہ میں آفتاب پیشانی ہوں میرے سامنے اس کا ستارہ پیشانی ہونا کیا اثر پیدا کر سکتا ہے۔ یہ سب وہی باتیں ہیں۔ اور مرد مہمل کی توجہ کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ دنیا کے معاملات گھوڑے کے بال بھونری پر موقوف نہیں ہیں فیر نے بہت سے مبارک بھونری کے جانوروں کے مالکوں کو مبتلائے آفات ہوتے دیکھا ہے۔ البتہ شایق کو عیوب شرعی کا ملحوظ واجبات سے ہے اور یہ ایسے عیوب ہیں کہ عقل سلیم بھی انہیں عیب مانتی ہے۔ ہم مسلمانوں میں بال بھونری کا عقیدہ ہندوستان میں آنے کے پہلے نہ تھا۔ اسلام میں تو ایسی لایعنی باتیں کیوں ہونے لگیں ایام جاہلیت کے اہل عرب بھی بال بھونری کو لاشے جانتے تھے۔ تعجب ہے کہ اس عہد کے ہندی اہل اسلام ایسی لغو باتوں کے پابند ہیں۔ اور صرف اسی کے پابند نہیں ہیں ہزاروں مہمل خیالات ان کے جزو معتقدات ہو گئے ہیں۔ علاوہ رنگ معقول بیان کرنے کے شاعر نے گھوڑے کی صفائی بدن کو ذکر کیا ہے۔ جاننا چاہیے کہ بغیر عمدگی جلد کے گھوڑے کے بدن میں صفائی نہیں آسکتی عمدہ جلد اسی گھوڑے کی ہوتی ہے جس کی نسل چچی ہوئی ہوتی ہے۔ شاعر کا اس صفت کو ملحوظ رکھنا کہہ دیتا ہے کہ شاعر اس درجہ کا آدمی ہے کہ اس کے پاس قوم دار گھوڑے تھے۔ امرئ القیس شاہزادگان نجد سے

ہے۔ امراءِ نجد گھوڑوں کی نسل کی حفاظت کرتے ہیں۔ اور ان کی اصالت کے قائم رکھنے میں اہتمامِ مبلغ کوراہ دیتے ہیں۔ گھوڑوں کے نسب نامے یاد رکھتے ہیں۔ اور عمدگی قومیت کو خوب پہچانتے ہیں۔ کوئی نجد میں جا کر ان کے گھوڑوں کی جلدوں کو اپنی آنکھوں سے معائنہ کرے تب قول امرئ القیس کی خوبی کو پہنچ سکے گا۔ کہ ناواقف کا کام نہیں کہ اس کے لطف کلام سے حظ اٹھائے۔ ہم ہندیوں نے کیا گھوڑے دیکھے ہیں۔ کہ اس کے بیان کے تہ کو پہنچ سکیں۔ بہر حال جاننا چاہیے کہ صفائی جلد دلیلِ نجات ہے۔ بری نسل کے گھوڑے بدپٹھے ہوتے ہیں۔ بال ان کے خرس و بز کو ہی کی طرح موٹے، ملاست و ملاحت ندارد۔ اس ملک میں یہی جو کبھی اچھے گھوڑے ملکِ عرب عراق، ایران، بخارا وغیرہ کی طرف سے آجاتے ہیں تو ان کی جلدیں دیکھنے کے قابل ہوتی ہیں۔ ان پر ہاتھ پھیرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جلدیں کا ہے کوہیں مغل کا شانی ہیں۔ بلکہ مغل سے کوئی زیادہ نرم شے ہیں۔

عَلَى الذَّبْلِ جَيَّاشٌ كَأَنَّ إِهْتِزَامَهُ إِذَا جَاشَ فِيهِ حَمِيمٌ عَلَى مَوْجِبٍ  
معنی۔ اسپ مذکورہ باوجود لاغری کے جوش مارنے والا ہے۔ گویا کہ آواز رفتار اس کی جب کہ اس کی گرمی جوش میں آئے دیگ کا جوش کرتا ہے۔ یعنی جب وہ گھوڑا گرم ہوتا ہے تو اس کے گرم ہونے پر اس کی آواز رفتار دیگ کے جوش کا عالم پیدا کرتی ہے۔ واضح ہو کہ شاعر نے گھوڑے کی تعریف لاغری کے ساتھ کی اسے فریب نہیں کہا۔ اس لیے کہ اسپ لاغری رفتار اور بکار آمد ہوتا ہے۔ بخلاف فریب کے کہ اسے نیرائی نہ دوزخ شکار نہ چوگان بازی میں کام لیا جاسکتا ہے۔ سعدی علیہ الرحمۃ نے خوب فرمایا ہے کہ

اسپ لاغری میان بکار آید روز میدان نہ گاؤ پر داری  
شاعر نے اس جگہ بھی اپنی اطلاع سے کام لیا ہے۔ گھوڑے کی تعریف میں مضمون لاغری کو پیش نظر رکھا۔ اہل عرب بھی خوب جانتے ہیں کہ گھوڑے کا بدن کس انداز کا ہونا چاہیے۔ اہل فرنگ بھی پورے طور پر باخبر ہیں۔ کہ سواری کے گھوڑوں کو کس قدر گوشت رکھنا چاہیے مگر بہت سے ہمارے وطن کے خیالات اس بارے میں علاحدہ ہیں۔ ان کی سواری کے گھوڑے دودھ مالیدہ، گاجر مہیلا کھا کر ایک عجیب شے ہو جاتے ہیں۔ سو پچاس قدم چل کر پسینے میں ڈوب جاتے ہیں۔ اور جس طور پر رکھے جاتے ہیں



اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ محض بے کار ہو جائیں۔ ایسے گھوڑے نہ دوڑ کے کام کے رہتے ہیں اور نہ ان سے صیدانگنی کی غرض نکلتی ہے۔ البتہ ایسے گھوڑے رقص کا لطف دکھاتے ہیں۔ اسی غرض سے گھونگھرو وغیرہ پہنائے جاتے ہیں۔ واہ رے مذاق گھوڑا جو سپاہی اور غازی مرد کا حکم رکھتا ہے۔ لڑائی حرکات بنایا جاتا ہے۔ واضح ہو کہ اہل عرب عمدہ گھوڑے نہیں رکھتے ہیں۔ بلکہ گھوڑے کو کیا ہونا چاہیے اور اس کا کیسا مصرف ہے اس کو بھی خوب سمجھتے ہیں۔ اہل فرنگ بھی اس کام کو خوب جانتے ہیں جیف ہے ہم لوگوں پر کہ ہم لوگوں کی جتنی اچھی باتیں بتھیں اہل یورپ میں بدلی گئیں۔ اور ہم لوگوں نے غیر اقوام کی بری خصلتیں اختیار کر لیں۔

مَسِيحٌ إِذَا مَا السَّابْعَاتُ عَلَى الْوُفَى'      أَثَرُ الْغَمَارِ بِالْكَدِيرِ الْمُرْكَبِ  
معنی۔ اسپ مذکور نہایت تیز رفتاری کے باعث مثل آب ریختہ کے ہے۔ یعنی جیسے آب ریختہ کی حرکت تیز ہوتی۔ ویسا ہی یہ اسپ بھی اپنے رفتار میں تیز ہے۔ اور یہ تیزی اس کی اس وقت تک قائم رہتی جب اور تیز رفتار گھوڑے دوڑ سے ماند ہو کر ایسی زمین سخت میں جو ستم ستوراں سے ترکیبہ اور کوفہ رہتی ہے۔ غبار اڑانے لگتے ہیں۔ یعنی اور گھوڑے دوڑ میں تھک سست ہو جاتے ہیں۔ مگر اسپ مذکور نہیں تھکتا اور اس کی وہی تیزی برقرار رہتی ہے۔

اس تعریف سے معلوم ہوتا ہے کہ اسپ مذکور صرف نہایت تیز رفتار نہیں ہے۔ بلکہ بہت جفاکش بھی ہے۔ جفاکشی تیز رفتار گھوڑے کے لیے ایک بڑی صفت کی بات ہے۔ شاعر نے بڑی اطلاع کے ساتھ گھوڑے کی یہ تعریف کی ہے۔ جاہل شاعر کے دماغ میں کبھی یہ تعریف نہیں آ سکتی ہے۔ یہ تعریف اسی شاعر کے قلم سے نکلے گی جو گھوڑے کے فن کا بڑا ماہر ہوگا۔ واقعی ایسے گھوڑے کا کیا کہنا۔ کہ جب دوڑ میں اور گھوڑے تھک جائیں تو اس کا دم خم بطور سابق باقی رہے۔ یہ بات عربی گھوڑوں میں دیکھی جاتی ہے۔ گھوڑوں میں ایسا دیکھا گیا ہے کہ جب اور قوم کے گھوڑوں کی قوت رفتار ختم ہونے لگی ہے تو اس وقت عربی گھوڑے اپنے زور پر آنے لگے ہیں۔ فقیر کا ذاتی تجربہ ہے کہ عربی گھوڑے ایک اچھے دوڑ کے بعد کھلنے لگتے ہیں۔ اور واقعی وہ اپنی پوری قوت رفتار برتب پہنچتے ہیں جب اور گھوڑوں کی قوت کم ہونے لگتی ہے۔ ظاہر



ہے کہ جو شاعر ان امور سے واقف نہ ہو گا وہ ایسے مضمون کیا باندھے گا۔ یا سامع بے خبر کو ایسے فطرتی کلام سے کیا لطف سخن ملے گا۔

يُوَلِّوْا الْغُلَامَ الْخَفَّ عَنْ صَهْوَاتِهِ وَيُلَوِّىْ بِاَثْوَابِ الْغَيْفِ الْمَشْقَلِ  
 معنی۔ اسپ مذکور غایت تیز رفتاری کے باعث طفل سبک کو اپنی پیٹھ سے گرا دیتا ہے۔ یعنی طفل جو سواری میں مہارت نہیں رکھتا ہے اس کی غایت تیز رفتاری کے سبب سے اس کی پیٹھ پر بٹھہر نہیں سکتا۔ پس اس کی سواری کے لیے جوان ماہر درکار ہے۔ کسی لڑکے کا کام نہیں ہے۔ کہ اس پر سوار ہو۔ اس پر وہی شخص سوار ہو سکتا ہے جو فن سواری کو جانتا ہے۔

اس تعریف سے غرض شاعر یہ ہے کہ اسپ مذکور نہایت تیز رفتار ہے نہ یہ کہ بد ہے جو سوار کو چٹک دیتا ہے۔ پس ایسے گھوڑے کو ایک عمدہ شہسوار درکار ہے۔ اور اسپ مذکور گرا دیتا ہے جامہ ہائے سوار ماہر و گراں کو۔ یعنی اس کی تیزی کے سبب سے ماہر سوار کے کپڑے اس کے ہاتھ سے باہر ہو جاتے ہیں۔ مطلب شاعر یہ ہے کہ اسپ مذکور اس قدر تیز ہے شہسوار کو چاہیے کہ کپڑے مستعدی کے ساتھ پہن کر اس پر سوار ہو۔ ورنہ ٹوپی دستار کہیں سے کہیں چلی جائے گی۔

دِرِّ بِرُكْحُذَرُوفٍ الْوَلِيدِ اَمْرًا تَتَابَعُ كَفَيْدًا بِخَطِّ مَوْصَلٍ

معنی۔ اسپ مذکور تیز رو ہے مانند خذروف لڑکے کے جس کا دھاگہ خوب بٹا ہوا ہوتا ہے اور جسے دونوں ہاتھ سے لڑکے گھماتے ہیں۔ بذریعہ ایک رشتہ پیوستہ کے واضح ہو کہ خذروف کو زبان ہندی میں پھر کی کہتے ہیں اس کو گھمانے سے ایک خاص طرح کی آواز نکلتی ہے۔ لڑکے اس کھیل کو ہندوستان میں بھی کھیلا کرتے ہیں۔ اس شے کو بنانے کی ترکیب یہ ہے کہ ایک ایک گلی مدروشی کو جھلی سے مڑھ دیتے ہیں۔ پھر اس میں دھاگہ ڈال کر گھمانے سے اس میں آواز نکلتی ہے۔ یہاں آواز سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ اس جگہ شاعر گھوڑے کی تیزی کو اس شے کی گردش کی تیزی کے ساتھ تشبیہ دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب کوئی ایسی شے گھمائی جائے گی تو اس کی حرکت نہایت سریع ہوگی۔ یہ تشبیہ بھی دائرہ فطرت سے باہر قدم نہیں رکھتی ہے۔ اور یہ اس طرح کا بے سرو پا مبالغہ نہیں ہے۔ جیسا کہ عربی نے اپنے شعر مرقومہ بالا میں



ازل وابد کو اکٹھا کر کے دکھلایا ہے۔

لَا يُطْلَا ظَبْيٌ وَسَاقًا نَعَامَةً دَارِخَاءُ بِرُحَانٍ وَتَقَرُّبُ تَسْفُلٍ

معنی۔ اسپ مذکور کی ہر دو تہی گاہیں آہو کی تہی گاہیں ہیں۔ اور اس کی ہر دو سانین شتر مرغ کی سانین ہیں۔ اور دوڑ اسپ مذکور کی بھیر ٹیے کی دوڑ ہے اور ریٹ بپہ روباہ کی ہے۔

واقع ہو کہ شاعر نے یہاں سب ایسے جانوروں کو مجتمع کیا ہے جو تیز رفتاری میں ممتاز ہیں۔ آہو کی تہی گاہ اور شتر مرغ کے پاؤں کا ذکر ہے۔ دوڑ بھیر ٹیے کی اور ریٹ روباہ کی بتلائی۔ آہو کی تہی گاہ سے تشبیہ اس لیے دی کہ آہو از روئے ساخت بدن پھر ہرا ہوتا ہے اس کی تہی گاہیں اس ترکیب کی ہوتی ہیں کہ جو اس کی تیز رفتاری کی معین ہوتی ہیں۔ گھوڑے کی تیز رفتاری کا یہی کمال ہے کہ آہو کے برابر دوڑ سکے۔ ایسے کم گھوڑے ہیں جن کی پیٹھ سے شکاری نیسزہ یا تلوار کے ذریعہ سے آہو کا شکار کر سکتا ہے۔ کرنیل کیمبل نے اپنے روزنامہ میں اور اسٹرنڈیل صاحب نے اپنی کتاب میں آہو کے گھوڑے سے شکار کیے جانے کی دو تین سرگزشتیں تحریر کی ہیں۔ مگر یہ آہو جن کے مذکور ان کی تحریر میں آتے گئے ہیں یہ سب کم و بیش قبل سے زخمی ہو چکے تھے۔ اس پر بھی وہ سب بڑی دوڑ کے بعد دشواری سے ہاتھ لگے۔ بقیاس فقیر ملک عرب میں بھی کم تر ایسے گھوڑے ہوں گے جو آہو کے صمیم سالم کو دوڑ کر چھو لیں۔ اور جو گھوڑے ایسے ہوں گے وہ اسی صفت ہوں گے۔ جس صفت کا امرئ القیس کا گھوڑا تھا۔ پھر شاعر نے شتر مرغ کی ساقوں کا مذکور کیا ہے۔ یہ جانور قوت پر داز نہیں رکھتا اور اسے قوت پر داز کی حاجت بھی نہیں ہے۔ فطرت نے اپنی بخشش میں افراط کو راہ نہیں دیا ہے۔ چونکہ اسے غایت درجہ کی تیز رفتاری بخشی ہے اس تیز رفتاری کے ساتھ قوت پر داز افراط بخشش کا حکم رکھتی۔ یہ جانور ریگستانوں میں رہتا ہے اور واقعی عجیب الخلق ہے۔ جب کوئی اس کا تعاقب کرتا ہے اس تیزی سے بھاگتا ہے کہ دم بھر میں آنکھوں سے نہاں ہو جاتا ہے۔ عرب اور افریقہ کے بڑے بڑے صحراؤں میں وطن رکھتا ہے۔ اور ان وسیع بیابانوں میں اپنے پاؤں سے وہ کام لیتا ہے جسے تیز پر داز طیور مثل عقاب و نسر کے اپنے پاؤں سے کام لیتے ہیں۔ عرب کے جو



نہایت تیز گھوڑے ہوتے ہیں صرف وہی تو اس کا پیچھا کر سکتے ہیں۔ اور جو گھوڑا اس کی دوڑ کو پہنچ سکتا ہے اس کی تیز رفتاری سندی سمجھی جاتی ہے۔ آہود شتر مرغ کا ذکر کر کے شاعر بھیڑیے کا مذکور کرتا ہے۔ اس جانور کی بھی بڑی دوڑ ہوتی ہے۔ اس کا فیر کو بھی ذاتی تجربہ حاصل ہے۔ واقعی نہایت تیز رفتار گھوڑے کا کام ہے کہ اس جانور کا تعاقب کرے۔ بغیر شکاری کتوں کی اعانت کے اس کا شکار دشوار ہے۔ آخر میں لومڑی کا بیان ہے۔ یہ وہ چالاک اور تیز رفتار جانور ہے کہ مازی کتوں کی کمر اس کے شکار میں ٹوٹ جاتی ہے۔ اہل فرنگ اس کا شکار خوب کھلتے ہیں۔ ناکس ہونڈ ہو لومڑی کے شکار کے کتے ہوتے ہیں بے ان کتوں کے سوار سے کچھ نہیں بن آتی۔ واضح ہو کہ یہ شعر خوبیوں سے معمور ہے۔ وہی شخص جو علم حیوانات سے خبر رکھتا ہوگا، اس سے لذت یاب ہوگا۔ نہ لایعلم شاعر ایسا شعر کہہ سکے گا۔ اور نہ لایعلم سامع اس سے حظ اٹھا سکے گا۔ جاننا چاہیے کہ استادوں نے گھوڑے کی خوبیوں کی تفصیل یوں کی ہے کہ گھوڑے میں تین خوبیاں عورت کی ہونی چاہیے۔ یعنی ایال زلف محبوبان کی طرح دراز۔ اور سینہ دسریں ان کے سینہ دسریں کی طرح عریض و مدور اور پھر اسے شیر کی تین صفیں دیکھار ہیں۔ یعنی شیر کی طرح رعب دار چہرہ رکھنا چاہیے۔ اور شیر ہی کی طرح اسے بہادر اور پرصوت ہونا چاہیے۔ بیش کی بھی تین چیزیں اس کو حاصل رہنا ضرور ہے یعنی ناک نیکی، تحمل برس منوال اسے تین اعصاب ہیں یعنی سر پاؤں اور جلد میں ہرن سے مشابہ ہونا چاہیے۔ اور اسی طرح بھیڑیے سے اس کے حلقوم، گلے اور قوت سمع کو اور لومڑی سے اس کے کان، دم اور دلکی کو اور سانپ سے اس کے قوت حافظہ قوت لبھ اور لچک کو اور خرگوش سے اس کی رفتار دوڑ اور جفاکشی کو ہم ساری کی حاجت ہے۔ ہر چند امری القیس نے اس طوالت سے اپنے گھوڑے کی خوبیوں کو نہیں لکھا ہے تاہم شاعرانہ تقاضا سے جس قدر امور ضروری تھے۔ انہیں نہایت استاد کی ساتھ موزوں کیا ہے۔ اس کے لطف کو وہی سمجھے گا جس کی گھٹی میں گھوڑے کا شوق پڑا ہوگا۔ اور جس شوق نے اسے ماہر فن کے درجہ کو پہنچایا ہوگا۔

صَلِغٌ إِذَا اسْتَدْبَرْتَهُ سَدَّ فَرْجَهُ بِضَافٍ فَوَيْقَ الْأَرْضِ لَيْسَ بِاعْزَلٍ  
معنی۔ اس پند کو پوری خلقت کا سرین سے پر گوشت پر اعصاب اور میان سے



بزرگ ہے۔ جب کوئی پس پشت اس کے آتا ہے تو اپنے دونوں زانوں کے درمیان کی کشادگی کو اپنے دم سے بند کرتا ہے اور اس کی دم میں کثرت سے بال ہیں۔ اور دم اس کی اس قدر دراز ہے کہ زمین سے صرف تھوڑی بلندی رہتی ہے۔ اور وہ دم کچ نہیں ہے۔ جو گھوڑے کے لیے عیب متصور ہے۔ بلکہ نہایت راست ہے۔

یہ تعریف ہی شاعر کے کمال اطلاع سے خبر دیتی ہے۔ واقعی گھوڑے کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ کہ خلقت سے پورا ہونا اس کے قد میں نقصان ہونا اس کے جسم میں گڈھنگا پن ہو سر میں کوہر گوشت ہونا چاہیے اس کے اعضائے ترکیب میں کوئی نقصان لاحق ہو کر سے بزرگ ہونے کے سبب سے متعل وزن اٹھانے کا ہو ہر طرح پر جوڑ بند سے درست ہو دم میں بال کثرت سے ہوں اور دراز ایسے ہوں کہ قریب زمین کے پہنچتے ہوں۔ اور بھی دم میں کبھی لاحق نہ ہو۔ واضح ہو کہ عربی گھوڑے جیسے خلقت کی رو سے خوش ترکیب ہوتے ہیں۔ دنیا میں کہیں ایسے گھوڑے نہیں ہوتے ہیں۔ عربی گھوڑے درحقیقت ایسے ہی ہوتے ہیں۔ جیسا کہ شاعر نے لکھا ہے۔ اس میں ایک حرف مبالغہ نہیں ہے۔ ملک عرب کے گھوڑے تمام دنیا کے گھوڑوں سے جدا انداز جسم رکھتے ہیں۔ ان کی تھوکتی چھوٹی، پیشانی آنکھیں بڑی ہوتی ہیں۔ سر اور کان چھوٹے گردن کے بال لانے، گردن کا خم مخراب نما سینہ وسیع قد کے حساب سے پیٹھ چوڑی مگر بزرگ، سر میں پر گوشت، پیٹ متوسط۔ دست دپا سانچے کے ڈھلے ہوتے ہیں۔ مختصر یہ کہ تناسب اعضا ایسا ہوتا ہے کہ آنکھیں اچھے عربی گھوڑے دیکھ کر سیر نہیں ہوتی ہیں۔ یہی جی چاہتا ہے کہ اسے دیکھا کریں۔ اس پر سے اس کی شائستگی، طبیعت داری، شریف مزاجی و ناداری اور ذہانت ایسی ہوتی ہے کہ شان خدا یا ذاتی ہے۔ کبھی یہ ہے کہ اس کی محبوبیت کچھ ایسی ہوتی ہے کہ اسے نظر سے دور رکھنا گوارا نہیں کرتی۔

كَانَ سَمَلًا تَلَهُ لَدَى الْبَيْتِ قَائِمًا      مَدَاكَ عَوْدِي اَدْوَلَا يَسْتَحْظَلُ  
معنی۔ گویا کہ پشت اس پر مذکور در حالیکہ وہ قریب گھر کے ایستادہ ہے۔ مثل اس پتھر کے کہ جس پر نئی دلہن کے لیے خوشبودار مصالح پیستے ہیں۔ یا مانند اس صاف و سخت پتھر کے جس پر حنظل توڑتے ہیں یعنی اس گھوڑے کی پیٹھ اس کے کھڑے رہنے



کی حالت میں ایسی عریف معلوم ہوتی ہے جیسے پتھر کی سل ہو جس پر مصالح پیسیں یا حنظل توڑیں۔

جاننا چاہیے کہ یہ تعریف بھی گھوڑے کے لیے ایک بڑی تعریف ہے جو گھوڑا عریف پیٹھ کا ہوتا ہے اس کی پیٹھ قابل اعتماد ہوتی ہے۔ اور ایسا گھوڑا علاوہ بکار آمد ہونے کے خوشنما بھی ہوتا ہے۔ شاعر کی خوش خیالی نہایت قابل تعریف ہے کیوں نہ ہو شاعر بھی اسی ملک کا شاہزادہ ہے۔ جہاں عمدہ ترین گھوڑے پیدا ہوتے ہیں۔ اس پر بھی شاہزادہ ایسا طبیعت دار مردانہ مزاج بہادر طبیعت خوش پسند اور اخلاق سخن۔

كَانَ دِمَاءَ الْهَادِيَاتِ يَخْرُجُ عَصَاةَ حِجَاءٍ بَشِيبٍ مُرَجَلٍ  
معنی۔ گویا کہ خون جانوران پیش رو کا اس کے سینہ پر فشرده ہندی کا ہے موئے سفید و شانہ کردہ میں۔ یعنی اس پ مذکور ایسا تیز رفتار ہے کہ دوش صحرائی کو جو اپنے ہم جنسوں سے دوڑ میں آگے رہنے والے ہیں، جالیتا ہے۔ اور وقت شکار ان کا خون جو اس کے سینہ پر گر رہا ہے وہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا موئے سفید و شانہ کردہ عصارہ حنا سے مخضب ہو رہا ہے۔

ظاہر ہے کہ وہ گھوڑا اگر اس قدر تیز رفتار ہوتا تو کیوں کر اس سے جانوران پیش رو کا شکار ممکن ہوتا۔ چوں کہ ایسے جانوروں تک دوڑ کر پہنچ جاتا ہے تو وقت شکار ان کے خون سے اس کا سینہ تر ہو کر معلوم ہوتا ہے کہ گویا سفید اور شانہ کردہ بالوں پر ہندی کا خضاب چڑھا ہے۔ واضح ہو کہ شاعر گھوڑے کی تعریف کرتے کرتے اب اس امر کا تذکرہ کرتا ہے جس سے کہ گھوڑے کی سچی خوبیوں کا تکملہ متصور ہے وہ امر معاملہ شکار ہے۔ گھوڑے کا پورا جوہر میدان جنگ یا شکار گاہ میں کھلتا ہے۔ شکار افگنی کی مشقت بھی نبرد آزمائی کی سی ہوتی ہے۔ شکار افگنی میں بھی بہت کچھ خوف جان لاحق رہتا ہے۔ شکار افگنی اور نبرد آزمائی میں فرق اس قدر ہے کہ ایک میں انسان کو مقابلہ دوش صحرائی کے ساتھ ہوتا ہے اور دوسرے میں انسان کا مقابلہ انسان کے ساتھ ہوتا ہے۔ خیر فرق جو کچھ ہو، شکار افگنی ایک بڑی محنت کا کام ہے۔ اس واسطے کہ اور سامانوں کے علاوہ اچھے سوار اور اچھے گھوڑے کی



جو ہر کر سکے۔ جس قسم کے شکار کا امری القیس شعر بالا میں ذکر کرتا ہے۔ شعر بالا کے لطف مضامین سے بہرہ مند ہونے کے لیے ضرور ہے کہ انسان اعلا قسم کی صید افگنی کا کچھ ذاتی تجربہ رکھے۔ اس کا تجربہ صرف انھیں لوگوں کو ہوتا ہے جو صید افگنی کا سچا مذاق رکھتے ہیں سچے مذاق کا حاصل ہونا ایک امر دشوار ہے۔ ہر شخص شکاری نہیں ہو سکتا اس کے لیے بڑی پرمادگی درکار ہے۔ شکار افگنی بھی ایک قسم شاعری کی ہے۔ جس طرح ہر شخص کو مذاق شاعری حاصل نہیں رہتا وہی حال مذاق صید افگنی کا بھی ہے۔ امری القیس شعر بالا میں اپنے مذاق صید افگنی کو گھوڑے کی تعریف کے پردہ میں دکھلاتا ہے۔ اور واقعی یہ مذاق ایسا ہے کہ انسان کو اس مذاق کے حاصل رہنے پر بالیدگی ہو سکتی ہے۔ اس شعر میں شاعر نے صرف گھوڑے کی تعریف نہیں کی ہے بلکہ اپنے ایک بڑے ہنر کی بھی خبر دی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ایک شعر میں راکب مرکب دونوں کی عمدگی کو ظاہر کیا ہے کس واسطے کہ ایسا گھوڑا جو وحوش پیش رو کو دوڑ میں مغلوب کر دے اگر قابل تعریف ہے تو اس کا سوار بھی جو ایسے صید ہائے تیز رفتار کو شکار کر سکے۔ قابل تحسین و آفرین ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اہل عرب و وحوش صحرائی کو گھوڑے کے ذریعہ شکار کرنے کا مذاق رکھتے ہیں۔ اور کیوں نہ یہ مذاق رکھیں جب ان کا ملک عمدہ گھوڑے پیدا کرتا ہے اور خود وہ لوگ مردانہ انداز رکھتے ہیں۔ ہندوستان میں بیشتر گھوڑے کے ذریعہ سے شائقین صید سور کا شکار کھیلتے ہیں۔ یہ شکار بھی خالی از خطر نہیں ہے۔ مگر راقم اپنے ذاتی تجربہ ہائے کثرت سے کہہ سکتا ہے کہ یہ شکار نہایت دلچسپی رکھتا ہے۔ اہل فرنگ نے تو اس شکار کو مکملہ تکمیل پہنچا دیا ہے۔ اور اس شکار پر کیا موقوف ہے انھوں نے ہر قسم کے صید افگنی کو قواعد علمی کے ساتھ اس طور پر برتا ہے کہ اس زمانہ میں شکار افگنی نے ایسی علمی صورت پیدا کی ہے کہ بغیر مدققانہ ہوئے کوئی آدمی شکاری ہو نہیں سکتا۔ مگر ہندوؤں میں بھی کچھ حضرات ایسے ہیں کہ جو اس کو قاعدہ کے ساتھ برتتے ہیں اور مذاق شکار افگنی سے بے خبر نہیں ہیں۔ علاوہ سور کے شکار کے اور کسی جانور کا شکار اس ملک میں نہیں ہے۔ جو گھوڑے کی پیٹھ سے کھیلا جائے۔ کبھی کبھی نیل گاؤ کا شکار گھوڑے کے ذریعہ سے کیا جاتا ہے۔ مگر یہ شاذ کا حکم رکھتا ہے۔



فَقَدْ لَنَا سُرُوبٌ كَأَنَّ نَعَاجَهُ عَذَارَى دُؤَارٍ فِي مُلَائِهِ مُذَيَّلٍ  
 معنی۔ پس آگے آیا ہم لوگوں کے ایک گروہ گادان دشتی کا گویا کہ مادہ ان کی مانند  
 اُن زنان دوشیزہ کے ہیں جو چادر دراز دامن پہنے ہوئے طواف دُوار کرتے ہیں۔  
 (دُوار ایک بت کا نام ہے جس کی پرستش اہل عرب ایام جاہلیت میں کرتے تھے)۔  
 شاعر اب شکار کی کیفیت کو بیان کرتا ہے۔ کہ صید گاہ میں کیا شکار سامنے آیا۔  
 معلوم ہوتا ہے کہ گادان دشتی ملک عرب میں آہوں کی طرح کثیر الوجود ہیں۔ اور  
 تیز رفتاری ان کی ایسی ہے کہ ان کو گھوڑے کے ذریعہ شکار کرنے پر شکاری فخر کر  
 سکتا ہے۔ یہاں وجہ تشبیہ مادہ گادان اور زنان دوشیزہ ہیں اس کے سوا اور کوئی  
 نہیں ہے کہ یہ دونوں پاکیزگی نفاست اور خوش نمائی میں مشارکت رکھتے ہیں۔ واضح  
 ہو کہ ملک عرب صید انگنی کی جہت سے حسب مراد ملک نہیں ہے۔ یہاں کے جانور  
 صید صرف دو چار اقسام کے ہیں۔ وحوش ماکول اللحم جو اغراض صید سے متعلق ہیں  
 ۔ ہی گادان دشتی بز کو ہی اور دو تین اقسام کے آہو ہیں۔ سبائی جانور بھی تھوڑے  
 ہیں۔ پلنگ، وکفتار، گرگ سے قوی تر شکاری جانور اس ملک میں نہیں ہوتے۔  
 دنیا میں افریقہ سے بڑھ کر کوئی شکار کی جگہ نہیں ہے۔ اس سے اگر کوئی مرعہ جگہ ہے  
 تو ہندوستان ہے۔ جاننا چاہیے کہ ہر چند افریقہ میں وحوش ماکول اللحم کی وہ کثرت  
 ہے کہ روئے زمین پر کہیں نہیں ہے۔ تاہم لطف صید انگنی جو ہندوستان میں  
 اٹھتا ہے افریقہ کے کسی حصہ میں نہیں اٹھتا۔ بہر حال ملک عرب شکار کے اعتبار سے  
 نہ افریقہ نہ ہندوستان کے برابر ہے تاہم مذاق شکار سے اہل عرب حالی نہیں ہیں۔  
 بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہر ملک کے طبیعت دار با مذاق شجاعت شعار مردانہ مزاج  
 اشخاص کم و بیش ضرور اس کا مذاق رکھتے ہیں۔ اہل فرنگ تو اس زمانہ میں مذاق  
 شکار ایسا رکھتے ہیں کہ ہم ہندوستانیوں کے احاطہ فہم سے ان کے شکار دست  
 ہونے کا مضمون باہر ہے۔ سر سیمپل بیکر، سینڈرسن، بالڈون کیمبل، کنسلاک،  
 فایف کوکسن، اسٹرنڈیل، کیوٹنگ وغیرہم ایسے شکاری گذرے ہیں کہ جن سے باہر  
 با مذاق شکاری واقف ہے۔ ان ناموروں کے مذاق پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے  
 کہ یہ قول کہ شکار کار بیکار ان سست، واقعی ایک محض جاہلانہ قول ہے۔ ان شکاریوں



کی محنتوں نے بڑے بڑے مسائل علیہ کی تحقیق کی ہے۔ علم جغرافیہ، علم طبیعیات، علم حیوانات، علم نباتات، علم معدنیات، علم معاشرت، علم اخلاق، علم تمدن وغیرہ کو ان کی جاں فشانیوں سے بڑے بڑے نفع پہنچتے گئے ہیں۔ جو شخص حقیقت صید انگنی سے بے خبر ہے وہ کیا جان سکتا ہے کہ اغراض صید انگنی کیا ہیں۔ ناواقف تو یہی سمجھے گا کہ شکار انگنی کا مطلب یہ ہے کہ ہانڈی گرم ہو اگر صید انگنی یہی ہے تو چڑی ماری اور صید انگنی میں کیا فرق ہے۔ اور پھر سرسیمول بیکر اور معمولی پہلیے میں کیا امتیاز باقی رہتا ہے۔ شکار سے ہانڈی کا گرم ہونا تو معمولی بات ہے، ماکول اللحم کے شکار سے ہانڈی تو گرم ہوتی ہی ہے مگر مقاصد شکار کھانے پینے ہی تک محدود نہیں ہے۔ جو جانتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ صید انگنی کو انسان کے معاملات جسمانی اور روحانی سے کیا تعلق ہے۔ اور خود شاعری کو صید انگنی سے کیا مناسبت ہے۔ امرئ القیس کا مضمون شکار انگنی کو داخل تصیدہ اس کی فطرتی خوش مذاقی سے خبر دیتا ہے۔ واقعی یہ مضمون ایسا ہی بلند پایہ ہے کہ اعلا درجہ کی شاعریوں میں اس کو جگہ دی جائے۔ چنانچہ بڑے بڑے شعرائے عالم نے اپنی تصنیفوں کو مضمون صید انگنی سے زمینت دی ہے۔ مضمون صید انگنی کچھ ایسا ہی قابل لحاظ ہے کہ اس کو اتنے بڑے بڑے شعرائے جیسے ہومیرس، ورجل، افسروسی، سعدی، بابلیکی وغیرہم میں توجہ کے ساتھ داخل کلام فرماتے گئے ہیں۔ یہ تو قدیم ایام میں یہ مضمون قابل امتیاز سمجھا گیا ہے۔ اس ۱۹ویں صدی میں تو با مذاق اہل فرنگ نے اس کو کچھ ایسا توجہ طلب سمجھا ہے کہ اُسے ایک بڑے بکار آمد فن کا درجہ بخشا ہے۔ چنانچہ اس وقت مجرد زبان انگریزی میں فن صید انگنی میں اس قدر کتابیں تصنیف ہوئی ہیں کہ اگر ایک جامعہ کی جائیں تو ان سے ایک اچھا کتب خانہ درست ہو سکتا ہے۔

فَادُبُونْ كَالْجَزْعِ الْمَفْصَلِ بَيْنَهُ  
بَجِيدٌ مَعْقِرٌ فِي الْعَشِيرَةِ مَحْجُولٌ

معنی۔ پس ان گادان دشتی نے بیٹھ پھیری در حالیکہ وہ گاوان دشتی ایسے جیل بیہ ہائے یمنی کے ساتھ مشابہت رکھتے ہیں کہ جن کے دوبیسہ کے اندر دیگر جواہرات داخل کیے گئے ہوں۔ اور وہی جیل ایسے لڑکے کی گردن میں پڑا ہوا ہے۔ کہ خاندان میں عم و خال رکھتا ہو۔ یعنی جب گاوان دشتی نے شکاریوں کو دیکھا تو بیٹھ پھیری اور متفرق ہو کر نکل بھاگیں اور چونکہ ان گادان دشتی کے چاروں پاؤں اور منہ سیاہ ہوتے ہیں شاعر نے ان کو



بیسہ مہنی سے تشبیہ دی اور جب متفرق ہو گئیں تو ان کو ایسا جمیل مفصل کہا جو ایسے لڑکے کے گلے میں پڑا رہتا ہے جسے قبیلہ میں بہت عم و خال ہوتے ہیں۔ وہ جمیل گراں سا ہوتا ہے۔

واضح ہو کہ یہ گاوان دشتی ہندوستان کے نیل گاؤں سے ایک علاحدہ جانور ہیں جو پروردہ گاؤں میں ہندوستان کے بعض جنگلوں میں بھی یہ جانور دیکھے جاتے ہیں۔ اور جہاں پائے جاتے ہیں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ وسط ہندوستان کے پہاڑوں میں ایک جانور ہوتا ہے جسے گور کہتے ہیں اور اس کا انگریزی نام باتسن ہے۔ یہ جانور پروردہ گاؤں سے جسامت میں بہت بڑا ہوتا ہے۔ اور ہر چند پروردہ گاؤں سے مشابہت رکھتا ہے مگر درحقیقت پروردہ گاؤں سے ایک علاحدہ جانور ہے۔ گور کا شکار خوب ہوتا ہے مگر سوائے قوی رفل کے اس کا شکار ناممکن ہے۔ گھوڑے اور نیزہ یا تلوار سے کسی شکاری نے آج تک شکار نہیں کیا ہے۔

فَالْحَقُّ نَايَا الْهَادِيَاتِ دَدُونًا جَوَارِحُهَا فِي مَسْرَقٍ لَمْ تَزِيلْ

معنی۔ پس لاحق کر دیا اسپ مذکور نے ہم لوگوں کو جانوردان پیش رو کے ساتھ اور اس اسپ کے نزدیک تھے۔ پس ماندگان گروہ درحالیکہ وہ گروہ متفرق نہ ہوا تھا۔ یعنی اسپ مذکور نے بسبب تیز رفتاری کے فوراً پیش روان گروہ کو چھو لیا۔ اور جو پس ماندہ تھے اور ابھی تک منتشر نہ ہوئے تھے وہ کس شمار میں تھے۔ ان کا شکار کر لینا تو کچھ دشوار نہ تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ امرئ القیس کو پوری دانست فن صید انگنی میں تھی۔ اور صرف دانست نہ تھی بلکہ مذاق شکار انگنی بھی اچھا رکھتا تھا۔ اگر خوش مذاق نہ ہوتا تو اس خوبصورتی کے ساتھ شکار کے مضامین کو حوالہ قلم نہیں کر سکتا۔ اس طرح کے بیان کی امید ایک لاعلم ادا بد مذاق شاعر سے نہیں کی جاسکتی ہے۔ ان اشعار میں بڑا لطف شاعری موجود ہے۔ اس لیے کہ تمام کلام شاعر بد قریبہ مبالغہ پرداز اور غیر فطرتی طریقہ بیان سے معصوم ہے۔ اس حسن بیان کی توقع فارسی یا اردو کے شاعر سے تو ہو ہی نہیں سکتی ہے کس واسطے کہ ان زبانوں کے شعرا جب صید انگنی کے مضامین باندھیں گے تو ان کو بہرام و اسد و حمل و تسر و دیگرے سرود یا اور خیالی امور کے ذکر کیے بغیر چارہ نہیں معلوم ہوتا ہے چنانچہ شکار کی مثنویاں جو مدح آصف الدولہ وغیرہ میر و مرزا نے بھی لکھی ہیں غایت بے سرو پائی



سے خبر دیتی ہیں۔ مگر ان حضرات کی طرف سے یہ معذرت کی جاسکتی ہے کہ ایسی مثنویاں شاعری کی غرض سے نہیں لکھی گئی تھیں۔ ان سے والیان ملک کو خوش کرنا منظور تھا۔ ان اشعار امرئ القیس کو جب اہل واقفیت نظر انصاف سے ملاحظہ فرمائیں گے تو ان پر ہویدا ہوگا کہ شاعر کس قدر صید افگنی کا صحیح مذاق رکھتا تھا۔ حق یہ ہے کہ اس کا مذاق اس صدی کے مذاق کے قریب قریب پہنچتا ہے۔ اور واقعی بہت تعجب گذرتا ہے جب اس امر کا خیال ہوتا ہے۔ کہ ایسی خوش مذاقی چودہ سو برس پہلے ایک ایسی قوم میں تھی کہ جس کی تعلیم یافتگی کا درجہ بہت بلند نہ تھا۔ اور جس قوم کی شایستگی کو اس زمانہ کی شایستگی سے کوئی نسبت حاصل نہ تھی۔

فَنَادَى عِدَاءَ بَيْنِ تَوْرٍ وَ نَعَجَةٍ      دِرَاكًا وَلَهُ يَنْضَحُ بِمَاءٍ فَيَغْسِلُ

معنی۔ پس اس پ مذکور نے ایک دوڑ میں دو صید کو یعنی ایک نر اور ایک مادہ کو پیالے شکار کر لیا۔ اور اس تیزی پر بھی وہ اس کا خوگر نہ ہوا کہ اس کا بدن پانی سے دھویا جائے۔ ظاہر ہے کہ دو گاؤں دشمنی یعنی ایک نر اور ایک مادہ کو پیالے وہی گھوڑا شکار کر سکے گا کہ جو نہایت تیز رفتار ہوگا۔ پھر شاعر اس کی جفاکشی کی تعریف کرتا ہے۔ کہ ایسی دوڑ کے بعد بھی اُسے اس کی حاجت نہیں ہوئی کہ دھویا جائے۔ اور اس راحت کرے۔ واضح ہو کہ اس شعر سے بھی ہر پہلو کی خوش مذاقی عیاں ہے۔ شاعر نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ اپنی شہسواری اور صید افگنی اور گھوڑے کی تیز رفتاری اور جفاکشی کے مضامین حوالہ قلم کیا ہے۔ اس صدی میں فن صید افگنی درجہ کمال کو پہنچ گیا۔ اگر نامی سے نامی شکاری گھوڑے سے شکار گوزن یا سور کا کرے گا تو ممکن نہیں ہے کہ اس سے زیادہ صید افگنی کا لطف دکھلا سکے۔

فَقَطَّلَ طُهَاءَ اللَّحْمِ مِنْ بَيْنِ مُنْفِجٍ      صَفِيفَ شِدَاءٍ أَوْ قَدِيرٍ مُعْتَدٍ

معنی۔ پس گوشت پکانے والے دو قسم کے ہو گئے۔ ایک وہ جنہوں نے کھنکھ میں گوشت کو کباب کیا۔ اور دوسرے وہ جنہوں نے گوشت کو دیگ میں ڈال کر دیگ دان پر پختہ کیا۔ یعنی جب بطرز بالا جانور شکار ہوتے گئے تو کچھ گوشت کا کباب اور کچھ گوشت ہانڈی میں پکا۔

واضح ہو کہ شاعر نے اس شعر کو اس غرض سے کہا ہے کہ جو جانور شکار ہوئے تھے

وہ ماکول اللحم تھے۔ اگر شیر پلنگ خرس وغیرہ کی طرح غیر ماکول اللحم ہوتے تو ظاہر ہے کہ ان کے گوشت مصرف میں نہیں لائے جاتے۔ اکثر ایسے شکاری جانوروں کی کھالیں یا ناخون وغیرہ بمنظر یادگار لے لیتے ہیں۔ کھالوں کا مصرف زیادہ ہی ہوتا ہے کہ کمروں میں بچھلتے ہیں اور ناخون سے زیور بناتے ہیں۔ لیکن ایسے سبائی جانور ملک عرب میں کم تر ہیں۔ شیر خرس تو ندارد ہیں۔ صرف چھوٹے قسم کا پلنگ صحراؤں میں پایا جاتا ہے۔ اگر کاش شیر و ببر و خرس یا ہاتھی گینڈا رنا گوردہاں ملک ہندوستان کی طرح ہوتے تو امرنی القیس ضمن صید انگلی میں ان جانوروں کا ذکر کسی نہ کسی پہلو سے کرتا۔ بہر حال اس نے ایک ایسے جانور کے شکار کا بیان اختیار کیا ہے جو عظیم پیکر تیز رفتار پاکیزہ انداز ملک عرب کے تمام جانوران صحرائیں ہوتا ہے۔ اس تجویز سے بھی اس کی خوش مذاقی عیاں ہے۔ جاننا چاہیے کہ گوشت صید کے پکائے جانے کا بیان بھی خالی از سبب نہیں ہے جو حضرات شکار دوست نہیں ہیں وہ پورے طور پر نہیں سمجھ سکتے ہیں کہ شکار کے گوشت میں کیا لذت ہوتی ہے۔ وہ حضرات اس کے لطف کے لذت کو کیا جانیں جو گھر میں بیٹھے ہوئے طرح طرح کے گوشت پکوا کر نوش فرمایا کرتے ہیں۔ ایسے حضرات کو شکاری کی بھوک کہاں نصیب ہوتی ہے۔ جو شکاری کی لذت یا بی کا اندازہ کر سکیں۔

وَرَحْنًا يَكَادُ الظُّفُ يُقَصِّرُ دُونَهُ مَتَى مَا تَرَقَّى الْعَيْنُ فِيهِ تَسْبَلُ

معنی۔ اور ہم لوگ شکار سے شب ہی کو واپس آئے۔ درحالیکہ قریب تھی آنکھیں کہ اسپ مذکور کے روبرو اس کے حسن کے دقائق کے معائنہ سے عاجز آئیں اور آنکھیں جب اس کے تن بالا کی طرف دیکھتی تھیں تو اس کی غایت صفا کے باعث اس کے تن زیریں کی طرف پھسل جاتی ہیں۔

شاعر یہاں دکھلاتا ہے کہ اسپ مذکور تیز رفتاری کے ساتھ شکار کرتا رہا۔ اس پر بھی اس کا دم خم ایسا رہا کہ شکار گاہ رات ہی کو سوار کے زیرِ ران رہ کر گھر واپس آسکا۔ دوسرا گھوڑا بعد صید انگلی کے تھک جاتا اور اس قابل نہیں رہتا کہ شب کو اسی مستعدی کے ساتھ شکار گاہ سے منزل مار کر گھر واپس آسکا۔ پس ایسے گھوڑے کے دقائق جس پر نگاہ کرنے سے آنکھیں اگر اظہارِ عجز کر سکیں تو بہت بجا ہے۔ یعنی اس کی بسیاری حسن



احاطہ نظر میں نہیں آ سکتی۔ اس واسطے آنکھ خیرگی کرنے لگتی ہے۔ ہ  
 دامان نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار گلچیں بہار تو زو امان گلہ دارد  
 مصرع ثانی میں اسپ مذکور کی صفائی و تابانی بدن کا بیان ہے کہ اس کی غایت  
 صفا و تابانی سے نظر اس کے بدن سے پھیل جاتی ہے۔ یعنی اس کے بدن پر نظر نہیں  
 ٹھہرتی۔ یہ تعریف ایسے درجہ مبالغہ کو نہیں پہنچتی ہے کہ بے لطف معلوم ہو۔ اس  
 تعریف میں فطرتی پہلو نہیں جاتا رہا ہے۔ بلکہ یہ تعریف ایسی ہے کہ واقعی خارج  
 میں ایک صاف اور تابان جسم کے گھوڑے پر صادق آتی ہے۔

فَبَاتَ عَلَيْهِ سَرَجُهُ فَلَجَامُهُ دَبَاتَ بَعِيْنِي فَأَيُّمَا غِيُوَ مَوْسَلٍ  
 معنی۔ پس رات گزاری اسپ مذکور پر اس کے زین و لگام نے اور رات گزاری  
 اس اسپ نے میری آنکھوں کے سامنے درحالیکہ استادہ اور بغیر چراگاہ کیے  
 ہوئے۔ یعنی جب اسپ مذکور شکار گاہ سے واپس آیا تو جیسا کہ کسا کیا تھا اسی  
 طرح پر شب بھر رہا اور میری رو برو استادہ رہ کر شب بسر کی اور چراگاہ  
 کی طرف بھی نہیں بھیجا گیا کہ چری کرے۔

اس قصیدہ کی شرح دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مراد شاعر یہ ہے کہ اسپ  
 مذکور ہر شب میرے رو برو استادہ رہتا ہے پس ایسی صورت میں زین و لگام بھی  
 دیا رہتا ہوگا۔ شاید اس طرح سے کسا کیا اس واسطے رکھا جاتا ہوگا کہ ہمیشہ غنیم  
 کا خوف لاحق رہتا ہوگا۔ مگر راقم کو سلسلہ بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کیفیت  
 شکار سے واپس آنے کی شاعر نے حوالہ قلم کی ہے۔ بہر حال ہر پہلو سے اس کی  
 جفاکشی کی تعریف ظاہر ہوتی ہے۔ واضح ہو کہ شاعر نے اٹھارہ اشعار بالا میں  
 گھوڑے کے اوصاف بیان کیے ہیں اور بیان اوصاف میں صید انگلی کے مضامین  
 کو بھی رقم کیا ہے۔ اس کے بعد اشعار ذیل میں سلسلہ اوصاف اسپ کو قطع کر کے  
 برق و باران کا ذکر کرتا ہے۔ قبل اس کے کہ اس بیان تازہ کی طرف حضرات ناظرین  
 کی طرف توجہ کی خواستگاری کی جائے۔ راقم ذیل میں کچھ خیالات خاص گھوڑے  
 اور صید انگلی کے بارے میں عرض کیا چاہتا ہے۔ واضح ہو کہ اس قصیدے میں  
 امرئ القیس نے جو مضامین باندھے ہیں۔ ایسے ہیں کہ ہر ملک کی شاعری میں ان کو

پایہ امتیاز حاصل ہے۔ صحبت اے گزشتہ کی مسرت ہمدموں کی تشفی دہی مفارقت کے صدمے معشوقوں کی محبت معاملات عشقیہ کی کیفیتیں، سیرچشمی، دلیری، مردمی، فیاضی، فروتنی کی خوبیاں اور اس قبیل کی اور بہت سی باتیں جو اس قصیدے میں جگہ پاتی گئی ہیں ہر ملک کے اعلا درجہ کی شاعری میں دخل رکھتی ہیں۔ انہیں اقسام مضامین سے گھوڑے کی شناخت گھوڑے کی قدر دانی اور گھوڑے کی سواری بھی اور اسی پر مضمون صید انگلی کو بھی قیاس کرنا چاہیے۔ اگر شہ سواری اور صید انگلی کے مضامین بلند پایگی نہ رکھتے تو ہر ملک کے شعرا ایک زبان ہو کر اس کی خوبیوں سے اعتراف نہ رکھتے اور امری القیس اتنے اشعار ایک قصیدہ میں صرف گھوڑے اور شکار کے بیان میں نہ لکھتا۔ لیکن چونکہ گھوڑے اور شکار کے مضامین ایک خاص پایہ بلند رکھتے ہیں۔ ان اشعار نے نہ صرف امری القیس کے قصیدے کے حسن کو افزا کر دیا ہے بلکہ اس کی خوبی طبیعت اور خوبی مذاق کو بین طور پر ظاہر کر دکھایا ہے۔ مختلف ملکوں کے شعرا اور مصنفین کے کلاموں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گھوڑے اور شکار کا شوق بڑی عالی مذاقی سے خبر دیتا ہے۔ اگر ایسی بات نہ ہوتی تو طبیعت داران یورپ کیوں گھوڑے اور شکار کا شوق رکھتے اور ہم ہندی مسلمانوں کے ولایتی آباد اجداد اہل یورپ کو ایسی ایسی عالی مذاقیوں کی کیوں کر راہ بتلاتے یہ بات بدیہی ہے کہ جب کوئی قوم برسر اقبال ہوتی ہے تو اسے گھوڑے کا شوق ہوتا ہے۔ وہ خوب گھوڑے پہچانتی ہے۔ خوب گھوڑے پر چڑھتی ہے۔ خوب چوگان کھیلتی ہے۔ خوب نیزے لگاتی ہے اور اسی طرح گھوڑے کی پیٹھ سے سپہ گری کے سب کام لیتی ہے۔ اسی طرح خوب شکار کھیلتی ہے اور صید انگلی کے مذاق صحیح سے خبر رکھتی ہے۔ بخلاف اس کے جب کوئی قوم مبتلائے ادبار ہوتی ہے تو ایون کھاتی ہے۔ چاند و پیتی ہے۔ بیڑ لڑاتی ہے اور اسی طرح جتنے نامردی کے کام میں کرتی ہے۔ بہر حال گھوڑا اور شکار یہ دو ایسے مضمون ہیں کہ نہایت توجہ طلب ہیں اور ان کے بیان میں جس قدر تحریر کو طول دیا جائے بعید از لطف نہیں ہے۔ مگر افسوس کہ راقم کو اس کتاب میں شرح و بسط کے ساتھ ان دونوں مضمون کو حوالہ قلم کرنے کا موقع نہیں ہے۔ اس لیے ذیل میں اختصار پر قناعت کرتا ہے۔



واضح ہو کہ خدائے تعالیٰ نے گھوڑے کو تمام جانوروں سے اشرف بنایا ہے۔ دنیا میں آدمی کے بعد اس جانور کا درجہ ہے۔ اس کی خوبیوں کی کوئی حد نہیں معلوم ہوتی ہے۔ جس قدر اس کی تعریف کی جائے بجا و درست ہے۔ چونکہ انسان کے بعد ردائے زمین پر اسی جانور کو اشرف حاصل ہے اس لیے یہ جانور انسان کے معاملات نیک و بد کا ہمیشہ شریک رہا ہے۔ اس کی تداومت سرکار بنی آدم میں ہر طرح پر ثابت ہے۔ اس کے سوا کوئی دوسرا جانور نہیں ہے جس سے اغراض انسانی کو اس قدر تعلق رہا ہو۔ ہر چند کتابت بہت بکار آمد جانور ہے اور اس میں ہزاروں خوبیاں ہیں مگر گھوڑے کی خوبیوں کو نہیں پہنچتا۔ کتا پھر کتا ہے کتا کسی زمانہ میں انسان کے امور ملکی مالی یا مذہبی سے بسبیل ضرورت متعلق نہیں رہا ہے۔ جتنی بڑی بڑی لشکر کشیاں چہ از بہر دنیا د چہ از بہر دین ظہور میں آئی گئی ہیں ان میں کتے کا کسی طرح کا دخل نہیں رہا ہے۔ برخلاف اس کے گھوڑے کے معاملہ کو سمجھنا چاہیے کہ امور دنیا و دین میں اس کی شرکت ہمیشہ رہا کی ہے۔ اور تا بقائے دنیا قائم رہے گی۔ انسان کی رغبت گھوڑے کی طرف ایک امر طبعی ہے۔ عدم رغبت نقص انسانیت سے خبر دیتی ہے۔ اسی شخص کو اس جانور سے عدم میلان ہوگا کہ جس کے قوائے اخلاقیہ خراب ہو گئے ہوں گے۔ خاص کر قوت شجاعت ضعف لاحق ہو گیا ہوگا ورنہ خوش اخلاقی قوم یا خوش اخلاق فرد انسان کو اس کی رغبت سے چارہ نہیں ہے۔ جتنی اولوالعزم قومیں دنیا میں گزری ہیں یا آج بھی موجود ہیں گھوڑے کی قدردانی سے خالی نہیں دیکھی جاتی ہیں۔ لاریب گھوڑے کی طرف میلان کا ہونا دلیل شجاعت ہے۔ اور شجاعت بہت سی خوبیوں کی جڑ ہے۔ بے شجاعت انسان انسان نہیں ہو سکتا۔ اس صفت کے نقصان سے انسان بے کار پُر فریب دغا باز اور بے حیا ہوتا ہے۔ پس جب اس قدر صفات ذمیرہ کا مجمع کوئی شخص ہوا تو پھر اس کے درجہ انسانیت سے گزر جانے میں کیا گفتگو ہو سکتی ہے۔ بالمشعر گھوڑے رغبت عمدگی طبیعت سے خبر دیتی ہے اور واقعی گھوڑا ایسا مخلوق خداوندی ہے کہ کوئی ایسا کم بخت ہوگا جو اس کا شیدانہ ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ جتنے بڑے لوگ گزرے ہیں اس کے چاہنے والے تھے اور جو اس وقت ہیں اس کے چاہنے والے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی بزرگی اس کی قدردانی کی مقتضی ہے اور اس کی خوبیاں کچھ ایسے



درجہ کی ہیں کہ خدا و نبی و وحی نے بھی ان پر اپنی چشم توجہ ڈالی ہے۔ بقول سعادت یار  
خال رنگین غفر اللہ ذنوبہ سے

تویرٹھ والعدایات آنکھیں نہ بند کر خدا نے کھائی ہے گھوڑے کی سوگند  
بہت چاہا ہے اس کو مصطفیٰ نے بہت مانا ہے اس کو مرتضیٰ نے  
یوں تو دنیا کی تمام ممتاز قومیں گھوڑے کی قدر داں ہیں۔ اور کوئی ایسی سلطنت  
نہیں ہے جہاں گھوڑا عزیز نہیں سمجھا جاتا ہے۔ مگر گھوڑے کی قدر و منزلت جس قدر  
اہل عرب کرتے ہیں روئے زمین پر کوئی قوم نہیں کرتی۔ اہل عرب گھوڑے کو زین و فرزند  
کے مثل عزیز رکھتے ہیں اور زن و فرزند کی طرح ان کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں۔  
اہل عرب جس خیمہ میں خود رہتے ہیں اس میں ان کے لڑکے اور بالے اور گھوڑے بھی  
رہتے ہیں۔ ان کے چھوٹے چھوٹے بچے گھوڑوں کے گرد و پیش بے خوف سوتے ہیں  
اور کبھی کسی طرح کا صدمہ نہیں اٹھاتے۔ ان کے گھوڑوں کی شایستگی انسان کی شایستگی  
سے کبھی کم نہیں ہوتی بلکہ عوام بنی آدم سے ان کی شایستگی زیادہ بھروسہ کرنے کے قابل  
ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عرب کے گھوڑے ایسے ہی ہوتے ہیں کہ جو کچھ ان کی قدر و  
منزلت کی جائے بجا ہے اور شک نہیں کہ دنیا میں اہل عرب سے زیادہ چاہنے والی  
قوم بھی کوئی نہیں ہے۔ راقم مثلاً ایک قصہ عرض کرتا ہے۔ جو تاریخی پایہ اعتبار رکھتا  
ہے۔ اور وہ یہ کہ ایک فرانسیسی جنرل نے ساحل عرب سے اپنے آقا شہنشاہ فرانس کو  
خبر دی کہ ایک نہایت مفلوک الحال عرب ہے جس کے پاس ایک عمدہ گھوڑا ہے۔  
عجب نہیں کہ غایت افلاس کے باعث اس کا مالک اسے فروخت کرے۔ شہنشاہ  
نے حکم بھیجا کہ جس قیمت کو وہ گھوڑا ہاتھ آئے خرید کر دے۔ چونکہ وہ عرب گھوڑا کے  
بیچنے پر راضی ہو چکا تھا جنرل نے اسے خبر دی کہ قیمت موجود ہے آؤ اور معاہدہ کی  
تعمیل کرو اس خبر کو پا کر وہ عرب اسی گھوڑے پر سوار جنرل کے رد برد آیا۔ جنرل نے  
قیمت کی اشرفیوں کے توڑے قبل سے اس کے لالچ کے بڑھانے کی نظر سے کھلوا  
رکھے تھے۔ اس نے پہلے ایک نظر ان اشرفیوں کو دیکھا اور پھر اپنے افلاس پر بھی  
خیال کو دوڑایا۔ مگر اسی کے ساتھ ہی اپنے گھوڑے کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ  
میں ہر چند افلاس زدہ ہوں مگر کیا تجھ سے مفارقت گوارا کر سکوں گا۔ تو میرے گھر



کی زینت ہے تجھے زہار کسی اہل فرنگ کہ نہ دے ڈالوں گا۔ یہ لوگ تجھے کھنٹے لگائیں گے اور چابک ماریں گے۔ میں ہرگز تیرے حق میں ایسی بے رحمی کا سبب نہ ہوں گا۔ یہ کہہ کر وہ فوراً آنکھوں سے غائب ہو گیا اور جبریل صاحب کی اشرفیوں کا ڈھیر وہاں پڑا کا پڑا رہ گیا۔ کیوں نہ ہو اسے گھوڑے کی قدر دانی کہتے ہیں۔ اس کو ہمارے ملک کے ان شائقوں کی ترکیبوں سے مقابلہ کیجیے جو سود و سود و پیہ کے نفع کو ملحوظ رکھ کر رخسار ستم بھی ہو تو فروخت کر ڈالیں اور امر واقعی یہ ہے کہ ہم ہندی وطن مسلمان کیا جانیں کہ گھوڑے کی خوبیاں اور محبوبیاں کیا ہیں۔ نہ اس ملک میں ملک عرب کے ایسے گھوڑے ہیں اور نہ ہم لوگوں کو اہل عرب کا مذاق میسر ہے۔ انصاف یہی ہے کہ امرنی القیس کی شناخت انیاں جو گھوڑے کے مادے میں مندرج قصیدہ ہیں کچھ ایسی ہیں کہ ہم ہندیوں کو ان خیالات کے ساتھ مانوس ہونا دشوار ہے اور دشواری کا سبب یہی ہے کہ اس ملک میں وہ اسباب موجود نہیں ہیں جو ان خیالات کے ساتھ ہمارے دماغ کو مانوس کر سکیں۔ خیر یہ امر بدیہی ہے۔ ہندوستان میں نہ ہم لوگ امرنی القیس کے گھوڑے کو پاسکتے ہیں اور نہ امرنی القیس کی طرح شہسواری کا لطف دکھلا سکتے ہیں۔ اس پر بھی اگر ہم لوگ کسی قابل الوجودی کو ترک کریں تو کچھ نہ کچھ سواری زمین سے لطف اٹھا سکتے ہیں۔ ہندوستان میں سور کا شکار بھی ایسا ہوتا ہے کہ شاید دباہد۔ فیر کو ذاتی تجربہ اس کا کافی طور پر حاصل ہے اور فی الواقع یہ شکار نہایت قابل توجہ ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ہم ہندیوں میں ہزار متاز اشخاص سے ایک شخص ایسے نہیں نکلیں گے جو عمر بھر میں ایک بار بھی بقصد شکار سواری زمین ہوتے ہوں گے۔ خیر سور کا شکار تو ایک دشوار امر ہے۔ اب تو شام و صبح کی سواری اس پر بھی معدوم صورت ہوتی جاتی ہے۔ اس وقت کا مذاق تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ بروٹش اور لینڈ ویں سواری ہو کر نہایت آرام سے خراٹے لیں اور کاہل وجودی کی داد دیں۔ اس مذاق کو امرنی القیس کے مذاق سے ملائیے تو سمجھ میں آئے کہ ہمارے ملک کے شائقین کا مذاق کس قسم کا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو شخص سواری زمین سے متمتع نہ ہو اس نے کوئی لطف گھوڑے کا نہ اٹھایا۔ گھوڑا جو ٹم ٹم فٹن بروٹش وغیرہ میں کام دیتا ہے پھر وہ گھوڑا نہیں رہتا۔ اگر کسی کو گھوڑے کا



سچا شوق ہے تو لازم ہے کہ اہل عرب کا مذاق پیدا کرے۔ اہل انگلستان جو اس زمانہ میں ہمارے حاکم ہیں اچھا مذاق رکھتے ہیں۔ ہر چند گھوڑے کو گاڑیوں میں جوتے ہیں۔ مگر اس سے زمین کا کام بھی نہایت مذاق کے ساتھ لیتے ہیں۔ فوجی کاروائیوں کے علاوہ نیزہ لگاتے ہیں۔ شکار کرتے ہیں۔ پولو کھیلتے ہیں۔ ددڑ میں شرطیں لگاتے ہیں۔ ٹی ٹی کرپاتے ہیں اور ان خاص کاموں کے سوا صبح و شام ہوا خوری کرتے ہیں۔ ہمارے ہم وطن جن کو خدا نے قدرت دی ہے باوجود حاصل رہنے شباب کے بھی ان کاموں سے کوئی کام نہیں کرتے۔ بھولے چو کے اگر طبیعت گھبرائی تو بیلوں کی تسنگی کی طرح لدے ہوئے میل دو میل سے کسی قسم کی گاڑی پر گھوم آئے اگر اسی کا نام گھوڑے کا شوق ہے تو ہو مگر ایسے شوق کا ماحصل سوائے خود نمائی کے اور کچھ نہیں ہے ایسے شوق سے نفع جسمانی یا روحانی کا مترتب ہونا بعید از قیاس ہے۔ حالانکہ سواری اسپ ایک ایسی شے ہے کہ جس سے جسمانی اور بھی روحانی فائدہ حاصل ہونا عند التجربہ یہ ثابت ہے۔ دنیا میں کوئی ایسی ریاضت نہیں ہے جو سواری اسپ کی برابری کر سکے۔ ریاضتوں سے قابل لحاظ ریاضت مشی ہے۔ اسی طرح ڈنٹر موگدر بھی ہیں۔ مگر ان کے منافع سواری اسپ کے منافع کے برابر زہار نہیں ہیں۔ مشی سے خاص فائدہ اعضائے اسفل کو ہوتا ہے اور کوئی شک نہیں کہ مشی معدہ کو بھی بہت مفید ہے۔ مگر سواری اسپ سے نہ صرف اعضائے اسفل اور معدہ کو فائدہ ہوتا ہے۔ بلکہ تمام اجزائے بدن شریک ریاضت رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ معدہ کو جو سواری اسپ سے فائدہ ہوتا ہے وہ فائدہ مشی سے نہیں ہوتا۔ یہ تو جسمانی ریاضت اور اس کے منافع کا پہلو ہے۔ اب دیکھیے کہ سواری اسپ سے روحانی فوائد کیا ہوتے ہیں۔ دنیا میں کوئی ریاضت ایسی نہیں ہے کہ سواری اسپ کے برابر انشراح روحی پیدا کر سکے۔ پشت زمین پر صاف ممیز ہوتا ہے کہ روح ترقی کرتی ہے۔ دماغی قوت افزوں ہوتی ہے۔ ذہن جو دت پیدا کرتا ہے۔ مردانگی بڑھتی ہے۔ ہمت عالی ہوتی ہے۔ یہ باتیں مشی ڈنٹر موگدر میں کہاں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سلطان کو تخت پر بھی وہ لطف حاصل نہیں ہوتا ہے کہ سوار کو



بلکہ حق یہ ہے کہ تمام عیش جسمانی و روحانی کی ترقی کا وسیلہ زمین سواری ہے اور کیوں نہ ہو جب نظام جسم و قوائے فاعلیہ و انفعالیہ اور اخلاقیہ پر ایک اثر خاص سواری اسپ پیدا کرتی ہے۔ راقم نے مشی سے زمین سواری کو النفع ہونے کی وجہ عند التجربہ یہ بھی پائی ہے کہ ریاضت سواری اسپ جب تک انسان کرتا ہے۔ اسے مشی کے اعتبار سے صاف تر ہوائے مستشق نصیب ہوا کرتی ہے۔ علاوہ اس کے بدن میں گھوڑے کے بدن سے مادہ برقی منتقل ہوا کرتا ہے۔ جو اس کی حرارت عزیز کی کو بڑھاتا ہے۔ اور یہ انتقال مادہ اس کے بردنی اور درونی دونوں ترکیبوں کو نفع عظیم بخشتا ہے۔ المخضر سواری اسپ نہایت بکار آمد شے ہے۔ ہزار حیف کہ وہ لوگ جو اپنے کو اس سے متمتع کر سکتے ہیں اس نعمت سے اپنے کو محروم رکھتے ہیں اور اسی محرومی سے انواع و اقسام کے ضرر جسمانی و روحانی اٹھاتے ہیں۔ بہت جائے تعجب ہے کہ ہماری قوم ایک وقت میں گھوڑے کا نہایت مذاق صحیح رکھتی تھی جیسا کہ متبنی نے کہا ہے۔

الَّيْلُ وَالْجَيْلُ وَالصَّحْرَاءُ تَعْرِفِي السَّيْفُ وَالصَّيْفُ وَالْقِرَاطُ وَالْقَلَمُ  
مگر و امصیبتا کہ گھوڑے کے مذاق صحیح کے جانے کے ساتھ اور بھی ہماری صفیتیں جو  
شعرا لالیں مذکور ہیں رخصت ہو گئیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

دوسرا امر جو توجہ طلب ہے مذاق شکار انگنی ہے یہ مذاق سواری اسپ سے ملتا جلتا ہے۔ بلکہ بعض حالتوں میں شکل مشترک پیدا کرتا ہے۔ کس واسطے کہ بعض قسم شکار کی ایسی ہے کہ جس کا تمام تر مدار شہ سواری پر ہے۔

واقع ہو کہ بیشتر عوام شکار انگنی کو بیکاری کا شغل جانتی ہے اور اپنے اس خیال کی تائید میں اس بے معنی مقولہ کو کہ ”شکار کار بیکاران ست“۔ دلیل گردانتے ہیں بعضوں نے شکار انگنی کا مطلب اس قدر سمجھا ہے کہ ہانڈی اس کے ذریعہ سے بھرتی ہے۔ لیکن راقم کی آئندہ تحریروں سے معلوم ہوگا کہ علاوہ اس کے صید انگنی صحت مندی کا ایک معقول ذریعہ ہے۔ اس کے انجام کی صلاحیت صرف محصل اشخاص کو ہے۔ بیکار آدمی شکاری ہو ہی نہیں سکتا۔ شکاری وہی ہو سکتا ہے جس کا دماغ حکیمانہ واقع ہوا ہے یا جس کی طبیعت شاعرانہ انداز رکھتی ہے۔ ممکن نہیں کہ ایسا آدمی جو علوم مختلف سے اطلاع نہیں رکھتا ہے جفا کشی کا عادی نہیں ہے۔ فطرت اللہ سے بے خبر



ہے۔ دفتر عالم کے مضامین پر نظر ڈالنے سے مجبور ہے اور صنایع آفرید گاہ کے ملاحظہ سے لذت روحانی حاصل نہیں کر سکتا ہے۔ شکار دوست ہو یا شکار انگنی کا مذاق صحیح رکھے۔ ظاہر ہے کہ ایسے آدمی کو جس میں یہ باتیں حاصل ہوں کوئی ذی فہم بیکار نہیں کہے گا اگر ایسا شخص بے کار سمجھا جائے تو دنیا کے تمام حکما و شعرا بیکار سمجھے جانے کے مستحق ہوں گے۔ پس یہ خیال کہ شکار بے کاروں کا کام ہے ایک محض بے خیالی ہے۔ البتہ یہ خیال اس وقت صحیح ہوگا جب صید انگنی کا شغل ایسا شخص اختیار کرے جو حکیمانہ یا شاعرانہ دماغ نہیں رکھتا ہے۔ اور غایت بے مادگی کے باعث لفظ بیکار کا مصداق ہو رہا ہے۔ اسی طرح پر جن لوگوں نے صید انگنی کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ اس سے ہانڈی کا بھرنا مراد ہے وہ بھی عامیانہ خیال کے لوگ ہیں۔ ہانڈی کا بھرنا شکار کی علت غائیہ نہیں ہے۔ البتہ جب کوئی صید ماکول اللحم ہاتھ لگتا ہے تو اس کا گوشت مصرف انسانی میں در آتا ہے۔ لیکن صید انگنی سے مجرد شکم پُری مقصود نہیں ہے۔ جیسا کہ آئندہ ظاہر ہوگا۔

واضح ہو کہ صید انگنی کا مذاق صحیح اس وقت انسان کو حاصل ہوتا ہے جب انسان علوم مختلفہ سے بہرہ کافی حاصل کر لیتا ہے۔ صید انگنی کے لیے بہت سے علوم کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس زمانہ میں یہ فن ایسے درجہ کو پہنچ گیا ہے کہ اس کا شوق اسی کو زیبا ہے کہ جو سر سیمول بیکر اینڈرسن اسٹرنڈل وغیرہ کی تعلیم یافتگی کا آدمی ہے۔ اس فن سے بہت علوم متعلق نظر آئے ہیں۔ حق یہ ہے کہ جاہل اس کام کو نہیں کر سکتا۔ وہ اس کا شائق بن کر جڑ مار یا قصاب ہو جائے گا۔ شکاری ہونے کے واسطے فطرتی اور کسی قابلیتوں کا حاصل رہنا ضروریات سے ہے یعنی ضرور ہے کہ شائق شکار فطرت کی رو سے شجاع ذہین حاضر طبیعت، خوش مزاج جفاکش صحرایہ، آزادہ دل اور سادہ دروں ہو اس کے ساتھ کامل درجہ کی صحت رکھتا ہو اور تمام اعضائے بدن اس کے نقصانات جسمانی سے پاک ہوں۔ اور محنت شاقہ کی برداشت کی صلاحیت رکھتے ہوں اختلاف آب و ہوا سے اس کا مزاج درجہ اعتدال سے نہ گزرتا ہو۔ طبیعت عیش پسند واقع نہ ہوئی ہو۔ علاوہ ان صفات کے اسے بردبار، رحیم، متمحل، سیر چشم، مہمان نواز، خلیق، بے تکلف اور دوست پرست



ہونا چاہیے۔ ان طبعی اوصاف کے ساتھ اسے علوم قدیمہ اور جدیدہ سے پورے طور پر باخبر ہونا چاہیے۔ بدانت راقم اسے علم مناظر علم ہوا، علم آب، علم نور، علم برق، علم تشریح، علم حرکت، علم کیمسٹری، علم معدنیات، علم نباتات، علم حیوانات، علم جغرافیہ، علم سیر، علم تاریخ، علم اخلاق، علم ادب، علم محبس علم جرثقیل، علم ریاضی، علم فلکیات سے واقف رہنے کی بڑی ضرورت ہے۔ لاریب ایسا شکاری جو فطرتی اور کبھی قابلیتوں سے بوضع بالا بہرہ مند ہو اس کو حقا دعوا برابری سرسمول بیکر اور ان کے سے نام برآوردہ اشما کے ساتھ حاصل ہے۔ جاننا چاہیے کہ سرسمول بیکر ایک بڑے درجہ کے شکاری تھے خدا نے ان کو جمیع صفات سے جن کا ذکر بالا میں آیا ہے۔ متصف فرمایا تھا۔ یوں تو ان کی سیاحت نے انسان کے احاطہ معلومات کو نفع عظیم بخشا مگر علم جغرافیہ ان کی جانفشانیوں کا بہت نمونہ ہے۔ سرسمول نے دریائے نیل کی تحقیق میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا اور جو کام قیصر روم سابق نہ کر سکا تھا اور کام میں محمد علی پاشائے مصر کو ناکامیابی مترتب ہوتی تھی اس کا انجام سرسمول کے ہاتھ سے ظہور میں آیا۔ سرسمول کی تصنیفات بہت ہیں اور سب کے سب پڑھنے کے قابل ہیں ایسے مصنفوں کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ صید افگنی سوائے عالم کے جاہل کا کام نہیں ہو سکتا۔ راقم کو دم تحریر یہ خطرہ ہو رہا ہے کہ عوام الناس فقیر کی ان تحریروں کو مبذوب کی بڑ سمجھیں گے کس واسطے کہ شکار کا مفہوم ناواقفوں کے دماغ میں محض غلط طور پر واقع ہے۔ انہیں اس کی مطلق خبر نہیں ہے کہ اس صدی میں صید افگنی کوئی ایسی شے ہو گئی ہے کہ بے افراط علم انجام نہیں پاسکتی اس غرض سے راقم کچھ مثالیں ضرورتِ علوم کی ذیل میں عرض کرتا ہے۔

مثال اول :- فیر کے وقت جب نال کے اندر بارود مشتعل ہوتی ہے تو اس میں گاس پیدا ہوتی ہے۔ اس گاس کے پیدا ہونے کی خبر اسی کو ہو سکتی ہے جو علم کیمسٹری سے واقف ہے۔ علم کیمسٹری کو کوئی شخص بغیر اور علوم کے جانے ہوئے نہیں سیکھ سکتا علم حساب اور علم جبر مقابلہ کی دانست کے بغیر علم کیمسٹری کا جاننا ناممکن ہے۔

مثال دوم :- جب گولی گاس کے ذریعہ سے متحرک ہوتی ہے تو کے قسم کی حرکتیں اس کو لاحق ہوتی ہیں۔ اس کو بغیر علم حرکت کے دانست کے کوئی شخص نہیں بتا

سکتا ہے۔ پھر جب گولی کروی ہوتی ہے تو اس کی حرکت مخروطی گولی کی حرکت سے کیا فرق پیدا کرتی ہے۔

مثال سوم :- جب نال سے گولی نکل کر فضا میں ہوا میں رواں ہوتی ہے تو اس کی راہ قوسی ہوتی ہے۔ کیوں راہ قوسی ہوتی ہے بغیر عالم ریاضی ہونے کوئی اس کا سبب نہیں بتلا سکتا۔ اس کے سبب کو جاننے کے لیے زمین کی کشش مرکزی سے بھی باخبر ہونا ضرور ہے۔

مثال چہارم :- معمولی بندوقوں میں ایک دید بان ہوتا ہے۔ جسے عوام مکھی کہتے ہیں اور رفل کی نال کے آخر حصہ کے قریب کبھی دو کبھی تین کبھی چار دید بان کس غرض سے بنائے جاتے ہیں۔ بے علم مناظر سے اطلاع رکھے کوئی شخص اس کا جواب نہیں دے سکتا۔ علم مناظر سے مطلع رہنے کے لیے ضرور ہے کہ انسان آنکھوں کی ترکیب سے واقف ہو۔ پردے اور رطوبتوں سے باخبر ہو۔ مذہب خروج شعاع اور انطباع شج مرے سے اطلاع رکھتا ہو اسی طرح جتنے مسائل علم مناظر سے متعلق ہیں۔ ان سے آشنا ہو۔

مثال پنجم :- بندوق کی نال کے لوہے کو پہچاننے کے لیے کچھ معدنیات میں دستگاہ ضروریات سے ہے۔ پھر نال اور چانپ کے لوہے کا فرق بے علمی اطلاع کے سمجھ میں نہیں آسکتا اسی طرح سید کی گولی سخت اور وزنی کرنے کے لیے ایسے اجزائے معدنیہ سے باخبر ہونا ضرور ہے جو سیسہ کو سخت اور وزنی کر دیتے ہیں۔

ہر درجہ کے وزن کو سمجھنے کے لیے مسئلہ اسپیفک گرویٹی SPECIFIC GRAVITY سے مطلع رہنا واجبات سے ہے۔ اسپیفک گرویٹی عبارت ہے اعتباری وزن سے کسی شے مادی کے بمقابلہ کسی دوسری شے مادی کے۔ مثلاً اگر ایک کاسہ میں پانی بھرے پھر اسی کاسہ میں سونا بھرے تو سونا وزن کے اعتبار سے پانی سے ۱۹ گونہ بھاری ہوگا۔ اسی پر اور اجسام کو قیاس کرنا چاہیے کہ پانی سے بوزن خاص بھاری یا ہلکے ہوں گے۔

مثال ششم :- ہاتھی حالت آزادی میں جہاں کہیں پایا جاتا ہے تو ایسے ہی ملک میں پایا جاتا ہے کہ جو خط استوا کے نیچے یا قریب اس کے واقع ہوتا ہے۔



س کلیہ کو سمجھنے کے لیے ضرور ہے کہ انسان علم جغرافیہ سے واقف ہو۔ ورنہ خط استوا کے سمجھنے سے قاصر رہے گا۔

مثال ہفتم :- ہندوستان اور براعظم افریقہ کے ہاتھی جسمانی ترکیب میں ایک دوسرے سے علاحدہ دیکھے جاتے ہیں۔ موضع دماغ ایک کا دوسرے کے موضع دماغ سے مناسبت نہیں رکھتا۔ اس مسئلہ کے سمجھنے کے واسطے ضرور ہے کہ علاوہ جغرافیہ دانی کے انسان حیوانات کی تشریح سے باخبر ہو۔ تشریح حیوانات میں آدمی کی تشریح بھی داخل ہے۔ پس علم تشریح کے اطلاع کی حاجت محتاج بیان نہیں ہے۔

مثال ہشتم :- شیر میں ایک ایسی قوت برقی مودعہ ہے کہ اکثر انسان کی قوتوں کو سلب کر دیتی ہے۔ اس لیے شیر کے سامنے کمزور اشخاص حواس باختہ ہو جاتے ہیں اس مضمون کو سمجھنے کے واسطے ضرور ہے کہ انسان برقی معاملات سے خبر رکھے۔ یعنی علم برق سے واقف ہو۔

مثال نہم :- بعض سانپ ایسے ہیں کہ نظر کے زور سے جانوروں کو بے حس کر دیتے ہیں اور بعض نظر کی کشش سے جانوروں کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب تک انسان تاثر الانظار کے اصول سے یا جذبات مقناطیسی کے قواعد سے واقف نہ ہوگا ان مضمونوں کی تہ کو نہ پہنچ سکے گا۔

مثال دہم :- شیر و پلنگ باوجود گوشت خوار جانور ہونے کے افعال و حرکات میں کچھ مطابقت نہیں رکھتے اسی طرح سابرا در نیل گاؤ کی بودد باش کے طریقے بالکل علاحدہ ہیں ان باتوں کو سمجھنے کے واسطے علم حیوانات کی دانست و اجبات سے ہے۔

مثال یازدہم :- جنگل مختلف اقسام کے ہوتے ہیں۔ کوئی ڈھاک کا کوئی سیلیٹی کا کوئی بانس کا کوئی کانس کا کوئی جہر بیری کا کوئی ساکھو کا وغیرہ ہر قسم کا جنگل تقاضائے خاص رکھتا ہے۔ پس ان کے تقاضاؤں سے مطلع رہنے کے لیے ضرور ہے کہ ان علم نباتات سے باخبر ہو۔

مثال دوازدہم :- حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت میں صید انگنی کا کیا طور تھا ان کے بڑے صاحبزادے کیوں کر شکار کرتے تھے۔ بے علم سیر کوئی اس کا جواب نہیں دے سکتا۔

مثال سیزدہم :- بہرام کور بڑا شکاری تھا اس کی حقیقت بے علم تاریخ کے نہیں منکشف ہو سکتی ہے۔

مثال چہار دہم :- شائقین فرنگ نے بہت سی کتابیں فن صید انگلی میں بہت عالی مذاقی کے ساتھ تصنیف فرمائی ہیں ان کتابوں کو پورے طور پر سمجھنے کے لیے اچھو مناسب ادبیہ درکار ہے۔

مثال پانزدہم :- شائق شکار کو لازم ہے کہ اپنے شکاری بھائیوں کے حقوق کو ملحوظ رکھے۔ جانور ان صید کو بلا ضرورت ایذا نہ پہنچائے۔ صید انگلی میں سفای کی کوراہ نہ دے۔ آداب شکار کو ہمیشہ ملحوظ رکھے۔ ان باتوں کی خوبیوں کو کوئی شخص بغیر علم اخلاق کی دانست کے نہیں سمجھ سکتا ہے۔

مثال شانزدہم :- جب احباب کا جلسہ ہو تو باتیں ایسی کرنی چاہئیں کہ کسی کو گزند نہ پہنچے۔ عنوان کلام ایسا رہے کہ مناظرہ نہ معلوم ہو۔ طینت، خلوص، بیباختہ پن، بخور وئی اور بشاشت کے ساتھ سلسلہ تقریر جاری رہے۔ کہیں سے بھی گفتگو بوئے اتانیت نہ دے۔ اس کے ساتھ خوشامد۔ چاہلوسی وغیرہ سے پاک ہوا ایسے جلسوں میں صید و شکار کا تذکرہ آجاتا ہے۔ خاص کر اگر کسی شریک جلسہ کو اس کا مذاق حاصل ہوتا ہے۔ پھر اکثر حضرات عام اس سے کہ شکاری ہوں یا نہیں رائے بیان کرنے لگتے ہیں۔ بعض نا تجربہ کار ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں کہ انھیں سن کر خاموش ہو جانا تقاضائے عقلمندی ہے۔ مگر جو معاملات صید و شکار سے واقفیت رکھتے ہیں ان سے بھی بعض اوقات اختلاف کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً اگر کسی نے یہ کہا کہ اکسپریس نمبر EXPRESS No. 45C شیر کے شکار کو کافی ہے تو اس کی تردید ایسے طینت کے ساتھ کرنا چاہیے کہ سامع کو گراں نہ گذرے اکسپریس نمبر 50 کا ذکر اس طور پر کیا جائے کہ مخاطب کو برا نہ معلوم ہو اور لطف صحبت برقرار رہے۔ ظاہر ہے کہ صحبتوں میں فراز و نشیب کا خیال رکھنا بے علم مجلس کی دانست کے محض دشوار ہے۔ جاننا چاہیے کہ علم مجلس تمام علوم کا پتھر ہے۔ اور ہر شریف آدمی کا فرض منصبی ہے کہ اس سے بہرہ ور ہو۔

مثال ہفتدہم :- زراعت کو شیر و پلنگ سے کس قدر نفع حاصل ہوتا ہے



اس کو وہی شخص جانے گا جس نے علم زراعت کو سیکھا ہوگا۔ ظاہر زراعت کو شیر و پلنگ سے کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا ہے مگر ارباب واقفیت سے ان کا تعلق پوشیدہ نہیں ہے۔ راقم نے کچھ عرصہ ہوا کہ ایک تحریر بزبان انگریزی لکھی تھی جس کی سرخی شیر اور زراعت تھی۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ ان مقاموں میں جہاں سے کوہ و جنگل قریب ہیں زراعت کو ایسے جانوروں سے جیسے سور، نیل، ساہو، چیتل، کوتار وغیرہ میں سخت ضرر پہنچتا ہے۔ مگر جب ان اطراف میں شیر و پلنگ ہوتے ہیں تو اقسام بالا کے جانور کی تعداد بڑھنے نہیں پاتی اور زراعت بربادی سے بچ جاتی ہے۔

مثال ہیزدہم :- صحرا و دشت میں جب شکاری رات کو راہ بھول کر بھٹکتا پھرتا ہے اور نہ سمت کا پتہ لگتا ہے اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ کس قدر شب باقی ہے تو اختر شناسی بہت کام دیتی ہے۔ اختر شناسی کے لیے ضرور ہے کہ انسان کچھ نہ کچھ علم فلکیات سے باخبر ہو۔

مثال نوزدہم :- کیفیت ہوا یا ارتفاع کوہ کو دریافت کرنا۔ اکثر شکاری کو ضرور ہو جاتا ہے۔ اس لیے اسے بیرو میٹر کی ضرورت ہوتی ہے۔ بیرو میٹر سے کرہ ہوائی میں جو انقلاب واقع ہونے کو ہوتے ہیں معلوم ہو جاتے ہیں۔ راقم نے چند بار شکار گاہوں میں ہمراہیوں کو ژالہ باری سے آگاہ کر دیا ہے۔ اور موقع کی اطلاع بخشی سے ان کو صدمہ عظیم سے مامون رکھا ہے۔ بلاشبہ بیرو میٹر نہایت بکار آمد آلہ ہے۔ مگر اس کے اصول سے واقف رہنے کے واسطے کس قدر معلومات کی حاجت ہے۔ یہ آلہ ارتفاع کوہ کے دریافت کرنے کے واسطے بھی خوب شے ہے۔ ارتفاع کے دریافت کی ضرورت کوہ ہمالیہ وغیرہ کے شکار میں ہوتی ہے۔ جب شکاری دریافت کیا چاہتا ہے کہ وہ سطح سمندر سے کس قدر بلندی پر چڑھ گیا ہے۔ ہمالہ میں بڑ کوہی کا شکار ہوتا ہے۔ یہ جانور بہت مرتفع مقاموں میں قیام کرتا ہے۔ علاوہ اس کے وہ خرس دپلنگ بھی جو برف میں وطن رکھتے ہیں بہت مرتفع جگہوں میں پائے جاتے ہیں۔ پس شکاری کو ایسے وقت میں ارتفاع کی تحقیق کا ذریعہ بیرو میٹر کے سوا دوسرا نہیں ہوتا۔

مثال بستم :- کبھی شکاری کورسن کے ذریعہ سے کوہی گڈھوں میں اُترتا ہوتا ہے اور وہاں اُتر کر شیر یا بز کوہی کو شکار کرنا پڑتا ہے۔ بعد شکار کرنے کے مع شکار اس کو ادبر آنے کی حاجت ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں اگر وہ علم جرثقیل سے بہرہ رکھتا ہے تو پولی گھرنی وغیرہ کے استعمال سے اپنے کو ادبر لانے کا سامان پہلے سے کر سکتا ہے۔ اسی طرح وزنی جانوروں کو اکٹھوانے میں اس کی اطلاع اس علم کی بکار آمد ہو سکتی ہے۔

واضح ہو کہ راقم نے بالا میں بہت ہی تھوڑے مسائل علمیہ کو جو فن شکار سے متعلق ہیں مثلاً بیان کیا ہے۔ اگر کچھ بھی تقریر کو وسعت دی جاتی تو پورا ایک دفتر تیار ہو جاتا۔ بالآخر جاننا چاہیے کہ فن صید انگنی ایک ایسا فن ہے کہ جس کو بہت سے علوم سے تعلق ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس کا شغل آدمی کو زیبا ہے۔ جو شخص محصل ہے اور ان صفات سے متصف ہے جن کا ذکر راقم نے بالا میں کیا ہے علاوہ اس کے یہ شغل سرسیمول ایسے باکار حکما سے اس شغل کو سچے شعرا سے بھی تعلق ہے۔ ناواقف کو یہ عرض بھی فقر کی مجذوب کی بڑ معلوم ہوگی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ سپا مذاق صید انگنی کا شاعری کے سچے مذاق کے ساتھ ایک بڑی مناسبت رکھتا ہے۔ اس مناسبت سے اہل اطلاع تو بے خبر نہیں ہیں مگر اہل عوام الناس کو اس کی اطلاع نہیں ہے اور نہ اس شاعر کو اطلاع ہے جو گھر میں بیٹھا ہوا جاہل شاگردوں کا ایک گروہ لیے ہوئے قافیہ پیمائی کیا کرتا ہے۔ اس کنویں کے مینڈک کو کیا خبر ہے کہ فنلئے آسمان کا کیا عالم ہے۔ اگر اس نے گھر سے باہر قدم رکھا ہوتا تو اسے معلوم ہوتا کہ دست قدرت نے کیا کیا عجائبات سے روئے زمین کو آئمنہ حیرت بنا رکھا ہے۔ مگر اس نے تو شاعری اس کو سمجھ لیا ہے کہ ادل مصرع میں گل ہو تو دوسرے مصرع میں بلبل ہو۔ اس کو اس کی کہا واقفیت ہے کہ شاعری نام ہے مشاہدہ عالم سے اپنے میں کیفیت جذبی کے پیدا ہونے اور دوسرے میں کیفیت جذبی کو پیدا کرنے کا پس ہر شخص جو اس طور پر اپنے میں کیفیت جذبی کے پیدا ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے یا کسی دوسرے میں کیفیت جذبی کے پیدا کرنے کی قابلیت رکھتا ہے۔ سپا شاعر ہے۔ ایسا شخص اپنے لیے بھی شاعر ہے اور دوسرے کے لیے بھی شاعر ہے۔ لیکن اگر اس کو اسی قدر صلاحیت ہے کہ کیفیت جذبی صرف اس میں پیدا ہو تو ایسا شخص صرف



اپنے لیے شاعر ہے یہ بھی بہت غنیمت ہے کس واسطے کہ ایسی صلاحیت کا موجود رہنا عمدگی طبیعت کی دلیل ہے۔ برخلاف ان دونوں کے وہ قافیہ پیمانا شاعر ہے جو مشاہدہ عالم سے محروم رہنے کی وجہ سے نہ اپنے میں کیفیت جذبی کے پیدا ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے اور نہ دوسروں میں کیفیت جذبی پیدا کرنے کی قابلیت رکھتا ہے بہر حال اب راقم دکھایا چاہتا ہے کہ سچے مذاق صیدانگنی کو سچے مذاق شاعری کے ساتھ کیا مناسبت ہے۔ واضح ہو کہ صیدانگنی ایک بڑا ذریعہ دنیا دیکھنے کا ہے۔ اس کو ہمارے ناواقف ہم وطن دشواری سے سمجھیں گے۔ کس واسطے کہ ان کو حقیقت صیدانگنی سے کچھ خبر نہیں ہے۔ اول تو ہم لوگ اس کا کچھ مذاق نہیں رکھتے۔ دوم جو حضرات صیدانگنی کا شغل کبھی کبھی اختیار کرتے ہیں وہ جوار میں جو کچھ جانور چرند پرند پاتے ہیں مار لیتے ہیں۔ اور اسی کو صیدانگنی سمجھتے ہیں۔ لیکن جاننا چاہیے کہ نہ یہ صیدانگنی ہے نہ اس میں فیسیر و فی الارض کی تعمیل مقصور ہے۔ صیدانگنی کیا شے ہے اسے اہل یورپ خوب جانتے ہیں۔ یورپین شکاری اپنے ملک سے نکل کر کبھی افریقہ کبھی امریکہ کبھی ایشیا کی طرف جاتا ہے۔ عجائبات عالم کا تماشا دیکھتا ہے۔ اپنے مشاہدات کو حوالہ قلم کرتا ہے اور اپنی تحریر سے شاعری کی پوری داد دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص دنیا کی سیاحت کرے گا۔ تو بہت کچھ دیکھے گا اور جب بہت کچھ دیکھے گا تو بہت کچھ لکھے گا۔ جائے انصاف ہے کہ ایسے شکاری سیاح سے کسی خانہ نشین عنکبوت سیرت شاعر کو کیا نسبت دی جاسکتی ہے۔ ان یورپین شکاریوں کے سفر ناموں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو تماشاے فطرت کے دیکھنے کے بے انتہا مواقع ملا کیے ہیں اور خدا جانے کیا کیا خطوط قلبی ان کو نصیب ہوتے گئے ہوں گے ان کی تحریریں بڑا زکیفیت نظر آتی ہیں۔ اور الحق ان کی خوبیاں سچی شاعری کی تصویر پیش نظر کر دیتی ہیں۔ صیدانگنی کی کاروائی جب عالی مذاق کے ساتھ عمل میں آتی ہے تو نہایت مطبوع رنگ پیدا کرتی ہے۔ خود شکاری اس سے متمتع ہوتا ہے۔ اور جب اپنے تمتع کے بیانات کو حوالہ قلم کرتا ہے تو اس کی تحریر سے ناظرین حظ روحی اٹھاتے ہیں۔ مشغلہ صیدانگنی میں انسان کو صنائع آفریدگار



کے معائنہ کا بہت موقع ملتا ہے۔ ایسے مواقع ان اشخاص کو جو گھر بیٹھے رہتے ہیں کبھی نصیب نہیں ہو سکتے۔ ایسے بڑے بڑے شکاریوں کو جیسے سرسیمول، بیکر، اسٹرنڈیل، انڈرسن بالڈون وغیرہ وغیرہ کیا کیا نہیں صنایع آفریدگار کے دیکھنے کے مواقع ملے ہوں گے۔ مگر فیر نے بھی شکار کی بدولت جھاڑ پھاڑ کی سیروں میں ایسی ایسی سینریاں اور خوش سوادیاں دیکھی ہیں کہ ان کے دیکھنے کے بعد کیوں کر کوئی منکر ذات باری تعالیٰ ہو سکتا ہے۔ ہر شجر، حجر، پرند، چرند، درند، گزند، جڑی، بوٹی، جھڑنا، چشمہ، پھول، پتی سب کے سب زبان حال سے اس کے وجود کا اقرار کرتے نظر آتے ہیں جدھر دیکھیے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ہے جو غافل کی آنکھوں سے نہاں رہ کر سب کچھ کیا کیا کرتا ہے۔ مولفہ

کوئی پنہاں ہے پس پردہ سامان بہار گل چمن میں نہیں بے وجہ ہنسا کرتے ہیں شکاری کی زندگی لاریب بڑی پیاری زندگی ہوتی ہے نام آور شکاریوں کا تو کیا کہنا خود ان کی تحریر میں ان کے عنوان زندگی سے خبر دیتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسی زندگیاں کمتر اہل دنیا کو نصیب ہوتی ہیں۔ لیکن فیر نے بھی جس قدر عمر صید انگنی میں بسر کی ہے۔ اس کے لطفوں کو خیال کر کے بے اختیار دل پوچھ اٹھتا ہے کہ کیا اس دارالمحرم میں بھی انسان کو اس قدر خوش دلی کا موقع ملتا ہے۔ جاننا چاہیے کہ اس مشغلہ میں افراط لطف کے حاصل ہونے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ صید انگنی کا لطف محض حسی انداز کا نہیں ہوتا بلکہ اس کا لطف بہت کچھ روحانی پہلو بھی رکھتا ہے حالات ذیل سے جو ذاتی معاملات راقم کے ہیں کسی قدر صید انگنی کی لذتوں کا موازنہ متصور ہے۔

فصل سرما کی تھی اور فیر کے خیمے ایک پہاڑ پر استادہ تھے عموماً اس فصل میں کم تر شیر وغیرہ کا شکار کھیلا جاتا ہے۔ مگر چونکہ راقم کو صید انگنی کا مشغلہ دو از دو ماہ رہتا ہے کسی خاص فصل کی پابندی نہیں رکھتا۔ بہر حال جہاں غنیم قرار پایا تھا وہاں کی سبزی نہایت دل آویز تھی ہر طرف سبز پوش پہاڑ ہی پہاڑ نظر آتے تھے ہزاروں عظیم پیکر اشجار چار سو دکھائی دیتے تھے۔ ہری کچور جھاڑیوں کی کمی نہ تھی۔ سبزے کی کثرت فرش زمردی کا رنگ پیدا کیے ہوئے تھی۔ چند طرح کے صحرائی



اشبار بھی بار آور ہو رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے طیور ہر جانب مشغول نوا سنی تھے مگر سب سے زیادہ قابل لحاظ ایک دریا تھا جو پہاڑوں کو کاٹتا ہوا ملک کے میدانی حصوں کی طرف بہ نکلتا تھا۔ جس صورت سے اس دریا نے پہاڑوں کو کاٹا تھا قلم کی طاقت سے باہر ہے کہ اسے احاطہ تحریر میں در لائے۔ کوسوں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے آلات کے ذریعہ سے دور دیہ پہاڑوں کو کاٹ کر درمیان سے ایک عریض دریا بہا دیا ہے اس دریا کا رخ اس وضع پر واقع ہوا تھا کہ اکثر مقاموں میں وقت صبح آفتاب کی سنہری شعاعوں سے وہ دریا میدان طلا معلوم ہوتا تھا۔ اور شام کو رنگ شفق رو سے عقیق کا ایک وسیع تختہ بنا ڈالتا تھا اس کے دونوں کناروں پر شاداب روئیدگیاں سبز گوٹ کی بابت پیدا کرتی تھیں اس پر فنا جگہ میں فقر کو دو تین روز اتفاق قیام ہوا شام کو جب شغل شکار سے فرصت ہو جاتی تو اسی دریا کے قریب کسی پتھر پر بیٹھ جاتا اور موجودہ سبزیوں پر غور و فکر کو راہ دیتا طرح طرح کے خیالات اس وقت پیدا ہوتے تھے کبھی قدم وحدوث کے مسائل پیش نظر ہوتے تھے۔ کبھی کون و فساد کے مضامین دل میں جگہ کرتے تھے۔ کبھی غل و سبب کی طرف طبیعت رجوع لاتی تھی۔ اور اسی طرح کے ہزاروں حکمائے خیالات پیش ذہن ہو جاتے تھے۔ علاوہ مسائل الہیات وغیرہ کے علم حیوانات، علم نباتات، علم معدنیات، علم طب وغیرہ کے مسائل غرض و فکر کے باعث ہوتے تھے۔ شاعرانہ خیالات کے ہجوم سے بھی چارہ نہ تھا۔ المختصر وہاں کے قیام مختصر کے زمانہ میں جو وقت صید افگن سے خالی پڑتا تھا وہ طرح طرح کے مسائل کے سوچ میں بسر ہوتا تھا۔ اور جوں جوں سوچ بڑھتی جاتی تھی اسی قدر دل زیادہ مبتلائے تخر ہوتا جاتا تھا۔ اسی اثنا میں بعض احباب با مذاق سے کسی مسئلہ میں جو گفتگو آ جاتی تھی تو رنگ برنگ کے خیالات کے اظہار کی صورت بھی پیدا ہوتی تھی۔

واقع ہو کہ ایسے مقاموں میں انسان ذی علم و با خبر کو دماغی کاموں کی طرف طبیعت کو رجوع کرنے کی حاجت نہیں ہوتی خود ایسے خیالات تقاضائے موقع و محل سے دل و دماغ میں ارباب فکر و غور کے آٹھٹے ہیں۔ چنانچہ بعض احباب با مذاق کے اظہار خیالات سے عیاں ہوتا تھا کہ ان کے دل و دماغ سیر و سفر میں بیکار



نہیں رہتے تھے۔ اے حضرات ناظرین اس وقت جو ایسی ایسی گزشتہ محبتیں یاد آتی ہیں تو ان کی یادیں سروسے وہی ولولے پیدا کر دیتی ہیں۔ طبیعت عالم مادیات کی طرف سے منہ موڑ کر روحانیت کی طرف میلان دکھانے لگتی ہے۔ یہ تو گھر بیٹھے طبیعت کی حالت ہوتی ہے۔ شکار گاہ کی کیا حقیقت بیان کی جائے۔ جہاں دنیا کو زق زق بقی بقی سے مرد شکاری کو فرصت حاصل رہتی ہے اور حالت آزادی میں اعلا درجہ کے خیالات اپنی اپنی جلوہ گریاں دکھاتے ہیں۔

أَصَاحَ تَرَى بُرْقًا أَرِيكَ وَصِيصَهُ كَلِمَعِ الْيَدَيْنِ فِي حَبِيٍّ مَكْلَلٍ  
معنی۔ اے ہم نشین تو برق کے چمکنے اور کوند نے کو دیکھ کہ اس کا چمکنا اور کوند نا اٹھتی ہوئی گھنگھور گھنائیں معشوقوں کے ہاتھوں کی رخشانی اور جنبش کے انداز رکھتا ہے۔

شاعر گھوڑے کی تعریف کو تمام کر کے اب برق و باراں کے مضامین کو قلم بند کرتا ہے۔ یہ مضامین برائے خود ہر زبان میں شاعرانہ خوبیاں رکھتے ہیں۔ مگر چونکہ عرب میں عموماً بارش قلت کے ساتھ ہوتی ہے اور اگر حسب مراد ہوتی بھی ہے تو صرف اس کے تھوڑے سے حصوں میں ہوتی ہے۔ اس لیے کسی شاعر عرب کا ایسے مضامین کی طرف توجہ کرنا خلاف فطرت نہیں ہے۔ امری القیس کا بیان برق و باراں کی طرف نقل کرنا اور بھی امر طبعی ہے۔ یہ شخص بالطبع عاشق مزاج صحرا پسند سپاہی منش آزاد و جفاکش دوست پرست مردانہ طبیعت شیر دل محنت کش یار باش اور شکار دوست تھا۔ اس پر سے شاعری کی قابلیت ایک بڑے درجہ کی رکھتا تھا۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ فطرت نے اسے خلقت کی رو سے شاعر بنایا تھا پس ایسے شخص کا سامان ابر و باراں سے بشارت ہو کر برق و باراں کے بیان میں شاعرانہ مذاق کے ساتھ تقریر کو طول دینا تقاضائے فطرت سے بعید نہیں ہے۔ ایسی بشارت اس کم بحث شاعر کو نصیب نہیں ہو سکتی جو گھر کے اندر بیٹھا ہوا عنکبوت کی زندگی بسر کرتا ہے۔ جس نے ابر کو سوائے اپنے گھر کے کہیں برستے نہیں دیکھا ہے۔ جس نے کبھی ابر کو کوہستان پر ٹوٹ پڑنے معائنہ نہیں کیا ہے۔ جس نے ابر کو کسی وسیع صحرا کو دم بھر میں نہ تہہ آب کر ڈالتے نہیں ملاحظہ کیا ہے لیکن امری القیس



جو ایک شاعر صحرانورد تھا اور جو عاشق مزاجی کے ساتھ سیر و شکار کو درست رکھتا تھا کیوں کر گھوڑے کے حالات کہتے کہتے برق و باراں کے بیان کی طرف متوجہ نہ ہوتا۔ اس شاعر کو ایسے اتفاقات ضرور آپڑے ہوں گے کہ وہ مشغول صید افگنی ہو گا یا دشت نوردی کر رہا ہو گا کہ اسی حال میں ابر گھرا یا ہو گا اور بارش نے اسے پناہ لینے کی فرصت نہیں دی ہو گی۔ فقیر کو ایسے اتفاقات اکثر پیش آئے ہیں اور یہ بھی فقیر کو یاد ہے کہ وقت صید افگنی کو ہستائوں میں جو ابر سیاہ نمودار ہوا ہے تو بے اختیار شعر بالا امری القیس کا ذہن فقیر میں آیا ہے اور اس موقع کی یاد نے اس وقت ایک عجیب لذت دل کو بخشی ہے۔ پس جاننا چاہیے کہ ایک ربط پوشیدہ امری القیس کے بیان برق و باراں کو اس کے اُن اشعار کے ساتھ حاصل ہے جن میں وہ گھوڑے اور شکار کا مذکور کرتا گیا ہے۔ واضح ہو کہ اس قصیدے میں امری القیس نے دو طرح کے مضامین یعنی داخلی Subjective اور خارجی Objective قلم بند کیے ہیں۔ اور دونوں طرح کی مضمون آوری میں داد شاعری دی ہے۔ مثلاً گھوڑے شکار اور برق و باراں کے جو مضامین ہیں خارجی پیرایہ رکھتے ہیں مگر جہاں داخلی رنگ منظور رکھا ہے۔ وہ مضامین عشقیہ وغیرہ پر مشتمل ہے۔ پہلا شعر اس قصیدہ کا قَفَّانْبُکُ الخ۔ داخلی پہلو رکھتا ہے۔ اسی طرح اور بھی اشعار ہیں مثلاً تسلت عمایات الوجال الخ۔ اس تمام قصیدہ کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ امری القیس ایک اعلیٰ درجہ کا شاعر تھا۔ اس رتبہ کا شاعر ہر ملک اور ہر زبان میں قابل قدر متصور ہے۔

یضیٰ سناء اومصائبیسم راہب اَمَالِ السَّليط بِالْداُّ بِالِ المقتل  
معنی۔ روشن ہوتی ہے اور درخشاں ہوتی ہے وہ برق جنبش کے ساتھ جس طرح پر معشوقوں کے ہاتھ رخشاں اور جنباں ہوتے ہیں یا مانند راہب کے چرائوں کے کہ جن میں تیل پلیمہ نافہ کی طرف مائل کیا جاتا ہے۔ تاکہ روشنی تیز ہو۔

واضح ہو کہ شاعر برق کی رخشاں اور جنبش کو دو چیزوں سے تشبیہ دیتا ہے۔ ایک تو نگاروں کے ہاتھوں سے رخشاں اور جنبش کے ساتھ، دوم چراغ ہائے راہب کے ساتھ جس کی روشنی بہت تیز ہوا کرتی ہے۔ پہلی تشبیہ

اس رنگ کی ہے کہ جس طرح پر شعرائے فارسی و اردو برق کو معشوق کے خندہ یا نگاہ کے ساتھ دیا کرتے ہیں۔ گورخسانی و جنبش دست کے مضمون کو اس طور سے کم تر باندھتے ہیں۔ لیکن دوسری تشبیہ تو خاص عربی مذاق رکھتی ہے۔ اور ملکی رواج سے خبر دیتی ہے۔ یعنی راہبوں کا دستور ہے کہ شام کو نہایت روشن چراغ جلایا کرتے ہیں۔ تاکہ دور سے اس کی روشنی نمایاں ہو جس کے ذریعہ سے اگر کوئی بھولا بھٹکا مسافر ہو تو چراغوں کی روشنی دیکھ کر ان کے کلیسا کی طرف حصول امن کی نظر سے چلا آوے۔ بلاشبہ یہ ترکیب مسافر نوازی کی خوب ہے۔ چنانچہ راہبان کلیسا یعنی پارسیان ترسا کی نیک دلی اور جیہی کی نقلیں بہت کچھ کتابوں میں درج ہیں اور خدا کے تعالیٰ بھی قرآن شریف میں انھیں خوبی کے ساتھ یاد فرماتا ہے۔ مگر بعض حکایتیں ایسی بھی منقول ہیں کہ بعض اشخاص راہبوں سے مسافروں کو مار بھی ڈالتے تھے۔ جاننا چاہیے کہ راہب عبارت ہے پارسیائی ترسا سے۔ ترسا سے مراد قوم عیسائی ہے۔ راہب بیاہ نہیں کرتے اور تارک دنیا ہوتے ہیں۔ رہبانیت کو اسلام نے ممنوع کیا ہے۔ اس اصول پر کہ یہ ایک غیر فطرتی طور زندگی بسر کرنے کا ہے اور یہ ایک ایسا ضرر انگیز طریقہ ہے کہ جس سے اندر اس بنی آدم کی صورت یقینی ہے۔ خودکشی سے بھی یہ امر زیادہ مقدوح نظر آتا ہے۔ کس واسطے کہ خودکشی کا نتیجہ فاعل خودکشی تک محدود رہتا ہے۔ بخلاف رہبانیت کے کہ اس کی مصہرت پہلوئے عام رکھتی ہے۔

واضح ہو کہ ہر ملک کی شاعری ایک خاص رنگ رکھتی ہے۔ اس لیے کسی خاص ملک کی شاعری کے لطف کو درک کرنے کے لیے اُس ملک کے معاملات تمدن، معاشرت، مذہب، اخلاق وغیرہ سے مطلع رہنا ضرور ہے۔ یہ تشبیہ برق کی چراغ ہائے راہب کے ساتھ ایسے ملک متوطن کو جس کے ہاں راہب نہ رہتے ہوں یا اس شخص کو جو مضمون راہب سے خبر نہ رکھتا ہو کوئی مزہ انہیں دے سکتی حالانکہ یہ تشبیہ جس ملک کی ہے اور وہاں اس کی خوبی سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا ہے۔ ایسی تشبیہات وہ ہیں جو کسی خاص ملک کے معاملات تمدن و معاشرت و مذہب وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں اور عام حیثیت سے دور ہوتی ہیں۔ بخلاف



ان تشبیہات کے جن کو امور فطرت سے تعلق ہوتا ہے۔ مثلاً چشم گریاں کی تشبیہ ابر کے ساتھ ظاہر ہے کہ یہ تشبیہ ایسی ہے کہ اس کو کسی خاص ملک کے معاملات تمدنی و مذہبی وغیرہ یا رواج کے ساتھ مناسبت نہیں ہے۔ تشبیہ اول جو شاعر نے رشتائی و جنبش برق کو دست نگار کے ساتھ دی ہے اسی قسم کا انداز رکھتی ہے اور اس کا فطرتی پہلو ویسا ہی ہے جیسا کہ برق کو خندہ خوبان و نگاہ خوبان کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور جس رنگ سے تشبیہ دی ہے اس کا انداز بہت خوب ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دو کوہ مقابل میں جو بھلیاں چمک رہی ہیں اور بادل گرج رہے ہیں گویا ایسا ہے کہ وہ دونوں آپس میں ہم کلام ہو رہے ہیں۔ بلاشبہ یہ ایک نہایت خوبصورت تشبیہ ہے۔ اور محتاج تصریح نہیں ہے۔ اردو یا فارسی میں ایسی تشبیہ فقیر کی نظر سے نہیں گذری ہے۔ البتہ ایک دوسرے رنگ میں فخر الشعرا استاد حضرت غالب نے مضمون کوہ و زبان کے بڑی جدت کے ساتھ قلم بند فرمایا ہے۔ چنانچہ حضرت فرماتے ہیں۔

لعل سے کی ہے پئے زمزمہ مدحت شاہ طوطی سبزہ کہسار نے پیدا منقار  
مگر اس شعر کا پہلو ایسا فطرتی نہیں ہے کہ ہر ملک کا آدمی مضمون لعل و طوطی سے ناواقف رہ کر اس شعر کو مجرد تبعیت فطرت کے سہارے پر سمجھ سکے۔

قَعَدْتُ لَهُ وَصَحْبَتِي بَيْنَ ضَارِجٍ وَبَيْنَ الْعُذَيْبِ بَعْدَ مَا مَتَّ امْتَلِي  
معنی۔ بیٹھے ہم اور یاران ہمارے درمیان ضارج اور عذیب اس ابر کے دیکھنے کے واسطے مگر جس ابر کے دیکھنے کو ہم لوگ بیٹھے وہ بہت دور تھا۔

واضح ہو کہ ضارج اور عذیب دو موضع کے نام ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ تما شائے ابر کے لیے ہم لوگ دو موضع کے درمیان بیٹھے مگر وہ مقام جہاں پر ابر چھایا ہوا تھا۔ وہ بڑے فضل پر واقع تھا۔ یہ شعر بھی نہایت فطرتی انداز رکھتا ہے۔ اور بے لفظی ناظر کی توجہ اس کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ امری القیس فطرت کا ایک بڑا شاگرد رشید تھا اپنی شاعری میں کبھی فطرت کی تبعیت سے انحراف نہیں کرتا ہے۔

عَلَى قَطْنٍ بِالشَّيْمِ أَيْمَنَ صُوبِهِ وَآيَسُرُّكَ عَلَى السِّتَارِ قَبْذُكُلٍ

معنی۔ جب میں نگاہ کرتا ہوں تو ابر کو بسیاری کے ساتھ جانے، راست میں کوہ قطن پر برستے دیکھتا ہوں اور جانب چپ میں کوہ ستار کوہ یذبل پر۔  
شاعر یہاں جو باران کو مذکور کرتا ہے اور وسعت موضع بارش کو دکھلاتا ہے۔ ملک عرب میں اس قدر بارش کا ہونا خالی از لطف نہیں ہو سکتا۔  
اہل ہند ملک عرب کو اپنے ملک پر قیاس نہ فرمائیں کہ جہاں بارش کی ایسی کثرت ہوتی ہے کہ اس قدر بارش جس کا ذکر امری القیس اپنے شعر بالا میں کرتا ہے کوئی حیرت افزا امر نہیں۔

فَاضِحٌ يَسْتَحُ الْمَاءُ فَوْقَ كَتِيفَةٍ يَكْبُ عَلَى الدَّ قَانِ دَوْحُ الْكَنْهَبِلِ  
معنی۔ پس موضع کتیفہ پر برابر برستا تھا اور زور باران اس قدر تھا کہ کنہبل کے درختوں کو ابھی جو جنگل کے درختوں میں عظیم پیکر ہوتے ہیں زمین پر منہ کے بل گرا دیتا تھا۔

اس شعر میں کوئی مبالغہ پرداز شاعر نے ایسی نہیں کی ہے کہ احاطہ فطرت سے تجاوز کر گئی ہو۔ ہمزید Hesiod شاعر یونانی بھی زور باد و باران کے مضمون کو اس طور پر قلم بند کرتا ہے جیسا کہ سابق میں عرض کیا جا چکا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہوا شدید ضربیں لگا لگا کر پہاڑ کی چوٹی پر کے قوی ہیکل دخت ہائے پائن Pine کو پھاڑ ڈالتی ہے اور عظیم پیکر درخت ہائے اوک کو اکھاڑ کر دامن کوہ میں پھینک دیتی ہے۔

وَمَرَّ عَلَى الْقَنَا مِثْلَ نَفْيَانِهِ فَأَنْزَلَ مِنْهُ الْعَصِيرَ مِنْ كُلِّ مَنَزَلٍ  
معنی۔ جب کوہ قنات پر باران پہنچا تو اس کے خوف سے آہوئے سفید بازو بز کو ہی ہر طرف سے پہاڑ کے نیچے اتر آئے۔ یعنی جب کثرت آب سے ان کو ہی جانوروں کو پہاڑ میں امن کی شکل باقی نہیں رہی تو میدانی حصہ زمین کی طرف اتر آئے۔

واضح ہو کہ عموماً بارش زیادہ کوہستان میں ہوتی ہے کوہ ہائے بلند اپنی طرف ابر کو کھینچ لیتے ہیں۔ پس جانوران کو ہی کثرت بارش کی حالت میں صحرا و میدان کی طرف اتر آتے ہیں۔ یہ شعر بھی پورا فطرتی مذاق رکھتا ہے اور



امری القیس کی خوش مذاقی سے خبر دیتا ہے۔

وَيَتَمَاءُ لَكَ يَتْرُكُ مَا جَدَّ عَخْلَةً وَلَا أَطْمَأَنَّ الْأَمْشِيدَ أَبْجَدًا لَ  
معنی۔ قریہ یتما میں تو بارش نے تنہا نے رکھا اور گھروں کو سلامت  
نہ چھوڑا الا ایسے مکانات کو جن کی تعمیر سنگ و گچ و آہک سے ہوتی تھی۔ یعنی  
صرف ایسے مکانات کہ سنگی اور پختہ تھے صدمہ باران سے محفوظ رہے۔

واضح ہو کہ عرب میں اتنی بارش کثرت کا حکم رکھتی ہے۔ گو ہندوستان میں  
ایسی بارش کہ جس کی وجہ سے خام مکان گر پڑیں اور پختہ کو کوئی صدمہ نہ پہنچے  
کوئی نادر امر نہیں ہے۔ بہر حال یہ شعر بھی اپنی وضع پر لطف سے خالی نہیں ہے۔  
اور نامطبوع مبالغہ پر دازی سے بمر اہل دور ہے۔

كَأَنَّ قَيْدًا فِي عَرَائِينَ وَيُلِيهِ كَيْفُ أَنْاسٍ فِي بَجَادٍ مُزْمَلٍ  
معنی۔ گویا کہ کوہ بئیر اوایل باران بزرگ قطرہ میں مثل ایک مرد امیر و بزرگ کے  
معلوم ہوتا ہے کہ جو ایک گلیم مخطط اوڑھے ہوئے ہے۔

واضح ہو کہ اکثر جس وقت پہلا پانی بارش کا گرنا شروع کرتا ہے تو بڑے  
بڑے قطرے برستے ہیں اور پیالے جو یہ قطرات زمین کی طرف آتے ہیں تو ان  
سے خطوط کی شکل پیدا ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آسمان سے زمین کی  
طرف لاکھوں خطوط کھینچے ہوئے ہیں۔ یہ پانی جب کسی پہاڑ پر پڑتا ہے تو پہاڑ  
مخطط دکھائی دیتا ہے۔ پس شاعر پہاڑ کے اس طور پر مخطط نظر آنے کو اک  
مرد امیر و بزرگ کے گلیم مخطط کو اوڑھے رہنے کے ساتھ تشبیہ دیتا ہے اور  
واقعی یہ تشبیہ تشبیہ نامہ ہے کس واسطے کہ کوہ کے ساتھ مرد امیر و بزرگ  
کو نسبت وقار حاصل ہے اور کوہ کا مخطط نظر آنا گلیم مخطط کے ساتھ پوری  
مشابہت رکھتا ہے۔ جاننا چاہیے کہ گلیم مخطط سوا امرا کے غریبا کو میسر نہیں  
آسکتی اسے گلیم درویش نہیں سمجھنا چاہیے۔ شاعر کی خوبی کلام محتاج بیان نہیں  
كَأَنَّ ذُرَى دَاسٍ الْمُجْمِيزِ عُدَّةً مِنَ السَّيْلِ وَالْفُتَاءِ فَلَكَّةٌ مِغْزَلٌ  
معنی۔ گویا کہ چوٹی کوہ مجیر کی وقت صبح سیل و خاشاک کے باعث چرخہ دوک ہو رہی  
ہے۔ یعنی کوہ مجیر کی چوٹی کے گرد جو سیل شکل گرداب پیدا کیے ہوئے ہے اور ار

میں خاشاک بھی شامل ہو رہی ہیں۔ تو مجیسر کی چوٹی نے چرخہ کی صورت پیدا کی ہے۔

وَالْقَى لَصَحْرَاءِ الْغَبِطِ بِعَا عِدُ نَزُولِ الْيَمَانِ ذِي الْعِوَابِ الْمُحْمَلِ  
معنی۔ اور ابر مذکور نے صحرائے غبیط میں اپنے مال ڈال دیے جس طور پر کہ تاجریمینی جو جامہ دانوں کا مالک اور ان کا بار کرنے والا ہوتا ہے نزل کرتا ہے۔

واضح ہو کہ تاجریمینی جامہ ہائے منقش لاتا ہے اور فروخت کی نظر سے انہیں لوگوں کے سامنے پھیلاتا ہے تاکہ لوگ دیکھیں اور خرید کریں۔

پس شاعر کہتا ہے کہ ابر مذکور صحرائے غبیط میں تاجریمینی کا طور اختیار کرتا ہے۔ یعنی رنگ برنگ کے پھول ہر طرف کھلاتا ہے۔ ہر سمت میں سبزہ اُگاتا ہے اس کی مثال ویسی ہے کہ جیسے تاجریمینی کسی دیار میں وارد ہوتا ہے۔ خریداروں کو اپنے جامہ ہائے منقش دکھانے کے واسطے انہیں پھیلاتا ہے۔ شاعر نے ایک نہایت پیاری تشبیہ اختیار کی ہے۔ مرزا قاسمی بھی اپنے قصیدہ منقبت امام ہشتم علیہ السلام میں نمود و گل و سبزہ کو پارچا ہائے منقش سے تشبیہ دیتے ہیں۔  
خرد شد ہر دم از گردوں کہ پوشد بر تن بامون

ز سنبل کسوت اکون ز ژاله خلعت دیبا

ز پس گلہائے گونا گوں چمن چوں صحف انگلیوں

تو گوئی شش سقلاطوں صبا گسترہ در مرغی

كَانَ مَكَائِي الْجَوَاءِ غُدِيَةً صُجْنُ سُلَافٍ مِنْ رَجِيْقِ مُفْلَقٍ  
معنی۔ گویا کہ مرغان بیابان نے ایسی شراب بامداد پی ہے کہ جو خالص اور فلفل انداختہ ہے یعنی بارش کے ہو جانے سے طیور ایسے مست ہو رہے ہیں کہ گویا انہوں نے شراب صبح پی ہے اور حالت مستی میں نوا سنجیاں کر رہے ہیں۔ بعد بارش کے ایسی ہی کیفیت ہوتی ہے کہ طیور مست نغمہ رہتے ہیں۔

شاعر کی خوبی بیان محتاج نہیں ہے۔ جس قدر شعر بالا فطرتی مذاق رکھتا

ہے اہل مذاق پر ہویدا ہے۔

كَانَ السَّيَّاحُ فِيهِ عَزَى عَشِيَّةٍ بِأَرْجَائِهِ الْقَصُوفُ أَنْابِشُ عُصْفَلٍ



معنی۔ جب بارش کی کثرت ہوئی اور درندے ترتر ہو کر خاک آلودہ ہو گئے تو ان کی صورتیں وادیاں دور افتادہ میں بیخ ہائے پیاز دشتی کی ہو گئی جو خاک آلودہ رہا کرتی ہیں۔ یعنی درندے خاک آلود ہو کر بیخ ہائے پیاز دشتی کی صورت ہو گئے پیاز دشتی کی جڑیں زمین میں مضبوطی کے ساتھ گڑے رہنے کے سبب سے ہمیشہ خاک آلود رہا کرتی ہیں۔ پس دوان دشتی خاک آلودہ ہو کر انہیں کی صورت کے ہو گئے۔

واضح ہو کہ یہ قصیدہ نمونہ کے طور پر انتخاب ہوا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ تمام قصائد سب سے فصاحت و بلاغت اور حسن شاعری میں غالب ہے بہر حال اس قصیدہ کے ملاحظہ سے حضرات ناظرین قبل بعثت کی شاعری عرب کا انداز سمجھ جائیں گے۔

جاننا چاہیے کہ یہ سب قصائد فطرتی مذاق رکھتے ہیں اور بلاشبہ بہت سے عمدہ خیالات پر مشتمل ہیں۔ ان قصائد میں بادشاہوں یا امیروں کی جھوٹی تعریفیں مندرج نہیں ہیں۔ ہر شاعر سچے جوش سے یا واردات قلبیہ اور دیگر امور ذہنیہ کو کہیں پر بیان کرتا ہے یا معاملات خارجیہ کو کہیں پر حوالہ قلم کرتا ہے۔ فارسی کے شعرا کی طرح بے سرو پا طور پر مضمون آوری نہیں کرتا ہے آئندہ معلوم ہو گا کہ کس قدر کم فارسی قصائد مدحیہ ہوا کرتے ہیں۔ اکثر شعرائے فارسی نے اپنی عمر عزیز مدح گوئی میں بسر کی ہے۔ اس کی پوری مثال مرزا حبیب قانانی ہیں۔ جن کے قصائد ان کی بڑی قابلیت بڑی بد مذاقی اور بڑی مجبوریوں کی شہادت دیتے ہیں۔

## انتخابات ذیل کتاب حماسہ سے لیے گئے ہیں

جاننا چاہیے کہ حماسہ کا لغوی معنی شدت ہے۔ چونکہ اس کتاب میں لڑائیوں کے اشعار مجتمع ہیں اور لڑائیاں شدت سے خالی نہیں ہوتی ہیں اس واسطے اس کتاب کا نام اس کے مؤلف ابو تمام حبیب بن اوس الطائی نے کتاب الحماسہ رکھا۔

قَالَ بَعْضُ شُعْرَاءِ بَلْعَنْبَرٍ وَاسْمُهُ قَرِيطُ بْنُ أَيْنِفٍ

کلام قریط بن اینف جو شعرا بلعبر سے ہے۔

لَوْ كُنْتُ مِنْ مَازِنٍ لَكُم تَسْتَحُ ابْنِي بَنُو الْقَبْطَةِ مِنْ ذَهْلٍ بَنُ شَيْبَانَ  
یعنی اگر میں قبیلہ مازن سے ہوتا تو میری اونٹ بنو لقیط جو ذہل بن شیبان  
سے ہیں لوٹ کر نہ لے جاتے۔

إِذَا الْقَامَ بَنَصْرِي مَعْشَرَ خُشْنٍ عِنْدَ الْحَفِظَةِ أَنْ ذُولُوتَةٍ لَنَا  
اس وقت میری مدد کو ایک ایسی جماعت کہ حمیت کے وقت سخت ہے  
کھڑے ہو جاتے اگرچہ کوئی کمزور نرمی کیا کرے۔

قَوْمٌ إِذَا الشَّرُّ أَبْدَى نَاجِذِيهِ لَهْمٌ لَمَّا رُوِيَ زَرَانَاتٍ وَوَحْدَانَا  
جب کسی قوم کے لیے فتنہ اپنی دونوں ڈاڑھیں ظاہر کرے یعنی کوئی قوم  
مبتلائے فتنہ ہو جائے تو مازن ایسی قوم ہے کہ اس قوم مبتلائے فتنہ کی طرف  
مدد کی نظر سے گروہ گروہ اور فرداً فرداً اور ٹھ لگتی ہے۔

لَا يَسْأَلُونَ أَخَاهُمْ حِينَ يَنْدِي مُهْمٌ فِي النَّائِبَاتِ عَلَى مَا قَالَ بُرْهَانَا  
یہ مازن ایسے ہیں کہ جب ان کا کوئی بھائی یعنی جب کوئی انہیں مصیبت  
کے وقت پکارتا ہے تو اس سے بلانے کا سبب نہیں پوچھتے۔ یعنی فوراً بے پوچھے  
بات کیے ملک کو مستعد ہو جاتے ہیں۔

لَكِنْ قَوْمِي وَإِنْكَالُ ذِي عَدَدٍ لِيَوْمٍ مِنَ الشَّرِّ نِي شَيْءٍ وَإِنْ هَانَا  
لیکن میری قوم یعنی قوم بلعبر اگرچہ عدد کی رو سے بہت افراد سے مرکب  
ہے لیکن فتنہ سے کنارے ہی رہا کرتی ہے گو وہ اس کنارہ کشی میں ذلیل بھی  
ہو جائے۔

يَجْزُونَ مِنْ ظَلَمِ أَهْلِ الظُّلْمِ مَغْفِرَةً وَمِنْ إِسَاءَةِ أَهْلِ السُّوءِ إِحْسَانًا  
میری قوم کا یہ انداز ہے کہ ظالموں کے ظلم کا بدلہ درگزر سے اور بدوں کی  
برائی کا بدلہ بھلائی کے ساتھ کرتے ہیں۔

ظاہراً اس شعر سے قوم بلعبر کی مدح پیدا ہوتی ہے۔ مگر شاعر بسبیل استہزا  
اس قوم کے حق میں اس قول کو کہتا ہے۔ مطلب شاعر یہ ہے کہ یہ قوم کسی وضع کی



حمیت یا خودداری نہیں رکھتے ہیں۔ محض بے کار اور لاشیٰ ہے۔

كَانَ رَبُّكَ لَمْ يَخْلُقْ لِحَثِيَّتِهِ سِوَاهُمْ مِنْ جَمِيعِ النَّاسِ اِنْسَانًا  
گویا خدا نے اپنے خوف کے لیے سوا ان لوگوں کے لیے تمام نوع انسان میں کسی انسان  
کو پیدا ہی نہیں کیا۔ یعنی گویا خوف خدا کے لیے سوا قوم بلعبر کے تمام بنی آدم میں کوئی قوم  
پیدا ہی نہیں ہوتی ہے۔

ظاہر ہے کہ شاعر نے اپنی قوم کی اس شعر میں بڑی ہجو ملیع لکھی ہے۔  
فَلَيْتَ لَوْ قَوْمًا اِذَا دَعَبُوا شَدَّوْا لَإِغَارَةَ قَوْسٍ اَوْ دَعَبَانَا  
اے کاش میرے لیے کوئی ایسی قوم ہوتی کہ جب سوار ہوں تو غارت گری کے لیے  
تیاری کریں درحالیکہ گھوڑوں اور اونٹوں پر سوار ہوں۔

شاعر اپنی قوم کی ضعف و بے چارگی کو بیان کر کے حیرت کرتا ہے کہ کاش  
ایسی کمزور اور بے کار قوم کے عوض اس کی قوم مستعد اور بکار آمد ہوتی۔

واضح ہو کہ قریط بن اینف جس کے اشعار بالا میں قبیلہ بلعبر کا آدمی ہے۔  
بلعبر دراصل بنو العبر ہے اس قبیلہ کے تیس اونٹ بنو اللقیطہ لوٹ لے گئے  
تھے۔ قبیلہ مازن نے قبیلہ بلعبر کی اعانت کی اور سوا اونٹ بنو اللقیطہ کے چھین کر  
قبیلہ بنی بلعبر کو دے دیے۔ شاعر اشعار بالا میں قبیلہ مازن کی مدح اور اپنے قبیلہ  
بلعبر کی ہجو کرتا ہے بہر حال اشعار بالا پر غور کرنے سے چند باتیں پیش نظر ہو جاتی ہیں  
اور وہ یہ ہیں کہ اہل عرب قومی تقاضوں سے ایک خاص حیثیت رکھتے ہیں جس کی  
شریک کم تر اور کوئی قوم نظر آتی ہے۔ صاف یہ اشعار کہہ دیتے ہیں کہ ملک عرب  
میں کوئی عام گورنمنٹ نہیں ہے جس کے تمام سکنائے عرب پابند ہوں۔ اس  
ملک کے متوطن قبیلہ قبیلہ میں تقسیم ہیں اور ہر قبیلہ کا انتظام جداگانہ ہے۔  
چنانچہ امر واقعی بھی ایسا ہی ہے کہ ہر قبیلہ کا ایک شیخ ہوتا ہے جو حکمران قبیلہ  
ہوتا ہے۔ اکثر یہ قبائل آپس میں لڑتے جھگڑتے ہیں اور موافقت و ناموافقت  
کی بنیاد پر آپس میں دوستانہ یا دشمنانہ برتاؤ رکھتے ہیں۔ جھگڑوں کے سبب  
بہت ہوتے ہیں۔ کبھی پانی پلانے میں نزاع پیدا ہوتی ہے۔ کبھی جانوروں  
کی چوری کے لیے جھگڑا اٹھتا ہے۔ اسی طرح بہت سی وجہیں جدال و قتال کے



برپا ہونے کی ہوا کرتی ہیں۔ اور آخر کار نوبت تیغ و سنان کی پہنچتی ہے۔ یہاں فتنہ کے برپا ہونے کی وجہ قبیلہ بنو اللقیط کی غارت گری تھی۔ پس ان باتوں سے ظاہر ہے کہ اگر ملک عرب میں کوئی عام گورنمنٹ موجود ہوتی تو نہ قبیلہ بلعبر کے اونٹ بنو اللقیط اس طور لے جاتے۔ اور نہ اس طور پر قبیلہ مازن قبیلہ بلعبر کی اعانت کرتے مگر جس ملک میں طوائف الملوکی کی شکل لاحق رہتی ہے وہاں کے قبائل اسی طرح کی خود سرانہ کارہ وائی کرتے ہیں۔ یہ تو پولیٹیکل انداز اہل عرب کا اشعار بالا سے ظاہر ہوتا ہے۔ اسی طرح ان اشعار سے طریقہ معاشرت اور فطرتی مزاج بھی اہل عرب کا عیاں ہوتا ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ اہل عرب ایسے لوگ ہیں کہ زمین داری نہیں رکھتے زراعتی پیداوار پر ان کی اوقات کا مدار نہیں ہے ملک گیری کے خیال سے بری ہیں۔ قوانین حال کے پہنچ پاؤں سے ناواقف ہیں ان میں نہ شائستہ ملکوں کے پیچیدہ قوانین مروج ہیں اور نہ کوئی قانون سزا دہی کے عوض معاوضہ کی کاروائی عمل میں لائی جاتی ہے۔ اشعار بالا سے تمام تر ان کی قومی بے زری ہویدا ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تجارتی کاروبار سے تعلق نہیں رکھتے مگر اس بے زری کی حالت میں بھی اپنے ملک سے مالوف نظر آتے ہیں اور اپنی موجودہ حالت کو تمام اہل دنیا کی حالتوں سے اچھی سمجھتے ہیں۔ امور بالا کے علاوہ یہ باتیں بھی ظاہر ہوتی ہیں کہ اپنی اوقات گزاری کا مدار اونٹ گھوڑے وغیرہ کی پرورش پر رکھتے ہیں اور جانوروں کی چری ضرورتوں سے بیشتر صحرائیں رہتے ہیں پھر آپس میں لوٹ مار کرتے ہیں۔ اور آپس کے اونٹ گھوڑے جو ان کی مالی کائنات میں چراتے ہیں اور تب معاوضہ کے خیال سے جدال و قتال اختیار کرتے ہیں۔ اس انداز معاشرت کے سبب سے انھیں تیغ بدست رہنے کی حاجت لاحق ہوتی ہے۔ جس کے باعث ان کی قوم بسبیل عادت بہادرانہ انداز رکھتی ہے۔ اور امر واقعی بھی یہ ہے کہ جب کسی قوم کو اپنی تلوار کے بل پر زندگی بسر کرنی پڑتی ہے، تو تقاضائے معاشرت سے وہ قوم دلیر اور جنگجو ہو جاتی ہے۔ اس طریقہ معاشرت کا اثر اہل عرب کے تمام افعال و اقوال میں دیکھا جاتا ہے۔ چنانچہ ان کی شاعری بھی وہی تیغ بدست مذاق رکھتی ہے۔ اگر ملک عرب



کی شاعری کو بنگالہ کی شاعری سے ملائے تو آسمان وزمین کا فرق محسوس ہوگا۔ ظاہر ہے کہ بنگالہ کے کسی شاعر کے دماغ میں اس طور کے جدال و قتال کے مضامین بسبیل عادت ایسی روانی اور آسانی کے ساتھ جگہ نہیں کریں گے۔ شاید یہ روکھا سوکھا اور تیغ بکف انداز شاعری کا اہل بنگالہ کی زبان میں خوش اسلوب معلوم بھی نہ ہوگا۔ اگر وہاں کا کوئی شاعر اس جنگی انداز کو اختیار بھی کرے تو صاف معلوم ہوگا کہ اس کی شاعری تقاضائے ملکی سے کنارے ہو رہی ہے۔ ہر چند بنگلہ زبان اب کمال خوبی و محبوبی کو پہنچ گئی ہے اور سب طرح کے خیالات ادا کرنے پر قادر ہے اس پر بھی مکمل تقاضوں سے کسی حال میں باہر نہیں ہو سکتی ہے لاریب عرب کی یہ رزمی شاعری جسے حماسہ کہتے ہیں اور اہل فرنگ وارسانگ Warsong کے ساتھ موسوم کرتے ہیں ایک خاص انداز رکھتی ہے کہ اہل عرب کی قومی افتاد طبیعت سے پورے طور پر خبر دیتی ہے۔ واضح رہے کہ عرب کی رزمی شاعری۔ ہومر، ورجل، فردوسی، ملٹن، بیاس، بالیسکی وغیرہ کی رزمی شاعریوں سے جدا انداز رکھتی ہے ان شعرا کی تصانیف بڑی بڑی مثنویاں ہیں۔ برخلاف اس کے اہل عرب کے اشعار رزمی قطعات و قصائد وغیرہ پر مشتمل دیکھے جاتے ہیں جیسا کہ اشعار حماسہ سے ہویدا ہے۔ اہل عرب کی شاعری میں یہ ایک بڑی منقصت پائی جاتی ہے کہ کوئی تصنیف منظوم مثنوی کے پیرایہ میں موجود نہیں ہے۔ یہ ایسا نقصان ہے کہ اگر عربی کی شاعری ذاتی خوبصورتی نہ رکھتی تو فارسی کی شاعری سے اس کو کسی طرح کا مقابلہ نہ ہو سکتا۔ مگر حقیقت حال یہ ہے کہ شعرائے عرب بڑی قوت نطق رکھتے تھے۔ ادائے خیالات خوب کرتے ہیں بلاغت کی داد کامل طور پر دیتے ہیں اور تبعیت فطرت سے خالی کبھی نہیں رہتے اس لیے ان کی شاعری کو فارسی کی شاعری پر مرجع سمجھنا دور از انصاف نہیں ہے۔ جاننا چاہیے کہ خاص کر یہ عمدگیاں حسب مراد بعثت آنحضرت مسلم سے پہلے کی شاعریوں میں پائی جاتی ہیں۔ اُس عہد کے شعرا کے کلام میں بلاشبہ ممتاز طور پر نیچرل رنگ رکھتے ہیں۔ یہ شعرائے سابق عہد جہاں داخلی یعنی Subjective مضامین کو قلم بند فرماتے ہیں تو وہاں ایسے

مضامین کو فطرت کی کامل پیروی کے ساتھ جلوہ دیتے ہیں اور اسی طرح خارجی  
 یعنی OBJECTIVE مضامین کو بھی حوالہ تسلیم کرتے ہیں۔ لاریب ان  
 عمدگیوں کے اعتبار سے سابق کے اہل عرب کی شاعری فارسی کی شاعری پر  
 بہت غلبہ رکھتی ہے۔ البتہ عربی کی شاعری وہی مقدس روح نظر آتی ہے جو خلفائے  
 دمشق و بغداد کے زمانوں سے خبر دیتی ہے۔ اہل عرب کے ان زمانوں کی شاعری  
 بین شکل سے فارسی کی شاعری کا رنگ رکھتی ہے۔ یعنی وہی بد مذاقیہا جو فارسی کی  
 شاعری میں دیکھی جاتی ہیں ان زمانوں کی عربی کی شاعری میں بھی پائی جاتی ہے  
 صاف معلوم ہوتا ہے کہ درباری شاعروں نے قرب سلطانی کے حاصل کرنے کی نظر  
 سے کم حوصلگی کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ہے۔

قَالَ وَدَّ الْبَنُّ ثَمِيلَ الْمَازِنِ

وداک بن ثمیل مازنی کہتا ہے -

رُوِيَ بَنِي شَيْبَانَ بَعْضُ وَعِيدِكُمْ تَلَا قَوَاعِدًا أَخِيلِي عَلَى سَفَوَاتِ

باز آؤ بنی شیبان اپنے بعض وعید سے ملو گے تم کل میرے سواروں سے سفوان پر

تَلَا قَوَاعِدًا لَا جَيْدُ عَنِ الْوَعَا إِذَا مَا عَدَّتْ فِي الْكَامِازِ الْمُتَدَانِ

ملو گے تم ایسے گھوڑوں سے جو لڑائی سے منہ نہیں پھیرتے۔

عَلَيْهَا الْكُمَاةُ الْغُرَمُ مِنَ الْمَازِنِ لِيُوتَ طَعَانٍ عِنْدَ كُلِّ طَعَانٍ

ان گھوڑوں پر آل مازن کے وہ چمکتے منہ ہوں گے جو ہر ایک جنگ میں جنگی شیر

ہیں۔ یعنی ان گھوڑوں پر آل مازن سوار رہیں گے جن کے منہ چمکتے ہیں اور لڑائی

میں شیر کے انداز رکھتے ہیں۔

تَلَا قَوَاهُمْ نَعْرِفُوا كَيْفَ صَبَرُوهُمْ عَلَى مَا جَنَّتْ فِيهِمْ يَدُ الْحَدَّانِ

جب ان سے تم دوچار ہو گے تو پہچان لو گے کہ ان کا صبر حوادث کے وقت کیسا ہے۔

مَقَادِيمُ وَمَالُونَ فِي الرِّدْعِ خَطُوهُمْ بِكُلِّ دَقِيقَةٍ الشُّغْرَتَيْنِ يَمَانِ

یہ آل مازن آگے بڑھنے والے اور اپنے قدم کو جنگ میں باریک دھار والی یمنی

تلوار پر پہنچانے والے ہیں۔

إِذَا السُّحُودُ أَكْثَرُ يَسَالُوهُمْ لَا يَتَحَرَّوْنَ أَمْ يَأْتِي مَكَانَ



یہ آل مازن ایسے ہیں کہ جب ان سے نفرت مانگی جاتی ہے تو طالب مدد سے جنگ و موضع جنگ نہیں دریافت کرتے۔ یعنی بے دھڑک اعانت کے واسطے مستعد ہو جاتے ہیں۔

واضح ہو کہ اشعار بالا کا ملکی رنگ وہی ہے جو اور اشعار کتاب حماسہ کا ہے بنظر اختصار راقم نے کتاب مذکور سے صرف دو شاعر کے کلاموں کو مندرج ہذا کڑا مناسب سمجھا اس رسالہ عجالہ میں اتنی گنجائش نہیں کہ کسی بیان کو طول دیا جاسکے پس مضمون اختصار کو ملحوظ رکھ کر اب راقم ایک قصیدہ متبنی کا درج ہذا کرتا ہے۔ اس قصیدہ سے تمام حضرات عربی داں واقفیت رکھتے ہیں اور واقعی یہ قصیدہ ایسا ہے کہ جس سے متبنی کی اعلا درجہ کی قابلیت شاعری ظاہر ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ شاعر نادر روزگار گزرا ہے اگر اس کی قابلیت کا استعمال بکار آمد طور پر کیا جاتا تو یہ شاعر دنیا کے بڑے بڑے شعرا میں جیسے ہومیرس، ورجل، ملٹن، فرڈوسی، ہالیکی، ویاس، کالی داس، شکسپیر، گوئتا اور میرانیس ہیں شمار کیا جاتا۔ مگر افسوس ہے کہ اس شاعر نے اتنا بڑا زمانہ پایا کہ جس وقت شاعری سے نہایت مبتذل کام لیا جاتا تھا۔ یعنی جس وقت شاعری سلاطین و امرا کے تقرب حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھی جاتی تھی۔ ظاہر ہے کہ ایسے وقتوں میں شاعری کی خوبیاں باقی نہیں رہ سکتی ہیں۔ ایسے وقتوں میں شاعری جس کا کام یہ ہے کہ آزادی، راستی، صفائی، خلوص، سیرجشی اور دیگر صفات حمیدہ کو اپنے تمام افعال و اقوال میں ملحوظ رکھے۔ ناچانا محمود امور کو اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اس کی شرافت ذاتی اور بزرگی نفس درباری شاعر ہونے کے ساتھ تمام تر رخصت ہو جاتی ہے۔ درباری شاعری کی ایک بڑی مثال متبنی ہے۔ جس کی عمر مدحہ مضامین کے گڑھنے میں بسر ہو گئی اگر اس کو آزادی حاصل رہتی تو مدح گوئی کے عوض شاعری کے بکار آمد اور مفید طریقوں کو اختیار کرتا۔ ہزار حیف کہ اس شاعر گرامی کو وہ کام کرنا پڑا جو معمولی بھانٹ وغیرہ کیا کرتے ہیں کس واسطے کہ عموماً مدحیہ رنگ کی قصیدہ گوئی بھانٹوں کی مدح سرائیوں سے اعلا یا اشرف پایہ نہیں رکھتی ہے۔ معاذ اللہ اگر شاعری کی یہی اوقات قرار دی جائے کہ



وہ سلاطین و امرا کے لیے طرح طرح کی غیر فطرتی مدحیہ مضامین پیدا کیا کرے تو شاعری سے زیادہ پوچ ذلیل ادنا مطبوع کوئی دوسرا کام قیاس نہیں کیا جاسکتا ہے۔ مگر جائے افسوس ہے کہ متبنی کو اور اس کے ایسے دیگر درباری شعرا کو اس طرح کی خوار زندگی بسر کرنے کی صورت لاحق ہوئی۔ اس سے زیادہ کیا مصیبت خیر کوئی طریقہ زندگانی تصور کیا جاسکتا ہے کہ آدمی ہزار کدو کوشش کے ساتھ ان باتوں کو عمر بھر زبانِ مستلم پر لایا کرے جنہیں خود وہ اپنے دل میں لغو و دروغ اور مہمل جانتا ہو۔ شاعری زہار لغو کوئی یا دروغ کوئی نہیں ہے۔ شاعری ایسی عظیم شے ہے کہ اس سے ہمارے بڑے بڑے اخلاقی تمدنی اور مذہبی اعراض متعلق ہیں۔ شاعری ہرگز اس واسطے نہیں مخلوق ہوئی ہے کہ بد مذاق سلاطین و امرا کو خوش کرنے کے لیے ایک نہایت غیر فطرتی رنگ سے برتی جائے۔ مگر ہزار افسوس ہے کہ عربی، فارسی اور اردو شاعریوں کا ایک ممتاز حصہ ایسا ہی نظر آتا ہے کہ جبارین وقت کی مدح و ثنا پر مشتمل ہے۔ اگر مداحی و ثنا خوانی کا رنگ فطرتی کبھی ہوتا تو قصائد و مدحیہ اس قدر تنفر انگیز نہیں معلوم ہوتے۔ مگر مدح سرائی کا لغو ذبا اللہ ایسا بڑا پیرایہ نظر آتا ہے کہ طبع فطرت پسند پورے طور پر متاثر ہوتی ہے۔ ارباب انصاف غور فرمائیں کہ قصیدہ گوئیوں کا یہ کیا طریقہ مدح سرائی ہے کہ اپنے ممدوح کے صاحب قدرت و ذی اختیار ہونے کو اگر بیان کریں تو اسے مالک قضا و قدر بنا کر چھوڑیں، ہوا، برق باران، آتش، آب، جبال، بحور سب کو اس کے زیر فرمان بتائیں اور اسی طرح ہزاروں لائق مضامین کو مستسلم بند کر جائیں۔ بہت سے ایسے قصائد عربی فارسی اور اردو میں موجود ہیں کہ ان کے مدحیہ اشعار جو سلاطین و امرا کے شان میں ہیں۔ اگر خدا نعت محمد مصطفیٰ اور منقبت علی مرتضیٰ میں پڑھے جائیں تو کوئی مضائقہ معلوم نہ ہو۔ متبنی کے اس قصیدہ میں بھی جو ابوعلی ہارون بن عبدالعزیز الزالارواحی کی مدح میں ہے۔ ایسے ایسے مضامین دیکھے جاتے ہیں کہ اگر رسول خدا اور ائمہ اظہار کی شان میں عرض کیے جاتے تو کسی شخص کو عذر نہ ہوتا۔ بلکہ وہ مضامین ایسے ہی ہیں کہ بزرگان دین کی شان میں عرض کیے جائیں نہ کہ نام آوران دنیا



کی۔ یہ قصیدہ تو خیر جیسا ہے ویسا ہے۔ اگر بعض شعرائے فارسی کے مدحیہ قصائد کو دیکھیے تو وہ بے سرو پا باتیں ہیں کہ جس کی کوئی حد نظر نہیں آتی ہے۔ اس پر بھی ایسے قصائد کی قدر دانیاں اپنے اپنے وقت میں سلاطین و امرا کی طرف سے اس درجہ پر ہوئی ہیں کہ ان کے خیال سے تعجب گذرتا ہے۔ خدا جانے ممدوحین کیسے لغو پسند تھے اور مداحین کیسا مذاق رکھتے تھے۔ ممدوحین کی تو یہ حالت دیکھی جاتی ہے کہ وہ اپنے شعرائے درباری پر قصائد و مدحیہ کی فرمائشیں کرتے تھے اور اگر ان سے بجا آوری خدمت میں کوئی کمی ظہور میں آتی تھی تو ان پر چشم نمائی عمل میں لائی جاتی تھی۔ چنانچہ متبنی کے ساتھ بھی ایسے معاملے پیش آئے ہیں جیسا کہ خود اس کے بعض کلام سے عیاں ہوتا ہے۔ یوں تو مدح گوئی سے کسی زبان کی شاعری خالی نہیں ہے مگر جو بھر مار مدح گوئی کی عربی فارسی اور اردو میں دیکھی جاتی ہے اس قدر کسی زبان میں نہیں دیکھی جاتی۔ متبنی کی تمام تصنیف قصائد مدحیہ سے مملو ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس شاعر نے سوا مدح گوئی کے کوئی دوسرا کام ہی نہیں کیا ہے۔ حالانکہ اس کی فطرتی قابلیت شاعری ایسی تھی کہ ہر صنف شاعری میں اس کو ممتاز عالم بنا سکتی تھی۔ مگر حیف ہے کہ اس نے اس وقت عالم ہستی میں قدم رکھا کہ جب شاعری شیوہ مذلت اختیار کر چکی تھی۔ یعنی جب شاعری سلاطین و امرا کی خوشامد کے لیے مختص کی جا چکی تھی ایشیائی درباروں کی بے عنوانیوں سے قابل لحاظ ایک یہ بے عنوانی بھی ہے کہ ہمیشہ شاعری محل کی لونڈی مانی گئی ہے اور شعرا در دولت کے غلام سمجھے گئے ہیں۔ تقاضائے ضرورت سے بے چارے شعر نے بھی ایسے سمجھے جانے کو گوارا رکھا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ان کی شاعری بد مذاقی کا طومار نظر آتی ہے۔ اس کثرت کے ساتھ عربی فارسی اور اردو زبانوں میں قصائد مدحیہ کا موجود ہونا شاعری سے بے سرو پا طور پر شاہان و امرا کے مناقب و محامد ضبط تحسیر میں۔ در آئیں۔ بلکہ قصیدہ وہ صنف شاعری ہے کہ جس میں شاعر اعلا درجہ کے مضامین جو معاملات اخلاق، تمدن و مذہب و دیگر اہم امور ذہنیہ و خارجیہ وغیرہ وغیرہ پر مشتمل ہوتے ہیں۔ قلم بند کرتا ہے۔ ایسے قصائد عربی و فارسی میں موجود ہیں



اور بوجہ عمدگی مذاق کے بہت قابل توجہ ہیں۔ مگر کم تر شعرائے زمانہ ایسے رنگ میں کہتے ہیں چنانچہ اس زمانہ میں جب لفظ قصیدہ کا استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے مراد قصیدہ مدحیہ ہوتا ہے۔ حالانکہ مدح گوئی جان قصیدہ گوئی نہیں ہے۔ بلکہ مدح گوئی ایک اذل طریقہ قصیدہ گوئی کا ہے جو قصیدہ مدحیہ ہوتا ہے۔ اس میں آزادی، خلوص، راستی، حق پروری، حق شناسی وغیرہ وغیرہ کے رنگ ہرگز نہیں پائے جاسکتے ہیں۔ پس جو قصیدہ ان خوبیوں سے معرا ہوا اس کی بے حقیقتی و ذالت اور کم حوصلگی میں کیا گفتگو کی جاسکتی ہے۔ غرض قصیدہ گوئی یہ ہے کہ عالی درجہ کے مضامین جو خواہ عالم ذہن اور خواہ عالم خارج سے متعلق ہوں قلم بند کیے جادیں۔ مثلاً مسائل توحید و عدل، نبوت، امامت، معاد، صدق، محبت، صبر، شکر، رضا وغیرہ وغیرہ یا مسائل خلقت ارض و سما و ما بینہا اور اسی طرح کے دیگر امور اہم جو شاعر حکمت آب کی توجہ کے قابل متصور ہے۔ مدحیہ قصائد وہی قابل پسند ہو سکتے ہیں جو حمد و نعت و منقبت میں لکھے گئے ہیں۔ یا آئندہ لکھے جائیں۔ مثلاً قصیدہ بردہ یا قصیدہ فرزدق جو نعت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور منقبت امام زین العابدین علیہ السلام و الثنا پر مشتمل ہیں۔ لیکن ایسے قصائد جو سلاطین و امرا کی مدح میں دیکھے جاتے ہیں زہار ایسے نہیں ہیں کہ کوئی تعلیم یافتہ دماغ کا آدمی ان سے کسی قسم کا حفظ اٹھا سکے۔ عموماً ایسے قصائد معاملات فطرت سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے۔ اس لیے نہایت قابل نفرت ہیں۔ جو قصیدہ یا کوئی صنف شاعری کی نیچرل خوبیوں سے معرا ہے۔ اس کی جانب شخص محصل طبیعت مائل نہیں ہو سکتی۔ شاعری کے واسطے تبعیت فطرت، واجبات سے ہے جو شاعر فطرت کی پیردی سے عاجز ہے اس کو لازم ہے کہ شعر نہ کہے کچھ اور کام کرے۔ بغیر تبعیت فطرت کلام مقبول اہل مذاق نہیں ہو سکتا مجرد تبعیت فطرت کا اثر ہے کہ امری القیس کی قصیدہ گوئی گو اس قدر حسن قبول نصیب ہے جو صاحب مذاق اس شاعر کے کلاموں کو بڑھتا ہے۔ ان کی نیچرل خوبیوں کو دیکھ کر آفریں صد آفریں کہتا ہے اور صرف زبانی تعریف نہیں کرتا ہے بلکہ ان کے جذبی تاثرات کا معترف ہو کر دل سے ان کی محبوبیوں کا اقرار کرتا ہے



متبنی قوت شاعری میں امری القیس یا دیگر شعرائے عرب سے زہار کم نہیں ہے مگر افسوس ہے کہ اس نے ایسے زمانہ میں ظہور کیا کہ جس وقت شاعری اپنی اصلی حالت پر باقی نہیں رہی تھی و شستگی زبان وہ سادگی انداز و لطف بے ساختگی وہ ولولہ محبت وہ جوش آزادی وہ قوت خلوص وہ زور استغنا وہ تبعیت فطرت اور بھی دیگر خوبیاں جو امری القیس یا دیگر شعرائے قبل بعثت کو نصیب تھیں۔ عہد متبنی میں گاد خورد ہو چکی تھیں پس ایسی صورت میں متبنی سے عالی مذاقی کی امید کیا کی جاسکتی ہے۔ ایسے زمانہ میں جہاں شاعر کو بھانٹ کا کام کرنا پڑے وہاں شاعری کیا جو ہر دکھلا سکتی ہے۔ ناچار متبنی کو ایسا شاعر بننا پڑا کہ جیسا اس کے عہد کا تقاضا تھا۔ قصیدہ ذیل جو بسبیل انتخاب درج ہذا کیا جاتا ہے اس سے متبنی کی پوری کیفیت معلوم ہوگی۔ یہ قصیدہ کہے دیتا ہے کہ عہد متبنی میں عربی کی شستگی زبان رخصت ہو چکی ہے۔ غبی انداز کلام دخل پا چکا ہے۔ مذاق شاعری میں کچھ ایسا انقلاب پیدا ہو گیا ہے کہ جو شعر نظر سے گزرتا ہے کہیں سے سوا الفاظ عربیہ کے خیالات کے اعتبار سے ملک عرب کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رہتا۔ شاعری کو جو ایک وقت میں آزادی کا پایہ حاصل تھا زوال پذیر ہو گیا ہے شاعر کو خلوص، جوش محبت، صدق، صفا استغنا اور تبعیت فطرت سے کوئی رابطہ باقی نہیں رہا ہے۔ شاعری دیروزہ گری ہو رہی ہے۔ اور شاعر ناکسی بے آبروئی اور ذلت کی تصویر ہو رہا ہے۔ اس قصیدہ میں اول بارہ شعر تشبیب کے ہیں اور بقیہ مدحیہ اشعار ہیں گریز تیرہویں شعر میں ہے۔ تشبیب کے اشعار غزل کا رنگ رکھتے ہیں اور پُر از بلاغت ہیں۔ مگر جذبی تاثیر سے معرّا ہیں۔ اس لیے کہ واردات قلبیہ اور تبعیت فطرت سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے باقی جو مدحیہ اشعار ہیں مبالغہ پردازی کے طومار ہیں اور انھیں کو بھلے لگ سکتے ہیں جو اغراض شاعری سے خبر نہیں رکھتے۔

### قصیدہ در مدح ابو علی ہارون بن عبدالعزیز الارواحي الکاتب

أَمِنْ أَرْذَلِ يَارَ لِي فِي الدُّجَى الْوَقْبَاءُ إِذْ حَيْثُ كُنْتُ مِنَ الظُّلَمِ ضِيَاءُ  
معنی۔ تاریکی میں تیری ملاقات کی طرف سے رقیبوں کو اطمینان ہے۔ کس واسطے



کہ اندھیرے میں جس جگہ تو ہوتی ہے روشنی ہوتی ہے یعنی تیرا پر تو حسن ایسا نور افگن ہے جہاں تو رہتی ہے وہاں اندھیرا نہیں ہوتا۔ تیری شمع روئی کے باعث تاریکی نور کے ساتھ مبدل ہو جاتی ہے۔ پس جب یہ کیفیت ہے تو رقیبوں کو اس امر کی طرف سے اطمینان ہے کہ اندھیرے میں کبھی تجھ سے ملاقات نہیں ہو سکتی۔ متبنی کی خلائی سخن محتاج بیان نہیں ہے۔ یہ مضمون ہر چند اور زبانوں میں بھی قلم بند پایا جاتا ہے مگر اس شاعر ادیب و بلیغ نے کسی زبان سے سرقہ نہیں کیا ہے یہ مضمون تمام تر اس کے حسن طبیعت کا جلوہ ہے۔ قبل اس کے کہ بقیہ اشعار اس قصیدہ کے زبان اردو میں ترجمہ کر کے دکھائے جاویں امر قابل عرض یہ ہے کہ عربی میں سخن سنجی کا طور ایسا ہے کہ شعرا نے عرب جب اشعار عاشقانہ رنگ میں کہتے ہیں تو اپنے مخاطب کو ہمیشہ مؤنث قرار دیتے ہیں یعنی عربی کی عاشقانہ شاعری مرد کی طرف سے عورت کی جانب ہوا کرتی ہے بلاشبہ یہ فطرتی تجربہ سخن سنجی کا ہے اور زبان عربی میں بہت بھلا بھی معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح یورپین زبانوں میں بھی عاشقانہ خطاب کا یہی طور ہوا کرتا ہے مگر فارسی اردو اور ہندی میں اس کے برعکس طریقہ برتا جاتا ہے۔ بعض نئی روشنی والے حضرات فارسی اور اردو کے اس انداز کلام پر منہ آتے ہیں اور غایت نا فہمی سے اظہار رائے فرماتے ہیں کہ یہ طریقہ اب متردک کیا جائے۔ اپنی اس رائے کی تائید یہ حضرات اس دلیل کے ساتھ کرتے ہیں کہ فطرتی طریقہ عاشقانہ سخن سنجی کا یہ ہے کہ خطاب عاشقانہ مرد کی طرف سے عورت کی جانب ہونا چاہیے مگر یہ نہیں معلوم ہوا کہ قوانین فطرت میں کیا نقصانات لاحق ہو جاسکتے ہیں۔ اگر وہی خطاب عاشقانہ عورت کی طرف سے مرد کی جانب کیا جائے اس امر کی طرف راقم عنقریب رجوع کرے گا کس واسطے کہ یہ امر ہندی گیت دوہرہ وغیرہ سے تعلق رکھتا ہے۔ مگر فارسی اور اردو کے انداز سخن سنجی پر جو اعتراض حضرات مسبوق الذکر کا ہے اس کی نسبت یہ عرض ہے کہ فارسی میں تو نہ اسمائے صنم تائید و تائید رکھتے ہیں لیس یہ اعتراض عام طور پر کیوں کر عائد ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اشعار ذیل میں معشوق کے مذکر ہونے کی



کوئی تخصیص نہیں نظر آتی ہے۔

## غزل حافظ

گل بے رخ یار خوش نباشد      بے بادہ بہار خوش نباشد  
طرف چمن و ہوائے بستاں      بے لالہ عذار خوش نباشد  
رقعیدن سرود حالت گل      بے صوت ہزار خوش نباشد  
باغ و گل و گل خوش سست لیکن      بے صحبت یار خوش نباشد  
ہر نقش کہ دست عقل بندد      بے نقش و نگار خوش نباشد  
بیا ر شکر لب گل اندام      بے بوس و کنار خوش نباشد

جان نقد محقرست حافظ  
از بہر شار خوش نباشد

ایضاً

گفتم غم تو دارم گفتار غمت سر آید      گفتم کہ ماہ من شو گفتار اگر بر آید  
گفتم ز مہر و رزان رسم و قابیہ موز      گفتم از ماہر و دیان این کار کم تر آید  
گفتم کہ بوی زلفت گمراہ عالم کرد      گفتم اگر بدانی ہم ادت رہبر آید  
گفتم دل رحمت کے عزم صلح دارد      گفتم بخش جفا را تا وقت اں بر آید  
گفتم کہ بر خیالت راہ نظر بہ بندم      گفتم کہ شب رواست ایں از راہ دیگر آید  
گفتم خوش اں ہوائے کز باغ خلد خیزد      گفتم خنگ نیسے کز کوئے دلبر آید  
گفتم کہ نوش لعلت مارا بآرزو کشت      گفتم تو بندگی کن کان بندہ پر در آید

گفتم زبان عشرت دیدی کہ چوں سر آید  
گفتم خموش حافظ کیں غصہ ہم سر آید

واضح ہو کہ ایسے بہت سے کلام دکھلائے جا سکتے ہیں کہ جن میں مخاطب کے مذکور ہونے کی تخصیص نہیں ثابت ہوتی ہے۔ نئی روشنی والے ایسے اشعار کے مخاطب کو اپنی تقلید پرستی کے مذاق کے مطابق مومنٹ ہی قیاس فرمائیں گو یہ اشعار ایسے ہیں کہ عورت اپنے اس معشوق کے حق میں جو فطرت کے

مطابق سوا مذکر کے مؤنث نہیں ہو سکتا ہے۔ زور شوق میں پڑھ سکتی ہے۔  
لیکن کچھ اشعار ایسے بھی پائے جاتے ہیں کہ ان کا مخاطب ایسا ہی ہے کہ سوا مذکر  
کے مؤنث نہیں ہو سکتا تو اس کی صورت یا یہ ہے کہ وہاں مخاطب معشوق  
حقیقی ہے جو کسی زبان میں مؤنث قرار نہیں دیا جاسکتا ہے جیسا کہ اشعار  
ذیل سے معلوم ہوگا۔

حسن خود در دروئے خواباں آشکارا کردہ      پس چشم عاشقان خود را تماشا کردہ  
پر تو حسنت گنجد در زمین و آسمان      در حریم سینہ حیرانم کہ چوں حبا کردہ  
لمؤلف

لے روئے ابد رنگ گرفتہ ز بہارت      در گلشن حسن تو گز نیست خزاں را  
یایہ کہ وہاں مخاطب ایک ایسا مرد جوان رعنا ہے کہ جس کی شان میں  
عورت کی طرف سے شاعر کلام عاشقانہ قلم بند کرتا ہے۔

حسن سبزے بخط سبز مرا کرد اسیر      دام ہمرنگ زمین بود گرفت ارشدم  
ز بہار اس شعر سے غرض شاعر اظہار امر دپرستی نہیں ہے۔ جیسا کہ  
کچ فہم معترضوں نے سمجھا ہے۔ اب رہی اردو کی عاشقانہ سخن سنجی تو اس کی حالت  
یہ ہے کہ زبان اردو میں ہر لفظ مذکر ہے۔ یا مؤنث خود لفظ معشوق مذکر ہے اور  
جتنے الفاظ معشوق کے معنی میں استعمال کیے جاتے ہیں مذکر ہیں جیسے یار جانا  
بت منم وغیرہ وغیرہ۔ پس ضرورت زبان کی وجہ سے جب کوئی کلام عاشقانہ  
رنگ میں قلم بند ہوتا ہے تو اس کا مخاطب بھی ضرور مذکر قرار پاتا ہے۔ ورنہ حقیقت  
مراد شاعر کبھی امر دپرستی نہیں ہوتی دوم یہ کہ غزل گوئی ایک ایسی صنف

شاعری ہے کہ جو فارسی اور اردو کے سوا کسی زبان میں اس وضع خاص سے نہیں  
دیکھی جاتی ہے اور اگر اس کے تقاضوں پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس سے  
تمجید باری تعالیٰ و انکشاف حقائق عشق وغیرہ مراد ہے۔ لیکن عوام یہ سمجھتے ہیں کہ  
اس میں عاشقانہ مضامین قلم بند ہوتے ہیں اور اکثر مرکز شاعر کوئی معشوق مجازی  
ہوتا ہے حالانکہ یہ بات نہیں ہے اس صنف شاعری کو زیادہ تعلق معشوق حقیقی  
سے ہے۔ بالغرض اگر کہیں پر معشوق مجازی بھی مرکز شاعر ہوتا ہے تو اس



غزل کے ساتھ ذکر کرتا ہے کہ شان کلام میں کسی طرح پر امتدال نہیں لاحق ہوتا ہے پس جب غزل گوئی سے مراد شاعریہ ہے کہ عاشقانہ پیرایہ سخن میں تمجید باری تعالیٰ کی شکل پیدا ہو یا دیگر معاملات عشقیہ و امور ذہنیہ احاطہ تحریر میں در آئیں تو عظمت مضامین کے خیال سے شاعر اپنے مخاطب کلام کو پیرایہ مذکور میں دکھلاتا ہے۔ اگر معشوق کو بہ ترکیب مومنث خطاب کرتا تو احاطہ خیال تنگ ہو جانے کے باعث وہ صحت کلام جس کی بدولت ذہن سامع فوراً معشوق حقیقی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے بالکل رخصت ہو جاتی اس وقت تو یہ وسعت حاصل ہے کہ جب کسی شعر میں شاعر معشوق کا ذکر کرتا ہے یا معشوق کی طرف خطاب کرتا ہے تو معشوق حقیقی کا تصور بے اختیار دل میں آ جاتا ہے۔ ایسی حالت میں بہ قصد اصلاح نئی روشنی والوں کی جانب سے کہ اب سے جتنے اشعار کہے جائیں ان میں جہاں ذکر معشوق کا کیا جائے تو نحوی ترکیب صیغہ و ضمائر کی مومنث ہوا کرے خالی از نقصان نہیں ہے۔ واقعی یہ عجیب پوچ فرمائش ان حضرات کی ہے۔ اس سے تو بالکل عرض غزل گوئی فوت ہو جاتی ہے۔ علاوہ توجہ ہلا کے یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ اہل اسلام میں عورتیں پردہ نشین مانی جاتی ہیں۔ اس لیے انھیں مستورات کہتے ہیں رواج مذہبی و ملکی یہی ہے اور اس قدر رسم پردہ داخل معاشرت ہو گیا ہے کہ سوسائٹی میں بے دھڑک ایک غزل میں بیس جگہ مستورات کا ذکر بہ سبیل و ضمیر مومنث نہایت مکروہ معلوم ہو گا۔ جب تک اس رسم پردہ کو حضرات نئی روشنی والے متروک نہ فرمائیں اس ترکیب کے ساتھ اصلاح غزل گوئی میں کوشاں نہ ہوں۔ پروفیسر یار

FALMER بھی فارسی اور اردو میں معشوق کے مذکور یاد کیے جانے کی توجہ اس رنگ سے بیان فرماتے ہیں کہ جیسا کہ راقم نے ابھی بالائیں عرض کیا۔ بلاشبہ غزل گوئی میں معشوق کو بار بار بصیغہ و ضمیر مومنث ذکر کرنا عظمت غزل گوئی کو ضائع کرنے والا ہو گا۔ البتہ مثنوی، ڈراما، مرثیہ وغیرہ میں جو طور دنیا میں صیغہ و ضمیر کے استعمال کا ہے اس کی پابندی شعرائے اردو کو بھی کرنی پڑے گی اور اس وقت بھی کرتے ہیں۔ میر حسن نے اپنی مثنوی سحر البیان میں بدرمیز کو مذکور نہیں لکھا ہے اور نہ کوئی مثنوی گو اس طریقہ بیان سے انحراف کرے گا۔



ظاہر انہی روشنی والوں کو تبعیت نیچر کی پابندی کا بڑا خیال معلوم ہوتا ہے۔ تبعیت فطرت اللہ ایک ایسی شے ہے کہ اس کا التزام انسان کے لیے واجبات سے ہے مگر بد لفظی کے ساتھ کسی امر کا پابند ہونا قباحت سے خالی نہیں ہوتا۔ اہل انصاف غور فرمائیں کہ اردو کی ترکیب ایک خاص وضع کی ہے ہر لفظ کے مذکر یا مؤنث ہونے سے یہ زبان نہ صرف دشوار ہو رہی ہے بلکہ اس کا انداز بھی نرالا ہو رہا ہے۔ یہ اعتراض کہ معشوق کو فطرت اللہ کی رو سے مؤنث ہونا چاہیے عجب اعتراض ہے۔ فطرت کی رو سے تو معشوق مذکر و مؤنث دونوں ہو سکتا ہے۔ مرد کا معشوق جب کوئی ہوگا تو عورت ہوگی۔ عورت کا معشوق جب کوئی ہوگا تو مرد ہوگا۔ اگر فطرت کی رو سے ہمیشہ معشوق کو مؤنث ہونا چاہیے تو کوئی عورت شاعرہ اور بھی عاشق ہو تو اس کے معشوق کو بھی مؤنث ہونا چاہیے واقعی انہی روشنی والوں کی پابندی فطرت کا یہ عجیب نتیجہ نکلے گا خدا جانے ان حضرات نے کیوں مذکر و مؤنث کا یہ بکھیرا پھیلا لیا ہے ہر قدم پر یورپ کی تقلید کرنا چہ معنی دارد۔ تبعیت فطرت کا معنی تقلید یورپ نہیں ہے۔ اگر یہی پابندی فطرت اور جوش تقلید ہے تو ارباب نیچر اب سے شمس کو کو مذکر اور قمر کو مؤنث زبان عربی میں قرار دیں گے۔ اس لیے کہ انگریزی زبان میں شمس مذکر ہے اور قمر مؤنث۔ اس طرح کی اصلاح پر عمل کرنے والے اکثر وہی حضرات ہوتے ہیں کہ انھیں یورپین زبانوں میں یادست گاہ نہیں ہوتی یا یورپین زبانوں کو ٹوٹی پھوٹی طرح جانتے ہیں۔ ایسے حضرات کو کمال نادیدگی سے تمام یورپین چیزیں نہایت عجب انجیز معلوم ہوتی ہیں اور لاعلیوں کے باعث ایسی غلطیاں کرتے ہیں جن سے قومی فائدہ ہونے کے عوض قومی ضرر مرتب ہوتا ہے۔ دوہری اور ہندی گیتوں وغیرہ میں بھی معشوق اکثر مذکر دیکھا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ معشوق وہاں ترکیب زبان کی رو سے مذکر واقع ہے بلکہ ہندی کی شاعریاں جو عاشقانہ رنگ میں ہوتی ہیں عورت کی طرف سے مرد کی طرف ہوتی ہیں۔ یہ ایک عجیب امر ہے کہ ہندوستان کی عورتوں کی افتاد مزاج سے خبر دیتا ہے۔ ہندوستان کی عورتیں اپنے مردوں کو اس قدر چاہتی ہیں



معلوم ہوتی ہے کہ انھیں ایک شوہر کے بعد دوسرے شوہر کے پانے کی کسی حالت میں توقع نہیں رہتی ہے۔ اس لیے ہندی کا عاشقانہ کلام ایسا پُر از موز ہوتا ہے کہ کسی ملک کی عاشقانہ شاعری اس کو نہیں پہنچتی ہے۔ یہ گیت ہندی ایسے پرتاثر ہوتے ہیں کہ ان کو سن کر دل ہاتھ سے جانے لگتا ہے۔ اکثر گیتوں میں عورت اپنے شوہر سے بچھڑ جانے کے مضمون کو بیان کرتی ہے یا اشتیاقیہ کلام از قسم انتظار و یاس وغیرہ کو زبان پر لاتی ہے۔ علاوہ اس کے قومی معشوق ہندوؤں کے شام یعنی کاندھ جی ہیں۔ اکثر گیت جو تصنیف ہوتے ہیں ان کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں۔ پس ایسی حالتوں میں ہندی گیتوں اور دوسروں وغیرہ میں معشوق مخاطب مذکر ہوا کرتا ہے۔

واضح ہو کہ متبنی اپنے قصیدہ کے مطلع بالا میں معشوق کو مؤنث خطاب کرتا ہے۔ اور یہ تمام تر عربی شاعری کے دستور کے مطابق ہے کما لا ینفٰی

قَلْنَ الْمَلَجَتِ دَهِي مَشْكَةً هَتَكُمَا وَمَسِيرُهُمَا فِي السَّيْلِ دَهِي ذُكَاؤُ

معنی۔ چونکہ معشوق میں مشک کی بویائی ہے اور آفتاب کی ضیا ہے تو جب وہ حرکت میں آتی ہے یا رات کو چلتی ہے تو یہ دونوں امرا اس کی پردہ دری کے سبب ہوتے ہیں

أَسْفَى عَلَى أَسْفَى الذِي دَلَهْتَنِي عَنْ عِلْمِهِ فِيهِ عَنَى خَفَاءُ

معنی۔ مجھے افسوس ہے تو اپنے اس غم پر ہے کہ تیرے پریشان کرنے سے میری عقل اس قدر جاتی رہی ہے کہ مجھے اب غم کے محسوس کرنے کی بھی تمیز باقی نہیں رہی۔

وَسَيَكُنِّي قَقْدُ السَّقَامِ لَا تَنْ قَدْ كَانَ لَمَّا كَانَ أَعْضَاءُ

معنی۔ مجھے جو شکایت ہے وہ اپنے مرض کے جاتے رہنے سے ہے جب تک مرض تھا میرے اعضا بھی باقی تھے۔ اب جو مرض جاتا رہا تو اعضا بھی معدوم ہو گئے ہیں۔ واضح ہو کہ یہ سب اشعار بالاطماتم ترغی مذاق رکھتے ہیں۔ فطرت سے ان کو کوئی تعلق نہیں ہے۔ واردات قلبیہ سے نام کو علاقہ نہیں رکھتے ہیں۔ بالکل مصنوعی شاعری کے نمونے۔ یہی مذاق اکثر عجمی غزل گویوں کا ہے۔ مبالغہ پر دازی سے لطف غزل گوئی جاتا رہتا ہے۔ ناممکن ہے کہ مبالغہ کے ساتھ کوئی کلام پرتاثر

ہوسکے۔ اگر متبنی نے ان اشعار تشبیہ میں حافظ کی سچی شاعری کا رنگ اختیار کیا ہوتا تو یہ اشعار دل پر کوئی معقول اثر پیدا کرتے۔ مگر چونکہ متبنی کی شاعری روٹی کی شاعری تھی اسے حافظ کا رنگ اختیار کرنا ناممکنات میں سے تھا روٹی کی شاعری واردات قلبیہ سے معزا ہوتی ہے۔ روٹی کا متلاشی شاعر مدام مبالغہ، استعارہ، تشبیہ وغیرہ کے نامطبوع پہلوؤں کا برتنے والا ہوتا ہے۔ جیسا کہ مرزا حبیب تا آنی و ذوق دہلوی وغیرہ دیکھے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ انداز سخن قبل بہشت آنحضرت صلعم کے شعرا میں کیا تھا۔ اس عہد کے شعرا نہایت فطرتی انداز غم و خوشی اور دیگر واردات قلبیہ کے اظہار کرنے کا رکھتے تھے۔ جو طریقہ شاعری اس جگہ متبنی نے اختیار کیا ہے اس کو فطرت کی تبعیت سے کوئی علاقہ نہیں معلوم ہوتا ہے اور اہل مذاق کی پسند سے بمراحل دور ہے۔ البتہ جو اغراض شاعری سے ناواقف ہیں اس کی مبالغہ پر دازیوں کی بھرمار سے عاجز آکر صدائے تحسین و آفریں بلند کریں تو خلاف از توقع نہیں ہے۔

اَنَا صَحْدَةُ الْوَادِي إِذَا صَا وَحَيْثُ وَإِذَا انْطَقْتُ فَيَا سَنِي الْجَوْدَاعُ  
معنی۔ میرے دل میں تو نے اپنی نگاہ سے زخم لگا کر اپنی آنکھ کی تصویر بنا دی ہے کہ وہ دونوں آپس میں فراخی کے اعتبار سے مشابہ ہو گئے ہیں۔ یعنی چونکہ تیری آنکھ بڑی ہے اور جب تیری نگاہ نے میرے دل پر ایسا زخم لگایا ہے کہ جو تیری آنکھ کی تصویر کا حکم رکھتا ہے تو ضرور ہے کہ وہ زخم تیری آنکھ کی طرح بڑا بھی ہو۔ پس میرا زخم تیری آنکھ کے ساتھ از روئے فراخی کے مشابہت رکھتا ہے۔ یعنی جس قدر بڑی آنکھیں تیری ہیں اسی قدر میرا زخم دل بھی بڑا ہے۔

یہ شعر بھی مصنوعی شاعری کا نمونہ ہے۔ ظاہر ہے کہ باوجود بلیغ ہونے کے کوئی لطف معاملہ قلبی کا نہیں رکھتا۔

نَفَذْتُ عَلَى السَّابِرِيِّ وَرَبَّمَا تَنَدَّقُ فِيهِ الصَّعْدَةُ السَّمَوَاءُ  
معنی۔ تیری نظر میری زرہ کے پار ہو گئی ہے حالانکہ وہ زرہ ایسی ہے کہ اکثر اس میں سیدھے گندم رنگ نیزے ٹوٹ جاتے ہیں۔ یعنی جس زرہ سے نیزہ نہیں پار ہوتا ہے تیری نگاہ اس سے یار ہو جاتی ہے۔



أَنَا صَخْرَةُ الْوَادِي إِذَا صَارَ زَوْجَمْتُ وَإِذَا أَنْطَقْتُ فَإِنِّي الْجَوْزَاعُ  
معنی۔ میں استقلال میں نالے کا پتھر ہیں جب کہ وہ ڈھکیلا جائے۔ اور جب میں  
بولتا ہوں تو جوزا ہوں۔

واضح ہو کہ جوزا وہ برج ہے کہ مقام عطار وہ ہے۔ عطار کو دبیر ملک بھی کہتے  
ہیں۔ چونکہ اس سیارہ کی طرف علم و ہنر کی نسبت کی جاتی ہے۔ اس لیے شاعر  
اپنے کو جوزا کہتا ہے۔ یعنی اپنے کو مقام عطار و قرار دیتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے  
کہ میں صاحب نطق کامل ہوں۔

وَإِذَا أَخْفَيْتُ عَلَى الْغَيْبِ نَعَاذِرُ أَلَا تَرَانِي مُقَلِّدُ عَمِيَاءُ  
معنی۔ اگر میں نادان سے پوشیدہ ہوں تو وہ معذرت ہے کیونکہ اندھی آنکھ نہیں  
دیکھ سکتی۔ یعنی اگر میرے کمال کو نادان نہیں درک کر سکتا تو وہ معذور ہے۔ کیونکہ  
اندھے کو کچھ نظر نہیں آتا۔

آنکھ والا تیری جو بن کا تماشا دیکھے دیدہ کور کو کیا آئے نظر کیا دیکھے  
شِيمُ اللَّيَالِي أَنْ تُتِكَ نَاقَتِي صَدْرِي بِهَا أَفْضَى أَمِ الْبَيْدَاءُ  
معنی۔ حوادث زمانہ میری اونٹنی کو شک میں ڈالتے ہیں کہ میرا سینہ ان حوادث  
سے زیادہ تر وسیع ہے یا وہ جنگل جس میں وہ اونٹنی روال ہے۔

شاعر یہاں اپنے مبتلائے حوادث روزگار ہونے کو بیان کرتا ہے اور  
کہتا ہے کہ اس قدر ہم مبتلائے حوادث ہوئے ہیں کہ ان سے میرا سینہ ایسا  
وسیع ہو رہا ہے کہ میری سواری کی اونٹنی کو شک ہو رہا ہے کہ آیا میرا سینہ  
زیادہ وسیع ہے یا وہ جنگل جس میں وہ چل رہی ہے۔

فَقَبْتُ تَسِيدُ مُسَيِّدُ فِي نَيْتِهَا إِسَادَهَا فِي الْمُهْمَةِ أَلَا لَضَاءُ  
معنی۔ پس اس ناکہ کی شب گزاری کا یہ حال ہو رہا ہے کہ اس کی چربی میں لاغری  
یوں سراپت کر رہی ہے کہ جس طرح وہ خود جنگل میں دوڑتی ہے۔

أَنْشَأَهَا قَمْعُوطَةً وَخِفَافًا فَهِيَ مَنكُوحَةٌ وَطَرِيقُهَا عَذْرَاءُ  
معنی۔ اس کے تنگ کے چشمے کھینچتے کھینچتے دراز اور کھڑنا ہموار راہوں میں  
چلتے چلتے سوراخ دار ہو گئی ہیں اور اس کا چلنا ایسی راہ سے ہوتا ہے کہ جس

راہ پر کوئی پہلے نہیں گیا ہے

يَتَلَوْنَ الْحِزْبَيْنِ مِنْ خَوْفِ التَّوَيِّفِ فِيهَا كَمَا تَتَلَوْنَ الْحَرْبَاءُ

معنی - وہ راہ ایسی ہے کہ جس میں خوف ہلاکت سے رہبر ایسا رنگ بدلتا ہے جیسے گرگٹ - یعنی راہ نہایت پرخطر ہے رہبر کا رنگ ایک آتا ہے ایک جاتا ہے -  
گرگٹ ایک معروف جانور ہے اہل عجم اسے بوقلمون کہتے ہیں - یہ جانور ایک گھٹنے میں چند رنگ بدلتا ہے اس لیے شخص متلون کو حربا سے تشبیہ دیتے ہیں -  
یہ ایک خاص قسم کا گرگٹ ہوتا ہے - ہر گرگٹ کو اس طور پر رنگ بدلنے کی قدرت حاصل نہیں رہتی ہے - حربا کا خاصہ ہے کہ آفتاب میں دھوپ کھانے کی غرض سے دیر تک رہتا ہے اور رنگ بدلا کرتا ہے - مؤلف نے اپنے شعر ذیل میں اس مضمون کو باندھا ہے -

جز تلمون ضما نیست بذات عیبی آفتابی و لے خاصیت حربا دار ی

بیتی و بین ابی علی مِثْلُهُ شَمُّ الْجَبَالِ وَمِثْلُهُنَّ رَجَاءُ

معنی - میرے اور میرے مدوح ابی علی کے درمیان بھی ایسے ہی بلند اور سخت پہاڑ ہے اور انھیں پہاڑوں کی سی میری آرزو ہے -

یہاں سے گریز قصیدہ ہے تشبیب کے بعد شاعر گریز اختیار کر کے مرج مدوح شروع کرتا ہے - اکثر مدحیہ قصیدوں کا یہی انداز ہوتا ہے -

وَعِقَابُ لُبْنَانٍ ذَكِيفَ يَقْطَعُهَا وَهُوَ الشِّتَاءُ وَصَيْفُهُنَّ شِتَاءُ

معنی - اور درمیان میرے اور مدوح کے کوہ لبنان کی گھاٹیاں ہیں - ان کی مسافت موسم سرما میں کس طرح قطع ہو کہ ان کا موسم تابستان بھی زمستان کا حکم رکھتا ہے - یعنی وہ گھاٹیاں نہایت سرد ہیں -

لَبْنَى الشُّوْجِ بِهَا عَلَى مَسَايِكِي فَكَانَتْهَا بَيْبَا ضَهَا سَوْدَاءُ

معنی - اس پہاڑ میں کثرت برف سے مجھے راہ نہیں ملتی - گویا وہ برف باوجود سفید رنگ سیاہ ہے - یعنی اس پہاڑ پر برف کے گرنے سے راہ چھپ گئی ہے اور اس لیے مجھے راہ نہیں ملتی کہ آگے چلیں اور ہر چند رنگ برف کا سفید ہے - مگر اس کی سفیدی حکم سیاہی کا رکھتی ہے ظاہر ہے کہ تاریکی میں آدمی چلنے سے



عاجز آجاتا ہے اور یہاں بھی کثرت برف سے چلنا دشوار ہے۔ پس ہر چند برف سفید رنگ رکھتی ہے مگر اس کی سفیدی کچھ سیاہی سے کم نہیں جب اس کے سبب سے کوئی چل نہیں سکتا۔

وَكَذَلِكَ الْكَوْنُ إِذَا تَامَ بِكَدِّهِ سَالَ النَّضَارُ بِهَا وَقَامَ الْمَاءُ  
معنی۔ اور ممدوح ایسا ہی کریم ہے کہ جب کسی شہر میں قیام کرتا ہے تو اس کی سنا کے باعث سونا بہہ چلتا ہے اور پانی حیران ہو کر ٹھہر جاتا ہے  
یہ شعرا ایشیائی شاعری کا پورا نمونہ ہے۔ اور فارسی وارد کے شعرا کو مبالغہ پرداز کی راہ بتانے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ متبنی اور اسی کے سے قصیدہ گو یوں نے فارسی کے شعرا کو غیر فطرتی رنگ پر مدح سرائی کے طریقے سکھائے ہیں اور فارسی کی شاعری کے داعی ہونے کے باعث ہوئے ہیں۔

جَمَدًا الْقَطَارُ ذَكَوْرًا ثُمَّ كَمَا تَزَى بُهِتَتْ فَلَمْ تَنْتَجِسْ إِلَّا نَوَاءً  
معنی۔ اس کے جود کو دیکھ کر قطرات باراں جم گئے اور اگر اس کو جیسے قطرہ لائے باراں دیکھتے ہیں۔ انوا دیکھتے وہ بھی فرط حیرت سے اپنی رفتار میں ٹھہر جاتے۔ واضح ہو کہ انوا ستارے ہیں کہ جن کی طرف امور بارش وغیرہ کی نسبت اہل عرب کرتے ہیں۔ پس مراد شاعر یہ ہے کہ قطرات بارش اسے دیکھ کر جم جاتے ہیں۔ اگر انوا بھی اسے قطرہ لائے باراں کی طرح دیکھ لیتے تو رفتار سے باز آتے۔ ایسی مدح سرائیاں کس طرح مدحین کو پسند آتی تھیں عہد متبنی شاعری کی بڑی بد حالی سے خبر دیتا ہے۔

فِي خِطْبِهِ مِنْ كُلِّ قَلْبٍ شَهَادَةٌ حَتَّى كَانَتْ مِدَادُهَا الْأَمْوَاءُ  
معنی۔ ہر دل میں اس کی تحریر کی خواہش ہے گویا دلوں کی خواہشیں اس کو لکھنے کی سیاہی بن گئی ہیں

واضح ہو کہ ممدوح کاتب تھا اس لیے یہ شعر اس کی کتابت کی تعریف تھی کہا گیا ہے۔ یہ تعریف یا اس کی خوش خطی کی ہے یا اس کی سناوت کی ہے کہ وہ فراہم عطیات لکھ دیتا ہے۔ یہ شعر کم غیر فطرتی رنگ رکھتا ہے اور ایسا ہے کہ

اگر اس طور پر مدح ممدوح کی جائے تو ایسی مدح سرائی چنداں خلاف مذاق صحیح نہیں ہوگی۔

وَلَكِنْ عَيْنٌ مُسْتَوَةٌ فِي تَرْبِهِ حَتَّى كَانَ مَغْنِيْبَهُ الْاَقْدَاءُ  
معنی۔ اس کے قرب میں سبھوں کی آنکھوں کو ٹھنڈک ہے یہاں تک کہ اس کا نظر سے دور ہونا آنکھوں کی کھٹک کا باعث ہوتا ہے۔

اس شعر کی شاعری نہایت پیاری ہے۔ کمالاً مخفی

مَنْ يَحْتَدِي نِي الْفِعْلِ مَا لَا يَهْتَدِي فِي الْقَوْلِ حَتَّى يَفْعَلَ الشُّعْرَاءُ  
معنی۔ ممدوح ایسا ہے کہ عمل میں اس بات کو پہنچ جاتا ہے جسے شعرا اپنے قول میں نہیں پہنچتے جب تک ممدوح اس کا عامل نہیں ہو لیتا۔ یعنی ممدوح کا ایسا عمل ہوتا ہے کہ شاعر کے خیال میں بھی نہیں آتا۔ جب تک ممدوح اسے دیکھ نہ لے۔  
یہ مدح اچھا شاعرانہ رنگ رکھتی ہے اور قصائد مدحیہ میں ایسی مدح کا پہلو نامطبوع نہیں معلوم ہوتا۔

فِي كُلِّ يَوْمٍ لِلْقَوَارِي جَوْلَةٌ فِي قَلْبِهِ وَكَأْذِبِهِ اهْغَاءُ  
معنی۔ ہر روز اس کے دل میں شعرا کے اشعار مدحیہ کی گردش ہے اور وہ انھیں دل سے سنتا ہے۔ یعنی ہر روز شعرا اشعار مدحیہ کہہ کر اس کے پاس لے جاتے ہیں اور وہ انھیں جی لگا کر سنتا ہے۔

مؤلف کی دانست میں کوئی شخص عام اس سے کہ سلطان یا امیر ہو جب تک مبتلائے بد مذاقی نہ ہوگا ہر روز شاعروں کی مدح سرائیوں کی تکلیف گوارا نہیں کر سکے گا۔ ظاہر ہے کہ شفاف اور صحیح خیال کا آدمی لایعنی تعریفوں سے کیوں محفوظ ہونے لگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کے اہل ثروت بے حد مبتلائے بد مذاقی تھے اور شعرا بھی اپنی ضرورتوں کے باعث بے مذاق ہو رہے تھے۔ زمانہ موجودہ بھی طلب اہل ثروت اور مدح گو شعرا سے خالی نہیں ہے۔ ابھی تک ایشیائی درباروں کا یہی رنگ دیکھا جاتا ہے اور اصلاح مذاق کی صورت نظر نہیں آتی ہے۔

وَاغَارَةٌ فِيْهَا احْتَوَاءُ كَمَا نَمَّا فِي كُلِّ بَيْتٍ فَيُلَوِّحُ سَهْمَاءُ



معنی۔ اور جو کچھ اس نے جمع کیا ہے اس میں لوٹ بٹا ہوئی ہے۔ گویا ہر شکر ایک لشکر جبار ہے۔ یعنی ممدوح کا خزانہ وقف شعرا ہو رہا ہے، ہر شعر مدحیہ لشکر جبار کی طرح اس کی دولت محزونہ کو لوٹ رہا ہے۔

یہ شعرا واقعات تاریخی کے خلاف نہیں ہے۔ عہد خلفائے بنی عباس میں درباری شعرا کے ساتھ ایسے ایسے سلوک ہوتے گئے ہیں کہ مرد محصل کو اس کے خیال سے تعجب گذرتا ہے۔ ایک شعر پر شعرا کو لاکھ لاکھ روپیے ملے ہیں۔ یہ اصراف ایشیائے درباروں کے معاملات تمدن و تہذیب و اخلاق کی خرابیوں سے پورے طور پر خبر دیتا ہے۔

مَنْ يَظْلِمُ الْكُومَاءُ فِي تَكْلِيفِهِمْ أَنْ يَصْبَحُوا وَلَهُمْ لَهُ أَكْفَاءُ  
معنی۔ ممدوح ایسا ہے کہ لیئموں کو اس امر کی تکلیف دیتا ہے کہ وہ اس کے ہم سر ہو جائیں۔ یعنی ممدوح چاہتا ہے کہ لیئم اس کے سے جواد ہو جائیں۔  
یہ خواہش لیئموں کے لیے تکلیف ہے۔ کس واسطے کہ وہ کبھی جواد نہیں ہو سکتے چہ جائیکہ اس کے برابر امر جود میں ہو جائیں۔

وَيَذْهَبُ هُمْ دِيَهُمْ عَرَفْنَا فَضْلَهُ دِيَضِلَّاهَا لَتَيْنِ الْأَشْيَاءُ  
معنی۔ اور ممدوح ان کو برا کہتا ہے حالانکہ انہیں کی بدولت ہم نے اس کی بزرگی پہچانی ہے۔ کس واسطے کہ اضراد ہی سے اشیاء کی شناخت ہوتی ہے۔ یہ شعر اچھا مدحیہ رنگ رکھتا ہے۔

مَنْ نَفَعُهُ فِي أَنْ يَهَاجَ دَحْزَةً فِي تَرْكِهِ لَوْ تَفَطَّنَ الْأَعْدَاءُ  
معنی۔ ممدوح ایسا شخص ہے کہ جیسے نفع لڑائی کے برائے نیکمختہ کیے جانے میں اور ضرر جنگ کے ترک کیے جانے میں ہے اگر دشمنوں کو یہ بات معلوم ہو تو کبھی نہ لڑیں۔ اس شعر کا بھی اچھا مدحیہ رنگ ہے۔

فَالَيْسَ يُكْسِرُ مِنْ جَنَاحِي مَالِهِ بِنَوَالِهِ مَا جَبُرُ الْهَيْجَاءُ  
معنی۔ پس صلح اس کے جود کے سبب اس کے مال کے دونوں بازو توڑ دیتی ہے۔ مگر اس کی تلانی پھر جنگ کر لیتی ہے۔ یہی حالت صلح میں وہ اپنا سب مال لٹا دیتا ہے۔ مگر جب پھر لڑائی ہوتی ہے تو مال غنیمت کے دستیاب ہونے سے جو کچھ وہ

حالت صلح میں خرچ کر ڈالتا ہے۔ اسے پھر مل جاتا ہے۔

يُعْطَى فَيُعْطَى مِنْ لَيْفِي يَدِهِ اللَّهُ ذَرَى بِرُؤْيَا رَائِي لَا رَاءُ  
معنی۔ ممدوح ایسی بخشش کرتا ہے کہ اس کے ہاتھ کی بخشش سے اور لوگ  
بخشش کرتے ہیں اور اس کی جودت نظر دوسروں کو صواب رائیں سمجھاتی ہیں۔  
مُتَفَرِّقِ الطَّعْمَيْنِ مَجْتَمِعِ الْقَوَى فَكَانَتْهُ السَّرَّاءُ وَالضَّرَّاءُ  
معنی۔ ممدوح ذات واحد ہو کر دو متفرق مزے رکھتا ہے یعنی دشمنوں کے حق میں  
تلخ اور دوستوں کے حق میں شیریں ہے۔ اور مجتمع القوی ہے۔ یعنی قوائے  
جسمانیہ اور قوائے روحانیہ میں اعتدال رکھتا ہے۔ پس گویا ممدوح خود مسرت  
و مضرت ہو رہا ہے۔

وَكَاَنَّهُ مَا لَا تَشَاءُ عُدَاوَاتُهُ مُتَمَثِّلًا يُوَفُّدُهُ مَا شَاءَ وَ  
معنی۔ اور گویا کہ ممدوح اپنے دشمنوں کی خواہش کے تمام تر مخالف ہے۔ حالانکہ  
اپنے پاس آنے والوں کے لیے وہی صورت بنا رکھی ہے کہ جیسی ان کی خواہش  
ہے۔

يَا أَيُّهَا الْمَجْدِيُّ عَلَيْهِ رُوحُهُ إِذْ لَيْسَ بَايْتُهُ لَهَا اسْتِحْدَاءُ  
معنی۔ اے وہ شخص کہ تجھ پر تیری روح معاف کی گئی ہے۔ اس سبب سے کہ  
اس کی کوئی مانگ نہیں آتی ہے۔ یعنی ممدوح ایسا شخص ہے کہ اس سے کوئی اس  
کی روح کا طالب نہیں ہوتا ہے۔ ورنہ وہ اپنی روح کو بھی دریغ نہیں رکھتا۔  
إِحْدُ عَفَاتِكَ لَا فُحَّتْ بِفَقْدِهِمْ فَلَتَرْتُكَ مَا لَمْ يَأْخُذْ فَاإِعْطَا مَرَدُ  
معنی۔ اپنے سائلوں کی مدح کر۔ تجھے ان کے گم ہونے سے دکھ نہ ہو جو۔ کیونکہ  
ان کا اس چیز کا نہ لینا جس کے لینے کے وہ طالب نہ ہوئے۔ برائے خود بخشش  
ہے۔

واضح ہو کہ تجھے اس کے گم ہونے سے دکھ نہ ہو جو۔ جملہ معترضہ دعائیہ ہے۔  
مطلب شعریہ ہے کہ اگر تجھ سے مانگے والے تیری روح بھی مانگتے تو دے دیتا۔ مگر  
چونکہ انہوں نے ایسا نہ کیا تو اپنے سائلوں کی مدح کرنیوں نے تجھ سے ایسا مطالبہ نہیں  
کیا۔ پس ان کا غیر طالب ہونا بھی ان کے واسطے بخشش کا حکم رکھتا ہے یعنی تیری



جان ان کی بخشی ہوئی ہے۔ ورنہ تو ایسا جو ادھے کہ ان کی طلب پر جان کو بھی عطا کر دیتا ہے۔ اس لیے تجھ کو ان کی مدح کرنا چاہیے کہ تو ان کا ممنون ہو رہا ہے۔

لَا تَكْثُرُوا الْأَمْوَاتَ كَثْرَةٌ قَلِيلٌ إِلَّا إِذْ أَشَقِيَّتْ بِكَ الْأَحْيَاءُ

معنی۔ مقتولوں کی کثرت تیرے عہد میں ایسی نہیں ہوتی کہ جس سے زندوں میں کمی ہو جائے۔ لیکن البتہ اس وقت میں کہ زندوں کی تیری نافرمانی کے باعث شامت آجائے۔ یعنی تیرے وقت میں بلا ضرورت خوں ریزی نہیں ہوتی۔ وہی مارے جاتے ہیں جو اپنی شامت سے تیری مخالفت اختیار کرتے ہیں۔

وَالْقَلْبُ لَا يَنْشَقُّ عَمَّا حَتَّتْ حَتَّى تَخْلُ بِهْ كَلَفَ الشَّحْنَاءُ

معنی۔ اے کوئی قلب شق نہیں ہوتا جب تک کہ اس میں تیری دشمنی جگہ نہ کرے۔ واضح ہو کہ یہ سب اشعار بالا نحو بصورت انداز مدح رکھتے ہیں۔ اور متنبی کے کمال خلاق سخن سے خبر دیتے ہیں۔

لَمْ تَسْمَرْ يَاهْرُونَ إِلَّا بَعْدَ مَا اِقْتَرَعَتْ وَنَازَعَتْ اُمَمُكَ الْأُمَمَاءُ

معنی۔ اے ہارون تیرا نام ہارون رکھا گیا۔ الایہ کہ ناموں میں منازعت واقع ہونے کے بعد قرعہ ڈالا گیا۔ یعنی اے ہارون تیرا یہ نام تب تجویز پایا جب اور ناموں میں رشک واقع ہونے کے سبب سے لڑائی واقع ہوئی۔ اور اس کا فیصلہ اس طور پر ظہور میں آیا کہ اور ناموں نے قرعہ ڈالا۔ پس از روئے قرعہ انداز کے تیرا نام ہارون قرار پایا۔

فَعَدَدْتُ دَأْمَكَ نِيكَ غَيْرُ مَشَارِكٍ وَالنَّاسُ فِيمَا فِي يَدِكَ سَوَاءٌ

معنی۔ اب تو ایسا ہو گیا ہے کہ اب تیری شہرت کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اور جو شے تیرے ہاتھ میں ہے۔ اس میں سب لوگ برابر ہیں یعنی تیری بخشش عام میں سب مساوی ہیں۔

نَعِمْتُ حَتَّى الْمَدَنُ مِنْكَ مِلَاءٌ وَلَفْتُ حَتَّى ذَانِئَاءُ لِفَاءٌ

معنی۔ تو نے وہ بخشش عام کی کہ تمام شہر تیری انعام دہی سے پر ہو رہا ہے۔ اور تو اس قدر نائی ہو رہا ہے کہ یہ تعریف بے قدر ہے یعنی تیری عظمت کے آگے یہ تعریف لاشے ہے۔

وَلَجُدَّتْ حَتَّى كَدَتْ تَجْلُ حَايِلًا      لَمَنْتَهَى وَمِنَ السُّرُورِ بَكَاءُ  
معنی۔ ٹوٹنے اس قدر جو دکوراہ دی ہے کہ تیسرا جو رانتہا کو پہنچ گیا ہے۔ جس سے بخل لگا ہوا ہے اور انتہا کی ایسی ہی حالت ہوتی ہے جیسا کہ سرور کی حد بکا ہوتی ہے یعنی تیسری بخشش حد کو پہنچی ہوئی ہے۔

فَالْفَخْرُ عَنْ تَقْصِيرِ بَكِ نَاكِبٌ      وَالْمَجْدُ مَنْ اِنْ يَسْتَزَادُ بَرَاءُ  
معنی۔ اب فخر تیرے مرتبہ تک پہنچنے سے قاصر ہے اور بزرگی تیسرا درجہ بڑھانے سے بڑی ہے۔ یعنی تیرا مرتبہ ایسا بلند ہو گیا ہے کہ فخر و عظمت کو وہاں تک رسائی ممکن نہیں ہے۔

فَاِذَا سئِلْتَ فَلَا لَانَكَ مَحْجُوجٌ      وَاِذَا كُئِمَّتْ دَشَتْ بِكَ اِلَاءُ  
معنی۔ اور جب تو سوال کیا جاتا ہے تو اس سبب سے نہیں کہ تو نے لوگوں کو سوال کا محتاج کر دیا ہے اور جب تو چپ رہتا ہے تیری بخشش تجھے ظاہر کر دیتی ہے۔  
وَإِذَا مَدَحْتَ فَلَا تَلْكَ رَفْعَةٌ      لِلشَّاكِرِينَ عَلَى اِلَالِهِ ثَنَاءُ  
معنی۔ اور جب تو مدح کیا جاتا ہے تو اس واسطے نہیں کہ مدح سے تجھے رفعت حاصل ہو۔ شکر گزاروں پر خدا کی ثنا واجب ہے۔ یعنی لوگ جو تیری مدح کرتے ہیں تو اس سے یہ مطلب نہیں کہ مدح گوئی سے تجھے رفعت حاصل ہوتی ہے بلکہ مداحین کا فرض منصبہ ہے کہ تیسری مدح کریں۔ اسی طرح جیسا کہ شاکروں کی شکر گزاری سے خدائے تعالیٰ کو کمال حاصل نہیں ہوتا بلکہ شاکرین کے لیے ایک امر واجب ہے کہ شکر خداوندی بجالائیں۔

وَإِذَا مَطُرَتْ فَلَا لَانَكَ هَجْلٌ      يُسْقَى الْخَضِيبُ وَتُمْطَرُ الدَّمَاءُ  
معنی۔ اور جب تجھ پر بارش ہوتی ہے تو اس سبب سے نہیں کہ تو خشک سالی لانے والا ہے بلکہ شاداب زمین سیراب کی جاتی ہے اور دریا پر مینہ برسا یا جاتا ہے۔

لَمْ تَحْكُ فَاِنَّكَ السَّحَابُ وَانْتَمَا      حُمَّتْ بِهِ نَصِيبُهَا الرُّخْصَاءُ  
معنی تیری بخشش کو سحاب نہیں پہنچ سکتا مگر بات یہ ہے کہ اسی گرمی رشک سے بخار آ گیا ہے اور ریزش اسی بخار کا پسینہ ہے۔ واضح ہو کہ ہر چند ہر دو اشعار بالا



سے متبنی کی خلاقی سخن ہویدا ہے مگر ایسے شعروں سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ اس شاعر نے ایسا بڑا زمانہ پایا تھا کہ جس وقت اس واضح کی مبالغہ پرداز یوں سے جبارین وقت خوش ہوتے تھے معیوب سمجھی جانے کے عوض ایسی شاعری مقتدر جانی جاتی تھی۔ ان اشعار کا رنگ جیسا غیر فطری ہے محتاج بیان نہیں ہے طبیعت کو تنفر ہوتا ہے اور متبنی کی قابلیت کے استعمال بد پر افسوس آتا ہے۔  
 لم تلتق مکان الوجه شمساً نارداً      إلا يوجه ليس فيه حياءُ  
 معنی۔ آفتاب ممدوح کی روئے روشن کے سامنے نہیں ہوتا ہے الا ایک ایسے منہ کو لے کر جس میں کچھ حیا نہیں ہے۔

یہ ایک معمولی رنگ مبالغہ پرداز کا ہے اس میں کوئی بڑی جدت نہیں ہے۔

فبايما قدّم سعيّت إلى العلى      ادم لہلال لاخمسك حداۓ  
 معنی۔ اے ممدوح تو کن قدموں رفعت کو پہنچا ہے ماہ نو کی کہاں تیرے تلوؤں کی جوتی ہو رہی ہے۔

ذلك الزمان من الزمان وقاية      ذلك الحمام من الحمام نداۓ  
 معنی۔ زمانہ ہی حادث زمانہ سے تیری سپر ہوئی اور موت ہی تیری موت کا فدیہ یعنی تو جمع حادث زمانہ سے مامون رہے اور اب تجھے کبھی نہ موت آئے۔

لولا تکت من ذالورنى الذامنك هو      عقت بمولد نسلها حواۓ  
 معنی۔ اگر تیری خلقت بنی آدم میں نہ ہوتی تو حوا تو بانجھ ہوتی اور اس سے کوئی نسل ظہور میں نہ آتی۔ یہاں متبنی نے مبالغہ پرداز کا خاتمہ کر دیا ہے اپنے ممدوح کے بارے میں کہتا ہے کہ اس کا ممدوح ہی اجرے نسل عالم کا سبب ہوا۔ اگر اس کی خلقت نہ ہوتی تو حوا کے لطن سے نہ کوئی پیدا ہوتا اور نہ نسل آدم جاری ہوتی۔ مخقر یہ کہ متبنی کے قول کے مطابق بنی آدم کا ظہور اس کے ممدوح کی خلقت کے باعث ہوا ہے یعنی اگر منشی ہرطن پیدا نہ ہوتے تو نوح شیث اور لیس ابراہیم اسماعیل اسحاق یعقوب یوسف موسیٰ زکریا۔ عیسیٰ محمد علی صغرتا ائمہ جمیع انبیاء جمیع اہل کمال اور جس کے نوکر ممدوح متبنی تھے۔ وغیرہ وغیرہ

پیدا نہ ہوتے۔ اگر یہ شعر محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کوئی شاعر کہتا تو حسب عقیدہ ہم غلامانِ محمدؐ کے نہایت مناسب تھا۔ مگر کاتب ہارون کے لیے یہ شعر جس قدر نازیبا ہے محتاج بیان نہیں ہے۔ ملا کاشی نے اپنے ہفت بند میں مولائے دو عالم کی شان میں اسی مضمون کا شعر لکھا ہے اور وہ یہ شعر ہے۔

گر نبودے ذاتِ پاکت آفرینش سبب تا ابد جو استردن بودی و آدم عذب  
 مولا کی شان میں یہ شعر نازیبا نہیں ہے۔ کس واسطے کہ بقول پاک حضرت رسول  
 مقبولؐ مولا کو درجہ عینیت حاصل ہے چنانچہ لمحک لحمی و دمک دمی و نفک نفسی  
 و روحک روحی و آنا و علی من نور واحد۔ یہ سب ایسے اقوال ہیں جن سے عینیت  
 بخوبی ثابت ہوتی ہے۔ پس جب ایسی مدح سرور کائنات کو زیبا ہے تو مولائے  
 دو عالم کو بھی ایسی مدح کا استحقاق حاصل ہے۔ حضراتِ ناظرین اس شعر سے  
 تجویز فرمائیں کہ کس قدر شعرائے درباری نے روٹی کے لیے اپنے فنِ شریف  
 کو ذلیل کر رکھا تھا۔ اپنے مدوحین کی ستائشیں ایسی بیباکی سے کرتے ہیں  
 کہ ان کو خدا اور رسولؐ کسی کی عظمت کا خیال باقی نہیں رہتا ہے۔ متنبیؒ کے سے  
 شعرا کے کلاموں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مدوحین ان کے اقوال  
 کی رو سے بلاشبہ خدا اور رسولؐ کے ہم پایہ تھے۔ ان کے مدوحین آفتاب،  
 ماہتاب، کواکب، بروج، ہوا، برق، باران، قضا و قدر سب پر اختیار  
 رکھتے تھے۔ ایسی مدح سرایوں سے مدح اور مدوح دونوں کی بد مذاقیوں  
 آشکارا ہیں بلاشبہ ایسی شاعریوں سے فنِ شاعری نے بڑا داغ پایا ہے۔  
 جن سلاطین و امرا نے ایسی شاعریوں کی اعانت کی ہے اور وہ حقیقت  
 فنِ شاعری کے بڑے دشمن تھے۔ افسوس ہے کہ عربی فارسی اور اردو زبان  
 کی شاعریاں انھیں مدح سرایوں کی بدولت نہایت ذلیل و حقیر ہو رہی  
 ہیں۔ جس طرح متنبیؒ اور دیگر درباری شعرا عرب کی بدولت عربی کی شاعری  
 بدنام ہو رہی ہے اُسی طرح فارسی کی شاعری تا آتی وغیرہ اور اردو کی شاعری  
 ذوق وغیرہ کے باعث خراب و خستہ ہو رہی ہے لیکن اگر چشمِ انصاف سے  
 دیکھیں تو یہ سب شعرا خود ان سب زبانوں کی شاعریوں کے محرب نہیں



ہوتے ہیں بلکہ سلاطین کی بد مذاقیاں ان کے محرب فن شاعری ہونے کی وجہ بڑی ہیں۔ واضح ہو کہ منتخبات بالا بعثت آنحضرت صلعم کے قبل اور بعد کی شاعریوں کے نمونے ہیں۔ راقم دونوں کا فرق بیان کر چکا ہے۔ اب اس کے اعادہ کی حاجت نہیں۔ مگر ظہور اسلام کے ساتھ جو مہذب اور تعلیمی مذاق کی شاعری نے جلوہ گری دکھلائی اس کی مثال میں کچھ اشعار جناب امیر المومنین علیہ السلام کے درج کیے جاتے ہیں۔ ان اشعار کے انداز سے معلوم ہوگا کہ اسلامی شاعری کیا ہے اور معاملات بنی آدم کی اصلاح ایسے اشعار سے کس قدر ہو سکتی ہے حقیقت یہ ہے کہ امیر المومنین علیہ السلام کا کلام کلام الامیر امیر الکلام کا مصداق ہے۔ ہر طالب حق کا فرض منصبی ہے کہ آپ کے منظوم و غیر منظوم کلاموں کو بالاستیعاب ملاحظہ کرے۔ اور کچھ نہ ہو تو دیوان حضرت کو ضرور پڑھ ڈالے ظاہراً یہ دیوان بہت کچھ قومی توجہ کے قابل معلوم ہوتا ہے مگر تعجب یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان بہت ایسے ہیں کہ یا اس سے ناواقف ہیں یا اس کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ ظاہر ہے کہ یہ دیوان ایک بڑے شخص کا ہے وہ شخص نہ صرف مذہبی پہلو سے بڑا مانا جاتا ہے بلکہ ہر ملت و مذہب کا غیر متعصب آدمی اسے نظر عظمت سے دیکھتا ہے۔ قبل اس کے کہ کچھ اشعار دیوان پاک سے حضرت کے اندراج ہذا کیے جائیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ لفظ ”اے ذکر“ علی عبادۃ حضرت کے ذکر خیر سے راقم اور ناظرین ثواب اندوز عقبی ہوں۔

غلی۔ نام پاک آپ کا غلی ہے اور کنیت ابوالحسن اور یہی بو تراب ہے۔ آپ کے والد بزرگوار کا نام حضرت ابوطالب ہے اس لیے آپ کو علی بن ابی طالب کہتے ہیں۔ ابوطالب پیغمبر خدا کے حقیقی چچا تھے۔ پیدائش آپ کی ۲۳ برس ہجرت کے قبل ظہور میں آئی اور شہادت ۴۰ ھ میں بمقام کوفہ بدست عبدالرحمن بن ملجم واقع ہوئی۔ وقت شہادت میں سن شریف آپ کا ۶۳ برس کا تھا۔ آپ باپ اور ماں دونوں طرف سے بنی ہاشم تھے۔ کس واسطے کہ ماں آپ کی فاطمہ بنت اسد بن ہاشم ہیں۔ آپ کے فضائل و مہمات ذیل میں محض مختصر طور پر حصول سعادت کی نظر سے عرض کیے جاتے ہیں۔

(۱) آپ پیغمبر خدا صلعم کے محسن زادے ہیں اس لیے کہ حضرت رسول خدا یتیم تھے حضرت ابوطالب نے حضرت صلعم کو پالا اور بے پدری کے غم کو آپ کے دل مبارک میں آنے نہ دیا جب تک زندہ رہے حضرت صلعم کے جان و دل سے معین و مددگار رہے اور کفار قریش مکہ کے واروں کو روکتے رہے (دیکھو کتب تاریخ) اور اپنی عرصہ حیات تک پیغمبر خدا صلعم پر کسی طرح کا آسیب آنے نہ دیا۔

(۲) حسب و نسب میں رسول خدا صلعم کے ہمسرتھے آپس کا رشتہ خون محتاج بیان نہیں۔

(۳) رسول اللہ صلعم آپ کو اپنا جان و تن سمجھتے تھے جیسا کہ فرمودہ آں حضرت صلعم ہے لِحِمِّكَ لِحْمِي وَدِمَّتِكَ دَمِي وَنَفْسُكَ نَفْسِي وَدُوحَكَ دَوْحِي۔

گر لِحْمِ لِحْمِي یہ حدیث نبوی ہے۔ بے صلّ علی نام علی بے ادبی ہے

(۴) حسب ارشاد نبوی یعنی انا و علی من نور واحد رسول اللہ صلعم کی خلقت اور آپ کی خلقت نور واحد سے تھی۔

(۵) آپ داماد پیغمبر صلعم کے تھے اور داماد بھی کیسے کہ حضرت خیر النساء جناب فاطمہ الزہرا کے شوہر۔

(۶) آپ داخل آل عبا ہیں یعنی اذن سے ہیں جو رسول اللہ صلعم کے کمل میں لے کر آیت تطہیر یعنی انما یرید اللہ لیذهب عنکم الرجس اهل البیت ویطہرکم تطہیرا پڑی تھی۔

(۷) آپ بچے از اہل بیت نبوی صلعم ہیں خدائے تعالیٰ آپ کو اور آپ کی بی بی کو اور آپ کے دونوں بیٹوں کو اہل بیت کے ساتھ خطاب کرتا ہے۔ جیسا کہ آیت مذکورہ میں واقع ہے۔

(۸) آپ بچے از پنجتن پاک ہیں۔ عبارت ہے حضرت رسول اللہ صلعم جناب علی مرتضیٰ فاطمہ الزہرا اور حسن حسین علیہم الصلوٰۃ والسلام سے پنجتن پاک کا مضمون خود آیت تطہیر سے ثابت ہوتا ہے۔

(۹) آپ بچے از چہار دہ معصوم ہیں۔ چہار دہ معصوم عبارت ہے جناب پیغمبر خدا و خاتون جنت یعنی جناب فاطمہ الزہرا اور دوازدہ امام سے۔ معصوم عبارت



ہے ایسے شخص سے گناہ کبیرہ و صغیرہ سب سے پاک ہو پس جس طرح پیغمبر خدا  
صلعم معصوم ہیں اسی طرح حضرت خاتون جنت اور بقیہ حضرات ائمہ اثنا عشر  
معصوم ہیں۔ راقم کا مذہب یہی ہے کہ یہ چار دہ تن صغائر و کبائر سے تمام تر  
پاک ہیں۔ لیکن غیر امامیہ سوائے رسول اللہ صلعم کے کسی کو معصوم نہیں جانتے۔  
(۱۵) آپ اول خیل ائمہ ہیں۔ واضح ہو کہ خاندان پیغمبر کے امام بارہ حضرات  
ہیں۔ اول ان سے امام علی مرتضیٰ دوم امام حسن مجتبیٰ سوم امام حسین شہید  
کر بلا چہارم امام سید الساجدین زین العابدین حضرت سجاد پنجم امام باقر ششم  
امام جعفر صادق ہفتم امام موسیٰ کاظم ہشتم امام علی رضا نہم امام محمد تقی دہم امام  
علی نقی یازدہم امام حسن عسکری دوازدہم امام مہدی صاحب الزماں علیہم الصلوٰۃ  
والسلام۔ یوم القیام۔ یہ ائمہ معصومین جانشین رسول اللہ ہیں اور سبب و فور علم  
دوہی کمالات کے دین محمدی کے فروغ دینے والے گذرے ہیں۔ جتنے سادات  
ہیں انہیں حضرات سے تعلق نسبی کہتے ہیں۔ اور بقول قطیبہ ایک وقت میں  
سادات انہیں حضرات کے طریقہ سے پابند تھے۔ ان جگر گوشگان رسول اللہ  
کے فضائل شمار سے بیرون ہیں۔ دوست داران خاندان محمد ان پر درود و سلام  
پہنچیں۔ یہاں پر ایک درود درج ہذا کیا جاتا ہے جو ان حضرات ائمہ کے ذکر پر  
مشتمل ہے اور وہ یہ ہے۔

لبیک اللہ ربنا وسعدیک اللہم صل وسلم علی سیدنا و مولانا محمد  
وآل سیدنا و مولانا محمد الذی کان علیاً فی درجاتہ حسناً فی صفاتہ  
شہیداً فی تجلیات زین العابدین باقر علم الاولین و الآخرین صادق  
فی اقوالہ کاظماً فی جمیع احوالہ متمکناً فی مقام الرضا جواد اکف  
عند العطا ہادیاً الی سبیل النجاة عسکریامع الغزاة مہدیاً الی  
طریقہ الیقین صلوٰۃ اللہ و سلامہ علیہ و علیہم اجمعین۔

(۱۱) آپ آیت مباہلہ ندع ابنائنا و ابناؤکم کی رو سے بھی داخل اہل بیت  
ہیں۔ مسلم سعد بن ابی وقاص سے روایت کرتے ہیں کہ جب یہ آیت مباہلہ نازا  
ہوئی تب رسول اللہ نے علی و فاطمہ و حسن و حسین کو بلایا اور فرمایا اللہم

ہولاء اہل بیٹی۔

(۱۲) آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک سب لوگوں سے احب تھے۔ جیسا کہ حدیث طبر سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس حدیث کو ترمذی اور امام حاکم نے روایت کیا ہے اور وہ حدیث یہ ہے کہ ایک روز جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے ایک مرغ بریاں رکھا ہوا تھا اور آپ دعا مانگ رہے تھے کہ الہی اس شخص کو بھیج دے کہ ساری خلقت سے جو تیرا زیادہ محبوب ہے تاکہ وہ میرے ساتھ اس طیر کو تناول کرے۔ انس بن مالک جو اس حدیث کے راوی ہیں کہتے ہیں کہ میں خدا سے دعا مانگتا تھا کہ ایسا شخص میری قوم انصار سے ہو مگر کچھ دیر نہ گزری تھی کہ حضرت علی آئے اور آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس طیر کو تناول فرمایا۔

(۱۳) آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مثل ہارون کے تھے جیسا کہ حدیث انت بمنزلتہ ہارون من موسیٰ اس پر دال ہے۔

(۱۴) آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سبائی دین و دنیا میں ہیں کما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انت اخي في الدنيا والاخرة

(۱۵) آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ درجہ عینیت حاصل ہے چنانچہ رسول اللہ نے فرمایا ہے کہ اِنَّ عَلِيًّا مِنِّي وَاَنَا مِنْهُ وَهُوَ وَلِيُّ كُلِّ مُؤْمِنٍ اس حدیث کو عمران بن حصین سے ترمذی نے روایت کی ہے علاوہ اس کے حدیث نور و حدیث لمحکم لثمی وغیرہ سے بھی آپ کی عینیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ثابت ہوتی ہے۔

(۱۶) آپ جمیع مومنین کے ولی و مولیٰ یعنی آقا ہیں۔ اس قول کی حیثیت حدیث بالا اور حدیث خم غدیر من کنت مولاه فعلی مولاه ہیں۔ ضرورت مذہبی سے جن صاحبوں نے ولی و مولا کا معنی دوست محب اور ناصر قرار دیا ہے اور علی مرتضیٰ کے آقائے جمیع مومنین ہونے سے چشم پوشی کی ہے ان لوگوں نے درحقیقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آقائے مومنین ہونے سے درپردہ انکار کیا ہے کس واسطے کہ ان حدیثوں سے جو نسبت علی کو ساتھ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے پیدا ہے وہ ایسی ہے کہ محض یگانگی سے خبر دیتی ہے۔ ایسی صورت میں ضرور ہے کہ جو مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جمیع مومنین و مسلمین سمجھیں اپنے مقابلہ میں وہی مرتبہ علی مرتضیٰ کا بھی مانند ان حدیثوں کی بنیاد پر



کبھی ایسا خیال نہیں کیا جاسکتا ہے کہ پیغمبر خدا کا آقائے مومنین ہونا تو مانا جائے مگر علی مجرد دوست محب اور ناصر سمجھے جائیں۔ زہار ان حدیثوں میں لفظ مبولی یا ولی اس طور پر نہیں استعمال کیا گیا ہے پیغمبر صاحب کی نسبت کے ساتھ تو آقائے مومنین کا معنی پیدا کرتے اور علی صاحب کی طرف جب منسوب کیا جائے تو اس کا معنی ناصر محب اور دوست سمجھا جائے۔ ان دونوں حدیثوں کے الفاظ مبولی ہیں اور نہ ترکیب دشوار ہے۔ فہم معمولی کے خلاف بھی کوئی امر نہیں ہے اس پر بھی اگر ناحق کے جھگڑے پیدا کیے جائیں تو یہ مقدرات کی بات ہے واقعی محبت علی بھی ایک امر منجانب اللہ ہے جس کو چاہے خدائے تعالیٰ عطا فرمائے۔

ایں سعادت بزور بازو نیست تانہ بخشد خدائے بخشندہ

(۱۷) آپ رسول اللہ کی جانب سے ادائے حق کرنے کے تمام تر سزاوار تھے اس قول کی مثبت یہ حدیث یعنی علی منی وانا من علی دلائل دلی عنی الا انا وعلی۔ راوی اس حدیث کے حبش بن عبادہ ہیں۔ معنی اس حدیث کا یہ ہے کہ علی مجھ سے ہے اور میں علی سے ہوں اور نہیں کوئی حق ادا کرے گا میری طرف سے مگر میں یا علی۔ اس حدیث کا قفہ نقض عہد مشرکین مکہ سے متعلق ہے یہاں اس کے اعادہ کی گنجائش نہیں ہے شایقین تحقیق خود دریافت حقیقت فرما کر رائے قائم کر لیں۔ (۱۸) آپ کی پیدائش کعبہ میں ہوئی اور شہادت مسجد میں۔

کعبہ میں حیات اور مسجد میں مات جو کچھ پایا خدا کے گھر سے پایا

(۱۹) آپ باسباب ظاہر سب سے اول اسلام قبول کرنے والے ہیں اس لیے ارشاد فرماتے ہیں۔ مسقتکم الاسلام طراً۔ غلاماً مابلغت ادا آن حلیہ۔ لفظ طراً قابل لحاظ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے آپ نے اسلام قبول فرمایا تھا یہ تو عالم اسباب کی بات ہے ورنہ حقیقت حال یہ ہے کہ جب آپ اور رسول خدا صلعم نور واحد سے ہیں تو کسی وقت میں آپ کی طرف شرک و کفر کی نسبت نہیں کہی جاسکتی ہے۔

(۲۰) آپ بڑے صاحب علم و حکمت تھے۔ اس قول کی مثبت حدیث آنا دارالحکمة وعلی بابھا۔ راوی اس کے ترمذی ہیں یہ حدیث انا دینہ العلم

رب لامکاں کا قصد شکر ہے کہ اس نے ہمیں توفیق دی کہ ہم اردو ادب کی کتب کو سافٹ میں تبدیل کر سکے۔ اسی صورت میں یہ کتاب آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ مزید اس طرح کی عمدہ کتب حاصل کرنے کے لئے ہمارے گروپ میں شمولیت اختیار کریں۔

انکھامیہ برقی کتب

گروپ میں شمولیت کے لئے:



محمد ذوالقرنین حیدر: +92-3123050300

اسکالر سردار طاہر صاحب: +92-3340120123



کے لفظوں کے ساتھ بھی مشہور ہیں۔ آپ کے اقوال، خطبات، اشعار، اجتہادات وغیرہ وغیرہ بڑی علمی حیثیت سے خبر دیتے ہیں۔

(21) آپ بڑے عالم قرآن تھے جیسا کہ امام کو ہونا چاہیے۔

(22) آپ کو اور قرآن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ساتھ ساتھ یاد فرمایا ہے جیسا کہ فرمودہ آل حضرت کا ہے۔

القرآن مع علی وعلی مع القرآن

(23) آپ قرآن ناطق تھے جیسا کہ خود فرمودہ امیر المومنین علیہ السلام کا ہے۔

آپ کو غیر صادق القول وہی سمجھ گاہ جو گمراہ اذلی ہوگا۔

(24) آپ عمرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں داخل ہونے کے باعث عظمت میں کتاب اللہ کے برابر ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ یا ایہا الناس انی ترکت فیکم ما ان اخذتم بہ لن تصدقوا کتاب اللہ وعترتی واهل بیتی۔ عمرت اور اہل بیتی شے واحد ہے اور مراد اس سے علیؑ ناطقہ حسن حسین ہیں۔ جن صاحب نے عمرت اور اہل بیتی سے اخذ سنت مراد لیا ہے عجب حیرت انگیز بات ہے۔ اس قدر عمرت اور اہل بیت مصطفیٰ سے فرار کیا معنی۔

(25) آپ حیرت انگیز قوت قضا رکھتے تھے جیسا کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ اقصاکم علیؑ۔ اور واقعی آپ کے فیصلے ایسے ہوتے تھے کہ اہل عرب تعجب کی آنکھ سے دیکھتے تھے۔ آپ کے بعد لوگ یہ کہا کرتے تھے کہ قضیۃ دلا اباحسن لھا۔ یعنی کہ مقدمہ ہے مگر علی نہیں جو فیصلہ کریں۔

(26) آپ نہایت حلیم، کریم، رحیم، متعبد، نفس کش، حیادار، باذل، سخی، ذی جود، شجاع، سیر چشم، تانخ، پاکیز، منکسر، حق گو، حق جو، خدا ترس، مردم شناس، علم داں، علم پرور و علم دوست، مابرا، شاکر، جفاکش، صاحب ریاضت، خوش جمال، خوش خصال، خوش خیال، صادق المقال، با استقلال، فہیم، ذکی، متین اور آخر میں تھے۔ محامد اور مناقب آپ کے ایسے نہیں ہیں کہ احاطہ تحریر میں آسکیں۔ ع کس را چہ زود و زہرہ کہ وصف علی کند۔ اس ناچیز نے مجرد عبادت سمجھ کر اس قدر قلم فرسائی کی ہے ورنہ اس سے شمار اوصاف گرامی مقصود

نہیں ہے۔

(۷۷) آپ کی محبت مومنین پر فرض ہے۔ آپ کا مخالف مومن نہیں ہو سکتا۔ رسول اللہ صلم فرماتے ہیں۔ لا یحب علیا منافق ولا ینقضہ مومن۔ اس حدیث کو ام سلم سے ترمذی روایت کرتے ہیں۔ جانا چاہیے کہ محبت علی عین ایمان ہے۔ مگر اس حدیث کی تعمیل کس قدر مفقود نظر آتی ہے۔

(۷۸) آپ کی شان میں آیات قرآنی بہت ہیں۔ بعض ان میں بے ذیل زیب رقم ہوتی ہیں۔

۱۔ انما ولیکم اللہ ورسولہ۔ یہ آیت جناب علی مرتضیٰ کے تصدیق خاتم سے متعلق ہے۔ ناسخ فرماتے ہیں۔

انگشتر اپنی دے کے سیماں کر دیا طاعت میں بھی سوال سنا کر گنہگار کا

۲۔ یا ایہا الذین آمنوا اتقوا اللہ وكونوا مع الصادقین۔ مراد صادقین سے علی مرتضیٰ ہیں۔ بسند تفسیر امام ثعلبی وغیرہ۔

۳۔ والذین آمنوا باللہ ورسولہ اولئکہ ہم الصدیقون۔ یہ آیت حضرت علی علیہ السلام وجعفر طیار و حضرت امیر حمزہ علیہما السلام کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ اس آیت میں خدائے تعالیٰ ان حضرات کو صدیق اور شہید کے خطابوں سے یاد فرماتے ہیں۔ دیکھو (مسند امام حنبل و تفسیر ثعلبی وغیرہ)

۴۔ ویتلوہ شاهد منہ الخ۔ یہ آیت جناب علی مرتضیٰ کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ جمیع علماء اس کے شان نزول میں موافق ہیں ملا محشم کاشی فرماتے ہیں مقصد تنزیل بلغ منظر اسرار غیب مطیع تیلوہ شاہد مقلطع جبل المتین

۵۔ دلکھ قومہ ہاد۔ حافظ ابو نعیم حضرت عبداللہ بن عباس امام ثعلبی وغیرہ اس آیت کی شان نزول کو بالاتفاق جناب علی مرتضیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

غلاوہ آیات بالا کے مشہور آیت تطہیر و آیت مباہلہ و آیت یا ایہا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک الخ۔ و آیت الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم

نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا و آیت یوفون بالنذر ہیں۔ ملا محشم فرماتے ہیں صاحب یوفون بالنذر آفتاب انما سیرۃ العین لعمدہ نازش



روح الامین۔

(29) آپ حدود اللہ میں نفسانیت کو دخل نہیں دیتے تھے۔ بلکہ جہاں نفسانیت کا خوف دیکھتے تھے وہاں ایسی کاروائی فرما جاتے تھے کہ جس میں نفس کی شرکت کی صورت باقی نہیں رہتی تھی۔ چنانچہ ایک بار کا یہ ماجرا ہے کہ حضرت ایک کافر قومی پنجہ سے مقابل ہوئے اور اسے بڑی زور آزمائی کے بعد زیر کیا۔ جب چاہا کہ اسے فی النار کر دیں اس نے روئے مبارک پر تھوک دیا۔ حضرت اس کے سینہ سے اتر پڑے اس عجب خیز کو دیکھ کر اس کافر نے پوچھا کہ یا علی اس محنت و مشقت سے آپ نے ہم کو زیر کیا اور جب وقت میرے مار ڈالنے کا آیا تو مجھے چھوڑ کر کیوں غلاحدہ ہوئے۔ حضرت نے فرمایا کہ میں تجھے خدا کے حکم کے مطابق مارنا چاہتا تھا کچھ اپنے نفس کی خاطر نہیں۔ مگر تو نے مجھ پر تھوک دیا تو اب میرا تجھے مار ڈالنا شرکت نفس کے ساتھ ہوتا اس لیے میں غلاحدہ ہو گیا۔ اور تجھے قتل نہیں کیا۔ وہ کافر اس تقریر پر پرتا شیر کو سن کر ایمان لایا۔ مولانا روم اسی قصہ کے متعلق فرماتے ہیں۔

اوجیو انداخت بر روئے علی افتخار ہر نبی و ہر ولی

(30) آپ کو درجہ شہادت بھی حاصل ہوا برائے خودیہ بڑا درجہ ہے۔ آپ کی شہادت شہر کوفہ میں واقع ہوئی۔ عبدالرحمن بن ملجم شوہر قسامہ آپ کا قاتل ہے۔ آپ کی رحیمی اور کریمی ایسی تھی کہ آپ نے اپنے قاتل سے بھی اپنے خلقی رحم کو باز نہ رکھا۔

(31) آپ کسب حلال کی نظر سے مزدوری کرتے تھے۔ اجرت پر کنویں سے پانی نکالتے تھے۔

(32) آپ کی غذا محض سادی تھی۔ بیشتر جو کی روٹی کھاتے تھے اور وہ بھی اسی قدر کہ پی میں جان باقی رہے۔ لباس کا یہی طور تھا کہ تکلیف سے تمام تر بری تھا۔

(33) آپ دوسروں کی ضرورتوں کو اپنی ضرورتوں پر مقدم جانتے تھے اور کبھی رد سوال نہیں فرماتے تھے۔ چنانچہ ایک بار آپ نے نذر کے تین روزے رکھے

شریک روزہ داری اپنے ہی گھر والے تھے یعنی حضرت بی بی دونوں صاحبزادے اور فہمہ کیر لقتہ و جنس سے پاس میں کچھ نہ تھا اس لیے سامان افطار کے خیال سے امیر المومنین کچھ گیہوں شمعون یہودی کے پاس سے قرض لے آئے۔ روزہ داروں نے کوٹ پیس کر روٹیاں پکائیں۔ شام کو جب حضرت روزہ داروں کے ساتھ افطار کو بیٹھے افطار فرمایا بھی نہ تھا کہ ایک سائل نمودار ہوا اور اس نے سوال کیا۔ حضرت نے جو کائنات افطاری کی شکل میں آگے موجود تھی سائل کو دے ڈالی اور خود اور گھر والے سب کے سب پانی سے افطار کر کے سو رہے دوسرے اور تیسرے دن پھر یہی صورتیں ہوتی گئیں۔ اللہ اکبر یہ سخاوت یہ جود یہ بذل یہ کرم کہیں دنیا میں دیکھا جاتا ہے۔ اسی روز نذر کی نسبت خدائے تعالیٰ قرآن میں آیت یونون بالسنذ کے ساتھ یاد فرمایا ہے۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ آپ صاحب عرفاں کامل تھے اور خدا کا یقین ایسا رکھتے تھے کہ اس سے زیادہ یقین کا امکان دشوار ہے۔ جیسا کہ خود فرماتے ہیں۔ لو کشف الغطاء لما اذ دوت یقیناً۔ یعنی اگرچہ اٹھ جاتا پردہ تو میرا یقین نہ بڑھتا۔ آپ کی خدا شناسی کا کیا درجہ تھا کیا کوئی بتا سکتا ہے۔

(35) آپ دنیا کو محض بے حقیقت جانتے تھے۔ یہ بات آپ کے ہر قول و فعل سے ظاہر ہوتی تھی۔ اسباب دنیا سے آپ کے پاس کچھ نہ تھا۔ آپ نان جو میں کھاتے تھے اور مولے کپڑے پہنتے تھے۔ اور اکثر زمین پر بیٹھے یا داہلی میں مشغول رہتے تھے اس لیے آپ کو لوگ ابو تراب کہتے تھے۔ آپ کا زہد و فقر بہت دشوار رنگ کا تھا۔ باتیں بھی جو کرتے تھے تمنائے دنیوی سے بے لگاؤ ہوتی تھیں۔ ایک نقل اس جگہ لکھ دی جاتی ہے۔ جس سے آپ کی اوقات بسر کی کا اندازہ معلوم ہو سکتا ہے۔ آپ کی ایک دن کی سرگزشت یہ ہے کہ آپ مسجد مدینہ میں تشریف رکھتے تھے اور صوم سے تھے۔ ایک مسافر آگیا وقت افطار آپ نے اسے اپنی جو کی روٹی سے جو آدھی تھی نصف اس کا اسے دیا اس نے دیکھا کہ اتنی روٹی سے بھوک نہ جائے گی اس جگہ چلا گیا جہاں امام حسن حسین مسکینوں کو طعام تقسیم فرما رہے تھے۔ صاحبزادوں نے اسے ایک آدمی کا حصہ مرحمت فرمایا۔ وہ ایک



حصہ لے کر دوسرے حصہ کا بھی طالب ہوا شہزادوں نے فرمایا تو ایک آدمی ہے دو آدمیوں کا کھانا لے کر کیا کرے گا۔ اس نے کہا کہ ایک مسکین اور بھی مسجد میں اترا ہوا ہے۔ جس کے پاس کھانے کو کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کے پاس صرف آدمی نان جوئی تھی کہ اس میں سے اس نے آدمی ہمیں دے ڈالی ہے اسی کے واسطے ایک حصہ لنگر خانے سے لے جانا چاہتا تھا۔ شہزادوں نے پوچھا کہ اس شخص کی صورت بتا جب اس نے حسب ارشاد صاحبزادگان صورت بتائی تو صاحبزادوں نے آبدیدہ ہو کر فرمایا کہ وہ شخص کوئی مسکین نہیں ہے۔ وہ ہمارا باپ علی ہے جو مولائے کونین ہے۔ اللہ اکبر یہ عجیب قصہ ہے واقعی شان مرتضوی وہم و قیاس سے بہت باہر ہے۔ اللہ صلی علی محمد و علی آل محمد۔

(39) آپ اپنے حق کی رو سے ویسے ہی سید ہیں جیسے پیغمبر خدا صلعم سید ہیں۔ اسی لیے آپ کی اولاد جو بطن حضرت سیدہ علیہا السلام سے نہیں ہے وہ بھی سید کہلاتی ہے۔ وہ سادات جو غیر بنی فاطمہ ہیں انہیں سادات علوی کہتے ہیں۔ واضح ہو کہ خلقت سعادت دربار خداوندی سے پنجتن پاک کو مرحمت ہوا ہے۔ حضرت سیدہ سید زادی ہونے کے سبب سے سیدہ نہیں ہیں بلکہ اپنے حق کی رو سے سیدہ ہیں۔ اسی طرح حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین علیہما السلام اپنے اپنے حق کی رو سے سید ہیں۔ جاننا چاہیے کہ سیادت بڑی نعمت ہے اس سے بڑھ کر دینی نعمت دوسری کوئی نہیں ہے۔ حضرات سادات جو اس زمانہ میں موجود ہیں ان پر فرض ہے کہ اس نعمت کی قدر کریں۔ اپنے آبائی طریقہ کے پابند رہیں اپنے اجداد کرام یعنی ائمہ معصومین علیہم الصلوٰۃ والسلام کے پورے پیرو رہیں۔ اپنے نسب ناموں کو ضائع ہونے سے بچائیں۔ طمع دنیاوی میں مبتلا ہو کر اپنی نسل پاک کو خراب نہ کر ڈالیں۔ راقم کو اپنی ایک جواری قوم پر نہایت افسوس آتا ہے کہ اس نے اپنے خاندانی سیادت کے شرف کو کمال نادانی سے ضائع کر ڈالا ہے۔ یہ قوم اس دیار میں ملک کہلاتی ہے اس قوم کے بزرگان شاہی زمانہ میں بڑے اہل حکم و رسم تھے چنانچہ اس میں سے ایک صاحب معروف بہ سید ابراہیم بڑے صاحب ثروت تھے یہ صاحب قصہ بہار میں آسودہ ہیں۔ ان کو ملک کا خطاب بادشاہ وقت کے حضور سے ملا تھا اس

یہ ملک بیو کے نام سے آج تک مشہور دیار و امصار ہیں۔ ان کی اولاد خطاب مورث کے سبب سے ملک کہلاتی ہے اور اس ملک کے سکنا نا واقفیت کے باعث ملکوں کو ایک مجہول قوم سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ لوگ سادات سے ہیں۔ علم القوم کی رو سے بھی یہ قوم بہت کچھ بنی ہاشم کے انداز رکھتی ہے یہ لوگ نہایت مہمان نواز، شجاع و خوش خلق ہیں اور ان کی وجاہت ظاہری ان کے علوم قومیت سے خبر دیتی ہے۔

(37) آپ نہایت مہمان نواز تھے اور مہمان نوازی آپ پر ختم تھی۔ آج تک سادات کرام میں مہمان نوازی کی صفت میسر طور پر پائی جاتی ہے۔  
(38) آپ کا قاتل اور مقتول دونوں اہل دوزخ ہیں۔

(39) آپ کا حارب رسول اللہ کا حارب ہے۔ جابر روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ نے علی وفاطمہ حسن و حسین کے حق میں فرمایا۔ انا حرب لمن جاد بہم و سلم لمن سالہم۔ یعنی کہ ہم کو جنگ ہے اس شخص سے کہ جو جنگ کرے ان لوگوں سے اور ہم کو صلح ہے اس شخص سے کہ جو صلح رکھے ان لوگوں سے۔ مؤلف

دشمن ہے جو علی کا وہ دشمن نبی کا ہے دشمن نبی کا دشمن اللہ پاک ہے پس دشمن علی و نبی و خدا جو ہو وہ عاقبت خراب جہنم کی خاک ہے  
(40) آپ کے ساتھ رسول اللہ کا بڑا تعلق دلی پیدا تھا جیسا کہ روایت عطیہ سے جو صحابیہ تھیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ کہتی ہیں۔ بعث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حیثا فیہم علی فسمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و هو رافع ید یدہ یقول اللہم لا تمی حتی تربی علیؑ۔ راوی اس حدیث کے ترمذی ہیں اور ترجمہ یہ ہے کہ روانہ کیا پیغمبر خدا نے ایک فوج کو کہ جس میں علی تھے۔ پس ہم نے رسول اللہ کو دونوں ہاتھ اٹھا کر یہ دعا مانگتے سنا کہ اے اللہ میرے مت مار مجھ کو جب تک کہ تو علی کو مجھے دکھانے لے۔ واقعی جگر جگر اور دگر دگر ہوتا ہے۔

(41) آپ نے جس طرح بیٹی رسول اللہ سے اسی طرح ذوالفقار خدا سے پائی۔ بقول ملا کاشی علیہ الرحمۃ۔ مصرعہ

وز خدا و مصطفیٰ شمشیر دختر یافتہ



(42) آپ نے صغریٰ میں رسول خدا کے پاس پرورش پائی اور لعاب دہن رسول اللہ کا وقت پیدائش چوسا اور غسل پیدائش رسول خدا کے ہاتھ سے پایا۔ سب سے پہلے رسول اللہ کے ساتھ نماز پڑھی۔

(43) آپ بروز ہجرت جان پر کھیل کر بستر رسول اللہ پر سوئے۔

(44) آپ بیت شکنی کی غرض سے دوش رسول اللہ پر سوار ہوئے یہ شرف کسی کو حاصل نہ ہوا۔

(45) آپ علم میں حضرت آدم علیہ السلام سے مشابہ تھے۔ درجہ خلقت حضرت ابراہیم کا رکھتے تھے ہیئت آپ کی موسیٰ کی ہیئت کے مانند تھی اور عبادت عیسیٰ کی عبادت سے۔

(46) آپ رسول اللہ کے غسل و کفن کے متکفل ہوئے اور خود آپ کو غسل و کفن ملائکہ نے دیا۔

(47) آپ حسب حکم رسول اللہ بحالت جنابت مسجد میں جانے کے موزوں تھے یہ اجازت سوائے اہل بیت علیہ السلام کے کسی کو نہ ہوئی۔

(48) آپ کا اور آپ کے جگر گوشگان ائمہ معصومین علیہ السلام کا ذکر کتب سماویہ میں آیا ہے۔

(49) آپ مفتی ہر چار دفتر تھے اسی طرح بقیہ ائمہ معصومین علیہ السلام بھی تھے۔

(50) آپ نے کسی کا حق غصب نہیں کیا۔

(51) آپ نے ناجائز رنگ پر ایک قطرہ خون کبھی نہ بہایا حریف کے ساتھ مکر و حیلہ کو راہ نہ دی۔ حریف پر بلا ضرورت کی سختی کبھی نہ کی۔ اسیران جنگ کو یا کسی کو گالی نہ دی۔ اسیران جنگ کے قتل کو کبھی پسند نہ فرمایا اور نہ ان کے قتل کی رسول اللہ کو صلاح دی کبھی فتنہ و فساد کے گرد نہ پھرے اور جب کوئی فتنہ برپا ہوا تو اس کے فرو کرنے میں دل سے کوشاں ہوئے۔

(52) آپ بہت حاضر طبیعت اور حاضر جواب تھے۔ انفصال قضایا میں بھی آپ کا یہی انداز تھا۔ تطویل کلام کے خوف سے راقم مثالیں آپ کی ان صفتوں کی نہیں

(53) آپ کے زور بازو شجاعت استقلال اور ہمت سے اسلام قائم ہو سکا۔ یہ علی ہی کی تلوار تھی جس نے اسلام کو مدینہ میں مضبوط کر دیا مکہ کو ماتحت مدینہ کر دیا۔ اور جتنے بدخواہ اسلام تھے ان کو زیر و زبر کر ڈالا۔ بلاشبہ رسول اللہ کے عہد کا اسلام سوچے میں نوے حصہ تیغ علی ابن ابی طالب کا ممنون ہے۔ سوائے ناسپاس اور ناحق شناس کے کوئی مسلمان واقفیت کی حالت میں اس سے انکار نہیں کر سکتا ہے عہد محمدی میں کوئی شخص علی سے زیادہ مددگار اسلام موجود نہ تھا اور سچی شجاعت اور سچی بہادری کی رو سے علی کا نظیر کوئی شخص امت محمدی میں نظر نہیں آتا ہے لاریب علی اسلام کے ہیرو آف ہیروز Hero of

Heroes یعنی شجاع شجاعان تھے اس ہیرو ازم Heroism

یعنی شجاعت کے ساتھ ان صفات حمیدہ سے بھی متصف تھے جو انبیا و اوصیا و اولیا کے لیے درکار ہیں۔ مگر تعجب ہے کہ اس عہد کے کسی مسلمان سیرت نگار نے علی کی لائف Life نہیں لکھی۔ راقم کو اس وقت کوئی شکایت نہ ہوتی اگر شد و مد کے ساتھ سیرت نگاری کی طرف بعض ارباب تحقیق مائل نہ ہوئے ہوتے خدا کا غضب ہے کہ سیرتیں مشاہیر اسلام کی لکھی جاویں پھر ایک ناسق شراب خور خونی، بدکردار، عیاش، نفس پرور، خود غرض، بنی عباس کا خلیفہ ایک ہیروز آف اسلام Hero of Islam یعنی شجاعان اسلام میں ٹھونسا جائے اور

اس کی سیرت نگاری میں زور و شور کے ساتھ دفتر کے دفتر سیاہ کیے جائیں مگر علی ابن ابی طالب کی دو صفحہ کی سیرت بھی حوالہ قلم نہیں کی جائے۔ مسلمانو! یہی انصاف ہے کہ عہد محمدی کا اسلام جس شخص کا ممنون درممنون ہو وہ ہیروز آف اسلام میں شمار بھی نہ ہو اور اس کے احوال میں دو سطریں بھی اشاعت نہ پائیں۔ اگر یہی اسلام ارباب تحقیق کا انداز ہے تو اسلام کو ایسے مصنفین سے فائدہ پہنچ چکا۔ خلق اللہ کو فائدہ رسانی کے لیے پابندی انصاف شرط ہے اتملاف حق ایک بڑی شے ہے خاص کر اتملاف حق اہل بیت۔ اسی سے اسلام کو ضرر پہنچ چکا ہے اور آئندہ بھی ضرر پہنچا کرے گا۔ اب یہی خواہاں اسلام اداۓ حقوق اہل بیت کی طرف کوشش فرمائیں ورنہ ان کی جتنی کوششیں ترقی اسلام کے لیے



ہوں گی رائیگاں جائیں گی۔ خدا کی خدائی انصاف پر چل رہی ہے یہ ممکن نہیں کہ بے انصافی کی بنیاد پر کسی قسم کی ترقی کی عمارت قائم ہو سکے۔ خدائے تعالیٰ دوست داران اسلام کو حق یمنی اور حق جوئی کی توفیق اور حق و باطل کی تمیز عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

خیر راقم اب علی ابن ابی طالب کے وہ احوال رقم کرتا ہے جس سے ظاہر ہوگا اس جناب کے زور بازو شجاعت، استقلال اور ہمت نے کس طرح پر دشمنان اسلام کے مقابلہ میں اسلام کو غلبہ بخشا اور اسلام کو تباہ و خراب ہونے سے محفوظ رکھا۔ تحریر ذیل پر حضرات ناظرین با انصاف کی توجہ درکار ہے۔

واضح ہو کہ جب کفار مکہ کے ظلموں سے رسول اللہ صلعم کو مکہ سے ہجرت اختیار کر لینی پڑی تو حضرت صلعم مدینہ کو تشریف لائے اور اہل مدینہ نے آپ کے دین کو قبول فرمایا۔ اہل مدینہ کے اسلام قبول کرنے سے مدینہ ایک اسلامی شہر ہو گیا۔ جب کفار مکہ نے دیکھا کہ محمد صلعم نے مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ میں اپنے دین کو استحکام بخشا تو کفار مکہ اس معاملے کو بڑے حسد اور غداوت کی نگاہ سے دیکھنے لگے اور اس فکر میں ہوئے کہ مدینہ پر چڑھائی کر کے اسلام کی حکومت کو درہم برہم کر ڈالیے اس قصد سے سرداران مکہ لشکر کشی پر آمادہ ہو کر مدینہ کی طرف بڑھے ان کی پہلی لڑائی مسلمانوں کے ساتھ چشمہ بدر پر واقع ہوئی۔ اگر یہ لڑائی اہل اسلام ہار جاتے تو محمد کے دین کا خاتمہ ایک امر یقینی تھا۔ ماہران علم تاریخ سے پوشیدہ نہیں ہے کہ پولیٹیکل پہلو سے جنگ بدر کو قسطنطین

Constantine کے زمانہ کی پہلی والی لڑائی Battle of the Bridge کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ لڑائی مسیح علیہ السلام کے ایک سو برس کے بعد درمیان عیسائین اور کفار کے واقع ہوئی تھی۔ اگر قسطنطین کو اس لڑائی میں ناکامیابی منجھتی تو دین مسیحی کو عروج و دشا ہوتا اس طرح اگر جنگ بدر خلاف میں اسلام کے انجام پاتی تو اسلام بالکل ٹھنڈا ہو جاتا۔ جاننا چاہیے کہ بے جدال و قتال کوئی دین قائم نہیں ہو سکتا ہے قیام و فروغ دین کے لیے جدال و قتال ایک امر ناگزیر ہے۔

ہر چند کہ مسیح علیہ السلام نے خود کوئی جدال و قتال نہیں فرمایا مگر حقیقت یہ ہے کہ دین اس معصوم اور برحق ہادی کا بے تیغ و سنان دنیا میں شائع نہیں ہوا ہے۔ جس قدر غزوات رسول اللہؐ میں خون بنی آدم کا حکم خدائے قدیر سے زمین پر بہا ہے اس سے چند در چند مرتبہ زیادہ حامیان دین مسیحی کی تلواروں سے میدان ہائے دنیا لالہ زار ہوا کیے ہیں یہ بھی اہل انصاف سے پوشیدہ نہیں ہے کہ جتنے غزواب رسول اللہؐ کے ظہور میں آئے ہیں وہ زبردستی کا پہلو نہیں رکھتے ہیں۔ ان کے وقوع کے اسباب ایسے ہی نظر آتے ہیں کہ بے جنگ کے اختیار کیے کوئی چارہ نہ تھا۔ اسی جنگ بدر کو دیکھیے کہ کفار مکہ نے خود لشکر کشی کی کیا محمدؐ ان کو مدینہ میں داخل ہو کر اسلام کو درہم برہم کرنے کی اجازت دیتے۔ ان دشمنان اسلام سے حضرت اگر نہ لڑتے تو کیا کرتے یہ لڑائی تو تمام تر تقاضائے فطرت کے قرین تھی اگر آج بھی دنیا کی کسی شاہستہ ترین قوم پر ایسی چڑھائی کی جائے تو باوجود حاصل رہنے ہر طرح کی شایستگی کے اُسے اپنے دشمن سے مقابلہ کرنا ایک امر مجبوری ہوگا۔ کفار ان مکہ کی تعدی ایک امر قابل لحاظ ہے پہلے تو یہ دشمنان اسلام پیغمبر صاحب کو مکہ میں طرح طرح کی ایذائیں پہنچاتے رہے جب آپؐ نے مجبور ہو کر ترک وطن فرمایا اور ایک غیر شہر میں جا کر امن پکڑا تو وہاں بھی ان کو قتل کرنے اور ان کے دین کو برباد کرنے کی کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھی حملے پر حملے ہوتے رہے۔ سبحان اللہ اور اس پر بھی دشمنان اسلام کی طرف سے اعتراض کیا جاتا ہے کہ آپؐ نے تلوار کھینچی اور خون بنی آدم بہایا۔ خیر اب ناظرین بالانصاف جنگ بدر کے معاملہ پر توجہ فرمائیں اور دیکھیں کہ یہ لڑائی کہ جس پر قیام و استحکام اسلام موقوف تھا کس طرح پر لڑی گئی اور اس لڑائی میں علی ابن ابی طالب کی تلوار نے کیا جوہر دکھلائے۔ کتب تاریخ میں مندرج ہے کہ جب کفار قریش بمقابلہ لشکر اسلام کے صف آرا ہوئے تو ان کفار سے تین شخص میدان جنگ میں مبارز طلب ہوئے۔ اس وقت ہاجرین میں سے کوئی بھی ان کے مقابلہ کو نہ نکلا الا حضرت علیؑ، حضرت حمزہؓ اور ابو عبیدہ بن حارث بن عبد المطلب یہ تینوں حضرات بنی ہاشم تھے اور تینوں نے خوب ہاشمیت کی داد دی پھر جب لڑائی



عام ہو گئی تو اور بھی حضرات بنی ہاشم نے بہادریاں دکھلائیں اور انصار بھی دلیری کے ساتھ  
 نبرد آزما ہوئے۔ حسب تحریر ارباب سیر ستر آدمی لشکر کفار سے اس لڑائی میں مارے  
 گئے اور ستر آدمی اسیر ہوئے منجملہ ستر کشت گان کفار کے چتیس نفر علی کے دست خاص  
 سے فی النار ہوئے اور بقیہ مقتولین کا زیادہ حصہ حضرت حمزہ کی تلوار سے طعمہ دوزخ ہوا  
 کشت گان کی فہرست نام بنام مندرج کتب تواریخ و سیر میں ہیں اہل واقفیت سے  
 کوئی امر پوشیدہ نہیں ہے۔ المنقریہ بدر کی لڑائی وہ ہے کہ اسلام کی آئینہ کی  
 سرسبزی تمام تر اس کی فتح پر موقوف تھی اگر اس لڑائی میں اسلام کو شکست ہو جاتی تو  
 اسلام کا کام تمام ہو چکا تھا۔ پھر نہ دین اسلام جاری ہوتا نہ بعد رسول اللہ کے خلافت  
 راشدہ قائم ہوتی۔ نہ پھر خلافت بنو امیہ کو پہنچتی نہ بنو عباس مالک خلافت ہو سکتے اور  
 نہ دنیا میں کوئی اسلامی سلطنت کو وجود ہوتا یہ تلوار علی ہی کی تھی جس نے اسلام کی جڑ  
 مضبوط کر دی اور یہ وہی تلوار تھی کہ عہد رسول اللہ میں اسلام کی جڑ کو مضبوطی بخشی  
 رہی حتیٰ کہ اسلام ایک ایسا قوی درخت ہو گیا کہ جس کی بیج کئی قیصر روم اور کسریٰ  
 فارس بھی نہ کر سکے۔

## جنگ احد

واضح ہو کہ جب قریش مکہ نے ہزیمت سخت بدر کی لڑائی میں اٹھائی اور ان کے  
 بہادران مثل ابو جہل وغیرہ کے مارے گئے تو ان کے دلوں میں اس کے معارضہ کی سخت  
 خواہش پیدا ہوئی چنانچہ بدر کے دوسرے ہی سال مشرکین قریش بڑی تیاری کے ساتھ  
 مدینہ کی طرف بڑھے ادھر سے رسول اللہ بھی مہاجرین و انصار کیلئے کران کے مقابلہ کے  
 واسطے مدینہ سے نکلے۔ کوہ احد کے متصل لشکر اسلام اور کفار قریش سے سامنا ہوا۔  
 کفار ان مکہ کا سردار ابو سفیان تھا چونکہ اس کے بیٹے اور رشتہ دار جنگ بدر میں طعمہ  
 ذوالفقار حیدری ہو چکے تھے اس نے لشکر آرائی میں بڑی کد کی۔ زنان قریش بھی لشکر  
 کے ساتھ آئیں یہ عورتیں جلاجل بجا بجا کر اور اشعار پڑھ پڑھ کر مبارزان قریش کو  
 تہور دلاتی تھیں اور کشت گان بدر کے معاوضہ پر انھیں آمادہ کرتی تھیں ان لوگوں  
 جابل شیطان کی سردار ہندہ تھی یہ وہی ہندہ ہے جو ابو سفیان کی زوجہ تھی اور



جس کی نسبت حکیم سنائی لکھتے ہیں۔ داستان پسر ہند مگر شنیدی الخ: خیر جب لڑائی شروع ہوئی تو لشکر اسلام کو فتح نمایاں نصیب ہوئی پھر شکست کا سبب یہ ہوا کہ اسلامی لشکر کی مال غنائم کے حاصل کرنے کی فکر میں مشغول ہو گئے اور رسول اللہؐ نے جو ارشاد فرمایا تھا اسے بھول بیٹھے یعنی رسول اللہؐ نے فرمایا تھا کہ پچاس شخص تیر انداز پہاڑ کی ایک گھاٹی پر موجود رہیں مگر جب فتح کی شکل نمایاں ہونے لگی اور قریش مکہ گریزاں نظر آنے لگے تو ان تیر اندازوں نے اپنی جگہیں چھوڑ دیں اور لوٹ میں مشغول ہو گئے قریش نے یہ طور دیکھ کر اپنے منتشر شدہ لشکر کو سیٹھا اور پھر قاعدہ سے لشکر اسلام کے مقابل ہوئے تب تو مال غنیمت کے طلب گاروں پر سخت آہنی لشکر اسلام کو مقاومت کی تاب نہ رہی عوام ہاجرین ایسے بھاگ نکلے کہ نشان بھی نہ ملا کہ کدھغائب ہو گئے صرف ہاجرین بنو ہاشم جو قرابت داران رسولؐ تھے استوار و گرم پیکار رہے۔ اسی طرح انصار بھی شریک جاں بازی رہے۔ صاحب مدارج النبوة جناب محدث شیخ عبدالحق دہلوی لکھتے ہیں کہ جب مسلمانوں نے شکست کھائی تو حضرت رسولؐ کو تنہا چھوڑ کر بھاگ گئے اس وقت آنحضرتؐ غضب میں ہوئے اور پیشانی مبارک سے پسینا گرنے لگا پھر دیکھا تو علیؑ کو اپنے پہلو پر ایستادہ پایا آنحضرتؐ نے علیؑ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ تم نے اپنے بھائیوں کا ساتھ نہ دیا اور ان سے نہیں جاملے اس پر علیؑ نے عرض کی لَا كَيْفَ بَعْدَ الْإِيْمَانِ إِنَّ لِي بَعْدَ أَسْوَأَ يَعْنِي بَعْدَ إِيْمَانٍ کے بھی ہم کفر اختیار کریں گے بتحقیق کہ مجھے آپ کے ساتھ اقتدا ہے اس وقت میں ایک جماعت کفار کی پیغمبر خدا صلعم کی طرف متوجہ ہوئی آنحضرتؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا کہ اے علیؑ مجھے اس جماعت سے محفوظ رکھ اور حق خدمت و نصرت بجالا کر یہ وقت مددگاری کا ہے۔ حسب ارشاد نبویؐ علی مرتضیٰ اس قوم کی طرف متوجہ ہوئے اور انھیں بد حال کر کے متفرق کر ڈالا اور ایک جماعت کثیر کو دوزخ میں پہنچا دیا اس کے بعد محدث ممدوح تحریر فرماتے ہیں کہ جب علیؑ سے یہ نصرت ظہور میں آئی تو پیغمبر خداؐ نے حق علی مرتضیٰ انہ منی و انامہ فرمایا اور جبریلؑ بولے انما نکما پھر محدث ممدوح فرماتے ہیں کہ آواز سنائی دی کوئی گوئندہ غیبی کہتا تھا لا فتی الاعلیٰ لاسیف الاذوالفقار۔ یہ بھی محدث ممدوح لکھتے ہیں ناد علیا منظر العجائب یسجدہ عونؑ لك فی النوائب کلہم و غم یتجلی



بولایتے یا علی یا علی یا علی۔ کا نزول اسی معرکہ احد میں ہوا ہے۔ سبحان اللہ کیا ذات پاک علی مرتضیٰ کی تھی اور آپ کیسے معاون اسلام اور جاں نثاری تھے کہ بدر میں کس طرح اسلام کو بربادی سے بچایا اور احد میں کس طرح رسول اللہ کی جان کے محافظ رہ کر دشمنان رسول کو زیر و زبر کر ڈالا۔ واضح ہو کہ کتب تاریخ و سیر سے ظاہر ہوتا ہے کہ احد کی لڑائی میں لشکر اسلام سے ۶۵ یا ستر حضرات شہید ہوئے اس میں سے حسب روایت ثانی ۶۶ و بر تقدیر روایت اول ۶۱ انصار شہید ہوئے۔ مہاجرین میں سے شہیدوں کے عدد تین یا چار نظر آتے ہیں اور یہ شہداء عزیزان پیغمبر صلعم تھے عوام مہاجرین میں سے نہ کوئی شہید اور نہ کوئی زخمی ہوا اس سے عوام مہاجرین کی عقیدت و وفاداری کو سمجھنا چاہیے ظاہراً ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سوائے رسول اللہ بنی ہاشم اور انصار کے کوئی غزوات رسول خدا میں لڑتا بھڑتا نہ تھا یہ تو جنگ بدر و جنگ احد کی سرگزشت ہے آئندہ اور غزوات میں بھی یہی کیفیت ظاہر ہوگی اس جنگ سے متعلق جو نہایت حسرت انگیز اور الم خیز معاملہ ہے وہ حضرت امیر حمزہ کی شہادت ہے آپ کی شہادت حضرت رسول خدا کے لیے ایک بڑے غم کی بات ہوئی آپ لشکر خدا کے بڑے معین و مددگار تھے اور بہت بہادری سے جان نذر اسلام فرمائی۔ ان اللہ دان الیہ راجعون۔ اس واقعہ جانگزا سے ایک عجیب نقل تاریخی متعلق ہے اور وہ یہ ہے کہ ہندہ زوجہ ابوسفیان نے کمال شقاوت سے اس جناب کے جگر کو دانتوں سے چبایا اور آپ کے گوش اور بینی مبارک کو جسم اظہر سے علاحدہ کر کے اور ان کا ہار بنا کر اپنی گردن ناپاک میں ڈالا اس شقاوت کو یاد کر کے حکیم سنائی فرماتے ہیں ہ ما دیوا و جگر غم پیغمبر بمکید۔ ہندہ کے اس فعل قبیح سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس قسم کی عورت تھی اور جس قبیلہ کی وہ عورت تھی اس قبیلہ کے اخلاق کس درجہ تنزل کو پہنچے ہوئے تھے۔ یہ عورت بنی امیہ سے تھی بنی امیہ قریش کا ایک ایسا قبیلہ تھا جو مکاری، دغا بازی، زنا کاری، خوں ریزی، شراب خوری وغیرہ وغیرہ میں فرد تھا۔ پیغمبر خدا کو اس قبیلہ سے تمام تر نفرت تھی اور تا رحلت یہ نفرت آپ کی قائم رہی چنانچہ عمران بن حصین سے مروی ہے مات النبی و هو یکرک کلثہ احیاء ثقیف و بنی حنفہ و بنی امیہ۔ راوی اس حدیث کے ترمذی ہیں۔ اور اس کا معنی یہ ہے کہ میرے نبی درحالیکہ وہ حضرت کراہت رکھتے تھے تین قبیلوں سے یعنی ثقیف بنی حنیفہ اور بنی امیہ



سے شاہ صاحب اپنی شرح میں لکھتے ہیں کہ حضرت رسول خدا نے خواب میں دیکھا کہ بندہ آپ کے منبر شریف پر کھیل رہے ہیں اور آپ نے تعبیر ان بندوں کی بنی امیہ سے فرمائی اور واقعی ایسا ہی ہوا کہ آپ کی رحلت کے ساتھ بنی امیہ اپنی حرفتوں سے صاحب اقتدار ہو گئے ملک شام ان کے زیر حکومت ہو گیا یہاں تک تمام بلاد اسلام کے مالک بن گئے اور بھر ہیٹ منبر رسول اللہ پر مشغول بازی رہے نہایت جائے افسوس ہے کہ جس قبیلہ کو رسول اللہ اپنے عہد میں نہایت کمزور اور بد حال کر گئے تھے حضرت کی رحلت کے بعد اس قبیلہ کی قوت نہ صرف عود کر آئی بلکہ ہزار درجہ ترقی کر گئی کاش اس قبیلہ کو ذی انقیاد ہونے کا موقع نہ دیا جاتا اگر یہ قبیلہ مرضی رسول خدا کے مطابق حالت ابتداء میں چھوڑ دیا جاتا تو نہ علی مرتضیٰ کی عمر تلخی میں بسر ہوتی نہ بنی ہاشم بتلائے نکالیف جسمانی و روحانی ہوتے نہ حضرت مقداد و دیگر دوست داران علی ذلتیں اٹھاتے نہ حضرت ظلم و زبیر شکست بیعت فرماتے۔ نہ حضرت عائشہ جمل کی لڑائی لڑتیں نہ حضرت عائشہ کنوئیں میں گرائی جاتیں نہ امام حسن کو زہر دیا جاتا نہ امام حسین شہید دشت کربلا ہوتے نہ امام زادے صوبتوں کے ساتھ مارے جاتے۔ اور نہ اہل حرم اسیر ہو کر دمشق کی گلیوں میں پھرائے جاتے۔ لاریب قبیلہ بنی امیہ کے صاحب اقتدار ہو جانے سے آل محمد کو بڑا نقص لاحق ہوا اور ان سے خوب کشت گان بد کے بدلے لیے گئے۔ اس جگہ سائل سوال کر سکتا ہے کہ پھر کس نے قبیلہ بنی امیہ کو سر نو سے قوی کر دیا اس کا جواب تاریخ کی کتابیں دے سکتی ہیں۔ راقم اس جگہ پر یہی عرض کر دینا کافی سمجھتا ہے کہ بنی امیہ کو علی نے نہیں سر چڑھایا رسول اللہ جس قبیلہ سے نفرت رکھتے تھے اس کو علی سر نہیں چڑھا سکتے تھے اگر سر چڑھائے ہوتے تو واقعہ کربلا کا التزام حقائق ہی پر عائد ہوتا کس واسطے کہ یہ واقعہ جاں گزرا مجرد قبیلہ بنی امیہ کے سر چڑھانے کا نتیجہ ہے۔ اس جنگ میں لشکر کفار سے صرف تیس آدمی مارے گئے ان میں سے ۹ نو ابردار لشکر کفار تھے۔ یہ نو یکے بعد دیگرے طعمہ ذوالفقار حیدری ہوتے گئے۔ پھر ۱۲ اور بھی حضرت علی مرتضیٰ کے ہاتھ سے مارے گئے باقی رہے ۹۔ ان میں چند شخص کو حضرت حمزہ علیہ السلام نے مارا اور بعد انصار کے ہاتھ سے فی النار ہو گئے۔ مہاجرین غیر بنی ہاشم سے کسی کافر کا مارا جانا ثابت نہیں ہوتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مہاجرین نہایت دور اندیش حضرات تھے نہ مارے



تھے نہ مارے جاتے تھے۔ مگر جاننا چاہیے کہ شباغت ایک ایسی صفت ہے جو تمام نیکیوں کی جڑ ہے اور اسی کے برخلاف بزدلی ہے۔ اور واقعی شباغت ایک ایسی صفت ہے کہ انسان کو بہت کچھ ذریعہ عزت ہوا کرتی ہے جیسا کہ خود اس لڑائی میں رسول اللہ کے ایک صحابی نے یہ شعر پڑھا تھا

فی الجین عارٌ و فی الاقتال مکرمۃ  
و المرء با الجین لاینجو من القدر  
یعنی نامردی میں ننگ ہے اور دشمن سے سامنا کرنے میں بزرگی ہے اور مرد نامردی کے ذریعہ سے مقدر سے نہیں بچ سکتا۔

## جنگ خندق

احد کی لڑائی کے بعد چند غزوات اور سرایا پے در پے ظہور میں آتے گئے مگر وہ مشہور نہیں ہیں۔ کتب تاریخ و سیر سے معلوم ہوتا ہے کہ ان غزوات و سرایا میں بھی علی کی تلوار نیام میں بیکار نہیں پڑی رہی شاہ مردان نصیر میں جو انھیں غزوات غیر مشہور سے اسلام سے غافل نہیں رہے چنانچہ غزوہ بنی نصیر میں جو انھیں غزوات غیر مشہور سے ہے شیر خدا نے ایک بڑے کافر جبری کو مارا یہ شخص بنی نصیر سے تھا اور ایسا تھا کہ جس کا سامنا ہاجر بن غیر بنی ہاشم نہیں کر سکتے تھے۔ یہ شخص رات کو حضرت رسول خدا پر حملہ آور ہونے کو تھا اور اسی قصد سے اپنے قلم سے نکلا تھا حضرت امیر اس کے انداز کو سمجھ کر شب کو اس کی طرف بے فرمائش رسول اللہ کے تشریف لے گئے۔ وہ عاقبت برباد مقصد بالا سے خیمہ رسول اللہ کی طرف چلا آتا تھا کہ راہ میں شاہ مردان سے سامنا ہو گیا اور حضرت نے اسے جہنم واصل فرمایا۔ اس قصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امیر رسول اللہ کی فرمائش کے بغیر بھی نصرت رسول اللہ اور اعانت اسلام فرمایا کرتے تھے۔ سبحان اللہ کیا حضرت کی شباغت شعاری اور قوت ایمان تھی واقعی اگر علی کو خدائے تعالیٰ نہیں پیدا کیا ہوتا تب اسلام کو زور پکڑنے اور استحکام حاصل کرنے کے واسطے خدائے تعالیٰ کو اور کوئی سامان تقویت پیدا کرنا پڑتا۔ ظاہراً تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کو جو کچھ زور اور استحکام حاصل ہوا اس میں علی کی ذات کو بڑا دخل تھا۔ خیران غزوات و سرایا کے بعد وہ لڑائی وقوع میں آئی جو جنگ خندق کے نام سے مشہور ہے۔ اسے جنگ اُخواب



بھی کہتے ہیں۔ یہ لڑائی بھی جنگ بدر و جنگ احد کی شہرت رکھتی ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ یہ جنگ ہجرت کے پانچویں سال میں واقع ہوئی قریش مکہ اور چند قبائل دیگر جن میں یہودی بھی شامل تھے حضرت ابوسفیان پدر حضرت معاویہ کی ماتحتی میں مدینہ منورہ پر حملہ آور ہوئے۔ اور اس کا محاصرہ کچھ روز تک کیے رہے ان کے حملوں سے شہر کو محفوظ رکھنے کی غرض پیغمبر خدا نے شہر کے گرد خندق کھدوائی تھی۔ اس خندق کی وجہ سے اس جنگ کو غزوہ خندق کہتے ہیں۔ کفار مہاجرین نے چند بار اس خندق پر حملے کیے مگر اندر شہر کے نہیں داخل ہو سکے۔ اس وقت بھی علی اعانت اسلام سے غافل نہ تھے اور ان کی شباغت شعاری حملہ آوروں کی خبر لیتی رہی لیکن جب آخر کار لڑائی میدان کی ٹھہری تو اس وقت لشکر کفار سے ایک شخص عمر بن عبدود نام مبارز طلب ہوا لشکر اسلام سے کسی کو تاب نہ پڑی کہ ایسے دیوزاد کا سامنا کرے یہ کافر ہزار سوار کے برابر تین تنہا سمجھا جاتا تھا خیر جب کوئی بھی لشکر اسلام سے نہ نکلا تو حضرت اس سے مقابلہ کے واسطے نکلے مگر آنحضرت صلعم نے روکا اور لشکر اسلام کی طرف متوجہ ہو کر تین بار فرمایا کہ کوئی تم میں سے ہے جو اس کافر کے ساتھ نبرد آزما ہو مگر کسی نے بھی لڑنے کی طرف رخ نہیں کیا تب کچھ اور گفتگو کے بعد جس کی تحریر کی یہاں حاجت نہیں ہے حضرت رسول نے حضرت علی کو عمر بن عبدود سے جنگ کی اجازت بخشی شاہ مردان تو اسی کے منتظر تھے اور اس کے پہلے ہی رسول کی فرمائش کے بغیر آمادہ جنگ ہو چکے تھے۔ اس دیونا پاک کا فوراً مقابلہ کیا وہ کافر بڑا ہی پیل تن قوی ہیکل اور نبرد آزما تھا دیر تک شاہ مردان کا مقابلہ کرتا رہا آخر کار ضربت حیدری سے فی النار والسقر ہوا۔ واضح ہو کہ اس غزوہ میں بھی علی کی تلوار نے ویسی ہی حمایت کی جیسا کہ غزوات سابقہ میں کرتی گئی تھی۔ اگر شاہ مردان عوام مسلمانوں کی طرح عمر بن عبدود کے مقابلہ سے انکار فرما جاتے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ کفار مکہ غالب آجاتے اور مدینہ والوں کو چھ ہاجرین وچہ انصار زیرِ دگر ڈالتے۔ اور اسلام جو حالت صغر سنی میں تھا آغوش عالم سے رنجست ہو جاتا مگر قتل عمر بن عبدود سے اسلام کے بازو قوی ہو گئے اور کفر کی کمر ٹوٹ گئی اس ملعون کے قتل ہوتے ہی اہل مکہ بے دل ہوئے اور جو قبائل بسرِ داری ابوسفیان مدینہ پر چڑھ آئے تھے ان میں پھوٹ مچ گئی اور وہ سب کے سب بھاگ نکلے جانا چاہیے کہ جناب امیر کی اس خدمت اسلام کی نسبت رسول اللہ نے فرمایا



ہے کہ علی کی خندق کے دن کی لڑائی میری تمام امت کے اعمال سے کہ وہ قیامت تک کرے گی افضل ہے۔ یہ حدیث کتاب مدارج النبوة و مدارج النبوة و کشف الغمہ میں مندرج ہے اور اس کی صحت میں کسی کو انکار نہیں ہے۔

واضح ہو کہ اس غزوہ میں بھی غزوہ بدر و غزوہ احد کی طرح کوئی مہاجر غیر بنی ہاشم نے نہ کسی کافر کو مارا اور نہ مارا گیا مارا جانا تو درکنار کسی کو خراش بھی نہیں لگی۔ صرف چھ شخص انصار شہید ہوئے اور کفار سے بھی صرف تین نفر مارے گئے یہ فتح مسلمانوں کو بغیر بہت کشت و خون کے نصیب ہوئی اور سبب اس کا وہی ہوا کہ شاہ مروان نے قتل عمر بن عبدود سے لشکر کفار میں ایک بڑا تہلکہ ڈال دیا جس کے باعث مشرکین بھاگ کھڑے ہوئے اور تاب مقاومت نہ لاسکے۔

## جنگ خیبر

سن ہفتم ہجری میں جنگ خیبر واقع ہوئی اور فریق مخالف اس میں یہودیان خیبر تھے۔ خیبر یہودیوں کا ایک قلعہ مرحب اس کا سردار اور اس کا بھائی حارث بھی اسی کی طرح ایک پہلوان مرد میدان تھا۔ الغرض دونوں بھائی بڑے مشہور شجاع تھے اور ظاہراً ان کا کوئی ہم نبرد کھانی نہیں دیتا تھا زمانہ جنگ میں رسول اللہ مبتلائے درد شقیقہ تھے اس لیے خیمہ میں تشریف رکھتے تھے مگر لشکر اسلام میدان جنگ میں تین روز پے درپے جایا کیا اور ہر بار شکست کھا کھا کر واپس آیا کیا تینوں روز لشکر اسلام پر یہ گزرا کیا کچھ بھاد اسلامی لشکر یہود سے مقابلہ کرنے کے واسطے جانا حارث اسے شہید کر ڈالتا جب اس طرح پر دو آدمی شہید ہو جاتے پھر کوئی مسلمان مقابلہ کا قصد نہیں کرتا یہ بے آبردی لشکر اسلام کو تین روز سے نصیب ہو رہی تھی روز لشکر اسلام یہودیوں کے مقابلہ کو جاتا اور کمال ذلت کے ساتھ خیمہ گاہ کو بھاگ آتا حضرت امیر وقت روانگی لشکر اسلام مدینہ میں جوش چشم کے باعث رہ گئے تھے اور بظاہر جنگ و پیکار کے قابل نہ تھے مگر عقب سے باوجود لاحق رہنے اس شکایت کے بتقاضائے حمایت رسول اللہ و خیال نصرت اسلام لشکر خدا میں حاضر ہوئے۔ واقعی ایمان اور حمیت اسلام اسے کہتے ہیں۔ سبحان اللہ حالت مرض میں بھی مفارقت رسول اللہ گوارہ نہ فرما سکے کہ نصرت دین خدا کی نظر سے مدینہ سے خیمہ گاہ رسول اللہ تک چلے ہی آئے۔ مگر ان تینوں دنوں میں کسی دن شریک کا نذر نہ ہو سکے۔

جب تیسرے دن بھی لشکر اسلام شکست کھا کر بھاگ آیا تب رسول خدا نے فرمایا کہ کل صبح کو ہم علم لشکر اسلام اس شخص کو دیں گے جو کراہے غر فرار ہے یعنی جو شخص بہادری ہے اور بھاگنا نہیں جانتا اور جو خدا و رسول کو دوست رکھتا ہے اور خدا و رسول اس کو دوست رکھتے ہیں نہیں لوٹے گا وہ جب تک کہ خدا اس کے ہاتھ پر فتح نہ دے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور وہ حدیث نبوی یہ ہے لا عین غدا رجلاً کراہاً غیر فرار یحب اللہ ورسولہ یرجع الالفتح اللہ علی یدیہ۔ اس ارشاد رسول اللہ کو سن کر بہت لوگ امیدوار علم ہوئے۔ مگر حضرت نے علم کو اس شخص کو بخشا جس کی شجاعت کا امتحان جنگ بدر واحد و خندق وغیرہ میں ہو چکا تھا۔ اور جو اس وقت تک دین خدا کو برابر تباہی سے بچاتا آیا تھا۔ خیر صبح کو حضرت رسول صلعم نے حضرت علی کو جو شش کردہ آنکھوں پر لب مبارک لگایا جس سے جوش کی تکلیف جاتی رہی اور علم موعود مرحمت فرما کر اجازت جنگ بخشی۔ اس کے بعد حکم خدائے عزوجل یہ رباعی پڑھی۔ ناد علیاً منظر الجباب الخ شاہ مروان نے میدان جنگ میں پہنچ کر مرحب اور حارث دونوں کافروں کو بڑی شجاعت شعاری کے ساتھ واصل جہنم فرمایا۔ درخبر کو اکھاڑ ڈالا اور قلعہ خیبر کو آن کی آن میں فتح کر ڈالا۔ غلامان شاہ مروان اس بات پر غور فرمائیں کہ بلاتامید ایزدی ایسے ایسے اہم کام انسان ضعیف البیان سے انجام نہیں پاسکتے بلاشبہ شاہ مروان موبد من اللہ تھے۔ اگر تائید غیبی شامل حال باکمال نہ ہوتی تو ایسے فائدہ کش روزداد نفس کش شخص سے ایسے ایسے حیرت خیز قوت اور شجاعت کے کام ظہور میں نہ آتے۔ وہ شخص جو جو کی روٹی کھائے اور عبادت خدا میں جسم کو گھلائے وہ میدان جنگ میں ہر بار کفار کو تہہ و بالا کر ڈالے عمر بن عبدود ایسے دیوبیکر کافر کو کشتی میں دے مارے مرحب اور حارث ایسے پہلو انان نامی کو دم کے دم میں فی النار کرے۔ اور اس پر تماشایہ کہ سات سومن کے دروازے کو اکھاڑ ڈالے اور پھر ایسی وزنی شے سے کہ جس کے اٹھانے کے واسطے ستر آدمی درکار ہوں ہاتھ میں لے کر سپر کا کام لے اہل صاف بتائے کہ کیا ایسے ایسے کام تائید ایزدی کے بغیر انجام پاسکتے ہیں اہل بعیرت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ شاہ مروان کو درخبر کو اکھاڑ نا جس کے مدد سے خود قلعہ خیبر کو لرزش ہوئی تھی ایک امر تاریخی ہے لیلی مجنوں کی کہانی نہیں ہے، از نہار یہ افسانہ نہیں ہے یہ محض واقعہ ہے۔



وہ مؤرخین بھی جو مخالف اسلام سے ہیں اس عجب انگیز معاملہ کو بحیثیت مؤرخ درج تصنیف کرتے ہیں چنانچہ واشنگٹن ایروینگ WASHINGTON IRVING اپنی کتاب تاریخ میں اس واقعہ کا ذکر مورخانہ طور پر کرتا ہے۔ پس تعجب ہی تعجب ہے اگر نئی روشنی والے حضرات اس حیرت خیز کارروائی کو قہر اور فساد پر محمول کریں یا اشخاص متعصب اس سے چشم پوشی کریں راقم کی دانست میں اس معاملہ کے حق ہونے میں وہی گفتگو کرے گا۔ جو پیغمبر خدا پر ایمان نہیں لایا ہوگا۔ کس واسطے حضرت رسولؐ نے جب حسب وحی خدا شاہ مروان کو منظر العجائب الغرائب فرمایا ہے اگر کوئی شخص اپنے کو مسلمان کہتا ہے اب پھر اس قول نبویؐ پر یقین نہیں رکھتا تو وہ داخل اسلام شمار نہیں کیا جاسکتا ہے اب حضرات ناظرین غزوہ حنین کے معاملہ پر نظر توجہ فرمائیں یہ آخر لڑائی تھی جو درمیان لشکر اسلام اور کفار قریش کے واقع ہوئی۔ اس جنگ کی حقیقت یہ ہے کہ بعد فتح مکہ اکثر قبائل عرب نے رسول اللہؐ کی اطاعت اختیار کی الا قبیلہ ہلے ہوازن وثقیف جنہوں نے ہزاروں آدمیوں کے ساتھ میدان حنین میں رسول اللہؐ سے مقابلہ کیا ہر چند مسلمانوں کے افراد کم نہ تھے مگر چونکہ دشمنوں نے دھوکے سے ان پر حملہ کیا تھا مہاجرین و انصار دونوں رسول اللہؐ کو چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ میدان جنگ میں قائم رہ جانے والے ایک قول کے مطابق کل نو شخص اور دوسرے کے مطابق صرف چار تھے یہ چار شخص علی مرتضیٰ، عباس رضی اللہ عنہ حضرت ابوسفیان اور عبداللہ تھے۔ ان چار شخصوں کے نام ان نو شخصوں کی روایت میں بھی دیکھے جاتے ہیں خیر جس وقت مہاجرین و انصار بھاگے جاتے تھے پیغمبر خداؐ نے فرارین کو غیرت دلانے کی نظر سے یا اصحاب السُّمَّاء کہہ کر پکارا اس کے سننے سے سو آدمی کے قریب انصار وغیرہ سے لوٹے اور پھر جنگ گاہ میں حاضر آئے فرارین کے اصحاب السمرہ کے لقب سے پکارے جانے کی وجہ یہ تھی کہ اکثر یہ لوگ بیعت الرضوان میں شامل تھے۔ بیعت الرضوان کی حقیقت یہ ہے کہ یہ بیعت اس وقت میں ہوئی تھی کہ جب رسول اللہؐ عمرہ کے ارادے سے بطف مکہ تشریف لے گئے تھے اور مطلب اس بیعت کا یہ تھا کہ اہل اسلام جہاد میں پوری کوشش کریں گے جہاد سے کبھی منہ نہ موڑیں گے اور تمام تر رسول اللہؐ کے مطیع رہیں گے۔ اور چونکہ یہ بیعت الرضوان ایک درخت کے نیچے وقوع میں آئی تھی اس واسطے اسے بیعت تحت الشجرہ بھی کہتے ہیں رسول اللہؐ



نے اسی لیے مفرورین کو غیرت دلانے کے لیے اصحاب السمرہ کے لقب سے پکارا یعنی اے درخت کے نیچے بیعت کرنے والو۔ جاننا چاہیے کہ سمرہ ایک قسم کا درخت ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ درخت جس کے نیچے یہ بیعت ظہور میں آئی۔ درخت سمرہ تھا۔ الغرض جب کچھ بھاگے ہوئے لوگ میدان جنگ میں مجتمع ہو آئے تو لڑائی شروع ہو گئی۔ ہنگام جنگ ابو جریول نامی ایک پہلوان لشکر کفار سے رجز خوانی کرتا ہوا نکلا اور مبارز طلب ہوا لشکر اسلام سے کسی نے بھی اس کے مقابلے کا قصد نہیں کیا اس کی تنویدی اور بہادری کے رعب میں سب کے سب گرفتار ہو گئے مگر ذوالفقار شاہ لافتی نے اس دشمن خدا کو سیدھے وہاں روانہ کر دیا۔ جہاں اس کے پہلے عمر ابن عبید و مرحب اور حارث اور دیگر سرکشان کفار پہنچائے جا چکے تھے اس لڑائی میں کفار نے شکست فاش اٹھائی اور ان کے مقتولین کا عدد ستر ہے اور ان میں چالیس نفر دست خاص شاہ مروان سے فی النار ہوئے اور بقیہ کو انصار وغیرہ نے مارا کسی ہاجر بنی ہاشم کے ہاتھ سے ایک کافر کا قتل ہونا بھی کتب تاریخ سے ثابت نہیں ہوتا ہے۔ واضح ہو کہ اس لڑائی میں خلاف عادت انصار بھی فرار ہو گئے اور جو شریک جنگ ہوئے وہ وہی اشخاص تھے جو رسول اللہ کے غیرت دلانے سے لوٹ آئے حضرات ہاجر بنی ہاشم کا فرار تو ایک معمولی امر تھا مگر ان کے فرار سے زیادہ توجہ طلب خاندان بنی امیہ کی حاضری جنگ ہے قبیلہ بنی امیہ کے بیشتر حضرات جو نئے مسلمان ہوئے تھے میدان جنگ میں حاضر تھے مگر لشکر اسلام سے الگ کھڑے ہو کر لڑائی کا تماشا دیکھ رہے تھے اور مسلمانوں کی مصیبتوں پر ہٹھاکے لگا رہے تھے جیسا کہ بالا میں رقم ہوا ہے۔ اس لڑائی میں بنی امیہ کے سردار حضرت ابوسفیان بھی حاضر تھے۔ مگر خس برابر بھی ان حضرت نے رسول اللہ کی اعانت نہیں فرمائی الگ سے اپنے اور عزیزوں کی طرح تماشاے جنگ دیکھتے اور تہقہہ مارتے رہے۔ حضرت نئے مسلمان ہوئے تھے اور یہ پہلا امتحان آپ اسلام قبول کرنے کا تھا حقیقت یہ ہے کہ یہ شخص فتح مکہ کے وقت مجبوراً مسلمان بنا تھا۔



جنگ میں صرف لڑائی کے سوا سب نہیں دیکھا کرتا اور یوں قبیلے نہیں لگتا رہتا اگر دل سے مسلمان ہوا ہوتا تو مجاہدین مومنین کی طرح اعانت دین خدا کرتا اور رسول اللہ کا ساتھ دیتا اس کے اس انداز سے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کی شکست کا تہہ دل سے خواہاں تھا اور اسلام کی ہزیمت کا منتظر تھا مگر چشم بداندیش کو رباد فتح نصیب اسلام ہوئی اگر اس کے برعکس کوئی معاملہ ظہور میں آتا تو یہ تبلیسی مسلمان مبارک باد کے لیے قبیلہ ہائے ہوازن و ثقیفہ کی طرف دوڑ لگتا واقعی بنی امیہ کا مسلمان کہلانا ایک طرف معاملہ ہے حقیقت حال یہ ہے کہ ابوسفیان اور اس کے لوگ خاصے منافق تھے ظاہراً مغلوب ہو کر مسلمان ہو گئے تھے یہ قبیلہ ہر پہلو سے قابل نفرت نظر آتا ہے۔ اگر یہ قبیلہ نہ ہوتا تو بدر واحد اور خندق کی لڑائیاں زہار وقوع میں نہ آتیں چین سے مذہب اسلام اشاعت پاتا اور اس قدر بہادران اسلام کی جانیں بے سبب تلف نہ ہوتیں۔ ابوسفیان اور اس کے قبیلہ والوں نے اسلام کی بیخ کنی کا کوئی درجہ اٹھا نہیں رکھا ہے۔ اگر علی کو خدائے تعالیٰ معین اسلام نہ بنائے ہوتا تو ظاہراً اسلام کی حفاظت اور اشاعت کی کوئی صورت نہ تھی۔ علاوہ فتنہ انگیزوں کے اس قبیلہ کے اخلاقی، مذہبی اور تمدنی امور کچھ پایہ تنزل کو پہنچے ہوئے تھے۔ ایسے قبیلہ سے ہر راست باز آدمی کو کراہت کا پیدا ہونا تمام تر مقفائے فطرت ہے پس پیغمبر خدا صلعم کو اس قبیلہ کے ساتھ کراہت بے سبب نہ تھی حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام بھی رسول اللہ کی اس کراہت سے تمام تر واقف تھے اور چونکہ آپ جناب رسول مقبول صلعم کے بڑے مطیع و فرماں بردار تھے بعد وفات آنحضرت کے بھی قبیلہ بنو امیہ سے کبھی موابلت پیدا نہیں کی۔ چنانچہ جب حضرت نبی اکرم نے رحلت فرمائی اور خلافت کا انتظام ہو گیا تب حضرت ابوسفیان غرض خاص سے جناب امیر کے پاس آئے اور فرمانے لگے۔ اے علی تم چپ رہ گئے اور معاملہ خلافت طے پا گیا اگر تم کہو تو ہم صحرائے مدینہ کو سواران مکہ سے بھر دیں اور انتظام خلافت کو درہم برہم کر دیں۔ اس جناب نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ اے ابوسفیان تم ایام جاہلیت میں فتنہ انگیزی کیا کرتے تھے اور اب مسلمان ہو کر بھی اپنی عادت فتنہ انگیزی سے باز نہیں آتے۔ یہ جواب پا کر حضرت ابوسفیان نے اپنی راہ لی اور جس طرف یہودی کی صورت نظر آئی اس طرف کو سدھارے۔ حضرات ناظرین ملاحظہ فرمائیں



کہ حضرت امیر کا یہ جواب بڑی مصلحت اور دور اندیشی سے خبر دیتا ہے کس واسطے کہ ارباب حقیقت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ حضرت ابوسفیان قبیلہ بنی امیہ کے سردار تھے یہ قبیلہ رسول اللہ کے عہد میں برابر ناکامیاں اٹھاتا رہا تھا اور اس قبیلہ کو بڑی منفرتیں خود حضرت علی کی تلوار سے پہنچاکی تھیں جیسا کہ غزوات بدر واحد اور خندق کے معاملات سے آشکارا ہے ایسی حالت میں یہ قبیلہ نہ رسول خدا اور نہ آل رسول خدا کا کسی طرح دوست ہو سکتا تھا اگر رسول اللہ کی دوست داری اس قبیلہ کو مد نظر ہوتی تو جنگ حنین میں ابوسفیان صاحب اپنے عزیزوں کے ساتھ مسلمانوں کی مصیبتوں کے تماشے دیکھتے اور ٹھہلکے لگاتے۔ پس حضرت ابوسفیان نے جو جناب امیر کو انتظام خلافت کے درہم برہم کر دینے میں مستعدی دکھلائی ہرگز یہ بات خوش نیتی پر مبنی نہ تھی الغرض جناب امیر فوراً سمجھ گئے کہ یہ شخص ہمارے ذریعہ سے مجر د اپنے کو اور اپنے قبیلہ کو نفع پہنچانا چاہتا ہے اسے مطلق ہماری اور ہمارے قبیلہ بنی ہاشم کی منفعت مد نظر نہیں ہے اس لیے اسے جناب مرتضیٰ نے اس طرح کا جواب دیا جس نے اس کا مفید شخص ہونا ظاہر ہوتا ہے کہ ابوسفیان کو شخص مفسد سمجھ کر جناب امیر نے اس کے مشورے پر عمل کر سکتے تھے اور نہ اس کی اعانت کو جائز رکھ سکتے تھے پس اسے ایسے جواب کے سوا کیا دوسرا جواب دیتے۔ علاوہ اس کے حضرت علیؑ خوب جانتے تھے کہ حضرت رسولؐ مقبول قبیلہ بنو امیہ سے کراہت رکھتے تھے پس آپ ابوسفیان سے کیوں کر میل جول پیدا کر سکتے تھے اگر حضرت امیر ابوسفیان سے لطف مرابطت پیدا کر لیتے تو حضرت کا یہ برتاؤ حضرت رسول خدا کے برتاؤ سے خلاف پڑتا کہ رسول اللہ کی پالیسی کو مغائر واقع ہوتا پوشیدہ نہیں ہے کہ رسول اللہ کی۔ یہ ایک بڑی عمدہ پالیسی تھی کہ قبیلہ بنی امیہ جو ایک سرکش اور مفسد قبیلہ تھا ہمیشہ مغلوب رہے چنانچہ بڑی محنت اور مشقت کے ساتھ ایک عرصہ دراز میں یہ قبیلہ مغلوب کیا گیا تھا۔ اگر امیر ابوسفیان کے مشورے کو سن لیتے تو یقیناً مرضی رسول اللہ کے خلاف آپ کی یہ کارروائی ہوتی مگر جناب امیر جو ہمیشہ تبعیت رسول اللہ کو فرض سمجھتے تھے اور مرضی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف معاملاً نہ کرتے تھے۔



میں حضرت امیر آجاتے تو آپ پر دو سخت الزامات عائد ہوتے اول تو یہ کہ جس قبیلہ سے رسول اللہ کو کراہت تھی اس کے سردار سے آپ نے موافقت، مرابطت پیدا کی دوم یہ کہ جس قبیلہ کو رسول اللہ ضعیف اور کمزور کر چکے تھے اس کو سر نو سے آپ نے قوی اور پرزور کر دیا ظاہر ہے کہ جب جناب امیر ابوسفیان سے اعانت قبول فرماتے تو اس کے معاوضہ میں ابوسفیان کو اسلام کی کچھ نہ کچھ حکومت عطا فرماتے۔ ایسی صورت میں ابوسفیان اور اس کے قبیلہ کا سر نو سے قوی اور پرزور ہونا خلاف توقع نہ تھا پس ابوسفیان برسر احتزاز رہ کر جناب امیر نے نہ صرف اپنے کو ان دونوں الزاموں سے بچایا بلکہ اس الزام سے بھی اپنے کو محفوظ رکھا جو ابوسفیان اور قبیلہ بنی امیہ کی حکومتوں کے حاصل کرنے کی بنیاد پر صورت پذیر ہوتا ہے۔ الحق ابوسفیان اور اس کے قبیلہ کا سر نو سے قوی ہو جانا خاص کر خاندان پیغمبر کے واسطے کچھ بھی اچھا نہ ہوا اس قبیلہ کے سر نو سے قوت حاصل کرنے کے تاریخی حالات قابل ذکر ہیں جانا چاہیے کہ جب حضرت علی نے اعانت ابوسفیان کے قبول کرنے سے انکار فرمایا تو ابوسفیان حضرت علی سے دست بردار ہو کر اپنے طور پر حصول حکومت کی فکریں کرنے لگے اور اپنی کارستانیوں سے ملک شام کی حکومت حاصل کر لی اور یہ بھی حق حاصل کر لیا کہ جس قدر ملک اطراف شام مسلمان فتح کر دے اس کا چہارم حصہ ان کو ملا کرے الغرض جب ابوسفیان صاحب نے حکومت شام حاصل کر لی تب انہوں نے فرمایا کہ میں پیر ہو گیا ہوں میں مکہ سے باہر جانا پسند نہیں کرتا شام کی حکومت پر ان کا بڑا صاحبزادہ یزید ابن ابوسفیان بھیجا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا صاحبزادے کے حاکم شام ہوتے ہی مردمان بنی امیہ جو پریشان حال ہو رہے تھے شام کو روانہ ہو گئے اور تھوڑے عرصہ میں اپنی سابق فوجی قوتوں کے اعتبار سے بھی دہ چند زیادہ قوی ہو گئے۔ شام کا سارا ملک زیر حکومت بنی امیہ ہو گیا شام میں چھوٹے سے بڑے عہدے پر بنی امیہ ہی سر فرزند کھائی دیتے تھے کہیں بنی ہاشم کی صورت پر نظر بھی نہیں پڑتی تھی بنی ہاشم کا شام میں کسی عہدے پر بحال ہونا تو محض ہی خلاف توقع تھا جب دارا الخلافہ مدینہ میں ایک کس بنی ہاشم پانچ روپے کی نوکری کا بھی نظریہ آتا تھا الغرض جو کچھ تاوان قبیلہ بنو امیہ عہد رسول اللہ میں اٹھاتا گیا تھا اس کی بہادری تلافی اس قبیلہ کے لیے فوراً رسول اللہ کی رحلت کے بعد ہو گئی۔



جاننا چاہیے کہ شام کی حکومت پر صرف چار برس یزید ابن ابی سفیان قائم رہ کر مر گئے ان کے بعد ان کے چھوٹے بھائی حضرت معاویہ ان کے حاشیوں بنائے گئے آپ اپنے برادر متوفی سے بمراحل قابل تر تھے آپ کے عہد حکومت میں قبیلہ بنی امیہ کی قوت حشمت شوکت وغیرہ وغیرہ احاطہ بیان سے باہر معلوم ہوتی ہے آپ بہت عرصہ تک حاکم شام رہے اور اس قدر صاحب قوت و ثروت ہو گئے کہ جب اپنے عہد خلافت میں علی ابن ابی طالب نے آپ کو حکومت شام سے معزول کرنا چاہا تو آپ معزول نہ ہو سکے اور خلیفہ وقت سے برابر مقابلہ فرماتے رہے۔ بلکہ خلیفہ وقت کو کثرت جنگ سے اتنی فرصت نہ دی کہ وہ خلافت کے اور کسی کام کی طرف اپنی پوری توجہ مبذول کر سکیں خلافت علی ابن ابی طالب کا زمانہ صرف چار برس اور چند ماہ تھا اس کے بعد امام حسن خلیفہ ہوئے پھر چھ مہینے کے اندر حضرت امام کو خلع خلافت کی نوبت آئی اس عجیب معاملہ کے بعد مدینہ کی جگہ دمشق ہی دار الخلافہ ہو گیا واضح ہو کہ بعد رسول اللہ کے بنی ہاشم ضعیف تو ہوتے ہی چلے گئے مگر اس خلع خلافت سے ان کی رہی سہی وجاہت میں پورا زوال آ گیا اور بنی امیہ ہر طرح سے منتہائے ثروت وینوی کو پہنچ گئے کیا تعجب ہے کہ وہ قبیلہ جس سے رسول خدا صلعم کو کراہت تھی اور جس کو بڑی کوششوں سے آپ آنحضرت اپنے عہد میں مغلوب و مجبور فرما گئے تھے آپ کی رحلت کے بعد زور پکڑنے لگا اور رفتہ رفتہ تمام تر مالک اور حاکم تمام بلاد اسلام کا ہو گیا اور بنی ہاشم جو رسول اللہ کا قبیلہ تھا اور جس کی عظمت مسلمانوں پر فرض تھی مغلوب و مجبور ہو گیا خیر جب حضرت معاویہ خلع خلافت کے بعد خلیفہ وقت قرار پائے حضرت اپنی قوت کے برقرار رکھنے میں برابر کوششیں کرتے رہے بلکہ اس کی بھی حضرت نے بڑی کوششیں فرمائیں کہ خلافت حضرت ہی کی نسل میں رہ جائے چنانچہ اس خیال سے حضرت نے استخلاف فرمایا اور اپنے صاحبزادے کی بیعت کے معاملہ میں کوششوں کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ بنی ہاشم تو ضعیف ہو ہی چکے تھے مگر اس قبیلہ کے دوسرے سردار یعنی امام حسن اور امام حسین ابھی تک زندہ تھے جن کی طرف سے حضرت کو اطمینان حاصل نہ تھا۔ تھوڑے عرصہ میں امام حسن کی طرف سے تو اطمینان حاصل ہو گیا یعنی امام حسن علیہ السلام زہر پا کر شہید ہو گئے یہ حادثہ خود حضرت معاویہ کے عہد میں واقع ہوا اور اس واقعہ کی نسبت ابوالفضل



شاہ حیات اپنی تاریخ المختصر فی احوال البشر میں لکھتے ہیں کہ حضرت امام حسنؑ کے مسموم کیے جانے کی نسبت یہ کہا گیا ہے کہ حضرت معاویہ نے زہر دلویا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت کے صاحبزادے یزید ابن معاویہ نے زہر دلویا۔ خبر جو امر صحیح ہو آپ کے مسموم کیے جانے سے دوسرا داران بنی ہاشم میں سے ایک کی طرف سے تو خرخشہ کا احتمال جاتا رہا اور حضرت کی اس اطمینان یا بی کی نسبت صاحب تاریخ الخس لکھتے ہیں کہ جب امام حسنؑ کی شہادت کی خبر دمشق میں حضرت کے پاس پہنچی تو حضرت نے اظہار خوشی فرمایا تب حضرت کی بہن فاختہ نے کہا کہ اے معاویہ تو سبط رسول اللہ کی موت پر خوش ہوتا ہے۔ تب حضرت نے فرمایا کہ میں سبط رسول اللہ کے مرنے پر اظہار فرح نہیں کرتا ہوں مگر اس خبر سے میرے دل کو راحت نصیب ہوئی لاریب امام حسنؑ کی رحلت حضرت کے واسطے بڑی طمانیت کی صورت ہوئی مگر اب بھی ایک کس سردار بنی ہاشم یعنی امام حسین علیہ السلام رہ گئے تھے۔ اور چونکہ یہ امام ہمام اپنے باپ علی شہیدؑ کی طرح صاحب شجاعت تھے ان کی جانب سے لگا ہوا دغہ بجا مگر اس امام عالی مقام کا خاتمہ عہد معاویہ میں مقدر نہ ہوا تھا اس لیے آپ کی شہادت حضرت کے صاحبزادے کے وقت میں واقع ہوئی۔ المختصر خاندان رسول اللہ کے گرفتار مصائب ہونے کا سبب قبیلہ بنی امیہ کا سرنو سے نشوونما پانا واقع ہوا ہے اگر اس قبیلہ کو سرنو سے قوت حاصل کرنے کا موقع نہ ملتا تو خاندان رسول اللہ اور بنو ہاشم کو اس قدر منہیبتیں لاحق نہ ہوتیں واقعی حضرت علیؑ نے بڑی دور اندیشی کی راہ اختیار کی تھی جو حضرت ابوسفیان کی مستعدی اعانت اور ترغیب دہی کی طرف توجہ نہ فرمائی ورنہ خاندان رسول مقبولؐ اور بنی ہاشم مضرت یا بیوں کا الزام خود حضرت علیؑ پر عاید ہوتا یہ بات روشن اور ہویدا ہے کہ اگر علی ابن ابی طالب حضرت ابوسفیان کی امداد اور اعانت کو قبول فرما لیتے تو اس کے صلہ میں حضرت علیؑ کو حضرت ابوسفیان کے ساتھ بہت کچھ سلوک کرنا پڑتا ضرور تھا کہ منصب وزارت حضرت ابوسفیان کو تفویض فرماتے جس کے ذریعہ سے پھر قبیلہ بنی امیہ کو ثروت کی صورت پیدا ہو جاتی صاحب اختیار ہو کر حضرت ابوسفیان اور قبیلہ بنی امیہ وہی سب کام کرتے جو صاحب ثروت اور صاحب اختیار ہو کر برابر کرتے گئے۔ البتہ خاندان رسول مقبولؐ اور بنی ہاشم کو



حضرت ابوسفیان اور قبیلہ بنی امیہ کے صاحب ثروت اور صاحب اختیار ہونے سے اس حالت میں کوئی فزرنہ پہنچتا کہ جب یہ لوگ خاندان رسولؐ اور بنی ہاشم کے سچے دوست دار ہوتے۔ جیسے رسولؐ آل رسولؐ اور بنی ہاشم کے یہ لوگ دوست دار تھے۔ اس کی حقیقت جنگ حنین میں ظاہر ہو چکی تھی امرحق یہ ہے کہ حضرت ابوسفیانؓ نے علیؓ ابن ابی طالبؓ کو امداد و اعانت کی مستعدی خلوص و اتحاد کی بنیاد پر نہیں دکھائی تھی اس اظہار ہمدردی میں تمام تر ذاتی غرض پنہاں تھی جس کو حضرت علیؓ خوب سمجھتے تھے اس لیے حضرت نے ایسا جواب دیا کہ حضرت ابوسفیانؓ نے مایوس ہو کر نیل مرام کے حاصل کرنے کی نظر سے دوسری جانب رخ فرمایا اور پورے طور پر اپنے مقاصد میں کامیاب ہوئے حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابوسفیانؓ بڑے مدبر آدمی تھے حضرت نے یہ سوچا کہ علیؓ ابن ابی طالبؓ کو ساتھ لے لینے میں ایک بڑی ظاہر داری رہ جاتی ہے مگر حضرت امیرؓ نے تمام تر بے رخی دکھائی جس سے وہ جناب رسولؐ اللہؐ کی اس کرات کے شریک رہے جو آنحضرتؐ کو قبیلہ بنی امیہ کے ساتھ تھی اور ان الزامات کے عائد ہونے سے بھی محفوظ و مامون رہے جو قبیلہ بنی امیہ کے سرنو سے اختیار و قوت حاصل کرنے کے نتائج صریح نظر آتے ہیں۔

۵۴۔ آپ کے لیے آفتاب نے رجعت کی جیسا کہ حضرت یوشعؑ کی دعا پر آفتاب ٹھہر گیا تھا۔ آفتاب کا دعائے حضرت یوشعؑ پر ٹھہر جانا توریت میں مندرج ہے اسی طرح رجعت آفتاب بروایت صحیحہ ثابت ہے۔ طحاوی کی کتاب کتاب مشکلات الحدیث میں بروایت اسماء بنت عمیس اور بھی کتاب منتقی میں یہ حدیث مندرج ہے اور جناب شاہ ولی اللہ صاحب نے بھی اس حدیث کو اپنی کتاب ازالۃ التحقیق کے مقصد دوم میں شرح و بسط کے ساتھ درج کیا ہے۔ صاحب تاریخ النخیس حسنؒ ابن محمد ابن حسنؒ دیار مکرئی نے بھی اسے داخل کتاب تاریخ مذکور کیا ہے۔ اس حدیث کا منکر صرف ابن جوزی نظر آتا ہے ابن جوزی دوست دار شاہ ولایت مآب نہ تھا اس کا انکار قابل اعتبار نہیں ظاہراً ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر معجزہ رجعت خورشید علیؓ کے لگاؤ سے نہ ہوتا تو یہ شخص اس حدیث کو موضوع قرار نہیں دیتا مگر دشمنان علیؓ یا پیروں کے انکار سے شان مرتضویؑ میں کچھ دھبا نہیں لگ سکتا ہے چھپے ہیں خاک ڈالے



سے چاند آفتاب آمد دلیل آفتاب - بہر حال رجعت خورشید کا یہ معاملہ ہے کہ ایک دن رسول خدا صلعم پر وحی آرہی تھی اور سر مبارک رسول اللہ کا حضرت علی کی گود میں تھا اور اتنی دیر تک رہا کہ غروب آفتاب ہو گیا اور حضرت علی کی نماز عصر قضا ہو گئی جب نزول وحی ہو چکا تو جناب رسول خدا صلعم نے پوچھا اے علی تم نے نماز عصر پڑھی آپ نے جواب میں عرض کیا کہ نہیں پس آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ اے میرے خدا علی تھا تیری اور تیرے رسول کی اطاعت میں پس پھر دے تو آفتاب کو اسما ربنت عمیں جو راویہ ہیں اور یہ وہ راویہ ہیں جو بقول آنحضرت صلعم قطعی جنتی ہیں کہ ہم نے آفتاب کو غروب ہو جاتے دیکھا تھا اور پھر ہم نے اسے طلوع ہوتے دیکھا اور اس کی روشنی زمین اور پہاڑ پر پھیلتی دکھائی دی حضرات ناظرین اس حدیث سے علی ابن ابی طالب کا بڑا درجہ معلوم ہوتا ہے اول تو وقت نزول وحی سر مبارک آنحضرت صلعم کا علی کی گود میں تھا دوم یہ کہ جب آنحضرت نے رجعت خورشید کی دعا فرمائی تو یہ ارشاد فرمایا کہ اے میرے خدا اعلیٰ تھا تیرے اور تیرے رسول کی اطاعت میں سوم یہ کہ علی کی نماز ایک ایسی شے متصور تھی کہ اس کے واسطے رجعت خورشید ظہور میں آئی اس جگہ پر حضرت مسلمین کی خدمت میں گزارش ہے کہ حدیث بالا سے نماز کی بڑی ضرورت ظاہر ہوتی ہے جو حضرات مسلمان ہو کر نماز کو ایک غیر قابل توجہ امر سمجھتے ہیں وہ اس حدیث پر غور کریں تب ان کو معلوم ہو گا کہ نماز کیا ضروری شے ہے۔ اگر نماز کوئی ضروری شے نہ ہوتی تو پیغمبر خدا صلعم ایک غیر ضروری شے کے لیے رجعت خورشید کی دعا نہیں فرماتے۔ واضح ہو کہ اس وقت میں کچھ ایسے لوگ دیکھے جاتے ہیں کہ اپنے کو مسلمان کہتے ہیں ترکہ وغیرہ مسلمانوں کی طرح بانٹتے ہیں۔ اور مسلمانوں کے ساتھ معاشرت رکھتے ہیں اس کے ساتھ یہی نہیں ہے کہ نماز کا ہلی سے نہیں پڑھتے بلکہ نماز کو ایک شے حقیر اور قابل نفرت جانتے ہیں۔ ایسے حضرات کو لازم ہے کہ اس حدیث کو بغور ملاحظہ فرمائیں تب ان کو از روئے اسلام کے پابندی نماز کی حاجت معلوم ہوگی اپنے کو مسلمان کہنا اور ترک نماز پر اصرار عجیب مضمون ہے یہ اور بات ہے کہ کوئی مسلمان نماز کا پابند نہیں ہے مگر جو بالقصد تارک صلوٰۃ ہے اور صلوٰۃ کو ایک بے حقیقت شے سمجھتا ہے وہ کیونکر دعویٰ اسلام کر سکتا ہے بلاشبہ نماز کا مکلف ہر ایسا مسلمان ہے جو اس قدر حواس رکھتا ہے کہ اپنے نفع و نقصان



کو پہچانتا ہے اگر کوئی شخص دیوانہ ہے یا منکر اسلام ہے تو ظاہر ہے کہ اس کو نماز کی فرمائش نہیں کی جاسکتی ہے مگر جو شخص اپنے کو مسلمان کہتا ہے اور اس اقرار کے ساتھ روٹی، مکھن، پلاؤ، قلیہ، سماع، رقص، تیل، عطر پان، مال، قال، عرس، مولود، مجرا، تاج، شال و دوشالہ، کوٹ، پتلون، گھڑی، گھوڑی، بنکھ، کوٹھی، تجارت، معاش، اجارہ، ٹھیکہ، مدعی، مدعا علیہ۔ اور تمام دنیا کے امور کے مطلب کو سمجھتا ہے اور ان سے متمتع ہوتا ہے تو انکار صلوٰۃ کے ساتھ مسلمان نہیں ہو سکتا بلاشبہ ایسا شخص مرتد یا زندقہ ہے اور تمام تر دائرہ اسلام سے خارج ہے یہ تو حالت ان اشخاص کی ہے جو اپنے کو مسلمان کہتے ہیں یا مسلمان ہونے کا دھوکہ خلق خدا کو دیتے ہیں ان کے علاوہ ایک فرقہ ایسے لوگوں کا ہے جو اپنے کو مسلمان کہتا ہے مگر معجزات سے انکار رکھتا ہے ایسے لوگوں کے نزدیک شق القمر یا رجعت خورشید یا جذامی کا صحت پانا وغیرہ امور غیر فطرتی متصور ہیں۔ ایسے حضرات معجزات سے انکار اس بنیاد پر رکھتے ہیں کہ معاملات فطرت کے خلاف کوئی امر ظاہر نہیں ہو سکتا ہے یعنی خرق عادات کوئی شے نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے حضرات بے حد تنگ چشم اور کم بین ہیں۔ ان لوگوں نے اسی کو معاملہ فطرت سمجھ لیا ہے جس میں ان کے ذہن کو ادراک کی وسعت حاصل ہوتی ہے ان کے ادراک و فہم سے جو بات باہر ہوتی ہے وہ ان کے نزدیک داخل احاطہ فطرت نہیں ہوتی مگر اس جگہ اور معجزات انبیاء علیہم السلام کو چھوڑ کر صرف رجعت خورشید کو بحث گردانا ہوں حضرات ناظرین راقم کی تصویر ذیل پر اپنی توجہ مبذول فرمائیں۔

معجزات حضرات انبیاء علیہم السلام کی نسبت منکرین معجزات برابر یہی کہتے چلے آئے ہیں کہ معجزہ کوئی شے نہیں ہے اس واسطے کہ معجزہ ایک امر غیر فطرتی یعنی خلاف نیچر ہے پس جو امر غیر فطرتی یا خلاف نیچر ہوتا ہے ظہور پذیر نہیں ہو سکتا ظاہراً یہ قول ایک غیر باخبر سامع کو قرین پذیرائی معلوم ہوتا ہے مگر یہ قول قلت تدبر سے خبر دیتا ہے جیسا کہ عند التحقیق ثابت ہوتا ہے۔ جانا چاہیے کہ یہ قول تب ہی صحیح سمجھا جا سکتا ہے کہ جب تک معجزات حضرات انبیاء علیہم السلام کی محالات عقلیہ سے مان نہ لیے جائیں ظاہراً ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرات منکرین معجزات انبیاء کو محالات عقلیہ سے سمجھ لیا ہے حالانکہ جتنے معجزے انبیاء کے درج کتب ہیں وہ بلا استثنائے احدی



سب کے سب امکانی پہلو رکھتے ہیں ایک بھی ان سے ایسا نظر نہیں آتا ہے کہ محال عقلی کا حکم رکھتا ہو فیکر کی اطلاع میں کسی نبی کی طرف کوئی ایسا معجزہ منسوب نہیں کیا گیا ہے جس کے ممکن الوقوع ہونے میں کسی معقول کو غدر ہو سکتا ہے البتہ جتنے معجزے بیان کیے گئے ہیں وہ ایسے ہیں کہ ان کے وقوع ہم لوگوں کے ہر روز کے تجربہ فطرت کے خلاف معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن محالات عقلیہ کا حکم نہیں رکھتے حضرات انبیاء کے جتنے معجزے کتابوں میں پڑھے جاتے ہیں ایک بھی ان سے ایسا نہیں ہے کہ ہندسہ کے علوم متعارف یا دیگر مقدمات یقینہ یا ادلیات کے خلاف ہو مثلاً کوئی معجزہ ایسا نہیں بیان کیا جاتا ہے کہ فلاں نبی نے گل سے جز کو اعظم کر کے دکھایا ہے لاریب کسی نبی سے محالات عقلیہ کے خلاف کوئی معجزہ ظہور میں نہیں آیا ہے۔ اور نہ ایسا کوئی معجزہ سنا جاتا ہے جس کے وقوع سے کسی مقدمہ یقینہ کے وجوب و کلیت میں ذرا بھی فساد لاحق ہوا ہو ایسی صورت میں حضرات پیغمبر کا انکار معجزہ پر اصرار اگر قلت تدبر نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ اب ہم معجزہ رجعت خورشید کی نسبت یہ عرض کرتے ہیں یہ معجزہ محالات عقلیہ سے کیونکر قرار دیا جاسکتا ہے کوئی منکر معجزہ نہیں بتا دے کہ یہ معجزہ ہندسہ کے کس علوم متعارف یا کس مقدمہ یقینہ کے خلاف پایا جاتا ہے اس معجزہ میں سوائے امکانی پہلو کے وجوب کا پہلو نظر ہی نہیں آتا ہے البتہ جو کچھ اس معجزہ کے خلاف میں کہا جاسکتا ہے وہ اسی قدر ہے کہ اس کا وقوع روزانہ کے معاملہ فطرت کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا ہے یعنی جس قدر منکر کو معاملہ فطرت کا تجربہ حاصل ہے اس کے خلاف اس معجزہ کا وقوع معلوم ہوتا ہے لیکن اگر اس قدر بھی معجزات تجربہ ہائے منکرین کے خلاف نہ ہوا کرتے تو پھر معجزات معجزات کیوں کہلاتے۔ حضرات ناظرین غور فرمائیں کہ رجعت خورشید کی بات جو کچھ اعتراض منکرین معجزات وارد کر سکتے ہیں وہ اسی قدر ہے کہ ہم لوگ ہر روز آفتاب کو ڈوبتے دیکھتے ہیں مگر اسے رجعت کرتے نہیں دیکھتے اور چونکہ یہ بات خلاف فطرت ہے اس لیے ایسا کوئی معجزہ پیغمبر خدا صلعم سے ظہور میں نہیں آیا تھا ایسے اعتراض سے ظاہر ہے کہ معترضین نے رائے بالا کے قائم کرنے کے وقت محال و ممکن کے فرق کو ملحوظ نہیں رکھا تھا ورنہ زینہار ایسی غیر معقولانہ رائے قائم نہیں کرتے۔ جائے لحاظ ہے کہ آفتاب کا ڈوب کر رجعت کرنا



یا آفتاب کا ٹھہر جانا یا آفتاب کا مشرق کے عوض مغرب سے طلوع کرنا وغیرہ وغیرہ محالات عقلیہ سے نہیں ہے۔ یہ بخوبی ممکن ہے کہ کسی خاص سبب سے آفتاب ڈوب کر رجعت کرے یا ایک جگہ کسی وقت تک ٹھہر جائے یا مشرق کے عوض مغرب سے طالع ہوا ایسے وقوع زمین ہار احاطہ امکان سے باہر نہیں ہیں۔ ایسے وقوع ہم لوگوں کے لیے حیرت انگیز اس لیے معلوم ہوتے ہیں کہ ہم لوگ اپنے تجربہ کے احاطہ تنگ کے اندر ایسے وقوع سے اطلاع نہیں رکھتے ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ اگر ہم کسی شخص سے جو علم الافلاک سے خبر نہیں رکھتا ہے یہ کہیں کہ چار ہزار برس پہلے جو تارا اس وقت ہم لوگوں کا قطب شمالی ہے قطب شمالی نہ تھا اس وقت کا قطب شمالی وہ تارا تھا جس کا نام تھیو بن HILLBAN ہے تو وہ ہمارے اس قول کو اپنا تجربہ ذاتی کی بنیاد پر صحیح نہیں مانے گا اسی طرح سینکڑوں انقلابات سماوی کی نظریں پیش کی جاسکتی ہیں جن کے سامنے آفتاب کا رجعت کرنا یا آفتاب کا ٹھہر جانا یا آفتاب کا مشرق کے عوض مغرب سے طلوع کرنا کوئی شے ہی نہیں ہے۔ خدا جانے دنیا کب سے ہے مگر جس قدر صرف چار ہزار برس کے اندر کے انقلابات سماوی ظہور میں آتے ہیں وہ کیا کم حیرت افزا ہیں یہ سب انقلابات شکل امکان رکھتے ہیں ان کو محالات عقلیہ سے وہی سمجھے گا جو محال و ممکن کی تمیز نہیں رکھتا ہوگا۔ پس حضرات منکرین کا رجعت خورشید سے انکار کوئی معقول پیرایہ نہیں رکھتا ہے۔ اس سبب سے عالی نظروں کے قابل توجہ بھی نہیں ہے۔ اسی منوال پر دیگر معجزات انبیاء علیہم السلام کو بھی قیاس کرنا چاہیے اور جاننا چاہیے کہ جتنے معجزات ظہور میں آئے ہیں وہ احاطہ امکان سے باہر نہ تھے اس لیے وہ سب خلاف فطرت بھی نہیں کہے جاسکتے ہیں البتہ معترضین کے احاطہ تجربہ کے اندر ان کو گنجائش نہیں دیکھی جاتی ہے مگر یہ امر خود تقاضا معجزہ کے مطابق ہے کس واسطے کہ اگر معجزات کو ایسی گنجائش ہوتی تو معجزہ معجزہ نہ ہوتا

۵۵۔ آپ کو اس اللہ یعنی شیر خدا اور ید اللہ کا خطاب ملا اس امتیاز کے حاصل ہونے کی یہ صورت ہوئی کہ شب معراج آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مقام پر ایک شیر دیکھا حضرت نے اپنی انگشتی اس شیر کے منہ میں ڈال دی پھر مقام قاب تو سین پر شیر برنج کھانے میں جب ایک ہاتھ خدا نے تعالیٰ کی جانب سے نمایاں ہوا تو وہی انگشتی اس



ہاتھ میں موجود تھی جب صبح شب معراج کو حضرت نے علی کو دیکھا تو وہی انگشتری دست  
علی میں دیکھی اس روز سے آپ کا لقب ید اللہ اور شیر خدا قرار پایا۔ تنگ چشم اس واقعہ  
سے چشم پوشی کریں تو کرس مگر علی کے ید اللہ اور شیر خدا کے ملقب ہونے کی وجہ بھی ہوئی ہے  
جو حوالہ قلم کی گئی ہے عربی فارسی اور اردو کے لٹریچر میں یہ ہر دو لقب امیر المومنین کے  
اکثر دیکھے جاتے ہیں کچھ نہیں تو ان زبانوں کے لٹریچر کے تقاضوں کے خیال سے بھی اس کی  
توجہ قابل توجہ ہے جناب شاہ نیاز صاحب فرماتے ہیں۔

زہے عز وجلال بو تراب فخر انسانی علی مرتضیٰ مشکل کشائے شیر برداری  
استاد ناسخ کا شعر ہے

بیعت خدا سے ہے مجھے بے واسطہ نصیب دست خدا ہے نام مرے دستگیر کا  
۵۶۔ آپ کو حکم خدا آنحضرت مسلم نے خرقہ معراج عنایت فرمایا اس خرقہ کی  
مرحمت ہونے کی وجہ یہ ہوئی کہ آپ صنعت ستاری میں یکتا تھے اس صنعت کے صلہ میں  
اس خلعت سے آپ سرفراز فرمائے گئے۔ مؤلفہ

خدا کیونکر نہ دیتا خرقہ معراج حضرت کو گنہگاروں کے عیبوں کو ہمیشہ آپ نے ڈھکا  
شب معراج میں آنحضرت نے عرش پر لکھا دیکھا لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ  
دایدناہ بعسی یعنی خدا کے سوا کوئی خدا نہیں محمد خدا کے رسول ہیں اور محمد کے  
مددگار علی ہیں۔

شیخ ناسخ فرماتے ہیں

آج مولا ہے جناب حیدر کرار کا ہو گیا بازو زبردست احمد مختار کا  
جناب شمس العلماء مولانا محمد سعید صاحب عظیم آبادی نور اللہ مرتدہ کا مطلع ہے۔  
جو ہر نصرت عیاں از تیغ ابروئے علی شد قوی دین نبی از زور بازوئے علی  
۵۷۔ آپ قائل قول سلونی تھے ملا جامی شواہد میں لکھتے ہیں کہ آپ نے اپنے  
ایک خطبہ میں فرمایا کہ جس کا جو جی چاہے مجھ سے پوچھے سوائے عرش کی بات کے میرے  
سینہ میں علم کثیر ہے اس لعاب دہن رسول اللہ کی بدولت جسے ہم نے ذائقہ کیا تھا۔  
۵۸۔ آپ نے فرمایا کہ ہم بندہ خدا برادر رسول خدا اور وارث رسول خدا ہیں  
اور یہ بھی فرمایا کہ ہم ناکح سیدۃ النساء بنت رسول اور سیدۃ الاولیاء اور خاتم الاولیاء

ہیں اور ہم وہ ہیں کہ ہمارے سوا جو ان فضائل کا دعوا کرے اس کو خدائے تعالیٰ بے شک  
بلا کرے گا۔ کذا فی الشواہد۔

۵۹۔ آپ نے ایک دیر کے قریب چشمہ نکالا اس پر اس دیر کے راہب نے آپ  
سے پوچھا کہ نبی یا فرشتہ ہیں آپ نے جواب دیا کہ میں وحی پیغمبر آخر الزماں کا ہوں تب  
اس نے راہب نے ایمان لا کر یہ کلمہ پڑھا اشہد ان لا الہ الا اللہ واشہد ان  
محمد رسول اللہ واشہد انک وصی رسول اللہ۔ یہ بھی حضرت حاجی کی شواہد میں  
مندرج ہے۔

۶۰۔ آپ کا وحی رسول ہونا حضرت امام شافعی علیہ الرحمۃ کے قول سے بھی ثابت  
ہے۔ رباعی علیٰ جنتہ جنتہ۔ تسیم النار والجنة۔ وصی مصطفیٰ حقاً۔ امام الانس والجنہ۔  
۶۱۔ آپ راہ ہدایت بتانے والے اور گمراہی سے بچانے والے ہیں حاکم نے کتاب  
مستدرک میں زید ابن ارقم سے روایت کی ہے کہ فرمایا رسول اللہ نے من یرید  
ان یحییٰ حیواتی ویموت مہاتی ویستکن جنتہ الخلد الی وعد فی ربی فلیتول علی بن  
ابی طالب فانہ لن ینخرجکم من ہدی ولن یدخلکم فی ضلال یعنی جو شخص چاہے  
جینا ہمارے جینے کے ساتھ اور مرنا ہمارے مرنے کے ساتھ اور رہنا اس بہشت میں  
کہ جس کا وعدہ مجھ سے میرے رب نے کیا ہے تو چاہیے اس کو کہ تولا کرے علی ابن  
ابی طالب سے کہ وہ تم کو نہ نکالے گا ہدایت سے اور نہ داخل کرے گا گمراہی میں۔  
۶۲۔ آپ کا دوست رکھنے والا بہشتی اور آپ کا جھٹلانے والا جہنمی ہے حاکم  
مستدرک میں عمار بن یاسر سے روایت کرتے ہیں حضرت رسول خدا نے علی سے فرمایا  
یا علی طوبی لمن احبک وصدقک فیکہ ودیل لمن ابغضک

۶۳۔ آپ کی نسبت رسول اللہ کو وحی ہوئی کہ آپ سید المومنین اور امام المتقین  
اور قائد الغر المحجلین ہیں۔ عبداللہ ابن عباس اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ  
رسول اللہ نے فرمایا ادھی الی فی علی ثلث انہ سید المومنین و امام المتقین وقاد  
الغر المحجلین۔

۶۴۔ آپ کا منہ دیکھنا عبادت ہے مستدرک میں حاکم بن عبداللہ مسعود سے  
سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا انظرونی وجہ علی عبادۃ۔



۶۶۔ آپ بروز قیامت حامل لوا را الحمد ہوں کے اور تمام انبیاء اس کے نیچے ہو کر چلیں گے اور وہ لوا آپ کے سر پر تاج کی طرح چمکے گا۔ دیکھو کتاب معارج النبوة۔

۶۷۔ آپ کو گالی دینی رسول اللہ کو گالی دینی ہے کتاب مشکوٰۃ المفاتیح کے باب مناقب علی میں بروایت ام سلمہ یہ حدیث مندرج ہے قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من سب علیاً قصید سبّی رواہ احمد۔ واضح ہو کہ شخص ناواقف کو ایسی حدیث کے سننے سے وحشت کا پیدا ہونا خلاف توقع نہیں ہے۔ یعنی وہ ضرور خیال کر سکتا ہے کہ علیؑ ایسے آدمی کو جو بہ نفس نفیس ایک قابل احترام اور واجب عزت آدمی تھے اور بھی ایک قریب رشتہ مندر رسولؐ کے تھے۔ کوئی کیوں گالی دینے لگا مگر حقیقت حال یہ ہے کہ ایک عرصہ دراز تک حضرت علیؑ مواد لعن و دشنام رہے ہیں رسول اللہ صلعم کو بہ حیثیت رسولؐ ضرور اس امر کی اطلاع تھی کہ لوگ علیؑ کو گالیاں دیں گے اس واسطے ایسا قول ارشاد فرما گئے ظاہر ہے کہ عہد رسولؐ میں کسی کو اس قدر جرأت کہاں تھی کہ علیؑ کو گالیاں دے سکتا۔ اور امر واقعی بھی یہی ہے کہ شب و شتم آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد ظہور میں آئے۔ سب علیؑ کے موجد حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔ حضرت ممدوح صرف خود ہی نہیں سب علیؑ فرماتے تھے بلکہ دوسروں کو بھی اس کا رخیہ پر آمادگی دلاتے تھے چنانچہ حضرت ممدوح کی تبعیت میں اس دشنام دہی کا طریقہ خوب جاری ہوا اور کیوں نہ جاری ہوتا جب حضرت ممدوح اپنے عہد کے امیر المومنین اور خلیفہ برحق تھے۔ حضرت امیر المومنین معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضرت علیؑ کے سبب اس قدر اصرار تھا کہ حسب تحریر ابوالغدا و دیگر مصنفین جب امام حسن علیہ السلام نے حضرت ممدوح کو نام صلح لکھا تو منجملہ اور مشروط کے یہ شرط بھی حوالہ قلم کی۔ کہ حضرت علیؑ کو برا نہ کہا کرو مگر حضرت امیر المومنین معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس شرط کو قابل پذیرائی نہ سمجھا لاچار تیب امام حسن علیہ السلام نے یہ کہا کہ جس مجلس میں مجھ کو پاؤ میرے سامنے حضرت علیؑ کو گالی نہ دو۔ بہر کیف یہ شرط قبول ہوئی۔ خیر حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جو رائے شریف ہو۔ رسول اللہ علیؑ کی دشنام دہی عین اپنی دشنام دہی سمجھتے تھے۔ جیسا کہ حدیث بالا میں حوالہ قلم ہوا۔

۶۸۔ آپ ہمیشہ مورد مراحم نبوی رہے مگر مواقع ذیل میں حضرت رسولؐ خدا نے



خاص طور پر آپ کی عزت بخشی فرمائی اور ایسے الفاظ استعمال فرمائے جس سے آپ کی اطاعت اور فرماں برداری جمیع مومنین پر فرض نظر آتی ہے۔

موقع اول۔ قبل ہجرت آنحضرت صلعم نے اپنے تمام اہالیان خاندان کی دعوت فرمائی بعد فراغ طعام کے آنحضرت نے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ میں عام لوگوں پر مبعوث ہوا ہوں لیکن تم لوگوں پر بالخصوص اور اس قوم کا جو طور میرے ساتھ ہے اسے تم دیکھتے ہو اب تم پر لازم ہے کہ میرے ساتھ میرے بھائی ہونے کی بیعت کرو مگر اس جماعت سے اس کام کے واسطے کوئی نہ اٹھا مگر علی مرتضیٰ ہر چند صغیر سن تھے فوراً اٹھے رسول اللہ نے آپ کو ہٹ جانے کو فرمایا بعد ازاں آنحضرت نے اسی قول کو تین بار اعادہ فرمایا اور ہر بار علی مرتضیٰ اٹھا کیے تب آنحضرت صلعم نے اپنے دست مبارک کو آپ کے ہاتھ پر مارا اور یہ کلمہ ارشاد فرمایا دَدْتُ اِبْنِ عَمِّيْ دُونَ عَمِّيْ یعنی اپنا وارث کیا میں نے اپنے چچا زاد بھائی کو اور نہیں اپنے چچا کو اسی قصہ کی حدیث کو بہرہ وایت ربیعہ بن ماجہ کتاب الخصائص میں نسائی نے درج کیا ہے اور اس قصہ کو شاہ ولی اللہ صاحب نے از التہ الخفا میں شرح و بسط کے ساتھ لکھا ہے۔ اور ابوالفدا مورخ نے بھی اس دعوت کے قصے کو اپنی کتاب تاریخ المخقر فی احوال البشر میں حوالہ قلم کیا ہے یہ مورخ لکھتا ہے کہ اس دعوت میں آنحضرت صلعم نے اپنے اہالیان خاندان کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ کون ہے جو میرا بھائی میرا وصی اور میرا خلیفہ ہوگا۔ تب کوئی جواب نہ دیا الا علی مرتضیٰ کے جنھوں نے بڑی خوشی کے ساتھ عرض کی کہ میں آپ کا بھائی وصی اور خلیفہ ہوں گا۔ اس پر آنحضرت صلعم نے حضرت علی سے فرمایا کہ تو میرا بھائی میرا وصی اور میرا خلیفہ ہے۔

موقع ۲۔ آپ کو آنحضرت صلعم نے روز ہجرت اداائے امانات اہل مکہ کے لیے اپنا نائب مقرر فرمایا اور خاص اپنے بستر پر سلوایا اور اپنا کپڑا اوڑھ لیا اس قائم مقامی کا شرف آپ کے واسطے ایک عظیم امر نظر آتا ہے۔

موقع ۳۔ جس سال بیعت الرضوان ظہور میں آئی اسی سال قریش کے کچھ لوگ بعض غلاموں کو واپس لینے کی نظر سے رسول اللہ کے پاس آئے رسول اللہ نے ان سے فرمایا کہ اے گروہ قریش خدا کی قسم ہے کہ اللہ تعالیٰ تم لوگوں پر ایک مرد مبعوث کرے گا جس کے ایمان قلبی کا اللہ تعالیٰ امتحان کر چکا ہے البتہ شخص تم کو دین پر چلائے گا۔ اور



بعضے کو تم سے مارے گا جب اصحاب رسول اللہ صلعم نے اس شخص کی نسبت آنحضرت صلعم سے پوچھا تو آنحضرت نے فرمایا کہ وہ شخص یہ ہے کہ جو شخص اس وقت جو تار مت کر رہا ہے یہ اشارہ آنحضرت کا حضرت امیر کی طرف تھا اس وجہ سے کہ آنحضرت صلعم نے آپ کو اپنا جوتا مرمت کرنے کو دیا تھا اور آپ نعل شریف کو مرمت فرما رہے تھے۔

موقع ۴۔ آنحضرت صلعم نے بوقت تبلیغ سورہ برات علی مرتضیٰ کو بحکم خداوند تعالیٰ اپنا قائم مقام کر کے مکہ کو روانہ فرمایا اور آپ نے سورہ برات کی احکام سنائی کتاب اعلام النوری اور حبیب السیر وغیرہ میں روایت ذیل درج ہے *ولکن الامین هبط انا عن الله عز وجل بانہ لا یودی عنک الا انت اور جل منک وعلی منی وھونی ووصیتی ودارتی وخیفتی فی اھلی وامتی وبعدی یقفنی دینی ولا یودی عنی الا علی۔* ترجمہ *ولیکن جبریل مجھ پر اس حکم کے ساتھ نازل ہوئے کہ اے محمد نہیں کوئی ادائے حق کرے گا تجھ سے الا تو یا کوئی مرد جو تجھ سے ہوا اور حال یہ ہے کہ علی مجھ سے ہے اور وہ میرا بھائی ہے اور میرا وصی ہے اور میرا وارث ہے اور میرا خلیفہ ہے میرے گھر میں اور میری امت میں اور میرے بعد میرے دین کو چلائے گا اور کوئی شخص ادائے حق مجھ سے نہ کرے گا۔* الا علی۔ اس معاملہ تبلیغ کو شاہ ولی اللہ صاحب بھی ازالۃ الخفا میں ذکر فرمایا ہے۔

موقع ۵۔ ایک بار آنحضرت صلعم نے علی مرتضیٰ کو سردار عرب فرمایا چنانچہ مستدرک میں بروایت حضرت عائشہؓ حدیث مندرج ہے۔ اور ازالۃ الخفا میں شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی نے اس حدیث کو نقل کیا ہے۔ *عن عائشۃ قالت قال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم ادعونی سید العرب فقلت یا رسول الله الست سید العرب قال اناسید ولد ادم وعلی سید العرب۔* حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ سردار عرب کو میرے پاس بلاؤ تو میں نے کہا یا رسول اللہ کیا آپ سردار نہیں ہیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ میں سردار اولاد آدم ہوں اور علیؑ سردار عرب ہے۔

موقع ۶۔ پیغمبر خدا صلعم نے آپ کو سید المومنین اور امام المتقین و قائد الغر المحجلین فرمایا یہ القاب آپ کے لیے مختص ہے

موقع ۷۔ پیغمبر خدا صلعم نے آپ کو یہ فرمایا کہ تو میرے بعد ہر مومن اور مومنہ



کا امام و سردار ہے۔ ازالۃ الخفایں یہ حدیث بروایت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ مندرج ہے اور وہ حدیث یہ ہے قال لہ (ای لعلی) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انت ولی کل مومن من بعدی و مومنہ ظاہر ہے کہ اس حدیث میں ولی کے معنی سوا کے سردار اور امام کے دوست نامر محبوب وغیرہ ہو ہی نہیں سکتا ہے کس واسطے کہ من بعدی کا لفظ ان میں سے کسی معنی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

موقع ۸۔ ایک بڑے مجمع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسب نزول وحی یہ فرمایا کہ کسی کا دروازہ مسجد نبوی میں سوائے علی مرتضیٰ کے دروازہ کے کھلا نہیں رہے اس کی تعمیل کی گئی اور یہ امر بہت اشخاص کے لیے موجب حسد ہوا۔ کتاب جذب القلوب میں یہ قصہ مندرج ہے اور اس کی حدیث صحیح بخاری میں موجود ہے۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے علی یہ مسجد میرے اور تیرے سوا کسی شخص جناب پر حلال نہیں ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مثال اس طرح پر دی کہ حکم خداوندی صادر ہوا کہ اے موسیٰ تو ایک مسجد پاک بنا اور اس میں کوئی سوائے تیرے اور ہارون اور پسران ہارون کے کوئی شخص ساکن نہ ہو۔

موقع ۹۔ پیغمبر خدا نے ایک بار جناب امیر کو اپنا نائب اور قائم مقام اس طرح پر مقرر فرمایا کہ آپ کے سر پر دستار اپنے دست مبارک سے باندھی پھر آپ کو اپنے شتر پر سوار کر کے کفار کی جانب روانہ فرمایا اور وقت روانگی یہ ارشاد زبان مبارک پر لائے کہ اگر ایک شخص بھی علی مرتضیٰ کے ہاتھ پر ایمان لائے گا تو وہ دنیا و مافیہا سے افضل ہوگا۔ اس کے بعد آنحضرتؐ یہ دعا بھی بحق علی مرتضیٰ فرمائی کہ اللہم ثبت لسانہ و اھد قلبہ اور آپ کے منقبت میں افنائم علیؑ ارشاد فرمایا ردیکھو جناب شیخ عبدالحق صاحب دہلوی کی مدارج النبوة جلد دوم صفحہ ۲۲۹ و ۲۳۰۔

موقع ۱۰۔ جب ملک یمن کے غنائم کی نسبت حضرت خالد بن ولیدؓ نے لوگوں کو ترغیب شکایت علیؑ کی نظر سے رسول خدا کے پاس بھیجا تو غصہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ سرخ ہو گیا صاحب مدارج النبوة لکھتے ہیں کہ اس وقت آنحضرتؐ نے فرمایا کہ علیؑ کی شان میں گمان بد نہ کرو اس لیے کہ وہ مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں اور وہ دلی تمھارا ہے جس شخص کے ہم مولا ہیں اس کا علی مولا ہے اور مولا سے صاف صاف



مراد حاکم ہے یعنی اس کے حکم میں کسی مسلمان کو سرتابی نہیں چاہیے کس واسطے کہ جیسے ہم تم لوگوں کے حاکم ہیں۔ ویسا ہی علی بھی تم لوگوں کا حاکم ہے پس مال غنائم کی تقسیم میں اس کا جو حکم ہوا ہے وہی میرا حکم ہے تم لوگوں کو اس کے حکم میں شکایت کی مجال نہیں ہے۔  
 موقع ۱۱۔ جب رسول خدا صلعم تبوک کو تشریف لے جانے لگے تو آنحضرت صلعم نے جناب امیر کو اپنا خلیفہ اور جانشین مدینہ میں مقرر فرمایا حضرت علیؑ کے واسطے یہ امر نہایت موجب فخر کا تھا مگر منافقوں نے عداوت سے یہ مشہور کرنا چاہا کہ رسول خدا صلعم کو آپ کی طرف سے کدورت لاحق ہو گئی ہے اس لیے آپ کو مدینہ میں چھوڑ کر تبوک کو تشریف فرما ہوتے ہیں حضرت علیؑ نے بحضور رسول خدا عرض کی کہ حضور مجھے بچوں اور عورتوں پر خلیفہ مقرر فرماتے ہیں حالانکہ میں نے پانچ لڑائیوں میں کبھی تخلف نہیں کیا اس پر رسول اللہؐ نے حضرت ہارون اور موسیٰ کی مثال دی اور فرمایا کہ تم میرے نزدیک ایسے ہو جیسے کہ ہارون موسیٰ کے لیے تھے اور یہ مثال اس قصہ پر مبنی ہے کہ جب حضرت موسیٰ میقات پر تشریف لے گئے تھے تو حضرت ہارون کو اپنا خلیفہ مقرر کر گئے تھے اس قصہ کے متعلق جو حدیث ہے وہ ذیل میں عرض کی جاتی ہے۔ اخراج البخاری عن مصعب بن سعد عرابیہ ان رسول اللہ خرج الی تبوک وامتخلف علیاً فقال اتخلفنی فی الصبیان والنساء قال الا ترضی ان تكون منی بمنزلة ہارون من موسی الا انه لیس بنی بعدی۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی بھی مدارج النبوة میں اس حدیث کو صحیح بخاری اور صحیح مسلم سے داخل کرتے ہیں لاریب یہ حدیث علی رضی اللہ عنہ کے بڑے علو مرتبہ سے خبر دیتی ہے مگر جو معاندین علیؑ ہیں اور جو تنقیص شان مرتضوی میں کو شاں رہتے ہیں ان کا قول ہے کہ اس حدیث سے کوئی خاص عزت شاہ ولایت مآب کی ثابت نہیں ہوتی ہے کس واسطے کہ رسول خدا صلعم نے آپ کو اپنے اہل و عیال پر خلیفہ مقرر فرمایا تھا عام اہل مدینہ پر خلیفہ نہیں مقرر فرمایا تھا اول تو اہل غنائم کا یہ قول خود ہی لغو ہے اس واسطے کہ رسول اللہؐ نے جب ہارون و موسیٰ کی مثال بیان فرمائی تو آپ کا جمیع اہل مدینہ پر خلیفہ ہونا ظاہر ہو گیا دوم یہ کہ جب آپ اہل و عیال رسول اللہؐ پر خلیفہ بنائے گئے تو عوام اہل مدینہ کیا شے ہیں جن پر آپ کے خلیفہ بنائے جانے میں کوئی عذر کیا جاسکتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ معاندین کے خیال میں اہل و عیال رسول اللہؐ



عوام اہل مدینہ سے افضل و اشرف نہ تھے تب ہی تو ایسی لنگڑی عذر داری پیش کی جاتی ہے سبھان اللہ کیا اہل بیت و عزت رسول اللہ کی قدر دان ہے حقیقت یہ ہے کہ تعصب آدمی کو اندھا کر دیتا ہے۔ اللہم احفظنا من ذالک

موقع ۱۲۔ ۱۰ حج میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منادی فرمادی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تشریف لے جانے کو ہیں جس شخص کو شریک حج ہونا منظور ہو مدینہ میں آئے اور ہرکاب رسالت مآب کے چلے یہ خبر باکر ہزاروں قبائل عرب سے حاضر ہو گئے اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم ایک مجمع کثیر کے ساتھ مکہ معظمہ کو تشریف فرما ہوئے جناب امیرین میں تھے آپ بھی اس ملک سے روانہ ہو کر مکہ میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں پہنچے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مناسک حج ادا فرمائے اور ایک خطبہ بھی نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ پڑھا اس خطبہ میں یہ بھی ارشاد فرمایا کہ اب وفات میری بہت نزدیک ہے اور قریب ہے کہ فرستادہ خدا کے عز و جل آئے اور میں بسیک کہوں پس میں اپنے بعد تم لوگوں میں دو چیزیں عالی قدر چھورتا ہوں کہ وہ ایک دوسرے سے بڑی ہیں۔ اور وہ آپس سے جدا نہ ہوں گی تاویل حوض کوثر پر میرے پاس پہنچیں۔ اگر تم لوگ ان کی پیروی کر دو گے اور ان کے ساتھ متمسک ہو گے تو ہرگز گمراہی میں نہ پڑو گے اور وہ دو چیزیں عالی قدر قرآن مجید اور اہل بیت ہیں۔ ترمذی جابر سے جو حدیث روایت کرتے ہیں وہ یہ ہے۔ عن جابر قال رایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی حجہ یوم العرفہ وهو علی ناقۃ القصوی یخطب فسمعتہ یقول یا ایہا الناس انی ترکت فیکم ما ان اخذتم ربہ لن تصلوا کتاب اللہ وعتقی۔ یعنی جابر روایت کرتے ہیں کہ اس نے دیکھا رسول اللہ کو حج میں بروز عرفہ در حالیکہ آنحضرت اپنی اونٹنی قصویٰ پر سوار تھے اور خطبہ فرما رہے تھے پس ہم نے رسول اللہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ اے لوگو! ہم نے یہ تحقیق تم لوگوں میں دو چیزیں چھوڑی ہیں کہ اگر تم اس کو پکڑو گے تو ہرگز گمراہ نہ ہو گے یعنی قرآن مجید اور میری اہل بیت یہ حدیث سعد بن ابی وقاص سے بھی مروی ہے اور تحفۃ الثنا عشریہ میں بھی جناب شاہ عبدالعزیز صاحب اس حدیث کو اس طور پر مندرج فرماتے ہیں۔ انی تارک فیکم اثقلین ان تمسکتم بھا لن تصلوا بعدی احدھا اعظم من الاخر کتاب اللہ وعتقی۔ اسی طرح جناب شاہ ولی اللہ صاحب نے بھی از الہ النفا میں اس حدیث کو درج کیا ہے اور یہ حدیث



صحیح و متواتر ہے اور کسی کو اس حدیث کی صحت میں جائے گفتگو نہیں ہے۔ بہر حال جب حج سے رسول خدا نے فراغت پائی تو آنحضرتؐ نے مدینہ کو معاودت فرمائی راہ میں جس وقت مقام خم غدیر کو پہنچے کہ ذی الجبہ کی اٹھارہویں تاریخ تھی اور ظہر کا وقت تھا جبریل امین یہ خطاب رب العزت سے لائے۔ یا ایہا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک فان لم تفعل فابلغ رسالۃ واللہ یعصمک من الناس۔ یعنی اے رسولؐ پہنچا دے اس پیغام کو جو نازل کیا گیا ہے تیری طرف تیرے رب کی جانب سے پس اگر تو یہ نہیں کرتا ہے تو گویا ہماری رسالت کی تبلیغ نہیں کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ تجھ کو آدمیوں کے شرف و فساد سے محفوظ رکھے گا۔ اس وحی کے نازل ہوتے آنحضرتؐ صلعم وہاں پر ٹھہر گئے اور لوگوں کو سہرہ سے مجتمع فرمایا۔ جانا چاہیے کہ خم غدیر ایک ایسا مقام ہے کہ جہاں سے مختلف راہیں نکلی ہیں جب معاودت کے وقت رسول اللہ صلعم کے ہمراہ حج یہاں پہنچے تو بہت سے لوگ مختلف راہوں سے اپنے اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئے تھے پس رسول اللہؐ نے ان لوگوں کو بلانے کے واسطے آدمی بھیجے جب گئے ہوئے لوگ واپس آچکے اور بھی جو لوگ پیچھے رہ گئے تھے رسول خداؐ سے آملے تب آنحضرتؐ نے نماز پڑھی اور چار کجاؤں کا منبر بنایا اور اس پر چڑھ کر ستر ہزار آدمی کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا الستم تعلمون انی اولی بالمؤمنین من انفسہم یعنی آیا تم نہیں جانتے کہ میں بہتر دوست تر و نزدیک تر مومنوں کا ہوں ذات مومنان سے۔ سامعین نے جواب میں عرض کیا ہلی۔ صاحب مدارج النبوة اس قول نبوی کا یہ معنی بتاتے ہیں کہ میں مومنوں کو کوئی ایسا حکم نہیں دیتا کہ جو ان کی صلاح و نجات و خیریت دنیا و آخرت کے خلاف ہو بخلاف ان کے نفوس کے کہ ان سے کبھی شرف و فساد کا بھی احتمال ہے بعد ازاں آنحضرتؐ نے فرمایا کہ میں تم لوگوں میں دو امر عظیم چھوڑے جاتا ہوں کہ ایک ان میں سے دوسرے سے بزرگ تر ہے اور وہ قرآن و اہل بیت ہیں ان سے خبردار رہنا اور دیکھنا کہ ان کے ساتھ تم کیا سلوک کرتے ہو اور ان کے حقوق کس طرح پر ادا کرتے ہو اور یہ دونوں امر میرے بعد ایک دوسرے سے ہرگز جدا نہ ہوں گے۔ یہاں تک کہ وہ مجھ تک حوض کوثر کو پہنچیں۔ اس کے بعد آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا کہ میرا مولا خدا ہے اور میں تمام مومنین کا مولیٰ ہوں اس کے بعد دست علی کو پکڑ کر فرمایا۔



اللّٰهُمَّ مَنْ كُنْتَ مَوْلَاكَ فَعَلَى مَوْلَاكَ اللَّهُمَّ وَآلٍ مِنْ دَاوُدَ عَادَ مِنْ عَادَاكَ وَالضَّرَّ  
 مِنْ نَصْرِكَ وَاخْذِلْ مَنْ خَذَلَكَ وَدَارَ الْحَقِّ حَيْثُ دَارَ - یعنی اے خدا میرے  
 جس کا مولا میں ہوں پس اس کا مولیٰ علی ہے اے اللہ میرے تو دوست رکھ اس کو  
 جو دوست رکھے علی کو اور تو دشمن ہو اس کا جو دشمن ہو علی کا اور تو مددگار ہو اس کا  
 جو مددگار ہو علی کا اور تو چھوڑ اس کو جو علی کو چھوڑے اور بھرتی کے ساتھ علی کے جس  
 طرف وہ پھرے اس کے بعد رسول اللہ نے حضرت امیر کو ایک خیمہ میں بیٹھنے کے واسطے  
 حکم دیا تاکہ مومنین آپ کو مولا مومنین ہونے کی مبارک باد دیں چنانچہ ازواج مطہرات  
 نے آپ کے خیمہ میں جا کر آپ کو مبارک باد دی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان پر زور  
 لفظوں سے مبارک باد دی نَحْ نَحْ يَا اَبَا الْحَسَنِ لَقَدْ اصْبَحْتَ مَوْلَانِي وَمَوْلَا كُلِّ  
 مُؤْمِنٍ وَمُؤْمِنَةٍ اس خطبہ خم غدیر کے بعد یہ آیت نازل ہوئی الْيَوْمَ اكْمَلْتُ  
 لَكُمْ دِينَكُمْ وَاتَّمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا - یعنی آج  
 کے دن کامل کیا میں نے دین تمہارا اور تمام کی تم پر اپنی نعمت اور راضی ہوا میں واسطے  
 تمہارے دین اسلام سے - امام احمد بن حنبل جو ائمہ اربع اہل سنت سے ہیں تحریر  
 فرماتے ہیں کہ بعد نازل ہونے آیت الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَاتَّمَمْتُ عَلَيْكُمْ  
 نِعْمَتِي وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا کے رسول اللہ نے فرمایا الْحَمْدُ لِلَّهِ عَلَى أَكْمَالِ  
 الدِّينِ وَاتِّمَامِ نِعْمَةٍ وَرِضَايِهِ بِرِسَالَتِي وَوَلَايَتِي عَلَى مَنْ بَعْدِي - یہ قصہ خم غدیر  
 کا حبیب السیر میں بھی مندرج ہے یہ تاریخ فارسی زبان میں ہے معمولی حیثیت کا آدمی بھی  
 اس کو خود دیکھ سکتا ہے واضح ہو کہ اس قصہ غدیر کو صحابیوں کی ایک جماعت کثیر اور  
 تابعین اور محدثین کے ایک گروہ غیر نے روایت کی ہے دُعَائِي سَوْعِلَاءُ شَافِعِي نے  
 حدیث خم غدیر کو حوالہ قلم کیا ہے منجملہ ان کے علامہ مغربی نے ایک نہایت خوب  
 قصیدہ تہنیت خم غدیر کا منقبت علی مرتضیٰ میں تصنیف فرمایا ہے جس کا ایک  
 شعر ہے -

اَوْضَحُ بِالتَّوَاتُؤِ مَا كَانَ مُشْكَلًا عَلَيَّ بَعْلَجُنَا لِهَ بِالْوَصِيَّةِ  
 الْمُخْتَصَرِ بِمَعَالِمِ خَمِ غَدِيرٍ كَاتَرِخِ اسَلامِ میں بہت کچھ ممتاز صورت نظر آتا ہے  
 اور جو اس کے تمام اجزا پر غور کیجیے تو ایک بڑے اہم امر سے خبر دیتا ہے ایسا معلوم



ہوتا ہے کہ رسول خدا صلعم نے اپنے بعد کا کوئی ضروری انتظام خود اپنے عین حیات میں انجام کرنا چاہا تھا اور زینہارا تنے بڑے اہتمام سے ایک ایسے معمولی امر کو مراد نہیں رکھا تھا کہ جس سے اسی قدر ظاہر ہو کہ علی ناصر دوست اور دوست دار مومنین کے ہیں جیسا کہ شیخ ابن حجر وغیرہ کا قول ہے ارباب انصاف ملاحظہ فرمائیں کہ اگر رسول اللہ کو اسی قدر بیان کرنا منظور ہوتا کہ علی ناصر اور دوست دار مومنین ہیں اور ان کے حاکم اور ان کے متصرف بہ امور دنیا و دین نہیں ہیں تو اس کی کیا ضرورت تھی کہ خدائے تعالیٰ بذریعہ وحی سے رسول اللہ سے اس موکدہ طور پر خطاب فرمایا کہ اے رسول پہنچا دے اس پیغام کو جو نازل کیا گیا ہے تیری طرف تیرے رب کی جانب سے پس اگر تو یہ نہیں کرتا ہے تو گویا میری رسالت کی تبلیغ نہیں کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ تجھ کو آدمیوں کے شروفساد سے محفوظ رکھے گا۔ یہاں پر یہ جز آیت واللہ اعلم بھی قابل لحاظ ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلعم اہل شر و منافقین وغیرہ سے مطمئن نہ تھے اور ان کی طرف سے فساد کا احتمال غالب تھا اس لیے اللہ تعالیٰ آنحضرت سے وعدہ حفاظت فرماتا ہے پھر اس آیت کے نازل ہوتے آنحضرت کیوں اس طرح ہمراہیان حج کو جمع فرماتے اور پالان شتر سے منبر بنا کر اس پر چڑھتے اور ان سے یہ سوال فرماتے کہ ایا ہم تم لوگوں سے از روئے تمہارے نفسوں کے اچھے یا نزدیک تر یا دوست تر ہیں پھر ان سے جواب میں قول بلیٰ پا کر کتاب اللہ اور اپنی عمرت کے مستمسک ہونے کی تاکید فرماتے پھر خدا کو اپنا مولیٰ اور اپنے کو تمام مومنین کا مولیٰ بنا کر دستِ علی کو پکڑتے اور یہ ارشاد فرماتے کہ اے خدا میرے جس کا مولیٰ میں ہوں پس اس کا مولیٰ علی ہے اے اللہ میرے تو دوست رکھ اس کو جو دوست رکھے علی کو اور تو دشمن ہو اس کا جو دشمن ہو علی کا اور تو مددگار ہو اس کا جو مددگار ہو علی کا اور تو چھوڑ اس کو جو چھوڑے علی کو اور تو پھیر حق کو ساتھ علی کے جس طرف وہ پھرے اگر اہتمامات سے مراد خدا و رسول اسی قدر تھی کہ علی مجرد ناصر دوست دار مومنین کہے جائیں تو دنیا میں کسی نبی یا کسی بادشاہ یا کسی حاکم یا کسی مدبر نے ایسی فضول کارروائی نہیں کی ہے اس پر سے طرہ یہ ہے کہ جب کلمات بالا آنحضرت صلعم بحق علی مرتضیٰ فرما چکے تب آپ نے تہنیت کی ہدایت فرمائی اور امہات المومنین اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ادائے مبارکاء

فرمائی اور بقول امام حنبل علیہ الرحمۃ بعد نازل ہونے آیت الیوم اکملت لکم دینکم کے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ادا کئے سپاس الہی کے طور پر یہ فرمایا الحمد للہ علی اکمال الدین والتمام نفعہ وما ضانہ برسالتی وولایت علی من بعدی۔ ظاہر ہے کہ یہ مبارک بادیاں اور یہ ادا کئے سپاس صرف اتنی بات کی بنیاد پر ظہور میں نہیں آئی تھیں کہ علیؑ ناصر یا دوست دار مومنین ہیں دنیا اور دین دونوں میں حق پسندی انسان کے لیے ایک نہایت مفید امر ہے حضرات ناظرین باتمکین اس قصہ کے تمام اجزا کو ملحوظ رکھ کر اپنی رائے قائم فرمائیں اس سے زیادہ راقم الحروف اور کیا گزارش کر سکتا ہے۔

واضح ہو کہ مناقب علیؑ علیہ السلام میں جن آیات قرآنی واحادیث نبوی و دیگر معاملات سیر و تاریخ کو فقیر نے بالا میں عرض کیا ہے اکثر ان میں ایسے ہیں کہ عربی و فارسی و اردو کے لٹریچر میں ان کی طرف حوالات و اشارات ہوا کرتے ہیں۔ مذہبی شاعری میں ان کو بہ کثرت دخل رہا ہے منقبت کی غزلیں، قصیدے، مسدس، مثنویات، رباعیات وغیرہ ان سے خالی نہیں ہوتیں۔ فردوسی، سعدی، سنائی، انوری، حافظ، جامی، مولوی روم، ملا مختتم کاشی قاتانی و دیگر شعرائے نامی و گرامی سمجھوں نے کچھ نہ کچھ ان آیات قرآنی واحادیث نبوی و دیگر معاملات سیر و تاریخ کو اپنی منقبت نگاریوں میں جگہ دی ہے یہ غیر ممکن ہے کہ کوئی شخص ان سے بالا سے ناواقف رہ کر منقبت کی غزلیں قصیدے، مسدس، مثنویات، رباعیات وغیرہ کو سمجھ سکے ذیل میں راقم ایک اپنی مذہبی غزل درج کرتا ہے جس میں کچھ مضامین ایسے منظوم ہیں کہ جو امور بالا سے تعلق رکھتے ہیں۔





## غزل

مرزین مدبسم اللہ سے مطلع ہے دیواں کا  
 فرداں ادراک سے ہے مرتبہ شاہ رسولان کا  
 فقیری میں مجھے بخش خدا نے اوج سلطان کا  
 رلاتا ہے لہوا آنکھوں سے غم شاہ شہیداں کا  
 نمود شکل ہستی کن نکاں کی کار سازی ہے  
 توانائی وہ ہر ناتوانا دست خالق ہے  
 تغافل اس کا رستم سے بنا دے زال سے بدتر  
 تری معراج سے معراج پائی عرش اعظم نے  
 طہارت پنجتن کی آیت قرآن سے ثابت ہے  
 زہے تو قیروشان آستان عرش پیرامن  
 علی سے تابہ ہندی یہ امام ہر دو عالم ہے  
 علی ہے رازدان حق علی ہے ہم زبان حق  
 سرخیل اماماں ہے امام پاکبازاں ہے  
 پڑھی ناد علی جب حکم جب سے سرور دین نے  
 شہا جس دم ترا بحر توجہ جوش پر آیا  
 اٹھایا پردہ ظلمت کو تیرے نور نے ورنہ  
 اٹھا دنیا سے عیسیٰ نام پاک مرتضیٰ لیتا  
 ہوا تو حکم حق سے ناخدا ئے زورق نصرت  
 کیا سجدہ ملائک نے تجھے آدم کی صورت میں  
 الہی ہوا اثر میرے بیاں میں حسن قرآن کا  
 اسے سرتاج خالق نے بنایا جن وانساں کا  
 گدا مجھ کو بنایا آستان شاہ مرواں کا  
 مرے گریہ سے دل ہے پانی پانی ابرباراں کا  
 ظہور ہر دو عالم ہے اشارا تیرے فرماں کا  
 جو آنکھیں ہوں کرے کوئی تماشہ پیر کنعاں کا  
 توجہ اس کی بخشے مور کو رتبہ سلیمان کا  
 فلک کہتے ہیں جس کو ہے وہ زینہ تیرے یواں کا  
 نجس خود ہے جو منکر ہو کلام پاک یزداں کا  
 بلا گرداں فلک ہے گنبد شاہ خراساں کا  
 ہر اک ان میں ہے حکم حق سے رہبر جن وانساں کا  
 علی ہے ترجمان حق علی معنی ہے فترآں کا  
 ام کا مقتدا ہے پیشوا ہے اہل ایماں کا  
 کھلا جو ہر احد میں ذوالفقار شاہ مرواں کا  
 ہوا غرق فنا دم میں عدو موسیٰ و عمراں کا  
 نہاں تھا خضر کی آنکھوں سے چشم آب جیواں کا  
 علی نام خدا ہے مومنو! اہتمام یزداں کا  
 نہ پہنچا کوئی صدمہ نوح کی کشتی کو طوفاں کا  
 ہوا اگر اہی شیطان کا باعث عذر شیطان کا

غیل اللہ کو تیرے کرم نے اس میں رکھا  
علی کے ہاتھ میں کونین کی عقدہ کشائی ہے  
ہمارا طائر دل ہے کباب آتش الفت  
وہ بلبل ہوں کہ باغ منقبت میں شور ہے اپنا  
خدا کیوں کرنے دیتا خرقہ معراج حضرت کو  
علی ہے باب شہر علم و دانائی رموز حق  
بٹی سے لے شے دیں تو نے پانی دُختر و شای  
ولایتی نہ ہو جس میں مسلمان ہو نہیں سکتا  
سنا ہے آفتاب حشر میں گرمی بہت ہوگی

بجا ہے گراثر کی ذات پر نازش کرے دوراں

فلک سے ہے زیادہ مرتبہ تیرے ثنا خواں کا

## منتخب از دیوان امیر المومنین علیہ السلام

نفی نسبت طینی و مدح علم دینی

النَّاسُ مِنْ جِهَةِ التَّمَثَالِ الْكَفَاءِ أَبَوْهُمْ آدَمُ وَأُمُّهُمْ حَوَّاءُ

معنی: جمیع افراد انسان شکل ظاہری کے اعتبار سے یکساں ہیں باپ سبھوں کے آدم  
ہیں اور ان کی ماں حوا ہیں یعنی تمام انسان جسمی ترکیب کی رو سے برابر ہیں کس واسطے  
کے سبھوں کے ماں باپ وہی آدم و حوا ہیں۔ پس تفاخر نسب کوئی شے نہیں ہے پس تفاخر  
جائز کوئی امر ہے تو اس کا سبب نسب نہیں ہو سکتا۔ واضح ہو کہ کلام بالا کی عمدگی محتاج  
بیان نہیں ہے۔ سعدی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں :-

بنی آدم اعفائے یک دیگر اند کہ در آفرینش ز یک جو ہر اند

لے زیات و تاریخ ادب عربی میں لکھتے ہیں ”امیر المومنین کا کلام تین محوروں پر گھومتا ہے ،  
خطبات و فراہم ، خطوط و رسائل حکم و نفاذ جن کو اسی ترتیب سے شریف رمنی نے ایک کتاب میں جمع  
کر دیا ہے اور اس کا نام ’ہنج البلاغ‘ رکھا ہے ...“ صفحہ ۲۸۵



ظاہر شیخ علیہ الرحمۃ کی کریا۔ بوستاں اور گلستاں کا ماخذ دیوان امیر المومنین علیہ السلام معلوم ہوتا ہے۔ جس قدر کلمات حکیمانہ و فلاسفانہ ان کتابوں میں موجود ہیں۔ وہ سب کے سب اس دیوان میں پائے جاتے ہیں۔ بلاشبہ حضرت شیخ نے مولا علیہ السلام کے اقوال نہایت توجہ کے ساتھ مطالعہ فرماتے ہیں۔ اس لیے ان کتابوں کو مقبولیت حاصل ہے۔

وَإِنَّمَا أَتَمَّهَاتُ النَّاسِ أَوْعِيَّةٌ مُسْتَوْدِعَاتُ دَلِيلِ أَحْبَابِ آبَادٍ

معنی : اور نہیں ہیں آدمیوں کی باتیں الاظرف کے جس میں ودیعت نطفہ ہوتی ہے اور اساس کے لیے باپ ہیں۔ یعنی مادران مردم ظروف کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان میں نطفہ سپرد ہوا کرتا ہے۔ مگر حساب نسب باپ کی طرف سے ہوتا ہے۔ اور باپ ہی کا فضل و شرف پایہ اعتبار رکھتا ہے۔ چنانچہ سیادت کی نسبت بھی باپ ہی کی جانب سے ہوتی ہے ماں کی جانب سے سیادت سے کوئی شخص سید نہیں ہو سکتا۔ ایسے شخص کو فقہا شریف کہتے ہیں سید نہیں۔

فَإِنْ يَكُنْ لَهُمْ مِنْ أَصْلِهِمْ يُفَاخِرُونَ بِهِ قَالِطِينَ وَالْبَاءُ

معنی : پس اگر انھیں از روئے اصل و نسل کے کوئی ایسی وجہ شرف حاصل ہے جس پر وہ فخر و مباحات کرتے ہیں۔ تو ان کی اصلیت اسی قدر ہے کہ ان کی خلقت مٹی اور پانی سے ظہور میں آئی ہے۔

وَإِنْ أَتَيْتَ بِفَخْرٍ مِنْ ذَوِي نَسَبٍ فَإِنَّ نِسْبَتَنَا جَوْزٌ وَعَلِيَاءُ

معنی : اور اگر تو تفاخر کرتا ہے عالی نسی پر تو ہم تیرے تفاخر نسب کے مقابلہ میں اپنے جود و بلند پایگی پر فخر کرتے ہیں۔ یعنی عالی نسب پر فخر ایک امر بے کار ہے۔ قابل فخر جود ہے جس کا نتیجہ بلند پایگی ہے۔

كَأَفْضَلِ إِلَّا لِأَهْلِ الْعِلْمِ انْتَهَى عَلَى الْعَدَى لِمَنِ اسْتَهْدَى أَيْلَاءُ

معنی : کسی کو اہل علم کے سوا افضل حاصل نہیں ہے۔ بہ تحقیق کہ اہل علم راہ ہدایت پر ہیں۔ اور جو شخص ان سے طلب ہدایت کرتا ہے۔ اس کے وہ راہ پر ہوتے ہیں۔ یعنی اہل علم کے سوا کسی کو شرف حاصل نہیں ہے ذریعہ فضیلت علم ہے اور نہ نسب اور نہ اسباب دنیا سی کوئی شے۔

بَنِي آدَمَ از علم باید کمال نہ از حشمت و جاہ و مال و منال

وَقِيَمَتُهُ الْمَرْءَ مَا قَدَّ كَانَ وَالْجَاهِلُونَ لِأَهْلِ الْعِلْمِ أَعْدَاءُ  
 معنی : اور آدمی کی قیمت وہی ہے۔ جو اس کا علم ہے۔ اور جاہلوں کا طور یہ ہے کہ اہل علم کے دشمن ہیں۔

نَقْمٌ يَعْلَمُ وَلَا يَنْغِي لَهُ بَدَلًا فَالنَّاسُ مَوْتَى وَأَهْلُ الْعِلْمِ أَحْيَاءُ  
 معنی : پس چاہیے کہ ہم لوگ شیوہ علم اختیار کریں۔ اور علم کا بدلہ نہ ڈھونڈیں۔ اس لیے کہ اشخاص بے علم مردوں کے برابر ہوتے ہیں۔ اور اہل علم زندوں کا حکم رکھتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ جہالت موت کے برابر ہوتی ہے۔ اور جاہل مردہ سے کم نہیں ہوتا۔

### تحدید راز مجالست جاہل و تنفیاز موانست غافل

وَلَا تَصْحَبْ أَخَا الْجَهْلِ وَآيَاكَ وَإِيَّاهُ فَكُنْ مِنْ جَاهِلِ أَرْضِي حَكِيمًا حِينَ أَخَاهُ  
 معنی : جاہلوں کے ساتھ صحبت نہ رکھ اور ان سے تمام تر کنارہ رہ کس واسطے کہ جاہلوں کے ساتھ مواخات کرنے سے مردِ عظیم کو ہلاکت منتج ہوتی ہے۔  
 زجاہل گیرزندہ چوں تیرباش نہ آمیختہ چوں شکر شیرباش  
 ترا از دہاگر بود یار عمار ازاں بہ کہ جاہل بود غم گار  
 يُعَاسُ الْمَرْءُ بِالْمَرْءِ وَإِذَا مَا هُوَ مَا شَاءَ وَلَشَى مِنَ الشَّيْءِ مَقَاتِلُ وَأَشْبَاهُ  
 معنی : آدمی جس شخص کی ہمراہی کرتا ہے اسی کا ساقیاس کیا جاتا ہے۔ اور ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ ایسی نسبت قیاس و مشابہت ہوا کرتی ہے کہ جس کے ذریعے استدلال کی صورت پیدا ہوتی ہے۔

وَالْقَلْبُ عَلَى قَلْبٍ دَلِيلٌ حِينَ يَلْقَاكَ

معنی : اور واسطے قلب کے اوپر قلب دیگر کے ہدایت ہے۔ جب کہ قلب، قلب سے ملتا ہے۔ یعنی ایک شخص جب دوسرے کا ملاتی ہوتا ہے تو اس کا قلب دوسرے کے قلب سے ہدایت پاتا ہے۔

شکایت از روزگار عذار و حکایت دوستان بے اعتبار

تَغَيُّوَاتِ الْمَوَدَّةِ وَالْإِخَاءِ وَقَدْ الصِّدْقُ وَالْفَقْطُ الرِّجَاءُ

معنی : متغیر ہوگئی دوستی اور برادری اور کم ہوگئی راستی اور منقطع ہوگئی امید یعنی



دوست، دوست نہ برابر برابر رہے۔ دنیا سے راستی جاتی رہی اور اس کے رخصت ہوتے ہی خیر کی امید منقطع ہو گئی۔ لاریب زوال راستی کے بعد پھر خیر کی کیا امید کی جاسکتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ امیر المومنین نے یہ شعر اور مابعد کے اشعار بڑی دل شکستگی کی حالت میں ارشاد فرمائے ہیں رنگ کلام تمام تر اظہار آزدگی کرتا ہے۔ خاص کر آخر کا شعر جو آنے والا ہے اور جس میں حضرت نے حقیقت حال کو صاف صاف بیان فرما دیا ہے یہ آخر کا شعر بدانت فیر شعراول کے اجمال مضامین کا مصرع ہے۔

قَا سَلَمُنَ الزَّمَانُ اِلَى صَدِيْقٍ كَثِيْر الْعُذْرِ لَيْسَ لِدُعَاءٍ  
معنی: اور سپرد کیا مجھے زمانہ نے ایک ایسے دوست کو جو نہایت پیمان شکن ہے۔ اور جو رعایت دوستاں ملحوظ نہیں رکھتا۔

سَيُغْنِيَنِ الَّذِي اَعْنَاكَ عَنِّي فَلَا فَقْرٌ يَدُوْمُ وَلَا اَشْرَاءُ  
معنی: پس عنقریب وہ کس (یعنی خدا) مجھ اس سے بے نیاز کر دے گا۔ جس نے اسے مجھ سے بے نیاز کر دیا ہے۔ اور حال یہ ہے کہ نہ بے زری کو مداومت ہے اور نہ تو نگری کو۔ سبحان اللہ کیا قول ہے۔ حافظ فرماتے ہیں یہ

چوں نماں دولت شب ہائے وصل بگزر دایام ہجر اں نیز ہم  
وَلَيْسَ يَدَا اِيْمًا اَبَدًا نَعِيْمٌ كَذَلِكَ الْبُرْسُ لَيْسَ لَهُ بَقَاءُ  
معنی: اور کسی نعمت کو بقا نہیں ہے، اسی طرح کوئی سختی کو بھی استمرار نہیں ہے۔  
وَكُلُّ مُوَدَّةٍ لِّلَّهِ تَصْفُو وَلَا يَصْفُوْنَ مِنَ الْفُسْخِ الْاِخَاءُ

معنی: ہر دوستی جو خدا کے لیے ہوتی ہے صافی ہوتی ہے۔ لیکن بھائی چارہ جو فسق و فجور کے لگاؤ سے پیدا ہوتا ہے۔ صافی نہیں ہوتا۔ یعنی جو دوستی خالصتاً خدا کے لیے ہو وہی صافی ہوتی ہے۔ اور اس کو پائیداری بھی حاصل رہتی ہے لیکن جو برادرانہ رابطت فسق و فجور کے لگاؤ سے پیدا کی جاتی ہے نہ صافی ہوتی ہے اور نہ اس کو استحکام حاصل رہتا ہے۔

اِذَا تَكَلَّمْتُ عَمْدًا مِنْ حَبِيْبِي فَبِئْسَ نَفْسِي الشَّكْرَ مَا لِحَيَاءٍ  
معنی: جب کوئی اقارب سے میرے ساتھ پیمان شکنی کرتا ہے۔ تو میرا نفس محرم و حیا کے باعث اس سے طالب انتقام نہیں ہوتا۔ سبحان اللہ کیا ذات مرتضوی ہے۔ واقعی

مولائے دو عالم کا یہی انداز مزاج تھا ہے

از غل آموز احتلاص عمل تار ہا گردی ز شیطان دخل

لاریب مولا کی کریم نفسی فہم انسانی سے باہر ہے اہل واقفیت سے پوشیدہ نہیں ہے۔  
کہ حضرت اپنے دشمن مغلوب کے ساتھ جس نے روئے مبارک پر تھوک دیا تھا کس طرح پر  
پیش آئے مولانا روم فرماتے ہیں ہے

اویخوانداخت بر روئے غلی افتخار ہر نبی و ہر ولی

حقیقت یہ ہے کہ صفات مسیحیہ بھی ذات پاک میں اس درجہ کی واہب العطایا نے بخشی  
تھیں کہ اگر حضرت چھ سو برس قبل ظہور اسلام کے اس عالم میں رونق افروز ہوتے تو  
ظاہراً جناب مسیح علیہ السلام کی بعثت کی کوئی حاجت نہ ہوتی۔

وَكُلُّ جَرَّاحَةٍ فَلَهَا دَوَاءٌ وَسُوءُ الْخَلْقِ لَيْسَ لَهُ دَوَاءٌ

معنی : اور ہر جراحت کے لیے دوا ہے۔ مگر بد خلقی کے آزار کے لیے کوئی دوا نہیں ہے۔  
واقعی یہ ہے کہ جس شخص میں خلقت کی رو سے بد خلقی لاحق رہتی ہے کسی صورت سے نہیں  
جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آدمی خوش اخلاق پیدا ہوتا ہے۔ خوش اخلاقی تعلیمی امر نہیں  
ہے۔ بقول سعدی علیہ الرحمۃ۔

مصرعہ طبعی است اخلاق نیکو نہ کسب

وَدُبَّ آخٍ وَفَيْتُ دَفِئْتُ وَلَكِنْ لَا يَدُومُ لَهُ الْوَفَاءُ

معنی : بہت سے برادر و نادار کی میں نے وفا کی مگر ہمیشہ اس کی وفاداری کو قیام  
نہیں ہے۔ یعنی میں نے بہت سے دعویدار ان وفا کے ساتھ وفا کے ساتھ وفا کی ہے مگر  
ان سے بے وفائی ہی ظہور میں آیا کی ہے۔

يُذِيْمُونَ الْمُؤَدَّةَ مَا رَأَوْنِي وَسَبَقِ الْوُدُّ مَا بَقِيَ لِلْقَاءِ

معنی : برقرار رکھتے ہیں محبت کو جب تک کہ مجھے دیکھتے رہتے ہیں۔ اور باقی رہتی ہے  
صورت محبت جب تک کہ مآقات ہوا کرتی ہے۔ یعنی دیکھنے کی محبت رکھتے ہیں۔

أَخِلَاءُ إِذَا اسْتَغْنَيْتُ عَنْهُمْ وَاعْدَاءُ إِذَا نَزَلَ الْبَلَاءُ

معنی : ارباب دنیا کی یہ حالت ہے کہ وہ تب ہی تک دوست بنے رہتے ہیں کہ جب  
تک ہم ان سے مستغنی رہتے ہیں۔ اور جب مصیبت آگرتی ہے تو دشمن ہو جاتے ہیں۔



یعنی ارباب دنیا کا یہ طور ہوا کرتا ہے۔ کہ جب تک انسان کو خوش حالی حاصل رہتی ہے اور اس خوش حالی کے سبب سے بے نیازی نہیب رہتی ہے تو اس کی دوستی کا دم اہل دنیا بھرتے ہیں۔ جب وہی شخص مبتلائے آفت ہو جاتا ہے تو وہی دعوے داران دوستی کھلے ڈالے انداز کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ سعدی فرماتے ہیں۔

دوست شمار آنکہ در نعمت زند      لاف یاری و برادر خواندگی  
دوست آل دائم کہ گیر دست دوست      در پریشاں مالی و درماندگی  
معنی : پس اگر ہم کسی دوست سے دُور از نظر ہوتے ہیں تو وہ دوست میرے ساتھ دشمنی کرتا ہے اور اچھی طرح سے ہمارے ساتھ عقوبت کے ساتھ پیش آتا ہے۔

إِذَا مَا دَأَسُ أَهْلُ الْبَيْتِ دَعَا      يَدَاءَ لَهُمْ مِنَ النَّاسِ الْجَفَاءُ  
معنی : جب سردار اہل بیت یعنی پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے رحلت فرمائی تو لوگوں کی طرف سے انھیں اہل بیت پر جفائیں شروع ہوئیں۔ اس کلام سے امیر المومنین کے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت صلعم کی وفات کے بعد لوگوں کے معاملات اہل بیت کے ساتھ اچھے نہ تھے۔ ورنہ اس طرح کے ملال آگیاں کلام جناب ولایت مآب نہ فرماتے ظاہر ہے کہ تمام اشعار بالالیں احباب دنیا کی پوری تصویر برد کھائی ہے اور حقیقت حال بھی یہی ہے کہ دوستاں پر غرض ایسے ہوتے ہیں جیسا کہ اشعار بالالیں بیان کیے گئے ہیں۔

### دعا و مناجات با قاضی الحاجات

لَبَّيْكَ لَبَّيْكَ أَنْتَ مُوَلَّاهُ      فَأَرْعُبُ بِدَا إِلَيْكَ مَلْجَاؤُ  
معنی : کھڑے ہیں ہم تیرے حکم کی تعمیل کو تو مولا میرا یعنی آزاد کرنے والا ہے۔ پس رجم کرا ایسے بندہ بر کہ تیرا ملجی ہے۔

يَا ذَا الْمَعَالِي عَلَيْكَ مُعْتَمِدِي      طَوْلِي لِمَنْ كُنْتَ أَنْتَ مُوَلَّاهُ  
معنی : اے صاحب بزرگیاں تجھ پر میرا تکیہ ہے۔ خوش ہے عیش ہے اس کا جس کا تو مولا ہے۔

طَوْلِي لِمَنْ كَانَ تَائِبًا آتًا      لِيَشْكُرَ إِلَى ذِي الْجَلَالِ بَلَاؤًا

معنی : خوش ہے عیش اس کا کہ پشیمان و بے خواب رہتا ہے۔ تاکہ اپنی بلا کا شکوہ صہور ذوالجلال میں کرے۔

مَا بِهِ عِلَّةٌ وَلَا سُقْمٌ      أَكْثَرًا مِنْ حُبِّهِ لِمَوْلَاهُ  
معنی : اسے کوئی مرض یا کوئی بیماری اپنے مولائے عشق سے زیادہ نہیں ہے یعنی مرض عشق کے سوا اس کو کوئی بیماری نہیں ہے۔

إِذَا خَلَّ فِي الظَّلَامِ مُبْهِلًا      أَجَابَهُ اللّٰهُ ثُمَّ لَبَّاهُ  
معنی : جب وہ تاریکی میں جا بیٹھتا ہے اور درود و دعائیں مانگتا ہے۔ تب ان سے اللہ جواب دیتا ہے۔ اور لبیک فرماتا ہے۔ اس طور پر جیسا کہ اشعار آئندہ میں ارشاد خداوندی مسطور کیے جاتے ہیں۔

واضح ہو کہ اشعار بالا دعا و مناجات کا طریقہ بتلاتے ہیں۔ جاننا چاہیے کہ دعا و مناجات محض عبادت ہیں۔ یہ گراہوں اور جاہلوں کا شیوہ ہے جو کہتے ہیں کہ دعا و مناجات کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ دعا و مناجات سے مسلمان کو کوئی چارہ نہیں ہے۔ اس سے انکار اسی کو ہو گا جو خدا کا قائل نہیں ہے اور درحقیقت دہریہ ہے۔ البتہ دہریہ کے نزدیک دعا و مناجات کوئی شے نہیں ہو سکتی۔ مگر جس کو خدا کے وجود کا یقین ہے وہ دعا و مناجات سے انکار نہیں رکھ سکتا۔ بعض جاہلوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ دعا تقاضائے رضا کے خلاف ہے۔ ان جاہلوں کو یہ نہیں معلوم کہ رضائے الہی اسی میں ہے کہ بندہ دست دعا کو خدا کی جناب میں بلند کرے۔ اور اس سے عافیت جسمانی اور روحانی کا طالب ہو یہ امر کبھی رضائے الہی کے موافق نہیں ہے کہ بندہ خدا سے مستغنی ہو بیٹھے اور یہ کہے کہ دعا کی کیا حاجت ہے۔ جیسا خدا کی مرضی میں آتا ہے ویسا کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جو خدا کی مرضی ہوتی ہے وہی ہوتا ہے۔ مگر صریحاً خدا کی مرضی کے مطابق یہ امر نص قرآنی سے معلوم ہوتا ہے کہ بندہ خدا سے دعائیں مانگے۔ اگر دعا طلبی بے کار شے ہوتی تو اس قدر دعائیں کیوں قرآن میں دیکھی جاتیں۔ انبیاء سلف کیوں کار بند دعا ہوتے۔ صحف قدیم میں دعائیں بکثرت مندرج ہوتیں۔ پیغمبر خدا کیوں ہاتھ اٹھا اٹھا دعائیں فرماتے علی مرتضیٰ دعا کے طریقے بتلاتے آئمہ دعا طلبی کو عبادت جانتے اور صحیفہ کاملہ کی ہی کتاب دنا و وظیفے طالبان حق ہوتی۔ اگر دعا کوئی شے نہیں ہے تو نماز ہی کوئی شے نہیں ہے۔ کس واسطے کہ نماز کو دعاؤں ہی پر



مشتعل نظر آتی ہے لاریب دعا سے انکار شیطان کا کام ہے۔ یہ مرد و اذلی کسی کی جناب میں دست دعا بلند کرے۔ خدا کا تو وہ دشمن ہے۔ الحق دعا و مناجات سے مسلمان کو چھٹکارا نہیں ہے۔ اس کا وہی شخص منکر ہو گا جو خدا کو لاشے جانتا ہو گا۔ ورنہ عبادت سے انکار خدا کا ماننے والا نہیں کر سکتا۔ پس چونکہ دعا عین عبادت ہے امیر المومنین علیہ السلام اپنے پیروان کو دعا کا طریقہ بتلاتے ہیں۔ آپ کے ارشاد کے مطابق داعی کو سراپا نیاز ہو کر طالب دعا ہونا چاہیے اور آخر اشعار بالا میں خلوت گزینی کی ہدایت ہے۔ اور یہ اس لیے کہ تمام تعلقات دنیوی سے دل و دماغ داعی کو فراغت حاصل ہو جائے۔ تاکہ یکسوئی کے ساتھ عرض حال درگاہ خداوندی میں کر سکے اس شعر سے مراقبہ کی تعلیم بھی ظاہر ہوتی ہے۔ بہر حال جب داعی اس اس طور سے عرض حال کرتا ہے تو خداوند تعالیٰ اس کی دعا کو قبول فرماتا ہے۔ قبول دعا کے وقت جو خطاب خداوند تعالیٰ اپنے بندے کی طرف فرماتا ہے۔ وہ اشعار ذیل میں ذکر کر پاتا ہے۔

سَأَلْتُ عَبْدِي وَأَنْتَ فِي كُنْفِي      وَكُلَّ مَا قُلْتَ قَدْ سَمِعْنَا  
صَوْتِكَ نَشْتَاقُهُ مَلَا يَكُنِي      فَذَنْبِكَ الْآنَ قَدْ غَفَرْنَا  
فِي الْجَنَّةِ الْخُلْدِ مَا يَمُنَّا      طُوبَاكَ طُوبَاكَ تَعَطُّوبَا  
سَلِّ بِلَا حِشْمَةٍ وَلَا رَحَبَةٍ      وَلَا تَخَفْ إِنِّي إِنْ شَاءَ اللَّهُ

معنی : تو نے سوال کیا اے ہمارے بندے اور تو ہمارے دائرہ حمایت میں ہے۔ اور جو کچھ تو نے کہا ہم نے اسے سناتیری آواز کی مشتاق ہمارے فرشتے ہیں پس تیرے گناہ کو اس وقت ہم نے معاف کیا۔ بہشت جاوید میں ہے۔ وہ چیز تو جس کا متمنی ہوا خوشحال اس چیز کا جس کی تو تمنا کرے ہم سے اپنے مطلب کا طالب ہو بے لجائے اور بے خوف کھائے اور نہ ڈر بہ تحقیق کہ ہم اللہ ہیں اور ہمارے کرم کی حد نہیں ہے۔

بیان آنکہ بنار کار مردم بر مال ست نہ بر عقل کامل و طبع راست

يُغْفَلُ عِيُوبُ الْمَرْءِ كَثْرَةُ مَالِهِ      يُصَدَّقُ فِي مَا قَالَهُ وَهُوَ كَذُوبٌ  
وَيُزْدَى بِعَقْلِ الْمَرْءِ قِلَّتُ مَالِهِ      فَتَقَّةُ الْأَثْوَامُ وَهُوَ لَيْدٌ

معنی : اور آدمی کی زیادتی مال اس کے عیوب چھپا دیتی ہے۔ پس اس کا قول سچا مانا جاتا ہے۔ حالانکہ وہ دروغ گو ہے۔ اور آدمی کی کم مائیگی سے اس کی عقل خوار ہوتی ہے۔

پس لوگ اس کو بے وقوف بناتے ہیں حالانکہ وہ خردمند ہے۔

### مدح علم و ادب و حمد عقل و حسب

لَيْسَ الْبَلَاءُ فِي آيَاتِنَا عَجَبًا بَلِ السَّلَامَةُ فِيهَا أَعْجَبُ الْعَجَبِ  
 معنی : روزگار میں بلا کا ہونا کوئی عجیب انگیزہ نہیں ہے۔ البتہ روزگار میں سلامتی کا پایا  
 جانا سب عجیب انگیزہ معنائیں سے زیادہ عجیب انگیزہ مضمون ہے۔  
 لَيْسَ الْجَمَالُ بِأَشْوَابِ بَزَّتِهَا إِنَّ الْجَمَالَ جَمَالُ الْعِلْمِ وَالْأَدَبِ  
 معنی : جامہ سے زینت انسان کو نہیں ہوتی۔ مرد کو جمال علم و ادب سے ہوتا ہے۔  
 لَيْسَ يَتِيمٌ الَّذِي قَدَّمَ وَالِدَهُ إِنَّ الْيَتِيمَ يَتِيمُ الْعَقْلِ وَالْحَسَبِ  
 معنی : وہ یتیم نہیں ہوتا ہے جس کا باپ مر جاتا ہے۔ یتیم وہ شخص ہے جو عقل و حسب کا  
 یتیم ہوتا ہے۔

### ارشاد ارباب صلاح بہ اسباب فلاح

قَوْضُ عَلَى النَّاسِ أَنْ يَتَوَبُّوا لَكِنَّ تَرْدَ الذَّنْبِ أَوْجَبُ  
 معنی : آدمی پر فرض ہے کہ گناہوں سے توبہ کرے مگر گناہوں کا ترک کرنا واجب ہے۔  
 وَالذَّهْرُ فِي صَرْفِهِ عَجِيبٌ وَغَفْلَةُ النَّاسِ فِي أَعْجَبُ  
 معنی : روزگار کے حوادث عجیب ہیں اور غفلت آدمی کے حوادث روزگار میں عجیب تر  
 ہے۔

وَالصَّبْرُ فِي النَّائِبَاتِ صَعْبٌ لَكِنَّ قُوَّةَ الثَّوَابِ أَصْعَبُ  
 معنی : صبر حوادث روزگار میں ایک دشوار امر ہے مگر اس سے زیادہ تر دشوار حوادث  
 روزگار بے صبر کے ثواب کا فوت ہو جانا ہے۔

فَكُلُّ مَا تَرْجُو تَوْبَتُكَ وَالْمَوْتُ مِنْ كُلِّ ذَاكَ أَقْرَبُ  
 معنی : دنیا کی ساری امیدیں قریب ہیں۔ مگر موت سب امیدوں سے قریب تر ہے۔  
 واضح ہو کہ امیر المومنین کا دیوان کا دیوان مسائل اخلاق و مکتبے معور ہے اور محتاج  
 انتساب نہیں ہے۔ ہر طالب حق کا فرض منصبی ہے کہ آپ کے تمام کلام کو بغور مطالعہ کر کے



اپنے دین و دنیا کو سنوارے اس کتاب میں حضرت کے تمام کلام معجز نظام کی گنجائش کہاں ہے۔ اس لیے صرف تھوڑے اشعار نمونہ کے طور پر داخل ہذا کیے گئے۔

## قصیدہ فرزدق

واضح ہو کہ قصیدہ آئندہ کو فرزدق نے بدیہہ کہا تھا۔ اور اس کے کہنے کا یہ طور ہوا کہ ہشام بن عبدالمالک بن مروان اپنے باپ کے عہد خلافت میں شام سے بہ تقریب حج مکہ معظمہ آیا ہوا تھا۔ وقت طواف جب اس نے چاہا کہ حجر اسود کو بوسہ دے تو اردہام مردم سے اسے اس کا موقع نہ ملا بس ایک منبر پر بیٹھ کر لوگوں کا تماشہ دیکھنے لگا۔ اور اس وقت جناب سید الساجدین حضرت امام زین العابدین علیہ السلام طواف کے لیے شریف لائے اور جب حجر اسود کے پاس پہنچے تو لوگ غایت ادب سے دور وہ بھٹ گئے۔ اور آپ نے بے مزاحمت حجر اسود کو بوسہ دیا۔ جب اہل شام نے خلافت کا یہ عالم دیکھا تو ایک شامی نے ہشام سے پوچھا کہ صاحب جاہ و جلال جس کی زائرین کعبہ نے اس قدر تعظیم کی کون ہے۔ ہشام کو اس خیال فاسد نے لیا کہ اگر ہم بتاتے ہیں کہ یہ یادگار و جانشین پیغمبر ہے تو اہل شام اس کی جانب مائل ہو کر اس کا کلمہ پڑھیں گے پس بطرز تباہل اس نے غایت لاپرواہی سے سائل کو جواب دیا کہ ہم اسے نہیں پہچانتے۔ اتفاقاً ہاں فرزدق موجود تھا اور ہشام اور اس کے ساتھی کی گفتگو سن رہا تھا۔ اس سے رہا نہ گیا۔ جوش دلائے اہل بیت میں اس نے یہ قصیدہ ہشام کے روبرو پڑھا ہشام کی بے دینی حرکت میں آئی اس نے فرزدق کو مجبوس کیا جب حضرت امام علیہ السلام کو اس کی خبر ہوئی آپ نے فرزدق کو بارہ ہزار درہم بھیجے اس دوست دار خداوند پیغمبر نے لینے سے انکار کیا اور کہلا بھیجا کہ میں نے صلہ کے خیال سے قصیدہ مدحیہ نہیں کہا تھا میری غرض اس مدح خوانی سے مجرد خدا و رسول کی طرف داری اور آپ سے امید مغفرت و شفاعت تھی۔ حضرت امام علیہ السلام نے فرمایا کہ ہم اہل بیت جو چیز کسی کو دیتے ہیں پھر واپس نہیں لیتے اور خدائے تعالیٰ تیری نیت سے وائف ہے جو تیری مراد ہے اسے بر لائے گا۔ فرزدق نے تعمیل ارشاد کی اور دین دنیا دونوں میں اچھا رہا۔

اے حضرات اہل ایمان دالے اس قصہ سے آپ خوب سمجھ سکتے ہیں کہ اہل حکومت اور



لکن پیروان کا اہم خاندان نبوت کے ساتھ کیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ بہت تھوڑے سے لوگ تھے جو خاندان نبوت کے ساتھ محبت رکھتے تھے اور جو رکھتے تھے ان پر اہل حکومت کی طرف سے بے حد سختیاں ہوتی تھیں۔ فرزدق مجرّد اس جرم پر کہ ان سے خاندان پیغمبر کی شناخت ہونے کی قید کیا گیا۔ اللہ اللہ کیا مسلمانی تھی۔ ہشام کو دیکھیے کہ حج کو آیا تھا اور امام وقت کو بقول خود نہیں جانتا تھا۔ سو سو پھٹکار ایسے حج پر اور اس مسلمانی پر جس کو خاندان پیغمبر سے بے تعلقی ہو۔ یہی حال اس وقت کے دنیا طلب مسلمانوں کا تھا کہ محمد کا حکم پڑھتے تھے اور ان کی اولاد اور احفاد کی تخریب میں کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھتے تھے کون سی ایذا اور کون سی بے آبروئی ہے جسے کلمہ گویوں نے خاندان پیغمبر کے لیے اٹھا رکھی ہے۔ کیا کیا حقوق اہل بیت ضائع نہیں کیے گئے ہیں۔ فقیر نمبر دار از ابتدا تا انتہا تمام مصائب خاندان پیغمبر کو عرض کر سکتا ہے مگر دو وجہ سے قلم کو روک لیتا ہے۔ اول یہ کہ اس دنیا میں بقیہ زندگی بسر کرنا ہے۔ دوم یہ کہ اگر حق گوئی میں زیادہ کدکری تو یہ کتاب حسب مراد اشاعت پذیر نہ ہوگی۔ اس عہد میں بھی ہشام سے ہزاروں بڑھے لکھے مسلمان ہیں جو نہیں جانتے کہ زین العابدین امام ہیں یا نہیں اور اگر امام ہیں تو خاندان پیغمبر کے امام ہیں یا کسی اور خاندان کے اور اگر خاندان پیغمبر کے امام ہیں تو کون سے امام ہیں اماموں سے ناواقفیت تو اکثر کلمہ گور رکھتے ہیں۔ فقیر اپنے ذاتی تجربہ سے کہہ سکتا ہے کہ زمانہ موجود میں ہزار خواندہ مسلمان سے شاید ایک شخص ایسا ملے گا جو ترتیب وار ائمہ اثنا عشر کے ناموں کو زبانی بتا سکتا ہے۔ اللہ اللہ خاندان پیغمبر کے ساتھ اس سے زیادہ بے تعلقی کیا ہو سکتی ہے۔ یہ کوئی عجب انگیز امر نہیں ہے۔ جب تعلیم کا یہی طور رکھا گیا ہے۔ کہ خاندان پیغمبر سے لاعلمی لاحق رہے اس تعلیم کے اصول وہی ہیں۔ جن پر ہشام نے اپنے سائل کو جواب دیا تھا۔ کتابوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خاندان پیغمبر کے حالات و معاملات کے چھپانے کے بند و بست ہمیشہ ہوا کیے ہیں۔ یہ انھیں بند و بست کا نتیجہ ہے کہ ہزار پڑھے لکھے کلمہ گویوں میں ایک آدمی بھی اس وقت ایسا نہیں پایا جاتا ہے جو ائمہ کے نام صحیح طور پر ترتیب وار بتا سکے ان کی سوانح عمری سے خبر رکھنی تو بیرون از توقع ہے۔ اگر دیدہ انصاف سے دیکھیے تو اس لاعلمی میں صرف خاندان پیغمبر کی کسر شان نہیں ہے بلکہ خود پیغمبر صاحب کی کسر شان ہے۔ رسول اللہ نے قرآن اور اپنی عزت کو دواہم امر فرمایا ہے پس تعجب ہے ایسے مسلمانوں سے جو ان کی عزت



اور آل اظہار سے لاعلمی رکھتے ہیں۔ خیراب دوست داران خاندان پیغمبر قصیدہ ذیل سے لذت روحانی اٹھائیں اور اس کے مصنف کی ولا کی داد دیں۔

### قصیدہ فرزدق

هَذَا الَّذِي تَعْرِفُ الْبَطَاءُ وَطَائِفُهُ وَالْبَيْتُ بِعَرَفِهِ وَالْحِلُّ وَالْحَرَمُ  
معنی : یہ وہ شخص ہے کہ مکہ اس کے جائے قدم کو پہچانتا ہے اور خانہ کعبہ اس کو پہچانتا ہے۔ اور پیرامون حرم و حرم پہچانتے ہیں۔ یعنی اے ہشام تو اگر اس شخص کو نہیں پہچانتا ہے تو کیا۔ اس شخص کے موضع قدم کو خانہ کعبہ اور حل و حرم پہچانتے ہیں۔

هَذَا ابْنُ خَيْرِ عِبَادِ اللَّهِ كُلِّهِمْ هَذَا الثَّقِيُّ الثَّقِيُّ الطَّاهِرُ الْعَلَمُ  
معنی : یہ بیٹا بہترین بندگان خدا کا ہے۔ یہ پرہیزگار پاک سردار گروہ ہے۔ بہترین بندگان خدا سے رسول اللہ اور سردار گروہ سے سردار قریش مراد ہے۔

إِذَا دَرَأَتْهُ قُرَيْشٌ قَالَ قَائِلُهُمْ إِلَى مَكَارِمُ هَذَا أَيْنَتْهِ الْكَمُّ  
معنی : جب قوم قریش اسے دھکیلتی ہے۔ تو ان میں کا کہنے والا کہتا ہے کہ اس شخص پر بزرگی اور جواں مردی کا خاتمہ ہے۔

يَنْبِيءُ إِلَى ذُرْوَةِ الْعِزِّ الَّذِي تَصَوَّرَتْ عَنْ يَنْبِهِمْ عَرَبُ الْإِسْلَامِ وَالْعِجَمُ  
معنی : بلند ہوتا ہے اس اوج عزت کو جس کی دریافت میں عرب الاسلام اور عجم عاجز ہیں۔

لے فرزدق : ”ابو فراس ہمام بن غالب تمیمی بصرہ میں پیدا ہوا اور وہیں ابتدائی زندگی گزاری وہ آنحضورؐ ادب میں پلانا، فصیح ماحول میں جوان ہوا... حضرت علیؑ نے اس کے باپ سے کہا کہ اسے قرآن پڑھاؤ کہ وہ اس کے بہتر ہے“ یہ بات فرزدق کے ذہن میں بڑھاپے تک جی رہی... بعد ازاں کوفہ و بصرہ کے والیوں سے جاملا، کبھی ان کی مدح کرتا کبھی ہجو... فرزدق کو اپنی اصل پر بڑا فخر اور اپنے خاندان پر بڑا ناز تھا... اس کی شاعری میں فخر یہ عنصر غالب ہے... عربوں کے مشہور واقعات و انساب کا ذکر اور خانہ بدوشوں کے طرز ادا کی پیردی چاہتا ہے یہی عناصر ہیں جن کی وجہ سے فرزدق کی شاعری کو راویوں نے پسند کیا اور نحوویں نے اسے ترجیح دی اور کہا فرزدق کی شاعری نہیں ہوتی تو عربی زبان کا تہائی حصہ تلف ہو جاتا۔ (متونی ۱۱۰ ص ۲۶۱)

یعنی اسے وہ ارتفاعِ عزت حاصل ہے کہ اہل عرب و عجم اس تک نہیں پہنچ سکتے۔  
 يَكْلَهُ يُمِسُّهُ عِرْفَانٌ رَّاحٍ ۖ رُكْنٌ كَبِيرٌ اِذَا مَا جَاءَ يَسْتَلِمُ  
 معنی : قریب ہو جاتا ہے سنگِ اسود کہ پکڑ لے اس کے ہاتھ کو جب وہ آتا ہے بوسہ دینے  
 کے واسطے یعنی سنگِ اسود پر جان کر کہ وہ فرزندِ رسول ہے اور اسے پکڑنا چاہتا ہے۔  
 فِي كَفِّهِ خَيْرٌ رَّانٍ رِيحُهُ عِبَقٌ ۖ فِي كَفِّهِ اَرْوَعُ عِرْنَنِ شَمَمٌ

معنی : اس کے کف دست میں بید ہے جس کی بو خوش ہے کہ ہاتھ میں اس خوش جہال کے ہے  
 کہ جس کی ناک بلند ہے۔ جانا چاہیے کہ بینی کا بلند ہونا شرف و بزرگی کی علامت ہے۔ وجاہت  
 ظاہری کو عمدگی باطن کے ساتھ ایک تعلق عظیم ہے۔ اس لیے انبیاء نہ صرف معایبِ جسمانی سے  
 تمام تر پاک تھے بلکہ صاف جہال بھی تھے۔ واضح ہو کہ پیغمبر خدا حضرت بنی اور علی مرتضیٰ اور ان  
 کی تمام اولاد و احفاد کو خدا نے حسن بخشا تھا۔ لاریب فطرت اسی کی مقتضی تھی کہ ایسے ایسے ارباب  
 فضل و شرف کو کمالات موری بھی حاصل ہوتے، بخیاں راقم بد صورت آدمی کم تر خوش صفات  
 ہوتے ہیں۔ بلاشبہ صورت اور سیرت میں کوئی تعلق خفی ضرور ہے۔

يُعْنِي حَيَاءٌ وَيُعْنِي مِمَّا بَتِه ۖ فَمَا يُكَلِّمُ الْاِلٰهِيْنَ

معنی : وہ حیا سے نظر او پر نہیں کرتا ہے۔ اور لوگ ہیبت سے اس پر نظر نہیں کر سکتے  
 پس اس سے گفتگو نہیں کی جاسکتی ہے۔ الا اس وقت کہ وہ مقسم ہوتا ہے یعنی حالت  
 بشاشت میں ہوتا ہے۔ نبی زادگی کا رعب ایسا ہی ہونا چاہیے۔ تب تو وقت طواف  
 دورویہ لوگ اپنے جی سے پھٹ گئے تھے۔

يَنْشَقُّ نُوْرُ الْهُدٰى مِنْ نُّوْرِ غُرَّتِه ۖ كَالشَّمْسِ يَنْجَابُ عَنْ اَشْرَاقِهَا الظُّلُمُ  
 معنی : نورِ ہدایت اس کے نورِ پیشانی سے پھٹ کر نکلتا ہے۔ جیسا کہ آفتاب کہ اس کی  
 رخسانی سے تاریکیاں زائل ہو جاتی ہیں۔ یہ شاعرانہ مدح نہیں ہے حقیقت حال بھی یہی  
 ہے کہ ان حضراتِ ائمہ سے نورِ ہدایت اشاعت پذیر ہوتا ہے۔

مَنْ جَدُّ دَانَ فَضْلُ الْاَنْبِيَاءِ لَهُ ۖ وَفَضْلُ اُمَّتِه ۖ دَانَتْ لَهُ الْاُمَمُ

معنی : ممدوح کا جد وہ ہے کہ جس کے سامنے تمام انبیاء کا فضل زبردست ہو گیا ہے  
 اور جس کی امت کے فضل کے مقابلہ میں تمام انبیاء کی امتیں زبردست ہو گئیں یعنی ممدوح  
 کا جد افضل الانبیاء ہے۔ اور ممدوح کے جد کی امت افضل الامم ہے۔



مُنْشَقَّةٌ مِّنْ رَّسُولِ اللَّهِ تَبَعَةٌ طَابَتْ عَنَّا صِرَافُهَا وَالْحَيِّمُ وَالشَّيْمُ  
 معنی : اُس کا درخت رسول اللہ سے اُگا ہے۔ پاک ہوئے عناصر اس کے اور پاک ہوئی  
 خوبو اس کی۔ یعنی ممدوح فرع نخل نبوت ہے۔ اور اس کی ترکیب بدن اور خوبو سب کا سب  
 پاک و صاف واقع ہوئے ہیں۔

هَذَا ابْنُ قَاطِمَةَ اِنْ كُنْتَ جَاهِلًا بِحَدِّكَ اَنْبِيَاءُ اللّٰهُ قَدْ خَتَمُوا  
 معنی : یہ پسر فاطمہ ہے۔ جان لے اگر تجھ کو نہیں معلوم ہے۔ اس کا نانا خاتم النبیین ہے۔  
 وائے برہشام کہ اس نے زین العابدین علیہ السلام کی نسبت اظہارِ نادر واقعیت  
 کیا۔ اور وائے ان مسلمانوں پر بھی جنہوں نے ائمہ علیہ السلام سے کلمہ گویوں کو نادر واقف  
 رکھنے کے بند و بست کیے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو کلمہ گو حضرات ائمہ سے تباہ یا لاعلمی  
 روا رکھتا ہے یا ان سے مطلع رہنے کو ایک غیر ضروری امر سمجھتا ہے۔ تو لاریب ایسا شخص  
 اسی ہشام کی امت کا آدمی ہے۔ وہ ہزار کلمہ پڑھنے پر بھی امت رسول اللہ میں شمار  
 نہیں کیا جاسکتا ہے۔ بہت جاتے افسوس ہے کہ اس زمانہ میں خاندانِ پیغمبر سے ایسی  
 بے تعلقی کلمہ گویوں میں دیکھی جاتی ہے کہ الہی توبہ۔ فقرے ہزاروں ایسے حضرات دیکھے ہیں۔  
 جو عمری خواہ ہیں۔ صوفی مشرب ہیں۔ داعظ ہیں۔ فقیہ ہیں، حاجی ہیں۔ زائرینِ مزارات  
 اولیا ہیں مصحف پرست ہیں پابندِ صوم و صلوٰۃ ہیں۔ شاغل ہیں اور خدا جانے کیا کیا ہیں۔  
 مگر دوازدہ اماموں کے ناموں سے آشنائی تک نہیں رکھتے۔ لاریب اگر ان برگزیدگان  
 حق کو حضرات ائمہ علیہ السلام سے کوئی تعلق ہوتا تو جس طرح اتنے کمالات کے حاصل کر  
 کی طرف سعی فرماتے گئے ہیں۔ بے چارے اماموں کو بھی اپنے گوشہ خاطر میں جگہ دیتے  
 تب ان مظلوموں کے نام بھی اہل کمالات کو یاد رہتے۔ بے تعلقی کی حالت میں کب  
 کس کو یاد رکھنے کی زحمت اختیار کر سکتا ہے۔ شایقانِ تحقیق فقیر کے قول بالا کی تحقیق  
 فرمائیں ہزاروں ممتاز صورت ایسے مسلمان نکلیں گے جو حضرات ائمہ سے تمام تر بے خبر  
 ہیں۔ اور ان سے باخبر رہنا کوئی ضروری امر نہیں جانتے۔ اس ناپہنچ نے چند پڑھے  
 لکھے حضرات کو جو ائمہ خاندانِ پیغمبر سے تمام تر بے خبر تھے مختلف وقتوں میں آگاہ کر دیا ہے  
 کچھ بزرگوں نے تو میری عرض معقول سمجھ کر حضرات ائمہ کے نام سیکھ لیے مگر بہتوں نے  
 ناواقف ہی کو راہ دی۔ اور ہشام وقت بنے رہے۔

اللَّهُ شَرَفَهُ قَدْ مَا وَعَظَمَهُ جَرَى يَدَاكَ لَهُ فِي لَوْحِهِ الْقَلَمُ  
 معنی : خدائے تعالیٰ نے اسے بزرگ اور عظیم بنایا۔ قدم میں اس کی بزرگی عظمت کو  
 اللہ پاک نے قلم قدرت سے لوح محفوظ پر ثبت فرمایا ہے۔ یعنی اس کی بزرگی و عظمت  
 قدیمی ہے۔ کسی کم بخت کی توہین و تحقیر سے اس کی بزرگی و عظمت میں کمی لاحق نہیں ہو سکتی۔  
 أَلَيْتُ أَهْوَنُ مِنْهُ حِينَ تَغْضِبُهُ وَالْمَوْتُ إِلَيْهِ مِنْهُ حِينَ يَفْتَضِرُّ

معنی : ممدوح سے شیر و سبکتر ہے۔ جس وقت تو غصہ میں لاوے اسے اور موت آسان  
 تر ہے۔ ممدوح سے جس وقت کے وہ تم یا غضب دلایا جاوے یعنی ممدوح کو جب غصہ  
 دلایا جاتا ہے۔ تو اس وقت اس سے شیر سبک تر ہے۔ اور جب ممدوح کو غضب دلایا  
 جاتا ہے۔ تو اس وقت اس سے موت آسان تر ہے۔

واضح ہو کہ پیغمبر خدا اور ان کے خاندان کے ائمہ نفاست سے تمام تر پاک تھے ان  
 حضرات کو غضب اور غصہ سے کوئی علاقہ نہ تھا۔ لیکن غضب و غصہ ان کو تب آتا تھا  
 جب اللہ کے حقوق معرض تلف میں در آتے تھے ظاہر ہے کہ حقوق خداوندی کی نگرانی نبی  
 سے ہوا کرتی ہے۔ پس چونکہ حضرت سید الساجدین برحق جانشینان پیغمبر صلعم ہیں۔ حقوق  
 خداوندی کے تلف ہونے پر آپ کا پر غضب ہونا نشان امامت ہے

فَلَيْسَ قَوْلُكَ مِنْ هَذَا أَيْضًا ۖ أَلْعَرَبُ مَنْ انْكَرَتْ وَالْحَجَمُ

معنی : پس تیرا یہ کہنا کہ یہ کون ہے ممدوح کو ضرر رساں نہیں ہو سکتا۔ تو نے جسے  
 نہیں پہچانا اسے عرب و عجم پہچانتے ہیں۔

بَلَّغْنَا يَدَيْهِ غِيَاثٌ عَمَّا نَفَعَهُمَا تَسْتَوِيَانِ وَلَا يَعْرُودُهُمَا عَدَمٌ

معنی : دونوں ہاتھ اس کے ایسے فریادرس ہیں کہ ان سے نفع عام جاری ہے۔ ان سے  
 بخشش کی ریزش ہوا کرتی ہے۔ اور وہ ہاتھ کبھی خالی نہیں ہوتے۔ واقعی خاندان پیغمبر کا  
 جو ایسا ہی ہے کہ امر مقرر کو بھی اس سے کوئی نسبت نہیں ہے۔ ایسے جو اد نہ ہوئے نہ  
 ہوں گے۔ ان کے جوہ کی ہزاروں مثالیں موجود ہیں۔ خوف تطویل کلام سے اس جگہ پر  
 نقل نہیں کی جاتی ہیں۔

سَهْلُ الْخَلْقَةِ لِاخْتِشَاءِ بَوَادِرَ لَا يَزِينُهُ إِنْسَانٌ حُسْنُ الْخُلُقِ وَالِإِيمِ

معنی : وہ نرم طبیعت از روئے خلقت کے ہے۔ اس کے مزاج کی تیزیاں ڈر کے



قلل نہیں ہیں۔ اسے دو شے آراستہ کیے ہوئے ہیں۔ ایک حسن خلق دوم خوش خوئی۔

حَمَلُ اقْتَالِ اقْتَوَامٍ اِذَا فِدْحُوًا خَلُو الشَّمَائِلُ تَخْلُو عِنْدَكَ نِعَمٌ

معنی : وہ اقوام کے یاروں کا اٹھانے والا ہے اس وقت جب اقوام مبتلائے قرض ہوتی ہیں۔ وہ شیریں خصائل ہے۔ اس کے پاس میں ہو کر نعمتیں شیریں ہو جاتی ہیں یعنی مردمان مقررہ کھشاید قرض سے نجات دینے والا ہے اور چونکہ شیریں خصائل ہے اس لیے اس سے احسان نمائی ظہور میں نہیں آتا ہے جس کے سبب سے اس کی نعمتیں لوگوں کو خوش گوار معلوم ہوتی ہیں۔

مَا قَال لَاقْظُ الْاَلَا تَشْهَدُ اَوَّلَا الشَّهْدُ كَانَتْ لَاءُكَ نِعَمٌ

معنی : کبھی لا نہیں کہا اِلَّا اِلَّا اللہ کہنے میں اگر تشہد نہیں ہوتا تو اس کا لا نعم ہوتا۔ یعنی سوال سائل پر کبھی لا نہیں کہا لا اس کی زبان پر تب ہی آتا ہے۔ جب وہ لا الہ الا اللہ کہتا ہے۔ اگر ضرورت تشہد نہیں ہوتی تو ہمیشہ نعم ہی فرماتا کبھی لفظ لا کو زبان پر نہیں لاتا۔ واقعی خاندان پیغمبر کا وجود ایسا ہی دیکھا جاتا ہے کہ گاہے سائل سے ان حضرات کی زبان پاک آشنائے انکار نہیں ہوتی تھی۔

لَا يَخْلِفُ الْوَعْدَ مِمَّنْ يَنْتَبِهْ رَحْبُ الْغِنَاءِ اَرِيْبٌ جِنُّ يَعْزِمُ

معنی : وہ وعدہ خلاف نہیں ہے۔ مبارک جان ہے۔ مہمان نواز ہے اور صراط مستقیم کے اختیار کرنے میں زیرک ہے۔

عَمَّ الْبَرِّيَّةِ بِالْاِحْسَانِ فَانْقَسَتْ عَنْهَا الْعِنَايَةُ وَذَلَمْلَاقُ وَالْعَدَمُ

معنی : اس نے خلافت کو گرفتار احسان کر ڈالا۔ پس خلافت سے رنج درویشی اور مفلسی جاتی رہی۔

هَعَا الْغِيُوْتُ اِذَا مَا اَزْمَمَ اَزْمَتٌ وَلَا سُدَّ اُسْدُ شَرِّ اِذَا الْبَاسُ مَحْتَدَمٌ

معنی : یہ لوگ یعنی مدوح و آبا ئے مدوح باران ہیں۔ جب شدت قحط استیصال مردم کرتی ہے۔ اور یہ لوگ شیران راہ کوہ سلمیٰ ہیں۔ جس دم کہ ہنگامہ کارزار برپا ہوتا ہے۔ واضح ہو کہ شیریں کوہ سلمیٰ کی راہ کو کہتے ہیں وہاں شیروں کی کثرت پائی جاتی ہے۔

لَا يَنْقُصُ الْعُسْبُوكُ بَطَانٍ اَكْفِهِمْ سِيَانُ ذَلِكَ اَنْ اِثْرًا اَذَانُ عَدُوٍّ

معنی : کم نہیں کرتی تھے نگلی فراخی کو ان کے ہاتھوں سے برابر تھی نگلی اور فراخی خواہ وہ

مالدار اور خواہ وہ غیر مالدار ہیں یعنی ان کی سخاوت زرداری اور بے زری دونوں حالتوں یکساں رہتی ہیں۔ یہ کوئی مبالغہ پردازی نہیں ہے خاندان پیغمبر کا یہی حال رہا ہے کہ دولت اور بے دولتی کو ان کی سخاوت شعاری میں کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَآلِ مُحَمَّدٍ۔

مُقَدَّمٌ بَعْدَ ذِكْرِ اللَّهِ ذِكْرُهُمْ فِي كُلِّ بَدْعٍ وَخَتْمٌ بِهِ الْكَلِمُ  
معنی : مقدم ہے بعد ذکر اللہ کے ذکر ان کا ہر سخن کی ابتداء میں اور سخن کا خاتمہ بھی انہیں کے ذکر پر ہے۔ یعنی بعد ذکر خدا کے ذکر محمد و آل محمد کا ہر سخن پر مقدم ہے۔ اسی طرح انہیں حضرات کے ذکر پر ہر سخن کا خاتمہ بھی ہونا چاہیے۔ واضح ہو کہ حکم نبوی صلعم بھی ایسا ہے۔ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَآلِ مُحَمَّدٍ۔

يَا بِي لَهْمَّ اَنْ يَحِلَّ الذَّمُّ سَاحَتَهُمْ نَحِيْمٌ، كَرِيْمٌ دَائِدِيْ يَالْتَدِيْ هُفُومٌ  
معنی : نکوش انکار رکھتی ہے۔ ان کے گھر میں فردو آئے کیونکہ ان کے خصائل کریم ہیں۔ اور ان کے ہاتھ پر ازداد دہش ہیں۔ یعنی ایسے ہاتھ ہیں کہ جو کچھ رکھتے ہیں دے ڈالتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے ارباب جو دوسرا کے گھر نکوش کیونکر آسکتی ہے۔

اَيُّ الْخَلَائِقِ لَسْتُ فِيْ رِقَابِهِمْ لَا ذَلِيْلَةَ هَذَا اَوَّلُهُ نِعَمٌ  
معنی : کون خلایق سے ہے جو ان کے بندگان سے نہیں ہے۔ بسبب اولیت اس شخص کے یا بسبب اس کی نوازش اور انعام کے یعنی اس وقت کون ایسے لوگ ہیں جو خاندان پیغمبر کے بندے نہیں ہیں۔ اس غلامی کا سبب یہ شخص ہو رہا ہے۔ اول اپنی انفلیت دوم اپنی نوازش و کرم کی بنیاد پر۔

مَنْ يَعْرِفِ اللَّهَ يَعْرِفْ اَقْرَبِيَّةَ ذَا وَالِدَيْنِ مِنْ بَيْتِ هَذَا اِنَّ اِلَهَ الْاُمَمِ  
معنی : جو شخص خدا کو پہچانے گا وہ اس شخص کی اولیت کو بھی پہچانے گا۔ اور امتوں نے دین کو اس شخص کے گھر سے پایا ہے۔ اس قول کی صحت میں اسی کو گفتگو ہوگی جو تنقیص شان علی ابن ابی طالب اور بقیہ ائمہ معصومین علیہ السلام مد نظر رکھتا ہوگا۔

واضح ہو کہ یہ قصیدہ فی البدیہہ کہا گیا تھا۔ اس سے فرزدق کی طبائی کا موازنہ کرنا چاہیے۔ واقعی یہ شخص بڑی قوت شاعری رکھتا تھا۔ اس پر سے لطف یہ کہ اس کا مذاق شاعری کس قدر عالی تھا۔ اس قصیدے میں کسی طرح کی بد مذاقی کی بات نظر نہیں آتی ہے۔ نہ مبالغہ



شاعر گزرا ہے۔ علاوہ اس کے بہت کچھ جامع علوم و فنون تھا اس کا دیوان دیدنی ہے۔ اس کی شاعری تمام تر یورپین مذاق رکھتی ہے اس لیے اہل یورپ کو اس کا انداز کلام نہایت پسند ہے۔ ایشیائی مبالغوں سے لاریب اس کے سب سے اشعار پاک ہیں تشبیہ و استعارہ بھی الشاذ کا معدوم کا حکم رکھتے ہیں۔ شاعری اس کی عمدگی مضامین اندیشگی زبان سے ہویدا ہے۔ بلاشبہ تعلیم یافتہ اشخاص کو اس شاعر کا کلام ضرور ہے کہ پسند آئے۔ حضرات شائقین زہیر کے دیوان کو ضرور ملاحظہ فرمائیں۔ یہ دیوان شہر لندن میں چھپ گیا ہے فقر کے پاس جو نسخہ ہے مطبوعہ لندن ہے اسی نسخہ کے دیباچہ بہار الدن زہیر کی نسبت ابن خلکان کی کتاب ذیات الاعیان و انباء انباء الزمان میں سے یہ حالت مندرج دیکھے جاتے ہیں کہ ابو الفضل زہیر بن محمد بن علی بن محی بن الحسن بن منصور بن عاصم المہلبی العتکی مقلب بہ بہار الدن الکاتب فضلاء عصر سے تھا اور نظم و نثر اور خطاطی میں سب پر غلبہ رکھتا تھا سلطان ملک صالح خدیو مصر کی سرکار سے متعلق تھا جب سلطان مذکور شام کی طرف گیا وہ بھی ہمراہ تھا۔ اور جب اس کا قبضہ دمشق پر ہو گیا اس نے بھی اس شہر میں قیام اختیار کیا۔ بعد ازاں ملک صالح گرفتار ہو گیا تب زہیر شہر نابلس میں رہ کر اپنے آقا کے حالات کا نگران رہا جب صالح غنصی کو مفلسی حاصل ہوئی اور وہ پھر مصر کی سلطنت کو واپس گیا یہ شاعر بھی اس کے ساتھ مصر کو گیا۔ ابن خلکان لکھتا ہے کہ ہم کو زہیر سے ملاقات ہوئی اور ہم نے اس کے چند اشعار اس کی زبان سے سنے اس مورخ کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ زہیر مصر میں مر گیا۔ اس کی وفات کا سن ہجری ۶۴۶ اور سن عیسوی ۱۲۴۹ء سے۔ اور اس کی قبر قرافات الصغریٰ میں امام شافعی کے نزدیک ہے۔

### نمونہ کلام زہیر

وَقَالَ رَكِبْتُ إِلَى بَعْضِ أَصْلِقَائِهِ فَكَانَ قَدْ عَوَّزَتْ سَفِينَتُهُ ذَهَبًا كَمَا كَانَ فِيهِمَا  
یعنی شاعر نے اپنے ایک ایسے دوست کو یہ اشعار لکھے ہیں کہ جس کی کشتی سفر دریا میں  
دوب گئی تھی اور جو کچھ اس کا مال تھا ضائع ہو گیا تھا۔

لَا تَعْتَبِ الدَّهْرَ فِي خُطْبٍ نَعَاكَ بِهِ      إِنَّ أَسْرَدَ نَعْدٍ مَا طَالَ مَا رَهَبَا  
حَسِبَ زَمَانُكَ فِي حَالٍ تَصَرَّفَ فِيهِ      تَلْمِذُهُ أَعْطَاكَ أَصْعَانَ الَّذِي سَبَا



نہ تشبیہ و استعارہ کی کثرت ہے جو مضمون ہے وہ ایسا ہی ہے کہ پیغمبر و خاندان پیغمبر کے معاملات کے حسب حال ہے۔ علاوہ اس ہر شعر کس قدر خلوص و بلا کے مزے سے بھرا ہوا ہے۔ جوش دین و ایمان راستی عقیدت کا جلوہ شعر سے عیاں ہے۔ لاریب جس شاعر کو خاندان پیغمبر کے ساتھ اس قدر تعلق نہ ہو گا وہ ایسا پر تاثیر قصیدہ نہیں تصنیف کر سکتا ہے۔ خدا تعالیٰ فرزدق کو جزائے خیر دے کہ اس نے پیغمبر صاحب کے خاندان مظلوم کو اس جوش و بلا کے ساتھ یاد کیا۔ خدا یا دہی جزائے خیر تو ان حضرات کو بھی عطا فرما جو اس قصیدہ کو اسی جوش کے ساتھ مطالعہ فرمائیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے قصیدوں کا صدق دل سے بڑھنا تمام تر حقوق خاندان پیغمبر کا ادا کرنا اور اپنی عاقبت کا سنوارنا ہے۔ خیر اب حضرات ناظرین اس قصیدہ کو متنبی کے اس قصیدہ کے ساتھ جو کاتب ہارون کی شان میں ہے۔ ملائیں وقت مقابلہ ظاہر ہو گا کہ متنبی کا کلام کس قدر نامطبوع مبالغوں سے بھرا ہوا ہے صاف متنبی کے انداز کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک شاعر اجرت طلب تھا کیا خود اپنے دل میں متنبی اس کا معترف نہ ہوتا ہو گا کہ اس نے جو کچھ لکھا ہے وہ محض لغو سرائی ہے۔ اس کی تحریر کا مصداق نہ ہارون نہ ہارون کا آقا ہو سکتا تھا اور نہ کوئی ان کا ایسا دنیا دار شخص ہو سکتا ہے۔ اس کے برخلاف فرزدق کے قصیدہ کو قیاس کرنا چاہیے کہ وہ سمجھتا تھا کہ اس کا ممدوح اس کے محامد سے بدرجہا عالی و برتر ہے اور اس لیے جو کچھ اس نے کہا ہے بہت ہی قلیل در قلیل ہے۔ حضرات ناظرین ملاحظہ فرمائیں کہ قصیدہ گوئی کا یہ مطلب زینہار نہیں ہے کہ شاعر سلاطین و امراء کی مدحوں سے شاعری کو ذلیل کرے قصیدہ گوئی سے مراد یہ ہے کہ مسائل اہم پیرایہ نظم میں بیاں کیے جائیں۔ پس جاننا چاہیے کہ متنبی اغراض قصیدہ گوئی کے خلاف کاربند ہوا ہے۔ اور فرزدق تمام تر تقاضائے قصیدہ گوئی سے قریں رہا ہے۔

ذیل میں نمونہ کے طور پر کچھ ایسے اشعار درج کیے جاتے ہیں جو ماقبل کے اشعار سے تمام تر علاحدہ رنگ رکھتے ہیں یہ اشعار وزرہ بہار الدین زمیرؒ کے ہیں۔ یہ شخص ایک بڑا قابل

سے احمد حسن زیات کی "تاریخ ادب عربی" میں ایک زمیر کا ذکر ہے لیکن وہ زمیر بن ابی سلمیٰ ہے۔ زیات لکھتے ہیں زمیر بن ابی سلمیٰ ربیعہ بن رباح مزی نے اپنے باپ کے رشتہ داروں (بنو غطفان) میں تربیت پائی۔۔۔ زمیر زمانہ جاہلیت کے تین مایہ ناز شعرا میں سے ایک ہے، بعض لوگ تو اسے نابغہ اور امرؤ القیس سے بھی بڑھا دیتے ہیں۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۱۱۳ و ۱۱۴۔



وَاللّٰهُ قَدْ جَعَلَ الْآيَاتِ مَذَاهِرًا  
فَلَا تَرَى دَاحَةً بَقِيَتْ وَلَا تَعْبَا  
وَنَاسٌ مَّا لَكَ وَهِيَ الرُّوحُ قَدْ سَلِمَتْ  
لَا تَأْتَفَنُ شَيْئًا بَعْدَهَا ذَهَابَا  
مَا كُنْتَ أَزَلٌ مِّمَّنْ يُجَادِبُهُ  
قَدْ أَصْفَى الدَّهْرُ لَابَدًا وَلَا كِذْبَا  
وَرُبَّ مَالٍ نَمَانٍ بَعْدَ مَرِيضَةٍ  
أَمَا تَرَى الشَّمْعَ بَعْدَ الْقَطْرِ مُلْتَهَبَا

یعنی زمانہ پر عتاب نہ کر کہ اس نے تجھے محل تردد میں ڈالا۔ اس کا دستور ہے کہ دے کر اپنی دی ہوئی چیز کو لے لیتا ہے۔ زمانہ کے ہر دو تصرف پر نظر ڈال تجھے معلوم ہوگا کہ جس قدر لیتا ہے اس کا مضاعف تجھے دیتا ہے خدا نے زمانہ کو گردان بنایا ہے۔ پس نہ رنج کو قرار ہے نہ راحت کو تیرا اس المال تیری جان ہے۔ جو سلامت رہ گئی پس جان کے سوا اور جو کچھ شے رہ جاتی ہے اس پر ہرگز افسوس نہ کر، تو ہی پہلا شخص نہیں ہے کہ مبتلائے مصیبت ہوا ہے دنیا کا یہی انداز ہے اکثر یہی ہوتا ہے کہ مال نقصان پذیر ہو کر ترقی کرتا ہے جیسا کہ شمع گل بنے سے روشن ہوتی ہے۔

ان اشعار کا فطرتی انداز محتاج بیان نہیں ہے۔ شاعر کی خوش مذاقی ہر مصرع سے عیاں ہے۔

## وَلَهُ

وَكُتِبَ إِلَى صِدَائِي لَهُ فِي جَوَابِ كِتَابِ

یعنی ایک دوست کے خط کے جواب میں ہر دو شعر ذیل زمیر نے لکھے ہیں۔

وَإِنِّي كَيْتَابُكَ وَهُوَ بَا  
لَا شَوَاقٍ عَنِّي يُعْيَابُ  
تَلِي لَدَيْكَ أَظَنَّهُ  
يُعَلِّي عَلَيْكَ وَتَكْتُبُ

یعنی تیرا خط پہنچا اور وہ میرے شوقوں کا اظہار کرتا ہے گویا کہ تیرے دم تحریر میرا دل تیرے پاس موجود ہو کر تجھے مضامین بتا رہا تھا۔

## وَلَهُ

وَقَالَ فِي رِحْلَةِ الشَّبَابِ  
رَحَلَ الشَّبَابُ وَلَمْ آيَنْدُ  
يَعْنِي رَحَصَتْ شَبَابٌ مِّنْ زَمِيرِنِ كَمَا هِيَ  
مِنْ لَذَّةٍ فِيهَا نَصِيْبِي

يَا طَيْبُهُ لَوْ لَمْ يَكُنْ  
أَرْسَلْتُ دَمْعِي خَلْفَهُ  
هَيَّجَاتِ لَا وَاللَّهِ مَا  
فَقَدْ نَجَلِي الشَّبَا  
فَقُلِ السَّلَامُ عَلَيْكَ يَا  
رَأَيْتَ فِي الدَّارِ  
مَلَأَ الصَّحَائِفَ بِالدُّوْبِ  
فَسَاءَ يُوجَعُ مِنْ قَرِيبٍ  
هُوَ بِالسَّمِيعِ وَلَا مَحِيبِ  
بِوَقْدِ بَدَا صُبُغِ الْمَشِيبِ  
وَصُلِّ الْجَسَدِ وَالْحَيْدِ  
مَا كَانَ يَخْفَى مِنْ عِيُونِي

یعنی شباب رخصت ہو گیا اور لذت شباب سے مجھے کچھ بھی بہرہ حاصل نہیں ہوا۔ شباب خوش تھا مگر کاش دفترِ گناہ بیان نہیں ہوا ہوتا۔ میں نے شباب کے پیچھے آنسو رواں کیے اس امید پر کہ شاید شباب معاودت کرے مگر افسوس کہ اس نے عود نہ کیا اور بخدا میری ایک نہ سنی المختصر شباب کی رات بسر ہو گئی اور پیری کی صبح نمودار ہو گئی پس الوداع اے وصلِ یار میں نے انوارِ پیری میں اپنے ان عیوب کو معائنہ کر لیا جن پر شباب کی ظلمت چھائی ہوئی تھی۔ سبحان اللہ کیا خوب استعارہ شاعر نے اختیار کیا ہے۔

## وَلَهُ

أَيُّهَا الْغَائِبُ عَنِّي إِنِّي  
فَإِذَا هَبَّ نَسِيمٌ طَلَبْتُ  
عَلِمَ اللَّهُ لِمَشْتَقٍ إِلَيْكَ  
أَنَا ذَاكَ الْوَقْتَ سَلَّمْتُ عَلَيْكَ

یعنی اے دوست کہ تو غائب ہے مجھ سے خدا جانتا ہے کہ میں کس قدر تیرا مشتاق ہوں جب ہوائے عطر آگیاں بہتی ہے، تو میں اس وقت تجھے سلام سے یاد کرتا ہوں۔

## تمام ہوئی جلد اول

قطعہ تاریخ از نیجہ افکار جناب سید علی محسن صاحب بلگرامی شاگرد حضرت صیفر بلگرامی  
کامل شعرو سخن سید امداد امام  
جن کی تحقیق ہے دنیا میں من الشمس انظر  
ہے قیافہ و نجوم آٹھ پہر پیش نظر  
عالم علم ریاضی و تواریخ و سیر  
منطق و حکمت و اخلاق و ادب ہیں ازبر  
ہمیت و ہندسہ و طب و فلاحت پہ عبور  
صرف و نحو اور معانی و بیباں میں کامل  
فن تفسیر و حدیث و فقہ و علم کلام



ایک فن میں کوئی کامل ہو تو ہے قابلِ قدر  
دیکھو جس فن میں انھیں کامل و اکمل دیکھو  
کس لیاقت کی لکھی ہے یہ کتاب نایاب  
ہیں ہر اک ملک کے شاعر کے خیالات بہم  
ہے کہیں شاعری اہل عرب کی توضیح  
مختصر یہ ہے کہ ہے عطریہ مجموعے کا  
لہذا الحمد کہ چھپ کر ہوئی مطابوعِ جہاں  
جامعیت کا یہاں لطف ہے اے اہلِ نظر  
ڈھونڈو جس علم میں بہتر سے ملیں گے بہتر  
اس سے انکار ہے بے شبہ خطائے منکر  
امری القیس کہیں اور کہیں درجِ ہنر  
مصر و یونان کے شاعر کہیں پیشِ نظر  
بس گیا جس سے دماغِ ہنر و اہلِ ہنر  
شکر صد شکر کہ چھپ کر ہوئی منظورِ نظر  
فکر تاریخ جو کی بے سراغِ اہم سن  
دل پکارا کہ لکھو، گلبنِ بستانِ اثر

۱۲۱۰ھ



## بنی فاضلہ دینیہ کاشف الحقائق (حصہ دوم)

جس میں فارسی اور اردو کی شاعری کا بیان حوالہ مستلم ہوا ہے۔

### فارسی اور اردو شاعریاں واحد المذاق

چونکہ دونوں زبانوں کی شاعریوں کا ایک ہی انداز ہے اس لیے ان دونوں کا ذکر اجمالی طور پر کیا جاتا ہے حقیقت یہ ہے کہ اردو کی موجودہ شاعری فارسی کی شاعری کے ساتھ بڑی مشابہت رکھتی ہے۔ دونوں زبانوں کی شاعرانہ اصناف کے اعتبار سے برابر ہیں اور خیالات کا رنگ تمام تر ایک ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اردو کے شعرا فارسی کے شعرا کے ہمیشہ متبع رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ اردو کی شاعری باوجود اس کے کہ اس کو فروغ ہندوستان میں ہوا سنسکرت کی شاعری سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی۔ حالانکہ تقاضائے ملکی یہی تھا کہ اردو کی شاعری سنسکرت کی شاعری کا انداز پیدا کرتی۔ لاریب اگر اردو کے شعرا شعرائے سنسکرت کا متبع اختیار فرماتے تو اردو کی شاعری کا دائرہ وسیع ہو جاتا۔ ایسی حالت میں اردو کی شاعری ممتاز تر صورت پیدا کرتی۔ مگر اس عدم متبع کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اکثر اردو کے شعرا زبان سنسکرت سے واقفیت نہیں رکھتے تھے۔ اور چونکہ عموماً صرف فارسی میں مہارت رکھتے تھے شعرا فارسی کے ہوا انہیں اور کسی زبان کے شعرا کے متبع کا موقع حاصل نہ تھا۔ کاش شعرائے اردو شعرائے سنسکرت سے مطلع رہ کر ان کے متبع ہوتے تو اردو میں اصناف شاعری کا عدد بڑھ جاتا۔ مثلاً ڈراما نگاری اردو شاعری میں داخل ہو جاتی اور اس جدت سے اردو شاعری کا وزن یقیناً اہل یورپ کے نزدیک ترقی کر جاتا اور اس ترقی سے زبان اردو کا شمار اعلیٰ درجہ کی زبانوں کے ساتھ کیا جاتا۔ ڈراما نگاری کے داخل ہو جانے سے اردو کی شاعری بلاشبہ ممتاز تر ہو جاتی۔ ظاہر ہے کہ ڈراما نگاری فارسی میں نہیں ہے۔ اور اگر ہے تو ابھی ابتدائی حالت میں ہے پس اگر ڈراما نگاری اردو میں آجاتی تو فارسی کی شاعری کو اردو کی شاعری کے ساتھ



کوئی صورت مقابلہ کی نہیں رہتی۔ ڈراما نگاری کے علاوہ سنسکرت کی ایک بہت اعلیٰ درجہ کی رزمی شاعری دیکھی جاتی ہے۔ جن لوگوں نے رامائن اور مہا بھارت پڑھی ہیں راقم کے ساتھ اس امر میں ضرور اتفاق رائے فرمائیں گے کہ ان دونوں تصنیفوں کا جواب فارسی میں نہیں ہے عربی تو اس صنعت شاعری کے اعتبار سے خارج از بحث ہے۔ اس لیے کہ عربی میں جب قنوی بنگار، نہیں ہے تو ایسی مبسوط کتابوں کا موجود رہنا ہی خلاف توقع ہے۔ فارسی میں جو مشہور کتاب شاہنامہ ہے یہی تو اس کی شکل تاریخ نما ہے۔ خاص کسی واقعہ کا بیان رزمی شاعری کے پیرایہ میں نہیں کیا گیا ہے۔ علاوہ اس کے خود فردوسی کی شاعری بالملکی اور ویاس کی شاعریوں کو نہیں پہنچتی ہے۔ جیسا کہ آئندہ واضح ہوگا۔ بالمشہور اگر اردو کے شعرا نے سنسکرت کے شعراء کا تتبع فرمایا ہوتا تو اس وقت تک اردو کی شاعری نے بہت کچھ ممتاز صورت پیدا کی ہوتی۔ شاید ایسی حالت میں اردو کی شاعری کا جواب دنیا میں کم تر ملتا ہے۔ لاریب اردو کی شاعری فارسی کی شاعری پر من جمیع الوجود بہت غالب آجاتی۔ کس واسطے کہ فارسی کی شاعری سنسکرت کی شاعری کے برابر نہ رفیع ہے اور نہ وسیع ہے۔ بلا گفتگو سنسکرت کی وہ رفیع شاعری ہے کہ جس کی رفعت کو شعرائے عالم میں صرف شکسیر پہنچتا ہے۔ ہومروس درجل اور ملٹن بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔ بہر حال اردو کی موجودہ شاعری کی حالت یہ ہے کہ اگر میرانیس صاحب کو شعرائے اردو کے زمرہ سے نکال لیجیے تو اردو کی شاعری فارسی کی شاعری سے بہت پیچھے پڑ جاتی ہے۔ یہ صرف جناب غفران آب کا کمال ہے کہ جس کی بدولت اردو کی رزمی شاعری کا پایہ بلند نظر آتا ہے اور اس اعتبار سے اردو کی شاعری نہ صرف فارسی کی رزمی شاعری سے اعلیٰ دکھائی دیتی ہے بلکہ یونانی، لاطینی اور انگریزی شاعریوں سے بھی بہ اعتبار بالا رفیع پائی جاتی ہے۔ لاریب حضرت کی مرثیہ نگاری نے رزمی شاعری کا وہ عالم دکھلایا ہے کہ جس کے مشاہدہ سے عقل دنگ ہو جاتی ہے۔ گو حضرت نے کوئی کتاب رامائن مہا بھارت ایلید اینیڈ شاہنامہ یا پیریڈائز لاسٹ کے طور کی منظوم نہیں فرمائی ہے تو بھی رزمی شاعری کا خاتمہ کر دکھایا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ آپ کے رزمی شاعری کا جواب دنیا میں بالملکی اور ویاس کی تصنیفات کے سوا کہیں نہیں پایا جاتا۔ انشاء اللہ تعالیٰ میرانیس صاحب کی شاعری کی بحث آئندہ آئے گی جس سے حقیقت حال ظاہر ہوگی۔

براعظم ایشیاء کے ملکوں سے فارس بھی ایک نامی ملک ہے اس کے غرب میں ملک شام

اور شمال میں ملک قاف و بحر کیسپین اور مشرق میں افغانستان و بلوچستان اور جنوب میں بحیرہ فارس اور بحر عرب واقع ہیں۔ ہندوستان سے کچھ فارس کے اعتبار سے کوئی ملک ایشیا میں ممتول تر نہیں ہے۔ یہ ملک بارہ حصوں میں تقسیم ہے یعنی آذربائیجان، عراق عجم، لورستان، خورستان، فارس، لارستان، کرمان، گیلان، ازندران، استرآباد، قزوستان، خراسان اس کا رقبہ پانچ لاکھ میل کا ہے اور قریب دس کروڑ کے اس کے سکنا کا عدد ہے۔ کوہستان کی کثرت ہے۔ کوہ قاف کی شاخیں اس ملک میں بکھل آتی ہیں اور شمال کی جانب کوہ البرز بھی واقع ہے۔ یہ وہی پہاڑ ہے جس کا ذکر علاوہ قاف کے شعراء نے فارسی اکثر کرتے گئے ہیں۔ علاوہ کوہستان کے بڑے بڑے صحرا بھی ہیں جن کی زمینیں محض شور ہیں۔ کوہستان و صحرا و دست کی اراضی تمام ملک فارس کے تیسرے حصہ سے کم نہیں معلوم ہوتی ہے۔ خاص ملک فارس میں کوئی بڑا دریا انک یا گنگا کے انداز کا نہیں نظر آتا۔ گو چھوٹے دریا۔ ندی چشمے، جھیل کی کمی نہیں دکھائی دیتی ہے۔ اس لیے ملک کی شادابی میں کوئی فتور نہیں پڑتا۔ پروردہ جانور اس ملک کے وہی ہیں جو اراقالیم میں ہوا کرتے ہیں لیکن یہاں کے خجراونٹ اور گدھے بہت ممتاز صورت ہوتے ہیں۔ علاوہ ان کے بکریاں اس قدر عمدہ شہم پیدا کرتی ہیں کہ تبت کی بکریوں سے برابری کرتی ہیں۔ بحرانی جانور از قسم آہو وغیرہ کثیر الوجود ہیں اور درندوں سے قابل ذکر شیر، خرس، ببر، پلنگ یوز، گرگ، شغال، روبہ اور گفتار ہیں۔ پیداوار ملک میوہ جات کے اعتبار سے بہت اچھا ہے۔ انگور بکثرت ہوتا ہے اور چوں کہ توت کی کھیتی آسانی کے ساتھ ہوتی ہے۔ ریشم کے کیڑے بکثرت پروردہ کیے جاتے ہیں ریشم کی تجارت ایران میں بڑی فراغت کے ساتھ کی جاتی ہے بیشک کی کاشت بھی بعض حصوں میں حسب مراد ہوتی ہے اور ایفون کے پیدا کرنے کی نظر سے لالے کی کاشت بڑی مستعدی کے ساتھ کی جاتی ہے۔ ایران کی تجارت ایفون کی اسی لیے قابل اتدیا معلوم ہوتی ہے۔ پھولوں میں گلاب کی کاشت تجارت کی نظر سے بکثرت کی جاتی ہے جتنی کے ایران کے عطر گلاب کی شہرت ہند تک پہنچی ہوئی ہے۔ اہل عجم گلاب کو اپنی زبان میں گل کہتے ہیں۔ اور گلاب اس عرق کو کہتے ہیں جو اس سے تیار کیا جاتا ہے اردو کے شرابھی گلاب کو گل کہتے ہیں مگر عموماً زیادہ گلاب ہی بولا جاتا ہے۔ ایران کی معدنی پیداوار مختصر معلوم ہوتی ہے سنگی نمک کی کثرت دیکھی جاتی ہے قیمتی پتھروں کی بھی کانیں ہیں مگر فیروزہ جس قدر ملک ایران میں اچھا اور بڑا دستیاب ہوتا ہے کسی ملک میں نہیں ہوتا۔ دستکاری



کے اعتبار سے اہل ایران ایک ممتاز قوم ہیں یہاں عمدہ اقسام کے ریشمی اور ریشمی کپڑے خوب بنے جاتے ہیں۔ آلات حرب اچھے بنتے ہیں۔ شال دو شالے درمی قالین نفیس سے نفیس تیار ہوتے ہیں۔ ظروف چینی یہاں کے چین کے ظروف کا جواب دیتے ہیں۔ اس ملک کی تعلیم یا فنگی اہل پورپ کی تحریر کے رو سے تمام ایشیائی ملکوں کی تعلیم یا فنگی پر غلبہ رکھتی ہے۔ الازامہ حال میں جاپان کے جس نے ایک عرصہ قلیل میں ایک حیرت انگیز ترقی کا عالم دکھلایا ہے اہل ایران بالطبع خوش پسند خوش طبع اور خوش خلق ہوتے ہیں۔ درس تدریس سے شوق رکھتے ہیں۔ اور اقسام علوم کی طرف ان کی طبیعت میں ایک خلقی میلان پایا جاتا ہے۔ اس وقت کے اہل ایران کا مذہب دینی محمدی ہے اہل سنت اعتبار سے امامیہ مذہب والے زیادہ اس ملک میں پائے جاتے ہیں بلکہ شاہی مذہب اس ملک کا بزمان حال امامیہ ہے سلطنت شخصی انداز رکھتی تھی یعنی شاہ کو ہر امر میں اختیار کامل رہتا تھا۔ مگر حال میں پارلیمنٹ وغیرہ کی پابندی کا رنگ دکھلانی دیتا ہے واضح ہو کہ ملک ایران صد ہا صدیوں سے مشہور دیار و امصار رہا ہے۔ کیا نیوں کی سلطنت ایک وقت میں منہائے عروج کو پہنچی تھی پھر عہد دارا میں سکندر اعظم نے اس ملک کو فتح کیا پھر ساسانیوں نے اپنا سلسلہ حکومت قائم کیا۔ اس کے بعد اہل عرب نے اسے اپنا لیا پھر اس پر چنگیز اور تیمور حملہ آور ہو کر مالک ملک ہوتے گئے۔ ترکوں نے بھی اس کے مغربی حصہ پر یورشیں کر کے اس کی حالت بدل ڈالی۔ آخر کار ۱۷۵۰ء میں اسماعیل صفوی نے اپنی سلطنت قائم کی۔ خاندان صفوی ایک عرصہ تک حکمران رہا۔ مگر جب شاہان صفوی میں ضعف لاحق ہو گیا تو اٹھارہویں صدی عیسوی کی ابتدا میں افغانوں نے ملک ایران پر سخت حملہ کیا۔ اور بہت کشت خون کے بعد قابض ملک ہو گئے۔ اس ہنگامہ کا ذکر شیخ محمد علی حزمین اپنے سوانح عمری میں فرماتے ہیں۔ افغانوں کا قبضہ ایران پر بہت مختصر رہا۔ تنویر نے ہی عرصہ کے بعد نادر شاہ نے اپنے افغانوں سے خوب بدلہ لیا۔ نادر کے انتقال کے بعد ملک میں سخت خانہ جنگیاں شروع ہوئیں۔ آخر کار بہت رگڑے جھگڑے کے بعد آغا محمد خواجہ مرا بڑی بڑی حکمت عملیوں سے اس ملک پر مستولی ہو گیا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کا بھتیجا اس کا جانشین ہوا۔ یہ بھتیجا وہی نامی گرامی فتح علی شاہ تھا جس کے خاندان میں اس وقت ایران کی سلطنت ہے۔

اگر کسی قوم کو شاعری کی طرف میلان نہیں ہے تو اس کی نسبت یہ بات تمام تر صحت کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اس قوم کی فطری تقاضوں میں ضرور کسی نہ کسی قسم کا نقصان لاحق

ہے لاریب روح کو سچی خوشی بخشنے والی اور اسفل سے اعلا کی طرف لے جانے والی کوئی شاعری سے بڑھ کر نہیں ہے جتنی ممتاز قومیں دنیا میں گزری ہیں یا اس وقت موجود ہیں شاعری کے میلان سے خالی نہیں ہیں۔ ایسی صورت میں اہل ایران کا شاعری کی طرف جڑا میلان ہے کم ہی کوئی ایسا تعلیم یافتہ ایرانی ہوگا جو کچھ نہ کچھ کہہ نہ لیتا ہوگا۔ یا استادوں کے کلام سے لذت یاب نہ ہوتا ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ ملک ایران شاعری کا ملک ہے فطرت نے اسے ایسی خوبیاں بخشی ہیں کہ وہاں شاعروں کی کثرت خلاف فطرت نہیں سمجھی جاسکتی ہے یہی وجہ ہے کہ منظوم کتابیں زبان فارسی میں بے حساب ہیں۔ تذکروں میں معروف شعرا کے ناموں کے علاوہ غیر معروف شعراء کے اس قدر نام دیکھے جاتے ہیں کہ ان کا یاد رکھنا دشوار ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اہل ایران کو شاعری کی طرف میلان عظیم رہا ہے۔ ان کی مضمون نگاریاں بھی ایسی ہیں کہ علمائے اہل یورپ سمجھتے ہیں کہ ابھی تک ہم لوگوں کو مشرقی شاعریوں کی نازک خیالیوں سے کما حقہ آشنائی نہیں پیدا ہوتی ہے۔ اور خیالات کے ایسے ایسے میدان پڑے رہ گئے ہیں کہ جہاں ہم لوگوں کا ابھی گزر نہیں ہوا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ اصناف شاعری سے بعض ایسی ہی ہیں کہ ان کی ہوا بھی اہل یورپ نہیں لگی ہے مگر فارسی شاعری کے نقصانات بھی اُسی درجہ کے ہیں کہ ان کی اصلاح کی بڑی حاجت ہے۔ مثلاً اصناف شاعری سے ڈراما نگاری ہے۔ جو فارسی میں کبھی موجود نہ تھی۔ البتہ اس وقت کچھ حضرات اہل زبان سے اس صنف شاعری کی طرف توجہ شروع کی ہے اسی طرح منجملہ دیگر نقصانات کے فارسی شاعری پر کثرت مبالغہ پردازی کا الزام سخت نامد ہوتا ہے۔ مولف کی دانست میں مبالغہ پردازی راستی کی قوت اور لطافت کو زائل کرنے والی شے ہے۔ اس سے جس قدر شاعر اجتناب کرے نسب اور اولیٰ ہے۔ اسی مبالغہ پردازی کی بدولت بیشتر فارسی کی شاعری معیوب معلوم ہوتی ہے۔ سوائے سعدی اور حافظ کے کتر ایسے شعرا نظر آتے ہیں۔ کہ جن کی شاعری کثرت مبالغہ پردازی سے پاک ہے۔ ان دونوں شاعروں کے مقبول ہونے کی زیادہ وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اکثر ان کے مضامین عدم مبالغہ پردازی سے فطری رنگ رکھتے ہیں۔ علاوہ اس کے عموماً فارسی شاعری میں ایک جڑا نقصان یہ پایا جاتا ہے کہ فطری خوبیوں سے بیشتر معرا ہے۔ فارسی کے اکثر شعراء یہ جانتے ہی نہیں کہ نیچرل بیانات کیا کیا دل آویز تاثرات پیدا کرتے ہیں۔ مولف کی دانست میں کوئی ثنوی زبان فارسی میں ایسی نہیں کہ سردالطراکات کی لیڈ آف دی لیک کی دلکش فطرت نگاری کا جواب دے سکے نظم تو نظم فارسی کی شروں کی



بھی وہی حالت دیکھی جاتی ہے مثلاً نثر ظہوری کہ ایک مشہور کتاب ہے اور اس کی نثر بہت تعجب  
 خیز سمجھی جاتی ہے مگر حقیقت حال یہ ہے کہ با مذاق تعلیم یافتہ آدمی کے لیے ایک ایک جملہ اس کا  
 سوہان روح مقصور ہے۔ بالاختصار یہ بات نہایت صحت کے ساتھ حوالہ قلم کی جاسکتی ہے کہ اہل ایران  
 شاعری کی طرف ایک میلان عظیم رکھتے ہیں اور ان کی شاعریاں قابل توجہ بھی ہیں۔ مگر ان کی  
 شاعری کا مذاق مختلف پہلوؤں کو ملحوظ رکھ کر بہت کچھ اصلاح طلب ہے۔ اگر حضرات اہل زبان  
 اس امر کی طرف کوشاں ہوں تو اس توجہ فرمائی سے نہ صرف فارسی کی شاعری ترقی کر جائے گی  
 بلکہ قومی معاملات اخلاق و تمدن میں حسبِ مراد انقلابات ظہور میں آئیں گے۔

### ملک ہندوستان کا بیان

براعظم ایشیا کے ملکوں سے ہندوستان بھی ایک ملک ہے۔ مگر یہ ایسا ملک ہے کہ خود بر اعظم  
 کا حکم رکھتا ہے۔ آب و ہوا فصل موسم جبال بحور دشت صحرا جنگل آبادی قوم علم فضل پیشہ  
 حرفہ تجارت زراعت صنایع تمدن نباتات حیوانات معدنیات وغیرہ وغیرہ کے اعتبار سے  
 یہ ملک تمام دنیا کا خلاصہ کہے جانے کا استحقاق رکھتا ہے۔ تمام دنیا کی بوقلمونیاں اس کے  
 احاطہ کے اندر پائی جاتی ہیں۔ اگر ہر مد کی تفصیل کی جائے تو راقم کی عمر اس کی تحریر کو اکٹفا  
 نہیں کر سکتی۔ بہر حال جاننا چاہئے کہ ہندوستان جو برٹش انڈیا کہلاتا ہے اس میں چند ملک و  
 جزائر وغیرہ بھی شامل ہیں۔ مگر ہندوستان خاص کے حدود اربعہ اس طرح پر قرار دئے جاسکتے  
 ہیں کہ اس کے مغرب میں ملک کابل بلوچستان اور بحر عرب اور شمال میں کوہ ہمالیہ اور شرق میں  
 ملک برما اور جنوب میں خلیج بنگالہ اور بحر ہند واقع ہیں۔ ملک ہندوستان جزیرہ نما ہے۔ اس  
 کے دو جانب میں سمندر پایا جاتا ہے اس ملک وسیع کا طول شمالاً و جنوباً دو ہزار میل ہے۔  
 اور عرض شرقاً و غرباً اٹھارہ سو میل۔ مربع اس کا چودہ لاکھ میل یعنی ملک فارس سے نو لاکھ میل  
 زیادہ ہے۔ انتظام سلطنت کے خیال سے یہ ملک تین پریسیڈنسیوں میں تقسیم ہوا ہے۔ یعنی  
 پریسیڈنسی بمبئی و پریسیڈنسی مدراس و پریسیڈنسی بنگال۔ پریسیڈنسی سے مراد احاطہ ہے  
 علاوہ ان پریسیڈنسیوں کے کچھ صوبے ہیں جو چیف کمشنروں کے زیر حکومت رہتے ہیں علاوہ ان  
 پریسیڈنسیوں اور چیف کمشنروں کے جو حصہ ہائے ملک باقی رہ جاتے ہیں ان میں خود مختار  
 راجگان و نوابان زیر نگرانی سرکار انگلشیہ بھی تہہ حکمران ہیں۔ اس ملک وسیع میں سیکڑوں

زبانیں بولی جاتی ہیں معروف زبانوں سے بنگلہ، اوریا، پنجابی، گجراتی، سندھی، مرہٹی، ماڑواڑی،  
 تملنگائی وغیرہ وغیرہ ہیں مگر ہندوستان کے زیادہ حصوں میں اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے ہندوستان  
 میں اردو زبان فرانس کا حکم رکھتی ہے جو یورپ کے اکثر ملکوں میں ذریعہ ہم کلامی ہوا کرتی ہے۔ اردو  
 زبان کی حقیقت آئندہ عرض ہوگی مگر یہاں پر اس امر کا ذکر کر دینا ضرور ہے کہ ہر چند یہ زبان  
 ہندوستان کے اکثر حصوں میں بولی جاتی ہے مگر اس کے صحیح بولے جانے کی نسبت صرف دہلی اور  
 لکھنؤ کی طرف کی جاتی ہے۔ جاننا چاہئے کہ دہلی پریسیدنسی میں بنگال واقع ہے اور لکھنؤ اودھ  
 کی چیف کمشنری کا صدر تھا۔ اور اب اضلاع متحدہ میں داخل ہے۔ پریسیدنسی بنگال تین حصہ  
 میں منقسم ہے۔ ہر حصہ ایک لفٹنٹ گورنر کے زیر حکومت رہتا ہے۔ پہلے حصہ کو لفٹنٹ بنگال دوسرے  
 کو لفٹنٹ اضلاع متحدہ اور تیسرے کو لفٹنٹ پنجاب کہتے ہیں۔ دہلی لفٹنٹ پنجاب میں واقع ہے ان  
 دونوں شہروں کے علاوہ اور جگہوں کے اردو بولنے والے اہل زبان کہے جانے کا حق نہیں  
 رکھتے۔ مثلاً ساکنین صوبہ بہار کہ ہر چند زبان اردو ہی بولتے اور رکھتے ہیں مگر اہل زبان ان کی  
 زبان کو کسی طرح سند نہیں مانتے حقیقت حال بھی یہی ہے کہ ہم بہاریوں کی زبان اہل لکھنؤ  
 یا اہل دہلی کو پسند نہیں ہو سکتی۔ ہم لوگوں کا بڑا کمال یہی ہے کہ زبان دان کہلائیں۔ اہل زبان ہونا  
 تو تمام تر خراج از امکان ہے۔ واضح ہو کہ عموماً شرفائے بہار کی اردو یہی ہے کہ جس میں فقیر  
 یہ کتاب لکھ رہا ہے۔ مگر ہمارے وہ اہل وطن جو حضرات اہل زبان کے فیضان صحبت سے مدت  
 مدید تک بہرہ مند رہے ہیں وہ البتہ راقم کی زبان سے کوئی علاحدہ زبان بولتے اور رکھتے ہیں۔  
 بہر حال جاننا چاہئے کہ صرف لکھنؤ اور دہلی ہی میں سندھی اردو بولی جاتی ہے اور انہیں دونوں  
 شہروں میں اردو کے وہ بڑے بڑے شعرا گزرے ہیں کہ جن کا نام نہایت فخر و امتیاز کے ساتھ  
 لیے جاتے ہیں۔ واضح ہو کہ علاوہ اردو کے اور جتنی زبانیں ہندوستان میں مروج ہیں ان کو اس  
 حمدی میں بڑی ترقی نصیب ہوتی گئی ہے۔ چنانچہ بنگلہ زبان کو وہ اوج نصیب ہوا ہے کہ اب  
 یہ زبان جو سو برس پہلے کچھ نہ تھی دنیا کی ممتاز زبانوں میں شمار کی جانے لگی ہے۔ آلاں کوئی علم  
 یورپ کا نہیں ہے کہ اس زبان میں کم و بیش طور پر منتقل نہیں ہوا ہے۔ شاعری اور ناول نگاری  
 نے تو بہت ترقی پائی ہے۔ ترقی کے اعتبار سے اردو نے زبان بنگلہ کے مقابل میں گویا کچھ  
 بھی ترقی نہیں کی ہے۔ اردو نے ابھی تک جو کچھ ترقی کی ہے وہ اسی قدر ہے جتنا فارسی کے  
 متبع ہونے سے حاصل کر سکی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یورپین علوم سے خاتم کرن شاعری کے



لگاؤ میں ترقی اردو کے لیے گویا کچھ بھی مدد نہیں لی گئی ہے۔ برخلاف اس کے اہل بنگالہ نہ صرف سنسکرت سے اقتباس مضامین کرتے گئے ہیں بلکہ یورپین شعرا کے تمتع سے دائرہ شاعری کو وسیع کر ڈالا ہے۔ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ ہندوستان کی مروج زبانوں میں صرف اردو ہی ایک ایسی جامد زبان ہے کہ جس کی شاعری نے سنسکرت اور انگریزی سے کوئی صورت استفادہ کی پیدا نہیں کی ہے۔ درنہ تہی اور زبانیں ہیں سب کی سب ان دونوں زبانوں سے مستفید نظر آتی ہیں جیسا کہ ان کی شاعریوں کا رنگ قول راقم کی صحت پر گواہی دیتا ہے۔

### ہندوستان بعہد حکومت انگلشیہ

واضح ہو کہ ملک ہندوستان پر اوقات مختلفہ میں بیرونی اولوالعزم قومی کے بعد گیرے حکمران ہوتی آئی ہیں اور جب ایک قوم کی سلطنت ضعیف ہوتی گئی ہے تب دوسری قوم زور آور اور اس پر قابض اور مالک ہو جاتی ہے۔ ہنود کے مختلف اقوام جو اس وقت ہندوستان میں موجود ہیں ان کے بزرگ بھی مسلمانوں کی طرح اس ملک کے فاتح تھے اور ان کی اولاد اور احفاد نے یہاں بود و باش اختیار کر کے صد ہا سال ہندوستان کے مختلف حصوں میں سلطنت رانی کی ہے بہت سے شاہان ہنود کے نام مثلاً، راجا دشرتھ، مہاراجہ رام چندر، راجہ چندر گپت، راجہ کبرماجیت، راجہ پتھورا وغیرہ وغیرہ السنہ خلافتی پر جاری ہیں اور ان کی علوم پروری اور عدل گستری کے حالات کتب تواریخ میں موجود ہیں بہر حال جب ہندوؤں کی سلطنتوں میں ضعف آیا تو مسلمان ان پر غالب آئے اور چند ممدیاں اس ملک میں حکمران رہے مسلمانوں میں ہنود کی طرح چند قومیں یکے بعد دیگرے فرماں روائے ملک ہندوستان ہوتی گئیں۔ آخر میں خاندان تیمور کو عروج ہوا۔ اور اسی خاندان کے ساتھ اس ملک کی سلطنت اسلامیہ بھی معدوم ہو گئی۔ بلاشبہ دولت تیموریہ ہندوستان میں مسلمانوں کی بڑی ثروت سے خبر دیتی ہے: مسلمان شاہان ہند میں کسی کو وہ ترقی نصیب نہیں ہوئی۔ جو دولت تیموریہ نے حاصل کی۔ اکبر کے وقت میں سلطنت اسلامیہ کو آئینی استحکام نصیب ہوا۔ اور جہانگیر کا زمانہ اکبر کے حسن جہان بینی کا نتیجہ معقول تھا۔ شاہ جہاں کی خوبیوں نے سلطنت کو رونق بخشی، اورنگ زیب کی حوصلہ مندی نے اسے بہت وسیع کر دیا۔ مگر اس بادشاہ کی غیر مدبرانہ کاروائیوں سے ہندو رعایا دل شکستہ ہو گئی۔ چنانچہ اورنگ زیب کے مرتے ہی سلطنت

میں زوال بھی شروع ہو گیا۔ آخر کار یہ کیفیت ہو گئی کہ ہندو اقوام نے دہلی کو بھی لے لیا۔ اور بادشاہان دہلی کو محض بے اختیار و بے کار بنا ڈالا۔ دولت تیموریہ کے زوال سے ہندوؤں کا ایسا زور ہو گیا تھا کہ اگر احمد ابدالی ہندوستان پر حملہ آور نہ ہوتا تو پھر ہندوؤں کی عمل داری ہو جاتی۔ اس قوی حملہ آور نے مرہٹوں کو ایسی شکست دی کہ مرہٹے نہایت ضعیف ہو گئے۔ اس پر بھی شاہان دہلی کی مزاج پرسی کے واسطے کافی تھے۔ اگر حکام انگلشیہ شاہان دہلی کی حفاظت نہ کرتے رہتے تو مرہٹے کبکے دہلی کو غارت کر چکے تھے۔ بالخصوص جب عنان سلطنت ہندوستان کی حکام انگلشیہ کو منتقل ہوئی اس وقت ہندو کی چند قومیں اس ملک میں برسرِ غلبہ تھیں۔ اسی باعث ایک مورخ انگریزی نے لکھا ہے کہ ہم لوگوں نے یعنی انگریزوں نے ہندوستان کی سلطنت ہندوؤں سے نہ کہ مسلمانوں سے پائی ہے۔ یہ قول بدانت مولف پورا صحیح تو نہیں ہے مگر اس میں شک نہیں کہ سلطنت تیموریہ مکرے مکرے ہو گئی تھی اور ہر مسلمان صوبہ دار بادشاہ بن بیٹھا تھا اور بہت سے اعضائے سلطنت اولوالعزم اقوام ہندو کے ہاتھ آ گئے تھے۔ اور اسی وجہ سے ہندو زور آور ہو رہے تھے۔ ایسا قیاس ہوتا ہے کہ اگر حکام انگلشیہ سلطنت ہندوستان کی طرف التفات نہ فرماتے تو آخر کار ہندو ہی فرمان روا تے ہندوستان ہو جاتے۔ ملک ہندوستان ہو کر کس طور پر سلطنت کرتے۔ یہ خدا کو معلوم لیکن اگر وہی مرہٹیا طور قائم رہتا تو رنایا تے ہند کو غافیت کا نصیب ہونا ایک امر محال تھا۔ خدائے تعالیٰ نہایت رحیم ہے کسی حالت میں اپنے بندے کو بے معیال و مددگار نہیں چھوڑ دیتا ہے چنانچہ جب ملکی قوموں میں جہان بانی کی صلاحت معقولہ پائی تو دور دراز ملک سے ایک ایسی قوم کو عدم پروری اور داد گستری کے واسطے معین کیا جس نے ہر جہاں داری کو آسانی کے ساتھ اٹھالیا۔ اور فرض منصبی کی بجا آوری میں کوئی کوشش دریغ نہیں رکھی۔ یہاں تک کہ از گنگ تا سبگ تمام ہندوستان مرآت امن و امان بن گیا۔ جان و مال و آبرو کے استحقاق کی شکل پھیرا ہوئی۔ ارباب واقفیت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ اورنگ زیب کے مرتے ہی ان کے بیٹوں کی خانہ جنگیوں سے سلطنت مغلیہ کا زور جاتا رہا اور جس وقت محمد شاہ کے زمانہ میں نادر نے حملہ کیا۔ اس وقت یہ سلطنت ضعیف ہو چکی تھی اس حملہ سے جو کچھ سلطنت کی وجاہت باقی رہی تھی وہ بھی جاتی رہی۔ اس حملہ کے بعد ہندوستان میں طوائف الملوکی کی صورت نظر آنے لگی یعنی صوبہ داران اودھ و بنگالہ وغیرہ خود مختار بن بیٹھے سکھوں نے پنجاب پر قبضہ کر لیا۔ جاٹوں نے دہلی اور اطراف دہلی میں ہنگامے مچائے۔



مرہٹوں نے ہندوستان کے ایک جزو اعظم کو زیر حکومت کر لیا۔ اسی طرح بہت سے سرداروں و قلعہ داروں نے جس کو جس طرح موقع ملا، اپنے کو خود سر کر ڈالا۔ اس طوائف الملوک کے زمانہ میں ہندوستان کو امن و امان سے کچھ علاقہ نہ تھا۔ صوبے داروں کے آپس کے خونریز جھگڑے جاٹوں کی یورشیں سکھوں کی طغیانیاں، روہیلوں کی فساد انگیزیان ہاجاؤں کی سرکشیاں، نوابوں کی بے عنوانیاں، فرانسیسیوں کی دست اندازیاں تمام ہی ہندوستان میں قیامت مچاتے ہوئے تھے۔ کیسی سیاست کیسا انتظام ہر کسی کے جان پر آہنی پٹی نہ داری کا کوئی طریقہ باقی رہا تھا نہ فریاد سے کچھ کام نکلتا تھا۔ جس سے جو بن آتی تھی کر گزرتا تھا۔ شہروں میں ایسے ایسے ڈاکو رہتے تھے جو دن دوپہر دولت مند اشخاص کے مکانات میں گھس کر جس کو پاتے تھے تہ تیغ کر دیتے تھے، قصبہ قصبہ گاؤں گاؤں مفسدان سرکش عافیت خلافت میں رخنہ ڈالے ہوئے تھے، مشاہر اہوں پر راہ زنوں کا پورا قبضہ تھا۔ جنگل اور ویرانے ٹھکیوں کے دم سے آباد تھے دریاؤں کو دریائی ڈاکوؤں نے سراسر پرخطر بنا رکھا تھا۔ پہاڑوں میں کوہی اقوام خرس و کفتار کو بھی خون خواری میں شرمندہ کیے ہوئے تھے، کیسا تھا نہ کیسی فوجداری کیسی نالش، کیسی فریاد نہ زمین پر پناہ نہ پانی پر امن، آئین و قانون کا کیا ذکر، زیر دست کا جوتا سر پر اور جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا مضمون پیش نظر تھا۔ اس وقت کے اہل حکومت بھی کچھ ڈاکو اور قزاقوں سے کم نہ تھے۔ اگر کسی رعیت کے پاس دولت پاتے حسب خواہش اپنے گھراٹھا لاتے، عورتوں کی عزت بھی خدا ہی کے ہاتھ میں تھی۔ اہل قدرت کے لیے جو روؤں کو شوہر سے یا بیٹیوں کو باپ سے چھین لینا کوئی تردد طلب امر نہ تھا۔ اس وقت میں بہت سے گیت سنے جاتے ہیں جو اس وقت کے جباروں کے ظالمانہ فعل سے خبر دیتے ہیں۔ پس ایسے زمانہ میں کہ اہل حکومت ہی اس وضع کی بد اخلاقی میں مبتلا تھے، راہ زنوں و بد معاشوں کا کیا ذکر ہے مختصر یہ ہے کہ ملک ہندوستان اس طور پر دارالفساد ہو رہا تھا کہ اس کی اصلاح ویسی منتظران سے ممکن نہ تھی، لیکن رحمت نامہ الہی اپنے کردار بندوں کو کب اس طرح پر گرفتار آلام پریشانی رکھنا قبول کر سکتی تھی۔ اس واسطے اس ملک وسیع کو ایک ایسی قوم کو سپرد کر دیا جو پورے طور پر داد جہان بانی دینے لگی۔ قوم انگلشیہ کے ہندوستان میں آنے کی سرگذشت یہ ہے کہ عہد ملکہ الیزبتھ میں جو انگلستان کی فرماں روا اور سلطان جہانگیر ابن اکبر شاہ کی ہم عصر تھیں، ایک کمپنی اس غرض سے قائم ہوئی کہ درمیان انگلستان



اور ہندوستان کے سلسلہ تجارت جاری کرے یہ مجمع تجارتی ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے قائم ہوا اور اجازت تجارت دربار ملکہ ممدوحہ سے اس کمپنی کو سنہ ۱۶۰۰ء میں ملی۔ ایک سفیر بھی سرطامس رونامی شاہ انگلستان کی طرف سے دربار جہانگیر میں بھیجا گیا مختصر یہ کہ کمپنی مذکور پہلے تو تجارتی کاروبار کو نہایت شعور مندی کے ساتھ ایک عرصہ تک انجام کرتی رہی اور جب ویسی فرماں رواؤں میں سلطنت کی صلاحیت باقی نہیں رہی، تب بار حکومت کو اپنے کاندھے پر لے لیا، سنہ ۱۶۵۷ء تک کمپنی بہ نیابت شاہ انگلستان فرماں روائے ممالک ہندوستان رہی۔ بعد بغاوت کے سنہ ۱۶۵۷ء میں حضرت علیا ملکہ وکٹوریا آنجہانی نے سلطنت ہندوستان کو زیر حکومت خاص فرمایا اور اس وقت سے اس وقت تک اسی طور پر یہ ملک زیر انتظام شاہی ہے ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ حکومت میں گورنر جنرل کو صرف کورٹ آف ڈائریکٹرز کی ماتحتی تھی، اس افسر اعلا کو ہر طرح کا اختیار حاصل تھا اور کسی قسم کی جوابدہی کا تعلق سلطنت انگلشیہ سے یہ عہدہ دار نہ رکھتا تھا۔ البتہ ڈائریکٹران کو اپنی کارروائی کی جواب دہی یا شرکاء کمپنی کو یا بذریعہ بورڈ آف کنٹرول کے شاہ انگلستان اور پارلیمنٹ انگلشیہ کو بھی، لیکن جب سنہ ۱۸۵۷ء میں حضرت علیا ملکہ معظمہ نے ممالک ہندوستان کو کمپنی کی حکومت سے منزع فرمایا تب سے لقب گورنر جنرل کے ساتھ خطاب و امیرائے یعنی نائب سلطان کا بھی ضم کیا گیا۔ بہر حال طوائف الملوکی کے زمانہ کے بعد جب رفتہ رفتہ صوبجات ہندوستان احاطہ حکومت انگلشیہ میں داخل ہوتے گئے تو ہر طرح کی برائیاں بھی دور ہوتی گئیں، حفظ و امان خلأق کے لیے قوانین ایسے نفاذ پائے جن سے جان و مال و آبرو سب کی حفاظت کی شکل پیدا ہوئی۔ والیان ملک کے باخود ہاجدال و قتال کا انسداد پورا کیا گیا۔ ڈاکو راہ زن قزاق دزدان بری و بحری سب نیست و نابود ہو گئے غریب و امیر سب کو امن نصیب ہوا۔ مظلوموں کی داد رسی کے قواعد مقرر کیے گئے زمینداران و رعایا کے حقوق کی نگہداشت کے واسطے فائدے اجر پائے تجارت اور مہاجنی کے کاروبار کے لیے آئین نفاذ پائے مختلف اقسام کے دعاوی کے ارجاع کے لیے مختلف محکمت قائم ہوتے گئے، نابالغوں کے استحفاظ جان و مال کے واسطے قانونی انتظامات عمل میں آئے کاشتکاری کی ترقی کی طرف توجہ شاہی جو مبذول ہوئی تو ہزار ہا بیگہ اراضی جو جھاڑ جنگل سے بھری ہوئی تھیں کاشتکاری کے اغراض کے لیے آباد کی گئیں۔ سیرابی زراعت کے لیے ایسے سامان



فرہم کیے گئے کہ ہزاروں بیگہ افتادہ اراضی حسب مراد زرخیز ہو گئیں۔ نئے نئے اقسام کے غلے اور اٹمار کی کاشت ہندوستان میں مروج کی گئی۔ صدمندی نالوں میں پل تیار کیے گئے، نئی نئی مٹرکیں اور راہیں نکالی گئیں۔ مسافروں کے واسطے سراؤں کا انتظام ہو گیا۔ کثرت سے تالاب و چاہ کی تعمیر ہوتی گئی۔ اقسام و اک کے سامان ظہور میں آئے۔ مریضوں کے واسطے شفاخانے تیار کیے گئے۔ شہروں اور قریوں کی صفائی میں کدو کو شمش کو راہ دی گئی۔ نامطبوع رسوم کے اندر اس کا سامان کیا گیا چنانچہ سستی اور بردہ فروشی کا نام تک باقی نہ رہا قحط اور وبائی عافوں کے دفع کرنے کے اسباب ہتیا کیے گئے، سیر و سفر کے واسطے عمدہ ٹکلیں پیدا کی گئیں مراسلات اور جلد خبر رسانی کے طریقے ایجاد پائے۔ ممتاز مقامات میں آب مصفا کے بہم پہنچانے کیلئے کارخانے قائم کیے گئے تفریح طبع خلایق کے لیے نادرنادر تفرج گاہیں آراستہ کی گئیں اور اسی طرح عیش و آرام کے بے انتہا سامان بہم پہنچائے گئے اور سب سے بڑا کام سرکار انگلشیہ کے عہد میں یہ ہوا کہ علوم یورپ کی اشاعت اس وسعت کے ساتھ تمامی ہندوستان میں کی گئی کہ ہزار ہا رعایا نے سرکاری اعلا درجے کی تعلیم یافتہ ہو کر اپنے خانگی اور ملکی حقوق کو خوب سمجھنے لگی اور اپنی مالی اور ملکی خرابیوں کی اصلاح میں کوشاں ہونے لگی یہ اسی اعلا درجہ کی تعلیم یافتگی کا نتیجہ ہے جو ہندوستان کے اقوام مختلفہ میں مرابطت اور یک جہتی کی صورت پیدا ہو جاتی ہے اہل بنگالہ و اہل مدراس و اہل بمبئی میں موانست و یک دلی کا سلسلہ قائم ہوتا جاتا ہے اور سمجھوں کو ملک کی بہتری و بہبودی کا خیال مرکوز خاطر ہو رہا ہے تعلیم یافتہ سکناے ہندوستان طرح طرح کی تمدنی کمیٹیاں اور جلسے منعقد کرتے جاتے ہیں۔ اخباروں کے ذریعے سے بڑے بڑے مدبرانہ کام لیے جارہے ہیں معقول تصنیفات سے ہندوستان کی مختلف زبانیں ترقی کرتی جاتی ہیں اور اجرائے شاہی زبان کی بدولت تمام ممالک ہندوستان میں ہم خیالی زور پکڑتی جاتی ہے مختصر یہ ہے کہ اشاعت علوم یورپ نے ہندوستان کو ترقی کی ایسی راہ دکھلائی ہے کہ یوٹا فیوٹا اس کی تمدنی خوبیاں بڑھتی ہی نظر آتی ہیں۔ اس وقت تک جو کچھ ترقیاں اس ملک کو مراحم خسروانی کی بدولت نصیب ہو چکی ہیں وہ کم حیرت انگیز نہیں ہیں۔

## فارسی کی نظم و نثر کے تاریخی حالات

فارسی کی نظم کی ابتدا کی نسبت بعض کا قول ہے کہ پانچویں صدی مسیحی میں بہرام گور نے



وزن اور قافیہ کو ایجاد کیا مگر بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ ابوالمفضل سمرقندی نظم کا موجد گزرا ہے۔ بہر حال یہ بات ضرور ہے کہ آخر شاہان ساسانی کو فارسی کی انشاء کی طرف میلان تھا لیکن جب ملک فارس پر قوم عرب کا قبضہ ہو گیا تو کچھ عرصہ تک اہل فارس کا یہ میلان دبا رہا آخر کار جب سلطنت خلفائے عباسیہ کو ضعف لاحق ہوا اور فارس نے رفتہ رفتہ سمرقند سے قومی آزادی حاصل کر لی تب پھر اہل فارس قومی لطیفہ کی ترقی کی طرف توجہ کرنے لگے، خراسان میں اس کی ترقی کا سلسلہ قائم ہوا۔ مردین ایک شخص مسمیٰ بہ عباس نے ۹۳۳ھ صلعم مطابق ۸۰۹ء میں نظم نگاری شروع کی۔ اس کے بعد خلیفہ مامون ابن ہارون رشید کی تعریف میں محمد عوفی نے اشعار لکھے پھر حنظلہ حکیم فیروز اور ابو سالک نے رباعی غزل اور قصائد لکھے اس کے بعد ابوشکور لمخی ثمنوی کا موجد ہوا۔ یہ صنف شاعری اہل عرب میں نہ تھی، اس کے ایجاد سے فارسی شاعری کو ادائے خیالات مسلسل کا ایک بڑا میدان ہوتا آیا جس کے سبب سے شاہنامہ وغیرہ کیسی مبسوط کتابیں فارسی میں لکھی جاسکیں۔ امیر نصیر دوم کے عہد میں از ۹۱۳ھ تا ۹۲۲ھ مطابق از ۸۹۷ھ تا ۹۰۶ھ صلعم سلطنت ایران کو استحکام حاصل ہوا اس عہد کے نامی شعراء عباس بنخارائی، ابوالمظفر، نفریشا پوری، ابو عبد اللہ، محمد جنیدی معنوی، خسروانی، ابوالحسن، شاہد لمخی، اور رودکی تھے اول اول حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق جس شاعر نے اپنی غزلوں کو مدون کیا، ابوالحسن شاہد لمخی تھا۔ رودکی کی روش کلام حکیم خباز نے اختیار کی پھر ابو شعیب ہراتی، رونقی بنخارائی، ابوالفتح بسطی، امیر ابوالحسن علی النخاس، عمر مروی اور کسائی اسی دسویں صدی مسیحی میں شعرائے نام آور ہوتے گئے اسی خاندان ساسانی کے نوح دوم کے عہد میں دقیقی نے بھی شاعری کی شہرت پیدا کی، اس کے بعد خاندان بسکنگین کو عروج ہوا۔ محمود غزنوی کے عہد میں فردوسی نے کتاب شاہنامہ لکھی ۱۰۱۰ھ میں یہ اختتام کو پہنچی فردوسی کے ہمعصر شعراء عنقری، عسجدی تھے ہر چند یہ سب بڑے درجہ کے شاعر تھے مگر فردوسی کی طباعی کے سامنے دربار محمود میں پھیکے پڑ گئے، شاہنامہ کی تصنیف سے ہر شاعر کے دل میں رزمی شاعری کا جوش پیدا ہوا۔ شعراء عام طور پر فردوسی کا تتبع کرنے لگے، بلکہ کوششیں ہونے لگیں کہ فردوسی پر بھی سبقت لے جائے۔ علی بن احمد الاسدی نے گرشاپ نامہ لکھا پھر سام نامہ جہانگیر نامہ، فرامرز نامہ، برزدا نامہ، شہریار نامہ وغیرہ تصنیف ہوتے گئے۔ ان سب کتابوں میں شاہنامہ کی طرح کے مضامین منظوم ہیں اور یہ مضامین تمام تر ایران قدیم کے قصص و



حکایات پر مشتمل ہیں جب ایران کے خیالی معاملات لکھتے لکھتے شعرائے فارس تھک گئے تب یونانی حالات تاریخی و غیر تاریخی کی طرف متوجہ ہوئے اکثر شعراء نے سکندر کے حالات منظوم کیے۔ اسی لیے فارسی میں بہت سے سکندر نامے دیکھے جاتے ہیں، ان سکندر ناموں میں سب سے ممتاز تصنیف نظامی کا سکندر نامہ ہے۔ یہ کتاب ۱۲۲۰ء مطابق ۵۹۹ھ ص ۳۷۹ میں اختتام کو پہنچی، جب سکندر کی حالات نگاری کا خاتمہ کر چکے تب شعراء نے رزمی شاعری کے دھارے کو فن سیر کی طرف پھیرا۔ حسن شستری نے انبیا نامہ لکھا ابن ہشام نے خاور نامہ میں امیر المومنین علیہ السلام کے معاملات جنگ حوالہ قلم کیے باذل نے حلیہ حیدری تصنیف کیا اور کاظم نے فرخ نامہ جب حالات سیر منظوم ہونے سے باقی نہ رہے تب شاہان وقت کے حالات منظوم کیے جانے لگے، بالتصنی نے تیمور نامہ لکھا، قاسمی نے شاہ اسمعیل اور شاہ طہاسپ کے وقائع منظوم کیے، کمال سبزداری نے شاہ عباس اعظم کا شاہنامہ تصنیف کیا اور عسقری نے شاہنامہ نادری، اسی طرح فتح علی شاہ قاجار میں شہنشاہ نامہ لکھا گیا۔ ہندوستان میں بھی شاہنامہ کے رنگ کی چند تصنیفیں ظہور میں آتی گئیں، عہد ہمایوں میں یعنی درمیان ۱۵۲۰ء و ۱۵۵۶ء کے اس قسم کی شاعری نے اس ملک میں رواج پکڑا اس کے بعد ہر عہد میں کچھ نہ کچھ اس رنگ کی کتابیں لکھی گئیں۔ چنانچہ عہد شاہ جہاں میں قدسی نے ظفر نامہ شاہ جہانی اور طالب کلیم شاہنشاہ نامہ لکھے گئے۔ بیجا پور میں آتشی نے عادل نامہ لکھا عہد عادل شاہ کی ابتدا ۱۶۲۹ء سے پھر ایک منظوم تاریخ موسوم بہ توارخ قلی قطب شاہ لکھی گئی۔ یہاں تک کہ آخر کار ۱۸۴۷ء میں غلام حسن نے فتح نامہ طیبوسلطان لکھا۔

واضح ہو کہ فردوسی کی رزمی شاعری نے نہ صرف اہل ایران کو اس رنگ کی شاعری کے برتنے کی راہ بتلائی۔ بلکہ بزمی شاعری کی طرف بھی شعراء کے دلوں میں میلان پیدا کر دیا۔ کتاب شاہنامہ ایسی مبسوط کتاب ہے کہ اس میں بزمی شاعری کے تخم بہ کثرت موجود ہیں۔ چنانچہ فردوسی کے بعد عاق بنجاری، جامی، موجی، قاسم خان ناظم ہروی، شوکت حام شیرازی بزمی ثنویاں حضرت یوسف اور زلیخا کے حالات میں لکھے گئے۔ یہ سب تصنیفات یوسف و زلیخا نام کہتی ہیں۔ جاننا چاہئے کہ اس کے علاوہ وہ یوسف زلیخا ہے جو فردوسی کی تصانیف سے ہے۔ بہر حال ان شعراء کے علاوہ فصیحی، جرجانی، میری، نامی وغیرہ نے اپنے زمانے میں دامتق و عذرا کے عشق کی کہانیاں شکل ثنوی منظوم کیں۔ المختصر ہر قسم کی ثنوی نگاری کے مذاق کے

پیدا ہونے کے باعث فردوسی کا شاہنامہ ہوا ہے اور حقیقت حال یہ ہے کہ صرف عاشقانہ  
 مثنویوں کے مروج ہونے کی صورت فردوسی کی شاعری نہیں ہوتی ہے بلکہ اس نے پسند و  
 موعظت کے رستے بھی شعرائے مابعد کو دکھائے ہیں۔ شاہنامہ میں بہت مقامات ایسے ہیں کہ  
 بہترین واعظ ان سے بہت کچھ پند لے سکتا ہے حقیقت یہ ہے کہ انہیں مقامات کے تمتع سے  
 فارسی کے بہت سے شعراء نام آور ہوتے گئے ہیں۔ سعدی، مولانا کے روم فرید الدین عطار  
 وغیرہ سب کے سب اس خدائے سخن کے پوچنے والے نظر آتے ہیں، المختصر تمام اقسام مثنوی نگاری  
 کو اسی کتاب شاہنامہ سے ہدایت ملی ہے اور واقعی فردوسی وہ بڑا شاعر ہے کہ شعرائے  
 فارس اسے جس قدر عظمت کی نگاہ سے دیکھیں عین انصاف ہے۔ درحقیقت فارسی میں  
 فردوسی کا جواب کوئی شاعر نہیں ہے۔ اس شاعر گرامی سے بہتر شاعر ڈھونڈنے کے لیے تلاش  
 کنندہ کو سرزمین ایران سے باہر جانے کی حاجت ہے۔ بزمی اور رزمی شاعروں کے علاوہ  
 قصیدہ گوئی بھی زور و شور کے ساتھ ہر طبقہ شاہان اسلام میں مروج رہی ہے۔ ذیل میں بعض  
 ممتاز شعرائے قصیدہ گو کے نام اور ان کے زمانے درج کیے جاتے ہیں:-

نمبر ۱۔ فخر الدین اسد جرجانی بعض شاہان سلجوق کا مداح تھا یہ قصیدہ گو گیارہویں صدی  
 مسیحی میں زندہ تھا۔

نمبر ۲۔ ابوالفرح لاہوری و مسعود بن سعد بن سلمان عہد سلطان ابراہیم غزنوی  
 میں تھے اس بادشاہ کا عہد حکومت از ۵۹۰ھ تا ۶۰۸ھ ہے۔

نمبر ۳۔ ادیب صابر عہد سلطان سنجر میں تھا اس بادشاہ کے حکم سے ۶۲۵ھ مطابق  
 ۱۲۳۸ء میں پانی میں ڈبا دیا گیا۔

نمبر ۴۔ جوہری امیر مغربی سنہ ۱۱۴۶ھ رشید و طواط سنہ ۱۱۴۲ھ  
 عبدالواسع سنہ ۱۱۴۹ھ اور مدالدین انوری سنہ ۱۱۴۹ھ قریب ۱۱۴۹ھ یہ سب کے  
 سب عہد سلطان سنجر کے شعراء ہیں۔

نمبر ۵۔ خاقانی سنہ ۱۱۹۹ھ انوری کا ہم عصر تھا۔

نمبر ۶۔ بلیقانی خاقانی کا ہم عصر تھا۔

نمبر ۷۔ ظہیر فاریابی ایضاً

نمبر ۸۔ کمال الدین سنہ ۱۲۳۶ھ



نمبر ۹ سیف الدین سنہ ۱۲۶۷ء

علاوہ ان شعرائے قصیدہ گو کے اور بھی ہزاروں شعرا گزرے ہیں جن کے ناموں کی فہرست طولانی ہے ان تمام شعرا کے کلام کم و بیش طور پر جادۂ فطرت سے انحراف پذیر معلوم ہوتے ہیں اور اس انحراف و ریزی کا سبب یہی ہوا کہ انھیں مدح بادشاہان وقت میں طرح طرح کے مضامین گھرے پڑے ہیں۔ ہر طرح کے استعاروں کو اختیار کرنا پڑا ہے اور مبالغہ پر دازی کی اُن راہوں میں چلنا پڑا ہے جن کو فطرت کی راہ سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ راقم کی دانست میں ایسی شاعریاں کسی صاحب مذاق صحیح کو پسند نہیں آسکتی ہیں اور درحقیقت یہ وہ شاعریاں ہیں جن سے نفس شاعری کو ضرر عظیم مرتب ہوتا گیا ہے۔

رزمی اور بزمی شاعریوں اور قصیدہ نگاریوں کے ساتھ ساتھ تصوف آمیز شاعری بھی زور پکڑتی گئی۔ تصوف کا مذاق اہل اسلام میں اول اول ملک فارس کی طرف سے داخل ہوا مگر اس مذاق کے پیدا ہونے کا سبب بھی وہی شاہنامہ ہوا ہے۔ فردوسی نے بہت مقاموں پر اخلاقی اور متصوفانہ مضامین حوالہ قلم کیے ہیں۔ چنانچہ کیخسرو کی نسبت اس کا یہ بیان دیکھا جاتا ہے کہ جب اس بادشاہ کو ہر طرح کی ثروت دنیاوی حاصل ہو چکی تب دنیاوی بے حقیقتی پر لحاظ کر کے اس نے دفعۃً ترک دنیا کیا اور تمنائے آرام ابدی میں وہ ایک سرچشمہ پر پہنچ کر چشم عالمیان سے نہاں ہو گیا۔ اسلام میں تصوف کا مادہ تمام تر زردشتیوں سے پہنچا ہے۔ جب اہل فارس سے میل جول کرنے لگے تو ناچار فارسیوں کے مذہبی خیالات ان کے دلوں میں اثر کرنے لگے۔ یہ تو نہ ہوا کہ عقیدۂ توحید اسلامیوں کا زوال پذیر ہو سکا مگر انداز توحید ضرور بدل گیا بہت سے جدید خیالات از قسم وحدت وجود وحدت شہود و ہمدوست وغیرہ پیدا ہوتے گئے۔ شعراء نے اپنی طباعیوں سے ان عقائد کو بہت کچھ زور بخشا۔ حتیٰ کہ ہزاروں منظوم کتابیں اس فرہنگ کی احاطہ تصنیف میں درآئیں۔ بہر حال پہلا شاعر جس نے تصوف کے اصول منظوم کیے فردوسی کا ہم عصر ابو سعید بن ابوالخیر مہانی تھا (۳۵۷-۴۴۰ ہجری نبوی علیہ والہ الصلوٰۃ والسلام) اس نے متصوفانہ مذاق کی رباعیاں لکھیں۔ پھر ناصر بن خسرو نے مثنوی موسوم بہ روشنائی نامہ تصوف میں لکھی۔ پھر علی بن عثمان نے کشف المحجوب لکھی، عمر خیام نے سیکڑوں رباعیاں لکھیں، افضل الدین کاشی نے بھی اس مذاق میں کتابیں تصنیف کیں۔ حکیم سنائی نے حدیقہ تصنیف کیا، اور جلال الدین رومی نے اپنی مثنوی مبسوط لکھی۔ (سنہ ۱۲۷۷ء)

۱۲۴۳ء مطابق ۹۰۴ - ۹۰۲ ہجری) اس کے پہلے فرید الدین عطار منظوم و غیر منظوم کتابیں لکھ چکے تھے۔ عطار نے عمر طویل پائی تھی ۱۱۴۰ برس زندہ رہ چکے تھے کہ قوم موغولیہ نے انہیں قتل کیا۔ پھر سعدی نے وفاتہ مذاق کی کتابیں لکھیں معلوم ہوتا ہے کہ سعدی نے ۱۱۰ برس عمر پائی تھی۔ ان کے انتقال کا سنہ ۱۲۹۲ء مطابق ۶۹۱ھ ہے سعدی نے خاص کر علم تصوف میں کوئی کتاب نہیں لکھی ہے۔ ان کا اصل مذاق اخلاق آموزی سے خبر دیتا ہے مگر اس مذاق کو چونکہ تصوف کے مذاق سے مشابہت ہے اس لیے ان کی تحریر تصوف نامعلوم ہوتی ہے، شیخ کی مشہور کتابیں گلستان اور بوستان کریمیا اور دیوان ہیں، گلستان اور بوستان متبع میں اکثر کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مگر کوئی بھی نقل مطابق اصل کا حکم نہیں رکھتی ہے متبعان سعدی سے بعض مصنفین ذیل ہیں۔

نمبر ۱ ہزاری کوہستانی نے کتاب دستور نامہ متبع بوستان میں لکھی یہ شاعر ۱۳۳۳ء مطابق ۷۲۰ھ میں راہی ملک بقا ہوا۔

نمبر ۲ کاتبی نے کتاب وہ باب بوستان کے جواب میں لکھی اس شاعر کا سال وفات ۱۲۳۴ء مطابق ۸۳۸ھ کے ہے۔

نمبر ۳ حیرتی نے بھی متبع بوستان میں کتاب گلزار لکھی یہ شاعر ۱۵۵۴ء مطابق ۹۶۱ھ میں مقتول ہوا۔

نمبر ۴ معین الدین نے گلستان کے متبع میں کتاب نگارستان لکھی۔ سال وفات اس شاعر کا ۱۳۳۵ء مطابق ۷۳۵ھ کے ہے۔

نمبر ۵ جامی نے یہ متبع ایضاً بہارستان لکھی سال تصنیف اس کتاب کا ۱۲۸۶ء مطابق ۶۹۲ھ ہے تاخرین شعراء نثار سے بعض اشخاص نے بوستان اور گلستان کے متبع میں کتابیں لکھی ہیں مگر کسی کی تصنیف سعدی کی تصنیفوں کو نہیں پہنچتی ہے۔ بہر حال متصوفانہ مذاق کو ہمیشہ ترقی ہی رہی اور آج تک بھی یہ مذاق محمود و مجہا جاتا ہے۔ ذیل میں بعض متصوفانہ مذاق کے مصنفوں کے نام درج کیے جاتے ہیں:-

نمبر ۱ عراقی نے لمعات لکھی سال وفات عراقی کا درمیان ۱۲۸۶ء اور ۱۳۰۵ء مطابق ۶۸۶ھ اور ۷۰۹ھ کے ہے۔

نمبر ۲ حسینی نے زاوالما فرین لکھی، سال وفات اس مصنف کا ۱۳۱۸ء مطابق ۷۱۸ھ



کے ہے۔  
نمبر ۲ محمود شستری نے گلشن راز لکھی، سال وفات مصنف ۱۳۲۰ء مطابق ۱۲۶۲ء  
کے ہے۔

نمبر ۳ اوحسی نے کتاب جام جمشید لکھی، سال وفات مصنف ۱۳۲۹ء مطابق  
۱۲۶۸ء کے ہے۔

نمبر ۵ قاسم انوار نے انیس العارفین لکھی، سال وفات مصنف ۱۳۳۴ء مطابق  
۱۲۷۳ء کے ہے۔

نمبر ۶ عارفی نے گوئی و چوگان لکھی، سال تصنیف ۱۳۳۹ء مطابق ۱۲۷۲ء کے ہے  
نمبر ۷ فتاحی نیشا پوری نے حسن و دل لکھی مصنف کا سال وفات ۱۳۴۸ء  
مطابق ۱۲۸۷ء کے ہے۔

نمبر ۸ اہل شیرازی نے شمع و پروانہ لکھی، سال تصنیف کتاب ۱۳۸۹ء مطابق ۱۲۹۲ء  
کے ہے۔

نمبر ۹ بلالی نے شاہ و گدا لکھی، اس شاعر کے مقتول ہونے کا سال ۱۵۲۲ء مطابق  
۹۳۹ء کے ہے۔

نمبر ۱۰ بہار الدین آملی نے نان و حلوا شیر و شکر وغیرہ لکھی وفات مصنف کا سن  
۱۶۲۱ء مطابق ۱۰۲۰ء کے ہے۔

شاعری ہائے اصناف بالا کے علاوہ غزل سرائی بھی ہر وقت میں مروج رہی رودکی کے  
زمانے سے آج تک اس صنف شاعری کو شعراء برتتے رہے ہیں ذیل میں کچھ غزل گو شعراء  
معروف کس نام و سال وفات اندراج پاتے ہیں۔

سنہ وفات	سنہ وفات	نام متغزلین
۶۹۱	۱۲۹۲	سیدی شیرازی
۷۹۱	۱۳۸۹	حافظ شیرازی
۷۷۹	۱۳۷۷	سلمان سادجی
	....	کمال خجندی
۸۰۹	۱۴۰۶	محمد شیریں مغربی

نام متغزلین	سنہ وفات	سنہ وفات ہجری
نعمت اللہ دلی	۱۴۳۱	۸۳۴
امیر شاہی	۱۴۵۳	۸۵۶
بابا افغانی شیرازی	۱۵۱۹	۹۲۵
نرگسی	۱۵۳۱	۹۳۸
لسانی	۱۵۳۴	۹۴۱
میری صفہانی		
لامحشم کاشی		
وحشی		
ابلی شیرازی	۱۵۳۵	۹۹۲
امیر حسن	۱۳۲۷	۷۲۷
امیر خسرو	۱۳۲۵	۷۲۵
خواجہ کرمانی	۱۳۵۲	۷۳۵
عبدالرحمن جامی	۱۴۹۲	۸۹۸
غزالی مشہدی	۱۵۷۳	
عرفی شیرازی	۱۵۹۱	
فیضی	۱۵۹۵	
زلالی	۱۵۹۲	
صائب تبریزی	۱۶۷۷	
بائف اصفہانی	۱۸۷۵	

واقع ہو کہ ہرچند اقسام بالاک کی شاعریوں کو ہر عہد میں فروغ رہا۔ مگر کسی شاعر نے ڈراما نگاری کی طرف توجہ نہ کی، اس صنف شاعری کے عدم موجودگی سے فارسی کی شاعری ذیل اور حقیقت معلوم ہوتی ہے، مگر اس صدی کی ابتدا میں اس صنف شاعری کی طرف بھی حال کے شعرائے ایران نے توجہ شروع کی ہے، عجیب کیا کہ اپنے وقت پر ڈراما نگاری مروج ملک ایران میں ہو جائے اُس وقت اس زبان کی شاعری کو یونانی، لاطینی، سنسکرت، انگریزی



وغیرہ وغیرہ کی شاعریوں کے ساتھ ساتھ مقابلہ کی صورت پیدا ہو سکے گی۔ اس وقت ڈراما نگاری جو ملک ایران میں مروج ہو چکی ہے وہ معاملات کر بلا سے تعلق رکھتی ہے اور اس طرح کچھ تورات کے قصے بشکل ڈراما موزوں ہوتے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب ڈراما نگاری حسب مراد اس طور پر مروج ایران ہو جائے گی تو فطری شاعری کے رواج پانے کے باعث امید کی جاتی ہے کہ ایرانی شعراء کے حال کا غیر فطری مذاق زوال پذیر ہو جائے گی۔

جاننا چاہئے کہ زبان فارسی میں بہت سی کتابیں علوم مختلفہ کی موجود ہیں: منطق، طبیعیات، فکلیات، ہندسہ، اخلاق، سیر و تاریخ وغیرہ وغیرہ کی کتابیں نہایت علمی تقاضوں کے ساتھ تصنیف پائی ہیں۔ مگر لٹریچر یعنی انشاء کی کتابیں کمتر مذاق صحیح سے خبر دیتی ہیں۔ وہی مبالغہ پردازیاں وغیرہ جن سے فارسی کی شاعری معیوب ہو رہی ہے، فارسی کی نثروں میں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ سو اگلستان سعدی کے بیشتر فارسی کی کتب ادبیہ فطری مذاق تحریر سے بے بہرہ نظر آتی ہیں۔ مثلاً نہ نثر ظہوری کہ بلاشبہ طوار بد مذاق ہے۔ یہی حال مینا بازار وغیرہ کا ہے تعلیم یافتہ اشخاص کو ایسی کتابوں سے تمام تر وحشت پیدا ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انشاء پردازان فارس مطلق مذاق صحیح سے بہرہ مند نہ تھے ان کے قصے اور کہانی کی تصنیفیں بھی نیچرل رنگ سے علاوہ معلوم ہوتی ہیں، حتیٰ کہ انوار سہیلی ایسی کتاب بھی بہت مقاموں میں خوش مذاق سے مبرا معلوم ہوتا ہے۔

چونکہ فارسی اور اردو کی شاعریاں واحد المذاق ہیں تو ان کے اصناف میں بھی کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا ہے چنانچہ دونوں کی معروف صنفیں ذیل میں درج ہوتی ہیں۔

فارسی اور اردو کے اصناف شاعری۔  
غزل، قصیدہ، قطعہ، رباعی، مثنوی، مسدس، مثنوی واضح ہو کہ تقسیم بالا عرضی ترکیب پر مبنی ہے مگر مضامین کی رو سے شاعری کی حقیقت ہر صنف کے بیان سے ظاہر ہوگی۔ اصناف مختلفہ کے وضع کیے جانے کی وجہ پر جب غور کیا جاتا ہے تو یہ سوال ہوتا ہے کہ اتنے اصناف کے ایجاد کیے جانے کا باعث کون سا امر ہوا۔ اگر سب اصناف کا تقاضا ایک ہی تھا تو اتنی صنفوں کے وضع کرنے کی حاجت کیا تھی، اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر صنف کا ایک تقاضائے خاص ہے ضرور کوئی امر ایسا ہے کہ ہر صنف کے برتنے میں شاعر کو اس کا ملحوظ رکھنا واجبات سے ہے ورنہ اصناف شاعری کا مضمون باطل ہو جائے گا۔ اب ذیل میں ہر صنف سے بچت کی جاتی ہے

حضرات ناظرین سے توجہ فرمانے کی خواہشگاری ہے۔  
غزل

یہ وہ صنف شاعری ہے کہ فارسی اور اردو کے سوا کسی اور زبان میں موجود نہیں ہے حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں زبانوں کے سوا کسی زبان کی ایسی ترکیب بھی نہیں واقع ہوئی ہے جو اس صنف شاعری کے حقوق کو پورے طور پر ادا کر سکے عربی میں غزل گوئی شکل امکان رکھتی ہے مگر کسی اہل زبان نے غزل گوئی نہیں کی۔ غمبی شاعروں نے جو زبان عربی میں کچھ غزلیں لکھی ہیں وہ صرف ان کا ایجاد ہی ایجاد ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عربی کو غزل گوئی کے ساتھ بلوری مناسبت بھی نہیں ہے۔ اس صنف شاعری کے ساتھ فارسی ایک خصوصیت رکھتی ہے اور چوں کہ اردو کو فارسی کے ساتھ ترکیب زبان و سلسلہ خیال کے اعتبار سے مشارکت حاصل ہے اس زبان میں بھی غزل گوئی کا لطف بخوبی اٹھتا ہے۔ زبان انگریزی میں شاعری کی ایک صنف ہے جسے سونٹ (SONNET) کہتے ہیں۔ یہ صنف غزل گوئی سے مشابہت رکھتی ہے مگر اس پر غزل گوئی کا اطلاق نہیں کیا جاسکتا ہے۔ کس واسطے کہ سونٹ کو جو کچھ مشابہت غزل کے ساتھ ہے وہ اسی قدر ہے کہ مضامین ذہنیہ از قسم واردات قلبیہ وغیرہ اس میں قلم بند کیے مگر اس کا پیرایہ غزل سے علاحدہ ہوا کرتا ہے، سونٹ کی ترکیب کچھ عشقیہ مثنوی کی ہو جاتی ہے، کس واسطے کہ التزام قطعہ بندی غزلیت کی ترکیب ظاہری قائم رہنے نہیں دیتا۔ خیر اب دیکھنا چاہئے کہ خود غزل گوئی کیا شے ہے اور اس صنف شاعری کے کیا کیا تقاضے ہیں۔

غزل کے لغوی معنی عورتوں سے کلام کرنا ہے مگر اصطلاح میں اس سے وہ صنف شاعری مراد ہے جس میں ایسے مضامین جو اعلا درجہ کے واردات قلبیہ اور ارفع درجہ کے امور ذہنیہ سے خبر دیتے ہیں۔ حوالہ قلم کیے جاتے ہیں۔ یہ صنف شاعری تمام تر داخلی پہلو (Subjective) رکھتی ہے۔ اسی لیے اس کا احاطہ بہت محدود ہوتا ہے چوں کہ اس صنف کا مقصد یہ تھا کہ امور خارجی قلب بندہ ہوں اور اگر ہوں بھی تو داخلی پہلو کی آمیزش سے خالی نہ ہوں اس لیے یہ صنف شاعری دشوار رنگ رکھتی ہے۔ ذرا سی لغزش سے غزلیت کا رنگ جاتا رہتا ہے کلام قصیدہ نما ہو جاتا ہے یا مبتلائے پست خیالی ہو کر احاطہ شاعری سے نکل جاتا ہے غزل گوئی کی شان سے ہے کہ وہ اعلا



قسم کا دل و دماغ رکھتا ہو۔ اور خلقت کی رو سے آزاد طبیعت پاک طینت، شوخ مزاج، نازک خیال، گداختہ دل اور برشتہ جگر ہو امور ذیل غزل گوئی کے لیے مہایت نامہ تصور ہیں۔  
۱۔ ادا تے مطلب کے لیے غزل گو کی زبان کو سلیس ہونا چاہئے کہ امور داخلی کے سوا امور خارجی قلمبند نہ ہوں اور اگر ہوں بھی تو داخلی پہلو کی آمیزش سے خالی نہ ہوں، اس لیے یہ صنف شاعری نہایت دشوار رنگ رکھتی ہے۔ کس واسطے کہ واردات قلمیہ کے بیانات تعلقات سے بے تاثیر ہو جاتے ہیں۔

۲۔ جس قدر ممکن ہوزبان کی سادگی ملحوظ رہے غزل گوئی کو صناع بانی کی حاجت نہیں ہوتی۔  
۳۔ حتی الامکان تشبیہ استعارہ و نقل نہ پائیں۔ چیزیں شاعری کے بجز طبیعت سے خبر دیتی ہے۔  
۴۔ مبالغہ پردازی سے جس قدر اجتناب ممکن ہو غزل میں لایا جائے اسی مبالغہ پردازی سے فارسی اور اردو کی شاعری حقیر اور ذلیل ہو گئی ہے۔

۵۔ اگر تشبیہ استعارہ اور مبالغہ سے بھی کام لیا جائے تو ان کا استعمال فطری خوبیوں کا مغل واقع نہ ہو۔

۶۔ پھبتی ضلع جگت وغیرہ سے اجتناب واجبات سے ہے۔  
۷۔ رعایت لفظی یا ندارد ہو یا محض طبعی انداز رکھتی ہو ایسا معلوم ہو کہ رعایت لفظی کا کوئی التزام کیا گیا ہو اگر فطری انداز بیان کے ساتھ بلا آورد رعایت لفظی کی شکل پیدا ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

۸۔ غزل کے جتنے مضامین ہوں داخلی ہوں مگر ایسے رفیع درجہ کے ہوں جس سے انسان کے عالم باطنی کا شرف ظاہر ہو سکے، جن سے انسان نمونہ قدرت خداوندی سمجھا جائے جس انسان کے قومی اخلاقیہ کی خوبیوں کا انکشاف متصور ہو۔ جن سے انسان کی وسعت ادراک کا پتہ مل سکے۔ جن سے عرفان حق کی راہ سمجھائی دے سکے، جن سے عالم روحانی کا انداز حسب قوت بشر کیا جاسکے۔

۹۔ مضامین عشقیہ ایسے نہ ہوں کہ معشوقان بازاری کی طرف محمول کیے جاسکیں فحش و فجور سے تمام تر بے لگاؤ ہوں عشق پر ایہ فسق میں نہ دیکھایا جائے بلکہ اس عظمت اور بزرگی کی شان سے بندش پائے کہ جو اس کی شان ہے۔ تعالیٰ العشق عن فہم الرجال اسی طرح وہ مضامین جو حسن سے تعلق رکھتے ہیں ان کے انداز ایسے عالی ہوں کہ فوراً خیال سامع معشوق حقیقی کی طرف کھنچ جائے۔

جاننا چاہئے کہ حسن و عشق بغير الفاظ صفات خداوندی سے ہیں اس لیے کہ حسن و جمال شے واحد ہے اور عشق و محبت بھی متحد ہیں۔ جمال کی نسبت حدیث میں وارد ہے۔ ان اللہ جمیل یحب الجمال اور محبت کے متعلق متعدد آیات قرآن مجید میں پائے جاتے ہیں مثل یحبہم و یحبونہ المخلصہ جو کچھ حسن و عشق کے مفہوم میں مثل دیگر غیر محدود صفات خداوندی کے عین ذات خداوندی ہیں اور ذات خداوندی کی طرح قدیم ہیں کس واسطے کہ اگر صفات خداوندی عین ذات خداوندی نہیں ہیں تو تعدد قدام لازم آتا ہے خیر اپنا مذہب یہی ہے بلکہ حسن و عشق کے معاملے میں خیال راقم یہ ہے کہ حسن و عشق شے واحد ہیں۔ اور بصورت وحدانیت خود خدا ہیں اور تمام ذات و صفات انہی سے مراد ہیں اس میں شک نہیں کہ دونوں اعلا سے اعلا درجہ کی چیزیں ہیں لاریب وہ بڑا پوج شاعر ہے جو مضامین حسن و عشق کو ان کے تقاضے کے مطابق نہ باندھے، اور اپنی ترکیب بندش سے انہیں ایسے درجہ ابتذال کو پہنچا دے کہ سامع کا ذہن معشوقان بازاری کی طرف منتقل ہو جاتے، اس عہد میں ایسے غزل گو یوں کی کمی نہیں ہے کتر ایسے طبیعت دار ہیں جو مضامین حسن و عشق کو ان کے تقاضوں کے مطابق باندھتے ہیں بلکہ بعض تو ایسے بد مذاق غزل گو ہیں کہ ان کی دماغی اور دلی بد ترکیبی پورے طور پر ان کی کم بینی خیرہ چسپی، بے حیائی، بد خلقی، بد نفسی اور فردمانگی کا اظہار کرتی ہے۔

- ۱۰۔ وصال و فراق کے مضامین فطرت کے احاطہ سے باہر نہ جاتیں وصال و فراق کی فطری کیفیتیں کیا کم لذت خیز ہیں جو غیر فطری اعانتوں کی محتاج قیاس کی جاسکتی ہیں۔
- ۱۱۔ وصال و فراق کے بیانات بے حیائی کے ساتھ رقم نہ ہوں کہ جس سے طبیعت کو اکراہ لاحق ہو۔

۱۲۔ ہولہ ہوس۔ حسرت۔ رنج۔ ملال۔ عداوت۔ رشک۔ جنوں، وحشت۔ رغبت۔ نفرت۔ حسد۔ غرور وغیرہ کی بندشیں ایسی نہ ہوں کہ مذاق صحیح سے خارج پائی جاتیں (مذاق صحیح عبارت ہے تبعیت فطرت سے)

۱۳۔ کوئی خیال پستی کی طرف مائل نہ ہو غزل گو کو لازم ہے کہ ہمیشہ عالی مضامین پر نظر رکھے اور جس قدر بلند پردازی احاطہ امکان میں ہو اسے اپنا شیوہ جانے۔

۱۴۔ شوخی ضروریات کلام سے ہے مگر شوخی سے مراد بے حیائی نہیں جو مرکوز عوام ہو رہی ہے بعض شعرا نے شوخی اور بے حیائی کو امر واحد سمجھ لیا ہے اور بے تکلف بے حیائی کے مضامین



منظوم فرماتے گئے ہیں اور طرہ یہ ہے کہ ان کے مداحین ان کی بے حیائیوں کو شوخی سے تعبیر کیا کرتے ہیں اور واہ واہ کی صدا بلند رکھتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ جس کلام میں شوخی نہیں ہوتی ہے وہ کلام تمام تر بے لطف ہوتا ہے مگر شوخی چیزے دیگر بے حیائی چیزے دیگر سعدی کے مقطع میں ذیل میں شوخی ہے بے حیائی نہیں ہے۔

سعدیا نوبت امشب وہل صبح بخوفت یا مگر صبح نباشد شب تنہائی را  
اسی طرح استادوں کے کلاموں میں کم و بیش طور پر شوخیاں دیکھی جاتی ہیں لیکن ایسی شوخیاں فحش و بے حیائی سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی فحش و بے حیائی کی مثالیں ایسے ایسے مضامین میں جیسا کہ ایک شاعر اپنے معشوق سے کہتا ہے۔

رات کا خواب الہی تو بہ آپ سنے گا تو شرمایتے گا

خدا یا کیسی شوخی ہے یہ بے حیائی نہیں ہے تو پھر بے حیائی اور کیسی ہوتی ہے اس پر طرہ یہ ہے کہ فقیر نے بعض دعوی داران سخن کو نامراد شعر پر وجد کرتے دیکھا ہے۔ لا حول تم لا حول۔ اسی طرح اور بھی بہت شعر ہیں جو فحش و بے حیائی کے نمونے ہیں۔ مثلاً ایک اور شعر کا مضمون یہاں ذکر کر دیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ یار ہم سے اس قدر بے گمان ہے کہ اس نے ہم اپنی پوری تصویر نہیں بھیجی جو تصویر بھیجی ہے وہ صرف اوپر کے دھڑکی ہے۔ استغفر اللہ کس قدر بد مذاقی نے ترقی کی ہے کہ مذاق صحیح معرض خطر میں جا پڑا ہے! المختصر شوخی کو شوخی کی حد میں رہنا چاہئے۔ اگر شوخی درجہ اعتدال سے گزر جائے تو پھر شوخی نہیں رہتی بے حیائی ہو جاتی ہے حقیقت یہ ہے کہ اکثر عوام جیسے شوخی سمجھتے ہیں وہ اقسام بے حیائی سے ہوتی ہے بلاشبہ مرزا غالب میں بڑی شوخی ہے مگر ان کی شوخی کو بازاری شوخی سے کیا علاوہ بعض شعرائے کلام ایسے بھی ہوتے ہیں کہ سرسری طور پر دیکھنے سے شوخ نظر آتے ہیں مگر ان پر جب نظر ڈالئے تو عیاں ہو جاتا ہے کہ انہیں صرف نمائشی شوخی ہے، سچی شوخی جو لوازم خوش خیالی سے اس کا نام و نشان بھی ان کے کلام میں نہیں پایا جاتا ہے ایسے شعراء زمرہ عوام الناس سے ہوتے ہیں مجمل شخص انہیں نہ شاعر نہ حکیم مان سکتا ہے البتہ بازاری اشخاص انہیں شاعر جانتے ہیں اور ان کے جا بلانہ کلام سے حظ اٹھاتے ہیں۔

۱۵۔ مکر وہ مضامین سے اجتناب واجب ہے کہ اسی طرح ان الفاظ سے بھی احتیاط

درکار ہے جو مکروہ مفہومات کے لیے موضوع کیے گئے ہیں۔

۱۶۔ غزل گوئی کی سرسبزی کے لیے اس کی حاجت ہے کہ جو واردات قلبیہ قلمبند ہوں

انہیں مجرّد شاعری زبان سے تعلق نہ ہو ضرور ہے کہ وہ مضامین فی الواقع دلی انداز بھی رکھتے ہوں تاکہ سامعین کے دلوں میں جگہ کر سکیں۔

جاننا چاہئے کہ جس قدر واردات قلبیہ کی بندش شاعر کے قلبی تقاضے کے ساتھ ہوگی، اسی قدر سامع کے دل میں اثر پیدا ہوگا۔ آنچہ از دل خیزد بردل یزد۔ ایک نہایت منقطع اور راست قول ہے کہ اگر کسی شاعر میں سوز و گداز درخشگی کی کیفیات موجود نہیں ہیں تو مجرّد اس کی مضمون بندی حسب مراد تاثیر نہیں پیدا کر سکتی، استاد غالب نے خود فرمایا ہے۔

حسن فردغ شمع سخن دور ہے اسد پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی  
۱۷۔ جس قدر ممکن ہو غزل گو کو چاہئے کہ تبعیت فطرت کو ہمیشہ ملحوظ رکھے، بعض غزل گو حضرات ایسے دیکھے جاتے ہیں کہ خلاق سخن تو ہیں مگر سخن سنجی میں فطرت کی پیروی کمتر کرتے ہیں تبعیت فطرت کی ضرورت صرف غزل گوئی ہی میں نہیں ہے بلکہ جمیع اصناف شاعری کو اسکی ضرورت ہے اہل یورپ کی شاعری نے اسی تبعیت فطرت کی بدولت فردغ عظیم پکڑا ہے۔

۱۸۔ غزل گوئی کی شان سے ہے کہ مضامین حکمت آگیں شاعری کے پردے میں قلمبند کیے جائیں اگر کوئی غزل گو حکیم نہیں ہے تو اس کی غزلیں محض عوام پسند ہوں گی اور اہل مذاق کو زینہار پسند نہ آئیں گی۔ حافظ علیہ الرحمۃ کا دیوان کا دیوان اخلاقی فلسفہ ہے اسی لیے کسی کی تاب نہیں ہے کہ خواجہ کے کمالات کا منکر ہو۔ تمام دنیا میں خواجہ کی خوش کلام کی شہرت ہے خواجہ کو لندن اور پیرس کے علماء اُسی طرح جانتے ہیں جتنا کہ شیراز و اصفہان کے اہل علم ان سے واقفیت رکھتے ہیں۔

۱۹۔ غزل گو کو عاشق مزاج ہونا واجبات سے ہے عاشق مزاجی سے یہ مراد نہیں ہے کہ کسی زن بازاری پر فریفتہ ہو کر کوچہ گردی کرنا اور اس کے وصال و فراق کے مضامین سے اپنے دفتر شاعری کو سیاہ کرنا۔ اکثر غزل گوئی کے دعویدار شامت اعمال سے اس طرح کی بوالہوسی میں مبتلا دیکھے گئے ہیں۔ عاشق مزاجی اسے نہیں کہتے کہ چنی گنی لڈن و ڈن کی صحبتوں میں اوقات ضائع کی جائے۔ یہ سب فسق و فجور کی باتیں ہیں۔ ان کو شاعری سے کیا علاقہ۔ جو غزل گو اس طرح کی بداد قاتی میں مبتلا رہے گا وہ اعلا درجہ کے مضامین عشقیہ کیوں کر موزوں کر سکے گا۔ پست خیالی سے عالی مذاقی کی امید نہیں کی جاسکتی۔ جاننا چاہئے کہ عاشق مزاجی سے مراد ہے عالم فطرت کے حسن پر محویت کا پیدا ہونا۔ یہ محویت عشق مجازی ہے لیکن جب وہی محویت حسن فطرت سے منتقل ہو کر سبب حسن و فطرت کی طرف رجوع کر جاتی ہے تو درجہ عشق حقیقی کو پہنچ جاتی ہے۔ واضح ہو کہ



حسن فطرت کے احاطہ وسیع میں حسن انسانی ہی ہے۔ انسان کا عشق انسان کے ساتھ خلاف فطرت امر نہیں ہے۔ بخوبی مرد کو عورت کے ساتھ اور عورت کو مرد کے ساتھ عشق پیدا ہو سکتا ہے۔ انسان کا عشق صادق معاتب میں شمار ہونے کے عوض بڑے حسن و اخلاق سے خیر دینا ہے۔ سیفوف (SAPPHO) جو ملک یونان کی ایک مشہور شاعرہ ہے کسی جوان رعنا سے عشق صادق کھتی تھی عالم عشق میں غزل مر تیاں کیا کرتی تھی۔ تمام شعرائے یونان میں کوئی شاعر ایسا نہیں ہے کہ سوز و گداز و درخستگی اور شریعت میں اس کا جواب سمجھا جاتے اس کے منہ میں عشق ایسے ہیں کہ جنہیں پڑھ کر کہیں جو مزہ کو آتا ہے۔ بخاہر ہے کہ اس شاعر کے کلام میں اس قدر دلیری کا سبب اس کا عشق صادق تھا۔

شاد باش اے عشق خوش سودا اے ما اے طیب بسلاطت ہائے ما  
۲۰۔ غزل گو کا فرض منصبی ہے کہ قرب سلاطین سے ہمہ امکان کنایہ کش رہے کسی منفعت شاعری کی قرب سلاطین اور امرا سے اس قدر ضرر نہیں پہنچتا جس قدر غزل گوئی کو حافظ اور میر کاہد امکان سلاطین و امرا سے کنایہ کش ہے اور اگر بڑے بھی تو محض وادعی طور پر خواہر حافظ کے پاس شاہزادے اور امیر زادے آتے تھے مگر ان کے ساتھ خواہر اس طور پر برتاؤ نہیں فرماتے تھے جیسا کہ درباری شعراء کا شیوہ ہوا کرتا ہے ایک بار خواہر کو شاہ دکن نے ہندوستان میں مدعو کیا تھا خواہر نہ آئے اور شاعرانہ عقد شاہ کو شعر ذیل کے ذریعہ سے لکھ بھیجا۔

نمی دہند سہلازت مرا بہ سیر و سفر نسیم خاکب منطے و آب رکنا باد  
اگر نہ اندوڑی کی بوس خواہر کو ہوتی تو سفر کی تکلیفوں کو گوارا کر کے داخل دکن ہو جاتے بلخضر  
یہ کہ خواہر کی قناعت درازی گوش گیمی، عزت پسندی، آزاد مزاجی، سیر شہی بے غرضی ہے پروائی  
کا نتیجہ ہے کہ ان کی غزل گوئی کا نظیر دنیا میں نہیں پایا جاتا ہے۔ مگر خواہر کو قرب سلاطین کی  
بوس ہوتی تو بلاشبہ بہت تیرت، گلیز کمالات سے محروم رہتے۔ ان کی غزل گوئی بھی عسفی،  
غیبوی، نعمت خاں، قناتی کی غزل گوئیوں کی طرح ہے تاثر ہو جاتی، میر صاحب ہی سلاطین و امرا  
کی محبتوں کے غالب دل سے نہ تھے چنانچہ جب بجاالت مجبوری دہلی سے لکھنؤ آئے تو نواب آصف اللہ  
کی درباری ذکر کے ایک بار کا ذکر ہے کہ میر صاحب نواب وقت سے ہاتھوں ہو کر اپنے مسکن پر چلے  
آئے اور کثرت مالی سے محروم ہو گئے جب ان کی بزرگی کی خبر نواب کو ہوئی تو نواب عبادت کے لیے  
آئے۔ اور ساتھ ایک رنج شب کی ناولی بھی لائے جس پر میر صاحب پڑے ہوئے تھے، نواب  
جی اس کے ایک کھڑے پر بیٹھ گئے، میر صاحب نے لکھنؤ سے لکھنؤ بند کیے پڑے تھے جب لکھنؤ

کھولیں تو دیکھا کہ نواب سامنے بیٹھے ہیں مزاج پرسی کے بعد نواب نے اس نادہلی کو میر صاحب کے گلے میں ڈال دیا میر صاحب نے جربستہ یہ مطلع فرمایا:-

دیوانہ پن ہمارا آخر کورنگ لایا جو دیکھنے کو آیا مٹھی میں سنگ لایا  
حضرات اہل دانش پر ہویا ہے کہ دل کی عہدگی کو انسان کے اقوال و افعال سے بڑا تعلق ہے  
غزل گوئی، خستہ جگر، گداختہ دل، آزاد مزاج، عزلت نشیں، قناعت پیشہ، الم کش اشخاص کا شیوہ  
ہے ہوساکی، جاہ طلبی، زراں دوزی وغیرہ سے اس شیوہ کو کیا علاقہ پس تقرب سلطانی اور غزل گوئی  
کا انجام ساتھ ساتھ نہیں ہو سکتا، چنانچہ فارس کے درباری شعراء کا حال ایسا ہی دیکھا جاتا ہے کہ  
ان میں سے ایک شاعر بھی اس صنف شاعری میں حافظ یا سعدی کا جواب نظر نہیں آتا ہے۔ غزل  
گوئی کے لیے قابلیت علمی کی اس قدر حاجت نہیں ہے کہ جس قدر عہدگی دل کی۔ عہدگی دل عبارت  
ہے، ان اوصاف میمنہ سے جن سے انسان انسان کہلاتا ہے عہدگی دل کا تقرب سلطانی کے ساتھ  
برقرار رہنا نہایت غیر متوقع امر ہے حکیم قانانی کو دیکھئے کہ کتنا بڑا شاعر تھا کس قدر استعداد علمی رکھتا  
تھا اور کس قدر معتمد ہو کر مرا گرا اس حیرت افزا شاعر کی غزلوں کو جو پڑھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ غزل گوئی  
سے کوئی مناسبت ہی نہیں رکھتا تھا اس کی وجہ اور نہ تھی الا یہ کہ درباری شاعر ہونے کے باعث اُسے  
آزادی قناعت و رزی، عزلت نشینی، خود داری، بے پروائی وغیرہ کی صفات کو برقرار رکھنے کا کبھی موقع  
حاصل نہ تھا جس شاعر کی یہ اوقات ہو کہ بادشاہوں کی تقریبات میں قصیدہ نگاری کی زحمت ہمیشہ  
گوارا کیا کرے وہ اپنی عہدگی دل سے کیا کام لے سکتا ہے۔ ایسے شاعر کا غزل گو ہونا محال عقلی سے ہے۔  
کرایہ کا شاعر غزل گو ہوا ہے نہ ہو گا چنانچہ حکیم قانانی کی غزل گوئی راقم کے اس دعوے کی پوری معین  
معلوم ہوتی ہے۔ اول تو اس شاعر کی غزلیں بہت تھوڑی ہیں اور جو ہیں بھی ان سے آشکارا ہے کہ اسے  
واردات قلبیہ اور معاملات روحانیہ کی طرف توجہ کرنے کی فرصت کم نصیب ہوتی ہے ساری غزلوں میں  
شاعری کا خارجی پہلو (OBJECTIVE) پایا جاتا ہے اسی لیے کمتر سوز و گداز و درخشگی وغیرہ کی  
کیفیتیں ان میں درک ہوتی ہیں۔ بخلاف حافظ کے ان کی تمام غزلیں داخلی رنگ (SUBJECTIVE)  
میں ڈوبی ہوئی ہیں اور اس سبب سے حق غزل گوئی کو دام دام ادا کر رہی ہیں۔ واضح ہو کہ فارس ہی کے  
درباری شعراء کی یہ حالت نہیں ہے کہ غزل گوئی میں پچکے نظر آتے ہیں بلکہ کم و بیش طور پر تمام درباری غزل  
گویوں کا یہی حال دیکھا جاتا ہے۔ ایشیائی درباروں میں آزادی کہا اگر فردوسی بھی ہو تو اسے پائے پیل  
سے پیسے جانے کے لیے مستعد رہنا چاہئے پس غزل گوئی جس کا مدار روح کی آزادی پر ہے فردوسی سے



بھی حسب مراد انجام نہیں پاسکتی ہے۔ یورپین درباروں میں ایشیائی درباروں کے اعتبار سے بہت زیادہ آزادی ہے مگر درباری شاعر ہو کر پورے طور پر آزادی کو قائم رکھنا بہت خلاف توقع ہے انگلستان ایک بہت آزاد ملک ہے مگر وہاں بھی ابھی تک ایک شخص تنخواہ دار دربار سے متعلق رہا کرتا ہے کہ جس کی خدمت یہ ہے کہ بادشاہ وقت کے محل میں جو شادی اور غمی کی تقریبیں ہوں ان کے متعلق اشعار تہنیت و تعزیت لکھا کرے اس شخص کا لقب پوٹ لارپٹ ہے یہ اسی طرح کا کام ہے کہ جیسے مثلاً قافی فارسی میں یا ذوق دہلی میں انجام کیا کرتے تھے ظاہر ہے کہ اس پابندی کے ساتھ غزل گوئی نہ ہندوستان انگلستان نہ ایران میں انجام پاسکتی ہے یہ ممکن ہے کہ کسی خاص درباری شاعر کو اتفاق وقت سے غزل گوئی کی فطری صلاحیت حاصل ہو مگر درباری شاعری کا تقاضا ایسا نہیں ہے کہ اس سے غزل گوئی کے حقوق پورے طور پر ادا ہو سکیں۔ بلاشبہ درباری معاملات کبھی ایسے نہیں ہوتے کہ ان میں سوز و گداز وغیرہ کو ذرا بھی دخل ہو۔ درباروں میں حافظ یا میر ایسے شاعروں کی کوئی ضرورت متصور نہیں ہے اور وہ بھی خاص کر ایشیائی درباروں جہاں آزادی حکم عنقا رکھتی ہے جائے لحاظ ہے کہ جب انگلستان ایسے آزاد ملک میں شاعری پر درباری اثر پیدا ہوتا ہے تو دوائے بہر حال ان درباروں کے جہاں شاعر کی گردن جلاؤ کی تلوار کے سائے تلے ہم دم رہا کرتی ہے۔ اہل اطلاع سے پوشیدہ نہیں ہے کہ ملک انگلستان میں کسی کو بے جرمی کی حالت میں سزائے مرگ یا کسی کی طرح سزایابی کا خوف نہیں ہے پس ایسے ملک کے درباری شاعر کو ضرور ہے کہ ایشیائی درباروں کے شاعروں سے بہت زیادہ آزادی اور عزت حاصل رہے۔ چنانچہ امر واقعی بھی یہی ہے کہ ٹینس صاحب نے نہایت آزادی اور عزت کے ساتھ اپنی عمر بسر کی مگر اس آزادی اور عزت کے حاصل رہنے پر بھی ان کو اپنے عہدے کے تقاضوں سے مضرت تھا لاریب اگر ان کو درباری تعلق نہ ہوتا تو بہت سے ان کے کلام جو ان کی عہدہ داری کے نتائج معلوم ہوتے ہیں وجود پذیر نہ ہوتے جائے لحاظ ہے کہ جب درباری اثر اس طور سے ٹینس صاحب کی شاعری پر دیکھا جاتا ہے تو دوائے بہر حال قافی کہ جو بیچارہ ایک ایسے دربار سے متعلق رہا کہ جس کی خوشی و ناخوشی پر اس کی حیات و جہات پر موقوف تھی ایسے شاعر سے کیا اُمید کی جاسکتی ہے کہ سچی شاعری کی داد دے سکتا ہے۔ یاد دل کی عمدگی کا لطف دکھلا سکتا ہے۔ جو کیفیت ایران کے درباری شاعر کی دکھائی دیتی ہے بحسنہ دہلی اور بکھنؤ کے شعرا کی بھی نظر آتی ہے۔ مثلاً ذوق کو جو دنیاوی ضرورتوں سے درباری شاعر بننا پڑا تو ان کی غزل گوئی کو بہت سی مضرتیں لاحق ہوتی گئیں اول تو ان کی قابلیت کے مطابق ان کا دیوان جمع نہ ہو سکا۔ دوم یہ کہ انہیں جو کبھی آزادی نصیب ہوتی تو ان کی



اکثر غزلوں میں غزلیت کا پورا مزہ پیدا نہ ہو سکا ظاہر ہے کہ جس غزل گو کی یہ اوقات ہو کہ کبھی اُسے بادشاہ کے حضور میں حاضر ہونا پڑے اور کبھی نواب سے مصاحبت گرم رکھنی ہو وہ غزل گوئی کی داد کیوں کر دے سکتا ہے ذوق بیچارے کی یہ حالت تھی کہ کبھی حاضر ہو کر ظفر شاہ کی غزلیں تیار کرتے تھے یہ دونوں حضرات کچھ بھی غزل گوئی پر قادر نہ تھے بادشاہ صاحب کبھی ایک مصرع کبھی نصف مصرع اور کبھی ایک شعر موزوں فرما لیتے تھے اور نواب صاحب تو اتنی بھی قدر نہ رکھتے تھے ذوق کو ان دونوں آقاؤں کے لیے غزلیں درست کر دینا پڑتی تھیں ایسی صورت میں کہ شاعر کو آزادی حاصل نہ ہو۔ اغراض غزل گوئی کے پورا کرنے پر کیا قادر ہو سکتا ہے ایسے پریشان اوقات شاعر کی غزلوں میں کیوں کر آزادی، درد، سوز، گداز، حسرت کی صفیں پائی جاسکتی ہیں ناممکن تھا کہ ذوق کی غزل گوئی خواجہ میر درد یا میر تقی میر کا رنگ پیدا کر سکتی ہے علاوہ اس مشغلہ کے کہ ذوق ظفر شاہ اور نواب الہی بخش کے لیے غزلیں بنایا کرتے تھے تقریبات شاہی میں انھیں قصیدہ گوئی کی زحمت بھی اختیار کرنی پڑتی تھی۔ غزل گوئی ایسے پاک کام کو مدح گوئی کے جھوٹے پتے سے کیا علاقہ رذیل دھندے کے ساتھ شریف دھندہ اچل نہیں سکتا۔ آخر کار کثرت دروغ سرائی سے ضرور ہے کہ شاعر کی طبیعت کو بے حسیتی لاحق ہو جو تقاضائے غزل گوئی کا بہت منافی ہے تقریب سلطانی سے متضرر ہونے کی دوسری مثال میر انشا اللہ خاں کی ہے سید صاحب جب تک نواب سعادت علی خاں کی مصاحبت میں عمر ضائع کرتے رہے ان کی غزل گوئی بے مزہ رہی مگر جب ترک خدمت کر کے گوشہ نشینی اختیار کی تو ان کے کلام میں فی الجملہ حسرت، سوز، درد، گداز کا مزہ آگیا فقیر اس امر کا زینہار قائل نہیں ہے کہ کوئی شاعر دوبار داری بھی کرے اور غزلیت کا لطف بھی دکھلائے۔ یہ کام گوشہ نشینان الم کش کا ہے، حریف طامع تنگ چشم اور پیٹ کے بندے سے غزل گوئی شکل امکان نہیں کہتی یوں تو اگلے زمانوں میں بڑے بڑے شعراء جو دولت فقر سے مالا مال تھے، گذرے ہیں مگر اس عاجز نے اپنے زمانہ میں بھی ایک ایسے شاعر کو دیکھا ہے کہ جن کی زیادت ثواب خالی نہ تھی یہ حضرت ہائے مولوی وحید آلہ بادی تھے شاعر کے لیے جتنی صفیں دیکھا ہیں ان کی ذات بابرکات میں موجود تھیں حضرت کو نہ لباس سے سے شوق تھا نہ کھانے سے ذوق دونوں سے نہایت بے پروا اور آزاد تھے جہاں نیند آگئی سو یہ جہاں جی چاہا چلے گئے دنیا میں کیا ہوتا ہے اس سے ان کو کوئی بحث نہ تھی جن لوگوں سے امتراز مناسب سمجھا بے رطلی رکھی، کسی کی بُرائی میں کبھی زبان نہ کھولی اگر کسی نے بُرا کہا تو اس کا جواب نہ دیا شکایت، نسیب، گلہ وغیرہ کی فرصت انھیں افکار شاعری سے نہ تھی ساہا سال کی ملاقات میں اس عاجز نے انھیں کسی کو بد کہتے نہ سنا۔ جس کا ذکر آگیا اس کو اچھا ہی کہا ہر طرح کے حسد ان کا



سینہ پاک تھا حتیٰ کہ شاعرانہ حسد بھی ان کے دل میں نہ تھا۔ قناعت، سیرشہی، عجز، صبر و تحمل، صدق و صفائیں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے قلب اس قدر سوز و گداز سے بھرا پایا تھا کہ ان کی صحبت میں طبیعت کو بے چینی پیدا ہوتی تھی طلب جاہ سے نہایت دور تھے ان کے دماغ میں اس خیال کا گندہ ہی نہیں ہوا تھا کہ حکام و اُمراء کے حضور میں حاضر ہو کر کسی طرح کا رِسخ پیدا کیجئے وہ ایسے لوگوں کے مذاق سے خبر بھی نہیں رکھتے تھے کہ جو حکام وقت کے درباروں کی شرکت پر جان و مال و آبرو نثار کر دینے کو ہر وقت آمادہ رہتے ہیں اور کمال بے حیائی اور نادانی سے اس طور کی گھس پیٹھ کو سرمایہ عزت و منزلت جانتے ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ مولوی صاحب مرحوم تمام ایسی صفات سے متصف تھے جو اعلا درجہ کے پاک سرشت، پاک طینت شاعر کے لیے درکار ہیں۔ پس لاریب انھیں صفات حمیدہ کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے کلام میں سوز و گداز و خشگی کی کیفیتیں اس درجہ پائی جاتی ہیں اہل انصاف کے نزدیک ان کا کلام سرمایہ ناز و افتخار ہے۔ زبان کی عمدگی سلاست اور روانی کے علاوہ ان کے کلام کی پر تاثیر سے سوائے حاسد کے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا ان کا کلام کہے دیتا ہے کہ ہم اس کے نتیجہ فکر ہیں کہ جس کی خلقت میں خدا نے سادگی راسخی، سیرشہی، حلم، تحمل، صبر، رضا، سوز و گداز، درد خشگی، آنا دی، قناعت، مروت، حیا، صدق، صفا، عشق، محبت، عجز، انکسار وغیرہ وغیرہ کی صفیں کوٹ کوٹ کر بھری ہیں۔ ایسے صافی طینت پاک خصلت شاعر کے ساتھ اس ننگ شاعری کو کیا مقابلہ ہو سکتا ہے جو حکام وقت کی مناقب کے قصیدے بغل میں دا بے درباروں کو اور حکاموں کے جلسوں میں پڑھتا پھرتا ہے اور شاعری سی عزیز خشنے ذریعہ سے اپنے کو ذلیل و خوار بنائے رہتا ہے۔ یہ ہیں تفادات رہ از کجاست تا بجایا

ہمارے شہرینہ میں ساٹھ ستر برس پہلے حضرت راسخ گندے ہیں جو جواب میر مانے جاتے ہیں خدائے تعالیٰ نے انھیں تمام صفات حمیدہ سے متصف فرمایا تھا۔ جو سچے شاعر کے لیے درکار ہیں۔ راسخ نہ دربار داری کرتے تھے نہ حکام و اُمراء سے سر درکار رکھتے تھے، فقر و قناعت میں عمر بسر کر ڈالی، ارباب مذاق سے ان کے دیکھنے والوں میں اب اس شہر میں خواجہ محمد شاہ صاحب شہرت رہ گئے ہیں خواجہ صاحب سے معلوم ہوا کہ حضرت راسخ مرحوم فقیر طبیعت اور فقیر دوست آدمی تھے۔ اکثر شاہ باقر کے تکر پر قیام رکھتے تھے 'ابلی و دست سے کم ملتے تھے، محبت فقر میں ہمیشہ رہتے تھے تب ہی تو ان کے کلام میں اس قدر مزا ہے۔ بے فقیر دل ہوئے نہ کلام پر تاثیر ہو لے نہ ہوگا۔ دباری شاعری کیا اور اس کی شاعری کیا وہ ٹیپٹ کا بندہ ہے، صوغ سرائی اس کا شیوہ ہے اسے کلام کی باتا شیر اور بے تاثیر ہونے سے کیا مطلب ایسے شاعر کی شاعری کو تعلق کلم سے ہوا کرتا ہے نہ دل سے۔

اب ذیل میں راقم کچھ شعرائے فارسی اور اردو کا ذکر اس خیال سے حوالہ قلم کرتا ہے کہ جو امور غزل گوئی کی نسبت بیانات بالا میں چھوٹ رہے ہیں وہ بھی احاطہ تحریر میں در آئیں اور بھی غزل گوئی کے تقاضوں کی مثالیں ان کے کلاموں سے وضاحت پذیر ہوں حضرات ناظرین کو اس یاد دہی کے اعادہ کی حاجت نہیں ہے کہ یہ کتاب بہ سبیل تذکرہ نہیں لکھی جاتی ہے اس کتاب کی جو غرض ہے وہ حقیقت شاعری کا بیان ہے نہ شاعروں کا شمار اس سے مطلب ہے اور نہ ان کے حالات کی سیر اس سے مدعا ہے۔ اس لیے کہ حسب وسعت ضرورت کچھ شعرا کے کلاموں کی نسبت عاجز اپنے خیالات مندر ناظرین کرتا ہے۔

فارسی شعراء کا عدد اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی اہل ہمت ان کا تذکرہ حسب مراد لکھنا چاہے تو اس کو اس کلام کے لیے انسان کی دو عمر طویل درکار ہوگی۔ مگر اس کثرت شعراء کے ساتھ بھی اچھے غزل گویوں کی تعداد بہت نظر نہیں آتی سراقم کی دانست میں سرآمد متغزلین خواجہ حافظ ہیں اور ان کے بعد دس پانچ ہی نام ہیں جن کو غزل گو کے لقب سے یاد کر سکتے ہیں۔ فقیر کی دانست میں اس صنف شاعری میں خواجہ کا جواب کوئی شاعر نہ فارس میں دیکھا جاتا ہے نہ ہندوستان میں۔ خواجہ کی غزل گوئی ایسی ہے کہ اس کے ساتھ فارسی یا اردو کے کسی شاعر کی غزل گوئی مناسب نہیں رکھتی ہے یہ وہ غزل گوئی ہے کہ برے خود مصداق غزل گوئی ہے خواجہ کا دیوان غزل گوئی کا نمونہ ہے جہاں سے پڑھتے ہر غزل ہر شعر ہر مصرع غزل گوئی کی مثال ہے ایسا کوئی غزل گو کسی زبان میں نہیں دیکھا جاتا ہے کہ اس کا دیوان کا دیوان پورے طور سے غزل گوئی کے تقاضوں کے مطابق ہو بہر حال خواجہ کو مستثنیٰ کر کے جب دیگر متغزلین پر نگاہ ڈالئے تو اغراض غزل گوئی کو مد نظر رکھنے والے بس چند ہی حضرات دکھائی دیتے ہیں۔ جیسے سعدی جامی، فغانی سیلی، کلیم بلالی، اہلی خسرو، حزین ان شعرائے متغزلین کے کچھ کلام درج ہذا کیے جاتے ہیں ان کے انداز کلام سے کم و بیش طور پر غزل سرائی کے تقاضے وضاحت پذیر ہوں گے۔

## خواجہ حافظ

خواجہ حافظ آپ کا نام نامی شمس الدین محمد ہے۔ غزل سرائی میں حضرت خواجہ کا آج تک کوئی نظیر نہیں پایا جاتا ہے حتیٰ کہ سعدی طبریزی بھی اس صنف شاعری میں خواجہ تک نہیں پہنچے ہیں۔ سعدی کو مذاق شاعری بطور تنوع حاصل تھا اور مختلف اصناف شاعری پر قدرت رکھتے تھے۔ یہ تنوع کی کیفیت خواجہ میں موجود نہ تھی۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ خواجہ فطرت کی ربط سے شاعری کا نام تراخی مسداق



رکھتے تھے۔ برخلاف اس کے سعدی کو شاعری کے داخلی اور خارجی دونوں پہلو سے مناسبت حاصل تھی مگر داخلی مذاق ان کا حافظ کے داخلی مذاق کے برابر نہ تھا اس لیے غزل گوئی میں خواجہ کے برابر لطف کلام پیدا نہ کر سکے۔ حافظ اور سعدی کی طرح بجنسہ کیفیت میر اور مرزا کی معلوم ہوتی ہے۔ مرزا رفیع سودا میں لطف تنوع حاصل تھا یہ بات میر تقی میر میں نہ تھی مگر خاص غزل گوئی میں مرزا رفیع سے زیادہ مناسبت رکھتے تھے۔ جس طرح سعدی اصناف شاعری پر قادر تھے۔ سودا کو بھی ویسی ہی قدرت حاصل تھی۔ ان دونوں شاعروں کو شاعری کے داخلی اور خارجی دونوں پہلوؤں کے برتنے کی بڑی اچھی صلاحیت حاصل تھی۔ شیخ علیہ الرحمۃ ثنوی، قصیدہ، غزل، قطعہ، رباعی وغیرہ یعنی سب اصناف شاعری کو خوبی کے ساتھ برتتے ہیں۔ اور مجموعی حیثیت کے اعتبار سے ان کا جواب کوئی شاعر نظر نہیں آتا ہے۔ یہی کیفیت مرزا سودا کی بھی معلوم ہوتی ہے۔ مگر غزل گوئی میں نہ سعدی حافظ کے اور نہ مرزا میر کے جواب معلوم ہوتے ہیں۔ گو سعدی اور مرزا اس صنف شاعری میں بھی بڑی دستگاہ رکھتے تھے۔ حافظ کی غزل گوئی کے ایسے کمالات ہیں کہ راقم کو ان کے بیان کی قدرت حاصل نہیں حضرات ناظرین اول ان مضامین کو ملحوظ رکھیں جنہیں فقیر نے غزل گو اور غزل گوئی دونوں کی نسبت اوپر بیس مکر کے حوالہ قلم کیا ہے۔ بلاشبہ حافظ کی غزل گوئی تمام ان مضامین کی مصداق ہے علاوہ ان خوبیوں کے حافظ کا تمام کلام ایک انداز کا ہے۔ دیوان کا دیوان ان خوبیوں سے بھرا ہوا ہے جو اعلا سے اعلا درجہ کی غزل گوئی کے لیے درکار ہیں۔ یوں تو غزل گوئی کے لیے اعلا درجہ کی واردات قلبیہ اور معاملات ذہنیہ کی بندش کی بڑی حاجت ہے بغیر اس التزام کے غزل گوئی حسبِ مزاج پیدا کر ہی نہیں سکتی ہے مگر حافظ کے داخلی مضامین ایسے عالم سے خبر دیتے ہیں کہ جس کو ظاہری آنکھیں نہیں دیکھ سکتی ہیں۔ صرف دل انکھ کا کام ہے کہ اس عالم کو معائنہ کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ صوفی مذہب والوں نے اپنے خیالات کے مطابق خواجہ کے دیوان کے دیوان کی شرح لکھی ہے۔ حضرات صوفی مذہب جو کچھ تاویلات دکھاتے مگر ہم عوام الناس کے لیے بھی خواجہ کا دیوان ایک ذخیرہ حیرت ہے اور جو فہم معمولی انسان کو عطا ہوا ہے اس کے ذریعہ سے خواجہ کے کلام کا کچھ مزہ نہیں اٹھتا ہے۔ اہل علم کے لیے خواجہ کا سارا کلام فلسفہ اخلاق کا حکم رکھتا ہے کچھ غزلیں ذیل میں نذر ناظرین ہوتی ہیں۔ سبحان اللہ کلام کا ہیکو ہے لائیک کی تسبیح و تہلیل ہے۔

تاز میخانہ دمی نام و نشان خواہد بود      میرمن خاک رہ پیرمغاں خواہد بود  
 حلقہ پیرمغانم ز ازل درگوش است      ماہانیم کے بودیم وہماں خواہد بود  
 بر سر تربت ماچوں گزری ہمت خواہ      کہ زیارتگہ یریداں جہاں خواہد بود  
 بہ زمینے کے سان کف پاتے تو بود      ساہبا سجدہ صاحب نظراں خواہد بود  
 برداے زاہد خود بین کہ ز چشم من و تو      راز این پردہ نہاں است و نہاں خواہد بود  
 ترک عاشق کش من بست بروں رفت امروز      تاکرا خون دل امر فر رواں خواہد بود  
 عیب متاں کن لے خواہد گزریں کہ نہ رباط      کس نہ دانست کہ رحلت بچیاں خواہد بود  
 چشم اندم کہ شوق تو نہد سر بہ لحد      آدم صبح قیامت ننگراں خواہد بود  
 بخت حافظ گرازیں گو نہ مدد خواہد کرد

زلف معشوق بدست و گراں خواہد بود

حضرت ناظرین خدا گواہ ہے کہ درج ہذا کرنا شروع کیا تھا کہ عجب حالت دیدہ و دل کی ہو گئی۔  
 چند منٹ تک کیا جان پر گزری۔ نہ زبان کو قدرت حاصل ہے نہ قلم کو یارا ہے کہ لکھے۔ سبحان اللہ  
 ایسا تو ہو کہ دل کو ہلا دے ورنہ بے تاثیر مضمون بندی کا حاصل کیا۔ اگر غزل گوئی صرف مضمون آفرینی  
 کا نام ہوتا تو فردوسی، عنصری، عسجدی، فرخی، ظہیر، خاقانی، عرقی، ظہوری، نعمت خاں صاحب،  
 شوکت نجابتی، نظیری وغیرہ کو بھی فقیر غزل گو جانتا، یہ حضرات بڑے بڑے شاعر تھے مگر غزل گو نہ  
 تھے۔ فقیر پران شعراتے نامی کے تمام تصانیف کا اتنا اثر کبھی پیدا نہ ہوا۔ جتنا کہ اس وقت چند  
 اشعار کے کاپی کرنے کے وقت محسوس ہوا ہے۔ بہر حال دل پر اختیار پیدا کر کے خواجہ کی کچھ اور غزلیں  
 بھی نذر ناظرین کرتا ہے۔

غلام نرگس مست تو تاجدار اند      خراب بادۂ لعل تو ہو شیار اند  
 ترا صبا و مرا آب دیدہ شد غماز      و گرنہ عاشق و معشوق رازدار اند  
 بزیر زلف دو تاچوں گز کئی نہ نگر      کہ ازیمین و لیلاست چہ میقرار اند  
 گزار کن جو صبا برینغشہ نار و جبین      کہ از تطاول زلف چہ سوگوار اند  
 رقیب و گداز و بیش ازین کن نخوت      کہ ساکنان درد و دست خاکسار اند  
 نصیب است بہشت لے خدا شناس برو      کہ مستحق کرامت گناہ گار اند  
 نہ من برآں گل عارض غزل مرا یم و بس      کہ عندلیب تو از ہر طرف ہزار اند



تو دستگیر شوائے خضر پے نجمتہ کہ من پیادہ مے روم دہسراں سوار اند  
 بیا بمیکدہ چہرہ ارغوانی کن مرد بصومعہ کانچا سیاہ کار اند  
 خلاص حافظ ازاں زلف تابدار مباد  
 کہ بستگان کند تو رستگار اند

نہایت جاتے حیرت ہے دس شعر کی غزل میں سادہ اخلاقی فلسفہ مع الہیات بھرا ہوا ہے۔ فی الواقع  
 خواجہ نے کوزہ میں دریا بھر دیا ہے۔ اس پر سے لطف بالائے لطف یہ ہے کہ کوئی مصرع کہیں سے  
 غزلیت کے پایہ سے اترا نظر نہیں آتا۔ ایسے ایسے حکیمانہ مضامین کو غزل سرائی کے پیرایہ میں اتنی آسانی  
 کے ساتھ موزوں کرنا یہ خواجہ ہی کا کام ہے بغیر موبد من الشر ہوتے کوئی شاعر یہ لطف کلام  
 پیدا نہیں کر سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی تعلیم نجبی خواجہ کو نصیب ہوئی تھی ورنہ یہ طرز بیان کہاں  
 کسی کو آسکتا ہے۔ صاف ایسا معلوم ہوتا ہے کہ الہام کے ذریعہ سے کلام فرماتے ہیں۔ جیسا کہ خود ان کا  
 فرمودہ ہے۔

دریں آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند  
 آنچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم

دوش دیدم کہ ملایک در میخانہ زدند	گل آدم بسرستند وہ پیمانہ زدند
ساکنان حرم سر عفاف ملکوت	با من راہ نشیں بادۂ ستانہ زدند
جنگ ہفتاد و دولت ہمدرا عذر بند	چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند
آساں بار امانت نتوانست کشید	قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند
نقطہ عشق دل گوشہ نشیناں خوں کرد	ہمچو آں خال کہ بر عارض جاناں زدند
ما بعد خرمن پندار زرہ چوں بردیم	چوں رہ آدم خاکی بہ یکے دانہ زدند
آتش آں نیست کہ ہر شعلہ او خندد شمع	آتش آں است کہ ہر خرمن پروانہ زند

کس چو حافظ نہ کشید از رخ اندیشہ نقاب  
 تا سر زلف عروسان سخن شانہ زدند

غزل کا ہیکو ہے دونوں عالم کی میر ہے، اخلاق تدبیر المنزل تمدن الہیات یعنی کے تمام  
 اقسام فلسفہ و حکمت کے اعلا درجہ کے مسائل ان چند اشعار میں کمال خوبی و لطافت کے ساتھ  
 موزوں کر دیے گئے ہیں۔ پھر طرز بیان لمائی مذاق سے کس قدر دور ہے۔ شاعری ہے کہ ہر پہلو

سے لپٹی پڑی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر چند شعرائے اردو نے شعرائے فارس کی تہج سے اردو کو ایک معقول صورت بخشی ہے مگر جس قدر عہدگی خیالات کی کثرت خواجہ کے دیوان میں دیکھی جاتی ہے اس کا سولہواں حصہ کسی اردو کے شاعر کے دیوان میں نہیں پایا جاتا۔ حافظ کے کلام کو بغور دیکھنے سے کسی اردو کے شاعر کی غزل گوئی باوقار نظر نہیں آتی ہے۔ مقابلہ سے اردو کی غزل گوئی ایسی مختصر ہو جاتی ہے کہ جیسے کوہ ہماہ کے سامنے دہلی کی پہاڑی۔

مژدہ ایدل کے میسا نفے مے آید	کہ زانفاس خوشش پوئے کسے آید
از غم و درد کن نالہ و فریاد کہ دوسٹ	زده ام فالی و فریاد رے مے آید
ز آتش وادی امین نہ منم خرم و بس	موسیٰ لبخا با مسید قیسے مے آید
ہیچکس نیست کہ در کوئے توش کلئے نیت	ہر کس لبخا با مسید ہوئے مے آید
کس ندانست کہ منز لگہ معشوق کجاست	ایں قدر ہست کہ بانگ جرے مے آید
جرہ دہ کہ بہ میخانہ ، ارباب کرم	ہر حریفے ز پئے ملتے مے آید
خبر بلبل این باغ مہر سید کہ من	نالہ می شنوم کز قفسے مے آید
یار ما گر سر پر سیدن بیمار غم است	گو بیا خوشش کہ ہنوزش نفے مے آید

یار دار دسر صید دل حافظ یاراں

شاہبازے ہٹکار گئے مے آید

خواجہ کا کلام فلسفہ و حکمت سے کہیں خالی تو ہوتا ہی نہیں ہے۔ مگر غزل بالا میں یہ شعر یعنی کس ندانست کہ منز لگہ معشوق کجاست۔ کچھ ایسا قول ہے کہ دو ہزار شاعروں کا حوصلہ ٹھنڈا کر دینے والا ہے۔ یہ شعر نہیں ہے خدا جانے کیا ہے بنی آدم میں جو محقق سے محقق شخص گزرا ہے اور جو آئندہ گزرنے کا معرفت الہی میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ تمام علوم انسانی کی مدد سے اسی قدر درک میں آ سکتا ہے کہ جتنا خواجہ فرما گئے ہیں کسی رتبہ کا عالم الہیات ہو اگر اسے ذات باری تعالیٰ کی حیانت ہوگی تو اتنی ہی ہوگی کہ وہ ہے مگر کیلے اور کہاں ہے اور کس طرف ہے اس کی حقیقت کا انکشاف امکان سے باہر ہے۔ پس جلتے لحاظ ہے کہ خواجہ نے آدمی کی مجبوری عرفان کو کس خوبصورت پیرایہ میں بیان فرمایا ہے۔ ملٹن نے بھی مضمون عرفان کو لکھا ہے اور کوئی شک نہیں خوب لکھا ہے۔ مگر خواجہ کا بیان ملٹن کے بیان پر بہت غالب نظر آتا ہے اس شعر کی غزلیت عجب لطف رکھتی ہے اور اعلیٰ مضمون کے تقاضے کے مطابق طرز بیان کس قدر پُر وقار دکھائی دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خواجہ وہ شاعر



ہیں کہ ہرچند اصناف شاعری سے صرف ایک صنف شاعری یعنی غزل گوئی کے برتنے والے ہیں مگر اس ایک صنف میں انھوں نے دونوں عالم کی سیر دکھائی ہے۔ لاریب اگر خواجہ نہ ہوتے تو فارسی کی شاعری کو اس قدر بلند پائے کی نصیب نہیں ہوتی حقیقت یہ ہے کہ حافظ اور سعدی فارسی شاعری کی جان ہیں۔ یاد آئیں ہیں جن سے شاعری کا چہرہ باز یگانہ نظر اہل نظر ہو رہا ہے ماقم کی کیا طاقت ہے کہ خس برابر بھی خواجہ کی ثنا خوانی کر سکے۔ خاموشی لڑھکائی تو حد نہ تھے تو پر عمل پیرا ہو کر اب حضرت سعدی کی غزل غزل گوئی کی طرف حضرات ناظرین کی توجہ کا طالب ہے۔

## سعدی

مصلح الدین نام نامی ہے اور سعدی تخلص آپ خواجہ حافظ کی طرح شیراز دہن ہیں۔ سوتہ ہیں خواجہ کی وفات کے قبل رحلت فرمائی۔ جیسا کہ کتابوں سے معلوم ہوتا ہے۔ شیخ کی وفات ۷۹۸ھ میں واقع ہوئی اور حافظ کی ۸۱۷ھ میں، سعدی کی نسبت بعض محققین سے لکھتے ہیں کہ غزل کے موجد حضرت ہیں۔ مگر یہ قول صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اس لیے کہ مولانا روم و نظامی و بعض دیگر شعراء کی بھی غزلیں دیکھی جاتی ہیں اور یہ حضرات قبل شیخ کے رحلت فرما چکے تھے لیکن اگر غزل گوئی کے کسی خاص ننگ کے موجد حضرت قرار دئے جائیں تو دورانِ صحت نہ ہوگا۔ بہر حال غزل سمرانی کی حیثیت سے حضرت سعدی حضرت حافظ کو نہیں پہنچتے ہیں۔ ہر چند شیخ کے کلام میں شوخی و ملامت وغیرہ ہے اور شیخ فلسفہ اخلاقی کے ماہر اور فلسفہ اخلاقی کے برائے معلم بھی گزرے ہیں۔ مگر حضرت میں خواجہ کے اعتبار سے غزل گوئی کا مادہ کم موجود تھا اس لیے اپنی اطلاع فلسفہ و حکمت کو پیرایہ شاعری میں اس خوبی کے ساتھ نہیں بیان فرما سکتے۔ جیسا کہ خواجہ اس امر پر قادر نظر آتے ہیں۔ بعض غزلیں حضرت سعدی کی نہایت حکیمانہ رنگ کے ساتھ بڑی غزلیت سے معمور دیکھی جاتی ہیں۔ مگر دیوان کا دیوان خواجہ کے دیوان کی طرح انتخاب کا حکم نہیں رکھتا۔ بعض کلام تو ایسا ہے کہ اس میں غزلیت کی تو بوجہ نہیں پائی جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی واعظ صاف صاف نظم میں ارشاد فرما رہا ہے۔ خیر غزل گوئی میں جو کچھ شیخ خواجہ سے کم ہوں۔ مگر شیخ کا مذاق بحیثیت تنوع خواجہ کے مذاق پر ہزار درجہ زیادہ غالب تھا۔ بلکہ خواجہ میں تنوع کا لطف گویا کچھ نہ تھا۔ خواجہ ایک فنی تھے اور شیخ ہزار فنی لیکن اس کے ساتھ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ خواجہ کی ایک فنی حوصلہ انسانی سے باہر معلوم ہوتی ہے۔ گو شیخ کی شاعری کا تنوع بھی ایک نہایت حیرت افزا امر ہے فقیر کے خیال میں سعدی کے مقابلہ کا کثیر المذاق شاعر فارسی جس کوئی نہیں



گزارا ہے۔ اس قدر صاف اور شفاف دماغ فردوسی نہ نظامی، نہ انوری، نہ سنائی اور نہ فارس کے اور کسی نامی شاعر کا ہے نظم و نثر دونوں کی یہ حالت ہے کہ اکثر قول ضرب المثل کا حکم رکھتے ہیں۔ ایسی مقبولیت کسی ناظم یا نثر کے کلام کو حاصل نہیں ہے۔ حق تو یہ ہے کہ سعدی تمام شعراء و نثرانِ عجم پر غالب ہیں۔ لیکن غزل گوئی میں صرف خواجہ حافظ سے کم ہیں۔ ظاہراً یہ امر تعجب انگیز معلوم ہوتا ہے کہ شیخ علم و فضل میں خواجہ سے کم نہ تھے۔ اور مذاق شاعری ہر قسم کا رکھتے تھے۔ علاوہ اس کے سیر و سفر سے و فور اطلاع کی صورت بھی پیدا کی تھی اس پر بھی حافظ سے غزل گوئی میں کم کیوں کر رہ سکے۔ اس کی وجہ یہ بیان کی جاسکتی ہے کہ غزل گوئی کے لیے ایک خاص صلاحیت درکار ہے۔ علم و فضل کثیر المذاق اور جہاں گردی کو کوئی خصوصیت اس صنف شاعری کے ساتھ نہیں ہے۔ آدمی عالم سے عالم حکیم سے حکیم نہایت کثیر المذاق اور بڑا سیاح ہو سکتا ہے۔ اس کے یہ سب کمالات صلاحیت خلقی کی کمی کی حالت میں غزل گوئی کو مطلق معین نہیں ہو سکتے۔ بلکہ غزل گوئی کے لیے سیر و سفر کی کوئی حاجت ہی نہیں۔ خواجہ نے خوب کیا کہ شاہ دکن کی دعوت قبول نہ فرمائی۔ اس سفر ہندوستان سے ان کی غزل گوئی کو کوئی فائدہ مترتب نہ ہوتا بلکہ یہ سفر اور شاہی تقرب بہت کچھ ان کے کمالات کا خارج ہوتا۔ جاننا چاہیے کہ غزل گوئی وہ صنف شاعری ہے کہ جس میں جہاں گشتی کی کوئی حاجت نہیں اس سبب سے کہ غزل گوئی کو ان امور سے تعلق ہوتا ہے جو محض داخلی پہلو رکھتے ہیں غزل گو کا مطلع نظر اس کا دوون ہوتا ہے۔ اسے عالم خارج کے مشاہدہ کی کوئی محتاجی لاحق نہیں رہتی۔ غزل گوئی غزلت نشیں کا شیوہ ہے جہاں گردی اس کے دائرہ احتیاج سے باہر ہے۔

خلوت گزید را بہ تماشہ چہ حاجت است      چوں روئے یار بہت بھرا چہ حاجت است  
لیکن چوں کہ حضرت شیخ کو شاعری کا مذاق بطرز تنوع حاصل تھا اگر سیر و سفر سے تمتع کثیر حاصل نہ فرمالتے تو مختلف اصناف شاعری پر قادر نہ ہو سکتے، جیسا کہ خود فرماتے ہیں ۷  
تمتع ز ہر گوشہ یافتم      ز ہر خرمن خوشہ یافتم

حضرت شیخ علیہ الرحمۃ کا ذکر ہر صنف شاعری کے ساتھ آئے گا۔ اس لیے اس جگہ پر وہی باتیں عرض کی جاتی ہیں کہ جو غزل گوئی سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور اباب واقفیت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ شیخ کے کلام میں عموماً دلفریبی، تاثیر، سوز و گداز، شوخی، نمکینی، شیرینی بدرجہ کثیر پائی جاتی ہے۔ پس ان صفتوں سے حضرت کی غزل گوئی بھی خالی نہیں دیکھی جاتی ہے۔ ان کی غزل سرائی میں ان کی آداد مزاجی سیر حشبی، قناعت، اخلاق، بلند حوصلگی وغیرہ کا اثر بھی بین طور پر پایا جاتا ہے۔ اور مختصر ہے کہ



غزل گوئی میں بھی حضرت کو ایسا دخل معلوم ہوتا ہے بعد خواہ کے حضرت ہی کا درجہ نظر آتا ہے۔ کچھ غزلیں نمونہ کے طور پر نذر ناظرین ہوتی ہیں۔

صوفی نہ شود صافی تا در نہ کشد جامے	بسیار سفر باید تا پختہ شود خلمے
ہر یک قلمی رفتہ است بروے سہرا جامے	گر پیر مناجاتی در رند خسرایابی
ہر کس علی دارد ما گوش بہ انعامے	فردا کہ خلایق را دیوان جزا باشد
تو عشق گلے داری من عشق گل اندامے	اے بلبل اگر نالی من با تو ہم آواز م
آنا کہ ندید ستم سروے لب بامے	سرو لب جوئے گویند چہ خوش باشد
وین عید نمی باشد الا بہر ایا مے	روزے سمرن مینی قسربان سرکوش
آخر ز دُعا گوئے یاد آ رہ دشنامے	اے در دل ریش من مہر ت چوں رواں دتن
ورنہ کہ برد ہیہات از ما تو پیغامے	باشد کہ تو خود روزے از ما خبرے پُرسی
نومید نشاید بود از روشنی بامے	گر چہ شب مشتاقاں تاریک بود اما

سعدی لب دیا دردانہ کجا یابی

در کام نہنگاں روگر میطلبی کامے

بلاشبہ یہ غزل غزلیت کی بہت خوبیاں رکھتی ہے۔ مگر حافظ کی حیرت انگیز ترکیبوں کو نہیں پہنچتی ہے۔

خو برویان جفا پیشہ وفا نیز کنند	بہ کساں درد فرستند و دوا نیز کنند
بادشاہاں ملاحظہ چو بہ نچسیر روند	صید را پاتے بہ بندند و رہا نیز کنند
نظرے کن بمن خستہ کہ ارباب کرم	بہ ضعیفان نظراں بہر خدا نیز کنند
عاشقاں راز در خویش مراں تا بر تو	سرو زہر بر تو نشانند و دُعا نیز کنند
گر کند میل بخوباں دل من عیب مکن	کیں گناہیست کہ در شہر شہا نیز کنند
بوسہ نان ذہن تنگ بدہ یا بفروش	کیں مٹا عیست کہ بخشد و بہا نیز کنند
تو خطائی پچہ از تو خطا نیست عجب	کانکہ از اہل صواب اند خطا نیز کنند
گر بر آید زباں نام منت با کے نیست	بادشاہاں بغلط یاد گدا نیز کنند

سعدیا گر نہ کند یاد تو آں ماہ مرنج

ماکہ باشیم کہ اندیشہ ما نیز کنند

یہ غزل غزل کا پورا حکم رکھتی ہے۔ گو مذاق کلام حافظ سے علاوہ ہے ظاہر ہے کہ اس لطف کی غزلیں سعدی کے دیوان میں سب ہی نہیں ہیں مگر یہ ایک غزل ایسی ہے کہ سعدی کے استاد غزل گوئی کے مانے جانے کو کافی ہے۔ اس غزل میں غزل سابق کے اعتبار سے داخلی مضامین زیادہ ملحوظ رہے ہیں اس لیے اس میں حسن مقبولیت بھی زیادہ ہے اب میں اور شعرائے متغزلین کی غزلیں مندرج ذیل کرتا ہوں کہ باوجود مختلف المذاق ہونے کے لطف غزلیت سے خالی نہیں ہیں۔

### غزل: جامی

اے ترک شوخ ایں ہمناز و عتاب چیت	بادل شکستگان تم بے حساب چیت
از مدرسہ بہ کعبہ روم یا بہ میسکہ	اے پیراہ گبو کے طریق صواب چیت
خنجر کشیدہ از پے قلم شتافتی	خود کشتہ یشویم ترا اضطراب چیت
گفتی شبے بخواب تو آیم دلے چہ سود	چون من بعر خویش ندانم کہ خواب چیت
بے تو ز ضعف قوت جنبید غم نماسد	در حیرتم کہ در دلم ایں اضطراب چیت

جامی چہ لات میسزنی از پاکدامنی

بر خرقہ تو ایں ہمہ داغ شراب چیت

لما جامی بھی مذاق غزل گوئی رکھتے ہیں اور ان کے دیوان میں بہت اشعار ایسے دیکھے جاتے ہیں کہ لطف غزلیت سے خالی نہیں ہیں۔ مگر تمام دیوان کی یہ کیفیت نہیں ہے۔ فقیر کی دانست میں جامی کی غزل گوئی سے ان کی مثنوی نگاری زیادہ خوب صورت ہے۔

### غزل: فغانی

نخل قد است کہ از چمن جاں برآمدہ	شاخ گلے بہ صورت انساں برآمدہ
از فرق تا قدم ہمہ جانست آن نہال	گویا ز آب چشمہ حیواں برآمدہ
اکنون توئی جمال جہاں گرچہ مس ازیا	آوارہ جمال ز کنساں برآمدہ
بر ہر زین کہ جلوہ کناں رفتہ بہ ناز	آہ از نہاد کبک خسراں برآمدہ
فندیہ چوں بہ شمع رخت کردہ ام نگاہ	از دل ہزار شعلہ پنہاں برآمدہ
بہر نظاۃ گل روئے تو در چمن	گل ہر طرف ز شاخ درختاں برآمدہ



مست مئے شبانہ مد من ز خواب ناز با آفتاب دست و گریباں برآمدہ  
 در ہر چین کہ گفتہ فغانی سرود غم  
 افغان ز بلبلان خوش الحان برآمدہ  
 یہ غزل ایک عمدہ نمونہ غزل سرائی کا ہے۔ لاریب بابا فغانی نے اس غزل میں پوری داد عاشقانہ  
 رنگ کی غزل سرائی کی دی ہے۔ سبحان اللہ کیا کہنا ہے۔

### غزل: خسرو

جان ز تن بردی و در جانی ہنوز	درد ہا داری و در مانی ہنوز
آشکارا سینہ ام بشگافتی	ہمچنان در سینہ پنہانی ہنوز
ملک دل کردی خراب از تیغ ناز	داندیریں دیرانہ سلطانی ہنوز
ہر دو عالم قیمت خود گفتہ	نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز
خون کس یارب نگیرد دامن	گرچہ در خون ناپیشیانی ہنوز
ماز گریہ چوں نمک بگداخستم	تو ز خندہ شکرستانی ہنوز
جاں زنبد کالبد آزاد گشت	دل بہ گیسوئے تو زندانی ہنوز

پیری و شاہد پرستی ناخوش است

خسرو تا کہ پریشانی ہنوز

خسرو سعدی کے جواب سمجھے جاتے ہیں۔ کوئی شک نہیں ہے کہ خسرو میں سعدی کا انداز ہے۔ مگر اس کی غزل سرائی سعدی تک نہیں پہنچتی ہے۔ بہر حال کوئی شک نہیں کہ خسرو بہت اچھے غزل گو ہیں۔ گو ان کا تمام دیوان حافظ کی طرح لطف غزلیت سے بھر ہوا نہیں ہے۔ لوگ خسرو کو ہندی کہتے ہیں مگر وہ ہندی مرزا بیدل اور قتیل کی طرح نہ تھے۔ ان کا شمار اہل زبان میں بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ کس واسطے کہ جس عہد میں وہ زندہ تھے اس میں فارسی کے ہوا ہندوستان میں مسلمان کوئی دوسری زبان نہیں بولتے تھے اور اہل زبان کی بڑی کثرت تھی۔

### غزل: ابلی شیرازی

خوش آنکہ نوباد آتی و ن پاتے تو بوسم در سجدہ صنم خاک قدم ہاتے تو بوسم

ہر جا کہ تو روزے نفسے جسائے گرفتی      آنجا روم و گریہ کناں جاتے تو بوسم  
 روئے تو تصور کم و لالہ و گل را      در حسرت رخسار دل آراتے تو بوسم  
 ہر جا کہ غزلیست چوں مجنوں سر و پیش      در آرزوئے نرگس شہلاتے تو بوسم  
 من اہلی درویش و تو آں شاہ بانی  
 دستیگہ بوسم بہ تمنائے تو بوسم

یہ غزل نہایت عاشقانہ رنگ رکھتی ہے گو حافظ کی حکمت آموزی کا حسن اس میں نہیں ہے تو بھی اس کے ایک عمدہ نمونہ غزل گوئی ہونے میں کوئی گفتگو نہیں ہو سکتی اگر کسی شاعر میں غزل سرائی کی اتنی بھی صلاحیت نہیں ہے تو بہتر ہے کہ اور اصناف شاعری کو اختیار کرے۔

### غزل: مرزا علی قلی خاں میلی

گو بخت آنکہ یار شکایت ز من کند      چند آنکہ مدعی نہ تواند سخن کند  
 گر دو ہزار پارہ گرفتار نا امید      گر شکوۂ دلم ز تو بیان شکن کند  
 گر ہم سرگرائی او نیست غیرا      منم چرا ز ہر ہی خویشی کن کند  
 آں طالع کجاست کہ از پہلوئے رقیب      قتل مرا بہانہ بر خاستن کند  
 او میکند سوال و مراد در جواب او      از اضطراب دل نہ تواند سخن کند

میلی ہزار حیف کہ آں مے پرست را

ذوق شراب ساقی ہر انجمن کند

یہ غزل نہایت شوخ رنگ رکھتی ہے۔ اور غزل گوئی کی ایک اچھی مثال ہے اگر اتنا بھی کسی شاعر نے شوخ طبیعت نہیں پاتی ہے تو اسے لازم ہے کہ غزل گوئی کو خیر باد کہے۔

### غزل: ابوطالب بہدانی کلیم

نہ ہیں مے رمد آں نوگل خنداں از من      می کشد خار دیریں باد یہ دامان از من  
 بامن آمیزش او الفت موج است و کنار      روز و شب بامن و بیوستہ گریزاں از من  
 قمری ریختہ بلم بہ پناہ کہ روم      تاجکے سر کشی اے سرو خرامان از من  
 چہ کلم بہ خموشی بہ تبسم بہ نگاہ      میتواں برد بہر شیوہ دل آسان از من



نست پرہیز من از زہد کہ خاکم بر سر ترسم آلودہ شود دامن عصیاں از من  
گرچہ موم دلے آں حوصلہ با خود دارم کہ بخشم بودار ملک سلیمان از من  
اشک بہودہ مرزیاں ہمہ ازدیدہ کلیم  
گردغم را نتوان شست بطوفاں از من

یہ غزل بھی غزل سرائی کا ایک نمونہ ہے کلام میں شوخی، متانت طبیعت داری سب کچھ موجود ہے  
حقیقت یہ ہے کہ کلام وہی ہے جس کی تاثیر دل پر پیدا ہو۔ ورنہ مجرد مضمون خیزی لطف غزلیت  
نہیں پیدا کر سکتی ہے۔

### غزل: ہلالی

این است کہ خون کردہ و دل بردے را بسم اللہ اگر تاب نگہ ہست کسے را  
دیدیم ز یاران وفا دار بے را لیکن چو سگان توندیدیم کسے را  
قطع ہوس و ترک ہوا کن کہ دریں راہ چنڈاں اثرے نیست ہوا و ہوسے را  
فریاد کہ فریاد کشیدیم و ندیدیم در بادۂ عشق تو فریاد سے را  
تا اذ لب شیریں مکیساں کام گرفتند گیرند بہ از خیل ملائک مگسے را  
زاں نظر افتاد رقیبے عجبے نیست در دیدہ خود رہ نتوان دادخسے را

پیش سگش این آہ و فغاں چیت ہلالی  
از خود مکن آزرده چنین ہم نفسے را

ہلالی میں بھی غزل گوئی کا لطف پایا جاتا ہے اگر غزل میں غزلیت نہ ہو تو پھر اُسے کوئی اور شے  
کہیں گے۔ غزل نہیں کہیں گے۔ واضح ہو کہ ان تمام غزلہائے بالا میں مختلف المذاقی پائی جاتی ہے۔  
مگر کوئی غزل لطف غزلیت سے خالی نظر نہیں آتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ شعراء وارداتِ قلبیہ  
اور امور ذہنیہ کو تمام ترتبعیت فطرت کے ساتھ اپنی غزلوں میں حوالہ قلم فرماتے گئے ہیں اور  
جس قدر ممکن تھا تشبیہ استعارہ اور مبالغہ سے کناہ کش رہے ہیں۔

### غزل: شیخ محمد علی حزیں

دل درخیم زلف او سودائے دگر دارد با سلسلہ دیوانہ غوغائے دگر دارد

صحرائے طلب درد بر ہر قدمے طورے      ہر سنگ دریں وادی موسائے دگر دارد  
افلاک نگہبان عشق تو نے باشد      ایں بادۂ زور آور مینائے دگر دارد  
در مجلس مایک کس ہشیار نمی گردد      در جام مگر ساقی صہبائے دگر دارد  
گر عشق نہاں باز با خود عجبے نمود      در پردۂ دل مجنوں لیلائے دگر دارد

پیداست حزیں مارا از دلق مے آلودش

کیں رند خسرا باقی تقویٰ لے گد دارد

حزیں میں بھی غزل گوئی کا اچھا لطف پایا جاتا ہے۔ مذاق غزل گوئی ان کا تصوف آمیز ہے مزاج میں فقر کی طرف بھی میلان بہت تھا۔ ہرچند اہل زبان سے ہیں۔ مگر اہل ایران ان سے بالکل ناواقف ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وطن سے نکل کر ہندوستان میں چلے آئے تھے اور ہندوستان میں رہ گئے۔ مزار شیخ کا شہر بنارس میں ہے۔ فقیر جب عنفوان شباب میں وہاں کے کالج کا ایک طالب علم تھا تو اکثر فاطمان میں جہاں وہ آسودہ ہیں جایا کرتا تھا۔ زمانہ یاد آتا ہے اور عمر گزشتہ کی دل میں حسرت ہوتی ہے۔ عاجز نے شیخ کے دیوان کو اول اول اسی زمانہ میں دیکھا تھا۔ اچھا فرماتے ہیں انداز کلام حافظ اور سعدی سے مرکب معلوم ہوتا ہے۔ مگر ان حضرات کی سخن سنجی تک ان کی طبیعت داری نہیں پہنچتی ہے قبل اس کے کہ شعراء فارس کی غزل گوئی کی بحث اختتام کو پہنچائی جائے۔ کچھ ان شاعروں کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے جو ہندی وطن ہو کر فارسی میں بھی نام برآوردہ نظر آتے ہیں۔ ان میں سے مشہور یہی حضرات ہیں۔ مرزا عبدالعتاد بیدل واقف پٹیلالوی مظہر جان جاناں، سراج الدین علی خاں آرزو، قتیل اور غالب۔ واقف پٹیلالوی نے حزیں کو دیکھا تھا۔ اور مذاق غزل گوئی اچھا رکھتے تھے۔ مرزا بیدل ہندوستان میں ایک مشہور فارسی گو شاعر ہیں۔ ہر ہندوستانی وطن جو فارسی سے آشنائی رکھتا ہے۔ ان کے کلام سے کچھ نہ کچھ واقف ہے۔ مرزا بیدل کا فارسی دیوان چھپ بھی گیا ہے مگر ان کی غزل سرائی فقیر کو پسند نہیں ہے۔ علاوہ اس کے زبان میں تصرفات کر جاتے ہیں غزلوں میں ایسے ایسے استعارات اور نازک خیالوں سے کام لیتے ہیں کہ غزل سرائی کا لطف قائم نہیں رہتا۔ مظہر جان جاناں کا کلام اچھا ہے۔ مگر اس درجہ کا نہیں ہے کہ ان کا شمار ممتاز غزل گویوں میں کیا جائے۔ خان آندو ایک محقق شخص ہیں مگر شاعری کے لیے طبیعت پورے طور سے مناسب نہیں پاتی تھی۔ قتیل میں غزل سرائی کا مادہ ہے مگر وہ اپنے اس مادے سے کام نہ لے سکے۔ غالب تو ان کے کچھ بھی معتقد نظر نہیں آتے ہیں۔



بلکہ بڑی بے اعتنائی سے انہیں یاد کرتے ہیں۔ جیسا کہ ان کا خود قول ہے۔  
گرچہ بیدل زابل ایران نیست لیک ہجو قتیل ناداں نیست

## غالب

خیر قتیل جو کچھ ہوں خود غالب فارسی کے اچھے غزل سرا نظر نہیں آتے۔ شک نہیں کہ غالب کو فارسی کی معلومات بہت ہے اور شاعری کا مادہ بھی بہت رکھتے تھے مگر ان کی فارسی کی غزل سرائی غزل سرائی کا حکم نہیں رکھتی ہے جس غزل کو دیکھتے ان کی مضمون آفرینی خلاق سخن پردازی نازک خیالی زور آوری وغیرہ عیاں ہے مگر ان کی تمام فارسی غزلوں میں صرف دس پانچ ہی شعر ہوں گے جو غزلیت کا لطف رکھتے ہوں گے۔ ورنہ دیوان کا دیوان حسن مقبولیت سے خالی نظر پڑتا ہے اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ استعارات وغیرہ سے بہت کام لیتے ہیں جو سچی غزل گوئی کی شان سے بہت بعید ہے۔ فقیر حضرت کا بہت معتقد ہے یعنی ان کو ایک بڑا شاعر گرامی جانتا ہے مگر افسوس ہے کہ ان کی فارسی کی غزل سرائی کو اپنے دل پر تاثیر پیدا کرتے نہیں پاتا ہے حضرت کی غزلوں کے اشعار بیشتر قصیدہ نما معلوم ہوتے ہیں اور کچھ ایسی خاص ترکیب رکھتے ہیں کہ ان سے وہ حظ دل کو نصیب نہیں ہوتا۔ جو غزل سرائی کا تقاضہ ہے کچھ غزلیں حضرت کی نذر ناظرین ہوتی ہیں۔

لعل تو خستہ اثر التماس کیست	بخت من از تو شکوہ گزار سپاس کیست
گیرم ز داغ عشق تو طرفے بہ پشت دل	ایم نہ بس بود کہ جگر روشناس کیست
لزم بہ کوئے غیر ز بیتابی نسیم	کاندر امید واری بوتے لباس کیست
با او بسا وصلے دامن بہ عزم قفل	آہ ازا امید غیر کہ ہم چشم یاس کیست
از بیکسان شہرم و از ناکسان دہر	گر کشتہ سر تو سلامت ہر اس کیست
از پرنیاں بعربہ راضی نہ می شود	خار رہ تو چشم براہ پلاس کیست
لطف بشکوہ از ہوس بے شمار من	شو قم بہ نالہ از ستم بے قیاس کیست
گیرم کہ رسم عشق من آوردہ ام بدہر	ظلم آفریدہ دل ناحق شناس کیست
صحن چمن نمونہ بزم فراغ تو	باد سحر علاقہ ربط حواس کیست

غالب بت مرا نگہ ناز محط نیست

تا بامنش مضائقہ چندیں بیاس کیست

غزل کی غزل پڑھ جائیے کسی شعر یا مصرع میں اتنی قوت نہیں ہے کہ تڑپا دے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خاص ترکیب میں ایسے مضامین موضوع کیے گئے ہیں کہ ان کو دل آویزی سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے اس بے تاثیر کی وجہ یہ ہے کہ ان اشعار میں کوئی مضمون ایسا نہیں باندھا گیا ہے کہ جو انسان کے کسی بڑے معاملہ قلبی سے خبر دیتا ہو۔ اور کوئی معاملہ قلبی بیان بھی ہوا ہے تبعیت فطرت سے علاوہ ہو کر اور ایسی ترکیب زبان کے ساتھ کہ جو بے ضرورت دشوار ضرورت ہے۔ ایسا کلام ضرب المثل کی تاثیر پیدا نہیں کر سکتا اور نہ اس کے مضامین پڑھنے والے کے ذہن میں ہمیشہ موجود رہ سکتے ہیں۔ جتنے غیر فطری اشعار ہیں انکار یہی حال ہوتا ہے کہ فوراً پڑھنے کے بعد یاد سے جاتے رہتے ہیں۔ اور کوئی تاثیر دل پر نہیں چھوڑ جاتے فقیر کے دل کا تو یہی حال ہے بہت بار اس عاجز نے اس غزل کو دیکھا ہے اور بے تاثیر کے اعتبار سے یہ ہر بار نئی معلوم ہوتی ہے برخلاف اس کے مسبق الذکر شعرائے مغربین کی غزلوں کی کیفیت دیکھی جاتی ہے کہ کم و بیش طور پر ان کا اثر قلب پر رہ جاتا ہے اور اگر نہ رہ جاتے تو آتی اثر ضرور ہوتا ہے۔ بخلاف اس غزل کے کہ اس میں پائیدار یا غیر پائیدار کس طرح کا اثر پایا ہی نہیں جاتا۔ حضرت غالب کی اکثر فارسی غزلوں کا یہی طور ہے۔ الا صرف دس پانچ اشعار کہ غزلیت کا پورا رنگ رکھتے ہیں۔ جس کے باعث ان کی پُر تاثیر معروض گفت گو میں نہیں آسکتی میں وغیرہ میں اور بھی ذیل میں عرض کرتا ہوں ایک حافظ کی زمین ہے اور دوسری سعدی کی۔

بتان شہر تم پیشہ شہر یا رانند	کہ درستم روش آموز رو گداز رانند
بند دل بہاولے کہ کس گماں نہ برد	فغاں ز پردہ نشیناں کہ پردہ دارانند
بجنگ تاجہ برد خونے دلبر آں کایں قوم	در آشتی نمک زخیم دل فگار انند
نہ زناغ و کشت شناسد نئے حدیقہ و باغ	ز بہر بادہ ہوا خواہ بادو بارانند
ز وعدہ گشتہ پشیمان و بہر دفع لال	امیدوار بہ مرگ امید دارانند
زردے خویش و منش نور دیدہ آتش	بہ رنگ و بونے جگر گوشہ بہار انند
تو سرمہ بیس و ورق در نور و دم و کش	میں کہ سحر نگاہان سیاہ کارانند
ندید و داد مزین حرف خسرو سالانند	بہ گرد راہ منہ چشم نے سوارانند



زچشم زخم بدیں حیلہ کے رہی غالب  
دگرگو کہ چومن درجہاں ہزارا نند

یہ زمین خواجہ کی ہے آپ فرماتے ہیں۔

غلام زرگس مست تو تاجدارا نند خراب بادہ لعل تو ہوشیارا نند  
کہاں یہ مطلع اور کہاں یہ مطلع

بتان شہرا لخ . . . . . چراغ مردہ کجا شمع آفتاب کجا  
اسی طرح اور بھی کچھ قافیہ غزل ہالامیں ہیں جنہیں حافظ نے بھی باندھا ہے۔ ان قافیوں کے  
اشعار دونوں غزلوں سے موازنہ کی نظر سے درجہ ذیل ہوتے ہیں۔

غالب :-

حافظ :-

ترا حیا و مرا آب دیدہ شد غماز بر بند دل بہ اداتے کہ کس گماں نبرد  
وگر نہ عاشق و معشوق رازدارا نند فغاں ز پردہ نشیناں کہ پردادارا نند  
حافظ کے شعر کی خوبی آشکارا ہے۔ اول تو یہ شعر تبعیت فطرت سے خبر دیتا ہے۔ دوم یہ کہ اس کا  
مضمون ایسی خوش ترکیبی سے حوالہ قلم ہوا ہے کہ اس کا سمجھنا زحمت خیز نہیں ہے۔ تیسری  
بات یہ ہے کہ ملاحظہ نمائیں، شوخی، شیرینی ایسی ہے کہ دل ہی چاہتا ہے کہ سوار اس شعر کو پڑھتے  
رہے۔ بخلاف اس کے غالب کا شعر ہے کہ اس میں یہ سب کوئی لطف نہیں ہے بلکہ دوسرے مصراع  
کو دوچار بار پڑھتے تو بالکل بے مزا ہو جاتا ہے بڑا حسن اس شعر کا یہ ہے کہ پردہ نشینوں کو پردہ  
وار کر کے دکھایا ہے۔ اس میں کیا بڑی مضمون آفرینی ہے یا بڑی غزلیت ہے۔ ظاہر کچھ نہیں  
معلوم ہوتا ہے حکمت و فلسفہ سے تو اس شعر کو بحث ہی نہیں ہے جیسا کہ اس غزل کے اور اشعار  
کو کوئی علاقہ نہیں ہے۔

غالب :-

حافظ :-

نصیب است بہشت ایندا شناس بر و بنگ ناچ بود خوے دلبراں کیں قوم  
کہ مستحق کرامت گنہاہ گارا نند در آشتی نمک زخم دلفگار ا نند  
چوں کہ گامان کا قافیہ دونوں شعر ہالامیں بندھا ہے اس لیے راقم نے ان دونوں شعر کو مقابلہ  
میں لکھ دیا۔ خیر اب دونوں شعروں کے لطف مضمون اور حسن بیان پر غور فرمائیے۔ حافظ کا

شعر جیسا کہ عموماً فطری رنگ رکھتا ہے زیور سادگی سے آراستہ دیکھا جاتا ہے کبھی مسئلہ حکمت و فلسفہ پر مبنی ہوتا ہے اور غزلیت میں ڈوبا رہتا ہے ویسا یہ شعر بھی ہے۔ بلکہ اس شعر میں خواجہ نے بہت سے مسائل دین و اخلاق کو بڑے آسان پیرایہ میں فرما دیا ہے۔ اس شعر کی کیفیت عرض کر کے غالب کے شعر کی طرف توجہ فضول ہے۔ مسائل علیہ سے تو کوئی بحث ہی نہیں ہے مضمون آخری کے اعتبار سے بھی چنداں شکل امتیاز نہیں رکھتا ہے۔

حافظ :- غالب :-

بیابان میسکہ و چہرہ ارغوانی کن تو سرمہ بین و ورق در نور دوم در کش  
مرد بصومعہ کا بجا سیاہ کارا نند میں کہ سحر نگاہاں سیاہ کارا نند  
تو دستگیر شوائے حفر پے نجمہ کہ من زوید و واد مزین حریف خرمہ سالانند  
پیادہ می روم و ہمسراں سوارا نند بہ گرد راہ من چشم نے سوارا نند  
اب موازنہ ہی فضول ہے ناظرین موازنہ کی زحمت سے عاجز کو معاف فرمائیں۔ اے حضرات نکتہ  
داں حافظ کی شہرت بے وجہ نہیں ہے۔ اگر کوئی شاعر و داغ حکیمانہ نہ رکھتا ہو تو کبھی حافظ کی  
راہ میں قدم نہ رکھے۔ مجرد بانڈانی یا معلومات سے حافظ کی سی شاعری نصیب نہیں ہو سکتی۔

غزل : غالب

دلستاناں نخلند ارچہ جفا نیز کنند از وفائے کہ نہ کردند حیا نیز کنند  
چون بینند بہ ترسند وہ یزداں گردند رحم خود نیست کہ بر حال گر نیز کنند  
خستہ آجاں نہ دہد وعدہ دیدار دہند عشوہ خواہند کہ در کا قضا نیز کنند  
خون ناکامی سی سالہ ہر خواہد بود مہربانا اگر از بہر خدا نیز کنند  
اندراں روز کہ پُرسش رود از ہر چہ گذشت کاش بام سخن از حسرت مانیز کنند  
ز درختان خزاں دیدہ بنا شمع کانہہا ناز بر تازگی برگت و نوا نیز کنند  
گر بود کو تہی از عمر تو دانی و اجل گفتہ کار بہ ہنگام روا نیز کنند  
نہ شوی رنجہ زنداں بصیرتی کایں قوم نفس باد سحر غالیہ سا نیز کنند  
گفتہ باشی کہ زما خواہش دیدار خطاست ایں خطائے ست کہ در روز جزا نیز کنند



خلق غالب نگرود ششہ سعدی کہ مرد  
خوب رویاں جفا پیشہ وفا نیز کنند

سعدی کی غزل کے ساتھ اس غزل کا موازنہ ہی فضول ہے۔ کیوں حضرت غالب نے اس زمین میں  
غزل لکھی۔ اس کی ضرورت نہ معلوم ہوتی۔ اس غزل میں صرف ایک شعر قابلِ توجہ ہے اور وہ یہ ہے  
اندریں روز پریش بود ز ہرچہ گزشت کاش با سخن از حسرت مانیز کنند

اس شعر کے سوا جتنے اشعار ہیں زمینہار اس قابل نہیں ہے کہ سعدی کے اشعار کے ساتھ بڑھے  
جانے کا استحقاق رکھتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ غزل سرائی بہت دشوار چیز ہے۔ یہ بڑے حکیم کا کام  
ہے اور وہ بھی وہ حکیم جس نے غزل سرائی کی خلقی صلاحیت پائی ہے۔ اگر مجر د حکیم بآی غزل گوئی  
کی مقاضی ہوتی تو ارسطو، بوعلی سینا، ملا صدرا، یہ سب کے سب غزل گو ہوتے۔ غزل گوئی خاقانی،  
مولوی معنوی، اور انوری کو تو نصیب ہی نہ ہوتی جو بڑے درجہ کے شعراء گذرے ہیں۔ مگر حضرت  
غالب پر بہت تعجب گزرتا ہے۔ کہ آپ اردو کے نہایت اچھے غزل گو ہیں۔ مگر ان کے دیوان سے  
وہ اشعار خارج کر دئے جاتیں کہ جو کثرت اشعارات و کثرت اضافات و کثرت اخلاق سے بد نما  
نظر آتے ہیں تو ان کے اردو کے کلام منتخب کا جواب نہیں پایا جائیگا۔ بہت جاتے حیرت ہے کہ ان کی اردو  
کی غزلیں سوز و گداز و حسرت و دل گرفتگی و پرتائیری کے مزے سے قریب قریب میر کی  
غزلوں کی طرح بھری ہوتی ہیں۔ مگر فارسی کی غزلیں ان صفات سے جو غزل گوئی کی شان سے ہے  
تمام تر معر نظر آتی ہیں۔ فقیر کی دانست میں مرزا غالب فارسی کی غزل گوئی کے اعتبار سے فارسی  
کی قصیدہ گوئی میں زیادہ دخل رکھتے ہیں۔ جیسا کہ آئندہ ذکر ہوگا۔

حضرات حقیقت آگاہ سے مخفی نہیں ہے کہ غزل گوئی کے لیے تمام تر داخلی مضامین  
درکار ہوتے ہیں۔ مگر جن شاعروں نے خواہ فارسی اور اردو میں شاعری کا خارجی پہلو اختیار کیا  
ہے۔ غزل سرائی خارجی پہلو کی مقاضی نہیں ہے۔ خارجی مضامین کا باندھنے والا غزل گو  
کس قدر نازک خیال، اخلاق سخن زور آور اور بلند پرواز ہو۔ کبھی اپنے کلام سے دل پر حسب مراد  
اثر پیدا نہیں کر سکتا ہے۔ چنانچہ فارسی میں مرزا صاحب اور اردو میں ناسخ باوجود بڑے بڑے گو شاعر  
ہونے کے کلام کے اس حسن و مقبولیت سے محروم ہیں جو حافظ اور میر کو نصیب ہوا ہے مرزا صاحب  
کس قدر کثیر الکلام ہیں اور علاوہ بڑی طباعی کے نفاست خیالات اور نزاکت مضامین میں نظر  
ہیں مگر ان کی سیکڑوں غزلیں پڑھ ڈالیے تو بھی اس کا اثر حافظ کی ایک غزل کے برابر بھی نہیں

ہوتا ہے۔ اس کی اور کوئی وجہ نہیں ہے۔ لہذا یہ کہ صائب غزل گوئی کے تقاضے کے خلاف کاربند رہے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ صائب کی سخن سنجی نے فارسی کے لٹریچر کے میدان کو بہت وسیع کر دیا۔ مگر اس توسیع سے خود غزل سرائی کو کوئی نفع نہ ہوا یہ صنف شاعری جس درجہ کو حافظ کی طبیعت داری سے پہنچ چکی تھی اسی درجہ تک قائم رہی ہے سرٹو بھی اس سے ارفع نہ ہو سکی۔ حقیقت یہ ہے کہ صائب اور ناسخ نے ایک ایسی صنف شاعری کی ایجاد کی ہے کہ جو غزل سرائی اور قصیدہ گوئی کے درمیان کیلے کاش یہ دونوں شاعر گرامی اور کسی صنف شاعری کو ترقی دیتے یا کسی صنف کے موجد ہوتے تو شاعری کو ان کی سخن سنجی سے زیادہ نفع پہنچتا۔ خیر جاننا چاہئے کہ مرزا صائب کی غزل سرائی کا رنگ مرغوب نہیں ہے۔ کس واسطے کہ ان کا رنگ غزل سرائی کے تقاضے کے مطابق نہیں ہے۔ ذیل میں مرزا صائب کی غزلیں نندہ حاضرین ہوتی ہیں۔

### غزل : مرزا صائب

دین گفتن خطائے جاہلاں پیدا شود	تیر کج چوں از کماں بیرون رود رسوا شود
پردہ پندار سد راہ وحدت گشتہ است	چوں حباب از خود کند قالب تمہی دیا شود
در مقام حیرت دیدار حرف و صوت نیست	طوطی از آئینہ حیرانم کہ چوں گویا شود
دست پلٹے باغبان سیدن از دس ہمتی ست	سعی کن تا بے کلید این در بردیت وا شود
مہر خاموشی چسبہ زرد بال پر شور من	حلقہ گرداب چوں مہرباں دریا شود
گوہر دارم کہ گراز جیب بیرون آورم	از فروغش پایہ میسزان یدربضا شود

دست رو برسیہ دیا گذار چوں صدق  
ہر کہ صائب آشنائے عالم بالا شود

### دیگر

عشق کیساں جنس درویش و تو گری کشد	این تر از دسنگ گوہر را برابر می کشد
آفتاب روز محشر بیشتر می سوزدش	ہر کہ اینجا درد و داغ عشق کمتر می کشد
تا بکام دل کند جلاں سمند شوخ ما	انتظار گرمی صحرائے محشر می کشد
آتشیں روئے کہ من پروانہ او گشتہ ام	ہر شرارش روغن از چشم سمندر می کشد



بھی از مردن ندارد شعلہ بے باک ما شمع ما گردن با امید صبا بر می کشد  
 نیست ہر ناشتہ روی قابل جولان اشک این رقم را عشق بر رخسار چوں زرمی کشد  
 سر ز جیب صبح بر می آورد چوں آفتاب  
 ہر کہ صائب در دل خود یکدو ساغری کشد

ظاہر ہے کہ مرزا صائب غزل سرائی میں تمام تر خارجی پہلو برتتے ہیں۔ ذیل میں ان کی ایک اور غزل بھی عرض کی جاتی ہے۔ اور اس کے ساتھ اسی زمین کی حافظ کی بھی ایک غزل پیش کی جاتی ہے۔ دونوں غزلوں کے معائنہ سے ظاہر ہوگا کہ جس قدر صائب غزل سرائی میں خارجی پہلو کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ اسی قدر حافظ داخلی پہلو کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے ہیں۔ اس موازنہ سے یہ بات بھی عیاں ہوگی کہ غزل سرائی میں داخلی پہلو کیا لطف سخن پیدا کرتا ہے۔ اور اس لیے اس صنف شاعری میں ایک پہلو کی کس قدر ضرورت ہے۔

### غزل: صائب

اے غنچہ لب کہ سر بہ گریباں کشیدہ در پردہ و پردہ عالم دیدہ  
 برق سبک عنانی و کوہ گراں رکاب در تیج جانی و ہمہ جا رسیدہ  
 تمکین و نطق و معنی شوخیت در توجہ در جلوہ و پائے بامن کشیدہ  
 بر پیر بن غریب تراز یوسفی بہ حسن در مصر سکنے و بکنعان رسیدہ  
 چشم بد از تو دور کہ چوں طفل اشک من ہر کوچہ کہ ہست بہ عالم دویدہ  
 در پلہ غرور تو دل گر چہ بے بہاست ارزاں بدہ زدست کہ ارزاں خریدہ  
 غیر از بنگاہ عجم کہ از دور می کشد  
 اے سنگ دل ز صائب مسکین چہ دیدہ

### غزل: حافظ

از من جدا مشو کہ تو ام نور دیدہ آرام جان و مونس قلب رسیدہ  
 از دامن تو درست نداشت عاشقان پیرا ہن صبوری ایشاں دیدہ  
 از چشم زخم دہر مبادت گزند زانکہ در دلبری بہ غایت خوبی رسیدہ

منعم کنی ز عشق دے اے مفتی زماں معذور دارمت کہ تو او را ندیدہ  
 پایم نہ میرسد بز میں دیگر از نشاط تاسوئے من چشم عنایت تو دیدہ  
 داری خیال پرشش عشاق بینوا گویا کہ بوائے صدق زایشاں شنیدہ  
 بیش از کلیم خویش گمراہ کشیدہ ایں سرزنش کے کرد ترا دوست حافظا

## فارسی اور اردو کا مختصر بیان

واضح ہو کہ موضوع اس کتاب کا کسی زبان کی تحقیق نہیں ہے۔ مگر چوں کہ ہمارے ملکی بہت اشخاص ایسے ہیں کہ فارسی اور اردو کے تاریخی حالات سے مطلع نہیں ہیں اس لیے ان دونوں زبانوں کا مختصر بیان خالی از نفع نہ ہوگا حقیقت حال یہ ہے کہ جو اس وقت مروج فارسی ہے۔ یہ زبان کیانیوں کی نہیں تھی۔ ان کے زمانہ میں جو زبان بولی جاتی تھی اسی سے انقلابات کشمیر کے بعد حال کی فارسی پیدا ہو گئی ہے۔ اس موجودہ زبان کو بھی قائم ہوئے پندرہ سو سال سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا ہے۔ جو زبان کیانیوں میں ان کے ابتدائی وقت میں جاری تھی۔ وہ یا قوم آریہ کی زبان تھی یا قوم آریہ کی زبان سے بہت مشابہت رکھتی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ قوم آریہ نسل ایرج سے تھی اور لفظ ایران بھی ایرج ہی سے مشتق معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ امر غلط نہیں ہے اس واسطے کہ کیانیوں کے خاندان کی اصل ایرج سے ثابت ہوتی ہے۔ پس کوئی تعجب نہیں کہ جس ملک نے نسل ایرج نے قرار لیا وہ ایران کہلایا زردشت کے وقت کی زبان ابتدائی کیانیوں کی زبان سے علاوہ نظر آتی ہے۔ اسی طرح رفتہ رفتہ انقلابات قبول کر کے وہ زبان پیدا ہو گئی جو زبان رتو کی اور فردوسی کی ہم لوگ اس وقت پاتے ہیں۔ اور جسے زبان فارسی کہتے ہیں۔ قوم آریہ جس نے چار ہزار برس پہلے ہندوستان کو فتح کر کے اس ملک میں توطن اختیار کیا تھا وہ زبان آریہ بولتی تھی آریہ زبان کیا تھی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سنسکرت زبان تھی۔ مگر جب ہندوستان میں قوم آریہ نے وطن اختیار کیا۔ اور اس ملک کے سکنائے مغلوب سے آمیزش پیدا کی تو ان کی شستگی زبان میں خلل لاحق ہونے لگا۔ اور رفتہ رفتہ اس آمیزش سے ایک زبان غیر سنسکرت جسے پراکرت کہتے ہیں پیدا ہو گئی۔ جب قوم آریہ نے دیکھا کہ سنسکرت کی شستگی اور صفائی میں بہت خلل واقع ہو رہا ہے تو قواعد صرف و نحو کے قائم کر کے اور الفاظ غیر سنسکرت کو دور کر کے اپنی زبان کی پوری اصلاح کر ڈالی اور یہ زبان خاص برہمنوں کی قرار پائی۔ لیکن جو زبان پراکرت جاری ہو چکی تھی اسے تصحیح و



تحقیق سے اس کا اندازہ نہ ہو سکا۔ اسی پر اکرت زبان کی ایک قسم بھاشا ہے۔ اور بھی مختلف دیسوں میں اسی طرح کی ممزوج زبانیں جاری ہیں۔ جب برہمنوں کے مذہب کو بودھ نے مغلوب کر ڈالا تو وہی پر اکرت سنسکرت کے قائم مقام سمجھی جانے لگی اور سنسکرت سے کوئی تعلق باقی نہ رہا۔ پندرہ سو برس کا عرصہ ہوتا ہے کہ ششکر آچاریہ نے مذہب بودھ کو شکست دی اور مذہب براہمنہ کی تجدید کی تو اس نے سرنو سے سنسکرت کو رواج دیا۔ مگر زبان پر اکرت رواج پا چکی تھی۔ عوام الناس میں یہی زبان جاری تھی لیکن جب اسلام نے ظہور فرمایا اور اہل عرب شروع شروع سندھ میں پہنچے تو سندھیوں کی زبان جو پر اکرت کی ایک قسم تھی عربی لفظوں سے مزاج پکڑنے لگی، پھر مختلف اقوام کے شاہان اسلام ہندوستان پر حملہ آور ہوتے گئے حتیٰ کہ اسلامی سلطنت ہندوستان میں قائم ہو گئی۔ اس وقت سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں میل جول زیادہ ہونے لگا زبان بھاشا جو ہندوؤں میں جاری تھی۔ اس میں فارسی عربی کے الفاظ کثرت سے داخل ہو گئے خاص کر لشکروں میں ایک خاص زبان بولی جانے لگی اس مرکب زبان کا نام اردو ہو گیا اردو لشکر کو کہتے ہیں پس وجہ تسمیہ اس کی یہی ہوئی کہ یہ زبان لشکریوں سے شروع ہوئی رفتہ رفتہ اس زبان نو نے شکل امتیاز پکڑی۔ حتیٰ کہ عہد اکبر میں معلوم ہوتا ہے کہ زبان ایسے انداز کی ہو گئی تھی کہ اس وقت کے اردو داں بھی اس عہد کی زبان کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ اکبر کی رباعی ذیل میں درج کی جاتی ہے جس سے معلوم ہو گا کہ اردو عہد اکبر میں کتنی حیثیت کو پہنچ چکی تھی بلکہ اس رباعی کی نشست الفاظ و ترکیب نحو ایسی معقول ہے کہ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس میں کسی طرح کی کہنگی محسوس ہوتی ہے:-

پوچھے جو گھڑی مجھ سے براہ عادت تو وصل کو ساعت کی نہیں کچھ حاجت

ہو جاتی ہے ملنے سے مبارک ساعت ساعت کا بہانہ نہیں خوش ہر ساعت

جب اکبر کے وقت میں اردو اتنی صورت پکڑ چکی تھی تو اس زبان کی پوری درستگی میں کوئی بہت تردد کا امر باقی نہ رہا تھا۔ یوں تو کہتے ہیں کہ امیر خسرو کے وقت سے اس زبان میں بطور تفسیر شعرا شعر کہا کرتے تھے۔ مگر اکبر کے عہد کی زبان تو بخوبی ایسی ہو چکی تھی کہ اس میں اصناف شاعری کا برتنا دشوار نہ تھا۔ لیکن چون کہ یہ زبان فارسی کے مقابل میں پایہ وقار نہیں رکھتی تھی۔ اس زبان میں لوگ جو کچھ موزوں کرتے تھے اسے کسی قسم کا اعتبار حاصل نہ تھا۔ مگر رفتہ رفتہ جو اس زبان میں شاعری کو رواج زیادہ ہوتا چلا۔ تو اس زبان کو پایہ امتیاز حاصل ہو گیا۔ پہلا شاعر جس نے اس زبان کو ممتاز کر دیا ولی دکنی تھا پھر مرزا کے وقت میں یہ زبان پورے طور پر قابل توجہ ہو گئی پھر لکھنؤ میں



اس کو عروج ہوا۔ ناسخ نے اسے خراش تراش کر کے ایک خوب صورت زبان کمر ڈالی۔ آخر کو میر انیس نے اسے ایسا بنا دیا کہ اس وقت بلاشبہ قریب قریب جواب فارسی ہو رہی ہے۔

المختصر پہلے قوم آریہ نے اپنی زبان قومی کو رواج دیا۔ بعد ازاں اس سے بھاشا پیدا ہوئی پھر اس بھاشا میں فارسی عربی کے لفظوں کی آمیزش ہوتی گئی پھر بہت سے انقلابات کے بعد وہ زبان پیدا ہو گئی جسے اردو کہتے ہیں۔ اب اس زبان میں مختلف زبانوں کے لفظ داخل ہو گئے۔ حتیٰ کے انگریزی الفاظ بھی بکثرت پائے جاتے ہیں۔ مگر ابھی تک اس زبان کو بہت الفاظ کی ضرورت ہے۔ اگر عربی، فارسی، انگریزی، سنسکرت کے الفاظ کثرت کے ساتھ داخل کیے جائیں تو اس زبان کی کیفیت انگریزی زبان کی ہو جائے گی۔ اور جیسی انگریزی زبان وسیع ہے۔ اسی طرح اس کو بھی ہر طرح کے خیالات غلیظ کے اظہار کی وسعت حاصل ہو جائے گی فقیر نے کمیسٹری وغیرہ کی کتابوں میں الفاظ انگریزی کو قایم رکھا ہے اور کوئی لفظ اپنی طرف سے ایجاد نہیں کیا ہے۔ ایجاد کرنے کا فائدہ کوئی نہیں ہے۔ کس واسطے کہ الفاظ ایجاد شدہ اصل الفاظ سے کم وحشت چیز نہیں ہوتے ہیں۔ جن صاحبوں نے الفاظ ایجاد کیے ہیں وہ وحشت خیز ہونے کے علاوہ ضحک انگیز بھی ہیں۔ مثلاً پیرل لائنس یعنی خطوط متوازیہ کا ترجمہ بیج برابر نان باروغن چراغ گرچہ گندہ پر ایجاد بندہ کا مزہ دیتا ہے۔ فقیر کی دانست میں اردو ابھی تک لفظوں کی محتاج ہے۔ علمی خیالات اس زبان میں فارسی، سنسکرت، عربی، انگریزی وغیرہ کی مدد کے بغیر ادا نہیں کیے جاسکتے ہیں۔ پس لازم ہے کہ اس زبان کو ایشیائی اور یورپین زبانوں کے لفظوں سے اعانت دی جائے مگر راقم کے اس خیال کے ساتھ شاید متراہل زبان اتفاق فرمائیں گے۔ چنانچہ ایک صاحب نے جوابل زبان ہونے کا دعوا رکھتے ہیں۔ فقیر کے لفظ مغربل کے استعمال کرنے پر اعتراض فرمایا تھا۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ راقم نے اپنی کتاب موسوم بہ کیمیائے زراعت میں لفظ مغربل کو استعمال کیا ہے۔ معترض نے یہ فرمایا کہ یہ لفظ غیر مانوس ہے۔ اس کو اردو میں نہیں استعمال کرنا چاہئے اس اعتراض کی وجہ فقیر کے سمجھ میں نہ آئی بہ لفظ ارباب علم میں غیر مانوس کیوں کر ہے۔ اس کی وجہ معترض صاحب نے کچھ نہ فرمائی شاید معترض صاحب کے گوش مبارک تک یہ لفظ پہنچا ہی نہ تھا ورنہ فقیر تو ہمیشہ نسخوں میں لکھنا چلا آیا۔ اور استادوں کو اپنی طرح لکھتے ہوئے دیکھا گیا۔ فرقہ الما میں یہ لفظ متعارف حیثیت رکھتا ہے۔ اور ہمیشہ استعمال میں لایا جاتا ہے۔ علمی تصنیفوں میں اس کا استعمال کیوں کر معترض اعتراض ہو سکتا ہے۔ راقم نے اس لفظ کو کسی غزل، خمسہ، مثنوی، واسوخت وغیرہ میں استعمال نہیں کیا تھا جس کتاب میں



استعمال کیا ہے وہ کتاب علم کیمسٹری سے بحث رکھتی ہے۔ علم کیمسٹری علم طب کا ایک جزو ہے پس وہ لفظ جو طبی حیثیت استعمال رکھتا ہے۔ اگر علم کیمسٹری کی کتاب میں استعمال کیا جائے تو معترض کو زبان کھولنے کا موقع کیا ہے۔ المختصر ہوا خواہ ان اردو کا فرض منصبی ہے کہ اس زبان کے وسیع کرنے میں ہر طرح کے امور کو ملحوظ رکھیں۔ اور حسب ضرورت مختلف زبانوں سے الفاظ کے اخذ کرنے میں مضائقہ نہ فرمائیں۔ مگر اس سے مراد راقم یہ نہیں ہے کہ بلا ضرورت بھی کسی زبان سے الفاظ لے لیے جائیں جیسا کہ اس زمانہ میں بد لحاظ اشخاص انگریزی لفظوں کو نہایت بے قرینگی اور بد ترکیبی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں اور درحقیقت کوئی ایسی زبان بولتے ہیں کہ نہ وہ انگریزی ہے اور نہ اردو۔ اس کی مثال یہ تقریر ہے ”جب ہم شام کو واک کر کے آئے تو بہت مائرڈ معلوم ہوتے فوراً ایک چیر پر بیٹھ گئے اس کے بعد طبیعت کو اسموک کرنے کی خواہش ہوئی۔ میچز نہ تھیں، سیکار کو کینڈل سے لائٹ کر لیا۔ اس نے مائرڈ پر سوڈنگ ایفکٹ پیدا کیا۔ ظاہر ہے کہ ان انگریزی لفظوں کے استعمال کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ اردو زبان بحالت موجودہ ایسی محتاج نہیں ہو رہی ہے کہ بلا ضرورت اس میں اس قسم کے الفاظ ٹھونسے جائیں۔ مگر فی زمانہ بد لحاظی اس درجہ کو پہنچ گئی ہے کہ اشخاص خام وضع اور خام زبان اسی نہج سے آپس میں گھستگو کرتے ہیں۔ المختصر اردو اس وقت بھی محتاج وسعت معلوم ہوتی ہے۔ اس کی طرف حضرات اہل زبان کی توجہ درکار ہے۔ ہر چند زمانہ خود مائل توسیع ہے مگر ظاہر زمانہ کی اعانت بھی خواہان زبان کی طرف سے کمتر دیکھی جاتی ہے۔ جو حضرات اس عہد کے نقادان سخن ہیں۔ ان کو مجرد متروکات کی فکر ہا کرتی ہے اس اصلاح سے زبان وسیع ہونے کے عوض ادب بھی تنگ ہو چلی ہے۔ فقیر کی دانست میں لفظ مت اسی قدر فصیح ہے جتنا کہ لفظ نہ ہے اسی طرح تک اور تلمک وضاحت میں برابر ہیں۔ اسی طرح کی اصلاح سے درحقیقت زبان کو کوئی فائدہ نہیں ہے ایسی اصلاحیں زہار بکار آمد نہیں ہو سکتیں۔ بہت خوب ہوتا کہ مت اور نہ، تلمک اور تلمک واعظا اور اے واعظ وغیرہ وغیرہ یہ سب محاورے مانے جاتے۔ اہل انصاف غور فرمائیں کہ ان سب متروکات کو ملحوظ رکھنا غزل سرائی میں تو کس قدر آسان معلوم ہوتا ہے مگر التزام متروکات کے ساتھ رامائن یا مہابھارت کی سی ضخیم کتاب کو تصنیف کرنا خالی از وقت مقصود نہیں ہے۔ ظاہر متروکات چہ حضرات اہل زبان کو اس توجہ بلیغ کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اردو کی شاعری زیادہ تر غزل سرائی وغیرہ میں محدود ہو رہی ہے اور چوں کہ غزل سرائی میں کوئی جدت کا پہلو باقی نہیں رہا ہے اس واسطے لفظی جدتوں کی طرف ناچار مائل ہونا پڑا ہے۔



## اردو کی نظم و نثر کی مختصر تاریخ

کب نظم و نثر نے اردو میں رواج پکڑا اس کی نسبت کوئی محققانہ قول دکھائی نہیں دیتا کہتے ہیں کہ اس زمانہ میں انشاء پردازی کی ابتدا عہد تیموری ہوئی۔ اس بادشاہ کے ہندوستان پر تسلط کا زمانہ ۱۳۹۸ء ہے بعض مصنفین یہ بھی لکھتے ہیں کہ اردو کی نظم و نثر اس کے بہت پہلے رواج پا چکی تھی۔ ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ گیارہویں صدی عیسوی کے آخر میں سعود بن سعد نے ایک دیوان بزبان اردو ترتیب دیا تھا۔ علاوہ اس کے سعدی اور خسرو نے بھی سترہویں صدی عیسوی کے آخر میں اس زبان میں طبع آزمائیاں کی تھیں۔ ظاہر ہے سب اقوال پایہ تحقیق سے بہت بعید نظر آتے ہیں۔ بہر حال ذیل میں وہ امور حوالہ قلم کیے جاتے ہیں جن کی صحت کتابی وسائل سے درجہ یقین رکھتی ہے۔

جاننا چاہئے کہ اردو کی انشاء پردازی کا مبداء ملک دکن ہے گو لکنڈہ اور بیجاپور میں اس زبان نے ایک ممتاز صورت پیدا کی ان دونوں مقاموں کے بادشاہوں کو اس زبان کی ترقی ملحوظ رہی۔ گو لکنڈہ میں شجاع الدین لوری نے غزلیں لکھیں۔ ابن نشاطی نے دو مثنویاں معروف بہ طوطی نامہ و پھول بن تصنیف کیں۔ نجسین الدین نے بھی ایک مثنوی لکھی اس مثنوی میں کامروپ اور کیلا کی کہانی منظوم ہے کامروپ اودھ کا راجہ تھا۔ اور کیلا سراندیب کے راجہ کی بیٹی تھی۔ یہ ایک دلچسپ عشقیہ مثنوی ہے اور بڑے شاعرانہ مذاق سے خبر دیتی ہے۔ اسی طرح بیجاپور میں نصرتی نے جو ایک برہمن تھا دو مثنویاں معروف بہ گلستاں عشق۔ وغلی نامہ تصنیف کیں۔ یہ سب شعرا عہد اورنگ زیب کے بہت پہلے گذرے ہیں۔ اس کے بعد ولی اور میراج نے اپنے حسن طبیعت سے اردو کو زینت بخشی ان دونوں شاعروں کے نشوونما کا زمانہ ۱۶۸۸ء سے لے کر ۱۷۲۲ء تک معلوم ہوتا ہے۔ مگر جب شاہان دکن کو اورنگ زیب نے زیر و زبر کر ڈالا تب اردو نے اپنے مولد سے جلا وطنی اختیار کر کے دلی کو اپنا مسکن بنایا۔ ولی کا دیوان پہلے پہلے اس دار الخلافہ میں ۱۷۱۹ء میں پہنچا یہ سن محمد شاہ کے جلوس کا دوسرا سال تھا۔ شاہ حاتم نے ولی کی تقلید شروع کی اور دو دیوان لکھے، شاہ حاتم کے ہم عصر ناہجی، منعمون اور ابرو تھے۔ ان لوگوں نے خوب خوب غزل سرائیاں کیں۔ شاہ حاتم ۱۷۵۹ء میں پیدا ہوئے اور ۱۷۹۲ء میں رحلت فرمائی۔ دلی میں اردو شاعری کے رواج دینے والے شاہ حاتم ہی گذرے ہیں۔ ان نامی شاگردوں میں مرزا رفیع سودا ہیں۔ اور ایسے شاگرد ہیں کہ بڑے بڑے استادوں کو ان کی شاگردی پر ناز کرنا درست و بجا ہے۔ پھر ولی کے نامی استادوں میں خان آرزو بھی تھے۔ ان کا



سن پیدائش ۱۶۸۹ء اور سن مات ۱۷۵۶ء ہے۔ میر تقی میر ان کے شاگردوں میں تھے۔ گو غزل سرائی میں اپنا تمام ہندوستان میں جواب نہیں رکھتے تھے۔ حملہ نادر کے بعد خان آرزو لکھنؤ کو چلے آئے اور اسی شہر میں ودیعت حیات فرمائی۔ اسی طرح دلی کے پرانے شاعروں میں انعام اللہ خاں تھیں تھے۔ انھوں نے ۱۷۵۶ء میں یہ عہد احمد شاہ پجیس برس کے سن میں انتقال فرمایا۔ اس مآتم سخت است کہ گوہند جواں مرد۔ ان استادوں کے ہم عصر خواجہ میر درد بھی تھے اور ایسے صاحب کمال تھے کہ آج تک ان کا نام نامی السہ خلائی پر جاری ہے۔ اور تا مرد و ہو رہا جاری رہے گا۔

واضح ہو کہ دہلی کی بربادی کے بعد اردو کے اکثر شعرائے نامی نے لکھنؤ میں آکر پناہ پکڑ لی۔ خان آرزو حملہ نادر کے بعد ہی ۱۷۳۹ء میں لکھنؤ کو چلے آئے اسی طرح مرزا رفیع سودا، میر تقی میر، میر حسن میر سوز قلندر بخش جرات بھی ترک وطن کر کے وارد لکھنؤ ہوتے گئے اور علاقہ اودھ ہی میں رحلت فرماتے گئے۔ میر حسن کی وفات ۱۷۸۴ء میں سوز کی ۱۷۸۲ء میں اور جرات کی ۱۷۸۱ء میں واقع ہوئی۔ میر حسن ایک اچھے غزل سرائے تھے۔ مگر ان کی شاعری کی شہرت کی وجہ ان کی شہسوی معروف بہ سحر البیان ہے۔ یہ وہ شہسوی ہے کہ اپنا جواب نہیں رکھتی اس کی خوبیوں کی بحث آئندہ آنے کو ہے۔ میر محمدی سوز بڑے طباع تھے اور ریختی میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔ جرات کی طبیعت داری بھی مشہور دیا رو امصار ہے۔ اور فی الواقع ان کی شاعری قابل لحاظ ہے۔ ان کا ملین کے ترک وطن کرنے سے البتہ دلی خالی ہو گئی مگر اس سرزمین میں پھر نامی شعرا پیدا ہوتے گئے۔ ذوق نے سرنو سے شاعری کو چمکایا، مومن خاں نے ملک سخن میں خوب ہی اپنا سکہ جمایا۔ غالب نے میر تقی میر کے زمانے زندہ کر ڈالا۔ مصحفی نے بھی لکھنؤ سے آکر دلی میں خوب شاعری کے لطف دکھائے اور دلی ہی کے ہو کر رہ گئے۔ آخری شاعر دہلی کے غالب ہیں۔ انھیں کے ساتھ دلی کی شاعری رخصت ہو گئی۔ ان کی وفات کا سن ۱۸۶۹ء ہے جانا چاہئے کہ جس وقت استادان دہلی لکھنؤ نہیں پہنچے تھے اس شہر میں اردو کی شاعری کو کوئی ممتاز درجہ حاصل نہ تھا مگر ان حضرات کے آنے سے لکھنؤ میں ہر سمت دھومیں مچ گئیں۔ طبیعت داروں نے سخن سنجی کے مشغلے اختیار کیے۔ شاعری کی نئی روشیں ایجاد ہونے لگیں۔ حتیٰ کہ دلی کی شاعری سے ایک علاوہ رنگ کی شاعری ظہور میں آئی۔ یعنی استاد آغا نے غزل سرائی کا ایک خاص رنگ پیدا کیا۔ اور آتش بھی صنف شاعری کو دلی والوں سے الگ ہو کر برتنے لگے۔ پھر ان دونوں استادوں کے شاگردوں نے غزل سرائی کی مختلف راہیں نکالیں اور اپنے اپنے کمالات کی بدولت مشہور دیا رو امصار ہوتے گئے۔ ان دونوں استادوں کے مشہور



شاگردوں میں خواجہ وزیر گویا، مقبول، برق، سحر، رندا اور صبا ہیں۔ ہر ایک ان میں استاد کا درجہ رکھتے تھے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جیسے شاگردان نامی ان دونوں شاعران گرامی کو نصیب ہوئے کمتر کسی اردو کے شاعر کو نصیب ہوئے۔

اہل انصاف سے پوشیدہ نہیں ہے کہ ہر چند لکھنؤ میں اردو غزل سرائی نے بہت کچھ فروغ پکڑا۔ مگر دلی والوں کی غزلیت کا لطف غزل سرا بان لکھنؤ اپنی غزلوں میں پیدا نہ کر سکے۔ یہ سچ ہے کہ غزن سرائی دلی والے کر گئے۔ لیکن مسدس نگاری حضرات اہل لکھنؤ نے اسی کی کہ دلی والے کیا اہل شیراز اور اہل اصفہان کو بھی خواب میں نصیب نہ ہوئی۔ اگر مشعل لے کر بھی کوئی شخص تمام دنیا میں میرانیس اور مرزا دبیر کی مسدس نگاری کا جواب ڈھونڈھے گا تو بالیقین کہیں نہیں پائے گا۔ میرانیس نے اردو کی شاعری کو اپنی مسدس نگاری سے اس درجہ تک پہنچا دیا ہے کہ اس کی ہوا بھی فارسی اور عربی شاعری کو نہیں لگی ہے۔ آئندہ میرانیس کی مرثیہ نگاری کی بحث آنے کو ہے جس سے معلوم ہوگا کہ رزمی شاعری میں میرانیس، ہوتر، ملتن، ورجل، اور فردوسی پر غالب ہیں۔ اور اگر ان کا کوئی جواب ہے تو بالیکی ہے یا ویاس ہے۔ المختصر کوئی شک نہیں کہ اردو کی رزمی شاعری درجہ کمال کو لکھنؤ میں پہنچی اور اہل حق یہ امر حضرات اہل لکھنؤ کے لیے ایک بڑا سرمایہ ناز ہے اسی طرح مرزا دبیر نے شاعری کا رتبہ ایسا بلند کر دیا کہ اردو زبانوں کی شاعری اُسے دیدہ حیرت سے نگراں ہے ارباب حقیقت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ لکھنؤ میں مرثیہ نگاری اس درجہ کمال کو پہنچ گئی ہے کہ خود کمال شاعری ہو رہی ہے۔ اگر شعرائے لکھنؤ رزمی شاعری میں ایسا کمال پیدا نہیں کرتے تو مجرد غزل سرائی اور مثنوی نگاری کی بنیاد پر ان کو شعرائے دہلی پر کسی طرح کی ترجیح حاصل نہ ہوتی اس صنف شاعری کے فروغ دینے والے میرمنس صاحب بھی تھے۔ پھر میسر و حمید صاحب نے میرانیس کے زمانہ کو زندہ کرنا شروع کیا تھا کہ اجل نے مہلت نہ دی۔ حیف صد حیف، افسوس صد افسوس۔ گلے برفت کہ ناید بعد بہار دگر۔ آخر میں میرنفس صاحب نے مرثیہ نگاری کو رونق بخشی، واحسرتا درد را کہ اب وہ بھی نہیں ہیں۔ خاندان مرزا دبیر صاحب میں صرف ان کے بیٹے اوج صاحب نام آور نکلے۔ خدائے تعالیٰ انھیں فردوسی سبھا اور میر تقی میر کی حیات عطا فرمائے فن شاعری کے لیے درازی عمر کی بڑی حاجت ہے۔ شاعری تب ہی جوان ہوتی ہے جب شاعر عالم پیری کو پہنچتا ہے یوں تو کوئی شک نہیں کہ اس وقت میں بھی مرزا اوج ایک بڑے نامی گرامی شاعر ہیں اور ان کی طباعی مشہور دیار و امصار ہے لیکن ان سے بہت کچھ امیدیں کی جاتی ہیں اور حق یہ ہے کہ وہ امیدیں ایسی ہیں کہ شاعر کے معمر ہونے بغیر پوری



نہیں ہو سکتیں۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ مرزا اوج کی مرثیہ نگاری بہت کچھ جدت سے خبر دیتی ہے۔ ان کی شاعری نقالی نہیں ہے۔ ہرگز ایسی نہیں کہ سو پچاس عمدہ مرثیے سے مرزا صاحب اقتباس مضامین کر کے ایک مرثیہ بنا لیتے ہوں۔ اس پر خوبی یہ ہے کہ روایات صحیحہ کو منظوم فرماتے ہیں اور خود ایجاد و اقوال سے امام و خاندان امام علیہ السلام پر اتہام نہیں لگاتے ہیں۔ واضح ہو کہ جب لہی اور لکھنؤ میں اردو شاعری نے ممتاز شکل پیدا کی تو اور شہروں میں بھی حضرات طباع نے سخن سبھی کا مشغلہ اختیار فرمایا چنانچہ میر ولی محمد نظیر اکبر آبادی نے علاوہ مسدسوں کے بہت سی مثنویاں اور غزلیں لکھیں یہ شاعر مشہور دیا و امصار ہے۔ اس کے نیچرل بیانات بہت قابل توجہ ہیں۔ اس طباع کے کلام ایسے ہیں کہ نیچرل شاعری کو بخوبی داد دیتے ہیں اس شاعر گرامی نے ۱۸۳۲ء میں رحلت فرمائی اس طرح راسخ نے اپنی مثنویوں اور غزلوں سے پٹنہ کے نام کو روشن کیا۔ اور مولوی وحید الد آبادی نے اپنے وطن کی عزت افزائی کی حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں شاعر بڑے غزل سران گزرے ہیں۔ راسخ تو پٹنہ کے میر تھے اور وحید امیر المتغزلین۔

اب حضرات ناظرین اردو کی نثر نگاری کے تاریخی حالات پر نظر فرمائیں۔ ارباب واقفیت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ انیسویں صدی کی ابتداء میں ڈاکٹر جان گلکرسٹ صاحب نے اردو کی نثر نگاری کی طرف اپنی توجہ مبذول فرمائی۔ چنانچہ اردو کی درسی کتابیں ان کے وقت میں تصنیف ہوتی گئیں انہوں نے بڑے بڑے نثران وقت کو جمع فرمایا ان کے عہد علم پروری میں حضرات مندرجہ ذیل کلمتہ میں مجتمع تھے۔

نمبر ۱ سید محمد بخش حیدری۔ ان کے تصانیف طوطا یمن کی کہانی، آرائش محفل، دہ مجلس گلزار و دانش، اور تاریخ نادری میں ان کی وفات کا سن ۱۸۳۸ء ہے۔

نمبر ۲ میر بہادر علی حسینی۔ ان کے تصانیف سے نثر بے نظیر، اور اخلاق ہندی ہیں حسینی نے ۱۸۴۰ء میں وفات پائی۔

نمبر ۳ میر امن لطف۔ ۱۸۴۰ء میں انہوں نے باغ و بہار تصنیف فرمائی۔ اسی سن میں انہوں نے نسخہ گنج خوبی کو بھی شائع کیا۔

نمبر ۴ حافظ الدین احمد۔ انہوں نے ۱۸۵۳ء میں خرد افروز لکھی۔

نمبر ۵ شیر علی افسوس۔ ان کے تصانیف سے دو کتابیں ہیں ایک آرائش محفل اور دوسری باغ اردو۔ سن وفات ۱۸۵۹ء ہے۔

نمبر ۶ نہال چند لاہوری۔ کتاب مذہب عشق، جو گنجل بکاوی کا ترجمہ ہے ان کے تصانیف سے ہے۔ یہ ترجمہ ۱۸۰۴ء میں انجام کو پہنچا۔

نمبر ۷ کاظم علی جوآن۔ شکستہ کے مترجم ہیں۔ علاوہ اس کے ایک کتاب معروف بہ بارہ ماہ بھی لکھی ہے ۱۸۰۴ء میں کلکتہ کالج کے پروفیسر مقرر ہوئے۔

نمبر ۸ للوال قوی۔ یہ گجراتی برہمن تھے۔ انھوں نے چند ہندی کی کتابیں لکھیں۔ ان کی اردو تصانیف سے لطائف ہندی ہے۔

نمبر ۹ مظہر علی دلا۔ انھوں نے اردو زبان میں مادھونل کا قصہ ترجمہ فرمایا۔

نمبر ۱۰ اکرام علی۔ ان کی تصانیف سے اخوان الغلبہ اس کے اتمام کا سن ۱۸۱۰ء ہے۔ اجماع نثاراں بالا سے ہوتا ہے کہ گلکرسٹ صاحب کو اردو کی نثر نگاری کی طرف بڑی توجہ تھی حقیقت حال بھی یہی ہے کہ اردو کی نثر جو اس وقت میں دیکھی جاتی ہے۔ اس کی ابتدائی ترقی موصوف کی کوششوں کا نتیجہ ہے کوئی شک نہیں کہ اس وقت سے اردو کی نثر نگاری میں بین ترقیاں ہوتی گئیں مگر انصاف یہی ہے کہ مصنفین بالا اردو کی نثر کے راہ بتانے والے تھے۔ انھیں مصنفوں کی نثاریوں نے سکنائے ہندوستان کو نثر نگاری کی طرف مائل کر دیا۔ پھر تو کتنے اخبارات جاری ہوتے گئے۔ اور مختلف علوم و فنون کی کتابیں تصنیف ہوتی گئیں۔ مرد ایام سے یورپین مذاق تحریر بھی پیدا ہوتا گیا۔ اور ہر چند ابھی تک بمقابلہ یورپین زبانوں کے اردو ایک بے حقیقت زبان ہے۔ تو بھی اس سو برس کے اندر یہ زبان ترقی سے خالی نہیں رہی۔ اس عہد کے نامور نثر نگار مرثیہ احمد خاں بہادر، شمس العلماء مولوی، مدیر احمد، اور شمس العلماء ذکا اللہ خاں بہادر ہیں۔ ان حضرات کی تحریریں شایستہ اقوام کے نثاروں کے انداز کی ہوتی ہیں۔ نثر کی ممتاز کتابوں میں غالب کی ارونے معلیٰ بھی ہے۔ مگر سوائے عمدگی زبان کے اس میں خیالات کا لطف کمتر ہے۔ یہ کتاب ایسی نہیں ہے کہ ایڈیشن وغیرہ کی تحریروں کے ساتھ اس کو کسی طرح کا مقابلہ حاصل ہے۔

فارسی کے شعراء متغزلین کے بیان کے بعد اب اردو کے شعراء متغزلین کی نسبت کچھ مضامین مندرج ہوتے ہیں۔ جن سے اردو کی غزل سرائی کی حالت موجودہ ظاہر ہوگی۔

ہندوستان کے ان حصوں میں جہاں اردو بولی جاتی ہے مستند غزل سرائی صرف دو جگہوں کی سمجھی جاتی ہے یعنی دہلی اور لکھنؤ۔ ان دونوں شہروں کی صرف غزل سرائی ہی مستند مانی نہیں جاتی۔ بلکہ جمیع اصناف شاعری ہی زبان کے اعتبار سے تو یہ خیال بہت صحیح ہے۔ کس واسطے کہ



ان دونوں جگہوں کے برابر کہیں کی زبان نہیں مانی جاسکتی ہے۔ مگر امر شاعری ایسا ہے کہ اس کو کسی خاص مقام سے تعلق نہیں ہے۔ چنانچہ بعض دیگر دیکھ کر کے ایسے شعراء نظر آتے ہیں کہ جو اہل زبان نہ تھے مگر نفس شاعری میں ان کو پایہ امتیاز حاصل تھا۔ مثلاً پٹنہ شیخ غلام علی راج گندے ہیں کہ ان کی توفیر میر تقی صاحب تیسرے بھی فرماتی تھی۔ مگر چوں کہ اہل زبان کی شاعری سندھیتی ہے۔ راقم لکھنؤ اور دہلی کے شعراء متغزلین کی غزل سرائیوں پر اپنے خیالات کا اظہار موقوف رکھتا ہے۔

یہ عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ دہلی کے حضرات متغزلین اکثر اپنی غزل سرائیوں میں شاعری کا داخلی پہلو ملحوظ رکھتے گئے ہیں۔ اس سبب سے ان کی غزل سرائیاں تقاضائے تغزل کے مطابق پائی جاتی ہیں۔ میر حسن، خواجہ میر درد، میر تقی میر، سودا، مومن، غالب یہ سب شعراء متغزلین اپنی داخلی رنگ کے برتنے والے گذرے ہیں۔ البتہ ذوق پورے طور پر داخلی پہلو کے برتنے والے نہ تھے تو بھی وہ خارجی پہلو کی آمیزش داخلی پہلو کے ساتھ اس رنگ سے کر دیتے ہیں کہ ان کا کلام سیٹھے ہونے سے بچ جاتا ہے۔ برخلاف اس کے لکھنؤ کی غزل گوئی کا رنگ نظر آتا ہے۔ اس جگہ کے اکثر شعراء نامی غزل سرائی میں خارجی پہلو اختیار فرماتے ہیں یعنی واردات قلبیہ اور امور ذہنیہ کی قید کے پابند نہیں رہے ہیں۔ بلکہ تقاضائے غزل گوئی کے خلاف خارجی مضامین کو اپنی غزل سرائیوں میں زیادہ جگہ دیتے گئے ہیں اس جدت سے احاطہ غزل گوئی تو وسیع ہو گیا مگر غزل سرائی سے جو غزل مقصود ہے فوت ہو گئی۔ ظاہر اس صنف شاعری کی علت غائیہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ دل مضامین درد انگیز سے متاثر و متاثر ہو۔ طبیعت شوخی کلام سے مزا اٹھائے جان کو سراپا سوز و گداز حاصل ہو۔ اخلاقی قوی ترقی کر جائیں پس ان جب باتوں سے کوئی بات حاصل نہیں ہوتی تو غزل سرائی سے کیا فائدہ اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ شعراء لکھنؤ نے غزل سرائی کی ترقی کو ہمیشہ ملحوظ رکھا۔ چنانچہ ناسخ نے نہ صرف اردو کو اپنے کلام معجز نظام سے ایک شستہ پاکیزہ اور باقاعدہ زبان بنا ڈالا بلکہ اردو لٹریچر کو بھی دولت عالی خیالی سے مالا مال کر دیا۔ فی الواقع جیسی ترقی اردو کو ناسخ کی بدولت نصیب ہوئی ہے ویسے کسی دوسرے شاعر کی بدولت ظہور میں نہیں آئی۔ بیشک اردو پر ناسخ کا بڑا احسان ہے۔ اگر ناسخ نہ ہوتے تو جیسی لکھنؤ کی زبان نفیس فصیح شستہ اور پاکیزہ ہو رہی ہے۔ یہ خوبیاں اس کو نصیب نہ ہوتیں۔ اس زبان کا منظوم لٹریچر بھی شیخ کی توجہ فرمائی کا بہت ممنون ہے۔ اگر ناسخ نہ ہوتے تو اردو میں کوئی شاعر مرزا صاحب کا جواب نہ نکلتا۔ لیکن زبان اور لٹریچر کی ترقیوں کے ساتھ لکھنؤ میں اردو کے نفس غزل گوئی کو فائدہ حاصل نہ ہوتا۔ کس واسطے کہ ان سب ترقیوں سے میر کی غزل



سرائی پر ترقی کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکی۔ حقیقت یہ ہے کہ میر کی غزل سرائی اپنے حال پر رہ گئی یہی حال فارسی کا بھی دیکھا جاتا ہے کہ مرزا صاحب کی طباعی سے فارسی کا منظوم لٹریچر تو ترقی کر گیا مگر اس زبان کے نفس غزل سرائی کو کوئی ترقی منتج نہیں ہوئی اور حافظ کی غزل سرائی اپنے درجہ پر رہ گئی۔ خیر اب راقم اپنے خیالات اردو کے شعرائے متغزلین کی نسبت عرض کرتا ہے حضرات ناظرین سے توجہ فرمائی کی التجا ہے۔

## ولی دکنی

ولی شمس الدین ولی دکنی اردو کی غزل گوئی کے اگر موجد نہیں ہیں تو اس زبان کی غزل گوئی کو درجہ امتیاز کے بخشنے والے تو ضرور ہیں۔ کس واسطے کہ ولی اپنے عہد میں کہ عہد عالمگیر تھا۔ غزل گوئی کو اس درجہ تک پہنچا چکے تھے کہ آج کی دنیا بھی ان کے اشعار کو بڑے تعجب کی نظر سے دیکھتی ہے۔ ان کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ ولی نہ صرف اپنے زمانہ کی زبان میں غزل سرائی کرتے تھے بلکہ میر، مرزا، مصحفی کی زبانوں کو بھی برتتے تھے۔ اس پر طرہ یہ کہ ان کے بہت سے کلام ایسے ہیں کہ جو ناخ سے لے کر حال کے زمانہ تک کی زبان میں دکھائی دیتے ہیں۔ غزل گوئی کے اعتبار سے ولی اول درجہ کے شاعر تھے۔ جو غزل گوئی کے تقاضے ہیں اُن سے ولی کو پوری اطلاع حاصل تھی چنانچہ غزل گوئی میں بیشتر شاعری کا داخلی پہلو ملحوظ رکھتے تھے۔ اسی لیے ان کی غزل سرائی پر تاثیر نظر آتی ہے۔ ان کے تنوع کلام سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مابعد جمیع متغزلین دہلی و لکھنؤ نے ان کے کلام سے فیض حاصل کیا ہے۔ اور سب غزل سرا بان نامی نے حسب استعداد ذاتی ان کی شاعری سے ہدایت پائی ہے۔ ولی کے کلام میں درد، سودا، میر، مصحفی، ذوق، ناسخ، آتش سب کے رنگ بکثرت موجود ہیں۔ اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ ولی کس قدر قوی الدماغ شاعر تھے جو ہر نوع کے کلام پر قدرت تامہ رکھتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ مابعد کے جتنے متغزلین موجد کسی طریق کے کہاتے ہیں۔ حقیقت اسی پر طریقت کے مرید ہیں۔ ولی کے کلام بہت ہیں اور گونا گوں رنگ رکھتے ہیں مگر اصل رنگ ان کا وہی ہے جسے میر، مرزا اور درد نے اختیار کیا۔ ولی کے کچھ اشعار ذیل میں نذر ناظرین ہوتے ہیں۔

صدیفت کے وہ یار مرے پاس نہ آیا	میر اسخن راست اسے راس نہ آیا
طاقت نہیں کسی کو کہ اک حرف من سکے	احوال گر کہوں میں دل بے قرار کا
شغل بہتر ہے عشق بازی کا	کیا حقیقی کا کیا مجازی کا
پھر میری خبر لینے وہ صیاد نہ آیا	شاید کہ مرا حال اسے یاد نہ آیا



اے دلی دل کو آب کرتی ہے نگہ چشم سرنگیں کی ادا  
نشہ سبزہ خطِ خواباں والی عالم خیال ہوا  
باعث نشہ دو بالا ہے حسن صورت کے ساتھ حسن ادا

سبحان اللہ کیا طرز کلام ہے غزل گوئی اسی سے عبارت ہے کوئی مصرعہ بھی دائرہ غزل گوئی سے باہر نہیں جاتا۔ سر شعر غزلیت سے اس قدر معمور ہے کہ غزل و قصیدہ کا فرق دکھا رہا ہے۔ افسوس کے دلی کے کلام سے کمتر اس عہد کے لوگ اطلاع رکھتے ہیں۔ حال کے حضرات معتزلین کا فرض منصبی ہے کہ دلی کو ہمیشہ پیش نظر رکھیں۔ تاکہ غزل گوئی کی لغزشوں سے مامون رہیں صاحب آب حیات سمجھتے ہیں کہ دلی کا دیوان لندن اور پیرس میں چھپ گیا ہے۔ واقعی اہل یورپ کس قدر علم پروری کا مذاق رکھتے ہیں۔ کہاں دلی کا دیوان اور کہاں لندن اور پیرس ایک اسی دیوان پر کیا موقوف ہے۔ سیکڑوں عربی فارسی کے دوا دین یورپ میں چھپ چکے ہیں۔ اور دوا دین پر ہی کیا موقوف ہے ہزاروں کتابیں مختلف ایشیائی علوم کی چھاپی گئی ہیں اور چھاپی جا رہی ہیں۔

## مرزا رفیع سودا

سودا۔ مرزا رفیع سودا تمام انواع شاعری پر عجیب قدرت رکھتے تھے۔ غزل گوئی میں بھی انہیں استاد کی کا درجہ حاصل تھا۔ فی الواقع ان کی قوت شاعری بہت حیرت خیز نظر آتی ہے۔ مضامین داخلی اور خارجی دونوں کی بندش پر انہیں اچھی طرح قدرت حاصل تھی۔ اس لیے تمام اصناف شاعری میں ان کا کلام عجیب جلوہ دکھا رہا ہے۔ اگر انہیں داخلی شاعری کچھ اور بھی قدرت ہوتی تو غزل گوئی میں میر کے ہسر مانے جاتے۔ یوں تو اور اصناف شاعری میں وہ میر سے بہت بڑھے ہوئے تھے میر صاحب کو خارجی شاعری کی بہت کم قوت حاصل تھی۔ بلکہ سودا کے مقابلہ میں کچھ نہ تھی۔ حقیقت حال یہ ہے کہ سودا کی قابلیت کے دنیا میں دس پانچ شاعر سے زیادہ نہ گزرے ہوں گے۔ سودا کی قوت شاعری ایسی ہے کہ اس سے کسی ملک کے آدمی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اور یہ لکھ چکا ہوں کہ شاعری کے دو پہلو ہیں۔ ایک خارجی اور دوسرا داخلی۔ خارجی پہلو کو تو مرزا صاحب ایسا برتتے ہیں کہ زبان اردو میں سوا میر انیس کے کوئی ان کا جواب نہیں ہے۔ مگر داخلی پہلو پر ان کو ویسی قدرت حاصل نہ تھی جس کے سبب وہ میر تقی صاحب سے غزل سرائی میں پیچھے نظر آتے ہیں۔ اگر مرزا سودا انگلستان میں ہوتے۔ تو دوسرے شیکسپیر ہوتے۔ مرزا صاحب کی اطلاع

ملکی بہت معلوم ہوتی ہے۔ اپنے ملک کے تمام معاملات کلی و جزوی سے باخبر تھے۔ یہی حال شیکسپیر کا بھی نظر آتا ہے کہ معاملات یورپ سے اسے پوری واقفیت حاصل تھی۔ خارجی پہلو کی شاعری برتنے کیواسطے اطلاع عام کی بڑی حاجت ہے۔ برخلاف اس کے داخلی شاعری میں معاملات خارجیہ کے دانست کی بہت حاجت نہیں ہوتی۔ داخلی شاعر کا درون ہی اس کی کائنات ہے جو واردات ذہنیہ اور معاملات قلبیہ اس کے ادراک میں جگہ رکھتے ہیں انہیں وہ موزوں کر دیتا ہے۔ آئندہ پھر ذکر مرزا سودا کا چند موقع پر آنے کو ہے جس سے مرزا صاحب کی شاعری کی بلند پایے کی ظاہر ہوگی۔ یہاں پر چوں کہ غزل سرائی کی بحث پیش ہے اس لیے ان کی غزل سرائی کے مادہ میں عرض کرنا کافی ہوگا کہ ہرچند وہ اس صنف شاعری میں تیسرے صاحب کے برابر نہیں ہیں اس پر بھی وہ اس صنف شاعری کے بھی ایک بڑے استاد ہیں۔ ان کا کلام درد، سوز و گداز، حسرت کی سے خالی نہیں ہے اور یہ وہ صفتیں ہیں کہ جو غزل سرائی کی جان ہیں۔ مرزا صاحب کی طباعی، طبیعت داری، شوخی، نازک خیالی، مضمون آفرینی بہت قابل لحاظ ہے۔ لاریب مرزا صاحب کا ایسا ہی درجہ ہے کہ استاد ناسخ ان کی شان میں یوں فرما گئے ہیں۔

کب ہماری فکر سے ہوتا ہے سودا کا جواب  
ہاں تبیح کرتے ہیں ناسخ ہم اس مغفور کا

ذیل میں کچھ مرزا صاحب کے اشعار نذر ناظرین ہوتے ہیں:-

ہم نے اسے ہر خار سیا بان میں دیکھا	بلبل نے جسے جا کے گلستان میں دیکھا
جس نور کو تُو نے مہ کنعان میں دیکھا	روشن ہے وہ ہر ایک ستارے میں زلیخا
لنکا وہ تری زلف پریشان میں دیکھا	برہم کرے جمیت کونین جوہل میں
اس روز کو ہم نے شب بجران میں دیکھا	واعظ تو سنی بولے ہے جس روز کی باتیں
کتنا وہ مزہ تھا جو ملک ان میں دیکھا	اے زخم جگر سودا التماس سے ٹھوکر

سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ

کیا جانے تُو نے اسے کس آن میں دیکھا

پہنچے کب اس کو ہاتھ ہمارے غبار کا	دامن صبا نہ چھو کے جس شہسوار کا
دل خاک ہو گیا ہے کسی بے قرار کا	موج نسیم آج ہے آلودہ گرد سے



### قطعہ

سودا قمارِ عشق میں شیریں سے کوہن  
بازی اگرچہ پانہ سکا سر تو کھو سکا  
کس منہ سے پھر تو آپ کو کہتا ہے عشق باز  
اے روسیاد تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

### قطعہ

بہنا کچھ اپنی چشم کا دشوار ہو گیا  
دی تھی خدائے آنکھ سونا سور ہو گیا  
بھٹکی پھرے ہے کب سے خدایا مری دُعا  
دروازہ کیا قبول کا معمور ہو گیا

### قطعہ

سودا کو کہتے ہیں کہ ہے اس سے مصاحب  
کتنا غلط یہ حرف بھی مشہور ہو گیا  
اوروں کی نسبت اندنوں کچھ لگ چلا تھا وہ  
دوچار جبر کیوں میں بستور ہو گیا

### قطعہ

تجھ بن عجب معاش ہے سودا کی ان دنوں  
تو بھی تک اس کو جا کے ستم گار دیکھنا  
نے حرف و نئے حکایت و نئے شعر و نئے سخن  
نے سیر باغ و نئے گل و گلزار دیکھنا  
خاموش اپنے کلبہ احزاں میں روز و شب  
تنہا پڑے ہوئے در و دیوار دیکھنا  
یا جا کے اس گلی میں جہاں تھا ترا گذر  
لے صبح تا بامِ کئی بار دیکھنا  
تسکین دل نہ اس میں بھی پائی تو بھر شغل  
پڑھنا یہ شعر گر کبھی اشعار دیکھنا  
کہتے تھے ہم نہ دیکھ سکیں تجھ کو غیر پاس  
پر جو خدا دکھائے سولا چار دیکھنا

عاشق تو نامراد ہیں پر اس قدر کہ ہم  
دل کو گنوا کے بیٹھ رہے صبر کر کے ہم  
کہتا تھا کل کسو سے کرونگا کسی کو قتل  
اتنا تو کشتی نہیں کوئی مگر کہ ہم  
دیکھیں تو کس کی چشم سے گرتے ہیں لختِ دل  
تو اس طرح سے روکے اے ابر تر کہ ہم  
بیٹھا نہ کوئی چھانوں نہ پایا کسی نے پھل  
بے برگ و بر نہیں کوئی ایسا شجر کہ ہم

قاصد کے ساتھ چلتے ہیں یوں کہے میرا شک  
دیکھیں تو پہلے پہنچے ہے واں نامہ برکہم  
اتنا کہاں ہے سوز طلب دل تپنگ کا  
رکھتی نہیں ہے شمع بھی ایسا جگر کہ ہم  
سودا نہ کہتے تھے کہ کسی کو تو دل نہ دے  
رہا ہوا پھر سے ہے تو اب در بندہ کہ ہم

گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ٹر بھی  
اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی  
کیا مذہب ہے مرے ساتھ خدا جانے وگرنہ  
کافی ہے تسلی کو مرے ایک نظر بھی  
ستد تری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات  
آئی ہے سحر ہونے کو ظالم کہیں مر بھی

سبحان اللہ کیا حسن کلام ہے۔ سوز و گداز، حسرت، درد، شوخی، نازک خیالی، بلند پروازی اور نگینی کے ساتھ زور طبیعت کا ایسا خوب صورت اظہار ہے کہ فی الواقع سودا کی غزل سرائی کی تعریف کما حقہ نہیں کی جاسکتی۔ اول تو دیوان اس قدر جم ہے کہ جس سے استحاب اشعار کر کے بھی درد، مومن، غالب، ذوق کے دیوان سے ان کا دیوان منتخب زیادہ حجم نکل سکتا ہے۔ دوم یہ کہ غزل سرائی اس اعلا درجہ کی ہے کہ سوا میر اور درد کے ان کا جواب کوئی نظر نہیں آتا ہے اگر تنویری حسرتی اور بھی سودا کے کلام میں ہوتی تو ان کا کلام میر اور درد کے برابر ہو جاتا۔ خدا جانے کہ سرزمین دہلی کی کیا تاثیر ہے کہ وہاں کے شعراء متغزلین اکثر غزل سرائی کی داد خوب دیتے گئے ہیں۔ اس پر تاثیر کا سبب یہی ہے کہ غزل سرائی میں واردات قلبیہ اور امور ذہنیہ کے مضامین کو حوالہ قلم کرتے گئے ہیں۔ یعنی غزل سرائی میں شاعری کے خارجی پہلو سے کام لیتے ہیں۔ ہمیشہ شاعری کے داخلی پہلو کو ملحوظ رکھا برخلاف اس کے استادان نکھنؤ غزل سرائی میں بیشتر شاعری کے خارجی پہلو سے کام لیتے رہے ہیں جس کے سبب سے ان کی غزل سرائی سے دل کو حسب مراد حظ نہیں اٹھتا ہے مرزا غالب فرمایا کرتے تھے کہ زبان اردو کو اہل نکھنؤ نے درست کیا۔ مگر مضمون آفرینی میں دہلی والوں کے برابر نہ ہو سکے مرزا غالب کا یہ قول مضمون آفرینی کے اعتبار سے تو صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ ناسخ، آتش اور ان استادوں کے شاگردوں نے مضمون آفرینی کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ہے۔ گریبات یہ ہے کہ نکھنؤ کے حضرات متغزلین دہلی کے حضرات متغزلین کے برابر پر تاثیر مضمون آفرینی نہ کر سکے۔ اس کا سبب یہی ہے کہ غزل سرائی میں حضرات نکھنؤ نے شاعری کے خارجی پہلو کو داخل کر دیا۔ جو غزل سرائی کے تقاضے کے خلاف ہے۔ پس یہ جدت مفید غزل سرائی کیوں کر ہوتی۔



## خواجہ میر درد

درد۔ خواجہ میر درد آپ کا نام ہے۔ سودا اور میر کے ہم عصر تھے گو پہلے ان ہر دو شاعران گرامی سے جلت فرمائی۔ اکثر مشاعروں میں یہ تینوں حضرات شریک رہے ہیں۔ خواجہ صاحب کی غزل سرائی نہایت اعلا درجہ کی ہے۔ سوز و گداز میں ان کے جواب یا میر تھے یا آپ اپنے جواب تھے۔ واردات قلبیہ کے مضامین ایسے باندھتے تھے کہ سودا ان تک نہ پہنچتے تھے۔ علاوہ اس کے خود طبیعت جو نہایت پُر درد واقع ہوئی ہے اس کا اثر ان کے کلام میں بدرجہ کثیر پایا جاتا ہے۔ ہر چند خواجہ کا دیوان مختصر سا ہے مگر قریب قریب انتخاب کا حکم رکھتا ہے۔ اگر میر صاحب کے دواوین سے انتخاب کیے جائیں تو خواجہ صاحب کے دیوان سے ان کے منتخب کا حجم بہت زیادہ نہ ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ دیوان کے ضخیم ہونے پر شاعری کی قدرت موقوف نہیں رہتی کلام کی خوبی قابل توجہ سمجھی جاتی ہے نہ اس کے دیوان کا حجم خواجہ صاحب کی غزل سرائی تمام تر اس صنف شاعری کے تقاضوں کے مطابق پائی جاتی ہے علاوہ سوز و گداز، درد، جستگی، علوم معانی اور سمو مضامین کے نظم کی شستگی راقم کی دانست میں میر صاحب کے کلام سے زیادہ بڑی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ خواجہ اپنے خیالات و کش کو بڑی صفائی کے ساتھ حوالہ قلم فرماتے ہیں۔ خواجہ کے کلام میں ایک امر اور بھی قابل لحاظ ہے کہ چوں کہ خلقت کی رو سے صاف دل تھے اور ریاضت نے ان کی اس قلبی کیفیت کو ترقی بخشی تھی۔ ان کے کلام میں عجب بے نفسی کی جلوہ گری پیدا ہے۔ المختصر غزل سرائی کے اعتبار سے ایک بڑے شاعر تھے اور ان کا نظیر سولے قیہ کے کوئی دوسرا نہیں دیکھا جاتا۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا ہے کہ درد کو حافظ کے ساتھ ہم سری ہے حافظ کے ساتھ نہ تو فارسی اور نہ اردو کے کسی شاعر کو ہم سری حاصل ہے۔ اس پر بھی درد کی غزل سرائی بڑی عظمت کی نگاہ سے دیکھے جانے کا استحقاق رکھتی ہے۔ ذیل میں کچھ اشعار خواجہ کے نذر ناظرین ہوتے ہیں:-

قتل عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا	پر ترے عہد سے آگے تو یہ دستور نہ تھا
مدر سر یا دیر تھا یا کعبہ یا بت خانہ تھا	ہم سبھی مہمان وہاں تھے تو ہی صاحب خانہ تھا
وائے نادانی کے وقت مرگ یہ ثابت ہوا	خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا
بھول جا چپ رہ غمت وہ سابقہ مت یاد کر	درد یہ مذکور کیا ہے آشنا تھا یا نہ تھا

ہم نے سو سو طرح سے مردیکھا  
 میں چاہوں اور کو تو یہ مجھ سے نہ ہو سکا  
 میں نے تو درگزر نہ کی جو مجھ سے ہو سکا  
 جب تلک پہنچے ہی پہنچے رکھکایاں ڈھیر تھا  
 تو کہہ کب تک آزما رہے گا  
 نہ سنا ہوگا گر سنا ہوگا  
 دل ہی نہیں رہا ہے کہ کچھ آرزو کریں  
 دامن پھوڑ دیں تو فرشتے و فز کریں  
 آئے بھی اگر ہزار جی میں  
 اتنا بھی نہ ملو کہ وہ بدنام کہیں ہو  
 گر دل ہوں تو آئندہ خاطر ہو تو رنجیدہ  
 تم نے کیا قہر کیا بال و پر پروانہ  
 کھل جائے اگر آنکھ تو پھر کیا نظر آئے  
 لوحِ مزار بھی مری چھاتی پہ سنگے،  
 مذکور کسی طرح تو جا کیجئے اس سے  
 ہم یہاں کیا آئے تھے کیا کر چلے  
 یاں سے سمجھانے کو اک دفتر چلے  
 چشم نم آئے تھے دامن تر چلے  
 جب تک بس ہیں سکے ساغر چلے  
 جو مانس بھی نہ لے سکے وہ آدہ کیا کرے  
 یوں ہی خدا جو چاہے تو بندے کا کیا چلے  
 اُس بے وفا کے آگے جو ذکر و وفا چلے  
 گر صبا کوئے یار میں گزرے  
 دن بہت انتظار میں گزرے  
 اے عمر رفتہ چھوڑ گئی تو کہاں مجھے

ان لبوں نے نہ مسیحائی کی  
 تو اپنے دل سے غیر کی الفت نہ کھوسکا  
 گونا گونا سا ہو نہ ہو آہ میں اثر  
 کی تو تاثیر آتش نے اس کو بھی  
 جفا سے غرض امتحان وفا ہے  
 اس نے قصداً بھی مرے نالے کو  
 ہم تجھ سے کس ہوس کی فلک جستجو کریں  
 ترد امنی پہ شیخ ہمساری نہ جاتیو  
 تو مجھ سے نہ رکھ غبار جی میں  
 ہر چہ نہ نہیں مہر تجھے درد و لیکن  
 ہر طرح زمانے کے ہاتھوں ہوں تم دیدہ  
 کاش تا شمع نہ ہوتا گذر پروانہ  
 جوں خواب ہے وابستہ غفلت یہ تماشا  
 اہل فنا کو نام سے ہستی کے ننگ سے  
 یار و مرا شکوہ ہی بھلا کیجئے اس سے  
 تہمتیں چہند اپنے ذمہ دھر چلے  
 ایک بھی پُرنہ نہ ہم لائے تھے ساتھ  
 شمع کی مانند ہم اس بزم میں  
 ساقیاں لگ رہا ہے چل چلاؤ  
 درد اپنے حال سے تجھے آگاہ کیا کرے  
 تیری گلی میں میں نہ چلوں اور صبا چلے  
 کہہ بیٹھو نہ درد کہ اہل وفا بول میں  
 یہی پیغام درد کا کہنا  
 کون سی رات آن طبع گکا  
 روندے بے مثل نقش قدم حلیاں مجھے



سبحان اللہ کیا غزل سرائی ہے۔ کن کن باتوں کی تعریف کی جائے خاموشی اذ شنائے تو حد  
 ثنائے تو۔ واقعی خواجہ صاحب کی غزل سرائی الہامی شاعری کا نمونہ ہے علاوہ سوز و گداز وغیرہ کے  
 ان کے کلام میں نفاست، متانت، شیرینی، ملاحیت، رنگینی بھی کس قدر پیدا ہے اور شوخی کس پاک  
 درجہ کی آشکارا ہے۔ اس شوخی کو اس ناپاک شوخی سے کیا علاقہ۔ جس پر جہاں زمانہ وجد کرتے ہیں۔ جو  
 شوخی مطبوع عوام ہو ہی ہے اس کی جھلک بھی خواجہ صاحب کے کلام میں پائی نہیں جاتی ہے۔ واقعی  
 اس زمانہ کے عوام کے خیالات جو شوخی کے مادے میں ہیں بہت قابل اصلاح نظر آتے ہیں کس واسطے  
 کہ ان خیالات کی بنا محض بد تہذیبی پر ہے۔ اللہمَّ احْفَظْنَا مِنْ ذَلِك۔

## میر تقی میر

میر نام نامی آپ کا میر محمد تقی ہے لاریب میر صاحب اردو کے سلطان المستعز لین ہیں۔ اور  
 استاد ناسخ کی عقیدت مندی ان کی جناب میں بے سبب نہ تھی۔ ع  
 آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر ہیں۔

میر صاحب کے چھ دیوان ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان میں بہت اشعار ایسے ہیں کہ ترک کر دینے  
 کے قابل ہیں۔ اس لیے کہ ان میں یا پست خیالی کا نقصان لاحق ہے یا ان کی شان اس قدر کم ہے  
 کہ ان کو میر صاحب کے کلام ہونے کا رتبہ حاصل نہیں ہے۔ اس پر بھی اگر ان چھ دیوانوں سے انتخاب  
 اشعار کیا جائے تو ایک نہایت حسب مراد دیوان مرتب ہو سکتا ہے۔ خیر اقام اب اپنے خیالات میر صاحب  
 کے منتخب کلام کی نسبت ظاہر کرتا ہے۔ اور وہ یہ ہیں کہ اگر میر صاحب کے منتخب کلام پر نگاہ ڈالنے  
 تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے کلام سے زیادہ خوب صورت کلام زبان اردو میں کہیں نہیں ہے اور  
 حقیقت حال بھی یہی ہے کہ خواجہ میر درد کو مستثنیٰ کر کے کسی شاعر ریختہ گو کو آج تک ان کے کلام کی  
 ہوا بھی نہیں لگی ہے۔ واقعی میر صاحب کچھ ایسا کہہ جاتے ہیں کہ ویسا کہنا تو درکنار ان کے دو ایک مصرع  
 کا چر بہی کسی سے نہیں اتر سکتا ہے۔ سارا دیوان ذوق یا ناسخ کا پڑھ ڈالنے ایک مصرع بھی کہیں  
 نظر نہ آئے گا۔ جس پر میر صاحب کے کلام کا دھوکہ ہو سکے۔ حالانکہ ناسخ یا ذوق کے استاد استاد ہونے  
 میں کسی صیغہ الحواس کو غور نہیں ہو سکتا۔ اس حیرت افزا غزل سرائی کا سبب جو ڈھونڈتے تو صرف  
 اتنی باتوں میں محدود پایا جاتا ہے کہ میر صاحب غزل سرائی میں کبھی واردات قلبیہ اور امور ذہنیہ کے  
 احاطہ سے باہر قدم نہیں رکھتے ہیں اور ان کے وہی اشعار زیادہ دل آویز معلوم ہوتے ہیں جو زیادہ

واردات قلبیہ سے متعلق معلوم ہوتے ہیں۔ میر صاحب کی غزل سرائی تمام تر شاعری کا داخلی پہلو رکھتی ہے۔ تب ہی تو ان کے کلام میں سوز و گداز، خشکی، انشعریت، رنگینی، ملاحظت شیرینی، شوخی وغیرہ کی کیفیتیں بدھ کر کثیر پائی جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کیفیات ہیں جو دل کو بھاتی ہیں۔ پس جس شاعر کے کلام میں یہ کیفیات موجود ہوں گی کیوں کر اس کا کلام دل آویز اور دل کش نہ ہوگا یہ سب صفتیں خواجہ میر درد صاحب کے کلام میں بھی موجود ہیں۔ مگر بدانت فقیہ خواجہ صاحب کے کلام میں میر صاحب کے کلام کے اعتبار سے خستگی کم ہے، لیکن سوز و درد خواجہ صاحب کا میر صاحب سے بڑھا نظر آتا ہے۔ علاوہ اس کے پاکیزگی اور نفاست خواجہ صاحب کے کلام کی بہت قابل توجہ ہے اسی طرح میر صاحب کے کلام میں دل گر فکلی محرونی اور انشعریت خواجہ صاحب کے کلام سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ خیر، سب کیفیات قلبی میں یہی دونوں حضرات ایک دوسرے کے جواب نظر آتے ہیں۔ مگر میر صاحب کو جو خواجہ صاحب پر غلبہ نظر آتا ہے۔ وہ قوت شاعری کے اعتبار پر ہے کہ یہ قوت میر صاحب کو خواجہ صاحب سے زیادہ حاصل تھی۔ امر موازنہ سے علاوہ ہو کر گذارش قائم میر صاحب کی غزل سرائی کی نسبت یہ ہے کہ ان کی سخن سنجی کا اندازہ ایسا ہے کہ کسی شاعر سے اس کا متبع ہو سکا بلکہ میر صاحب کے حسن کلام تک پہنچنے کی شعرا نے جس قدر کوششیں کیں اسی قدر انہیں پسپائی نصیب ہوئی۔ چنانچہ ذوق نے نہایت انصافاً فرمایا ہے:

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب      ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

اسی ناکامیابی نے مختلف شعرا کو مختلف غزل سرائی کی راہیں سوجھائیں مگر کوئی موصل الی المطلب نہ نکلی، ذوق، ناسخ، آتش نے جس قدر منزلیں طے کیں میر صاحب کی غزل سرائی کے دیار سے دور پڑتے گئے۔ مومن نے راہ راست اختیار کی بھی تو چمن منزل چل کر رہ گئے۔ غالب کا بھی یہی حال ہوا کہ منزل راہ راست پر چل کر آخر کار انہیں راہ زنوں سے پالا پڑا اور منزل مقصود تک نہ پہنچ سکے۔ مختصر یہ کہ جہاں میر صاحب جا کر منزل گزین ہوئے وہاں کوئی راہ رو نہ پہنچ سکا ذیل میں میر صاحب کے کچھ کلام نذر ناظرین ہوتے ہیں:-

### کلام میر تقی میر

ہنگامہ گرم کن جو دل نامبور تھا	پیدا ہر ایک نالہ سے شورِ نشور تھا
آتش بلند دل کی نہ بتی ورنہ اے کلیم	یک شعلہ برقِ حرمین صد کوہ طور تھا
ہم خاک میں ملے تو ملے لیکن اے سپہر	اس شوخ کو بھی ماہ پہ لانا ضرور تھا



## قطرہ

کل پانوں ایک کاسہ سر پر جو آگیا      یک سر وہ استخوان شکستوں سے چورتھا  
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر      میں بھی کبھی کسی کا سر پر غور تھا

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات      کلی نے یہ سن کر تبسم کیا  
جگر ہی میں یک قطرہ خوں ہے سرشک      پلک تک گیا تو طلاطم کیا

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دو نے کا کیا      دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا  
عہد جوانی و رو کا تا پیری میں لیں آنکھیں موند      یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا  
ناقی ہم مجبور ہیں پرستہ بہت ہے مختاری کی      چاہے ہیں سو آپ کریں ہم کو عبث بدنام کیا  
شیخ جو ہے مسجد میں سنگا رات کو تنہا میناڑے      عجبہ خرقة کرتا تو پیستی میں انعام کیا  
یاں کے سفید ریسہ میں جھکھل جو ہے سوا ناہے      رات کو در و صبح کیا دن کو جوں توں شام کیا  
تیر کے دین و مذہب اب پوچھتے کیا ہو ان زتو      قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

منہ کا ہی کرے ہے جس تپس کا      حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا  
شام سے کچھ بچھا سا رہتا ہے      دل ہوا ہے چراغِ مغلط کا  
تاب کس کو جو حال میسر ہوئے      حال ہے اور کچھ ہی مجلس کا

جب جنوں سے ہمیں توصل تھا      اپنی زنجیر پا ہی کا غل تھا  
یک نگہ کو دفنا نہ کی گویا      موسم گل مفسرِ ببل تھا  
ان نے پہچان کر ہمیں سارا      منہ نہ کرنا ادھر تجا بل تھا  
اب تو دل کو نہ تاب ہے نہ قرار      یاد ایام جب تحمل تھا  
خوب دریافت جو کیا ہم نے      وقت خوش میر نکہت گل تھا

مارا زہن میں گاڑا تب اس کو صبر آیا  
موجیں کرے ہے بحر جہاں میں ابھی تو تو  
اس دل نے ہم کو آخریوں خاک میں ملایا  
جانے گا وقت مرگ کہ عالم حباب تھا

گل کو محبوب ہم قیاس کیا  
دل نے ہم کو مثالِ آئینہ  
فرق نکلا بہت جو باس کیا  
ایک عالم کا روشناس کیا  
صبح تک شمع سر کو موصفتی ہے  
کیا پتنگے نے التماس کیا

داغِ فراقِ حسرتِ وصلِ آرزوئے شوق  
کیا کہوں کیسا تم غفلت سے مج پر ہو گیا  
میں ساتھ زیرِ خاک بھی ہنگامہ لے گیا  
قافلہ جاتا رہا میں صبح ہوتے سو گیا  
بکیسی مدتِ تلکِ برسا کی اپنی گور پر  
میر ہر اک موج میں ہے زلف ہی کلا دماغ  
جب سے وہ دیا پہ آکر ہاں اپنے دھو گیا  
جو ہماری خاک پر سے ہو کے گزرا رو گیا

دل سے شوقِ رُخِ نکونہ گیا  
سب گئے ہوش و صبر تاب و توان  
جھانکنا تاکنا کبھو نہ گیا  
لیکن اے داغِ دل سے تو نہ گیا  
سُجھ گردان ہی میسر ہم تو رہے  
دست کوتاہ تا سُبھو نہ گیا

کچھ نہ دیکھا پھر بجز یک شعلہ پر چچ و تاب  
دور تجھ سے میر نے ایسا تعب کھینچا کہ شوخ  
شمع تک ہم نے تو دیکھا تنہا کہ پروانہ گیا  
کل جو میں دیکھا اسے مطلق نہ پہچانا گیا

اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا  
ہوش جاتا نہیں رہا لیکن  
ہوا آتا ہے جب نہیں آتا  
جب وہ آتا ہے تب نہیں آتا  
صبر تھا ایک مونس ہجران  
دل سے خفیت ہوئی کوئی خواہش  
گر یہ کچھ بے سبب نہیں آتا  
پر سخن تا بلب نہیں آتا  
عشق بن یہ ادب نہیں آتا  
جی میں کیا کیا ہے اپنے اے ہدم  
دور بیٹھا غبارِ میسر اس سے



شب فروغ بزم کا باعث ہوا تھا حسن دوست      شمع کا جلوہ نصبار دیدہ پر دانہ تھا  
جو اس شور سے میر رقتا رہے گا      تو ہم سایہ کا ہے کو سوتا رہے گا  
مغاں مجھ مست بن پیر خندہ سا غم نہ ہوئیگا      لئے گلگوں کا شیشہ ہچکیاں لے لے کے ہوئیگا

اے گل نو دمیدہ کے مانند      ہے تو کس آفریدہ کے مانند  
ہم امید و وفا پر تیری ہوتے      غنچہ دیر چسیدہ کے مانند  
سراٹھاتے ہی ہو گئے پامال      بسزہ نو دمیدہ کے مانند  
ہم گرفتار حال ہیں اپنے      طائر پر بریدہ کے مانند  
دل تڑپتا ہے اشک خونیں ہیں      صید خون طسیدہ کے مانند  
میر صاحب بھی اس کے پاس تھے لیک      بندہ نہ خسیدہ کے مانند

اگر راہ میں اس کے رکھا ہے گام      گئے گذرے حضرت علیہ السلام  
دہن یار کا دیکھ چپ لگ گئی      سخن یاں ہوا ختم حاصل کلام

میرے سنگ مزار پر فساد      رکھ کے تیشہ کہے ہے یا استاد

کہتے ہوا تھا د ہے ہم کو      ہاں کہو اعتماد ہے ہم کو  
نامرادانہ زیست کرتا تھا      میسر کا طور یاد ہے ہم کو

دیکھ تو دل کہ جاں سے اٹھتا ہے      یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے  
خاندہ دل سے زینہاں نہ جا      کوئی ایسے مکاں سے اٹھتا ہے  
یوں اٹھے آہ اس گلی سے ہم      جیسے کوئی جہاں سے اٹھتا ہے

مرا پا آرزو ہونے لے بندہ کر دیا ہم کو  
فلک اے کاش ہم کو خاک ہی رکھتا کہ اس میں ہم  
وگرنہ ہم خدا تھے گردِ بے مدعا ہوتے  
غبارِ راہ ہوتے یا کسی کے خاکِ پا ہوتے

اپنی ہستی حساب کی سی ہے  
تازگی اس کے لب کی کیا کہیے  
یہ ناشِ شراب کی سی ہے  
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے  
بار بار اس کے در پہ جباتا ہوں  
میں جو بولا کہہا کہ یہ آواز  
حالتِ اب اضطراب کی سی ہے  
اُسی خانہِ خسراب کی سی ہے  
میرانِ نیم باز آنکھوں میں  
ساری مستی شراب کی سی ہے

شمعِ صفت جب کبھی مرجائیں گے  
اب جو اک حسرتِ جوانی ہے  
ساتھ لیے داغِ جگر جائیں گے  
عمرِ رفتہ کی اک نشانی ہے  
ہم قفسِ زادِ قیدی ہیں درنہ  
تا چن ایک پر فحاشی ہے

چہرے سے اٹھا برقع کو وہ بت اگر آوے  
جب نام ترا لہجے تب آنکھ بھرا آوے  
اللہ کی قدرت کا تماشا نظر آئے  
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آئے

کرے کیا کہ دل بھی تو مجبور ہے  
دل اپنا نہایت ہے نازک مزاج  
زمینِ سخت اور آسماں دور ہے  
گرا گریہ شیشہ تو پھر چور ہے

تربتِ میسر پر ہیں اہلِ سخن  
تو بھی تقریبِ فاتحہ سے چل  
ہر طرف حرف ہے حکایت ہے  
یہ خدا واجب الزیارت ہے

کیا کروں شرحِ خستہ جانی ہے  
حال بہ گفتمی نہیں میرا  
میں نے مَرَمَر کے زندگانی کی  
تم نے پوچھا تو مہربانی کی  
جس سے کھوئی تھی نیند میرے کل  
ابتدا پھر وہی کہانی کی



اب کی بھی سیر باغ کی جی میں ہوس رہی  
 میں پاشکتہ جانہ سکا قافلے تملک  
 دن رات میری آنکھوں سے آنسو چلے گئے  
 جون صبح اس چہن میں نہ ہم کھل کے نہس سکے  
 اپنی جگہ بہار میں کچھ قفس رہی  
 آئی اگر چہ دیر صدائے جرس رہی  
 برسات ابکی شہر میں سارے برس رہی  
 فرصت رہی جو تیر تو بس اک نفس رہا

آج کل بے قرار ہیں ہم بھی  
 آن میں کچھ ہیں آن میں کچھ ہیں  
 منع گریہ نہ کر تو اے ناصح  
 نلے کو یوں سمجھ کے اے بلبل  
 مدعی کو شراب ہم کو زہر  
 گرز خود رفتہ ہیں ترے نزدیک  
 میر نام اک جوان سنا ہوگا  
 موت اک ماندگی کا وقفہ ہے  
 بیٹھ جا چلنے بار ہیں ہم بھی  
 تحفہ روزگار ہیں ہم بھی  
 اس میں بے اختیار ہیں ہم بھی  
 باغ میں یک کنار ہیں ہم بھی  
 عاقبت دوست دار ہیں ہم بھی  
 اپنے تو یادگار ہیں ہم بھی  
 اُسی عاشق کے یار ہیں ہم بھی  
 یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

فقیرانہ آئے صدا کر چلے  
 جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم  
 وہ کیا چیز ہے آہ جس کے لیے  
 کوئی نہ امید نہ کرتے نگاہ  
 دکھائی دیئے یوں کہ بے خود کیا  
 کہیں کیا جو پوچھے کوئی ہم سے میر  
 کہ میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے  
 سو اس عہد کو اب وفا کر چلے  
 ہر اک چیز سے دل اٹھا کر چلے  
 سو تم ہم سے منہ بھی چھپا کر چلے  
 ہیں آپ سے بھی جدا کر چلے  
 جہاں میں تم آئے تھے کیا کر چلے

کوئی ہو محرم شوخی ترا تو میں پوچھوں  
 کہ بزم عیش جہاں کیا سمجھ کے برہم

مصاب اور تھے پر دل کا حبان  
 عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

واضح ہو کہ اشعار بالا راقم نے نمونہ کے طور پر میر صاحب کے دیوان اول سے انتخاب کر لیے ہیں اس انتخاب سے یہ مطلب نہیں ہے کہ اس دیوان میں اس کے علاوہ اور اشعار انتخاب کے قابل نہیں ہیں۔ بہر حال اتنے اشعار میر صاحب کے انداز کلام کو دکھانے کے واسطے کافی ہیں۔ حضرات اہل قلم واقفیت سے مخفی نہیں ہے کہ اشعار بالا میں کیا کیا واردات قلبیہ اور امور ذہنیہ کی کیفیتیں شاعری کے پیرایہ میں بیان کی گئی ہیں۔ اور لطف بالا لطف یہ ہے کہ یہ سب دشوار کیفیتیں جو مسائل علمیہ کا حکم رکھتی ہیں۔ ایسی آسان اور سلیس زبان میں بیان کی گئی ہیں کہ اس سے آسان اور سلیس تر زبان میں ان کا بیان کیا جانا ممکن نہ تھا۔ واقعی کیا کیا دشوار مضامین کو جو محض قلب و ذہن سے متعلق ہیں میر صاحب ایسی آسانی اور خوش اسلوبی کے ساتھ بیان فرما جاتے ہیں کہ عقل دنگ ہو جاتی ہے۔ ان کی سادگی زبان کا عالم فی الحقیقت نرالا ہے۔ بیان مضامین بیشتر تشبیہ استعارہ اور مبالغہ سے احتراز رکھتا ہے اور اگر کہیں ان صنعتوں کو دخل بھی دیتے ہیں تو اس خوبصورتی سے کہ آورد کی کیفیت مطلق ظاہر نہیں ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب شاعر سخن سنجی میں قاصر آتا ہے تب ہی تشبیہ استعارہ اور مبالغہ سے اپنے کلام میں اعانت لیتا ہے۔ ورنہ منقہ، خوش اسلوب، پُر تاثیر، دلغریب جاں فزا، روح پرور، نچرل مضمون زینہار ایسی ایسی ترکیبوں کا محتاج نہیں ہوتا چنانچہ بہت سے گیت دُہرے وغیرہ ایسے ہیں کہ تمام تر تشبیہ استعارہ اور مبالغہ سے پاک ہیں مگر ان کے مضامین کی عمدگی ایسی ہے کہ بے اختیار دل پر عجب بامراد تاثیر پیدا کرتی ہے۔

## مومن دہلوی

مومن۔ حکیم مومن خاں، ذوق کے ہم عصر تھے۔ مگر ذوق سے غزل گوئی کا رنگ علاحدہ رکھتے تھے۔ غالب بھی اسی زمانہ میں تھے گو مومن کے بعد بہت دنوں تک زندہ رہے۔ ہر چند مومن اور غالب دونوں غزل سرائی میں شاعری کا داخلی پہلو برتتے تھے۔ تو بھی ان دونوں کے مذاق شاعری جدا گانہ تھے۔ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں ہے کہ مومن کی جتنی غزلیں ہیں ایک ہی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ مومن کی غزل سرائی دہلی کی غزل سرائی کا طور کھیتی ہے۔ غزل سرائی میں مومن بھی واردات قلبیہ اور امور ذہنیہ کے مضامین حوالہ قلم کرتے ہیں۔ گو ان کے بیان میں خواجہ درد یا میر صاحب کے کلام کی پُر تاثیر پائی نہیں جاتی ہے۔ ان دونوں بزرگوار کے کلام کی خوبی یہ ہے کہ جس طرح کمان سے تیر نکلے ان کا کلام سامع کے دل پر فوراً جا بیٹھتا ہے۔ برخلاف اس کے مومن کا انداز سخن ہے کہ جب تک بغور ان کے کلام پر نظر



نڈالیے لطف کلام حاصل ہی نہیں ہوتا۔ اس لیے بعض بے مغزوں نے مومن کے دیوان کو مہل قرار دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مومن ایک بڑے طبع شاعر ہیں۔ مگر میر صاحب کے کلام کی رفعت، جلالت، کمند، جستگی، برستگی کو نہیں پہنچتے ہیں۔ اور ہر چند وصل، فراق، غم، ملال، سنج، صبرا، عداوت، حسد، رشک، اضطراب، بے تابی، بے خوابی کے مضامین خوب باندھتے ہیں۔ مگر ان کے کلام سے کبھی کبھی کوچہ گردی کی بو آ جاتی ہے۔ اس پر بھی جو نامہ انداز کے ساتھ تہذیب کی عنان کبھی ہاتھ سے نہیں دیتے خیر، خواجہ اور میر سے معاملات قلبیہ کے مضامین کی بندش میں مومن خاں جو کچھ کم سمجھے جاتیں مگر حقیقت حال یہ ہے کہ وہ ایک ایسے بڑے غزل سرا ہیں کہ ان کی غزل سرائی پر اہل دہلی کو بلکہ اہل دیار کے اہل مذاق کو ناز ہونا چاہئے۔ مومن خاں کی غزل سرائی تشبیہ سے اکثر پاک دیکھی جاتی ہے۔ استعارے بھی کثرت سے داخل کلام نہیں ہوتے اور مبالغے با مذاق سے خالی نہیں دیکھے جاتے۔ ان کی شاعری میں جو کچھ نقصان ہے وہ نقصان بندش ہے۔ نقصان مضامین نہیں ہے۔ مثلاً تعقیدات کو ان کے کلام میں دخل نہ ہوتا تو ان کی غزل سرائی ترکیب زبان عیب سے پاک ہوتی۔ راقم قبل میں عرض کر چکا ہے کہ اکثر سرائے دہلی غزل سرائی میں شاعری کا داخلی پہلو برتتے ہیں۔ برخلاف ان کے شعرائے نکھو خارجی پہلو سے بیشتر سروکار رکھتے ہیں۔ راقم ذیل میں دو غزلیں حوالہ قلم کرتا ہے۔ ایک مومن خاں کی ہے دوسری خواجہ آتش کی۔ اہل نظر پر روشن ہے کہ مومن اپنی اس تمام غزل میں تین شعر کے سوا داخلی پہلو کے متسک رہے ہیں اور آتش ساری غزل میں خارجی پہلو سے کام لیا کیے ہیں۔

### غزل مومن

دس میں روز مرتے ہیں دو چار کے لیے	کرتا ہے قتل عام وہ اغیار کے لیے
عاشق ہوتے ہیں وہ مرے آزار کے لیے	دیکھنا مذاق رنج دل زار کے لیے
یہ ہی سزا تھی ایسے گنہگار کے لیے	قتل اس نے جرم صبر جفا پر کیا مجھے
تجویز زہر ہے ترے بیمار کے لیے	لے تو ہی بھیج دے کوئی پیغام تلخ اب
تسکین اضطراب دل زار کے لیے	آتا نہیں ہے تو تو نشانی ہی بھیج دے
ہو جاؤ یوں عدم مرے اغیار کے لیے	کیا دل دیا تھا اس لیے میں نے تمہیں کہ تم
طرب غرام و شوخی رفتار کے لیے	چلنا تو دیکھنا کہ قیامت نے بھی قدم
اظہار حال چشم گہر بار کے لیے	جی میں ہے موتیوں کی لڑی اسکو بھیج دوں
بوسے جو خواب میں ترے رخسار کے لیے	دیا ہوں اپنے لب کو بھی گل برگ سے مثال

جینا امید وصل یہ بھراں میں سہل بھتا مرنا ہوں زندگانی دشوار کے لیے  
 مومن کو تو نہ لائے کبھی دام میں وہ بت ڈھونڈے ہے تار سجد کے زنا کے لیے  
 واضح ہو کہ گہر بار، رخسار، اور زنا را شیائے خارجیہ سے ہیں۔ ناچار ان اشعار کے مضامین  
 بھی خارجی پہلو سے بندھے۔ اگر مومن خاں کو کچھ استعارہ پردازی پر عمل کر جائے تو یہ قافیہ داخلی  
 پہلو کے مضامین کے ساتھ بندھ جاتے۔ غالب ہوتے تو ضرور یہی روش اختیار کرتے جیسا کہ ان کی  
 روش خاصی کا تقاضا ہے۔

### غزل خواجہ آتش

ناہمی اپنی پردہ ہے دیدار کے لیے      ورنہ کوئی نقاب نہیں یار کے لیے  
 نور تجستی ہے ترے رخسار کے لیے      آنکھیں مری کلیم ہیں دیدار کے لیے  
 قول اپنا ہے یہ سب و زنا کے لیے      دو پھندے ہیں یہ کافرو دینار کے لیے  
 لطف چن ہے بلبل گلزار کے لیے      کیفیت شراب ہے غم خوار کے لیے  
 سیری نہ ہوگی تشنہ دیدار کے لیے      پانی نہیں چہ ذقن یار کے لیے  
 اتنی ہی ہے غم و مرے یار کے لیے      شیرہ ہے جس قدر مرے اشعار کے لیے  
 دشتِ عدم سے آئے ہیں باغ جہاں میں ہم      بے دارغ لالہ و گل بے خسار کے لیے  
 شمشاد اپنے طہرہ کو بیچے تو لیجیے      اس لالہ رو کی لٹوٹی دستار کے لیے  
 دوا آنکھیں چہرے پر نہیں تیرے فیکر کے      دو ٹھیکرے ہیں بھیک کے دیدار کے لیے  
 سرمہ لگایا کیجئے آنکھوں میں مہربان      اکیر یہ سرفوف ہے بیمار کے لیے  
 حلقہ میں زلف یار کے موتی پروتیے      دندان ضرور ہیں دہن یار کے لیے  
 گفت و شنید میں ہوں بسر دن بہار کے      گل کے لیے ہے گوش زباں خار کے لیے

واضح ہو کہ خواجہ کی یہ غزل چھتیس شعر کی ہے۔ بطور نمونہ ایک طرف سے بارہ شعر  
 نقل کر لیے گئے ہیں۔ سوا مطلع کے کہ داخلی پہلو رکھتا ہے۔ جمیع اشعار اس غزل کے خارجی مضامین  
 سے مشتمل ہیں۔ یہ ایک عمدہ مثال اس دعا کی ہے کہ نکھنؤ کے استادان غزل بہت خارجی مضامین  
 برتتے ہیں۔ ساری غزل خواجہ کی وارداتِ قلبیہ اور امور ذہنیہ سے ہر احوال دور ہے۔ جتنے امور عالم  
 خارج سے متعلق ہیں وہی احاطہ بندش میں درآتے ہیں۔ برخلاف اس کے مومن کی غزل ہے کہ تین



شعر کے سوا بقیہ اشعار غزل محض امور ذہنیہ ہیں۔ اور ہر چہ انداز و درجہ کے واردات قلبیہ سے خبر نہیں دیتے ہیں۔ تو بھی امور داخلی ہونے کے باعث غزلیت ہی کی شکل قائم رکھنے والے ہیں۔ الحق غزل سرائی کے لیے داخلی پہلو کے مضامین نہایت مطبوع ہوتے ہیں۔ چنانچہ خواجہ کا پہلا مطلع جو داخلی پہلو رکھتا ہے۔ بقیہ اشعار غزل سے زیادہ غزلیت کا لطف رکھتا ہے۔ یہ تو خواجہ کی رنگینی طبیعت کی خوبی ہے۔ کہ خارجی مضامین بھی ان کی غزلوں میں کچھ مزہ دے جاتے ہیں۔ ورنہ اگر کوئی دوسرا شاعر خارجی رنگ میں غزل لکھتا تو یقیناً اس کی غزل میس سے خالی نہیں ہوتی۔ اہل مذاق سے پوشیدہ نہیں ہے کہ مومن کی غزل کس قدر غزلیت کا مزہ دے رہی ہے۔ یہ لطف مجرد داخلی مضامین کی بدولت ہے ورنہ بندش و زبان میں خواجہ کے اشعار مومن کے اشعار پر بدجہا غالب ہیں۔ ذیل میں کچھ مومن کے کلام نمونہ کے طور پر منسلک ہذا کیے جاتے ہیں:-

### غزل مومن

رات کس کس طرح کہانہ رہا	نہ رہا پردہ مہ لقمانہ رہا
غیر اگر قسریب خانہ رہا	شوق اب تیرے آنے کا نہ رہا
تیرے پردے نے کی یہ پردہ دہی	تیرے چھپتے ہی کچھ چھپانہ رہا
غم مرا کس لیے کہ دنیا میں	نہ رہا میں مرا فسانہ رہا
مدنا غیر سے کہتا وہ	سمجھے اب کچھ بھی مدعا نہ رہا
غیر چھپ کر کے ہے زخم دل پہ نمک	شور الفت میں بھی مزانہ رہا
دل لگانے کے تو اٹھائے مزے	جی بلا سے رہا نہ رہا
تو فلک مرگ ہم سے سب غافل	اب کسی کا بھی آسرا نہ رہا
مومن اس بت کے نیم ناز ہی میں	تم کو دعوا اتقا نہ رہا

مانکیے چاک گریباں کو تو ہر بار لگا	باتھ کٹواؤں جو ناصح رہے اب تار لگا
بس کہ اک پردہ نشیں سے دل بیمار لگا	جو مریضوں سے چھپاتے ہیں وہ آزار لگا
تو کسی کا بھی خسریا نہیں پر ظالم	مفسر دوشوں کا ترے کوچہ میں بازار لگا
کعبہ سے جانب بت خانہ پھر آیا مومن	کیا کرے جی نہ کسی طرح سے زہار لگا

مرے کوچہ میں عدو مضطرب و ناشاد رہا  
اس روانی سے ذرا خنجر بے داد رہا  
نقدِ جاں تھانہ سزا دیت عاشق حیف  
لے چلا جوش جنوں جانب صحر افسوس  
گہم غم خور گئے عشق بتاں اے مومن  
شبِ خدا جانے کہاں وہ ستم ایجاد رہا  
بارے اک دم اثر نالہ و فساد رہا  
خونِ فساد سرگردنِ فساد رہا  
جب مرے کوچہ میں آکر وہ پر یزاد رہا  
میں سدا سوختہ حسنِ خدا داد رہا

وعدہ وصلت سے دل ہوشاد کیا  
کچھ قفس میں ان دنوں لگتا ہے جی  
نالہ پیہم سے یان فرصت نہیں  
ہیں اسیر اس کے جو ہے اپنا اسیر  
شوخی بازاری تھی شیریں بھی مگر  
نشہ الفت سے بھولے یار کو  
نالہ اک دم میں اڑا ڈالے دھوئیں  
جب مجھے رنج دل آزاری نہ ہو  
پاؤں تکت پڑتی وہ زلفِ خمِ نجم  
کیا کروں اللہ سب ہیں بے اثر  
دل ربانی زلفِ جاناں کی نہیں  
ان نصیبوں پر کیا اختر شناس  
روزِ محشر کی توقع ہے عبث  
گر بہائے خونِ عاشق ہے وصال  
بت کدہ جنت ہے چلیے بے ہراس

تم سے دشمن کی مبارک باد کیا  
آشیاں اپنا ہوا برباد کیا  
حضرت نامح کرین ارشاد کیا  
ہم نہ سمجھے صید کیا صیاد کیا  
ورنہ فسقِ خسرو فساد کیا  
سچ ہے ایسی بے خودی میں یاد کیا  
چرخ کیا اور چرخ کی بنیاد کیا  
بے وفا پھر حاصل بے داد کیا  
سرو کو اب باندھیے آزاد کیا  
ولولہ کیا، نالہ کیا فساد کیا  
پیچ و تاب طرہ شمشاد کیا  
آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا  
ایسی باتوں سے ہو خاطر شاد کیا  
انتقامِ زحمتِ جلاد کیا  
لب پہ مومن ہر چہ بادا باد کیا

روز جزا جو قاتل دل جو خطاب تھا  
عاشق ہوئے ہیں آپ کہیں گواسی پہوں  
وقت و داعِ بے سبب آندہ کیوں ہوئے  
میرا سوال ہی مرے خوں کا جواب تھا  
شبِ حال غیرِ محب سے زیادہ خراب تھا  
یوں بھی تو ہجر میں ہے رنج و غلاب تھا



کیا جی لگائے تذکرہ یار میں عبث  
رو ز جزا خدا بت جلا د کو ملا  
نامح سے مجھ کو آج تلک اجتناب تھا  
گویا کہ خون ناحق مومن ثواب تھا

شب تم جو بزم غیر میں آنکھیں چرا گئے  
پوچھا کسی پر مرتے ہو اور دم نکل گیا  
کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے  
ہم جان سے عنان بہ عنان جدا گئے  
پھیلی وہ بوجو ہم ہیں نہاں مثل غنچہ بھتی  
مجلس میں اس نے پان دیا اپنے ہاتھ سے  
اٹھا نہ ضعف سے گل داغ جنوں کا بوجھ  
غیر دل سے ہو وہ پردہ نشیں کیوں بے حیا  
تقی بدگمانی اب انہیں کیا عشق حور کی  
تابندہ و جوان تو بخت رقیب تھے  
ہم تیرہ روز کیوں غم بھراں کو بھا گئے  
وہ بھی ہماری لاش کو ٹھوکر لگا گئے  
عالم شب وصال کے آنکھوں نہیں چھا گئے  
اے مومن آپ کب سے ہوئے بندہ بتاں  
بارے ہمارے دین میں حضرت بھی آگئے

## ذوق دہلوی

ذوق۔ شیخ ابراہیم ذوق ظفر شاہ کے استاد تھے۔ بادشاہ کے حضور سے خان بہادر اور خاقانی ہند کے خطابوں سے سرفراز بھی ہوئے تھے۔ کوئی شک نہیں کہ ذوق ایک بڑے ممتاز شاعر گذرے ہیں۔ مگر ان کی غزل سرائی، غزل سرائی کے تقاضوں کے مطابق پورے طور پر نہ تھی۔ اسی لیے اس صنف شاعری میں وہ خواجہ میر درد یا میر تقی میر کے برابر نہیں سمجھے جاسکتے ہیں۔ ذوق غزل سرائی میں زیادہ خارجی مضامین باندھتے ہیں اور جو داخلی مضامین باندھتے ہیں تو ان میں درد اور میر کے کلام کے سوز و گداز خستگی وغیرہ کی کیفیت نہیں پائی جاتی پس ظاہر ہے کہ اسی صورت میں ان کی غزل سرائی ان دونوں بزرگوں کی غزل سرائیوں کا لطف نہیں پیدا کر سکتی ہے۔ ذوق کے تمام دیوان کو دیکھ کر یہ بات معلوم ہوتی ہے ان کے تو شعر میں پختہ شعر فارسی ننگے ہوتے ہیں۔

اسی لیے ان کی غزل سرائی حضرت اہل لکھنؤ کی غزل سرائی سے زیادہ مشابہ نظر آتی ہے۔ اور اسی لیے ان کا کلام ان کے معروف شعرائے وطن کے کلاموں سے ایک علاحدہ انداز رکھتا ہے۔ اگر مومن اور غالب سے شوق کو ملائیے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ ذوق غزل سرائی میں اپنے ملکی مذاق کے پابند نہ تھے بلکہ ان کا مذاق غزل سرائی کا ایسا دکھائی دیتا ہے کہ جس سے وہ شیخ ناسخ اور خواجہ آتش کے ہم مذاق معلوم ہوتے ہیں۔ قوت شاعری کے اعتبار سے ذوق ایک زور آور شاعر تھے۔ ان کی خلاق سخن، بلند پروازی، نازک خیالی، نفیس مزاجی وغیرہ وغیرہ میں کسی کو مجال گفتگو نہیں ہے۔ مگر غزل سرائی میں وہ اُس روش کے پابند نہیں رہے ہیں۔ جو درد اور میر کی تھی۔ اسی لیے ان کی غزلیں باوجود عالی خیال وغیرہ کے وہ تاثیر قلبی پیدا نہیں کرتی ہیں جس کی متقاضی غزل سرائی ہے۔ حضرت ذوق کے کچھ کلام بطرز نمونہ ذیل میں نذر ناظرین ہوتے ہیں۔ جس سے ان کی غزل سرائی کا رنگ ہویدا ہوگا۔

### ذوق کے خارجی مضامین کے اشعار

شوق نظارہ ہے جب سے اس شوخ پر نور کا ہے مرامِ نظر پروانہ شمع طور کا  
واضح ہو کہ یہ غزل کی غزل جو شیخ ناسخ کی غزل پر لکھی گئی ہے۔ ناسخ کی غزل کی طرح تمام تر شاعری کا خارجی پہلو کھتی ہے۔ ذوق کی اس غزل سرائی میں پچیس شعر ہیں اور سب کے سب کم و بیش طور پر خارجی مضامین سے مشتمل ہیں۔

نام منظور ہے توفیق کے اسباب بنا      پُل بنا چاہ بنا مسجد و تالاب بنا  
واہ کیا مرہم زخمِ دل بیتاب بنا      آب سے نشترِ سر تیز کے تیزاب بنا

یوں تن خاکی میں دل روشن ہمارا ہو گیا      جس طرح پانی کنوئیں کی تہ میں تارا ہو گیا  
میرے نالوں سے جو پانی سنگِ خارا ہو گیا      کوہ کے چشموں کا ہر آنسو شرار ہو گیا

یاں تک عدو زمانہ ہے مردِ دلیر کا      جھلسے ہیں منہ شکار کیے پر بھی شیر کا  
جس گھر میں ہو لڑائی وہاں آدمی نہیں      کانا ہے گھر میں سیاہی کا یا گلِ کنیر کا



دریائے اشک چشم سے جس آن یہ گیا سُن ییچو کہ عرش کا ایوان بہ گیا  
ان سب غزلوں کے بھی اکثر اشعار تمام تر خارجی پہلور کھتے ہیں۔

ہے قفس سے شور اک گلشن تلک فریاد کا خوب طوطی بولتا ہے ان دنوں صیاد کا  
روز مرگ عاشق ناشاد ہے شادی کا دن ہے بجائے شور ماتم غل مبارک باد کا  
آپخ سے تلوار کی ڈرتا نہیں یہ سخت جان کشتہ کرنا سخت ہے مشکل ہے اس فولاد کا  
یہ مینوں شعر اس غزل کے ہیں جو ذوق نے ناسخ کی غزل پر لکھی تھی۔ یہ غزل بھی ناسخ کی غزل کی طرح  
اکثر خارجی مضامین سے مشتمل ہے اور کھلے ڈلے طور سے ناسخ کا رنگ رکھتی ہے۔

عالم ہے زندگی میں زمانہ شباب کا گلشن میں برگ برگ ہے پھول آفتاب کا  
جلوہ ہو کیوں کہ خاک پہ تاب عتاب کا جلتا نہیں ہے برق سے دامن سحاب کا  
اے کارخو: چھیڑنا دامن سحاب کا دیکھو چھلک رہا ہے کٹورا گلاب کا  
اس غزل کے بھی تمام اشعار خارجی پہلور کھتے ہیں۔ یہ غزل بھی ناسخ کے رنگ کی ہے اور ناسخ کے زمین  
میں نم، نم ہے۔

بھر کنا کیا کہوں سید میں اپنے آتش غم کا کہ جائے پنبہ ہے ہر داغ پھول جہنم کا  
جہاں میں نہ عشرت سے سوا چند ہے غم کا کہ ہے گر عید کا اک دن تو عشرہ ہے محرم کا  
یہ زمین بھی ناسخ کی ہے اور رنگ بھاشیخ ہی ہے۔  
بزرگ گلی مہاسے کب بھلا دل گیر دل میرا کہ ہے بانج جہاں میں غنچہ تصویر دل میرا

مہمنوں نے دی لگا جو سرخ زار پشت پشت اب ہجوم خار سے ہے پشت خار پشت  
ان دونوں غزلوں کے اشعار اکثر خارجی پہلور کھتے ہیں۔

تقی زلف تیری سنبل معن چمن کی شاخ قندوں سے پر عرق کے بنی یاسین کی شاخ  
یہ ایک جڑی طولانی غزل ہے۔ اور غزل کی غزل کا رنگ خارجی ہے۔

بادام دو جو بھیجے ہیں بتوے میں ڈال کر ایما ہے یہ کہ بھیج دے آنکھیں نکال کر  
وہی خارجی رنگ اس غزل کا بھی ہے۔ اسی طرح استاد ذوق کے صدمہ اشعار ہیں کہ جو شاعری کا  
خارجی پہلور کھتے ہیں۔ راقم عرض کر چکا ہے کہ خارجی مضامین غزل سرائی کے تقاضوں کے مطابق

نہیں ہوتے۔ پس جتنے حضرات غزل سرا کیا فارسی اور کیا اردو کے جنہوں نے شاعری کا خارجی پہلو اختیار کیا ہے کبھی اغراض غزل سرائی کو پورا نہیں کر سکے۔ مگر حضرت ذوق کی نسبت اتنا عرصہ کر دینا ضرور ہے کہ آپؒ کا نام اس درجہ میں کو نہیں پہنچا ہوا ہے کہ جو خارجی پہلو کی غزل سرائی سے عموماً فٹج ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر چہ عموماً غزل سرائی میں ذوق خارجی شاعری برتتے ہیں مگر ان میں ایک خاص بات یہ ہے کہ خارجی مضامین کو کسی قدر قلبی اور ذہنی امور کے ساتھ مروج کر دیتے ہیں جس کے باعث ان کی غزل سرائی سیٹھے ہونے سے بچ جاتی ہے۔ یہی اتنی بات ناسخ میں نہیں ہے ورنہ ناسخ خلاقی مضامین بلند پروازی اور صفائی بندش میں ذوق یقیناً غالب ہیں۔

### ذوق کے داخلی مضامین کے اشعار

اگر پایا تو کھوج اپنا نہ پایا	اسے ہم نے بہت ڈھونڈھا نہ پایا
خدا جانے کہ پایا یا نہ پایا	لحم میں بھی ترے مضطر نے آرام
کبھی جس کا نشان پایا نہ پایا	سراغ عمر رفتہ ہاتھ کیا آئے
غبارِ راہ بھی عنقا نہ پایا	رہ گم گشتی میں ہم نے اپنا
کہیں ہم نے تجھے تنہا نہ پایا	جہاں دیکھا کسی کے ساتھ دیکھا
غرض خالی دل مشیدا نہ پایا	کبھی تو اور کبھی تیسرا ہاں ہم
فلک نے بھی قرار اصلا نہ پایا	مرے ظالم کی وہ گردش سے جس سے

واضح ہو کہ وہ غزل جس سے اشعار بالا انتخاب کر لیے گئے ہیں۔ طوطائی ہے۔ مگر ان کے علاوہ اس غزل کے جتنے اشعار ہیں خارجی پہلو رکھتے ہیں۔ یہ اشعار بھی جو ہیں کچھ ایسا داخلی پہلو نہیں رکھتے کہ دردِ امیر کے کلام کا لطف دکھا سکیں۔ یوں تو استاد کے شعر ہیں۔ خوش خیالی اور ترکیبی سے خالی نہیں ہو سکتے۔

ایک دم بھی ہکھوچینا بھر میں تنہا ناگوار  
پرامید وصل پر برسوں گوارا ہو گیا  
اس غزل میں تیرہ شعر ہیں۔ مگر ان میں یہی ایک شعر ہے جو داخلی پہلو رکھتا ہے۔  
میں ہجر سے مرنے کے قرن ہو ہی چکا تھا  
تم وقت پر آپہنچے نہیں ہو ہی چکا تھا  
جو کچھ کہ ہوا ہم سے وہ کس طرح نہ ہوتا  
حکم ازلی ذوق یوں ہی ہو ہی چکا تھا  
سبحان اللہ کیا خوب اشعار ہیں۔ مگر باقی اشعار غزل خارجی شاعری سے خبر دیتے ہیں۔



بندہ نوازیاں تو یہ دیکھو کہ آدمی جزو ضعیف محرم اسرار کل ہوا  
سوا اس شعر کے باقی اشعار غزل وہی خارجی رنگ رکھتے ہیں۔

اس پیش کا ہے مزا دل ہی کو حاصل ہوتا کاش میں عشق میں سر تا بقدم دل ہوتا  
آپ آئینہ ہستی میں ہے تو اپنا حریف ورنہ یاں کون تھا جو تیرے مقابل ہوتا  
سینہ چرخ میں ہر اختر اگر دل ہے تو کیا ایک دل ہوتا مگر درد کے قابل ہوتا  
ہوئی گر عقدہ کشائی نہ ید اللہ کے ہاتھ ذوق حل کیوں کہ مرا عقدہ مشکل ہوتا  
بقیہ اشعار داخلی پہلو نہیں رکھتے۔

مذکور تری بزم میں کس کا نہیں آتا پر ذکر ہمارا نہیں آتا نہیں آتا  
اس غزل میں بھی داخلی پہلو کے اشعار کے علاوہ خارجی پہلو کے اشعار کی کچھ کمی نہیں ہے اور جو اشعار  
داخلی پہلو کے ہیں بھی ان میں درد اور تیر کے کلاموں کی جذباتی قوت نہیں پائی جاتی حضرات ناظرین  
اس غزل کو ذوق کے دیوان میں ملاحظہ فرمائیں بہ خیال اختصار یہاں درج نہیں کی جاسکی۔  
ہیں اس صنم کے طے کے رستے تو سیکڑوں پر کوئی راست ہے کوئی رستہ ہے پھیر کا  
باقی اشعار غزل خارجی پہلو رکھتے ہیں جیسا کہ اکثر اشعار حضرت ذوق کے یہی رنگ رکھا کرتے ہیں۔  
ترے آتے ہی آتے کام آخر ہو گیا میرا ربی حسرت کہ دم میرا نہ تیرے رو برو نکلا  
کہیں تھجکونہ پایا اگرچہ ہم نے اک جہاں ڈھونڈا پھر آخر دل ہی میں دیکھا بغل ہی میں سے تو نکلا  
اس غزل کے اشعار بھی زیادہ خارجی رنگ رکھتے ہیں۔

ہم ہیں اور سایہ ترے کوچے کی دیواروں کا کام جنت میں ہے کیا ہم سے گنہگار دل کا  
بقیہ اشعار غزل یا خارجی پہلو رکھتے ہیں یا داخلی اور خارجی رنگ سے مرکب ہیں۔  
لاکھ دیتا فلک آزار گوارا تھا مگر ایک تیرا نہ مجھے درد جلدانی ہوتا  
باقی اشعار غزل کا وہی رنگ ہے جو عموماً کلام ذوق کا ہوا کرتا ہے۔

ایک پتھر چومنے کو شیخ جی کعبہ گئے ذوق ہر تہ قابل بوسہ ہے اس بتخانہ میں  
ذوق اس صورت کہہ میں ہیں ہزاروں صورتیں کوئی صورت اپنے صورت گر کی بے صورت نہیں  
ناز ہے گل کو نزاکت چمن میں اسے ذوق اس نے دیکھے ہی نہیں ناز و نزاکت والے

سبحان اللہ اشعار بالاکیا خوب ہیں ایسے ہی اشعار شاعر کو استاد کہلا دیتے ہیں بہر حال جن غزلوں  
سے یہ اشعار انتخاب ہوئے ہیں وہ غزلیں پورے طور پر داخلی رنگ نہیں رکھتی ہیں ان کے بہت

رب لامکاں کا صد شکر ہے کہ اس نے ہمیں توفیق دی کہ ہم اردو ادب کی کتب کو سافٹ میں تبدیل کر سکے۔ اسی صورت میں یہ کتاب آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ مزید اس طرح کی عمدہ کتب حاصل کرنے کے لئے ہمارے گروپ میں شمولیت اختیار کریں۔

انتظامیہ برقی کتب

گروپ میں شمولیت کے لئے:



محمد ذوالقرنین حیدر: +92-3123050300

ایکالر سردار طاہر صاحبہ: +92-334 0120123



سے اشعار خارجی رنگ کے بھی ہیں۔

اہل واقفیت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ استاد ذوق غزل سرائی میں زیادہ خارجی شاعری کا پہلو اختیار فرماتے ہیں یا مرکب رنگوں کو برت جاتے ان کے دیوان میں ایسے اشعار کے عدد جو محض داخلی رنگ رکھتے ہیں۔ یقیناً کم ہیں۔ شاید یہی سبب ہے کہ اکثر حضرات اہل لکھنؤ سوا ذوق کے دہلی کے کسی غزل سرا شاعر کو چشمِ رغبت سے نہیں دیکھتے ہیں۔ بلکہ جو حضرات وہاں کے دہلی کی غزل سرائی کے انداز کو پسند فرماتے ہیں اپنے ہم وطنوں میں انگشت نما ہو جاتے ہیں۔ کچھ شک نہیں کہ ذوق کی غزل سرائی استادانہ جلوہ دکھلاتی ہے۔ مگر غزل سرائی کا اصل تقاضا یہ ہے کہ تمام تر داخلی شاعری سے سروکار رکھے۔ خواجہ میر درد یا میر تقی میر کی غزل سرائی کھلے ڈالے طور پر داخلی رنگ کھتی ہے لاریب غزل سرائی کے لیے داخلی رنگ کی پابندی واجبات سے ہے۔ اگر کوئی غزل سرا اس رنگ کو اختیار کرے گا تو ضرور کم و بیش طور پر اسے اس صنف شاعری کے برتنے میں کامیابی حاصل ہوگی اور اگر اعلا درجہ کے قومی اخلاقیہ رکھتا ہے اور اس کے وارداتِ قلبیہ ارفع رتبہ کے ہیں تو عجب نہیں کہ قوت شاعری کے حاصل رہنے پر اس کا کلام درد یا میر کا انداز پیدا کرے۔ ظاہراً استاد ذوق کے کلام میں مسانت رفعت جلالت عظمت مضمون خیزی نفیس پسندی عالی خیالی بنسرد پر وازی طبیعت داری وغیرہ وغیرہ کی خوبیاں بن طور پر نمایاں ہیں۔ مگر چون کہ مضمون بندی معاملاتِ قلبیہ اور امور ذہنیہ سے حسبِ مراد طور پر مشتمل نہیں معلوم ہوتی ہے۔ ان کی غزل سرائی دلچسپی نہیں پیدا کرتی ہے یعنی جو درد اور میر کی غزل سرائی سے لطف اٹھتا ہے۔ ان کی غزل سرائی سے نہیں اٹھتا۔ منجملہ قابلِ لحاظ وصفوں کے استاد ذوق میں ایک بڑا وصف یہ ہے کہ حضرت اردو کے محاوروں کو ایسی آسانی اور روانی کے ساتھ اپنے اشعار غزل میں باندھ جاتے ہیں کہ اہل اطلاع کی طبیعت نہایت لذت یا حیرت ہوتی ہے۔ لاریب فطری طور پر محاوروں کی بندش شاعر کے کلام کا بڑا حسن بخشی ہے۔ اور لغز گفاری کو نہایت معین ہوا کرتی ہے کچھ اشعار ذیل میں ایسے درج کیے جاتے ہیں کہ محاورہ بندی کے نمونے ہیں:-

نیمچہ یار نے جس وقت بغل میں مارا	جو چڑھا منہ اسے میدانِ اجل میں مارا
اس نے جب مال بہت رد و بدل میں مارا	ہم نے دل اپنا اٹھا اپنی بعل میں مارا

نالہ اس شور سے کیوں میرا دہائی دیتا      اے فلک گر تجھے اونچا نہ سنانی دیتا

کہے ہے خنجر قاتل سے یہ گلو میرا      کمی جو مجھ سے کرے تو پیئے لہو میرا

گل اس نگہ کے زخم رسیدوں میں مل گیا      یہ بھی لہو لگا کے شہدوں میں مل گیا

کہا پتنگ نے یہ وار شمع پر چپڑھ کر      عجب مزا ہے جو مریے کسی کے سر چڑھ کر  
مرے خیال میں وہ چشمِ فتنہ گر چپڑھ کر      یہ خانہ جنگ بنی آئی لڑنے گھر چڑھ کر  
تو کہے غنچہ کہ اس لب پہ ڈھری خوب نہیں      چپ کہ منہ چھوٹا سا اور بات بڑی خوب نہیں  
مشتے نمونہ از خروارے بہت ایسے اشعار ہیں جس میں استاد نے محاورہ بندی کا لطف دکھایا ہے  
سب کے انتخاب کا یہاں موقع کہاں ہے جو درج ہذا کیے جاتیں۔ البتہ ذوقِ مصلح زبان نہ ہوتے یہ  
دولت استادِ ناسخ کے لیے اٹھار کی گئی تھی۔ جو اپنے وقت پر اس یگانہ روزگار کو حوالہ کی گئی۔

## غالب دہلوی

غالب۔ مرزا نوشہ نواب اسد اللہ خاں۔ غالب فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے نام  
اور شاعر ہیں۔ ان کی فارسی کی غزل سرائی کی نسبت راقم اظہار خیال کر چکا ہے۔ اب ان کی اردو  
کی غزل سرائی کی کیفیت عرض کرنے کو ہے۔ غالب ان شاعروں میں ہیں جو ہر صنفِ شاعری سے  
مناسبت رکھتے تھے۔ مگر یہاں ان کی اردو کی غزل سرائی زیر بحث ہے۔ حضرت نے ذوق، مومن، ناسخ  
آتش ان سب استادوں کے زمانے دیکھے اور ان سب اساتذہ کے بعد رحلت فرمائی۔ ذوق سے  
شاعرانہ سابقہ بھی ظہور میں آیا۔ مگر مومن سے کیا طور حضرت سے رہا فقیر کو نہیں معلوم۔ ناسخ سے لطف  
مراسلات حاصل تھا۔ آتش کے ساتھ موافقت یا مخالفت کی کوئی بات علمِ راقم میں نہیں ہے۔ اردو  
کی غزل سرائی کے اعتبار سے مرزا نوشہ بہت قابلِ توجہ شاعر ہیں۔ اپنی غزل سرائی کی نسبت  
حضرت فرماتے تھے کہ میری غزل گوئی کی ابتدا تھی کہ ناسخ مرحوم کا دیوان دہلی میں پہلے پہل پہنچا۔  
شیخ کی سخنِ سنجی کی تمام شہر میں دستوم مچ گئی۔ میں نے اور مومن نے ان کا مستیع ہونا چاہا۔ ہم لوگوں نے  
شیخ مرحوم کے رنگ میں مشق کلام کرنا شروع کیا مگر شیخ کا رنگ ہم لوگوں میں نہ آیا۔ مومن مشق کے  
بعد ویسے ہو گئے جیسے ان کا رنگ دیکھا جاتا ہے۔ اور ہم میر کے رنگ میں در آئے۔ اس جگہ پر امر قابلِ  
لحاظ کہ مومن اور غالب کے عجز اور تتبع کا سبب اور کچھ نہ تھا۔ البتہ کہ اور دونوں شاعران نامی افتاد



طبیعت سے داخلی شاعری کے برتنے کی قابلیت رکھتے تھے پس ناسخ کی شاعری جو محض خارجی رنگ رکھتی ہے کیوں کہ ان کی خلقی صلاحیت کے ساتھ موافق پڑتی۔ بہر حال غالب کا یہ فرمانا کہ ہم میر کے رنگ میں درائے واقعات سے بہت بعید نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ غالب کی غزل سرائی میں میر کی جھلک نمایاں ہے۔ لاریب واردات قلبیہ اور امور ذہنیہ کے مضامین غالب فریب قریب میر صاحب کے پرتاثری کے ساتھ باندھ جاتے ہیں۔ مگر حالت یہ ہے کہ ان کے مختصر دیوان میں بہت کم شعر ہیں جو میر صاحب کی سادگی کلام کا لطف دکھاتے ہیں۔ زیادہ حصہ ان کے کلام کا استعارات سے بھرا ہوا ہے۔ اضافتوں کی وہ بھرمار ہے کہ بعض وقت جی گھبرا اٹھتا ہے کہ انہی اضافتوں کا سلسلہ کب ختم ہوگا۔ الفاظ فارسی کی وہ کثرت دیکھی جاتی ہے کہ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اردو کے اشعار زیر نظر ہیں یا فارسی کے ان باتوں کے علاوہ کبھی کبھی اخلاق مضامین کا وہ عالم دکھائی دیتا ہے کہ ادراک اپنے فعل میں قاصر ہونے لگتا ہے۔ بلاشبہ ان کے ایسے کلام کوئی لطف غرلیت نہیں رکھتے۔ اگر ان کے دیوان کا کوئی انتخاب جدید کیا تو لازم ہے کہ ایسے متعلق اشعار خارج از دیوان کر دیئے جائیں لیکن ان مصائب سے گزر کر اگر یکتائے روزگار کے کلام کو انصاف کی نگاہ سے دیکھیں تو پھر حسن کی کوئی انتہا بھی نظر نہیں آتی۔ واقعی جو سوز، گداز، جستگی، درد، بزرگی، نشتریت، بلند پروازی، نازک خیالی، کمزرت، تنانت، جدالت، تہذیب، شوخی غالب کے کلام میں ہے، باستانائے درد میر کسی استاد کے کلام میں نہیں پائی جاتی ہے۔ نشتریت تو ایسے غضب کی ہے کہ میر صاحب کے کلام میں بھی اس سے زیادہ نہ ہوگی۔ پرتاثری کا کیا کہنا۔ دل بے اختیار چلا اٹھتا ہے کہ غزل سرائی اسے کہتے ہیں۔ شوخی کا وہ عالم ہے کہ طبیعت بے چین ہو جاتی ہے۔ عالی مذاقی روح کو عالم بالا کی سیر دکھاتی ہے۔ واردات قلبیہ کے مضامین کی خوبی جذباتی معاملات کے تماشے پیش نظر کر دیتی ہے اور مختصر ہے کہ حضرت کے کمالات گوناگوں کا وہی قاتل نہ ہوگا جسے قلبی نعمتوں سے فطرت نے محروم رکھا ہے۔ ذیل میں کچھ کلام معجز نظام اندر ناظرین ہوتا ہے۔

## غالب

بوسے گل نالہ دل وود چراغ محفل	جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے	دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا
میں نے چاہا تھا اندوہ و فاسے چہوتوں	وہ ستم کر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا
کس سے محرومی قسمت کی شکایت کیجئے	ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

محروم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا  
منہ نہ کھلنے پر وہ عالم ہے کہ دیکھا ہی نہیں  
یاں درنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا  
زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کہ منہ پکھلا

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ  
حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب  
تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے  
وایں گے میرا ترانہ صاف محشر میں نہ ہو  
ہائے اس زود پشیمان کا پشیمان ہونا  
جس کی قسمت میں بدعاشق کا گریبان ہونا  
دیکھنے ہم بھی گئے تھے یہ تماشائے ہوا  
اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائے گا  
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں  
یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں  
نظر لگے نہ کہیں اس کے دست بازو کو

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے  
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار  
میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں  
جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود  
آخر اس درد کی دوا کیا ہے  
یا الہی یہ ماجرا کیا ہے  
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے  
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے  
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے  
ہم کو ان سے وفا کی ہے اُمید

ان کے دیکھنے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق  
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

کب وہ سنتا ہے کہانی میری  
اور پھر وہ بھی زبانی میری

منحصر مرنے پہ جو جس کی اُمید  
نا اُمیدی اس کی دیکھی جائے

دافع ہو کہ اشعارِ بالا کے رنگ کے بہت اشعار دیوانِ غالب میں موجود ہیں سب کے انتخاب  
کا یہاں موقع نہیں ہے حضراتِ شائقین خود دیوان کو ملاحظہ فرمائیں لیکن چوں کہ غزلِ سمرائی  
حضرتِ غالب کی سوز و گداز، دردِ محبت، خستگی، برشتگی، نشتریت، عالی خیالی، دل آویزی،



خوش مذاقی شیریں، بیانی، نفیس پسندی، شوخی، رفعت، کمالت، متانت وغیرہ سے معمور ہیں اس لیے چند پوری غزلیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں کہ حضرات ناظرین ان سے حظ روحی اٹھائیں اور ہر چند ان میں میر صاحب کے کلام کی سادگی نہیں ہے تو بھی اس میں غزلیت کا ایسا لطف ہے کہ کمتر استادوں کے کلام میں دیکھا جاتا ہے:-

### غزل نمبر ۱

در دمنت کشن دوا نہ ہوا	میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو	اک تماشہ ہوا کلا نہ ہوا
ہم کہاں قسمت آزمانے جاتیں	تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا
ہے خبر گرم ان کے آنے کی	آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
کیا وہ غمزدگی خدائی تھی	بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
جان دی دی ہوئی اسی کی تھی	حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
زخم گرد بگیا لہو نہ تھما	کام گر رک گیا روا نہ ہوا
رہزنی ہے کہ دلستانی ہے	لے کے دل دلستان روا نہ ہوا
کچھ تو پڑھیں کہ لوگ کہتے ہیں	آج غالب غزل سرا نہ ہوا

### غزل نمبر ۲

ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا	آپ آئے تھے مگر کوئی عنان گیر بھی تھا
تم سے بیجا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ	اس میں کچھ شائبہ خوبی تقدیر بھی تھا
تو مجھے بھول گیا ہو تو پتا بستلادوں	کبھی فتر اک میں تیری کوئی پتھر بھی تھا
قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد	یاں کچھ اک رنج گرا نہا رہی زنجیر بھی تھا
بجلی اک کوندگی آنکھوں کے آگے تو کیا	بات کرتے کہ میں لب تشنہ تقریر بھی تھا
یوسف اس کو کہوں اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی	گر بگڑ بیٹھے تو میں لائق تعزیر بھی تھا
دیکھ کر غیر کو ہو کیوں نہ کلیجہ ٹھنڈا	نالہ کرتا تھا ولے طالب تاثیر بھی تھا
پیشہ ہے عیب نہیں رکھئے نہ فراد کو نام	ہم ہی آشفہ سہروں میں وہ جوا میر بھی تھا

ہم تھے مرنے کو کھڑے پاس نہ آیا نہ سہی آخر اس شوخ کے ترکش ہیں کوئی تیر بھی تھا  
 پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے نیکے پر ناحق آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا  
 رنجی کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب  
 کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

### غزل نمبر ۳

عرض نیاز عشق کے قابل نہیں رہا جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا  
 جاتا ہوں داغ حسرت ہستی لیے ہوئے ہوں شمع کشتہ درخور محل نہیں رہا  
 مرنے کی ایدل اور ہی تدبیر کر کہ میں شایان دست و بازو سے قاتل نہیں رہا  
 بر روئے شش جہت در آئینہ باز ہے یاں امتیاز ناقص و کامل نہیں رہا  
 واکر دیئے ہیں شوق نے بند نقاب حسن غیر از نگاہ اب کوئی حاصل نہیں رہا  
 گو میں رہا رہیں ستم ہائے روزگار لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا  
 دل سے ہوائے کشت و فامٹ گئی کہ وال حاصل سوائے حسرت حاصل نہیں رہا  
 بیداد عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسد  
 جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

### غزل نمبر ۴

جور سے باز آئیں پر باز آئیں کیا کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا  
 رات دن گردش میں ہیں سات آسمان ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرا آئیں کیا  
 لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا  
 ہو لیے کیوں نا، ہر کے ساتھ ساتھ یارب اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا  
 موج خون سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے آستان یار سے اُٹھ جائیں کیا  
 غم جبرہ دکھایا کیے مرنے کی راہ مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا  
 پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے  
 کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا



## غزل نمبر ۵

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہوجانا  
تجھ سے قسمت میں مری صورت قفلِ ابجد  
دل ہوا کشمکشِ چارہ رحمت میں تمام  
اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ  
ضعف سے گریہ مبدلِ بدمِ سرد ہوا  
دل سے مناتری انگشتِ حنائی کا خیال  
ہے مجھے ابر بہاری کا برس کا کھلنا  
گر نہیں نکہت گل کو ترے کوچہ کی ہوس  
تا کہ تجھ پر کھلے اعجازِ ہوائے صیقل  
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہوجانا  
تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہوجانا  
مٹ گیا گھسے میں اس عقدہ کا دوا ہوجانا  
اس قدر دشمنِ ارباب وفا ہوجانا  
باور آیا ہیں پانی کا ہوا ہوجانا  
ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہوجانا  
روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہوجانا  
کیوں ہے گردہ جولانِ صبا ہوجانا  
دیکھ برسات میں سبز آئینہ کا ہوجانا

بختے ہے جلوہ گل ذوقِ تماشا غالب

چشم کو چاہئے ہر رنگ میں دوا ہوجانا

## غزل نمبر ۶

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں  
یاد تھیں ہم کو بھی رنگارنگ بزمِ آرمیاں  
تھیں نباتِ انفسِ گردوں دن کو پردہ میں نہاں  
قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر  
سب رقیبوں سے نہ ہوں خوش پر زناں نہر سے  
تجئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق  
ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام  
نیندا کی ہے دماغ اسکا ہے راتیں اس کی ہیں  
ہیں چمن میں کیا گیا گویا دبستانِ کھل گیا  
وہ گاہیں کیوں ہونی جاتی ہیں یارب دل کے پار  
خاک میں کیا صوتیں ہونگی کہ نہاں ہو گئیں  
لیکن اب نقشِ نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں  
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ غریباں ہو گئیں  
لیکن آنکھیں روزن دیوارِ زنداں ہو گئیں  
ہے زلیخا خوش کہ موماہ کنعیاں ہو گئیں  
میں یہ سمجھو نگا کہ دو شمعیں فروزاں ہو گئیں  
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں  
تری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں  
بلبلیں سن کر مرے مالے غزل خواں ہو گئیں  
چوری کوتاہی قسمت سے مرزاں ہو گئیں

بس کہ روکائیں نے اور سینہ میں بھریں پڑیے  
 واں گیا بھی میں تو انکی گالیوں کا کیا جواب  
 جانفرا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا  
 ہم موحید ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم  
 رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج  
 مری آئیں بخت چاک گریباں ہو گئیں  
 یاد تھیں جتنی دعائیں صرف درباں ہو گئیں  
 سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگ جاں ہو گئیں  
 ملتیں جب مٹ گئیں اجڑائے ایماں ہو گئیں  
 مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہل جہاں  
 دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

## غزل نمبر ۷

دل ہی تو ہے نہ سنگِ خشت در سے بھر آئے کیوں  
 دیر نہیں حرم نہیں دیر نہیں آستاں نہیں  
 جب وہ جمال و لغز و صورت مہر نیم روز  
 دشتِ غمرہ جاں ستاں ناوک ناز بے پناہ  
 قبر حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں  
 حسن اور اپنے حسن ظن رہ گئی بواہوس کی شرم  
 واں وہ غرور و عز و نازیاں یہ حجاب پاس وضع  
 ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بیوفا ہسی  
 رویں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں  
 میٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم غیر ہمیں اٹھائے کیوں  
 آپ ہی ہونظا و سوز پڑے میں منہ چھپائے کیوں  
 تیرا ہی عکس رخ ہی سامنے تیرے آئے کیوں  
 موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں  
 اپنے پر اعتماد ہے غیبر کو آزمائے کیوں  
 راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائے کیوں  
 جس کو ہو دین و دل عزیز اسکی گلی میں جائے کیوں

غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں  
 رویے زار زار کیا کیجیے ہائے ہائے کیوں

## غزل نمبر ۸

کسی کو دے کے دل کوئی نواں فغاں کیوں ہو  
 وہ اپنی خون چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں  
 کیا غمخوار نے ہوا لگے آگ اس محبت کو  
 وفا کیسی کہاں کا عشق جب ہر پھوڑنا ٹھہرا  
 نہو جب دل ہی سینہ میں تو پھر منہ میں نہاں کیوں ہو  
 سبک سرنگے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو  
 نہ لائے تاب جو غم کی وہ میرا راز داں کیوں ہو  
 تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو  
 گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشاں کیوں ہو  
 قفس میں مجھ سے رُوداد چہن کہتے نہ ڈر مہدم



یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں ہیں پھر یہ بتلاؤ  
غلط ہے جذب دل کا شکوہ دیکھو جرم کسا ہے  
یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں  
کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی  
یہ فتنہ آدمی کی خانہ دیرانی کو کیا کم ہے  
کہ جب دلیں تمہیں تم ہو تو آنکھوں سے کہاں کیوں ہو  
نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش دریاں کیوں ہو  
عدو کے ہو لیے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو  
بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہو کہ ہاں کیوں ہو  
ہوئے تم دوست جس کے اسکا دشمن آسما کیوں ہو

بکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب

ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

## غزل نمبر ۹

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی ہے  
قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے  
میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی  
ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے  
اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو  
عمر ہر چند کہ ہے برق خرام  
ہم کوئی ترک وفا کرتے ہیں  
کچھ تو دے اے فلک نا انصاف  
ہم بھی تسلیم کی خود الیں گے  
مری وحشت تری شہرت ہی ہے  
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی ہے  
اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی ہے  
غیر کو تجھ سے محبت ہی ہے  
آگہی گر نہیں غفلت ہی ہے  
دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی ہے  
نہ سہی عشق مصیبت ہی ہے  
آہ و فریاد کی رخصت ہی ہے  
بے نیازی تری عادت ہی ہے

یار سے چھٹیڑ چلی جائے اسد

گر نہیں وصل تو حسرت ہی ہے

## غزل نمبر ۱۰

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی  
شق ہو گیا ہے سینہ خوشالذت فراغ  
وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں  
دونوں کو اک ادا میں رضا مند کر گئی  
محلیف پردہ داری زخم جگر گئی  
اٹھتے بس اب کہ لذت خواب سحر گئی

اڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں      بارے اب اے ہوا ہوس بال و پر گئی  
دیکھو تو دل فریبی انداز نقش پا      موج خرام یار بھی کیا گل کستر گئی  
ہر لبو الہوس نے حسن پرستی شعار کی      اب آبروئے شیوہ اہل نظر ستر گئی  
نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا      مستی سے ہر نگہ ترے رُخ پر بکھر گئی  
فردا ودی کا تفرقہ یک بار مٹ گیا      کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گذر گئی

مارا زمانہ نے اسد اللہ خاں تمہیں  
وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

## غزل نمبر ۱۱

کوئی دن گر زندگانی اور ہے      اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے  
آتش دوزخ میں یہ گرمی کہاں      سوز غمہائے نہانی اور ہے  
بارہا دیکھی ہیں ان کی رنجشیں      پر کچھ اب کی سرگرائی اور ہے  
دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر      کچھ تو پیغام زبانی اور ہے  
قاطع اعمار ہیں اکشر نجوم      وہ بلائے آسمانی اور ہے

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام  
ایک مرگ ناگہانی اور ہے

## غزل نمبر ۱۲

مدت ہوتی ہے یار کو مہاں کیے ہوئے      جوش قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے  
کرتا ہوں جمع پھر جگر نخت نخت کو      عرصہ ہوا ہے دعوت مژگاں کیے ہوئے  
پھر وضع احتیاط سے رکنے لگا ہے دم      برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کیے ہوئے  
پھر گرم ناہائے شرر بار ہے قفس      مدت ہوئی ہے میر چراغاں کیے ہوئے  
پھر پریش جراحت دل کو چلا ہے عشق      سامان صد ہزار نمسکداں کیے ہوئے  
پھر بھر رہا ہے خامہ مژگاں بخون دل      ساز چمن طسرازی واماں کیے ہوئے  
بہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر قیب      نظارہ و خیال کا سماں کیے ہوئے



دل پھر طواف کونے لامت کو جاتے ہے  
پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب  
دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال  
پھر چاہتا ہوں نامہ دل دار کھولنا  
مانگے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوس  
چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو  
اک نو بہار ناز کو تاکے ہے یہ نگاہ  
پھر حجب میں ہے کہ درپے کسی کے پڑے رہیں  
جی ڈھونڈ رہا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن  
پندار کا صنم کدہ دیراں کیے ہوئے  
عرض متاع عقل دل و جاں کیے ہوئے  
صد گستاں نگاہ کا ساماں کیے ہوئے  
جان نذر دل فریبی عنوان کیے ہوئے  
زلف سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے  
سرمہ سے تیز و مشنہ مژگاں کیے ہوئے  
چہرہ فروغ مے سے گلستاں کیے ہوئے  
سرمزیر بار منت درباں کیے ہوئے  
بیٹھے رہیں تصور حباں کیے ہوئے

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوش اشک سے

بیٹھے ہیں ہم تہیہ طوفاں کیے ہوئے

فقیہ کی دانست میں اگر کوئی شاعر اپنی تمام عمر میں صرف بارہ غزلیں ایسی جو بالا میں رقم ہوئیں تصنیف کرے تو اسے صاحب دیوانِ تحمیم ہونے کی حاجت نہیں ہے۔ یہ غزلیں اعلا درجہ کی غزلِ سمرانی سے خبر دیتی ہیں۔ علاوہ ان کے اور بھی غزلیں دیوانِ غالب میں موجود ہیں جو انتخاب کا حکم رکھتی ہیں۔ یہ بارہ تو صرف نمونہ کے طور پر مندرج کی گئی ہیں۔ بہر حال یہ بارہ غزلیں اہل انصاف کو رائے قائم کرنے کے واسطے کافی ہیں حقیقت یہ ہے کہ استادِ غالب اردو میں بڑے غزل سرا گذرے ہیں۔ یوں تو بے عیب خدا کی ذات ہے۔ مگر اس پر بھی ان کی غزلِ سمرانی معائب غزلِ سمرانی سے بہت کچھ پاک ہے۔ لاریب ان کی غزلِ سمرانی قریب قریب غزلِ سمرانی کے تقاضوں کے موافق ہے۔ اگر غالب، دردِ یامیر تک اس صنفِ شاعری میں نہیں پہنچتے ہیں۔ تو ان دونوں استادوں کے بعد انہیں کا درجہ ہے۔ واقعی باستثنائے خواجہ میر کسی کی غزلِ سمرانی ایسی نہیں دیکھی جاتی ہے جو دل کو بلا دے یوں تو پر تاثیر سے استادوں کا کلام خالی نہیں ہوتا۔ اس جگہ فقیر اپنی ذاتی کیفیت دلی کو عرض کر رہا ہے۔ نہیں معلوم کہ اس عاجز کا قول کلیہ کا حکم رکھتا ہے یا نہیں۔ مگر اکثر کیفیتیں جو احقر پر غالب کے شعر میں سے گذری ہیں۔ ان سے اپنی رائے وہی قائم ہوا کی ہے۔ جسے تجربہ شخصی کے طور پر اس ہیچمان نے بالا میں عرض کیا خواجہ میر قدس اور میر تقی میر کے کلاموں کی پر تاثیر سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ مگر غالب کی نسبت بھی فقیر کا یہی عقیدہ ہے کہ ان کے کلام کی تاثیر عجب رنگ و ڈھنگ رکھتی ہے۔ راقم

بہت ایسی صحبتوں میں شریک رہا ہے کہ جہاں بہت استادوں کے کلام پڑھے گئے ہیں۔ مگر غالب کے کلام نے رنگ جلسہ کو بدل دیا ہے۔ ایک بار کی سرگزشت ہے کہ بندہ سیر و شکار کی نظر سے ایک صحرا میں خیمہ زن تھا۔ کچھ ارباب مذاق جو مدعو تھے۔ شام کے بعد شعر خوانی فرمانے لگے۔ بہت سے استادوں کے کلام پڑھے گئے اور سب حضرات تلمذ و روحی اٹھانے لگے۔ آخر میں ایک طبیعت دار جوان رعنا نے یہ مقطع غالب کا پڑھا۔

عمر اپنی جو اسی طرح پہ گزری غالب  
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

یہ شعر غیر معروف نہ تھا۔ مگر اس سے کچھ عجیب کیفیت قلبی پیدا ہوئی۔ اس وقت سے تا سحر اس دل گرفتہ کو سخت بے قراری لاحق رہی۔ فقیر کے دل سے اس دن کی نماز صبح کا مزا نہیں جاتا۔ کاش ایسی صبح دولت خیز ہر روز نصیب ہوتی۔ واقعی جس کلام میں تاخیر نہ ہو تو وہ کلام گو ہزار صنائع بدائع سے بھرا ہوا ہو۔ قابل نفرت ہے۔ اسی طرح ایک بار شب کو ایک دوست نے خواجہ میر درد کے یہ دو شعر پڑھے۔

یہی پیغام درد کا کہنا جب صبا کوئے یار میں گزرے  
کون سی رات آن ملے گا دن بہت انتظار میں گزرے

حالانکہ ان شعروں سے بھی ناجز کو سابق سے واقفیت حاصل تھی۔ مگر دل کا یہ عالم ہوا کہ خدا تیری پناہ۔ وہ رات تو بُری گزری مگر ایک ہفتہ تک وحشت کی کیفیت قائم رہی میر صاحب کے نشستروں کی کیفیتوں کو بیان کرنا فضول ہے کون شخص ایسا ہے کہ جو دل رکھتا ہے اور ان کا زخم خوردہ نہیں ہے۔ المختصر غزل سرائی ایک ایسی شے ہے کہ جس کو محض دل سے تعلق ہے اور ظاہر اجسی غالب کی غزل سرائی نظر آتی ہے اس سے ان کا ایک بامراد غزل سرائی ثابت ہونا بعید از انصاف نہیں ہے۔ حضرت غالب کے کچھ وہ اشعار جن سے لطف غزلیت نہیں اٹھتا نمونہ کے طور پر ذیل میں عرض کیے جاتے ہیں:-

تماشائے بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا	شمار سجدہ مرغوب بت مشکل پسند آیا
کشائش کو ہمارا عقدہ مشکل پسند آیا	بفیض بیدلی نومیسی جاوید آساں ہے
کہ انداز بخون غلطیدن بسل پسند آیا	ہو اے سیر گل آئینہ بے مہری قاتل
بخون غلطیدہ صدنگ دعویٰ پارسانی کا	پئے نذر کرم تحفہ ہے شرم نارسانی کا



نہو جس تماشا دوست رسوا بے وفائی کا      بہر صد نظر ثابت ہے دعوا پارسائی کا  
ظاہر ہے کہ ان اشعار میں غزلیت کا کوئی مزاج نہیں ہے۔ ان سے پرتائیری کی کیا امید کی جاتی ہے۔ اگر  
ایسے ایسے اشعار خارج از دیوان کر دیئے جائیں تو سوائے فائدہ کے کوئی نقصان مقصود نہیں ہے۔

## ناتخ

ناتخ۔ شیخ ام بخش ناتخ زبان اردو کے مصلح گزرے ہیں۔ اس اعتبار سے ان کا یہ تخلص نہایت  
حسب حال ہے شیخ نے اردو کو خراش تراش کر ایسا درست کر دیا کہ اب اس کی لطافت اور صفائی  
فارسی سے کچھ کم نہیں معلوم ہوتی ہے۔ ذوق نے صرف مضمون آوری کی طرف اپنی توجہ مبذول رکھی اور  
اصلاح زبان پر مطلق مائل نہ ہوئے۔ مومن کو بھی اس جانب میلان نہ ہوا اور غالب نے فارسی کی اس قدر  
آمیزش کر دی کہ اردو پر زبان فارسی کا شبہ ہونے لگا۔ حضرت نے فارسی الفاظ سے اجتناب نہ کیا مگر  
ترکیب ایسی ملحوظ رکھی کہ اردو اردو نہ گئی۔ بلکہ اگر کسی فارسی جملہ کو بھی اپنے کلام میں جگہ دی تو فارسی  
کو اردو کر کے دکھا دیا۔ مثلاً شیخ فرماتے ہیں:-

سوال وصل پر ہلنا پریر و تیرے ابرو کا      اشارہ ہے برات ناشقاں بر شاخ آہو کا  
لاریب زبان فارسی شیخ کی کوششوں کی تمام تر ممنون ہے۔ اگر جناب شیخ کو اصلاح زبان  
کی طرف توجہ نہ ہوتی تو زبان حال کی صورت پیدا نہ ہوتی بہر حال اب دیکھنا چاہئے کہ شیخ کی طباعی سے  
غزل سرائی کو کس قدر فائدہ پہنچا۔ اہل واقفیت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ شیخ کی شاعری کی شہرت  
مجرد غزل سرائی کی بنیاد ہے کس واسطے کہ اور اصناف شاعری میں شیخ کی کوئی تصنیف ممتاز شکل  
نظر نہیں آتی ہے۔ پس شیخ کی غزل سرائی ہی اصناف شاعری سے ہے جس کی نسبت رائے زنی کی  
حاجت ہے۔ واضح ہو کہ شیخ کے ہر دو دیوان کے معائنہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ بہ کثرت اپنی غزل  
سرائی میں شاعری کا خارجی پہلو برتا کیے ہیں۔ یعنی ایسے مضامین کو باندھا کیے ہیں جن کو عالم خارج  
سے تعلق ہے۔ اسی وجہ سے شیخ کا رنگ درد۔ تیر۔ مومن اور غالب سے تمام تر علاحدہ ہے۔ شیخ کی  
غزل سرائی ذوق کے رنگ سے بھی مطابقت نہیں رکھتی ہے اس لیے کہ ذوق بیشتر داخلی اور خارجی  
شاعری کی آمیزش کے ساتھ غزل سرائی کرتے تھے ان کا رنگ خالص خارجی نہ تھا شیخ کی غزل  
سرائی تو ایسی دکھائی دیتی ہے کہ سو شعر میں کہیں ایک شعر داخلی رنگ رکھتا ہے اور  
باقی اشعار پورے طور پر خارجی پہلو رکھتے ہیں۔ یعنی باقی اشعار کے مضامین اشیائے موجودہ فی الخارج



سے کہ عبارت عالم مادی سے ہے۔ اس میں شک نہیں کہ خارجی پہلو کے اختیار کرنے سے شیخ کو شاعری کا ایک ایسا میدان وسیع ملتا آگیا کہ جس میں غزل سرائی کی حیثیت سے درد، تمیز، مومن اور غالب نے کبھی قدم نہیں رکھا تھا۔ پس شیخ کے سے بلند فکر، عالی دماغ شاعر نے جو ایسے میدان میں قدم رکھا۔ تو غزل سرائی کا دائرہ تنگ بہت وسیع ہو گیا۔ چنانچہ وہ خیالات شیخ کی بدولت بڑی کثرت کے ساتھ احاطہ غزل سرائی میں داخل ہو گئے جو درحقیقت احاطہ سرائی سے باہر ہیں یعنی شیخ نے ان خیالات کو زبردستی کے ساتھ احاطہ غزل سرائی میں داخل کر دیا۔ جو قصیدہ و قطعہ وغیرہ کے لیے مخصوص ہیں لیکن اس زور آزمائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ واردات و جذبات قلبیہ اور دیگر امور ذہنیہ کے مضامین سے شیخ کی غزلیں معرا ہو گئیں۔ اور غزل سرائی کا مطلب فوت ہو کر ایک ایسی قسم کی شاعری ایجاد ہو گئی کہ جس پر نہ قصیدہ گوئی اور غزل سرائی دو میں سے کوئی تعریف صادق نہیں آتی ہے۔ واقعی بہت خوب ہوتا۔ اگر شیخ اپنی حیرت انگیز قوت شاعری کو اور کسی صنف شاعری میں صرف فرماتے ہیں اور غزل سرائی کے حدود کو درد، تمیز، مومن اور غالب کی حدود بندی پر قائم رہنے دیتے۔ بنیال راقم غزل سرائی کا احاطہ وسعت پذیر ہونے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا ہے۔ اس واسطے کہ اس صنف شاعری میں خارجی مضامین داخل نہیں کیے جاسکتے۔ ایسے مضامین کے دخل پانے سے غزلیت جاتی رہتی ہے کبھی خارجی مضامین سے حافظ یا تمیز کی غزل سرائی کا لطف پیدا نہیں ہو سکتا۔ خارجی پہلو کے اختیار کرنے سے ضرور ہے کہ کلام میں صائب یا ناسخ کا رنگ آجائے۔ جو غزل سرائی کے اعتبار سے مرغوب و محبوب نہیں ہے یہی سبب ہے کہ اکثر با مذاق حضرات صائب اور ناسخ کی غزل سرائی کو بے لذت کہتے ہیں اور کھلے ڈالے طور پر کہہ جاتے ہیں کہ ان دونوں کے کلام سیٹھے ہیں اور امر حق بھی یہی ہے کہ جب واردات و جذبات قلبیہ کے مضامین باندھے نہ جائیں گے۔ تو کلام میں ضرور سیس محسوس ہوگا۔ اور یہ امر بین طور پر تقاضائے غزل گوئی کے محض خلاف ہے۔ بہر کیف شاعری کے اعتبار سے لاریب شیخ بڑے طباع اور خلاق سخن تھے ان کی نازک خیالی اور بلند پروازی نادر انداز رکھتی ہے۔ کلام میں بلاغت فضاحت کے ساتھ شیر و شکر ہو رہی ہے۔ دونوں دیوان جو اہر مضامین کے معدن ہیں۔ سوائے ان خوبیوں کے ان کے کلام پر از منانت، جلالت، شوکت، حشمت، تہذیب و وقار نظر آتے ہیں۔ مگر ان وصفوں کے ساتھ تشبیہ کو اسی افراط کے ساتھ کلام میں دخل دیتے ہیں۔ جیسا کہ غالب کی غزلوں میں استعارہ کی کثرت دیکھی جاتی ہے۔ ناسخ کی تشبیہیں اکثر بلند خیالی کی داد دیتی ہیں۔ اس پر بھی کبھی کبھی بھیتی کا انداز پیدا کرتی ہیں۔ اول تو بکثرت تشبیہ سے اعلا درجہ کی غزل سرائی مستغنی ہے۔



پھر جب تشبیہ پستی کی پستی کو پہنچ جاتی ہے تو اس سے اغراض غزل سرائی میں کامیابی حاصل نہیں ہوتی۔ اسی طرح مبالغہ پردازی کی طرف بھی میلان شیخ پایا جاتا ہے اور جب مبالغہ پردازی درجہ اعتدال سے تجاوز کر جاتی ہے تو شیخ سے فطرت کی راہ چھوٹ جاتی ہے۔ اس وضع کے معائب غزل سرائی کے ساتھ بھی شیخ ناسخ بلا گفتگو استاد استاد مانے جانے کا استحقاق رکھتے ہیں حضرت کے ایک بڑے نامور شاعر ہونے میں کسی صاحب عقل و تمیز کو گفتگو نہیں ہو سکتی شیخ کی ذات پر لکھنؤ بلکہ تمام ہندوستان کا فخر و مباہلات کرنا بجا ہے اور اہل فن جو کچھ اس گمانہ روزگار کو عزت و توقیر کے ساتھ یاد فرمائیں درست ہے ذیل میں ایک غزل شیخ کی نمونہ کے طور پر درج کی جاتی ہے :-

## غزل ناسخ

بہزہ خط گورے گالوں پر نمایاں ہو گیا	یاسمن زار صباحت سنبھلتاں ہو گیا
آگیا مجھ کو جو اس زلف پریشاں کا خیال	دم میں مجبوعہ عناصر کا پریشاں ہو گیا
تنگی محفل کی دولت بھر کے بیٹھا مجھ سے یار	رات اہل بزم کی کثرت کا احساں ہو گیا
منہ لگاتے ہی نئے قلیاں بنی ہی نے شکر	دو دمنبا کو نسیم باغ رضواں ہو گیا
ہو کے خم تسلیم کرتے ہی کیا مجھ کو شہید	قدرِ ظالم کمان تیسرے مژگاں ہو گیا
خود بخود ہوتا ہے پرزے آتے ہی فصل بہار	یاں گریباں اسے جنون گل کا گریباں ہو گیا
اس قدر مضمون نرے دست خانی کے سکھے	جو قلمداں میں قلم تنہا شاخ مر جاں ہو گیا
چاند چھپتا ہے جو دودن ہوتی ہے مشتاق خلق	ہو گئی قدر اس کی جو نظروں سے پنہاں ہو گیا
بعد دودن بھی ہے باقی مجھ سے خوش چشموں کی مند	بہزہ تربت چسرا گاہ غراں ہو گیا
پاؤں بھی اب اسے جنوں کر دیجئے کانٹوں کے نڈ	سہر تو مدت سے نیاز سنگ طفلان ہو گیا
ہو گیا دھڑکے جس شہر میں تصویر یار	جس کنوین کو اس نے جھانکا چاہ کناں ہو گیا
ہم وہ مجنوں ہیں کہ جو خود رشید رو آیا نظر	صبح ساں اپنا دہن چاک گریباں ہو گیا
مشغل ایسے ہیں اس کے دست نازک خود بخود	طائر رنگ خا بھی مسرغ بریاں ہو گیا
سراٹھا کر جو چلا اس دشت وحشت خیز میں	پار تلووں سے دیں خار مغیلاں ہو گیا
شمعیں کا فوری جلاتے تھے سوان کی گود پر	دیدہ غول بیاں سے چراغاں ہو گیا
کوئی دم پیری بھی اپنی ہے بساں مسجد م	مثل شب عہد شباب آنکھوں سے پنہاں ہو گیا

کیوں سلاطین زمانہ آگئے ہیں یاد پھر      تختہ تابوت جب تخت سلیمان ہو گیا  
ہر سحر سن کر ترے مجنون کا غل کہتی ہے خلق      چاک کیا صبح قیامت کا گریباں ہو گیا  
مکرشی کرتے ہیں مجھ سے جو کہ ہیں پامال خلق      شیر قالین بھی مجھے شیر نیستاں ہو گیا  
یار کے جاتے ہی بھرتے مری آنکھوں میں اشک      جوش تاروں کا ہوا خورشید نہاں ہو گیا

اشک جو آتا ہے ناسخ بخت بلبل پر مجھے

جب کھلا غنچہ مرا مکرے گریباں ہو گیا

اہل دانش پر بویا ہے کہ غزل بالا کے تمام اشعار خارجی پہلو کے ہیں ایک شعر بھی داخلی رنگ نہیں رکھتا۔ پس جس غزل میں داخلی رنگ کا فقدان ہو تو اس میں واردات و جذبات قلبیہ کے مضامین موجود نہیں رہ سکتے۔ اسی طرح شیخ کی اکثر غزلیں تمام تر خارجی رنگ رکھتی ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ شیخ کی کوئی غزل نظر سے نہ گزری جو درد، تیر، موت، غالب کے داخلی رنگ میں نکھی گئی ہو۔ یہی سبب ہے کہ وہ حضرات جو غزل سرائی کے تقاضوں سے واقفیت رکھتے ہیں شیخ کی غزل سرائی کو پسند نہیں فرماتے۔ ورنہ شاعری کے اعتبار سے شیخ کی شاعری بڑی خلاقی حسن، نازک خیالی اور بلند پروازی سے خبر دیتی ہے اور حقیقت شیخ کی شاعری ایسی ہی رفیع و جلیل ہے کہ ہر قدر شناسا سخن اس کو بڑی عظمت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ فقیر کو اکثر یہ حسرت ہوتی ہے کہ کاش شیخ کی قابلیت شاعری اور کسی صنف شاعری میں صرف ہوتی ہوتی، واقعی جاتے افسوس ہے کہ اتنی بڑی قابلیت اس صنف شاعری میں صرف ہوتی۔ جسے اس کی کوئی حاجت نہ تھی۔ نمونہ کے طور پر دو غزلیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔ ان میں ایک شیخ کی ہے اور دوسری غالب کی۔ ان دونوں کے معائنہ اور موازنہ سے ظاہر ہوگا کہ کس کا رنگ خارجی اور کس کا داخلی ہے۔

## غزل ناسخ

ششدر سارہ گیا ہوں دبیار دیکھ کر      دیوار بن گیا ہوں میں دیوار دیکھ کر  
ایک برہمن کے عشق میں ہے آنسوؤں کا تار      سبھ نکالی ہے ہم نے بھی نار دیکھ کر  
کیفیتیں جو خم میں ہیں زمرم میں وہ کہاں      بھولا ہے کعبہ خانہ خمار دیکھ کر  
کیا اشک سادہ موسم گل میں بجاؤں میں      روؤں لہو وہ پھول سے رخسار دیکھ کر  
سوکھا ہوں غم سے مثل عفائے کلیم میں      وہ اڑ دہائے گیسوئے خم دار دیکھ کر



زنجیر زلف یار کی تاثیر دیکھنا      دیوانے روز ہوتے ہیں دو چار دیکھ کر  
 پھینکا ہے دور تیر کو غصہ سے یار نے      رخسار کی طرف لب سو فار دیکھ کر  
 زلفیں نظر جو آئیں تو الجھن ہے نزع کی      جھینے سے تنگ ہوں دہن یار دیکھ کر  
 پر یان تمام تخت سلیمان کو بھول جائیں      اے جان جان ترا یہ ہوا دار دیکھ کر  
 زنجیر مجھے سنبھل ہیچاں کو جبر میں      وحشت زیادہ ہو گئی گلزار دیکھ کر  
 ناسخ ہو جائے سرمہ سیاہی حروف کی  
 روشن ہوں آنکھیں نامہ دلدار دیکھ کر

## غزل غالب

کیوں جل گیا نہ تاب یار دیکھ کر      جلتا ہوں اپنی طاقت دیدار دیکھ کر  
 آتش پرست کہتے ہیں اہل جہاں مجھے      سرگرم ناہائے شر بار دیکھ کر  
 کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا      رکنا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر  
 آتا ہے میرے قتل کو پُر جوش اشک سے      مڑتا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر  
 ثابت ہوا ہے گردن مینا پر خونِ خلق      لرزے ہے موج مئے تری رفتار دیکھ کر  
 وحسرا کر یار نے کھینچا تم سے ہاتھ      ہم کو حسیں لذت آزار دیکھ کر  
 بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ      لیکن عیار طبع خسیار دیکھ کر  
 زناں باندھ سجدہ و صدانہ توڑ ڈال      رہرو چلے ہیں راہ کو ہموار دیکھ کر  
 گرنی مٹی ہم پہ برق تجلی نہ طور پر      دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

سر پہوڑنا وہ غالب شوریدہ حال کا  
 یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

ارباب رائے دونوں استادوں کے کلاموں کو موازنہ فرمائیں۔ وقت تجویز ظاہر ہو جائے گا  
 کہ غزل سرائی کے لیے داخلی شاعری کی کس قدر حاجت ہے فقیر کی دانست میں خارجی شاعری  
 سے غزل سرائی کے اغراض کا پورا ہونا ناممکنات سے ہے حضرت ناسخ حضرت غالب سے قابلیت  
 شاعری میں کبھی کم نہیں ہیں مگر خارجی پہلو برتتے کے باعث ان کی غزل غزلیت کا مزہ نہیں دیتی ہے لیکن  
 نہیں ہے کہ خارجی رنگ کی غزل سرائی داخلی رنگ کی غزل سرائی کی پرتائیری کا لطف دکھائے

مثلاً راقم دو غزلیں اور بھی درج ہذا کرتا ہے۔ ان میں ایک استاد ذوق کی ہے اور دوسری غالب کی۔  
غزل سرائی میں داخلی رنگ کو خارجی رنگ پر کیا غلبہ ہوا کرتا ہے۔ وقت موازنہ اہل انصاف پر روشن  
ہو جائے گا۔

## غزل ذوق

کہاں تلک کہوں ساقی کہ لا شراب تو دے  
بھٹاتا گریہ ہے گر سوز دل کو آب تو دے  
ابھی چشم کے چشمہ کو اتنا آب تو دے  
کھلے ہے ناز سے گلشن میں غنچہ زر گس  
دل برشتہ کو میرے نہ چھوڑاے مے خوار  
کہاں بھی ہے تہ خاک میری آتش دل  
تمہارے مطلع ابرو پہ خال کہتا ہے  
دیر قبول ہے دربان نہ بند کر در یار  
صبا بگولہ ہے کشتگان زلف کی خاک  
شہید کرتا ہے قاتل تو پھر ہے جلدی کیا  
بلا سے آپ نہ آئیں پر آدمی اُن کا  
شکار بستہ فتراک کو ترے مقدور  
نشہ میں ہوش کسے جو گئے حساب کرے  
زبان خنجر قاتل نے کیا کہا تجھ سے  
ہما ہی آنکھ سے ہم چشم ہو گا کیا دریا  
بلا سے کم نہ ہو گریہ سے میسرا سوز جگر  
خنکے لوہی اگر مشیت خاک دوزخ میں  
کر گیا قتل وہ اے ذوق تجھ کو سرمہ سے  
نہ دے شراب ڈبو کر کوئی کباب تو دے  
اور آگ میں یونہی دینا ہے گر عذاب تو دے  
کہ سر پہ چرخ بھی دکھلائی جوں حباب تو دے  
ذرا دکھا اسے تو چشم نیم خواب تو دے  
جولنت اس میں ہے ایسا ماز شراب تو دے  
کہو ہوا سے ہلا دامن حساب تو دے  
کہ ایسا نقطہ کوئی وقت انتخاب تو دے  
دنائے خیر ذرا ہونے مستجاب تو دے  
کہ بعد مرگ بھی معلوم پیچ و تاب تو دے  
ذرا ٹھہرنے تہ تیغ اضطراب تو دے  
تسلی آکے مجھے وقت اضطراب تو دے  
ہوا نہ بھیجی کہ بوسہ سبر رکاب تو دے  
جو تجھ کو دینے ہوں بوسہ بلا حساب تو دے  
دل شہید تو چپ کیوں ہے کچھ جواب تو دے  
کسی کو بھر کے ذرا کاسہ حساب تو دے  
بجھا پران کی ذرا آتش عتاب تو دے  
پڑے تو واقعی ایک بار آگ داب تو دے  
نمک کی تیغ کو ہونے سیاہ تاب تو دے

پہنچ ہوں گا سر منزل فنا سے ذوق  
مثال نقش قدم کرنے پا تراب تو دے



## غزل غالب

وہ آکے خواب میں تسکین اضطرار تو دے      دل مجھے پش دل بجاں خواب تو دے  
کرے بے قتل لگاؤ میں میرا وودینا      تیری طرح کوئی تیغ نگہ کو آب تو دے  
دکھائے جنبش لب ہی تمام کر ہم کو      ندے جو بوسہ تو منہ سے کہیں جواب تو دے  
پلا دے اوک سے ساقی تو ہم سے نفرت ہے      پیالہ گر نہیں دیتا ندے شراب تو دے

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے

کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

اہل انصاف ملاحظہ فرمائیں کہ استاد ذوق کی غزل کس قدر طولانی ہے مگر چونکہ از مطلع یا مقطع خارجی رنگ رکھتی ہے۔ کسی طرح کا حسب مراد اثر دل پر پیدا نہیں کرتی۔ برخلاف اس کے غالب کی غزل ہے کہ نہایت ہی مختصر ہے۔ مگر داخلی رنگ رکھنے کے باعث کس قدر پُر اثر ہے۔ اسی سے ثابت ہوتا ہے کہ غزل سمراتی میں شاعر کو داخلی پہلو برتنے کی کس قدر حاجت ہے۔ بے داخلی پہلو برتنے غزلیت کا لطف پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ استاد ناتخ نے غزل سمراتی میں خارجی پہلو کو اختیار کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی غزلوں میں دلچسپی کی کیفیت پیدا نہیں ہو سکی لیکن کہیں کہیں اشعار داخلی رنگ کے شیخ کی غزلوں میں جو نظر آتے ہیں تو ان سے طبیعت کو حظ اٹھتا ہے۔ ایسے اشعار بہت نہیں ہیں بہر حال کچھ ایسے ذیل میں مذرا ناظرین ہوتے ہیں:-

## اشعار ناسخ

سب ہمارے لیے زنجیر لیے پھرتے ہیں      ہم سمر زلف گرہ گیر لیے پھرتے ہیں  
کون تھا صید و قمار کہ اب تک صیاد      بال و پر اس کے ترے تیر لیے پھرتے ہیں  
تیری صورت سے نہیں ملتی کسی کی صورت      ہم جہاں میں تری تصویر لیے پھرتے ہیں  
دل میں پوشیدہ بت عشق بتاں رکھتے ہیں      آگ ہم سنگ کے ماند نہاں رکھتے ہیں  
بزم جاناں میں کبھی بات نہ نکلی منہ سے      کہنے کو شمع کے ماند زبان رکھتے ہیں  
مثل پروانہ نہیں کچھ زرد مال اپنے پاس      ہم فقط تجھ یہ فدا کرنے کو جا رکھتے ہیں  
طاثر روح کو کر دیتے ہیں کیوں کر بسمل      تیر رکھتے ہیں پری رُوند کمان رکھتے ہیں

ہو گیا زرد پڑی جب کہ حسینوں پہ نظر  
بھاگتی کون سی وہ بات بتوں کی ورنہ  
عوض ملک جہاں ملک سخن ہے ناسخ  
اُڑا کے ساتھ یہ مشت غبار لیتا جا  
مقابل آپ کا آنکھوں کے آہو ہو نہیں سکتا  
ہوسارے بدن کا کر دیا ہے خشک فرستے  
جنوں پسند مجھے چھانو ہے بولوں کی  
عجب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی

حضرات سخنذاں پر روشن ہے کہ اشعار بالا کسی قدر داخلی رنگ رکھتے ہیں جس کے باعث  
فی الجملہ ان میں دلچسپی پائی جاتی ہے مگر چوں کہ ان میں بہت اعلیٰ درجہ کی واردات قلبیہ کے مضامین  
نہیں ہیں۔ درد یا تیر کے انداز کلام تک نہیں پہنچتے ہیں۔ آخر میں شیخ کی غزل سمرانی کی نسبت قابل لحاظ  
ایک اور بات بھی گزارش کی جاتی ہے کہ علاوہ فصاحت و بلاغت کے شیخ کا کلام پُر از تہذیب دیکھا  
جاتا ہے۔ کوئی شعر ایسا نہیں پایا جاتا ہے جس سے کچھ بھی کوچہ گردی کی بونھلی ہو شیخ کبھی فسق و فجور کے  
مضامین نہیں باندھتے۔ کوئی مضمون عشق ایسا حوالہ قلم نہیں فرماتے کہ جو محض حسناں بازاری سے تعلق  
رکھتا ہو۔ ظاہر ہے کہ حسناں بازاری زینہاں اس قابل نہیں کہ عشق ایسے پاک امر کے ساتھ یاد کیے  
جائیں۔ کوئی صافی طینت اور پاک فطرت آدمی کسی حسین بازاری کے ساتھ تعلق عشق نہیں رکھ سکتا۔  
پس شیخ کا اجتناب ایسے مضامین کی بندش سے جو تقدس اور پاکبازی کے خلاف ہوں۔ بہت کچھ قابل  
احترام ہے۔ اس جگہ ایک مطلع حضرت کا عرض کیا جاتا ہے جس میں ایک تعلیم ملحوظ رہی ہے۔ خاص کر حضرت  
نوجوان کو اسے گوش دل سے سنا چاہئے۔

اہل حرفہ جو ہیں بت ان کا خریدار نہ ہو      جوش سودا کہیں اسے دل سر بازار نہ ہو  
واقعی اس شعر میں بڑی قوی اصلاح مد نظر رہی ہے۔ یہ ان اقسام اشعار سے ہے کہ  
جو بے انتہا مفید معاشرت ہیں۔

## آتش

آتش۔ خواجہ حمید علی آتش شیخ ناسخ کے ہم عصر تھے۔ مگر چند سال تک شیخ کے بعد زندہ رہے  
لکھنؤ میں آتش بھی ناسخ کی طرح شاعر مستند مانے جاتے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ لکھنؤ کی غزل سمرانی



دونوں شاعران گرامی کے اجتہادات کی ممنوں ہے شیخ اور خواجہ کے وقت سے جتنے ممتاز غزل سرا لکھتے ہیں گزرے ہیں یا ماشاء اللہ اس وقت موجود ہیں انہیں دونوں استادوں کی پیروی کرنے والے نظر آتے ہیں دونوں استادوں کے بڑے بڑے نامی گرامی شاگرد گزرے ہیں جن کے دواوین چاپ ہو کر مختلف دیار میں شائع ہوتے گئے ہیں خواجہ اور شیخ میں شاعرانہ مقابلہ ہوا کرتا تھا اور بڑے بڑے مشاعرے ان دونوں بزرگواروں کے دم سے قائم ہوتے تھے شہرت شاعری میں خواجہ شیخ سے کم نہیں ہیں چنانچہ شیخ کے نام کے ساتھ خواجہ کا نام بھی آج تک السنہ خلافت پر جاری ہے خواجہ کے دونوں دیوانوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت بھی شیخ کی طرح اکثر غزل سرائی میں شاعری کا خارجی پہلو برتتے تھے یہ وہی رنگ ہے جس کے پابند جمیع متغزلین لکھتے نظر آتے ہیں دہلی اور لکھنؤ کی غزل سرائی کا فرق یہی ہے کہ استادان دہلی بیشتر غزل سرائی میں داخلی پہلو کو ملحوظ رکھتے تھے اور استادان لکھنؤ اس کے برخلاف کاربند ہوتے ہیں یہی ایک ایسا امر ہے جس نے ان دونوں جگہوں کی غزل سرائی کو دو شے بنا رکھا ہے جاننا چاہئے کہ اس امر کی واقفیت پر سخن فہمی کا مدار ہے بے اسی امر کی دانست کے ان دونوں جگہوں کی غزل سرائی کا فرق سمجھ میں آسکتا ہے اور نہ کسی غزل گو کے حسن دق کلام سے خبر ہو سکتی ہے ذیل میں ایک غزل خواجہ صاحب کی درج کی جاتی جس سے خواجہ صاحب کا مذاق غزل سرائی ظاہر ہوگا۔ اسی زمین میں ایک غزل غالب کی بھی ہے جو پہلے نذر ناظرین ہو چکی ہے وقت مقابلہ اہل مینش پر روشن ہو جائے گا کہ خواجہ کی غزل خارجی پہلو اور غالب کی غزل داخلی پہلو رکھتی ہے۔

## غزل آتش

خشک لیں آنکھیں تمہاری آفت جاں ہو گئیں	بر چھیاں عاشق کشتی کرنے کو مڑسکاں ہو گئیں
تم جو جانکے نسیم نو بہاری کی طرح	پھول کھل کھل کر گل دلا لہ کی کلیاں ہو گئیں
اے صبا دامن ہے تیرا اور مجھ مجنوں کا ہاتھ	اس پر سی رو کی اگر زلفیں یریشاں ہو گئیں
سامنے رہنے لگا رخسارۂ زیبائے یار	صوت آئینہ آنکھیں اپنی حیراں ہو گئیں
مہندی ہاتھوں میں ملی تو نے جولے دیائے حسن	انگلیاں رنگ خا سے شاخ مر جاں ہو گئیں
راستی سے نیزۂ مڑسکاں بنا بالائے یار	وہ بھون اپنی کجی سے تیغ عریاں ہو گئیں
خانہ دل میں تصور خوش جسمالوں کا رہا	گاہ جو رہیں گاہ پریاں اپنی مہماں ہو گئیں
کوچہ گردی میں دکھائی تیغ قاتل نے بہار	لسلوں سے شہر کی گلیاں گلستاں ہو گئیں

دیدۂ عاشق سے دیکھا جس نے دیوانہ ہوا جس نے پریان بلائے جانِ انساں ہو گئیں  
 اسے مرادِ دل ترے کو پہ میں رکھتے ہیں قدم حسرتیں جو کچھ کہتیں گردِ پریشاں ہو گئیں  
 یہ کھلا آتشِ عناصر سے دل دیوانہ کو  
 چار دیواریں اکھی ہو کے زنداں ہو گئیں

دونوں غزلوں کے موازنہ سے ظاہر ہو گا کہ غزلِ سمرائی کے لیے داخلی پہلو کی کس قدر حاجت ہے  
 جناب آتش مرزا اسد اللہ خاں غالب سے قابلیتِ شاعری میں کبھی کم نہ تھے۔ مگر خارجی پہلو اختیار کرنے  
 سے خواجہ کی غزل حسبِ مراد تاثیر پیدا نہیں کر سکی۔ خیالِ راقم خواجہ کی نسبت یہ ہے کہ اگر وہ دہلی وطن ہوتے  
 تو تقاضائے ملکی سے ان کی غزل سمرائی بھی بہ قرینہ غالب زیادہ داخلی رنگ کی ہوتی پس اسی صورت میں  
 وہ یا دردِ و میر کے جواب ہوتے یا موتمن اور غالب کے ہم عصر یا ان دونوں سے بھی بہتر غزل سرائے۔  
 خواجہ کی فطری صلاحیت بڑے اعلا درجہ کی معلوم ہوتی ہے مگر چون کہ شیخِ ناسخ اپنا رنگ جاپچکے تھے۔  
 خواجہ کو تقاضائے زمانہ سے بہت کچھ ملے رنگ اختیار کرنا پڑا۔ ہزار افسوس کہ خواجہ کو داخلی پہلو کے اختیار  
 کرنے کا موقع نہ ملا۔ غزلِ سمرائی کا رتبہ بہت اعلا ہو جاتا۔ بہر کیف اس خارجی رنگ کے ساتھ بھی  
 خواجہ کے کلام میں ایسی بات ہے کہ شیخِ ناسخ کو باوجود بڑی طباعی اور خلاق سخن کے حاصل نہیں ہے۔  
 شیخ صاحب کے اکثر اشعار تشبیہ اور مبالغہ سے مملو ہیں اور اکثر اشعار کی ترکیب یہی ہوتی ہے کہ پہلے مصرع  
 میں دغوا ہوتا ہے اور دوسرے میں دلیل، خواجہ صاحب بھی ملکی مذاق کے تقاضے سے بیشتر اسی رنگ  
 کے اشعار فرما گئے ہیں۔ مگر طبیعت کی رنگینی شوخی اور ہرنگی سے ان کے اشعار میں شیخ کے اشعار کے اعتبار سے  
 کچھ غزلیت کا ایسا انداز پیدا ہو جاتا ہے جس سے دل کو فی الجملہ غزلِ سمرائی کی لذت نصیب ہو جاتی  
 ہے لیکن شیخ کے رنگ سے مزاحرہ ہو کر جب حضرت خواجہ لطفِ طبیعت دکھاتے ہیں تو انکی غزل سمرائی  
 احاطہِ تعریف سے باہر ہو جاتی ہے۔ ذیل میں ایک غزل درج ہذا کی جاتی ہے جو خواجہ کے اصلی رنگ  
 طبیعت سے خبر دیتی ہے۔

## غزلِ آتش

نارِ تارِ چرخ میں بس رہی ہے بوجے دوست  
 چہرہ رنگین کوئی دیوان رنگیں ہے مگر  
 جگر کی شب ہو چکی روزِ قیامت سے دراز  
 مثل تصویرِ نہالی میں ہوں یا پہلوئے دوست  
 من مطلع ہے جہیں مطلع ہے صلیٰ برفیے دوست  
 دوش سے نیچے نہیں اترے کبھی گیسوئے دوست



دور کردل کی کدورت محو ہو دیدار کا  
 واہ ری شانہ کی قسمت کس کو یہ معلوم تھا  
 آئینہ کو سینہ صافی نے دکھایا روئے دوست  
 پنجہ شل سے کھلیں گے عقدہ ہائے موئے دوست  
 دشمن جاں ہیں جو آنکھیں دکھتی ہیں موئے دوست  
 چار تلوار و نہیں شل ہو جائے گا بازوئے دوست  
 خشت زیر سر نہیں یا یکہ تھا زانوئے دوست  
 جب اٹاتی ہے ہوائے تند خاک کوئے دوست  
 یاد کر کے اپنی بربادی کو رو دیتے ہیں ہم

اُس بلائے جان سے آتش دیکھئے کیونکر سنبھلے

دل سوا شیشہ سے نازک دل سے نازک خورئے دوست

واقعی خواجہ صاحب داخلی رنگ اختیار فرماتے ہیں تو غضب کی طبیعت داری دکھا جاتے ہیں  
 درحقیقت یہ غزل ایسی ہے کہ اغراض غزل سرائی کو پورا کرنے والی ہے۔ سبحان اللہ کیا کہنا ہے ایک  
 غزل ہزار دیوان کا جواب ہے۔ ظاہر ہے کہ اس غزل کے اکثر اشعار ارفع درجہ کے واردات قلبیہ سے تعلق  
 رکھتے ہیں۔ بلاشبہ خواجہ کا اصل رنگ یہی ہے اور اسی رنگ کی بدولت خواجہ کی شہرت تمام اں دیار میں  
 ہے جہاں اردو بولی جاتی ہے حضرت خواجہ کی غزل سرائی پر نظر ڈالنے سے بہت سی خوبیاں بین طور پر  
 عیاں ہوتی ہیں۔ اول لطف زبان ایسا ہے کہ کس مزہ سے کوئی اس کی تعریف کرے۔ دوم محاورہ بندی  
 ایسی ہے کہ جواب نہیں رکھتی۔ سوم اکثر اعلا درجہ کے مضامین بندش پاتے ہیں۔ چہارم مضامین شوخی اور  
 بانگن سے خالی نہیں ہوتے۔ پنجم اکثر مضامین فقر و آزاد مزاجی سے خبر دیتے ہیں۔ کیوں نہ ہو حضرت خواجہ  
 آدمی بڑے فقیر طبیعت تھے۔ مال و منال کی انھیں کوئی پردا نہ تھی۔ نہایت بے طمعی لا پرواہی اور میر حشری  
 کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔ چنانچہ اپنے حسب حال فرماتے ہیں۔۔۔

نہیں رکھتے ہیں امیری کی ہوس مرفقیہ شیر کی کھال بھی ہے فاقم و سہلاب مجھے

ششم۔ کلام کا رنگ بہت مردانہ ہے۔ غزل گوئی کے لیے اس رنگ کی بڑی حاجت ہے۔ ورنہ اشعار میں  
 جلالت و ممانت کی صفتیں حاصل نہ ہوں گی۔ حقیقت یہ ہے کہ خواجہ صاحب ایک وقت میں کسی لشکر سے  
 متعلق تھے۔ جب پیشہ سپہ گری کو چھوڑا راہ فقیر اختیار کی، تارک دنیا ہو کر غزل سرائی کی طرف مائل  
 ہوئے۔ پھر اپنی فطری صلاحیت کی بدولت اس صنف شاعری کے ایک مستند استاد ہو گئے۔ المختصر  
 خواجہ صاحب میں وہ سب خوبیاں مودہ تھیں جو ایک بڑے شاعر کے لیے درکار ہیں حضرت افعال و  
 اقوال سے تمام تر شریف تھے۔ کوئی بات خواجہ میں ایسی نہ تھی جو ان کی عظمت و جلالت کی کمی کا سبب

قیاس کی جاسکے۔ شجاعت، سخاوت، مردت، قناعت، سیرحشی، خوش اخلاقی، پاکبازی کے مجمع تھے، نام نہون امور سے اجتناب رکھتے تھے اور تادم آخر ان صفحات کے ساتھ مصنف رہے حضرت کے کچھ اشعار نمونے کے طور پر ذیل میں مذکر ناظرین ہوتے ہیں:-

حباب آسائیں دم بھرتا ہوں تیری آشنائی کا نہایت غم ہے اس قطرے کو دیا کی جدائی کا  
یہ شعر تو ایسا شرح طلب ہے کہ اس کے لیے عالم سے عالم اور عارف سے عارف شارح کی ضرورت  
ہے۔ سبحان اللہ کتنا بڑا مضمون کس آسانی کے ساتھ اور کیسے خوب پیرایہ شاعری میں بیان ہوا ہے۔  
واقعی اگر خواجہ بہت بڑے طبیعت دار نہ ہوتے تو ایسے شعر کے موزوں کرنے پر قادر نہ ہو سکتے اس شعر  
سے کس قدر نازک خیالی بلند پروازی اور عالی مذاقی ظاہر ہے:-

ظہور آدم خاکی سے یہ مجھ کو یقیں آیا	تماشا انجمن کا دیکھنے خلوت لاشیں آیا
خدا مرنے تو سودا دے تری زلف پریشاں کا	جو آنکھیں تو نظارہ ہوا ایسے سنبھلاں کا
چمن میں شب کو جو وہ شوخ بے نقاب آیا	یقین ہو گیا شبنم کو آفتاب آیا
اسیر ہونے کا اللہ رے شوق بلسل کو	جگایا پاؤں سے صیاد کو جو خواب آیا
شب فراق میں مجھ کو سلانے آیا تھا	جگایا میں نے جو افسانہ گو کو خواب آیا
چکو حسن مہ چار دہ کو بھول گیا	مراد پر جو ترا عالم شباب آیا
ہماری قبر سے آئے گی یہ صدا تا حشر	یہ مردہ آیا کہ مجھ پر کوئی عذاب آیا
عدم میں ہستی سے جا کر سہی کہوں گا	ہزاروں حسرت زندہ کو گا رذاب آیا
محبت مے و معشوق ترک کر آتش	سفید بال ہوئے موسم خفتاب آیا
غضب ہے جان کو پہلو میں ہونا ویسے دشمن کا	مقل خون ہے ہمسایہ قصاب و برہمن کا
جو سویا ساتھ بھی قاتل تو خنجر درمیان رکھ کر	ہمارے اس کے پردہ رہ گیا دیوار آہن کا
یہ خوش اسلوب جسم اس نوجوان کا ہے جو ناہن تو	برابر نکلے ڈورا اس کسر کا اور گردن کا
چنی افشاں جو پیشانی یہ اس نے چاندنی چٹکی	ٹلی سی تو آئینہ میں پھولا تختہ موسن کا
ڈراتا ہے کسے اے شیخ تو نار جبہ نسیم سے	سمندر موج مارے گر نچوڑ دوں پاؤں کا
وحشت دل نے کیا ہے وہ بیاباں پیدا	سیکڑوں کو س نہیں صورت انساں پیدا
دل کے آئینہ میں گر جو ہر نہاں پیدا	درد دیوار سے ہو صورت جانان پیدا
فریب سن سے گبر و مسلمان کا چلن بگڑا	خدا کی یاد بھولا شیخ بت سے برہن جھگڑا



امانت کی طرح رکھا زمین نے رو دو محشر تک  
 لگے منہ بھی چڑھانے دیتے دیتے گایاں تھکا  
 چال ہے مجھ ناتواں کی مرغ بس کی ترب  
 عاشق شیدا علی مرتضیٰ ہو گیا  
 قرب حق حاصل ہے اس کو مرد عارف ہے ہی  
 ساختہ برداختہ تیری ہے ساری کائنات  
 وقت مشکل میں کہا جس وقت یا مشکل کشا  
 کون تجھ سا ہے ولی اللہ اے مولا مرے  
 کوچہ یار میں سایہ کی طرح رہتا ہوں  
 اسے جان کے برابر مرتے مرتے ہم نے رکھا ہے  
 برہن آنکھوں کو ملتا ہے جو پائے بت پر  
 پیسا مبرنہ میسر ہوا تو خوب ہوا  
 بہار لالہ دگل سے لگی ہے آگ گلشن میں  
 باغ جہاں میں گل کی قناعت ہے جائے رشک  
 چلے تو سیر کو ہیں آپ سیلے گلشن میں  
 یہ سودائے شہادت ہے ہمارے سر کو اے قاتل  
 نہیں روزن جو قصاریاں پر و انہیں ہکو  
 طریق عشق میں آتش قدم مجھ سا نہ گزرے گا  
 جنوں کے جوش میں یکجا نہیں دم بھر قرار آ  
 غدا گور کاواں سامنا یاں رخ دنیا کا  
 شریف کعبہ کو کعبہ مبارک ہم تو اسے آتش  
 خدا بنٹے صنم یہ کہہ کے مجھ کو یاد کرتے ہیں  
 قفس میں جسم کے مرغ دل اپنا سر پکاتا ہے  
 خدا جانے یہ آیش کرے گی قتل کس کس کو  
 نہ خود آتے ہیں میت پر نہ اذن دفن دیتے ہیں

نہ اک موکم ہوا اپنا نہ ایک تار کفن بگڑا  
 زبان بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجئے دہن بگڑا  
 ہر قدم پر ہے یقین یاں رہ گیا واں رہ گیا  
 دل مرا بندہ نصیری کے خدا ہو گیا  
 یا علی پر دو تجھ سے میٹھا کا ہو گیا  
 حکم حضرت سے وجود ارض و سما کا ہو گیا  
 سہل چٹکارا گرفتار بلا کا ہو گیا  
 کعبہ پیدائش سے تیری گھر خدا کا ہو گیا  
 در کے نزدیک کبھی ہوں کبھی دیوار کے پاس  
 ہماری قبر پر دیا کرے گی آرزو برسوں  
 رشک آتا ہے مجھے سنگ دریا نہ ہو  
 زبان غیر سے کیا شرح آرزو کرتے  
 گریباں بھاڑ کر چل میٹھے صحرا کے دامن میں  
 عمر دو روزہ ایک قبا میں تمام کی  
 اشارے کیسے کیسے ہو گئے نافرمان یوسن میں  
 تری تلوار کا دم بھرتی ہے جو گرے گردن میں  
 نگاہ شوق خستہ کرتی ہے دیوار آہن میں  
 گریباں میں بھی ہے جب لگی ہے آگ دامن میں  
 کبھی گلشن سے صحرا میں کبھی صحرا سے گلشن میں  
 نہ گھر میں چین زندوں کو نہ مڑوں کو بے من میں  
 بتوں کے گھونے کو جلتے ہیں دیر برہن میں  
 دعائے مغفرت میرے لیے جلا د کرتے ہیں  
 کسی پازیب کے دانے کہیں فریاد کرتے ہیں  
 طلب ہوتا ہے شانہ آئینہ کو یاد کرتے ہیں  
 وہ گھر بیٹھے ہوتے مٹی مری برباد کرتے ہیں

عدم سے جانب ہستی تلاش یار میں آئے  
 اٹھائے بار عشق اس عالم غدار میں آئے  
 شیشے شراب کے رہیں آنکھوں پہ سر کھلے  
 زنگر زکی دکان میں بھرے ہوں ہزار رنگ  
 حیوان پر آدمی کو شرف نطق سے ہوا  
 کٹ جاتے وہ زباں نہ جس سے دعائے خیر  
 کوتاہ ہے اس قدر مرے قدر پر روئے عیش  
 فصل بہار آتی ہے چلتا ہے دور حجام  
 مطلب نہ سر نوشت کا سمجھا تو شکر کر  
 دیوانہ ہو جو حال قضا و قدر کھلے

چلنا پڑے گایار کی خدمت میں سر کے بل  
 سمجھے ہو کیا جو بیٹھے ہو آتش کسر کھلے

اشار بالا سے خواجہ صاحب کی عنایت طبیعت داری کا اندازہ ہو رہا ہے۔ زبان کے اعتبار سے ان کی زبان شیخ صاحب کی زبان سے زیادہ دلفریب ہے۔ گو اصلاح زبان کی حیثیت سے شیخ صاحب کا درجہ ارفع و اعلا ہے شیخ صاحب کو لغات کی طرف بہت توجہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ شیخ صاحب کی زبان سوتی سے خس بھر بھی تعلق نہیں رکھتی ہے۔ ان کی زبان میں غلط العام کا نشان بھی نہیں ملتا۔ اور انصاف یہی ہے کہ خواجہ زبان کی زبان صحت لغات کے اعتبار سے شیخ صاحب کی زبان کو نہیں پہنچتی ہے۔ مگر خواجہ صاحب کی زبان کا حسن ایسا ہے کہ چند غلط العام شکلیں جو ان کی بعض غزلوں میں دیکھی جاتی ہیں وہ چہرہ زیبا میں خال کا حکم رکھتی ہیں۔

## رند

رند۔ نواب سید محمد خاں حضرت آتش کے شاگرد تھے۔ ان کی غزل سرائی قابل لحاظ ہے۔ شہسنگی زبان، خوبی بندش، صفاتی کلام، روانی طبع، بختگی مضامین کی صفتیں اس درجہ تمامی دیوان میں آشکارا ہیں کہ جس غزل کو جہاں سے پڑھئے یہ صفتیں اپنے جلو سے دکھا رہی ہیں۔ شروع سے آخر تک دونوں دیوانوں کو ایک رنگ ہے۔ ہر شعر یہ کہتا ہے کہ میں رند کے نتائج سے ہوں یہ بات تو خواجہ صاحب کی غزل سرائی میں بھی نہیں دیکھی جاتی ہے۔ کس واسطے کہ سیکڑوں شعر حضرت خواجہ کے ایسے ہیں جو شیخ صاحب کا رنگ



رکھتے ہیں اور ان کے ذاتی رنگ سے تمام تر علاحدہ ہیں ایک اور خوبی بھی زندگی غزل سرائی میں یہ ہے کہ ان کی غزلیں بہت سیر ہو کر کرتی ہیں واضح ہو کہ رند بر خلاف اپنے ملکی رنگ کے بیشتر شاعری کا داخلی پہلو ہوتے ہیں اسی لیے ان کی غزلیں غزلیت بکھرا دیتی ہیں۔ اگر ان کے کلام میں خشکی پرشتگی سوز و گداز نشتریت درد ممانت جلالت وغیرہ کے مواد حسب مراد ہوتے تو ان کو درد، قیر اور غالب کے ساتھ ہم سری حاصل ہوتی۔ خیر اس پر بھی جیسی ان کی غزل سرائی ہے نہایت غنیمت ہے۔ اور باب مذاق کی توجہ کے قابل ہے۔ ذیل میں کچھ کلام رند کے نذر ناظرین پڑھتے ہیں:-

## غزل نمبر ۱

حور پر آنکھ نہ ڈالے کبھی شیدا تیرا	سب سے بیکار ہے اے دوست شناسا تیرا
شان ارفع ہے تری مرتبہ اعلا تیرا	تو ہے کیا کوئی ثانی نہیں حق تیرا
عقل کیا دخل کرے کنہ حقیقت میں تیری	حوصلہ پست مرا مرتبہ اعلا تیرا
راہ میں اس کی جو ثابت قدمی ہے تجھ سے	سجدہ گہ جانے ملک نقش کعب پا تیرا
جستجو میں تونہ دوڑیں تری ٹوئیں وہ پاؤں	سرودہ کٹ جائے نہ ہو جس میں کہ سودا تیرا
تو ہی نے اس کو بنایا ہے یہ قدرت سے	تو ہی چاہے گا تو بگڑے گا یہ پستلا تیرا
دیدلیں کے لیے دیدہ مجنوں ہے ضرور	میری آنکھوں سے کوئی دیکھے تماشا تیرا
اک عالم کو ترے نام کا ہے وردائے دوست	میں ہی کچھ ذکر نہیں کرتا ہوں تنہا تیرا
میں بھی دیکھوں گا دکھا مجھ کو تجھ لائے جمال	میں بھی شائق ہوں صنم صورت موسیٰ تیرا
آنکھ لا سکتی نہیں تاب تجھ لائے جمال	عالم نور ہے اے حور سراپا تیرا
بیٹھے تیکہ بھی لگا کر کبھی اس دن سے	ہم فقیروں نے لیا ہے جب سے سہارا تیرا
پاک دامن میں تیری نہیں پڑنے کا خلل	اپنے مشتاقوں سے ناتاق ہے یہ پردا تیرا
تجھ سے سبزا ہوں جاتا ہوں سوتے ملک عدم	منہ دکھلائے خدا پھر مجھے دنیا تیرا

عاشق روتے پری شیفہ حور نہیں

جان جاں رند ہے دیوانہ و شیدا تیرا

سبحان اللہ کیا حسن کلام ہے۔ یہ حمد نگاری اور اس کے ساتھ یہ غزلیت آفریں صد آفریں مرجا  
صد مرجا۔ کیا پُر تائیر کلام ہے بشاعر کی حقیقت دل کا آئینہ اور حقیقت آکاہوں کے لیے تماشا گاہ

حیرت ہے۔ ایسی لاجواب غزل ہے کہ اگر بزمِ عشق میں پڑھی جائے تو عاشقوں کی بے قراری کو بڑھادے اور اگر مسجد میں سنائی جائے تو عابدوں کی توفیقِ عبادت میں ترقی پیدا کرے۔

## غزل نمبر ۲

کوہِ فرہاد سے مجنوں سے سیاہاں جیتا	وحشتِ دل ترے اقبال سے میدانِ جیتا
رو بہِ بستر بھی اب کھل نہیں سکتی ہم سے	باندھ لاتے تھے کبھی شیرِ نستانِ جیتا
گردِ کلفت میں دبا جاتا ہے میرا تنِ زار	گاڑ دے گی مجھے کیا گردشِ دورانِ جیتا
بندگی کرتا غلاموں کی طرح سے تیری	آج کے دن نہ رہا یوسفِ کنعانِ جیتا
جس کی دعوت کے زمانے نے دیا زہر اُسے	اس کے گھر سے نہ پھر ایک بھی مہمانِ جیتا
پیس ڈالے گی یہ ایک کو چکنی کی طرح	کوئی رکھنے کی نہیں گردشِ دورانِ جیتا
مرگِ خواہاں ہے مری بچکی ہے زیتِ جواب	تیری اُمید یہ ہوں عیشی دورانِ جیتا
آپ دانستہ کھوتا ہے کوئی نعمتِ اپنی	پھینک دیتا ہے کوئی توڑ کے دندانِ جیتا
سخت جان تھا جو رہا زندہ چمن سے چھٹ کر	میں تو دم بھر بھی نہ اے مرغِ گلستانِ جیتا

چل کے اب عرض کر و حضرت آتش سے بند

معرکہ آپ کا یہ طفلِ دبستانِ جیتا

## غزل نمبر ۳

لالہ رویوں سے کب فسرانِ رہا	اک نہ اک گل کا دل پہ داغِ رہا
نازِ بیجا اٹھائیے کس کے	اب ذوہِ دل نہ وہ دماغِ رہا
کب مَعاشِق کا نشانِ دل سے	زخمِ اچھا ہوا تو داغِ رہا
اک نظر جس نے تجھ کو دیکھ لیا	عمر بھر درپے سراغِ رہا
یاد ہیں کس کو زمزمے بلبل	مدتوں ہمنوائے زاغِ رہا
کبھی نظارہ چمن نہ کیا	اپنے داغوں سے باغِ باغِ رہا

دل کو افسردگی سی ہے اے بند

سیرِ گل کا کسے دماغِ رہا



## غزل نمبر ۴

کھلی ہے کنہ قفس میں مری زباں صیاد  
 دکھائے گا نہ اگر سیر بوستاں صیاد  
 جہاں گیا میں گیا دام لے کے واں صیاد  
 دکھایا کج قفس مجھ کو آب و دانہ نے  
 اجازت موسم گل ہی میں آشیاں میرا  
 میں کھینچوں دام میں بلبل تو آشیانہ جلاں  
 عجیب قصہ ہے دلچسپ اک حکایت ہے  
 نہ گل کھلیں گے نہ چہکارے گا کوئی بلبل  
 ہمائے زندہ گھسیٹے گا دام میں شاید  
 خبر نہیں کہتے ہیں گل چمن کیسا  
 اداس دیکھ کے مجھ کو چمن دکھاتا ہے  
 رہے نہ قابل پرواز بال و پر میرے  
 قفس کو شام سے لٹکا کے فرش خواب کے پاس  
 کرے گا یاد مرے زمرہوں کو بعد مرے  
 سناؤں گا واقعہ اپنا تجھے تمام و کمال  
 ستم زیادہ نہ کر حکم دے رہائی کا  
 چمن میں رکھا نہ بلبل کا نام تک باقی  
 ہزار مرغ خوش الحان چہکتے ہیں ہر سو  
 میں جھانکتا نہیں چاک قفس سے بھی گل کو  
 اسیر کج قفس کر بہ شوق دام میں کھینچ  
 پر دل کو کھول دے ظالم جو بند کرتا ہے  
 نہ ہوں گا بند قفس میں بھی وہ بلبل ہوں  
 در قفس بھی کھلے گا تو اب نہ جاؤں گا

میں ماجراتے چمن کیا کروں بیان صیاد  
 بھڑک بھڑک کے قفس ہی دوں گا صیاد  
 پھرا تماش میں میری کہاں کہاں صیاد  
 وگرنہ دام کہاں میں کہاں کہاں صیاد  
 انہی ٹوٹ پڑے تجھ پہ آسماں صیاد  
 ہم یہ مشورہ کرتے ہیں باغباں صیاد  
 سناؤ لگا گل و بلبل کی داستاں صیاد  
 بہار باغ کو ہونے تو دے خسراں صیاد  
 بجائے دانہ بچھاتا ہے استخواں صیاد  
 قفس کو جانتے ہیں ہم تو آشیاں صیاد  
 کئی برسوں میں ہوا ہے مزاج داں صیاد  
 قفس سے اڑ کے ہیں اب جاؤ لگا کہاں صیاد  
 سنا کی میری تاجم داستاں صیاد  
 ہوں چند روز ترے گھر میں مہماں صیاد  
 جو گوش دل سے سنے میری داستاں صیاد  
 پکارتے ہیں گرفتار الاماں صیاد  
 خدا کرے یوں ہی ہو جائے بے نشاں صیاد  
 براز چمن ہوا اب تو ترا مکاں صیاد  
 نہ ہوتے تاملی جانب سے بدگماں صیاد  
 قضا لے آئی ہے مجھ کو کشاں کشاں صیاد  
 قفس کو لے کے میں اڑ جاؤ لگا کہاں صیاد  
 ہزار تجھ کو سناؤ لگا داستاں صیاد  
 یقین نہ ہووے تو کر مرا امتحاں صیاد

رہا ہو کے بھی بھولوں گا حق خدمت کو  
 چن میں بلبل و قمری کا پر نہ چھوڑے گا  
 قفس پر رکھنے لگا اب تو ہار بھولوں کا  
 عیوب نہ رکھتا۔ ہے کرتا ہے خاطر میں میری  
 نکالو نہ قدم آشیاں سے بلبل  
 وہ عندلیب ہل جل کر کروں جو نلے گرم  
 مرے بیاں کو سن کے کانپ اٹھا  
 اپنی دیکھتے کیوں کرتا ہوتا ہے  
 سوائے شکر شکایت اگر کبھی کی ہو  
 ادا تے شکر کروں گا میں ہر زبان صیاد  
 رہا جب آٹھ پہر گھات میں نہاں صیاد  
 ہزار شکر ہوا مجھ پہ مہر باں صیاد  
 ملا ہے خوبی قسمت سے قدر داں صیاد  
 لگائے بیٹھے ہیں پھندے جہاں تہاں صیاد  
 قفس کے چاکوں سے اٹھنے لگے دھواں صیاد  
 غضب یہ ہے کہ سمجھتا نہیں زبان صیاد  
 زبان دراز ہوں میں اور بد زبان صیاد  
 اپنی قطع ہو منتقار سے زبان صیاد

فریب دانہ نہ کھاتا میں زینہاراے رند  
 نہ کرتا دام اگر خاک میں نہاں صیاد

## غزل نمبر ۵

دید گل کے تجھے پڑ جائیں گے لالے بلبل  
 کان کھولے ہوئے گل گوش براوا ہے آج  
 پھر وہی کج قفس ہے وہی صیاد کا گھر  
 پہلے گلشن کی ہوا دیکھ لے رہ کر چندے  
 دست انداز نہ ہو گل پہ ابھی اے گل چیں  
 بے اجازت میں قدم باغ میں دھرنیکا نہیں  
 ہاتھ اوراق گل آئیں تو بس کرا جیسا  
 کوئی اہاں نہیں لے کے چلے باغ سے ہم  
 نہ رہی بوئے وفا ایک بھی گل میں باقی  
 ہے یہ ویرانی گلشن تو عجب کیا اس کا  
 کس طرف جائے گی برداشتہ خاطر ہو کر  
 باغ تک خاۓ صیاد سے اڑ کر آئی  
 عہد طفلی سے وہ گل مائل عشاق رہا  
 پڑ گئی جب کسی صیاد کے پالے بلبل  
 درد دل جو تجھے کہنا ہو سنا لے بلبل  
 چار دن اور ہوا باغ کی کھالے بلبل  
 آشیاں کی تو ابھی طرح نہ ڈالے بلبل  
 صبر کر صبر ذرا باغ سے حبالے بلبل  
 منتظر ہوں درگزر پہ آلے بلبل  
 لکھوں رنگین مضامین کے رسالے بلبل  
 دل کے جو حوصلے تھے خوب نکالے بلبل  
 اب تو اس باغ سے الٹا اٹھالے بلبل  
 بچہ بوم جو بیٹھنے سے نکالے بلبل  
 باغ کیوں کرتی ہے گلیچیں کے حوالے بلبل  
 بارے پھر تو نے پرداں نکالے بلبل  
 طائر دل کا جو ہوا شوق تو پالے بلبل



دعوا ملک تو اثبات کرے گلچین پر  
دام میں بھنس کے نکلتا ترا نامکن ہے  
درد آمیز بچہ نہ ہوں کانوں میں صدا  
دم بدم سینہ سوزاں سے نہ کرنا لہ کرم  
ایک دو گل سے جو تسکین نہ ہوئے اسکی  
جس شجر پر ترا جی چائے نشین کر لے  
انگے خالق سے دعا بعد بقائے گل کی  
نر ہے گل ہی گلستان میں جو تھے تہہ شناس  
کسی غنچہ کو چھو اور نہ کوئی گل توڑا

لاکے دکھلائے گلستاں کے قبائے بلبل  
تا بہ مقدور پر وبال ہلائے بلبل  
بے اثر ہو گئے کیسے ترے نالے بلبل  
پڑ نہ جائیں تری منہا میں چھالے بلبل  
باغ کا باغ ہی سر پر نہ اٹھالے بلبل  
پھٹ پڑیں گے نہ ترے بوجھ سے ڈالے بلبل  
پہلے صیاد سے خیر اپنی منالے بلبل  
اڑ گئے سب ترے پہنچانے والے بلبل  
گھورتی کیوں ہے مجھے آنکھیں نکالے بلبل

چھپے زند کرے گا تو یہ ہو جائے گا بند  
کہدو گلچین کہ زبان اپنی سنبھالے بلبل

## غزل نمبر ۶

نہ ستا در پہ پڑا رہنے دے کیا لیتے ہیں  
نوس عمر نے طے منزل ہستی کی ہے  
میرے ہمراہی مجھے چھوڑ گئے یاں در نہ  
بھیجیں گے پیک بنا کر ترے پاس اے سخن  
سامنا لاکھ مصیبت کا پڑے پر کوئی  
کوچہ دوست میں رکھ پاؤں ادب سے غافل  
زلف پر بیچ کا مضمون نہیں بندھ سکتے کا  
حق تو یہ ہے کہ عجب لوگ ہیں مردانِ خدا  
شور و شر کرتے ہیں ہستی دو روزہ پر  
لب لبب رہتے ہیں جو شام و محراب سے  
گرچہ درویش ہیں یہ لوگ مگر چاہیں تو  
میرے ویرانہ میں درویش بھی سلطان ہو جائے

اے شہ حسن فقیروں کی دعا لیتے ہیں  
ہم بھی یار ان عدم رفتہ کو جا لیتے ہیں  
قافلے والے تو سوتوں کو جگا لیتے ہیں  
سمرقاصد کے لیے بال ہما لیتے ہیں  
آسرا غیر کا مردانِ خدا لیتے ہیں  
مکرش اس راہ میں گردن کو جبکا لیتے ہیں  
کیوں دباں اپنے سردوں پر شر لیتے ہیں  
اپنے مرغسیر کی ناحتی یہ بلا لیتے ہیں  
آسمان اہل دین سپہ اٹھا لیتے ہیں  
زندگانی کا وہی لوگ مزا لیتے ہیں  
سلطنت مول ترے در کے گدا لیتے ہیں  
یہاں بسیرا سرشام آکے ہما لیتے ہیں

جام جم سے اسے رتبہ میں سمجھتے ہیں زیادہ      بھیک جس کاسے میں ترے فقر لیتے ہیں  
جو گزر رہا ہے دفن چسینوں کے کبھی      واں کی ہم خاک کو آنکھوں سے لگاتے ہیں  
عیب سے پاک و مبرا ہے کلام ان کا زند  
جو غزل حضرت آتش کو دکھا لیتے ہیں

واقع ہو کہ ان شعرائے غزل سرائے کے علاوہ جن کے کلام نمونہ کے طور پر بالائیں درج ہذا کیے گئے اور بہت سے استادان فن گزرے ہیں اور ماشار اللہ اس وقت بھی موجود ہیں۔ مگر چوں کہ یہ کتاب سبیل تذکرہ نہیں لکھی جاتی ہے۔ ان حضرات کے ذکر کی ضرورت نہیں دیکھی گئی اب غزل سرائی کے مادے میں آخر عرض راقم یہ ہے کہ اس زمانہ میں تقاضائے سلطنت سے انگریزیت نے ایسی تاثیر پھیلائی ہے کہ ہر شے جو ملکی وضع ترکیب ساخت روش وغیرہ کی ہے تنگ چشموں کی آنکھوں میں ذلیل اور خوار نظر آتی ہے جن حضرات نے علوم یورپ حاصل کئے ہیں۔ ان کا انقلاب مذاق خیر انا حیرت انگیز نہیں ہے مگر تعجب ان حضرات سے ہے جو انگریزی جانتے ہیں و فرانسسی مگر صحت فہم مذاق پر بحث کرنے کو مستعد ہو جاتے ہیں۔ اور ہندوستانی علوم و فنون کی مذمت بے دھروک کرنے لگتے ہیں۔ ایسے حضرات کے نزدیک ہر شے جو ہندوستان سے تعلق رکھتی ہے بفتوائے یقین مقدوح و مذموم ہے منجملہ دیگر اشیائے ملکی کے ملکی شاعری بھی ان کے خیال میں پر از عیوب مقصور ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ملکی شاعری میں معائب ہیں۔ مگر یورپین شاعری بھی عیوب سے پاک نہیں ہے۔ یورپین شاعری کے عیوب ایسے حضرات کو سو جباتی نہیں دیتے اور حقیقت یہ ہے کہ انھیں یورپین شاعری کے عیوب کیوں کر نظر آئیں جب ان کی اطلاع کوٹ، پتلون، کرسی، میز، چھری کاٹنے وغیرہ کے اندر محدود ہے۔ ایسے حضرات کو ہومر، ورجل، ہارس، ڈینی، شکسپیر، ملٹن، بشلی بیرن، مینسن وغیرہ ہم کے حسن و قبح سے کیا خبر ہے جو یورپین شاعری کا دم بھرتے ہیں اور شاعری ایسے امراہم میں رائے زنی کرنے کو مستعد ہو جاتے ہیں۔ ایسے حضرات غزل سرائی کے مادے میں جو جو صورتیں اصلاح کی بتاتے ہیں اس کی نسبت یہی کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے غزل سرائی کی خوبیوں کو عجز طبیعت کے باعث درک نہیں کیا ہے یا ان پر انگریزی کا جہل مرکب ایسا سوار ہو رہا ہے کہ جب تک دن کے خیال کے مطابق انگریزی مذاق کے ساتھ غزل سرائی نہیں کی جائے تب تک غزل سرائی مطبوع رنگ پیدا نہیں کر سکتی۔ ان حضرات سے بعض فرماتے ہیں کہ غزل میں ہمیشہ عشقیہ مضامین باندھے جاتے ہیں جو مخرب تہذیب ہوا کرتے ہیں۔ لازم ہے کہ ایسے مضامین کے عوض وعظ، پند نصیحت اخلاق تمدن اور نیچرل سیریاں کی باتیں موزوں کی جائیں۔ نیچرل سیریاں عبادت ہے



جبال، بحور، صحرا، میدان کشت راز، حیوانات، نباتات، ہوا، برق، یاران وغیرہ وغیرہ کی نمود سے ایسے معترضین کی خدمت میں عرض راقم یہ ہے کہ غزل وہ صنف شاعری ہے کہ جو مضامین عشقیہ کے لیے موضوع کی گئی ہے اس کا تقاضا ہی یہ ہے کہ اس میں اعلا درجہ کے واردات قلبیہ معاملات روحیہ اور امور ذہنیہ حوالہ قلم کیے جائیں۔ اگر واقعی کسی غزل سرا ایسے مضامین کی بندش کی قدرت ہے تو اس کی غزل سرائی مخرب تہذیب ہو نہیں سکتی۔ بلکہ اس کی غزل سرائی سے بہت کچھ اصلاح قلب و روح کی امید کی جاسکتی ہے۔ جیسا کہ حافظ کی غزل سرائی دیکھی جاتی ہے کہ اس سے زیادہ اخلاق آموز کوئی کتاب فارسی زبان میں نہیں دیکھی جاتی ہے۔ اسی طرح وعظ پند کی نسبت عرض ہے کہ غزل سرائی کو پند و موعظت سے عداوت نہیں ہے۔ البتہ بھونڈے طور کی پند گوئی اور وعظ فرمائی کو غزل ایسی نازک صنف شاعری سے کیا علاقہ۔ یہ میں نہیں کہتا کہ غزل سرائی کو پند و موعظت سے کوئی علاقہ ہی نہیں ہے۔ مگر ہاں جو علاقہ ہے وہ نہایت نازک انداز کا ہے۔ یہ بڑے غزل سرا کا کام ہے کہ پند و موعظت بھی کرے اور غزل کے رنگ کو بھی قائم رکھے۔ اس کام کو حافظ خوب کرتے ہیں۔ اس کا پورا ڈھنگ سعدی کو بھی نہ تھا۔ کس واسطے کہ شیخ جب غزل میں پند و موعظت فرماتے ہیں تو غزل سرائی کے پیرائے سے نکل جاتے ہیں لیکن اگر کسی کو یہ منظور ہے کہ پند و موعظت کھلے ڈلے طور پر داخل غزل کی جائے تو اسے اس امر کوئی الذہن رکھنا چاہیے کہ یہ صنف شاعری اس کام کے لیے موضوع نہیں ہے اس کام کے لیے اور اصناف شاعری درکار ہیں مثلاً قطع، رباعی، قصیدہ اور مہم۔ جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا۔ مشیران اصلاح غزل اس کی امید نہ رکھیں کہ کھلے ڈلے طور کے پند و موعظت غزل میں کوئی موثر رنگ پیدا کریں گے۔ کہہ مائے سعدی اور پند نامہ عطار کی مضمون بندی غزل کے لیے زینہار درکار نہیں ہے۔ اس طرح نیچرل سینریوں کے بیان کے لیے غزل موضوع نہیں ہوتی۔ اس صنف شاعری کو مجرد عالم درونی کی سیر درکار ہے۔ غزل گو کو کوئی حاجت نہیں ہے کہ وہ کوہ پتھروں کو یا دریا موجوں کو گستاخ پھرے۔ نیچرل سینریوں کے لیے مثنوی موضوع ہوتی ہے۔ یورپین شاعریوں میں بھی نیچرل سینریوں کا بیان لیرکس میں نہیں دیکھا جاتا ہے۔ ایسے مضامین کے لیے مثنوی کے رنگ کی شاعری عموماً کام میں لائی گئی ہے مثلاً مرد الزکی دہ مثنوی جس کا نام لیڈی آف دی لیک (LADY OF THE LAKE) ہے جس حضرات مشیران اصلاح کی خدمت میں عرض ہے کہ غزل جس کام کے لیے ایجاد ہوئی ہے اس میں بے موقع دست اندازی فرمائیں۔ اس کے عوض یورپین مذاہمائے شاعری کے لیے یا کوئی صنف جدید اختراع فرمائیں۔ یا موجودہ اصناف شاعری سے کسی صنف کو جس میں وسعت دیکھیں نہایت شوق سے اختیار فرمائیں۔ ظاہر غزل



میں کوئی اصلاح کی جگہ نہیں نظر آتی ہے کوئی طباع روئے زمین پر نہ ہے۔ اور نہ ہوگا۔ جو حافظ کی غزل سرائی کی خوبیوں پر ایک جو کے برابر بھی کسی قسم کی افزائش کر سکتا ہے یا کر سکے گا۔ نامربوط امور کو غزل میں داخل کرنے کی مثال ایسی معلوم ہوتی ہے کہ کسی خاص پر سے کوئی امیر یہ فرمائش کرے کہ تو ایسی فیرنی پکالا کہ جس میں خاکینہ گریں مرغ مسکمر بے چینی اور اچار کی لذتیں موجود ہیں۔ واضح ہو کہ بعض مشیران اصلاح غزل نے جو اصلاح عملی طور پر کوشش کی ہے۔ وہ نہایت ناکامیاب رہے ہیں۔ ان کی غزل سرائی ازاں سو راندہ وازیں سودر ماندہ کی پوری تصویر نظر آتی ہے۔ دوسرا امر جو مشیران اصلاح غزل سرائی کے بارے میں فرماتے ہیں۔ وہ یہ کہ غزل میں مستوق کو غزل سرایاں اردو مذکر باندھتے ہیں۔ اور یہ امر خلاف نچر یعنی خلاف فطرت ہے۔ اس کی بحث راقم اہل عرب کی شاعری کے بیان میں کر چکا ہے۔ یہاں اس کے اعداد کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ تیسرا امر جو مشیران اصلاح فرماتے ہیں یہ ہے کہ غزل کو قطعہ بند ہونا چاہئے۔ ظاہر ہے کہ اس التزام کی صلاح کا سبب اہل یورپ کی تقلید کو راندہ کے سوا دوسرا امر نہیں۔ وائے بر مشیران اصلاح جو اہل یورپ کے متبع پر امرِ باحق میں جان دیتے ہیں۔ اہل انصاف تجویز فرمائیں کہ غزل سرائی میں اس التزام کی کیا ضرورت ہے۔ بلکہ جو غزل سرائی کا موجودہ طور ہے وہ بہت قابل لحاظ ہے۔ کس واسطے کہ سوائے فارسی اور اردو کے کوئی زبان روئے زمین پر نہیں ہے کہ جس میں نازک سے نازک اور دشوار سے دشوار مضامین صرف دو مضارع میں تمام ہو جاتے ہیں۔ کیا یہ امر فارسی اور اردو کے لیے موجب امتیاز نہیں ہے۔ واقعی کوئی زبان ان دونوں زبانوں کے سوا ایسی نہیں ہے کہ ادائے مطلب پر اس طور سے قادر ہو۔ خواجہ حافظ کے دیوان میں اموہ قلبیہ اور اخلاق جس چستی بندش کے ساتھ حوالہ قلم ہوئے ہیں یقیناً کسی اور زبان کی شاعری میں اس ترکیب خاص کے ساتھ نہیں پائے جاتے۔ پس جاننا چاہئے کہ غزل سرائی میں التزام قطعہ بندی کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ اس عدم احتیاج کی وجہ یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ خود تقاضائے غزل گوئی سے مضامین غزل ایسے ہوتے ہیں کہ ایک احاطہ خاص سے باہر نہیں جاتے یعنی غزل سرائی کے مضامین واردات و جذبات قلبیہ اور امور ذہنیہ کے احاطہ سے باہر قدم نہیں رکھتے پس یہ احاطہ یک گونہ خود حکم قطعہ بندی کا رکھتا ہے۔ ایسی صورت میں مشیران اصلاح کی صلاح بے کار معلوم ہوتی ہے۔ بلکہ جس طرح کے التزام کی صلاح یہ حضرات دیتے ہیں وہ لطف غزل سرائی کو قوت کر دیتے والا نظر آتا ہے۔ کس واسطے کہ حسن غزل یہی ہے کہ غزلیت کی خوبیوں کے ساتھ مختلف انداز کے داخلی مضامین شامل غزل رہیں۔ راقم کو اس سے انکار نہیں کہ قطعہ بند غزلیں بھی ہوتی ہیں مگر جو التزام کی صلاح دی جاتی ہے وہ مفید غزل سرائی نہیں ہے۔ اور درحقیقت اہل یورپ کی کورانہ تقلید پر مبنی ہے۔ چوتھا امر جو بسبیل مشورہ حضرات جدت پسند ارشاد فرماتے ہیں۔



اسے عرونی قواعد سے تعلق ہے۔ مشیران اصلاح فرماتے ہیں کہ غزل سرائی میں ردیف کی کیا حاجت ہے صرف قافیہ کا التزام کافی ہے۔ ارباب مذاق سے پوشیدہ نہیں ہے کہ ردیف غزل سرائی کے لطف کو بڑھا دیتی ہے۔ اس کا متروک ہونا غزل کے نصف لطف کو ضائع کر دے گا۔ ہر زبان کے عروض کا ایک خاص تقاضا ہے۔ چونکہ انگریزی میں ردیف کا مضمون کمتر ہے اس لیے مقلدان اہل یورپ کو راضی کرنے کے واسطے کوئی ضرورہ نہیں کہ اردو میں بھی انگریزی نظم کا طور اختیار کیا جائے۔ بعض مشیران اصلاح ردیف تو ردیف قافیہ کے بھی ندارد کر دینے پر برسر اصرار نظر آتے ہیں یعنی جس طرح انگریزی میں بے قافیہ اور ردیف کے اشعار جنہیں بلینک ورس کہتے ہیں لکھے جاتے ہیں۔ اردو میں بھی لکھے جائیں۔ ایسی صلاح وہی حضرت دینگے جو اقسام ذیل کے اشخاص ہوں گے۔

نمبر ۱۔ وہ جو غلوم یورپ سے بے خبر ہیں۔ مگر بہت سی یورپین چیزوں کو جو اچھی دیکھتے آئے ہیں تو اس سے یہ رائے قائم کر لی ہے کہ جتنی یورپین چیزیں ہیں سب کی سب اچھی ہیں۔ خاصا اور دعوے مالدار کے مضمون سے یہ بے چارے بالکل ناواقف ہے۔ یہ تنگ چشم حضرات یورپ کی ہر چیز کو کورا جس ہی کی دکان کی بنی ہوئی جانتے ہیں۔ جیسا کہ ایک نادان نے کسی جلسہ میں ایک کتاب کی جلد کی نسبت کہا تھا کہ اس کی جلد کی راجس دکان کی بندھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اس زمرہ کے وہ لوگ ہیں جنہوں نے ترجمہ وغیرہ کے ذریعہ سے کچھ انگریزی اشعار کے مضامین ضبط بے ضبط طور سے دریافت کر لیے ہیں۔ اور اس دریافت کی بنیاد پر رائے زنی کرتے ہیں۔

نمبر ۲۔ وہ جو نہیں جانتے کہ انگریزی و دیگر یورپین زبانوں میں بلینک ورس کے مروج ہونے کا سبب کیا ہوا۔ حقیقت حال یہ ہے کہ یورپین زبانوں میں الفاظ متعنا بہت کم ہیں بس ایسی زبان میں جب منظوم جیم کتابیں لکھی جاتیں گی تو کمی قوامی کی حالت میں بلینک ورس ہی لکھی جائیں گی۔ ہومرس کی ایلیڈ و جیل کی اینڈ اور پٹن پیرٹنڈ ایڈ لاسٹ اگر بلینک ورس میں نہیں لکھی جاتیں تو ایسی مسوط اور پرمختون تعانیف کے اتمام کی صورت یونانی لاطینی اور انگریزی زبانوں میں کیا ہوتی ہے۔ اردو فارسی تو ایسی زبانیں ہیں کہ جس میں قوافی کی کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی ہے۔ پس ان زبانوں میں بلینک ورس کی کیا حاجت متصور ہے۔

نمبر ۳۔ وہ جو شاعری کا دم بھرتے ہیں۔ مگر انہیں درحقیقت موزونی طبع حاصل نہیں ہے۔ یہ حضرات سمجھتے ہیں کہ جب قافیہ اور ردیف کی پابندی باقی نہیں رہے گی۔ تو حسب مراد طور پر غزل سرائی کر سکیں گے۔ یہ ان کا گمان ہے۔ بودے طبیعت کے لوگ بلینک ورس میں بھی طبع آزمائی نہیں کر سکتے۔ بخلاف اس کے شخص طباع پابندی قوافی کے ساتھ اردو اور فارسی میں غزل سرائی ہی نہیں کر سکتا۔ بلکہ ایلیڈ اینڈ

اور پڑیلا نزل اسٹ کیسی بسوط کتابیں بھی مربوط کر سکتا ہے۔

نمبر ۴۔ وہ جو اپنے کو مصلح قوم سمجھتے ہیں اور قوم کی ہائے دوائے سے صرف اتنی شہرت منظور رکھتے ہیں ایسے لوگوں سے قوم کو نہ کوئی نفع پہنچا ہے اور نہ پہنچے گا۔ البتہ ایسوں سے قوم کو ذلتیں نصیب ہوتی گئیں ہیں۔ ایسوں کی حقیقت یہ ہے کہ نفع ذاتی کے خیال سے قوم کی ہزاروں برائیاں بیان کیا کرتے ہیں۔ یہ لوگ جلسہ ہائے عام میں کہا کرتے ہیں کہ میری قوم ایسی اور میری قوم ویسی ایسی تقریروں سے سوائے قومی ذلت کے اور کوئی فائدہ مرتب نہیں ہوتا ہے۔ یہ تقریریں جب خود طوری کی پہلو سے دور ہیں تو غیر اقوام کی آنکھ میں ضرور قومی سبکی بھی پیدا کریں گی۔ ان مصلحان قوم نے بسبیل عادت ہر قومی شے کو برا سمجھ لیا ہے، قومی، مذہب، قومی معاشرت، قومی عادت وغیرہ کو تو برا ہی جانتے ہیں۔ قومی شاعری بھی ان کی بدگوئی سے نہیں بچ سکتی ہے۔

## سہرا

واضع ہو کہ غزل کی صورت پر سہرا بھی لکھا جاتا ہے۔ اس کی عروضی ترکیب تمام تر غزل کی ہوتی ہے۔ اس سے اور غزل سے فرق یہ ہے کہ اس کے مضمون غزل کے اعتبار سے محدود ہوتے ہیں۔ ہجر، فراق، درد، رنج، الم، حسرت، یاس، حرم، تمنا وغیرہ کے مضامین جو غزل کے لیے محض ہیں سہرے میں نہیں باندھے جاتے۔ خوشی اور خرمی اور ہلکے پھلکے شادی بیاہ کے مضامین اس میں حوالہ قلم کیے جاتے ہیں۔ سہرے کی تصنیف میں کبھی ایسے دشوار مضامین کو نہیں دخل دینا چاہئے کہ سامعین کے دماغ کو اس کے فہم میں ذرا بھی دقت لاحق ہو۔ غرض سہرے کی یہ ہے کہ شادی بیاہ کے مجمع میں اُسے ارباب قص گاتیں اور حاضرین محض لطف اٹھائیں۔ مشہور سہروں میں دو سہرے ہیں۔ ایک سہرا حضرت غالب کا فرمایا ہوا ہے اور دوسرا استاد ذوق کا۔ غالب کا سہرا ان کے مذاق غزل گوئی کا رنگ رکھتا ہے اور سہرے کے اعتبار سے اس کا رنگ سہرے کے تقاضے کے مطابق نہیں ہے۔ برخلاف اس کے ذوق کا سہرا تمام تر ایسا ہے کہ جیسا کہ سہرے کو ہونا چاہئے۔ حضرت غالب مضمون آوری کے کار بند ہوتے ہیں۔ سہرے میں غزل کی مضمون آوری کی کوئی حاجت نہیں۔ استاد ذوق نے معمولی مضامین کو شاعری کی خوبیوں کے ساتھ اس طور پر موزوں فرمایا ہے کہ ہر خاص و عام کو پسند آتا ہے۔ جاننا چاہئے کہ سہرا کوئی ایسی صنف شاعری نہیں ہے کہ جس میں داخلی مضامین دقیق اور نازک انداز کے باندھے جائیں اس میں اس قسم کے مضامین کو دخل دینا سہرے کے تقاضے کے خلاف ناہل ہوتا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ جب ذوق کا سہرا لکھا گیا ہو گا تو حضار محفل کو بہت لطف حاصل ہوا ہو گا۔ شاعری میں



اس امر کا لحاظ واجبات سے ہے کہ جس نہایت کی شاعری اختیار کی جائے اس میں کوئی! مرا اس کے تقاضے کے خلاف دخل نہ پائے ہر سخن کے لیے موقع دخل ہے۔ بے موقع اور بے محل کلام کبھی لذت بخش نہیں ہو سکتا۔

## غالب کا سہرا

خوش ہواے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا      باندھ شہزادے جواں بخت کے سر سہرا  
کیا ہی اس چاند سے کھڑے پہ بھلا لگتا ہے      ہے ترے حسن دل افروز کا زیور سہرا  
سر پہ چڑھنا مجھے پھبتا ہے پر اے طرف کلاہ      مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر سہرا  
نادبھر کر ہی پروتے گئے ہوں گے موتی      ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا  
سات دریا کے فراہم کیے ہوں گے موتی      تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا  
رخ پہ دولہا کے جو گرمی سے پسینہ چپکا      ہے رگ ابر گہر بار بار سر سہرا  
یہ بھی اک بے ادبی بھتی کے قبا سے بڑھ جائے      رک گیا آن کے امن کے برابر سہرا  
جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہیں ہیں اک چیز      چاہئے پھولوں کا بھی ایک مقدر سہرا  
جب کہ اپنے میں ساتیں نہ خوشی کے بارے      گوندھے پھولوں کا بھلا ہر کوئی کیوں کر سہرا  
رخ روشن کی دمک گوہر غلطان کی چمک      کیوں نہ دکھائے فردغ مہ اختر سہرا  
تاریشیم کا نہیں ہے یہ رگ ابر سہرا      لائے گا تاب گرا نیاری گوہر سہرا

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں

دیکھیں اس سہرے سے کہ دے کوئی بہتر سہرا

ارباب مذاق پر ہویا ہے کہ یہ سہرا کہے دیتا ہے کہ ہم نواب مرزا اسد اللہ خاں غالب کے نتائج افکار سے ہیں داخلی پہلو کی مضمون آوری کی کوئی کمی نہیں معلوم ہوتی ہے۔ ہر شعر حضرت کی غزل سرائی کا رنگ لیے ہوئے ہے۔ الفاظ کی بندش کا انداز بھی وہی ہے جو حضرت کی غزلوں میں اکثر قائم رہتا ہے حسن دل افروز طرف کلاہ، رگ ابر گہر بار، تاب گرا نیاری گوہر ایسے مرکبات ہیں کہ زبان حال سے کہہ رہے ہیں کہ اس سہرے کا مصنف کون ہے۔ لاریب سہرے کے واسطے یہ وقت شاعری خوش مذاقی سے بعید ہے۔ اب تو ابراہیم ذوق کے سہرے پر توجہ فرما کر ناظرین صحت مذاق کی داد دیں۔

## ذوق کا سہرا

اے جوان بخت مبارک تجھے سر پر سہرا  
آج وہ دن ہے کہ لائے دُرِ انجم سے فلک  
تابشِ حسن سے مانند شعاعِ خورشید  
وہ کہے صلِ علی۔ یہ کہے سبحان اللہ  
تاجِ ادبِ نبی میں رہے اخلاصِ بہم  
دھوم ہے گلشنِ آفاق میں اس سہرے کے  
روئے فرخ پر جو ہیں تیرے برستے انوار  
ایک کو ایک پہ تزیں ہے دمِ آرایش  
ایک گہر بھی نہیں صدکان گہر میں چھوڑا  
پھرتی خوشبو سے ہے اتراتی ہوتی بادِ بہار  
سروِ طرہ ہے مزین تو گلے میں بدھی  
رو نمائی میں تجھے دے مرو خورشیدِ فلک  
کثرتِ تارِ نظر سے ہے تماشائیوں کی

آج ہے یمن و سعادت کا ترے سر سہرا  
کشتیِ زر میں مہ نو کی لگا کر سہرا  
رُخ پر نور پہ ہے تیسرے نور سہرا  
دیکھے کھڑے پہ جو تیرے مہِ اختر سہرا  
گوندھتے سورۃِ اخلاص کو پڑھ کر سہرا  
گاتیں مرغانِ نوا بخ نہ کیوں کر سہرا  
تارِ باش سے بنا ایک سرا سر سہرا  
سروِ دستار ہے دستار کے اوپر سہرا  
تیرا بنوایا ہے لے لے کے جو گوہر سہرا  
اللہ اللہ دے پھولوں کا معطر سہرا  
کنگنا لہتہ میں زیبا ہے تو سر پر سہرا  
کھول دے منہ کو جو تو منہ سے اٹھا کر سہرا  
دمِ نظارہ ترے روئے نکو پر سہرا

جن کو دعوا ہو سخن کا یہ سُنادِ دان کو

دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

فی الواقع کیا خوب سہرا ذوق نے لکھا ہے۔ سہرے کے تقاضوں کے مطابق یہ سہرا ہے۔ تعقیبات و تعقیدات کے نقصانات کو نظر انداز کر کے اسے جو صاحب مذاقِ صمیم دیکھے گا آفریں صد آفریں کہے گا۔ جن اشعار پر راقم نے خطوط کھینچ دیئے ہیں وہ ایسے ہیں کہ زبانِ حال سے اس مصراع کو پڑھ رہے ہیں۔ مصرع۔

دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

واضح ہو کہ راقم اپنے خیالات کے اظہار میں تا حدِ انصاف و انصافِ درست بازی کو ہمیشہ ملحوظ رکھتا ہے۔ دروغِ سرائی کام بے ایمان کا ہے۔ ایمان کی کہیں گے ایمان ہے تو سب کچھ۔

راست میگویم دینِ دال نہ پسند و جزا راست  
حرفِ تارا راست سر دوں روشن اہرِ من است  
اس میں شک نہیں کہ فقیر اپنے خیال کے مطابق غالب کی اردو غزلِ سرائی کا بہت معتقد ہے مگر



فقیر کے اعتقاد کا طور ان کی جناب میں کورانہ ہے۔ امر حق جو راقم کو معلوم ہوا اسے بالائیں عرض کیا۔ اور آئندہ بھی اس روش کا پابند رہے گا۔ خیر انصاف یہی ہو کہ ذوق نے غالب سے کہیں بہتر سہرا لکھا ہے اور ایسا لکھا ہے جیسا کہ سہرے کو ہونا چاہئے۔ لیکن ذوق کے سہرا لکھنے کے بعد جو قطعہ معذرت لکھا ہے وہ ایسا لکھا کہ غالب کے عوض اگر ذوق کو اس کے لکھنے کی نوبت آتی تو اس کا میا بی کے ساتھ قادر نہ ہوتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ذوق داخلی مضامین کی بندش پر چڑی قدرت نہیں رکھتے تھے اور اگر رکھتے ہوتے تو غزل سرائی اسی رنگ میں کی ہوتی۔ جیسا کہ درد، میر، موتی، غالب وغیرہ کر گئے ہیں۔ غالب کا یہ قطعہ داخلی رنگ رکھتا ہے، کس واسطے کہ معذرت خواہی خود ایک داخلی امر ہے۔ اس کو وہی شاعر حسب مراد موزوں کرے گا جو داخلی شاعری کی صلاحیت رکھے گا۔ اس قطعہ سے ادب بھی قلبی اور ذہنی کیفیات عیاں ہیں جو اہل دانش سے پوشیدہ نہیں ہیں۔

### قطعہ

منظور ہے گزارش احوال واقعی	اپنا بیان حسن طبیعت نہیں مجھے
سو پشت سے ہے پیشہ ابا سپہ گری	کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے
آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلح کل	ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے
کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں	مانا کے جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے
استادش سے ہو مجھے پُر خاش خیال	یہ تاب یہ محال یہ طاقت نہیں مجھے
جام جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر	سو گند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے
میں کون اور ریختہ۔ ہاں اس سے مدعا	جز انبساط خاطر حضرت نہیں مجھے
سہرا لکھا گیارہ امتثال امر	دیکھ کہ چارہ غیر اطاعت نہیں مجھے
مقطع میں آچری ہے سخن گسترانہ بات	مقصود اس سے قطع محبت نہیں مجھے
روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ	سودا نہیں جنوں نہیں و حشت نہیں مجھے
قسمت بُری سہی پہ طبیعت بُری نہیں	ہے کہ شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول کا غالب خدا گواہ

کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

## سلام

عروضی ترکیب کی رو سے غزل سہرا اور سلام شے واحد ہیں۔ مگر ان کے مضامین کے تقاضے ایکٹ دوسرے سے علاحدہ انداز رکھتے ہیں۔ فارسی میں سہرا اس واسطے نہیں ہے کہ اس ملک میں دولہا یا دلہن کو سہرا نہیں باندھتے۔ مگر سلام ہے۔ سلام غزل کی طرح اعلیٰ درجہ کے مضامین از قسم واردات قلبیہ و معاملات ذہنیہ باندھتے ہیں۔ مگر ان میں غزلیت کا رنگ پیدا ہونے نہیں دیتے۔ سلام کی ترکیب کو رنگینی کے ساتھ بھی غزل سے علاحدہ ہونا چاہئے۔ سلام گوئی کا مطفہ یہی ہے کہ شوخی، رنگینی اور طبیعت داری کے ساتھ بھی غزل سہرائی سے جدا نظر آتے ہیں۔ عموماً سلام میں واقعہ کربلا و شہادت امیر المومنین و شہادت امام حسن و مصائب حضرت خاتون جنت و حلت حضرت رسالت مآب صلوٰۃ اللہ و سلامۃ علیہم الی یوم القیام کے مضامین داخل ہوتے ہیں۔ اور بھی دیگر امور الم انگیز و حسرت خیز جو خاندان پیغمبر خدا صلعم سے متعلق ہیں۔ اندراج پاتے ہیں۔ علاوہ انکے اخلاقی و تمدنی و مذہبی و دیگر امور جلیلہ جن سے شاعری کی زینت مقصود ہے منظوم کیے جاتے ہیں۔ ایسے مضامین کبھی کبھی غزلوں میں بھی باندھے جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ سلام کے بعد اشعار ایسے دیکھے جاتے ہیں کہ اگر غزلوں میں داخل کر دیئے جاتیں تو بے موقع یا بے محل معلوم ہوں گے۔ میرانیس اور میر موسیٰ کے بہت ایسے اشعار سلام ہیں کہ اگر غزلوں میں داخل کر دیئے جاتیں تو غزلوں کا وقار ترقی کر جاسکتا ہے۔ ذیل میں کچھ سلام میر ضمیرؔ مرزا دلگیرؔ میر سرائیسؔ اور میر موسیٰ کے بطور انتخاب درج کیے جاتے ہیں۔

### سلام میر ضمیر رحمہ اللہ تعالیٰ

مجرئی شہ نے کہا میں جو بے سر ہوتا	حشر کو تاج شفاعت نہ میسر ہوتا
شاہ کہتے تھے اگر تیرے لگتے دل پر	دیکھتے تھے تم کہ جو ان کیا علی اکبر ہوتا
شاہ نے حرم کہا آج جو کچھ تو نے کیا	ایسا کرتا جو حسن میرا برادر ہوتا
شاہ کہتے تھے یہ ہے ذوق شہادت شمر	ہم تجھے دیتے جو تجھ پاس نہ خنجر ہوتا
ہوتی خاتون قیامت تو قیامت ہوتی	حشر ہو جاتا اگر شافع محشر ہوتا
سوچ کر تشنگی شاہ کو بولے عباس	نہر کیا پانی نہ ہم پیتے جو کوثر ہوتا

شاہ فرماتے تھے کچھ چیز نہیں آب فرات  
ہم لٹا دیتے اگر چشمہ کوثر ہوتا



## سلام میاں دلگیر مرحوم و مغفور

ای سلامی وطن شاہ تو کچھ دور نہ تھا  
ہائے اس ملک میں پائی تھی سکینہ نے وفات  
سر کھلے قید میں لے جائیں کسی کے ناموس  
پا سپاہ کہیں بیمار بھی چلتا ہے بھلا  
علی اکبر سا لما خاک میں جو نور نظر  
کس طرح گنج شہیدان نہ بناتے سجاد  
تھی سکینہ سے خجالت نہ پھرے جو عباس  
بانو کہتی تھی کہ کیا جلد سدا ہا اصفہر  
بسکہ تھے ناز سوزاں حرم شعلہ فشاں  
اور خاصان خدا پر بھی مصیبت گزری  
کچھ قیامت میں نہ باقی تھا دم قتل حسین

لیک مشیر کو پھر جانا ہی منظور نہ تھا  
جہاں عابد کو کفن دینے کا مقدور نہ تھا  
پیش ازیں ملک عرب میں کبھی دستور نہ تھا  
قابل نادر کشی عابد رنجور نہ تھا  
جب تک شاہ جئے آنکھوں نہیں پھر نور نہ تھا  
کون سالار تھے تھانہوں سے جو وہ چور نہ تھا  
ورنہ میدان سے خیمہ تو بہت دور نہ تھا  
چھ مہینے کا بھی وہ لال تو بھر پور نہ تھا  
خیمہ آل محمد بھی کم از طور نہ تھا  
پرسوا شہ کے کوئی درد میں سرور نہ تھا  
حکم خالق کا مگر بہر دم صور نہ تھا

اُن کے ہر گام تلے چشمہ نکلتا دلگیر

پانی پینا ہی مگر شاہ کو منظور نہ تھا

اہل نظر سے پوشیدہ نہیں ہے کہ دونوں سلام بالاکا بندش گو ویسی چست نہیں ہے جیسے ہر دو سلام  
ذیل کی ہے مگر مرثیت کا انداز حسب مراد ہے۔

## سلام میر انیس اعلی اللہ مقامہ فی الجنۃ

گزر گئے تھے کئی دن کہ گھر میں آب نہ تھا  
نمود و بود بشر کیا محیط عالم میں  
فشار سے جو بچا میں ہوا زمین کو عجب  
اگر بہشت میں ہوتے نہ کوثر و تسنیم  
نہ جلنے برق کی چشمک تھی یا شرر کی لپک  
حسینؑ اور طلب آب اے معاذ اللہ

مگر حسینؑ سے صابر کو اضطراب نہ تھا  
ہوا کا جب کوئی جھوکا چلا حباب نہ تھا  
صدایہ قبر نے دی حکم بو تراب نہ تھا  
تورونے والوں کی آنکھوں کا پھر جواب نہ تھا  
فنا جو آنکھ جھپک کر کھلی شباب نہ تھا  
تمام کرتے تھے حجت سوال آب نہ تھا

جسے نبیؐ نے بلایا ہو وہ نخل نہال  
 ٹھرا سے بھی دے جو کہ باریاب نہ تھا  
 غلّی کے پائے مبارک نے جو ضیا پائی  
 وہ نور حضرت موسیٰؑ کو دستیاب نہ تھا  
 فقط حسینؑ کے بچوں پہ بند تھا پانی  
 بہت قریب تھی وہ نہر قحط آب نہ تھا  
 حضور شاہ پھر آیا کب سے حر شہید  
 خطا کی راہ میں گر جادہ صواب نہ تھا  
 انیس عمر بسر کر دو خاکساری میں

ہمیں نہ یہ کہ غلام ابو تراب نہ تھا

خوبی زبان چستی بندش بلند پروازی مضامین رنگینی طبیعت محتاج بیان نہیں ظاہر ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ  
 میرا نیت صاحب مرحوم جس عمدگی کے ساتھ مرثیہ نگاری فرماتے تھے اسی طرح سلام کے لکھنے پر ایک  
 حیرت انگیز قدرت رکھتے تھے۔

### سلام میر مونس نور اللہ مرقدہ

مجرئی چلتا تھا شہ کا جسم بے سر دھوپ میں  
 شامیاء تھا نہ لاشے پر نہ چادر دھوپ میں  
 جب کینچا غزل گل رخسار سرور دھوپ میں  
 مجرئی کیا کیا بسی زلف معنبر دھوپ میں  
 اس قدر حدت تھی روز قتل سرور دھوپ میں  
 اے سلامی لال سے میداں کے پتھر دھوپ میں  
 آگ سے بھی تھی سوا اس دن حرارت مہر کی  
 باہر آتا گر تو جل جاتا سمندر دھوپ میں  
 اڑتے تھے ذرے شرر کی طرح میگ گم کے  
 سنگریزے جل رہے تھے مثل انگر دھوپ میں  
 داں تو ابن سعد کے سر پر لگا تھا چتر زر  
 یاں کھرا تھا مہر تاباں بمیر دھوپ میں  
 رہا میں ڈھالوں کے تھلاحت سے غمزد سیاہ  
 چھاؤں تلواروں کی تھی سرور کے سر پر دھوپ میں  
 وہ ری جرات کہ تنہا لڑا تھا فوج سے  
 تین دن کا بھوکا پیاسا میر کو شر دھوپ میں  
 بقراری جس طرح آتش پہ ہو سیماں کو  
 گر کے تڑپے اس طرح ریتی پہ اکبر دھوپ میں  
 تھیں روایتیں جی نہ لاشوں پر عجب نیرنگ تھا  
 سوکھتے تھے باغ زہرا کے گل تر دھوپ میں  
 شنہ انداسے کہا لازم ہے اس پر ہم کو رحم  
 بوند پانی کے لیے نکلا ہے مغر دھوپ میں  
 کہتے تھے شر اسکو دامن میں چھپالے اے زمین  
 جلتی ریتی پر پڑی ہے لاش اکبر دھوپ میں  
 رکھ دیا شمعیں نے ایک سنگ گرم پر  
 کاٹ کرتن سے سرسبط بمیر دھوپ میں  
 بے کفن چہلم تک افادہ رہا وہ آفتاب  
 رہنے دیتی تھی نہ زہرا جس کو دم بھر دھوپ میں



کیا مصیبت تھی اسیران ستم پہ ہے ستم اوس میں بہتے تھے ساری رات دن بھر سوپ میں

سایہ طوبے میں پہنچائیں گے منس حسین کو

حشر کے دن دیکھ کر نالاں و مضطرب سوپ میں

خوش خیالی خوبی زبان چستی بندش کے ساتھ جس قدر میر مونس مرحوم رنگین طبع تھے اظہر من الشمس ہے طبیعت کی رنگینی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے بعضوں کا یہ خیال ہے کہ سلام گوئی میر مونس مرحوم پر ختم تھی مگر میر مونس غفران مآب عالم وجود میں نہ آئے ہوتے تو یقیناً اس قول کی صحت میں کسی پہلو سے جائے گفتگو ممکن نہ تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اہل فارس کو سلام گوئی کا مذاق کم ہے کوئی دلخواہ سلام فدرسی کا راقم الحروف کو دستیاب نہ ہوا۔ اس لیے داخل جلد ہذا نہ کر سکا۔

## قصیدہ

قصیدہ وہ صنف شاعری ہے کہ عروضی ترکیب میں غزل سے تمام تر مشابہت رکھتا ہے۔ البتہ کہ اس میں غزل سے بہت زیادہ اشعار ہوتے ہیں جس طرح غزل پانچ شعر سے کم کی نہیں ہوتی اسی طرح قصیدہ اکیس شعر سے کم کا نہیں ہوتا۔ لیکن مضامین کے اعتبار سے قصیدہ اور غزل میں بڑا فرق ہے۔ یہ صنف شاعری داخلی اور خارجی دونوں پہلوؤں کے مضامین سے تعلق رکھتی ہے اس صنف میں شاعر اعلا درجہ کے مضامین جو امور ذہنیہ اور معاملات خارجیہ سے مشغول رہتے ہیں۔ موزوں کرتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ قصیدہ کا احاطہ مضامین غزل کے اعتبار سے وسیع تر ہے۔ قصیدہ کے لیے علوم مضامین کی بڑی ضرورت ہے۔ اگر کوئی قصیدہ اس صنف سے متصف نہیں ہے تو اس پر قصیدہ کا اطلاق نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس صنف شاعری کے لیے ضرور ہے کہ اس میں امور ذہنیہ از قسم مسائل اخلاق و تدبیر المنزل و سیاست مدن و مذہب و شریعت و طریقت و عرفان و توحید و عدل و نبوت و امامت و معاد و قوانین الہی و انسانی وغیرہ اور معاملات خارجیہ از قسم مضامین و مشاہدات اشیائے سماویہ و ارضیہ و مابینہما احاطہ نظم میں درآئیں۔ المختصر قصیدہ گوئی شاعر حکمت آب کا کام ہے۔ اور اس کے لیے وفور معلومات غیر کی حاجت ہے۔ لیکن ہزار افسوس ہے کہ اس صنف شاعری سے بہت سے شعرائے اہل علم بھی وہ کام نہیں لیتے گئے ہیں جو اس کا تقاضا ہے۔ راقم نے قصیدہ کی بحث تہی کے قصیدہ گوئی کے نگاہوں میں کی ہے جس سے قصیدہ کے استعمال بد کی کیفیتیں ظاہر ہو چکی ہیں۔ اسی پر فارسی اور اردو کی قصیدہ گوئی کو بھی خیال کرنا چاہئے کہ شعرائے دہلی کی بدولت یہ صنف شاعری کس درجہ ابتذال کو پہنچ گئی ہے۔ جاننا چاہئے کہ قصیدہ کی اصل غرض یہ ہے کہ شاعری کے

پیرایہ میں مسائل اخلاق و معاشرت و تمدن و معاش و معاد وغیرہ کی تعلیم دینی و دنیوی بنی آدم کو نصیب ہو۔ یا حمد خدا و نعت محمد مصطفیٰ و منقبت علی مرتضیٰ وائمہ باصفاء شاعر کو ثواب عقبی حاصل ہو۔ اور سامعین کو ذکر خدا اور رسول وائمہ سے توفیق عبادت پیدا ہو۔ لیکن شعرائے ناعاقبت اندیش اس صنف شاعری کو اس بد ترکیبی سے استعمال کرتے گئے ہیں اور آج بھی کر رہے ہیں کہ عربی اور فارسی اور اردو کی قصیدہ گوئی ننگ شاعری ہو کر شائستہ ملکوں میں ان نابالوں کی تفضیح کی صورت ہو گئی ہے۔ ذیل میں کچھ فارسی اور اردو کے شعرائے قصیدہ گو کے کلام درج کیے جاتے ہیں اور ان کی نسبت جو راقم کے خیالات ہیں وہ بھی خدمت ناظرین میں گزارش ہوتے ہیں۔

## فارسی کی قصیدہ گوئی

ظاہر ہے کہ فارس کے تمام شعرائے قصیدہ گو کا ذکر اس کتاب میں کیا نہیں جاسکتا۔ کس واسطے کہ اس کی تصنیف بسبیل تذکرہ واقع نہیں ہوتی ہے۔ اس لیے صرف چند مشاہیر حضرات قصیدہ گو اس کتاب میں یاد کیے جاتے ہیں۔ ان کے نمونہ ہائے کلام سے قصیدہ گوئی کی حقیقت کم و بیش طور پر منکشف ہو جائیگی۔

## رودکی

معلوم ہے کہ یہ شخص فارسی کا پہلا شاعر ہے۔ قصیدہ کا موجد تو کہا نہیں جاسکتا۔ اس واسطے کہ اس کے ظہور کے بہت سی صدیاں پہلے یہ صنف شاعری اہل عرب میں جاری تھی۔ بہر حال رودکی کی قدیم ترین شعرائے فارس سے ہے اور اس کا کلام فطری خوبیوں سے معمور ہے۔ اس کے ایک قصیدہ کے کچھ اشعار ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔ ان سے ظاہر ہو گا کہ یہ شاعر فطرت کی تبعیت کرنے والا تھا۔ بے سرو پا طوے کے مضامین کا باندھنے والا نہ تھا۔ یعنی اس کی ترکیب ظہیر فارسیابی وغیرہ کی نہ تھی۔ ہر چند قصیدہ ذیل بھی ایک درباری قصیدہ ہے۔ مگر ظہیر کے ان پست شہناپ درباری قصیدوں سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا۔ رودکی کا کلام زیور سادگی سے آراستہ نظر آتا ہے اور فطری رنگ رکھنے کے باعث دلچسپی سے خالی نہیں معلوم ہوتا۔ اس قصیدہ کا کوئی شعر ایسا دکھائی نہیں دیتا کہ سعدی علیہ الرحمہ کو یہ کہنے کی ضرورت پڑتی۔

چہ حاجت کہ نہ کرسی آسمان      نہی زیر پائے قزل ارسلان

واقعی سعدی کیا ہی عمدہ مذاق کے شاعر تھے۔ آخر ظہیر کے اس شعر نے

نہ کرسی فلک نہ ہد اندیشہ زیر پا      تابوسہ بر رکاب قزل ارسلان دہ



شیخ سے شعر بالا کہلا ہی چھوڑا۔ کیوں نہ ہو ہر راست باز راست پسند راست طبیعت راست خلقت آدمی کو دروغ سرائی سے وحشت ہوتی ہے۔ لاریب ایسی ہی مبالغہ پرداز یوں نے فارسی کی شاعری کو عالم میں بدنام کر رکھا ہے۔ اگ فارسی شاعری سے مبالغہ پرداز کی بد مذاقی دور ہو جائے تو فارسی شاعری پر وقار ہو جائے غضب خدا کا ہے کہ فارسی کے شعرا اپنے سلاطین و امرا کی تعریف ایسے ہیجے کرتے ہیں کہ اگر ان کے اشعار حمد خدا و نعت محمد مصطفیٰ اور منقبت علی مرتضیٰ میں پڑھے جائیں تو نہایت ہی حسب حال معلوم ہوں۔ بیشتر شعرائے فارس کے قصائد مدحیہ کا یہی رنگ دیکھا جاتا ہے۔ باستثنائے شعرائے قلیل متقدمین و متاخرین سب کے سب مرفح مبالغہ پرداز کی علیل نظر آتے ہیں اور افسوس ہے کہ مروریام سے یہ بیماری ترقی ہی کرتی گئی۔ چنانچہ فخر المتاخرین حکیم قانی کو آزار مبالغہ میں متقدمین سے بھی زیادہ مبتلا پاتے ہیں مثلاً ایک شعر ان کے ایک قصیدہ مدحیہ کا عرض کیا جاتا ہے۔ شعر:-

شہنشاہ ہے کہ ہست اور ابطلوع و طبع جان دل قصائد بایع قدر طالع ملک خادم فلک چاکر  
کاش قانی نے اس کو مرزا ناصر الدین شاہ کی مدح کے عوض نعت محمد مصطفیٰ و منقبت علی مرتضیٰ میں کہا ہوتا۔ اسی طرح اس شاعر نادر کے سیکڑوں اشعار ہیں جو حمد و نعت و منقبت کے لیے موزوں معلوم ہوتے ہیں۔ نہایت جائے حسرت ہے کہ مبالغہ پرداز کی بیماری سے فارسی کی نظم و نثر دونوں بد حال ہو رہی ہے۔ مگر ابھی تک اس کے ازالہ کی طرف توجہ نہیں کی گئی ہے۔ کاش اب بھی کوئی علاج کی صورت نکلتے کہ فارسی کے شاعری پنجہ اجل سے نجات پائے۔ واضح ہو کہ شاعری کو دروغ سرائی سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ دروغ سرائی شاعری کی پُر تاثیر کھودیتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ اکثر فارسی کے قصائد تمام تر بے اثر نظر آتے ہیں انہیں پڑھ کر طبیعت کو کسی قسم کی فرحت نصیب نہیں ہوتی۔ بالیقین ایسے قصائد تعلیم یافتہ دماغوں میں جگہ نہیں کر سکتے ان سے ملنڈ ہونے کے لیے ضرور ہے کہ پہلے انسان ان کے مصنفوں کا مذاق پیدا کرے۔ بلاشبہ ایسا شخص جو شاعری کو سرمایہ زندگی و قوت روح جانتا ہے۔ ایسی شاعری سے جو درحقیقت سوہان جان ہو کسی طرح کی دلی و دماغی خوشی حاصل نہیں کر سکتا ہے۔ بہر حال روڈ کی کا وہ قصیدہ جس کے کچھ اشعار درج ذیل ہوتے ہیں۔ ان مصائب سے پاک ہے۔ جن سے فارسی کی شاعری انگشت نما ہو رہی ہے۔ اس میں نہ میوب طور کی مبالغہ پرداز سے اور نہ نامطبوع انداز کی نازک خیالی، ظہیر، عرفی، قانی وغیرہم کے طریقہ قصیدہ گوئی سے تمام تر علاحدہ ہے۔ معاً، چیسٹان اور ہر طرح کے صنائع و بدائع کے معائب سے تمام تر پاک ہے۔ نچرل شاعری کا نمونہ ہے اور جس غرض سے لکھا گیا تھا اس کا پورا کرنے والا نظر آتا ہے۔ اسی لیے حسن تاثیر سے آماستہ دکھائی دیتا ہے۔

## اشعار از قضاۃ رودکی

باد جوئے مولیاں آید ہی      یاد یار مہسرباں آید ہی  
ریگ آمو باد در شہتہاے او      زیر پائیم پر نیاں آید ہی  
آب حیوں از نشاط روئے ما      خنگ مارا تا میاں آید ہی  
اے بخارا شاد باش ددیرزی      میر ثروت شاد ماں آید ہی  
میر سرواست و بخارا بوستان      سرو سوئے بوستان آید ہی  
میر ماہ است و بخارا آسمان      ماہ سوئے آسمان آید ہی

صاحب تاریخ برگزیدہ لکھتے ہیں کہ رودکی کو اس قصیدہ کے لکھنے کی حاجت ہوئی کہ امیر نصر ۱۹۳۵ء میں بخارا چھوڑ کر مروجہ دولت ہرات میں قیام پذیر ہوا تھا۔ اس شہر سے اسے ایسی دل بستگی پیدا ہوئی کہ وہ بخارا کو بھول بیٹھا۔ امرا و وزراں بہت اس کے کوشاں تھے کہ وہ وطن مراجعت کرتا۔ مگر وہ کسی کی سنا نہیں تھا۔ تب رودکی نے یہ قصیدہ کہا اور یہ قصیدہ بحضور امیر گایا گیا۔ اس قصیدہ کا یہ اثر ہوا کہ امیر فوراً جلسے اٹھا اور بلا سامان سفر امرا و وزرا کو لے کر بخارا کو روانہ ہو گیا۔ صاحب ذخیرہ دولت شاہی لکھتے ہیں کہ غلام کو اس قصیدہ کی مقبولیت پر تعجب ہوتا ہے کس واسطے کہ یہ نہایت سادہ اور سلیس زبان میں لکھا گیا ہے اور زیورات شاعری سے تمام تر معرا ہے۔ امیر نصر کے بعد کے سلاطین کے حضور میں ایسا کوئی قصیدہ پڑھا جاتا تو ضروران کی ناپسندیدگی کا باعث ہوتا۔ واقع ہو کہ دولت شاہ کی یہ تحریر مذاق شعرائے فارس کے تمام تر موافق ہے۔ مگر راقم کو اس قصیدہ کی مقبولیت میں کوئی تعجب نہیں گزرتا ہے۔ اس لیے یہ قصیدہ نہایت فطری رنگ رکھتا ہے۔ فطری انداز میں اگر پر تاثری موجود نہ ہو تو پھر کہاں ہو سکتی ہے۔ حضرت غالب نے بھی ایک قصیدہ اسی زمین میں تحریر فرمایا ہے۔ اس کے عمدہ ہونے میں کوئی گفستگو نہیں۔ مگر اس کا انداز اس قدر فطری نہیں ہے۔ اس لیے اس کو اس قدر حسن قبول حاصل نہ ہوا۔ علاوہ اس کے جائے غور ہے کہ رودکی نے اپنا قصیدہ ایسے وقت میں لکھا تھا کہ تمام امرا و وزرا و رفقاء امیر پر جب وطن کا جوش غالب ہو رہا تھا۔ رودکی بھی دوری وطن سے پریشان تھا۔ ایسی حالت میں جو کچھ رودکی نے کہا۔ دل سے کہا۔ انچہ از دل خیزد بردل ریزد، یہ موقع حضرت غالب کو کب نصیب ہوا۔ بس حسب مراد مقبولیت کی صورت حضرت غالب کے قصیدہ کو کیوں کر ہو سکتی تھی۔



## فردوسی طوسی

فردوسی ابوالقاسم نام نامی ہے اور فردوسی تخلص۔ چوں کہ وطن ملک طوس تھا۔ اس لیے طوس کی نسبت کے ساتھ یاد کیے جاتے ہیں اور درجہ حکمت حاصل رہنے کے باعث لقب حکیم ہیں۔ اس خدائے سخن کی شہرت قصیدہ گوئی کی بنیاد پر نہیں ہے جس بنیاد پر ہے اس کی بحث کی آئندہ آئے گی یہاں ذیل میں ایک قصیدہ جو اس ہمایون نہاد کی فکر پاک کا نتیجہ ہے۔ نذر ناظرین کیا جاتا ہے۔ یہ قصیدہ منقبت سیدنا امیر المومنین میں ہے اور دوست داران امام کے خلاف مذاق نہیں ہے۔

### قصیدہ فردوسی

اگر بری نجم زلف تابدار انگشت	نر زلف خوش برآری بزمینہاں انگشت
مگر شمارۂ زلف تومی کند شانہ	کہ کردہ درخ زلف تو بے شمار انگشت
گرہ گرہ شدہ رگہائے جاں خستہ دلاں	چو کردہ زلف سیادہ تو تار تار انگشت
بحر قتل من انگشت کش نہادی دوش	مسم فداے تو زین حریف برادر انگشت
مزارے شہد شہادت شہید عشق برد	چو بار تیغ برآرد دلا برآر انگشت
پے نظارۂ مشکین ہلال او با ماہ	کشمہ نوا زین نیلگوں حصا انگشت
بمستی آرزوئے پائے بوس او کردم	نہادہ بر لب خون نوش خود نگار انگشت
دلا چو پیر شدی بگز از ہوا و ہوس	زہر آرزوئے نفس خود برآر انگشت
بگو کہ بود کہ شد فتح باب خیر از و	کہ کرد برد آں قلعہ استوار انگشت
کہ پارہ کرد کمند نفاق و رشتہ کفر	بگاہوا کہ زد و در دہان مار انگشت
علی عالی اعلا کہ دست ہمت او	ہزار نے زدہ چرچشم ذوالنہار انگشت
شہد کہ تازد و انگشت در زخیر کند	برآمد از لیے اسلام صد ہزار انگشت
زدست تیغ تو جان برد و ز جہان ایمان	ہر آنکہ کرد بدین تو استوار انگشت
کیک جب تو اش نیست تا بروز شمار	بہرزہ گوئی تبیح می شمار انگشت
کیک دست بدامان حمید و آتش	نزد بہا کہ بدنہاں کند فگار انگشت
شہا تراست مسلم کرم کہ گاہ رکوع	کند برائے تو انگشتی نثار انگشت

کینہ چاکر مداح تست فردوسی      ہمیشہ باطلش گشتہ دستیار انگشت  
 بگیر دست خدا یا بحق حیدر و آل      دران نفس کہ رود خلق راز کار انگشت  
 موالیان علی راز روئے لطف و کرم      زہول روز جزا برقرار دار انگشت  
 شہا غلام غلام توام مرا بہ گذار  
 برائے فاقہ برآرم بہ زینہار انگشت

## سنائی

سنائی - مجدد الدین نام نامی ہے۔ سنائی تخلص۔ اور حکیم لقب ہے۔ وطن اطراف غزنین میں تھا۔  
 ظہور اس حکیم نامی کا آل سلجوقی کے عہد میں ہوا تھا۔ اس خاندان کے جن جن بادشاہوں کو اس یکتائے  
 روزگار کو دیکھنے کا اتفاق ہوا حلقہ بگوش عقیدت رہے۔ واقعی حکیم سنائی عجب بزرگ گزشتے ہیں۔  
 اہل سنت ان کو اولیا و اتقیا سے جانتے ہیں۔ حکما ان کو حکیم مانتے ہیں۔ شعرا ان کو استاد باکمال کہتے ہیں۔  
 شیعہ ان کو عظمت کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔ ذیل میں ایک قصیدہ حکیم ممدوح کا بطرز نمونہ نذر ناظرین ہوتا ہے۔

## قصیدہ سنائی نمبر ۱

کن در حیم و جان منزل کہ ایں دون است و اں والا      قدم از ہر دو بیروں نہ نہ اینجا باش و نہ آنجا  
 بہر چہ از راہ باز افقی چہ کفر آں حروف و چہ ایماں      بہر چہ از دوست دمانی چہ زشت آں نقش و چہ زیبا  
 گروہ بہر و اں بینی کہ مرڈوش بینی از دوزخ      نشان عاشق آں باشد کہ خشکش بینی از دریا  
 سخن کر راہ دیں گوئی چہ عبرانی چہ سریانی      مکان کن بہر حق جوئی چہ جالبقا چہ جالبیسا  
 گو مغرور غافل را برائے امن او نکستہ      مدہ محسور و جاہل راز بہر طبع او حسرنا  
 نہ حرف از بہر آں آمد کہ سوزی زہرہ زہرا      نہ حرف از بہر آں باشد کہ دزدی چاد زہرا  
 تو علم آموختی از حسر آں گد ترس کا ندر شب      جو ذرد با چسراغ آید گزیدہ تر برد کالا  
 چو علمت ہست خدمت کن چو بے علمان کہ زشت آید      گرفتہ چہ سیماں احرام و مکی خفستہ در بطحا  
 چو تن جانرا مزین کن بہ علم دیں کہ زشت آید      ازین سوشاہ عریاں و از اں سو کو شرک از دریا  
 ترا یزدان ہی گوید کہ در دنیا مخور بادہ      ترا ترسا ہی گوید کہ در صغرا مخور حلوا  
 ز بہر دیں نہ بگذازی حسراں از حرمت یزدان      ولیک از بہر تن مانی حلال از گفتہ ترسا



مرا بارے بحمد اللہ ذراہ حکمت و ہمت  
 نخواستہم لاجرم نعمت نہ در دنیا نہ در جنت  
 کہ یارب مرستانی را سنائے دہ تو در حکمت  
 مگر دواں عمر من چو گئل کہ در طفلی شوم کشتہ  
 بحر ص از شربتے خوردم مگیر از من کہ بد کردم  
 بہر چہ از اولیا گفتند از زقنی و دقنی  
 بہ سوتے خط وحدت بر د عقل از خطہ اشیاہ  
 ہی گوید بہ ہر ساعت چہ در سنا چہ در ضرا  
 چناں کز وے بر شک آید روان بو علی سینا  
 مگردان حرص من چوں مل کہ در پیری شوم برنا  
 بیا باں بود و تابستان و آب سہ دو استعفا  
 بہر چہ از انبیا گفتہ امانا و صدقنا

سبحان اللہ واقعی سوا حکیم کے کون شاعر ایسے اشعار موزوں کر سکتا ہے۔ ہر شعر دفتر حکمت ہے تعلیم دین و دنیا کا خاتمہ ہے کیسے کیسے مسائل منقح پیرایہ شاعری میں بیان ہوتے ہیں یہ اشعار عالموں کو راہ ہدایت بتانے والے ہیں۔ ان سے فلسفی کو فوائد عظیم فتح ہوتے ہیں۔ ان سے طالب حق دریافت حق کر سکتا ہے۔ کیا کہنا ہے آفریں صد آفریں، الاریب جس زبان میں ایسے اشعار موجود ہوں وہ زبان اپنے وقار پر ناز کر سکتی ہے۔ کاش فارسی کے سب قصائد اس انداز کے ہوتے۔ حیف صد حیف کہ درباری قصیدہ گوئیوں نے اس زبان کو بے آبرو کر ڈالا۔ اس زبان کے وقار پر بد مذاقی شعرا کا ابراہیسا بھار ہا ہے کہ یہ زبان بتلائے تیرگی ہو رہی ہے۔ واضح ہو کہ برائے خود قصیدہ ایک نہایت اعلا اور افضل اصناف شاعری ہے مگر اس کے استمان ملنے اسے مقدوح بنا رکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ صنف شاعری بڑے بڑے اہم مفہامین کی بندش کے واسطے وضع کی گئی تھی جیسا کہ اس قصیدہ کے انداز سے ہویدا ہے۔ راقم ایک اور بھی قصیدہ اس حکیم عالی مقام کا دوج بذا کرتا ہے۔

## قصیدہ سنائی نمبر ۲

برگ بے برگي نداد لاش در ویشی مزین  
 ہر چہ یابی جز ہوا آن دین بود در جاں بکار  
 سر برار از گلشن تحقیق تا در کوئے دیں  
 در یکے صف کشندگان بینی بتیغ چوں حسین  
 در دین خود بواجب دئے ست کا ندروئے چو شمع  
 ہر کسے از رنگ و گفتارے باں رہ کے رسد  
 قرن باید کہ تا یک کو دے از لطف طبع  
 مرغ چو عیاراں میاراں جاں چو نامرداں بکن  
 ہر چہ بینی جز خدا آن بت بود در ہم شکن  
 کشندگان زندہ بینی انجمن در انجمن  
 درد گر صفت خستگان بینی بزم ہرے چو حسن  
 چوں سوئی بیمار بہتر گردی از گردن زدن  
 درد باید صبر سوز مرد باید گام زن  
 عاقلے کامل شود یا فاضلے صاحب سخن

ساہا باید کہ تا یک سنگ اہلی ز آفتاب  
لعل گردد در بخشاں یا عقیق اندر یکن  
ماہی باید کہ تا یک مشت پشم از پشت میث  
صوفی را خرقہ گردد یا حمارے را رسن  
روز ہا باید کشیدن انتظار بے شمار  
تا کہ در جوف حدف باراں شود در عسدن  
ہفتہ ہا باید کہ تا یک پنہ دانہ ز آب گل  
شاہدی را حلہ گردد یا شہیدے را کفن  
صدق اخلاص درستی باید و مسروراز  
تا قریں حق شود صاحب قرآنے در قرن  
باد و قبلہ در رہ توحید نتوان رفت است

یا رضائے دوست باید یا ہوائے خویشتن

کس منہ سے اشعار بالا کی تعریف کی جائے۔ سبحان اللہ وصل علی ہر شعر املا درجہ کی تطہیم روحانی کا آلہ ہے کس قدر فطرت کے قرین ہے۔ حق گوئی اور حق جوئی کا خاتمہ ہے۔ کلام ایسا تو ہو کہ ضرب المثل کا حکم رکھتا ہو۔ فارسی کو جس قدر بد مذاق قصیدہ گوئیوں کی سخن سنجی ہے سرمایہ شرم ساری مترتب ہوا ہے۔ اسی قدر ایسے اشعار کے بدولت گنجینہ ناز بھی ہاتھ آیا ہے۔ واقعی سنائی ایسے حکیم دین و دنیا گزرے ہیں کہ ہر مذہب و ملت کا آدمی ان کے شرف حکمت مآبی کا قائل اگر نہ ہو تو آدمی نہیں ہے۔ اس پر سے حضرت والائے اہل بیت میں ایسے غرق معلوم ہوتے ہیں کہ خاندان نبوت کی یاد سے کبھی غافل نہیں ہوتے۔ واقعی جب تک انسان کسی شے کو محبوب نہیں رکھے گا اس کو گاہ و بیگاہ یاد نہیں کرے گا۔ فرقہ شیعی مذہب کا حکیم سنائی کو نظر عظمت سے دیکھنا بے وجہ نہیں معلوم ہوتا۔

## انوری

انوری - حکیم اوصد الدین انوری قصیدہ گوئی میں مشہور آفاق ہیں۔ اطراف خراساں میں پیدا ہوئے۔ سلطان سنجر سلجوقی کے عہد میں ان کی طباعتی نے شہرت پکڑی۔ واقعی انوری بڑے طباع تھے علم و فضل میں حکیم کا درجہ رکھتے تھے۔ مگر مولف کی دانست میں ان کی قصیدہ گوئی حکیم سنائی کی قصیدہ گوئی تک کی خوش مذاقی تک نہیں پہنچتی ہے۔ انوری درباری شاعر تھے مگر سنائی نے تقرب سلطانی سے اپنی شاعری کے دامن کو آلودہ ہونے نہ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ سنائی کا کلام پاک اور مقدس نظر آتا ہے۔ ان دونوں حکیموں کے حالات زندگی کافی پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں اہل کمال دونوں کے آدمی تھے۔ انوری طالب علم و ممال تھے اور سنائی تارک دنیا انوری نے اپنے کمالات علم و فضل کی بدولت سلطانی تقرب حاصل کیا۔ مگر سنائی نے سلطانی تقرب سے اپنے کو علاحدہ رکھا۔ انوری کے حالات میں محققین نے



لکھا ہے کہ ایک روز آپ مدرسہ کے دروازے پر بیٹھے تھے کہ ملک اشعرا حکیم ابو الفتح کی سواری نہایت جاہ و احتشام کے ساتھ سامنے سے گزری۔ انوری نے بتلائے افلاس ہو رہے تھے۔ پوچھا کہ یہ کون امیر ہے کہ اس تزک سے جاتا ہے۔ لوگوں نے کہا کہ یہ شاعر بارگاہ سلطانی ہے۔ انوری نے کہا کہ میں بھی اپنے کو سلسلہ اشعرا میں داخل کروں گا۔ یہ امانہ کر کے ایک قصیدہ مدحیہ خدمت شاہ میں پیش کیا۔ بادشاہ کو بہت پسند آیا۔ سلطان بڑے اعزاز و احترام سے پیش آئے اور آخر کار انوری کو ملک اشعرا کا رتبہ بخشا۔ اس کے برخلاف حکیم سنائی کی سرگزشت نظر آتی ہے کہ سلطانی وقت ابراہیم غزنوی نے ان کا اپنی بہن سے بیاہ کر دینا چاہا۔ مگر سنائی کی آزاد مزاجی نے بادشاہ کی خواہش پوری ہونے نہ دی آپ نے فوراً سفر حجاز اختیار فرمایا اور حج و زیارت بیت اللہ سے مشرف ہوئے۔ واضح ہو کہ اسان کے اخلاق و اطوار کو اس کے علم و فضل میں تمام تردد ختم ہوتا ہے۔ پس جب سنائی کا انداز مزاج ایسا تھا تو ضرور ہے کہ اس کے کلام میں بھی اس کے مزاج کا انداز پایا جائے۔ چنانچہ امر واقعی بھی ایسا ہی ہے کہ سنائی کا کلام بڑی حوصلہ مندی سے خبر دیتا ہے۔ دنیاۓ دون کی پستی کی طرف میلان نہیں رکھتا۔ یہ بات درباری شاعری میں پائی نہیں جاسکتی طالب جاہ و مال کہاں تک عالی خیال ہو سکتا ہے۔ نہایت جائے افسوس ہے کہ سلاطین اسلام کی بدولت شاعری درجہ ابتذال کو پہنچ گئی۔ جائے غور ہے کہ حکیم انوری سے قابل شخص کو بھی اس کام کو کرنا پڑتا تھا۔ جو سچے شاعر کے لیے ایک بڑے ننگ کی بات ہے معلوم ہوتا ہے کہ عموماً سلاطین نے شاعری کو اپنی مداحی کے واسطے مختص سمجھا تھا۔ پس انھیں شعرا کی عزت و آبرو ہوتی تھی۔ جو اپنے بادشاہوں کی مدح میں کوئی دقیقہ دریغ گوئی کا اٹھا نہیں رکھتے تھے۔ انوری کے اکثر قصائد گو بڑی طباعی سے خبر دیتے ہیں مگر درباری شاعری کے معائب سے بھرے ہیں۔ راقم ذیل میں ایک قصیدہ حکیم ممدوح کا درج کرتا ہے یہ نعتیہ قصیدہ ہے۔ اور غرض قصیدہ گوئی کے موافق ہے حضرات ناظرین حصول ثواب فرمائیں اور اس کے مصنف عالی مقام کے لیے حق تعالیٰ سے خواستگار رحمت ہوں۔

## قصیدہ انوری

اے شادی جان آفرینیش	وے گوہر کان آفرینیش
اے محرم خلوقی کہ آنجا	محو است نشان آفرینیش
اے بلبل بوستان تجرید	در شورہ ستان آفرینیش
در جلوہ کشید کشف نطق	امرا نہان آفرینیش

کائے بخت جوان آفرینش	در بدو وجود گفت پیرت
تیرے زکمان آفرینش	ناجستہ ز فکر تب رواں تر
ذاسیب گمان آفرینش	آزاد مراتب یقینت
نام تو نشان آفرینش	بے فاتحہ ثنا نبرده
باتاب و توان آفرینش	در شیوۂ اختراع و ابداع
تیزی عمنان آفرینش	کم کردہ گراں رکابی تو
فارغ زبسان آفرینش	در بے جہتی ہلال قدرت
برتر ز زبان آفرینش	در بے صفتی علو نعتت
پیش تو میان آفرینش	نابستہ نمود تاکہ بودہ
زاں سوئے جہان آفرینش	صیت تو گرفتہ صد ولایت
بر کل مکان آفرینش	دہ یازدہ قبول داری
از سود و زیان آفرینش	بیش است زکات مایہ تو
یعنی کہ بحبان آفرینش	سو گند بحبان تو خورد عقل
در فصل خزان آفرینش	ہر توبہ مجلس بہاریست
آرائش خوان آفرینش	لوزیمہ استعارات تست
درد اوستان آفرینش	نقد سخت چو رائج افتاد
گفتا ہمدان آفرینش	پرسید ز عقل کُل کہ آن حیت
بر طرف دکان آفرینش	صرف سخن کہ نفس کل است
اندر خم ران آفرینش	تا ابلق تند ہر و رام است
دوران زمان آفرینش	در خدمت دور دولت باد
تا حشر دہان آفرینش	شیریں ز نشان شکرینت

## خاقانی

حکیم افضل الدین سروانی حستان عجم کی شہرت شاعری ان کی قصیدہ گوئی کی وجہ سے ہے۔  
اس صنف شاعری میں انہیں بڑی دستگاہ حاصل تھی۔ قصائد ان کے بہت پر زور نظر آتے ہیں اور



ہرچند اکثر درباری شاعری کے عیوب سے پاک نہیں ہے۔ اس پر حکیمانہ مذاق رکھتے ہیں۔ لاریب خاقانی کے کلام میں جبری نازک خیالی اور بلند پروازی دیکھی جاتی ہے۔ فقیر کی دانست میں حکیم قاضی کے کلام کے نقصانات یہ ہیں کہ محض آسان مضامین بھی وقت خیر ترکیبوں سے حوالہ قلم کیے گئے ہیں۔ اور چوں کہ عموماً بیان مضامین کو طور دشوار ہوا کرتا ہے۔ پرتاشیری ان میں کتر پائی جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خاقانی کو دم سخن سنجی یہ یاد نہیں رہتا تھا کہ خوش خیالی لسانی کی محتاج نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ خوب مرغوب مضامین کج و کاواک بیان سے بے اثر ہو جاتے ہیں۔ مسائل منقح کے لیے سادگی بیان ہی عمدہ ہوا کرتی ہے۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ عالی اور نازک خیالات ایسی دقیق ترکیبوں سے حوالہ قلم کیے جائیں کہ معما کی صورت پیدا کریں۔ ذیل میں بطور نمونہ کچھ اشعار قصیدہ ہزۃ الارواح و نزہۃ الاشباح سے نذر ناظرین ہوتے ہیں۔

### قصیدہ

صبح را چوں مُحرماں کعبہ عریاں دیدہ اند	آہ رواں در صبح صادق کعبہ جاں دیدہ اند
ہم بصبح از کعبہ جاں رقصے ایماں دیدہ اند	از لباس نقس عریاں ماندہ چو ایماں صبح
ہم چو پستہ بہر خون آلود و خنداں دیدہ اند	در مکر ریزند ز اشک خوں کہ گردوں را بہ صبح
موقف شوق ایستادہ کعبہ جاں دیدہ اند	وادی فکر ت بریدہ محسوس عشق آمدہ
صبح را تیغ و شفق را خون قسریاں دیدہ اند	روز و شب دیدہ دو کاوبستہ در قمر بانگہش
در دل از خطید اللہ صد دبتاں دیدہ اند	خواندہ اند از لوح دل شرح مناسک بہر آنکہ
دل غلامت گاہ پا بجمہائے سلطان دیدہ اند	نام سلطان خواندہ ہم ہر پادشہ سلطان از آنکہ
در کجا در دادی تجسید امکاں دیدہ اند	از کجا برداشتہ ز اول ز بغداد طلب
چاشتگہ ہم مقصد و ہم چشمہ ہم خواں دیدہ اند	مصحف ماندہ ز منزل تشنگاں ناشنا
ہم چو عقل سالکاں سرست قیلاں دیدہ اند	در سجود کعبہ جاں ساکنان سدرہ را
علم و خضر و چشمہ و ماہی بریاں دیدہ اند	در حریم کعبہ جاں محسوسان الیاس وار
از پے در یوزہ جان کاسہ گرداں دیدہ اند	در طریق کعبہ جاں چرخ زرین کاسہ را
ماہی خضر اند گوئی کاسب حیواں دیدہ اند	کشتگان کز کعبہ جاں باز جانور گشتہ اند
کین دو جہان نفس ذمی طبع دہقان دیدہ اند	کعبہ جاں زان ہوئے نہ شہر جوقی دہفت وہ
کعبہ جاں را بہ شہر عشق بنیال دیدہ اند	برگزشتہ نزیں وہ دزان شہر در اقلیم دل

خاکیاں دانشدہ راہ کعبہ جاں کوفت کین رہ دشوار شے خاک آساں دیدہ اند  
 کعبہ سنگین مثال کعبہ جاں کردہ اند خاصگان این را طفیل دیدن آں دیدہ اند  
 ہر کو تر کز حسیم کعبہ جاں آمدہ است زیر پرش نامہ توفیق پنہاں دیدہ اند  
 عاشق اول طواف کعبہ جاں کردہ اند  
 پس طواف کعبہ تن عرض فرماں کردہ اند

## مطلع ثانی

باخیاں دیدہ نفس کعبہ جاں دیدہ اند دیدہ اند شوق کعبہ زمزم افتال دیدہ اند  
 اشعار بالا سے خاقانی کی طباعی ہویدا ہے یہ اشعار تمام تر حکیمانہ مذاق رکھتے ہیں۔ اس کی بلند  
 پائینگی معروض گفتگو میں نہیں آسکتی۔ واضح ہو کہ خاقانی اکثر شاعری کا داخلی پہلو برتتے ہیں۔ ان کا کمتر  
 کوئی قصیدہ ہے جو اس پہلو سے خالی نظر آتا ہے۔ یہ ایک بڑا فرق درمیان خاقانی اور قانی کے حائل ہے۔  
 کمال الخمی علی ارباب النظر والمحقق۔

## سعدی بحیثیت قصیدہ گو

شیخ غلام الرحمن کو قصیدہ گوئی سے بھی مناسبت حاصل تھی اور یہ مناسبت اس قسم کی نہ تھی کہ جو قصیدہ  
 گوئی کو بدنام کرنے والی ہو ا کرتی ہے۔ چونکہ حضرت کی طینت میں راست خیالی اور راست گفتاری داخل  
 تھی۔ آپ کے قلم سے ایسی باتیں نکل ہی نہیں سکتی تھیں کہ جنہیں سن کر کسی حق گو یا حق جو کا دل پریشان ہو۔  
 واقعی آپ تو لاؤ فعلًا مصداق راستی تھے۔ اسی واسطے جب کوئی قصیدہ منظوم فرماتے تھے تو ظہیر فاریابی  
 وغیرہ کی ترکیبوں سے تمام تر علاحدہ رہتے تھے۔ عموماً آپ کا کلام بہ ظہر آسان اور باطن دشوار نظر آتا ہے  
 خیالات کی صفائی ایسی ہے کہ فردوسی، نظامی، انوری اور خاقانی کو بھی نصیب نہیں ہوتی۔ جو بات زبان  
 قلم پر آجاتی ضرب المثل کا حکم رکھتی ہے حضرت کی قصیدہ گوئی بھی ان صفات سے خالی نہیں ہے۔ ذیل میں  
 ایک قصیدہ موعظت اور دو قصیدے تعریف ربیع کے نذر ناظرین ہوتے ہیں۔ یہ تینوں قصیدے اغراض  
 قصیدہ گوئی کے تمام تر موافق ہیں۔ پہلا قصیدہ موعظت کا ہے اور حسن بیان سے معمور ہے۔ اس کی پڑائی  
 غافلوں کو ہوشیار بنادینے والی اور سوتوں کو جگادینے والی ہے۔ ہر مصرع تصویر عبرت ہے فصیح سے  
 فصیح اور بلین سے بلین واعظ بھی اس سے بہتر طریقہ اختیار نہیں کر سکتا۔ اسی لیے مساجد میں سر منبر واعظین



اس قصیدے کو پڑھتے ہیں۔ واقعی اس کی پرتائیری ایسی ہے کہ اگر شخص دنیا دار غفلت کردار اسکو بہ توجہ سنا کرے تو اس کی آنکھ میں دنیا بچ دکھائی دینے لگے اور یقیناً آخر کار اسے دنیا سے منفرد پیدا ہو جائے گا۔ واہ سعدی واہ، حقیقت یہ ہے کہ اپنے خوب اس قول کو سمجھتا تھا کہ دنیا روزے چند و آخر کار با خداوند متب ہی تو آپ ایسی پرتائیر زبان میں اس خیال کو نظم کر کے حضرات حق آگاہ سے پنہاں نہیں ہے کہ نچرل شاعری کا کلام عموماً راستی سے ملو ہوتا ہے مگر یہ کہ راستی کے ساتھ کلام کمال درجہ کی شاعری کی صفت کے ساتھ بھی متصف ہو۔ یہ بڑی ندرت سے خبر دیتا ہے۔ سعدی کی شاعری یہی ندرت رکھتی ہے کہ راستی مضامین کے ساتھ اعلا درجہ کے شاعرانہ حسن سے مزین پائی جاتی ہے۔ اس قصیدہ کو حضرات ناظرین ملاحظہ فرمائیں کہ شروع سے آخر تک نہ صرف مصداق راستی ہے بلکہ اعلا درجہ کی شاعری کی تصویر بھی ہے۔ اس کے علاوہ جو اور دو قصیدے منسلک ہوتے ہیں وہ بھی اغراض قصیدہ گوئی کے تمام تر موافق ہیں۔ ان دونوں قصیدوں میں شیخ علیہ الرحمہ نے ربیع کی صفت بڑی عالی مذاقی کے ساتھ حوالہ قلم فرمائی ہے۔ اہل مذاق صحیح ان کو پڑھیں انیچرل شاعری کا لطف اٹھائیں۔ واضح ہو کہ سعدی کے ان دونوں ربیع کے قصیدوں کو دیکھ کر طمس (THOMSON) شاعر انگلستان یاد آتا ہے۔ اس با مذاق شاعر نے بھی فصلوں کی کیفیتیں منظوم کی ہیں۔ اس کی اس تصنیف کا نام "ماسنر سیزس" ہے۔

### قصیدہ سعدی نمبر ۱

قرار گاہ تو دارالقرار خواہد بود	تراز کوئے اجل کے قرار خواہد بود
مباش غمرہ کہ ناپایدار خواہد بود	اگر تو ملک جہاں را بدست آوری
ہم نصیب میسر است خواہد بود	ہمال غرہ چہ باشی کہ یک دو روزے چند
گرت خزانہ و لشکر ہزار خواہد بود	ترا بہ تختہ و تابوت در کشند از تخت
تن تو طعمہ ہر مورد مار خواہد بود	ترا بہ کنج لحد سالہا بہاید خفت
دمیدہ بر سر خاک تو خار خواہد بود	اگر تو در چین روزگار ہمجو گلے
مگر عمل کہ ترا بار بار خواہد بود	نیاز مندی یاراں نداردت سودے
بسا پیادہ کہ آنجا سوار خواہد بود	بسا سوار کہ آنجا پیادہ خواہد شد
بسا اسیر کہ فرمان گزار خواہد بود	بسا اسیر کہ آنجا اسیر خواہد شد
کہ روز حشر و جزا شرم سار خواہد بود	بسا امام ریائی و پیشوائے بزرگ

چرا از حال قیامت و مے نمیدیشی      کہ حال بے خبراں سخت نادر خواهد بود  
 بہشت می طلبی از گنہ نہ پرہیزی      بہشت منزل پرہیزگار خواهد بود  
 گرز باطل و مسردانہ حق پرستی کن      ز حق پرستی بہتر چہ کار خواهد بود  
 باز چارہ رفتن چوں رہرواں رفتند      کہ سعدی از تو سخن یادگار خواهد بود  
 بہ قطرہ قطرہ حرمت عذاب خواهد داد

بہ ذرہ ذرہ حلالیت شمار خواهد بود

اے حضرات حقائق دستگاہ واقعی سعدی کا کلام کس قدر پر تاثیر معلوم ہوتا ہے۔ کون شخص دنیا میں ہے جو ان اشعار کو چڑھ کر دنیا کی طرف سے افسردہ خاطر نہ ہوگا۔ یہ وہ اشعار ہیں کہ سلطنت دولت حکومت حسن شباب موت زور اور دنیا کی تمام نعمتوں کے نشہ کو پھاڑ ڈالنے والے ہیں۔ واہ کلام ہو تو ایسا پر تاثیر ہو۔ یہ پُر تاثیر امر اختیاری نہیں ہے، ہر شاعر سعدی نہیں ہو سکتا۔ یہ تمام تر خدا کی دین ہے جس کو خدا دے وہی پائے۔

ایں سعادت بزور بازو نیست      تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

### قصیدہ نمبر ۲ در صفت زینع

علم دولت نوروز بصرہ برخواست      لشکر زحمت سرازیر برخواست  
 تا رہاید کلمہ قائم برف از سر کوہ      یزک تابش خورشید بیغنا برخواست  
 بر عروسان چمن بست صبا ہر گہرے      کہ بغواصی ابراز دل دریا برخواست  
 ایں چہ بوئے ست کہ از جانب خنج بد مید      دیں چہ بادی است کہ از جانب صحر برخواست  
 چہ ہوائے است کہ خلدش بہ تبحر نشست      چہ زمینے است کہ خورشش بتولا برخواست  
 طارم اختر از عکس چمن حمرا گشت      بس کہ از طرف چمن لولوے لالا برخواست  
 موسم نغمہ چنگ است کہ در برم صبح      بلبلان راز چمن نالہ و غوغا برخواست  
 بوئے آلودگی از خسر قہ صوفی آمد      شور دیوانگی از سینہ دانا برخواست  
 از زمین نالہ عشاق بگر دوں برسید      و از شرے نالہ مستان بہ ثریا برخواست  
 بسکہ خواباں بہ فرح سوے بستان رفتند      الغیاث از چمن و گلبن حمرا برخواست  
 عاشق امروز بذوقی بر شاہد نشست      کہ دل زاہد از اندیشہ فردا برخواست



ہر کجا طلعت خود شید رننے سایہ لگند  
 ہر کجا سو قدے چہرہ چو یوسف بنمود  
 ہر کسے را ہوں رونے گلے در سر شد  
 با رخسار لالہ اندام بچہ رونق پشگفت  
 سر بالین عم باز نہ ای نرگس مست  
 بہ سخن گفتن او عقل زہل بر مید  
 روز رویش چو بر انداخت نقاب سر زلف  
 ورق خوبی معشوق زہم بر گردید  
 ترک عشقش بے صبر جہاں غارت کرد  
 کہ چناں راز حرم را زما برخواست

سعدیا نامہ سیہ کردن سولہ ما کے  
 کہ قلم را بہر از دست تو سودا برخواست

### قصیدہ سعدی نمبر ۳

بامدادان کہ تفاوت نہ کنند لیل و نہار  
 صوفی از صومعہ گو خیمہ بزن در گلزار  
 کوہ و دریا و درختاں ہمہ در تسبیح اند  
 بلبلان وقت گل آمد کہ بانند از شوق  
 آفرینش ہمہ تمبیہ خداوند دل است  
 خبرت نیست کہ مرغان چن می گویند  
 ہر کہ امروز نہ بیند اثر قدرت او  
 تاکے آخر چو بنفشہ سر غفلت در پیش  
 کہ تواند کہ دہر میوہ رنگین از چوب  
 وقت آنست کہ داماد گل از جملہ غیب  
 آدمی زادہ اگر در طرب آید چہ عجب  
 باش تا غنچہ سیراب دہن باز کند  
 خوش بود دامن صحرا و تماشاے بہار  
 وقت آن نیست کہ در خانہ نشینی بے کار  
 نہ ہمہ مستمعان فہم کنند این اسرار  
 نہ کم از بلبل مستی تو بنال اے ہوشیار  
 دل ندارد کہ ندارد بخداوند اقرار  
 کاخر اے خفہ سراز بالش غفلت برار  
 غالب آں است کہ فریادش نہ بیند دیدار  
 حیف باشد کہ تو در خوابی و نرگس بیدار  
 با کہ داند کہ برآرد گل ہد ہرگ از خار  
 بدر آید کہ درختان ہمہ گردند نثار  
 سرود باغ برقص آمدہ دبید و چار  
 بامدادان چو سہرناؤ آہوئے تار

مژدہ ہانے کہ گل از غنچہ بروں می آید  
صد ہزار آغینچہ ریزند عروساں بہار  
باد گیسوئے عروساں چن سناہ کند  
بویے نسرین و قرنفل بہر در در اقطار  
زالہ بر لالہ فرود آمدہ ہنگام سحر  
راست چوں عارض گلگون عرق کردہ یار  
باد بویے سمن آورد و گل و سنبل بہید  
در دکان بچہ رونق بکشاید عطار  
خیری و خطمی و نیلو فروستان افروز  
نقشبائے کہ در خمیرہ بماند البصار  
ارغوان ریختہ بردر گہ خضر رائے چین  
ہیمنائے است کہ بر تختہ دیبا دینار  
ایں ہنوز اول آثار جہاں افزوی است  
باش تاخیمہ زند دولت نیساں و ایار  
شاخہائے دختر و دوشیزہ باغ اند ہنوز  
باش تا حاملہ گردند بالواں آشمار  
حیف از عمر گرانمایہ کہ در لہو برفت  
یارب از ہر چہ خطارفہ ہزار استغفار

در دینہاں بہ تو گویم کہ خداوند منی  
یا نہ گویم کہ تو خود مطلق بر اسرار

## مولانا جمال الدین عرفی شیرازی

یہ شاعر گرامی ہندوستان میں شہرت عظیم رکھتا ہے۔ مگر اس سے اہل ایران بھی واقفیت رکھتے ہیں۔ عرفی، حزن کی طرح ایران میں غیر معروف شاعر نہیں ہے۔ شہرت عرفی کی قصیدہ گوئی کی بنیاد پر ہے اس کے قصائد درسیات میں داخل ہیں۔ عرفی کی قصیدہ گوئی ایک ممتاز پایہ رکھتی ہے۔ لیکن جو ایشیائی شاعری کے نقائص ہیں۔ اس شاعر کے قصیدوں میں موجود ہیں۔ عرفی کے قصائد کا مجموعہ جس کا معروف نام قصائد عرفی ہے۔ ایسے قصیدوں پر مشتمل ہے جو علاوہ قصائد حمد و نعت و منقبت کے اکثر شاہنشاہ دہلی شاہزادہ سلیم و دیگر امراء دربار کے مدحیہ قصائد ہیں اور تمام تر درباری رنگ رکھتے ہیں۔ عرفی ایک ذی علم شاعر تھا اور چوں کہ اہل زبان سے ہے ضرور اُسے وہ آسانی بیانی کی حاصل تھی جو فارسی میں ہندی قصیدہ گو کو فطرت کی رُو سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ واضح ہو کہ اس کتاب میں راقم الحروف کو کسی ملک کی زبان سے بحث نہیں ہے۔ اس لیے یہاں جو کچھ خیالات فقیر کے حوالہ قلم ہوتے ہیں۔ ان کو مجرد شاعری سے تعلق ہے اس پہلو سے عرفی کی نسبت یہ عرض آٹم ہے کہ عرفی ایک ممتاز شاعر ہے کوئی تعجب نہیں کہ عہد اکبر اعظم میں اس کی طباعی نے فروغ پکڑا اور آج تک اس کی شاعری کی شہرت قائم رہ گئی ہے۔ لاریب یہ شاعر گرامی دشوار گو آفرین اور خوش خیال ہے مگر اپنے خیال کو آسان ترکیبوں سے حوالہ قلم نہیں کر سکتا۔



اس کے کلام میں استعارات کی ایسی کثرت ہے کہ بسا اوقات دم کو الجھن ہونے لگتی ہے تشبیہات بھی افراط کے ساتھ داخل کلام دیکھی جاتی ہیں مگر مبالغات درجہ مبالغہ کو پہنچے ہوئے نظر آتے ہیں عربی کی شاعری یورپین شاعری کے ساتھ کسی طرح کی مناسبت نہیں رکھتی ہے بہت سے اشعار ایسے ہیں کہ ان کا ترجمہ کسی مغربی زبان میں حسب مراد اچھے طور پر نہیں ہو سکتا ہے عربی کو قصیدہ گوئی میں زیادہ تر داخل شاعری کی طرف میلان معلوم ہوتا ہے۔ برخلاف مرزا جیب قانی کے جو اس صنف شاعری میں تمام تر پہلو کے پابند دکھائی دیتے ہیں عربی ہر چند ایک نامی شاعر ہے مگر اس کو نچرل شاعری کی ہوا بھی نہیں لگی ہے کشمیر کی تعریف میں جو اس کے اشعار قصیدہ ہیں ان کو فطرت نگاری سے کوئی علاقہ نہیں معلوم ہوتا ہے مطلق ہی اس قصیدہ کا ایشیائی مبالغہ نگاری کی پوری تصویر دکھائی دیتا ہے۔

ہر سوختہ جانی کہ کشمیر در آید گرم مرغ کباب است کہ بال و پر آید  
سارا قصیدہ پڑھ جلتے کہیں بھی کسی سیری کا بیان حوالہ قلم نظر نہیں آتا۔ البتہ ہر جگہ مبالغہ نمکی بھرا ہے جس سے طبیعت کو سنگفتگی خاطر کا نصیب ہونا معلوم کشمیر کے وصف میں اگر یہ قصیدہ لکھا گیا تھا تو ضرور تھا کہ کشمیر کا بیان فطری رنگ رکھتا۔ کشمیر ایک دلچسپ جگہ ہے۔ اس کا سچا بیان ضرور ہے کہ مسرت خیز ہو اس کے جبال، صحرا، چشمے، سبزہ زار، مرغ زار، لالہ زار، جنگل، وحوش، طور آود ہزاروں اقسام کے ازہار و انماز ایک نیچرل شاعر کے لیے سرمایہ کشمیر کا حکم رکھتے ہیں مگر مولانا عربی کو نچرل شاعری کا مذاق ہوتا تو کشمیر کی تعریف میں ایسا کو ڈھنگا قصیدہ تصنیف نہ فرماتے ہوتے۔ یورپ کا ایک نیچرل مذاق کا شاعر کشمیر کا ایک ایسا فوٹو تیار کر دیتا کہ جس سے اہل مذاق کو کشمیر کی پوری سیر نصیب ہو جاتی بہت جلتے افسوس ہے کہ عموماً فارسی کے قصیدہ گو شعرا نیچرل مذاق سے محروم پائے جاتے ہیں۔ لاریب جس شاعری کو نچرل مذاق کی دولت نصیب نہیں ہے۔ اس کا کلام دل میں جگہ نہیں کر سکتا۔ ذیل میں ایک قصیدہ اس شاعر گرامی کا داخل کتاب ہذا کیا جاتا ہے۔ یہ قصیدہ حمد کا جیسا کہ مولانا عربی کا دستور ہے۔ نازک خیالیوں کی دستیابی کا سامان اس قصیدہ میں بھی کثرت استعارات کے ذریعہ سے عمل میں لایا گیا ہے۔ اس پر یہ قصیدہ بہت کچھ قابل توجہ ہے۔

## قصیدہ عربی

اے متاع درد در بازار جاں انداختہ گوہر ہر سود در جیب زیاں انداختہ  
نور حیرت در شب اندیشہ اوصاف تو بس ہایوں مرغ عقل از آشیان انداختہ

از کماں ناجستہ در چہم تھمت سر کردہ جا  
 اے بطبع باغ کون از بہر بہان حدوث  
 سرعت اندیشہ را انگندہ درد امان تیر  
 در چہن ہائے محبت ہر قدم چوں کربلا  
 مرغ طبع اندر ہوائے معصیت نکشودہ بال  
 سایہ پرورد غمت و آفتاب رستخیر  
 طعمہ عشق ترا از مغز حباں آوردہ ام  
 اے لذت را روانی دادہ در بازار عشق  
 ہر کجا تا شیر غم را دادہ اذن عموم  
 زین خجالت چوں بریں آیم کہ دل بسوج خون  
 فیض را نازم کہ ہر کس پا بہت ماندہ است  
 صید دل را بہر آگاہی ز صیاد ازل  
 کردہ از عرفاں لباس عجز را دامن دراز  
 طعمہ کز خواں عشق انگندہ ام در کام دل  
 شرع گوید مغ لب کن عشق گوید بعرہ زن  
 دولت و صلت کہ دریا بد کہ بآن محرمی  
 حیرت حسن ترا نازم کہ در بزم وصال  
 وصف صنعت کز لب ہر ذرہ میریزد بر دہوں  
 دہنایت چو کشایم لب کہ برق نا کسی  
 من کہ باشم عقل کل را ناوک انداز ادب  
 معرفت کو تیر حکمی بر نشاں انداختہ  
 طرح رنگ آمیزی از فصل خزاں انداختہ  
 عادت خمیازہ در جیب کساں انداختہ  
 از نسیم عشوہ فرشش ارغواں انداختہ  
 عفو تو شاہین رحمت را براں انداختہ  
 فرش استبرق بزیر سائبال انداختہ  
 اں ہما تا سایہ بریں استخواں انداختہ  
 عزت و شان را از اوج عز و شال انداختہ  
 شادی راحت نشاں را نا تو اں انداختہ  
 نوع و سان غمت را موکشاں انداختہ  
 دل بدست آورد و جان را از میاں انداختہ  
 در کند طرہ مخبر نشاں انداختہ  
 کو تہی در جیب عقل نکستہ داں انداختہ  
 ریزہ آں را جمیم اندر دہاں انداختہ  
 کائے تو ہم در راہ عشق خود عنایں انداختہ  
 جو ہر اول علم بر آستاں انداختہ  
 جام آب زندگی از دست جاں انداختہ  
 نطق ادر معرض عقد اللساں انداختہ  
 منظم را آتش اندر خان و ماں انداختہ  
 مرغ ادھان تو از ادج بیال انداختہ

مست ذوق عرفیم کز نعمہ توحید تو

لذت آوازہ و کام جہاں انداختہ

## قائنی

قائنی - حکیم مرزا جیب شیرازی مشہور بہ قائنی۔ اطراف شیراز میں پیدا ہوئے والد بزرگوار ان کے



مرزا ابوالحسن گلشن غلص کو فن شاعری کے ساتھ بڑی شغلی پیدا تھی۔ بیٹے کو اس کی طرف مائل پا کر چاہا کہ اس فن کی تعلیم دیں چنانچہ قآنی کو نہایت کم عمری میں خراسان کی جانب بھیج دیا۔ مشہد مقدس میں مرزا حبیب نے علومِ مردجہ میں رنگاہ حاصل کر کے شاعری کا مشغلہ شروع کر دیا۔ چوں کہ اس فن کے ساتھ طبیعت کو بڑی مناسبت حاصل تھی۔ سخنِ نجی میں جلد مشہور دیا۔ دامصار ہو گئے۔ کوئی شک نہیں کہ قآنی کو شاعری کی بڑی قوت حاصل تھی لیکن اگر اس شاعر کی فطری استعداد میں تقاضائے زبان و مکان کو دخل نہ ہوتا یہ وہ شاعر تھا کہ جودت طبع اور جدت فکر کی بدولت عالم میں اپنا ڈنکا بجا دیتا۔ مگر اس بڑے طباع کو بھی ان ہی کمزوریات کا سامنا کرنا پڑا جس کے متلا قبل میں۔ عنفری، فرخی، عسجدی، انوری، عربی وغیرہ وغیرہ ہو چکے تھے۔ بہت جگہ افسوس ہے کہ یہ شاعر کسی ایسے آزاد ملک میں پیدا نہ ہوا کہ جہاں شاعری سے بھانٹوں کا کام نہیں لیا جاتا ہے بلکہ جہاں شاعری دولت اور حکومت کے فکر و ذکر سے تمام تر لب بند اور خاموش رہا کرتی ہے۔ بہت جگہ حیرت ہے کہ اس انیسویں صدی میں زمانہ نے بہت کچھ ترقیاں کیں۔ مگر فارسی کی قصیدہ گوئی مبتذل حالت میں تھی رہ گئی۔ قآنی کی قابلیتوں کو خیال کر کے اور بھی زیادہ افسوس ہوتا ہے کہ یہ نادر روزگار اس صدی میں تھا جس میں اہل یورپ و اہل امریکہ نے انواع و اقسام کی ترقیاں نمایاں کیں۔ مگر اس کی شاعری ان بد حالیوں میں مبتلا رہی جن میں اس کے قبل کی صدیوں کی شاعری علی الاطلاق گرفتار چلی آئی۔ حالات قآنی پر نظر ڈالنے سے معلوم ہو جائے گا کہ اس کی شاعری پر اس کی لمبی بد مذاقیوں کا کیوں کراثر پڑا کہ جس سے نہ اسے اور نہ اس کی شاعری کو حافظ یا سعدی کی عظمت و جلال کا دعوا ہو سکتا ہے۔

المختصر جب قآنی کا نام فن شاعری میں بلند ہوا اس کی شہرت نے شاہزادہ حسن علی مرزا دالی خراسان کی خدمت میں پہنچایا۔ واضح ہو کہ قآنی کے درباری شاعر ہونے کی ابتدا اسی وقت سے ظہور میں آئی۔ شروع شروع اس کی شاعری کی آزادی کو داغ اس تقرب سے لگا۔ شاہزادہ نے قآنی کو ایک قابل شاعر پا کر سلسلہِ ندامت میں داخل کیا۔ ظاہر ہے کہ شاعری کو سلاطین و امرا کی ندیمی سے کیا علاقہ۔ لیکن جب یہ حکیم ندیم بنا تو ایشیائی درباروں کی بے عنوانیوں سے اس کا مومن رہنا محال تھا۔ پس تقاضائے خدمت سے ندیموں کی طرح عمر بسر کرنے لگا اور اس تعلق کی حالت میں اس نے خدمتِ ندیمی کی مشق کو اس درجہ تک پہنچایا کہ تھوڑے عرصے کے بعد اسے فتح علی شاہ کی حضوری نصیب ہوئی تو بے تکلف ندائے شاہشاہی میں در آیا۔ یہ تقرب شاہی اسے تادم آخر نصیب ملا۔ یعنی فتح علی شاہ جنتِ آماں گاہ کے بعد محمد شاہ بہشتِ آماں کی ندیمی کرتا رہا۔ پھر بھی خدمتِ مرزا ناصر الدین شاہ خلد مکان کے عہد میں برقرار رہی حتیٰ کہ ۱۲۴۸ھ صلح میں ملک بقاء ہوا۔ اہل واقفیت سے پوشیدہ نہیں کہ درباری شاعر کی عمر ندیمی امید و بیم میں بسر ہوتی ہے۔



ہمیشہ اسے بادشاہ اور امرا کی رضامندی کی فکر رہتی ہے۔ امید نان و بیم جان کا مضمون پیش نظر رہتا ہے چنانچہ یہی حالت قآانی کی تمام عمر رہی۔ تاہم آخری عشر کمال العیاد سلاطین و امرا کی خوشامی میں کرتا رہا۔ اور اپنے کمال شاعری و شاعری میں طبع نقصان لگا کر لیا۔ اس یکتائے روزگار کا دیوان کھول کر دیکھئے تو چند قصیدوں کے سوا جتنے قصیدے ہیں سب کے سب شامان اہل حکومت ہی کی مدح میں دکھائی دیتے ہیں۔ اللہ تیری پناہ۔ جس شاعری کا یہی ہر روز کا دھندا ہو طرح طرح کے جھوٹ اور غیر فطری مضامین دل سے گریھ گریھ کر حوالہ ظلم کیا کرے تو اس کے دل میں راست بازی اور فطرت پسندی کی کیا صلاحیت باقی رہ سکتی ہے۔ پس ایسا شاعر عجمی شاعری کی کیا داد لے سکتا ہے اور شاعری کو بلند پایگی کو قائم رکھ سکتا ہے۔ راقم ذیل میں حکیم قآانی کے دو قصیدے نذر ناظرین کرتا ہے۔ ایک قصیدہ امام ہشتم علیہ السلام کی ثنائیں ہے اور دوسرا ویسا ہی مدحیہ ہے جیسا کہ امرا و سلاطین کے لیے لکھا جاتا ہے۔

### اشعار از قصیدہ منقبت در شان سیدنا امام رضا علیہ السلامیہ والثناء

بگردون تیرہ ابرے بامدادن بر شنداز دریا	جواہر خیزد گوہر بزیو گوہر سیر و گوہر زرا
چو چشم اہمن خیرہ چو روئے زنگنیاں تیرہ	شدہ گفتی ہمہ چہیرہ بہ مغزش علت سودا
شبہ گون چوں شب ناسخ گرفتہ چوں ل عاشق	بر اشک دیدہ دامن برنگ طرہ عذرا
تمش باقیر آلودہ دلش از شیر آمودہ	بروں پر سمر سودا دروں پر لولوے لالا
بزل گلشن بتن زنداں گہے گریاں گہے خداں	جو در بزم طرب زنداں ز شور نشہ صہبا
جو دودے بر ہوارفتہ چو دیوے ست و آشفہ	زدہ پس دنا سفتہ زمستی خیرہ برخارا
شدہ خورشید نور انشان تبارے ہم ادبہاں	چو شاہ مہر در زندان چو ماہ چہرہ در ظلما
دیاد تیرہ چہ میترن نہفتہ چہرہ روشن	دیاد روشن گہر بہن شدہ در کام اژدہا
لب غنچہ رخ لالہ بر دیں آورہ بت خانہ	زبس باران ازاں ازالہ بطرف گلشن و صحرا
ز فیض او دمیدہ گل شمدہ طرہ سنبل	کشیدہ از طرف بلبل بشاخ سرخ گل آدا
عذرا گل خراشیدہ خطریحان ترا شیدہ	زبس الماس پاشیدہ بہ باغ ازالہ بیضا
از دوا طرف خار ستاں شدہ کیر بہا ہوتاں	وزو در شک نگار ستاں زمین ازالہ حمرا
نگندہ بر سمن سایہ دمن را دادہ سرمایہ	چمن زو عرق پیرایہ چو رنگین شاہد رعنا
ز ہمیش مرغ جان پر دوز سہش زہرہ ہا دزد	چو او چوں اژدہا غر دیا چوں دد کشد آوا



خروشد ہر دم از گردوں کہ پوشد بر تن ہامون  
 فشاند بر چین زالد دماند از دمن لالہ  
 کنوب از فین ادستان نماید از گل دریخان  
 چمن از سر و لب سبز ہمال خلخ و کشر  
 زبس گلہائے گوناگوں چمن چوں صف اگیوں  
 زبس خوبان فرخ مرغ گلستان غیرت خلخ  
 زبس لالہ زبس نسرین دمن رنگین چمن مشکین  
 گل از بادوزان لرزان و زان مشک ختن این  
 زفر لالہ و سوسن ز نور و نار نستر و ن  
 چو در ہاموں چو در بیتاں صفائے صف گل دریخان  
 تو گوئی اہل این کشور بر ہند پا بر ہند ہمر  
 ز سنبل کسوت اکسوں ز ژالہ خلعت دیبا  
 چناں از دل کشد نالہ کہ سعد از فرقت اسما  
 بزرگ چہرہ فلماں بہ بوئے طسرة حورا  
 دمن از لالہ و عہر طسرا ز تربت دیغما  
 تو گوئی فرش سقلاطوں صبا گسترده در مرغی  
 ہمہ چوں نوش دیباخ ہمہ چوں سیم در سیم  
 زبوتے آن ز رنگ این ہوا دکش زمین زیبا  
 بلے نمود شگفت از زان کساد عنبر سدا  
 دمن چوں وادی این چمن سینہ سینا  
 ز یکسو لالہ نعمان ز یکسو ز گس شہلا  
 چماں دزد شک سال اندہ بہ ہاموں ہر استقا

چمن از فر فرور دیں چماں نازاں بدشت چین  
 کہ طوس از فر شاہ دیں بریں نہ گنبد خضر

واضح ہو کہ اس قصیدہ میں ۸۵ شعر ہیں اور سب اشعار ابداریں۔ یہ سبیل اختصار ان میں سے کچھ اشعار نقل کر لیے گئے۔ سبحان اللہ کیا سخن آوری ہے۔ مآخنین کو یہ شاعری کیا نصیب ہوتی۔ مقتدین میں بھی یہ طبقاتی خاقانی کے سوا کسی میں نہیں پائی جاتی۔ قاتانی کی تشبیہوں کے معنائیں اکثر خارجی رنگ رکھتے ہیں۔ یہ رنگ قصیدہ گوئی کے لیے نہایت مناسب ہے بلکہ قصیدہ کے تشبیہی اشعار کا داخلی رنگ رکھنا قصیدہ کو غزل نما کر دیتا ہے۔ واضح ہو کہ یہ بڑے عالی فکر اور بامادہ شاعر کا کام ہے کہ داخلی رنگ میں قصیدہ لکھے۔ اور قصیدہ کو غزل نما ہونے نہ دے۔ بہر حال قصیدہ بالا میں جو قاتانی کا رنگ ہے تمام تر قصیدہ گوئی کے حسب حال ہے۔ کاش اس خلاق سخن کے تمام قصاید حمد و نعت و منقبت و مسائل علوم و فنون وغیرہ سے مشتمل ہوتے۔ ہزار حیف کہ اتنی بڑی قابلیت کے شاعر کو مدح سرائی کا متبذل کام انجام کرنا پڑا۔ اور شاہان امرا کی پابوسی میں اس کی عمر گرامی تمام ہوئی۔ خیر مقدرات سے کوئی چارہ نہیں ہے اب حضرات اہل انصاف اس شاعر کی خوبیوں پر نظر انصاف ڈالیں۔ واضح ہو کہ یہ قصیدہ منقبت امام ضامن ثامن میں ہے۔ یہ تو ممکن نہیں کہ کوئی شخص آل محمد کی ثنا خوانی میں حق ثنا خوانی کے مطابق انجام کر سکے۔ تو بھی بحد طاقت بشریہ یہ ایسا قصیدہ منقبت کھا گیا ہے کہ اگر اس کی مدح خوبیوں کے برابر کوئی شاعر اظہار فکر کرے تو اسے جس لقب گرامی سے

دستداران آل محمد یاد کریں بجا درست ہے۔ اس قصیدے کے اشعار تشبیب شوکت لفظی اور معنی ایسے رکھتے ہیں کہ کمتر کسی قصیدہ کے اشعار تشبیب اس صنعت خاص سے متصف دیکھے جاتے ہیں۔ فصاحت کا خاتمہ نظر آتا ہے۔ فصاحت کے ساتھ بلاغت کی آمیزش شاعری کی ممتاز صورت دکھا رہی ہے۔ رنگینی الفاظ کا یہ عالم ہے کہ مینا کاری کا حکم رکھتی ہے جو لفظ جہاں پر ہے ایک جزاؤ جو ہر ہے۔ ان سب بندرتوں کے ساتھ عالی خیالی بلند پروازی نفاست کی پاکیزگی تمکنت اس درجہ کی ہے کہ جس کی اعلا درجہ کی شاعری متقاضی ہے۔ ان محاسن کے علاوہ یہ اشعار نچرل خوبیوں سے ملبوہ ہیں۔ آئی نے ملک ایران کی بہار کی تصویر ان اشعار میں کھینچی ہے۔ اشخاص ہندی وطن کے ایسی بہار کو بغیر اس کے دیکھے سمجھنا خلاف توقع ہے۔ ایران کی بہار ہندوستان کی بہار سے آسمان زمین کا فرق رکھتی ہے حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں نہ خزاں ہے نہ بہار کوئی ایران کی بہار کو اپنی آنکھوں سے دیکھے تو سمجھے کہ بہار کسے کہتے ہیں۔ وہاں کی خزاں جیسی عبرت خیز ہوتی ہے ویسی ہی بہار ہی عشرت انگیز ہوتی ہے۔ تشبیب کے بعد گریز کیسی خوب صورت ہے پھر اشعار منقبت ایسے ہیں کہ درگاہ امام ہمام علیہ السلام میں ان کی مقبولیت مرتبہ یقین رکھتی ہے۔ آفرین صد آفرین بروح قآنی باد۔

## قصیدہ قآنی نمبر ۲

واضح ہو کہ یہ قصیدہ کسی حاکم وقت کی مدح میں لکھا گیا ہے فقیر نے اس میں سے صرف اشعار تشبیب انتخاب کر لیے ہیں۔ بقیہ اشعار قصیدہ روئی کما کھانے کے ہیں۔ جیسا کہ درباری رنگ کے اشعار ہوا کرتے ہیں۔ بہر حال اس کے اشعار تشبیب بہت کچھ قابل توجہ ہیں۔ اور اس بات کے ثابت کرنے والے ہیں کہ قآنی ان شاعروں میں ہے کہ جب آسمان سیکڑوں برس چکر کھاتا ہے تب ایسے شعرائے گرامی پیدا ہوتے ہیں۔ اس کی بھی تشبیب بہار یہ ہے اور بہار ایران کی تصویر ہے۔ اسی لیے اس کے جتنے اشعار ہیں محض خابری رنگ رکھتے ہیں۔

نیم سلدی وز دمگرز جو تب رہا	کہ بوئے مشک میدہد ہوائے مرغزار رہا
فراز خاک و خشتہا میدہد سبز کشتہا	چرکشتہا بہشتانہ دہ ز صد ہزار رہا
بہ جنگ بستہ جنگہا بہ نالے ہشتہ رنگہا	چکا وہاں کلنگہا تدرہا ہزار رہا
زنائی خویش فاخترہ دودھ اصول ساختہ	ترانہا نواختہ چو زیر ویم تار رہا
فلگندہ اند کشیدہ اند زمزمہ	بشاخ سرو بن ہمہ چہ بکہا ہزار رہا
نیم روضہ ارم ہمدہ مغرب دم	ز بس دمیدہ پیش ہم بطرف جوتبار رہا



بہار با بنفشہ با شقیقہا اشگو فہا  
 زہر کراہ مستہا پایا با بستہا  
 ریزش سما بہا بر آبہا حب بہا  
 فراز سرو بوستان نشستہ اند قمریاں  
 فگندہ اند غلغلہ دو صد ہزار یک دلہ  
 دختہا بگ بارور چوا شتران باربر  
 مہارکش شمشاں سما بہا رخاں شاں  
 دین بہار دل نشیں کہ گشتہ خاک عنبریں  
 رفیق بوشیق خو عقیق لب شقیق رو  
 بطرہ کردہ تعبہ ہزار طبلہ غالیہ  
 مہی دو ہفت سال او سواد دیدہ خال او  
 دو کوزہ شہد در لبش دو چہرہ ماہ بخشش  
 ہیل حسن چہرا و دو چشم من پہراو  
 چہ گوشت کہ دوش چوں بناز و غمزہ شد بریں  
 بکف بطنی ز سرخ مے کہ گراز و چسکڈنے  
 دوندہ در داغ و سر چہندہ درد دل و جگر  
 مرا بعشہ گفت ہے تراست یہ سچ میل مے  
 خوش است کا مشبائے منم خویم مے بیاد جم  
 شامہا نجمتہ با اراکبہا عسارہا  
 زمغزے پرستہا نشانہ می خسارہا  
 چو جوئے نقرہ آہارواں دما آبشارہا  
 چو مفریاں لغز خواں بزم رویں منارہا  
 بہ شاخ گل پئے گلہ زرنج انتظارہا  
 ہی ز پشت یکدگر کشیدہ صدف قطارہا  
 اھو شاں عقاشاں فرو عشاں مہارہا  
 زمین ربودہ عقل و دین نگارے از نگارہا  
 رقیق دل دقیق نوچہ موز مشک تارہا  
 بہ مژہ مہستہ عاریہ بوندہ ذوالفقارہا  
 شگفتہ از جمال او بہشت بہا بہارہا  
 نہفتہ زلف چوں شبش بہ تارہا تارہا  
 مدام مست مہراو نبیندہ اعقارہا  
 بہ حجرہ آمد اندرون بطرے گارہا  
 ہی ز بند بند دے بردوں جہد شرارہا  
 چنانکہ بر جہد شمر بہ خشک ریشہ خارہا  
 بگفتش بیاد کے بخشش ہے بیارہا  
 کہ گشتہ دولت عجم قوی چو کوہ سارہا

ز سخی صد نامور مہین امین داد گھر

کز و کثرت باب و در ز حصن و ارحصارہا

## اردو کی قصیدہ گوئی

اردو کی قصیدہ گوئی کا انداز وہی ہے جو فارسی کی قصیدہ گوئی کا ہے۔ مگر اردو میں قصیدہ گوئی کو فانی  
 کے باہر فرغ حاصل نہیں ہوا ہے اسکی چند وجہیں دیکھی جاتی ہیں۔ اول یہ کہ فارسی اردو کے اعتبار سے قدیم  
 زبان ہے۔ چند صدیاں اردو کے وجود سے پہلے فارسی میں قصیدہ گوئی بہت زور شور کے ساتھ رواج

پڑھ چکی تھی۔ سیکڑوں سلاطین گزر چکے تھے اور ہزاروں شعراء فاتر سیاہ کر چکے تھے۔ پس اردو نے اتنا زمانہ ہی  
 نہیں پایا کہ اس صنف شاعری میں فارسی کے ساتھ برابری کا دعوٰی کر سکے۔ دُوم یہ کہ جس وقت میں اردو  
 کی قصیدہ گوئی نے صورت امتیاز حاصل کرنا شروع کی، اس وقت سلاطین ہند بتلائے ادبار بوجھ چکے تھے۔  
 ان کے اختیار میں اتنا بھی نہیں رہا تھا کہ اپنے مداحوں کی اوقات بھری کا کوئی معقول سامان کر سکیں۔ اردو  
 کے نام اور قصیدہ گو شاعروں میں مرزا رفیع سودا اور شیخ ابراہیم ذوق ان دونوں کی حالت معاش کو  
 اس سے قیاس کرنا چاہئے کہ سودا بحلیف بے زری سے دہلی سے پایہ تخت کو چھوڑ کر لکھنؤ چلے گئے وہ ذوق  
 جو دہلی میں رہے بھی تو افلاس رہے۔ حضرات ناظرین ملاحظہ فرمائیں کہ ذوق اور چار روپیہ ماہانہ کی نوکری  
 اختیار کریں۔ اور اس تنخواہ سے رستہ رستہ ہزار خرابی آخر عمر میں سو روپیہ ماہواری تک پہنچیں۔ یہ دُوم  
 مثالیں اس امر کے ثابت کرنے کو کافی ہیں کہ ہندوستان میں جس وقت اردو کی قصیدہ گوئی رواج میں  
 آئی وہ وقت اس صنف شاعری سے حصول مال و منال کا نہ تھا۔ پس ایسی حالت میں اردو کی قصیدہ گوئی  
 کا فردغ فارسی کے برابر کیوں کر ہو سکتا تھا۔ سوم یہ کہ فارسی میں ایسے درجہ کے شعراء قصیدہ گو جو دُور علم و  
 دانش کے باعث حکیم کا درجہ رکھتے تھے بکثرت سے گزرے ہیں۔ ان کے فضل و کمال کا ایک شاعر بھی اردو  
 زبان میں نظر نہیں آتا ہے۔ اردو میں جو کچھ ہیں حضرت سودا ہیں۔ اگر سودا نہ ہوتے تو اردو کی قصیدہ گوئی  
 کے ساتھ مقابلہ کی کوئی صورت محال نہیں ہے۔ اردو میں نہ سعدی اور سنائی کے درجہ کا اخلاق آموز  
 کوئی قصیدہ گزرا ہے۔ اور نہ خاقانی و انوری و قاتانی وغیرہ کی ترکیبوں کا برتنے والا پیدا ہوا ہے۔  
 بہر حال جو کچھ حالت موجودہ اردو کی قصیدہ گوئی کی ہے ذیل کے بیانات سے منکشف ہوگی۔ ظاہر ایہ معلوم  
 ہوتا ہے کہ جتنے قصیدے اردو زبان میں تصنیف ہوئے۔ بادر باری یا مذہبی اغراض سے لکھے گئے ہیں۔  
 مذہبی اغراض کے قصائد بادر باری اغراض کے قصائد سے بہت کم ہیں۔ اس کی وجہ محتاج بیان نہیں ہے۔  
 دنیاوی ضرورتیں دینی ضرورتوں پر ہمیشہ غالب ہوا کرتی ہیں۔ اس کے ثبوت میں راقم استاد ذوق کے  
 قصائد پر حوالہ کرتا ہے۔ دیوان ذوق میں منجملہ ۲۴ قصیدوں کے ایک قصیدہ بھی نہیں ہے۔ جو محمد خدا  
 یا نعت محمد مصطفیٰ یا منقبت علی مرتضیٰ یا محامدائمہ باصفائیں لکھا گیا ہو۔ صرف ایک قصیدہ ہے جو کسی  
 درویش موموم بہ عاشق نہال کی شان میں ہے۔ اسی سے سمجھنا چاہئے کہ بے چارے ذوق کو درباری تعلقاً  
 سے اتنی فرصت کہاں تھی کہ بحیثیت شاعر سپر پیغمبر کی خدمت کر سکے البتہ سودا، مومن، غالب وغیرہ  
 نے درباری قصائد کے علاوہ کچھ مذہبی قصائد بھی لکھ کر سعادت عقبیٰ حاصل کی ہے! المختصر اردو میں  
 درباری قصیدوں کی تعداد مذہبی قصائد کے اعتبار سے بہت زیادہ پائی جاتی ہے۔ لیکن ان دونوں ترکیبوں



کے قصائد کے سوا اور کوئی ترکیب کا قصیدہ اردو میں نہیں ہے۔ یا راقم کی نظر سے نہیں گزرا ہے۔ راقم نے آج تک کوئی قصیدہ اردو میں ایسا نہ دیکھا جو قصائد سب سے متعلقہ کی ترکیب رکھتا ہو۔ یا سعدی یا سنائی کے اخلاق آموز قصائد کا جواب سمجھا جائے۔ حقیقت اردو کے قصائد جو درباری رنگ رکھتے ہیں ایسے قصائد کے مضامین ہمیشہ ان خیالات پر مشتمل ہیں کہ جن کو کوئی راست باز صحیح مزاج شریف آدمی زبان پر لاسکتا ہے اور نہ راست باز صحیح مزاج شریف آدمی سن سکتا ہے۔ اکثر ایسے قصائد کے مضامین اس طرح پر بندش پاتے ہیں کہ شاعر پہلے تشبیب کے اشعار لکھتا ہے تشبیب میں یا زمانہ کی شکایت کرتا ہے اور اپنی بد حالیوں کو دکھاتا ہے۔ یا موسم بہار کی کیفیتوں کو رقم کرتا ہے۔ یا اپنی جوہر ذاتی اور علی صفائی کو نوزوں کرتا ہے۔ یا اور بھی اسی طرح کے مضامین جن کو تشبیب سے مناسبت ہے حوالہ قلم کرتا ہے۔ اس کے بعد مضامین تشبیب سے گریز کر کے ممدوح کی تعریف کا کوئی درجہ اٹھا نہیں رکھتا ہے۔ ممدوح کی خوب صورتی و جاہت دولت جلالت عظمت شوکت قدرت ہمت سخاوت وغیرہ وغیرہ نہایت غیر فطرتی طریقوں سے بیان کی جاتی ہے پھر اس کے ہاتھی گھوڑے تلوار وغیرہ کی تعریفیں اس نامربوط رنگ پر برآمدھی جاتی ہیں پھر اس کے طویل عمر کے لیے اس دست سے دعا کی جاتی ہے کہ اس کا قبول ہونا معلوم آخر میں اس کے دشمن کے لیے بد دعا بھی اس بد قرینگی کے سانچے کی جاتی ہے کہ جس بد قرینگی کے ساتھ دعا کی جاتی ہے۔ مختصر اکثر قصائد مدحیہ کا بھی اندازہ ہوتا ہے جسے راقم نے عرض کیا اب ارباب مذاق فیر لیں کہ جس شاعر کا یہ انداز ہے وہ شاعری کیا ہے۔ لاریب اردو کی قصیدہ گوئی بہت اصلاح طلب ہو رہی ہے۔ واقعی جو اس وقت کی قصیدہ گوئی ہے شاعری کو بدنام کرنے والی ہے۔ ایسی قصیدہ گوئی صرف شاعر اور اس کے ممدوح کو ذلیل نہیں کرتی ہے بلکہ تمام ان اقوام کو جو اردو کو اپنی مادری زبان جانتے ہیں بہت جائے افسوس ہے کہ ابھی تک اردو کی قصیدہ گوئی نے کسی قسم کی اصلاح کی صورت نہیں دیکھی ہے۔ حاجت مندانہ شعرا جو ریاستوں میں حصول رزق کی نظر سے مارے پھرتے ہیں وہی پُرانا راگ گایا کرتے ہیں۔ ممدوح کو سخاوت حاتم، شجاعت میں رستم، مدد میں نوشیرواں، حکمت میں لقمان لکھا کرتے ہیں۔ سپاہ ممدوح کو مورد ملخ بتاتے ہیں۔ اس کے تابع فرمان آفتاب ماہتاب فلک ملک ابر باد آتش خاک قضا و قدر سب ہی کو کر دیتے ہیں۔ اس کی تلوار کو برق، ہاتھی کو کوہ، اور گھوڑے کو ہوا کہا کرتے ہیں۔ اس کی عمر کو عمر خضر سے بھی طویل تر چاہا کرتے ہیں۔ اور اسی طرح کے سیکڑوں نامربوط مضامین حوالہ قلم کیا کرتے ہیں۔ ایسے شعرا سے اصلاح مذاق کی امید تو فضول ہی فضول ہے۔ لیکن اگر ان کے ممدوحین اظہار رضامندی کے عوض اظہار نارضامندی فرمادیں تو شاعری کا یہ ناممود طریقہ دور دفع ہو جائے۔ اور قافیہ حال کے مذاق کی قصیدہ گوئی میں ایک انقلاب معقول پیدا ہو۔ لاریب حال کی قصیدہ گوئی نہایت



درجہ ابتذال کو پہنچ گئی ہے۔ جتنی کے گدائی کی صورتوں میں سے یہ بھی ایک صورت ہو رہی ہے۔ کتنے قصیدہ گو شعرا مالدار اشخاص کے پاس قصائد مدحیہ لے کر آیا کرتے ہیں۔ یہ بھی سوال کا ایک طریقہ ہو گیا ہے۔ یہ کبھی شعرا صرف مالداروں پر نازل نہیں ہوتے۔ ہم غریب اور مساکین کو بھی تنگ کرتے ہیں۔ ایک بار ایک قصیدہ گو شاعر فقیر کے گھر تشریف لائے عاجز نے انہیں مناسب سمجھ کر اپنے مقدور کے مطابق کچھ سلوک کرنا چاہا۔ شاعر صاحب بہت برہم ہوئے اور فرمانے لگے ایسے قصیدہ غرا کا اس قدر انعام قلیل دیا جاتا ہے فقیر نے عرض کی حضرت یہ آپ کے قصیدہ کی اجرت نہیں ہے۔ حیثیت شاعر آپ مجھ سے کچھ بھی پانے کے مستحق نہیں ہیں میں آپ کو مسافر سمجھ کر کچھ دیا چاہتا ہوں۔ آپ کا قصیدہ آپ کو مبارک ہو۔ آپ اس کو کسی احمق کے پاس پیش فرمائے گا جو اپنے کو دارا کی کاؤں کی خیر و فریدوں رستم، حاتم نوشتیرواں لقمان ارسطو فلاطون وغیرہ وغیرہ سمجھے۔ میں بیچارہ کہاں اور یہ شاہیر عالم کہاں۔ آپ ہی انصاف فرمائیے کہ میں آپ کو ایسی شے کی کیا اجرت دوں جو طومار و مرغ گوئی ہو۔ اس پر بھی جب وہ اپنے احسانات مجھ پر دھرنے لگے تو ناچار ہو کر عاجز نے یہ عرض کی کہ حضرت مجھ سے آپ کے احسانات کی جزا ناممکن نہیں ہے۔ آپ دو گھنٹہ کی مہلت دیں میں ایک ایسا ہی قصیدہ آپ کی تعریف میں لکھ دیتا ہوں ہل جزاء الاحسان الا احسان مختصر یہ ہے کہ قصیدہ گوئی فی زمانہ اس مذلت کو پہنچ گئی ہے کہ تمام تر گدائی ہو گئی ہے۔ اللہم احفظنا من ذالک لیکن اس بد حالی پر بھی اس طرح کی قصیدہ گوئی مذموم نہیں سمجھی جاتی ہے۔ ملکی مذاق ابھی تک اس کے موافق ہے اور اہل دول اپنی مدح سرائی سے خوش ہوتے ہیں۔ یہ نہیں سمجھتے کہ یہ مدح سرائی نہیں ہے ان کی بجو ہے۔ فقیر کی نگاہ میں قصیدہ مدحیہ ایسا ہی نظر آتا ہے۔ اور عل بھی فقیر کا اسی پر ہے۔ چنانچہ ایک بار کا یہ ذکر ہے کہ کسی خاص وجہ سے فقیر ایک بڑی ریاست میں گیا ہوا تھا وہاں احباب نے صلاح دی کہ عاجز ایک قصیدہ تصنیف کر کے بحضور والی ریاست پیش کرے۔ صلاح دوستانہ تھی۔ مگر ایسے فعل قبیح کا مرتکب ہونا طبیعت کو سخت ناگوار معلوم ہوا۔ احباب سے فقیر نے معذرت کی اور جو حضرات صاحب مذاق صحیح تھے۔ ان سے اپنے خیالات کو ظاہر بھی کیا۔ فرمانے لگے واقعی قصیدہ گوئی لغو سرائی کے درجہ تک پہنچ گئی ہے۔ ارباب مذاق ایسے شیوہ کو کیوں کر پسند کر سکتے ہیں حقیقت حال یہ ہے کہ کثرت مدح سرائی سے قصیدہ گوئی کی غرض فوت ہو گئی ہے۔ ناواقف حضرات تو یہی سمجھتے ہیں قصیدہ گوئی سے صرف اس قدر مراد ہے کہ شاعر شاہان امراء و خواتین کی مدحیں لکھ کر رسوخ پیدا کرے۔ یا روتی مکا کھائے۔ حالانکہ غرض قصیدہ گوئی یہ زہار نہیں ہے۔ قصیدہ گوئی کا مطلب یہ ہے کہ شاعر



اعلا درجہ کے مضامین داخلی اور خارجی کو پسندیدہ عنوان سے پیرایہ نظم میں بیان کرے۔ یاد رہے کہ یہ صنف شاعری غزل سے زیادہ وسیع دائرہ خیال رکھتی ہے۔ قبل میں عرض کیا جا چکا ہے کہ غزل میں صرف مضامین داخلی بندش پاتے ہیں۔ اور مضامین خارجی کو غزل سے علاوہ نہیں ہوتا۔ مگر قصیدے کے لیے جو مضامین داخلی کو تمام تر حکیمانہ رنگ رکھنا چاہئے۔ مثلاً یہ قصیدہ کی شان سے ہے کہ اس میں توحید، عدل، نبوت، امامت، معاد، حمد، معاش، معاشرت و دیگر امور دینی و دنیوی کے مضامین ہیں جگہ پائیں یا اخلاقی معاملات از قسم صداقت و خلوص و شجاعت و ہمت، فتوت و مروت و سخاوت وغیرہ موزوں کیے جائیں۔ یا اعلا درجہ کے مضامین ذہنیہ جو اقسام جذبات قلبیہ سے ہیں۔ زور بیان کا لطف دکھائیں۔ داخلی مضامین کے علاوہ جو خارجی مضامین باندھے جائیں ان کو تقاضائے فطرت سے خالی نہیں ہونا چاہئے۔ کہ قصیدہ میں بھی نچرل مضامین کی حاجت ہے۔ گو اس قدرت و وسعت بیان کیساتھ نہیں جس کی محتاج شہسوی ہوا کرتی ہے۔ ذیل میں کچھ اردو قصائد کے انتخابات نذر ناظرین ہوتے ہیں۔ چوں کہ یہ کتاب بسبیل تذکرہ نہیں لکھی جاتی ہے اس لیے صرف سودا اور ذوق کے قصائد سے اشعار انتخاب کر لیے جاتے ہیں۔ ورنہ سحر اور انشاء اللہ خاں و دیگر حضرات کے قصائد بھی موجود ہیں۔ اہل شوق انہیں ملاحظہ فرمائیں۔

## مزارِ رفیع سودا بہ حیثیت قصیدہ گو

سودا اگر اردو کے سلطان المتغزلین نہیں ہیں تو کشورِ قصیدہ گوئی کے بادشاہ کا مگر تو یقیناً ہیں اردو کے کئی قصیدہ گو شاعر کو سودا کی ذہانت اور طباعی کے ساتھ براہِ بری کا دعوا نہیں ہو سکتا میر ہر چند غزل مرثیہ میں اپنا جواب نہیں رکھتے ہیں۔ مگر قصیدہ گوئی میں سوداے کوئی نسبت نہیں رکھتے۔ بولیں خاں نے بھی مذہبی قصائد لکھے ہیں اور اچھے لکھے ہیں اور غالب کے بھی دو مذہبی قصیدے ان کے دیوان میں موجود ہیں۔ سحر اور انشاء اللہ خاں بھی قصیدہ گوئی کی معقول صلاحیت رکھتے تھے۔ اور ذوق کی شہرت تو زیادہ تر قصیدہ گوئی ہی کے باعث ہوئی۔ مگر انصاف یہی ہے کہ ان حضرات میں کوئی حضرات اس صنف شاعری میں سودا کو نہیں پہنچتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر چند سودا قصیدہ گوئی میں سانی، انوری، خاقانی، اور قافا کے جواب نہیں سمجھے جاسکتے ہیں۔ مگر شعرائے اردو میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ سودا کے قصائد جو ان کے دیوان میں دیکھے جاتے ہیں۔ بیالیس ہیں۔ ان میں چودہ قصیدے مذہبی ہیں۔ اور بقیہ یا مدح میں ہیں یا ذم میں۔ تمام قصائد اعلا درجہ کی سخن آفرینی اور طباعی سے خبر دیتے ہیں۔ ذیل میں ان کے قصائد کے کچھ انتخابات

نذر ناظرین ہوتے ہیں۔

## نمبر ۱۔ قصیدہ نعت تاسی اشعار

نہ ٹوٹے شیخ سے زناں تبیح سلیمان  
نہ ہو جوں تیغ بے جوہر و گرنہ تنگ عریانی  
نہیں کچھ جمع سے غنچہ کو حاصل جز پریشانی  
نہ جھاڑے آستین کہکشاں شاہوکی پیشانی  
سدا خورشید کی جگہ پر مساد ی ہے زرافشانی  
ہوئی جب تیغ زنگ آلودہ کم جاتی ہے پہچانی  
ہوئی ہے فیض تنہائی سے عمر خضر طولانی  
بہت رہا ہے نالاں فضل گل میں مرغ بتانی  
کہ ہو جو تیغ با جوہر اسے عزت ہے عریانی  
کہ تابد گو صدائے غیب سے کھینچے پشمانی  
موافق گرنہ ہوتے دوست ہے وہ دشمن جانی  
نفس جب تک سے داغ دل سے فرصت کو نہ پہچانی  
کہ زیب ترک چشم یار سر مر ہے صفا بانی  
لکھوں گریہ غزل اس زمین میں مطلع ثانی

ہو واجب کفر ثابت سے وہ تمغائے مسلمان  
ہنر پیدا کر اول ترک کیجئے تب لباس اپنا  
فرام نہ رکنا باعث اندوہ دل ہوئے  
خوش آمد کب کریں عالی طبیعت اہل دولت کیا  
عروج دست ہمت کو نہیں کچھ قدر پیش دم  
کرے ہے کلفت ایام صنایع قدر مردوں کی  
اکیدا ہو کے نہ دنیا میں گر چاہے بہت جینا  
اذیت وصل میں دونی جدائی سے عاشق کو  
موقر جان ارباب ہنر کو بے لباسی میں  
برنگ کوہ رخ خاموش حرف نامز اسٹن کر  
یہ روشن ہے برنگ شمع ربط باد و آتش سے  
نہیں غیر از ہوا کوئی ترقی بخش آتش کا  
کسے ہے دہر زینت ظالموں پر تیرہ روز کیو  
طلوع مہر ہو پا مال حسرت آسماں او پر

مصلح

فلک بال ہما کوپل میں سو پنے ہیں گس رانی  
کہ چشم نقش پا سے تا عدم نکل نہ حیرانی  
و گرنہ دیکھ آئینہ کو پتھر ہو گئے پانی  
کہ ہے جمعیت خاطر مجھے ان کی پریشانی  
گر غنچہ کی کھولے ہے صبا کیوں کر با سانی  
کہ اعضا دیدہ رنجیر کے کرتے ہیں مژگانہ  
مگر انو سے اب باقی رہا ہے ربط پیشانی

عجب ناداں ہیں وہ جنکو ہے عجب تاج سلطان  
نہیں معلوم ان نے خاک میں کیا کیا ملا دیکھا  
ہماری آہ دل تیرا نہ ہواوے تو یا قسمت  
تیری زلفوں سے اپنی رو سیاہی کہ نہیں سکتا  
زمانہ میں نہیں کھلتا ہے کار بستہ حیران ہیں  
جنوں کے ہاتھ سے ہر تاقدم کا ہدیہ اتنا ہوں  
نرنگی جگ میں رسم دوستی اندوہ روزی نے



یہ جنتی میں اے سودا نہیں طول سخن لازم  
سمجھ اے ناقباحت فہم کب تک یہ بیان ہوگا  
خدا کے واسطے باز آتو اب ملنے سے خواہاں کے  
نظر رکھنے سے حاصل ان کے چشم و زلف کے اوپر  
نکال اس کفر کو دل سے کہ اب وہ وقت آیا ہے  
زہے دین و محمد پیروی میں اس کے جو ہوویں  
ملک سجدہ کرتے آدم خاکی کو گراسی کی  
اسی کو آدم و حوا کی خلقت سے کیا پیدا  
خیال خلق اس کا اگر شفیع کافراں ہووے  
واہ کیا خوب قصیدہ ہے۔ سبحان اللہ قصیدہ کا ہے کوہے مرزا سودا کا تو شہ آخرت ہے بلکہ  
گوشایمان سے سننے والوں کو پر دانہ نجات بھی ہے۔ لاریب مذہبی قصیدہ کا یہ ایک عمدہ نمونہ ہے۔  
قصیدہ کے لیے جتنی باتیں ہیں اس میں موجود ہیں۔

## نمبر ۲. قصیدہ منقبت تاجہل و ہفت اشعار

اٹھ گیا بہن دولی سے چنستان کا اعلیٰ  
سجدہ شکر میں ہے شاخ مروار ہر ایک  
قوت نامہ لیتی ہے نباتات کا عرصہ  
واسطے خلعت نوروز کے ہر باغ کے بیج  
بخشتی ہے گل نورستہ کی رنگ آمیزی  
عکس گلبن یہ زمین پر ہے کہ جس کے آگے  
تدبارش میں پروتے ہیں گہر ہائے تگرگ  
بار سے آب رواں عکس ہجوم گل کے  
شاخ میں گل کے نزاکت یہ بہم پہنچی ہے  
جوش روئیدگی خاک سے کچھ دور نہیں  
دم عینی سے فزوں فیض ہوا ہے یاں تک

تیغ اردی نے کیا ملک خزاں مستاحل  
دیکھ کر باغ جہاں میں کرم عزوجل  
ڈال سے بات تماک پھول سے لیکر تاجہل  
آب جو قطع لگی کرنے روشش پر مخمل  
پوشش چھینٹ قلم کار بہر دشت جبل  
کار نقاشی مانی ہے دوم وہ اول  
ہار پہنانے کو اشجار کے ہر سو بادل  
لوٹے ہے سبزہ پہ از بسکہ ہوا ہے بے گل  
شمع سا گرمی نظارہ سے جاتی ہے گچھل  
شاخ میں گاد زمین کی بھی جو پھوٹی کوئل  
دین میں قسم جادات سے شلید ہو غل

کہیں دعوا خدائی نہ کریں لات و ہیل  
 بچہ مرغ چمن تخم سے آتا ہے نکل  
 جو زبان سے سخن اب طوطی کے آتے نکل  
 جہاں نشوونما کرنے میں ہیں ضرب مثل  
 گل بہم پہنچے ہے یہ عقدہ ہو کسی طرح کا حل  
 ان گلوں چھٹ جو نگہ کے ہیں سداستل  
 چاہتی ہے بساجت کرے سبز سے بدل  
 غنچہ لالہ نے سرمہ سے بھری ہے کحل  
 چشم سیارہ گلستاں میں جھپکتی نہیں پل  
 خطا گلزار کے صفحہ پر طمائی جدول  
 ساغر دھل میں جوں کھینچے زمستہ کو حل  
 تیغ کبار ہوئی دست ہوا سے صیقل  
 گل کو دیکھو تو نگہ جارہے سنبل پھیل  
 پاؤں کھتی ہے صبا مہن میں گلشن کے سنبھل  
 جو ٹھمر شاخ سے اترا سو گرا سر کے بل  
 شہد مچکے جو لگے نشتر ز بنور عل  
 سبز و اباں دانہ شبنم سے ہوا ہے جنگل  
 گرتے گرتے بزمین برگ ہوا ہے نکل  
 خواہ ہو شیخ پسر خواہ ہو فسر ز بند فل  
 آگیا لعل و زمرہ کے پر کھنے میں خل  
 افکار از فیض ہوا سبز شود در منعتل  
 ہے فضا اس کی تو دوچار ہی دن میں فیصل  
 رہے گا سبز پھر مجمع و ہر یک رنگل  
 جلوہ ناک و چمن جائے گا آن میں وصل  
 یک طرفہ انگلستاں میں ہے یکسو حقل

فکر رہتا ہے مجھے یہ کر زبان سے اپنی  
 حدایم کے پیش از مدد نامیہ سے  
 سبز ہوتا ہے نصیحی کے سخن پر ہر بار  
 دست گل خوردہ و مثل گل و گلزار بہم  
 غنچہ پر کبھی نہیں موقوف عجب فصل ہے یہ  
 آوے ہے ان کے نظر لاکھ طرح کا وہ گل  
 یا من رنگ جو کھتی ہے خزاں سے مانا  
 چشم ز گس کی بشارت کی زبس ہے درپے  
 اس قدر محو تماشا ہے کہ ز گس کی طرح  
 آج جو گرد چمن لمعہ خورشید سے ہے  
 سایہ برگ ہے اس لطف سے ہر ایک گل پر  
 فکر نے ربہ آئینہ کیا ہے پیدا  
 برگ برگ چمن ایسی ہی صفا رکھتا ہے  
 لڑکھرائی ہوئی پھرتی ہے خیال میں نسیم  
 اتنی ہی کثرت لغزش بزمیں ہر باغ  
 فیض تاثیر ہوا یہ ہے کہ اب حقل سے  
 دانہ جس شور میں بہ نہ پھلا دھقاں سے  
 کشت کرتے ہیں ہر ایک تخم سے از فیض ہوا  
 سبز فام ان دنوں آتا ہے نظر ہر گل رو  
 جو ہری کو چمنستان جہاں میں اس فصل  
 تاکجا شرح کروں میں کہ بقول عرفی  
 نسبت اس فصل کو پر کیا ہے سخن سے میرے  
 او میرا سخن آفاق میں تا یوم قیام  
 تا ابد طرز سخن کی ہے میری رنگینی  
 نام لفظی نہیں مجھ نطق میں جز شیرینی



ہیں برومند مخمور مرے ہر مصرعہ سے      مصرعہ مکر و سے پایا ہے کسی نے بھی پھل  
ہو جہاں کے شعرا کا مرے آگے سرسبز      نہ قصیدہ نہ مخمس نہ زبانی نہ غزل  
ہے مجھے فیض سخن اس کے ہی مداحی کا      ذات پر جس کی مہرین کہنہ عنز و جل  
مہر سے جس کے منور ہے دل جوں خورشید      رو سیہ کینے سے جس کے رہے مانند زحل  
بغض جس کا کرے جوں مویلیاں کو ضعیف      مور کو جب سے ملی جس کی بلوں کا ساں  
جائے وصلت پہ بنی جس کو ندے غیر از عرش      فرش گلزار زمین حق نے سمجھ مستعمل  
شیر بزدان نہ مردان علی عالی قدر      وحی ختم رسل اور امام اول  
خاک نعلین کی جس کی مدد طالع سے      پہنچے اس شخص کو جو شخص ہوا عائن ازل  
وہ نظر آئے اسے دہر کی بینائی سے      رہ گیا اور رہے گا جو ابد تک او جمل  
مرح غائب سے کھلے اس کے نہ مداح کا دل      رو برو مطلع ثانی سے یہ ہو عقدہ حل

دید تیری بدوئی حق سے نغمہ کا ہے خلل

ایک نئے دو نظر آتی ہے چشم اول

بلاشبہ مرزا سودا نے قصیدہ گوئی کا خاتمہ کر دیا ہے۔ کیا تاب کہ کوئی شاعر منقبت میں پھر  
ایسا لامیہ قصیدہ لکھ سکے۔ طبیعت داری سخن آفرینی، متانت، جلال، شکوہ و قار بلند پروازی عالی خیالی  
ہر شعر میں جلوہ گر ہے حقیقت یہ ہے کہ ذہانت اور طباعی سودا کی گھٹی میں پڑی تھی، اردو کے کسی قصیدہ  
گو شاعر میں خلائی سخن کی ایسی قدرت نہیں دیکھی جاتی ہے۔ اس قصیدہ منقبت کے علاوہ سونائے اور بھی  
منقبت کے قصائد لکھے ہیں۔ اور اکثر ائمہ عظیم السلام کی شان میں قصائد نظم کیے ہیں۔ یہ سب سب  
قصائد قابل توجہ ہیں۔ لاریب سودا نے اپنی قوت شاعری سے یہ اچھا کام لیا کہ قصائد مذہبی رقم کر کے  
ثواب عقبی حاصل کیا۔ قصیدہ نگاری کے اغراض سے یہ بھی ایک بھاری غرض ہے عربی میں بھی اس  
وضع کے قصائد ہیں جیسے قصیدہ بردہ و قصیدہ فرزوق وغیرہ جو مذہبی پہلو کی شاعری سے خبر دیتے ہیں۔

### نمبر ۳: تشبیب قصیدہ در مدح نظام الملک

صبح ہوتے جو گئی آج مری آنکھ جھپک      دی دین آکے خوشی نے دہل پہ دستک  
پوچھائیں کون ہے بھلی کہ وہ ہیں غافل      ننگے شوق میں جس کے کعبہ شائق کی پلک  
ہے خوشی نام میرا میں ہوں عزیز دلہا      زندگانی کی حلاوت ہے جہاں میں مجھ تک

کھول آغوش دل اور لے مجھے جلدی ناداں  
سن کے یہ خردۂ جاں بخش جو میں کھولی آنکھ  
آنکھیں ملکر کے جو دیکھوں ہوں تو ایک دل پوش  
حسن ایسا کہ جسے ماہ شب چار دہم  
چہرے میں ایسی ہے گرمی کہ شب روز جسے  
زلفیں یوں بھری ہوئی چہرہ پر انگلیں تھیں دل  
بعد وہ قبر کہ گندھنے میں جس کی ہر لہر  
ناگنی بیچ میں آؤں گے مانگے پانی  
جہیں ایسی کہ جگر ماہ کا ہو جاوے داغ  
قتل کرنے کا جو ہر نہ ہوں شمشیر کے بیچ  
دست وہ تیز کہ عالم میں نہیں جس کی پناہ  
فتنہ اس چشم کا ایسا کہ مرثیہ سے خونخوار  
حسن سے کان کے آویزے میں وطن کی جوں  
بحر خوبی کی گویا مچھلی ہے قلاب کے بیچ  
نظر آئے دہن بینی کو تنگی کے سبب  
ہی آلودہ لب اٹھ کر تھے نہ خاکستر  
سلک گوہر کی صفادام نے اون دانتوں سے  
دونوں عارض گویا شیشے میں مئے گلگوں کے

پھر خدا جانے یہ دن کب تجھے دکھلائے فلک  
اشعہ نور کی سی مجھ کو نظر آئی جھلک  
سر سے لے عرق جواہر میں دم ہے پاؤں تلک  
یک بیک دیکھے تو یکچند ہی رہ جائے بھیک  
یاد کرتی ہی رہے دامن مرگان کی جھپک  
جس طرح ایک کھلونے پر مین دو بالک  
گھر ڈبا دینے کو عشاق کے دریائے امک  
کھیل جاوے وہیں کالا جوڑے اسکی لٹک  
اس کی تشبیہ سے جب اسکو تجاؤڑے فلک  
اس کے ابرو سے مشابہ نہ بناویں جب تک  
چشم وہ ترک کہ ہم قوم جنھوں کا اذ بک  
متصل چو نکتے یا کر دیا کرتے ہیں تھپک  
مستعد قطرہ شبنم کہ پڑے گل سے ٹپک  
نتھ کے حلقے میں جو دیکھے کوئی نتھنے کی پھپک  
منخری اپنی سے گوان نے تراشی عینک  
کہ ہوا سے وہ سخن کرنے میں جلتے دہک  
برق دیوڑہ کرے موج تبسم کی چمک  
نرخ اُن دونوں میں یوں جیسے نکران میں نکا

وصف میں اس کی ملاحات کے پڑھوں ایک مطلع

جس کے آگے نہ رکھے مطلع خورشید نمک

سبحان اللہ اس سے زیادہ خوبصورت تشبیہ کیا ہو سکتی ہے۔ ایسی ایک تشبیہ انسان کے شاعر نامی ہونے کے واسطے کافی ہیں۔ اشعار بالا میں غزل کی پرتا شیری کے ساتھ قصیدہ کی ممانت اور جلالت کس آن بان سے جلوہ گر ہے۔ فی الواقع ایسے اشعار کوئی شخص بے شاعر پیدا ہوئے ہیں کہہ سکتا۔ ان کو پڑھ کر طبیعت کو کیا سنگفتگی پیدا ہوتی ہے حضرات ناظرین اپنے اپنے دل سے پوچھ لیں۔ راقم اپنی کیفیت قلبی کیا عرض کرے بے شک یہ وہ اشعار ہیں کہ ہر ملک کے اہل مذاق کو



اُن کا پسند آنا ایک امر مجبوری ہے۔ کیا طرز بیان ہے۔ کیا بندش مضامین ہے۔ کیا خلاقی سخن ہے۔ کیا مضمون آوری ہے۔ کیا صورت نگاری ہے۔ کیا مرقع سازی ہے۔ مرجا صدمرجا، آفرین صد آفرین اے سودا کن لفظوں سے تیری تعریف کروں۔ کن حرفوں سے تیری ثنا لکھوں۔ لاریب تو سچے شاعروں کی طرح الہامی قدرت رکھتا تھا۔ ورنہ ہر نظم کا یہ کام نہیں کہ مضمون کے زور سے تسخیر دل کر سکے۔ اے سودا تو نے اس تشبیب میں خوشی کی ایک ایسی تصویر کھینچی ہے کہ بہزاد ومانی کیا، یورپ کے استادان مصوری بھی تیری قلمکاری پر قربان نظر آتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ تو نے کمال صنّاعی سے شاعری اور مصوری کو شے واحد کر کے دکھایا ہے۔ تیرے حسن تفسیر سے خوشی ایک معشوق مجسم دکھائی پڑتی ہے۔ واقعی تو نے اپنے اعجاز بیان سے ایک بے جان چیز میں جان ڈال دی ہے۔ اے سودا تیرا کیا کہنا یہ شاعری نہیں سخن نگاری ہے۔

## نمبر ۲۔ قصیدہ در تہنیت فتح

آیا عمل میں تیغ سے تیری وہ کار راز  
بے سر ہوئے ہیں آج یہ مکرش کہ گر نہاں  
سر چنگ اس طرح کی نہ کھائی کہ آج بشر  
آتش غضب کی تو نے یہ ان کی فسرہ کی  
نام اس کا تیری تیغ نے معدوم یہ کیا  
یکنم تھا دل انہوں کا پر از بادۂ غرور  
تھا عزم یہ ہر ایک کا گاوں گے بیٹھ ہم  
آئے تھے وہ چنانچہ اسی طرح روز جنگ  
گاتے بجاتے ناچتے اور کودتے ہوئے  
وہ جھنڈیاں نظر پڑیں اک دم میں اس طرح  
پر حق بجانب ان کے ہی تھا کچھ اس امر میں  
جو غول تیرے سامنے آیا تو سمجھے یہ  
جیسی ہی اس گروہ نے پی تھی شراب کبر  
اسباب پر حریف کے آپس میں لگتے داؤں

دیکھا جسے نہ ترک فلک نے بروزگار  
خاک ان کی پر ہو تو نہ ٹمراوے شاخسار  
مدفون ہوں جس زمیں پہ تو وہاں اٹھ سکے غبار  
تن میں نہیں ہے قطرہ خوں صورت شرار  
نہ عفت کرے ہے سگسمہ نغان مرغ کو ہمار  
تن اس میں کر دیا نمک تیغ آب دار  
تینوں کو کھینچ کھینچ کے قلعاری مار مار  
پایا تھا جوں دلوں میں خیال انکے نے قرار  
سایہ میں جھنڈیوں کی صفیں باندھ بیٹھار  
گاذر بچھا دیں پارچہ جوں نہر کے کنار  
تیرے دلا دروں کا نہ دیکھا تھا کارزار  
اک کھیت رو برو ہے ہمارے پر از خیاب  
کھینچا ہے اسکے نشتر نے دیسا ہی کچھ خمار  
شکر میں اپنے بیٹھ کے جب کھیلے قمار

حق ناشناس قوم یہ تھی غرہ اس قدر  
لیکن خدا کے فضل سے یہاں ناگرفتہ قرض  
شمیر و دست و بازو کے ہیں یہ بہت ملی  
پروہ جو ہیں غلام غلام اس جناب کے  
جرات میں ان کے حرف نہیں پریر کیا کریں  
اُن میں سے اس غلام کے تھے اکثر آشنا  
یک قوم و یک برادری و یک گروہ کے  
حافظ کی لاش ڈال گئے معرکہ میں تم  
ان میں سے ایک نے بدم سردیہ کہا  
لیکن جو کچھ واقعی دیکھا سو ہم کہیں  
تھی سامنے ہمارے جو فوج ہرا ولی  
سننے میں اب ہر ایک سے اس فوج کی یہی  
محبوب اور سنت و لطائف تھیں یک طرف  
لیکن انھوں کو آدمی کہنے کہ دیو دو  
اپدھر سے بان و رہکلہ و توپ متصل  
بڑھ بڑھ کے آخرش وہ لگے تو ہیں دانغے  
لیکن میں تجھ سے کیا کہوں اے یا اس گھڑی  
تھی کرتیاں تلگوں کی مانند لالہ زار  
تو ہیں جو دانغے تھے قتیلوں سے آن آن  
گبنال مثل رعد کے کر کے تھی دمبم  
بارود گولہ توپ میں تھا یا وہ باد تھی  
فرصت کس نے اتنی نہ پائی کہ وہ کرے  
ہر ایک جا ہی نظر آیا ہر ایک کو  
اڑتے تھے یوں پیادہ کو تو دے کو ریتی کے  
تھے ہاتھیوں پہ بیٹھے جو حافظ کے ہم نشین

غارت پہ ہر بزد کے لیتے تھے سب اُدھار  
جولائے تھے سو دے گئے رکھانہ ایک تار  
اپنا تو حرف حق سے گزنا نہیں شعار  
آگے قدم انھوں کے نہیں ان کا امتوار  
صحبت نہ دل سے ان کی تہور نے کی ہرار  
میں نے کہا انھوں سے کہ تم جیسے جا نگزار  
ہو سامنے عربوں کے بے حد و بے شمار  
فتح و شکست مردوں کو ہے پر یہ افطار  
خواہش خدا کی یوں ہے نہ تھا اپنا اختیار  
آوے تجھے سخن کا ہمارے گر اعتبار  
ہوں گے وہ دس ہزار تاک پیادہ و سوار  
مکر رہے تھے سمیت فرنگی کے پانچ چار  
یکسو تھا میر سید علی مستعد سکار  
ان کا قدم دغا میں یہ پایا ہم استوار  
پڑتی تھی پروہ بڑھتے ہی آتے تھے ہر گزار  
اس پلے پر جہاں سے جزائر کی ہو دے مار  
دکھلائی تھی اجل نے عجب طرح کی بہار  
تھا دود توپ ابڑسیاہ تنگ گ بار  
رنجک مثال برق چمکتی تھی بار بار  
آواز شتر نال تھی طاؤس کی چنگھار  
جس نے کے قوم عاد اُڑائی تھی جون غبار  
بندوق و تیر و تیغ سے جا ان میں کلزار  
گھوڑا ادھر جو تڑپے ہے ادھر پڑا سوار  
ندان کا کما نچہ جوں دے ہے امتدار  
ساتھ اس کے ہم پیار و باہم نوالہ خواہ



وہ بھاگے اس طرح کہ کہتی تھی انکو خلق  
 نے رونے کے تو اس تھے نے بھاگنے کا ہوش  
 باور ہی سمجھو اس کو تو اے یار اس گھڑی  
 جیدھر کو اس کا منہ اٹھا اودھر کو وہ چلا  
 ہو یہ غضب تو لاش کا حافظ کے ذکر کیا  
 حافظ کی لاش ہم سے نہ اٹھی تو نزد ہم  
 لازم نہ تھا اسے کہ ہو ایسے کے سامنے  
 لے زر سے نا جواہر و انا سپ تا پھیل  
 نہ رتبہ زر کو ہے نہ جواہر کی منزلت  
 خلعت کسی کو اسپ کسی کو فیل  
 حافظ چاہے عہد سے اس کے برآؤں میں  
 کیا کیا کرو نہیں اس کی شجاعت کا اب بیان  
 حافظ نے سردیاں دیا زر ہوئی ہے یہ  
 ہاگا وہ دیکھو جاتے ہے میداں سے کوہار  
 نے سوچ جینے کا ہے نہ مرنے کا کچھ بچار  
 آیا جو کچھ علی میں نہ تھا اس میں اختیار  
 سوچے بغیر یہ کہ فلاں جا کروں قسار  
 بیٹا سکتا چھوڑ کیا باپ نے فرار  
 جاگہ نہیں ہے طعن و تعرض کی ہم پر یار  
 ہمت میں اور کرم میں جو ہے طاق و نگار  
 جس کے ہم کے آگے نہ رکھے کچھ اعتبار  
 نہ قدر اسپ کی ہے نہ کچھ فیل کا وقار  
 بخشے کسی کو لاکھ کسی کو دسے ہزار  
 پیادہ کو دے کتے تین روپیہ نو روپیہ سوار  
 ہمت کو اس کے کیا کروں اظہار بار بار  
 تاریخ اس کی فوت کی کر کے عدد و شمار

تاریخ فتح عرض کی سودا نے یوں کہ ہو

یہ فتح نو مبارک نواب نامدار

واضح ہو کہ یہ قصیدہ تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ اور سودا کے عہد کے معاملات ملکی سے خبر دیتا ہے۔  
 اس قصیدہ کے لکھے جانے کا یہ سبب ہوا کہ حافظ رحمت خاں روہیلہ اور نواب شجاع الدولہ نواب وزیر  
 المہالک اودھ کے درمیان جنگ واقع ہوئی جس میں روہیلوں کو شکست ہوئی۔ اور حافظ مارے بھی گئے۔  
 نواب اودھ کو یہ فتح زینہار نصیب نہ ہوئی۔ اگر شکرا نگلشیہ مدد پر نہ ہوتا۔ فوج انگلشیہ کی شرکت  
 کی وجہ یہ ہوئی کہ سرکار اودھ سے سرکار ایسٹ انڈیا کمپنی کو اتحاد تھا۔ یہ اتحاد ملکی اصول پر اور تقاضائے  
 وقت کے مطابق تھا۔ اس زمانہ کی تاریخ قابل سیر ہے۔ اس وقت کے ہندوستان سے اس عہد کے  
 ہندوستان کو کوئی مناسبت نہ تھی۔ یہ ملک اس وقت طوائف الملوکی کی بلا میں مبتلا ہو رہا تھا۔  
 دہلی کی سلطنت پرزے پرزے ہو چکی تھی۔ ہر صوبہ دار بادشاہ وقت بن بیٹھا تھا۔ چنانچہ اودھ  
 بھی دہلی سے علاحدہ ہو کر ایک آزاد سرکار ہو گیا تھا۔ اسی طرح روہیلوں نے کچھ ملک دبایا تھا اور  
 نہ نواب اودھ کا ماتحت اپنے کو سمجھتے تھے اور نہ دلی کے بادشاہ کو کوئی شے جانتے تھے اس وقت

اہلیان کمپنی بڑی حکمت عملیوں سے کام لے رہے تھے جن ریاستوں سے موافقت کی ضرورت دیکھتے تھے موافقت کرتے تھے اور جن سے خلاف کی حاجت دیکھتے تھے مخالفانہ کارروائی عمل میں لاتے تھے اس لڑائی میں بھی انگریزوں کی شرکت اس ملک داری اور ملک گیری کے قاعدہ کی بنیاد پر تھی یہ شرکت سودا کے کلام سے بھی عیاں ہے۔ اب حضرات ناظرین سودا کی طباعی اور قابلیت کی طرف توجہ فرمائیں۔ کہ قصیدہ بالا میں اس یکتائے روزگار نے کیا کیا شاعری کے تماشے دکھائے ہیں۔ یہ قصیدہ تہنیت فتح میں لکھا گیا ہے۔ نواب کی تعریف کے بعد سودا روہیلوں کی آمد کو کس عمدگی سے لکھتے ہیں۔ اس عہد کی فوجیں یورپین فوجوں کی طرح باقاعدہ تو نہیں ہوتی تھیں ہندوستانی لشکروں کے انداز وہی ہوتے تھے جو اس وقت بھی بعض ریاستوں کے لشکروں کے دیکھے جاتے ہیں۔ اب انگریزوں کی تقلید سے ریاستوں کے لشکروں کی کچھ ظاہری صورت درست ہوئی ہے۔ ورنہ اکثر ریاستوں کے سپاہیوں کی وہی قطع ہے۔ کہ اگر دگلا درست ہے تو موزہ پھٹا ہوا ہے۔ تلوار صاف ہے تو بندوق زنگ آلودہ ہے۔ یا دگلا، موزہ، تلوار، بندوق اور جمیع اسباب جنگ سب کا سب ہی جتلائے نکبت ہو رہا ہے۔ یہی حال حافظ کے لشکریوں کا بھی تھا کہ لیڑیوں کی صورت پھٹا پرانا پہنے طرح طرح کے کہنہ آلات حرب لگائے غل شور مچاتے میدان جنگ میں آئے۔ نواب کے لشکریوں کی بھی حالت اس سے اچھی نہ تھی۔ اودھ کی فوجیں نیپولین..... (NAPOLEAN) اور ولینگٹن (WILLINGTON) کی تعلیم کردہ نہ تھی۔ کچھ تھوڑا باقاعدہ جو لشکر نواب تھا بھی وہ پوری یورپین تعلیم جنگ پائے ہوئے نہ تھا۔ اگر فوج انگریزی ملک نواب پر نہ ہوتی تو اس فتح کا نصیب نواب ہونا کوئی امر یقینی نہ تھا۔ چنانچہ غنیم کی مستعدی کا ثبوت سودا کے کلام سے بھی ملتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:-

شمشیر و دست و بازو کے میں یہ بہت ملی اپنا تو حرف حق سے گزرنا نہیں شعار  
 پر وہ جو ہیں غلام غلام اس جناب کے آگے قدم انھوں کے نہیں ان کا استوار  
 جرأت میں ان کے حرف نہیں پر یہ کیا کریں صحبت نہ دل سے ان کے تہورنے کی برابر  
 خیر اس کے بعد سودا جو میدان جنگ کی تصویر کھینچتے ہیں ایسی ہے کہ مصوری کا عالم دکھا رہی ہے۔ اہل مذاق بیان جنگ کو پڑھیں اور لذت یاب سخن ہوں۔ اس عہد کی لڑائی کے آلات حرب اور طریقہ حرب پر توجہ فرمائیں۔ وہ زمانہ ہماری مارٹینی اسٹامیڈر اور کرپ گن کا نہ تھا۔ یہی گنجانل شترمال اور جزائر سے لڑائیاں لڑتی جاتی تھیں۔ لاریب یہ بیان جنگ مورخ کی توجہ فرمائی کے بھی قابل ہے۔ اس سے اس عہد کی لشکر آرائی اور نبرد آزمائی کا پورا انداز ظاہر ہوتا ہے۔ واہ سودا واہ، شاعری



واقعہ نگاری کا لطف دکھا رہی ہے۔ شاعری کو ایسا ہی ہونا چاہئے۔ بہتر تشبیہات کو ملاحظہ فرمائیے۔  
 تو خوبیوں سے معمور نظر آتی ہیں حقیقت یہ ہے کہ ان سے بہتر تشبیہات ڈھونڈنے سے دستیاب نہیں  
 ہو سکتی ہیں۔ ان میں غیر فطری انداز کی کوئی تشبیہ نظر نہیں آتی ہے! مختصر حضرت سودا نے اس قصیدہ میں  
 بڑی خوش مذاقی کا اظہار کیا ہے۔ اور فقیر کی دالت میں یہ قصیدہ پچرل بیانات سے خالی نہیں ہے۔

### نمبر ۵۔ قصیدہ شہر آشوب

اب سامنے میرے جو کوئی پیر و خواں ہے  
 میں حضرت سودا کو سنا بولتے یا رو  
 اتنا میں کیا عرض کہ فرماتے حضرت  
 سن کر یہ کہنے لگے کہ خاموش ہی رہ جا  
 کیا کیا میں بتاؤں کہ زمانہ کی کٹی شکل  
 گھوڑا لے اگر نوکری کرتے ہیں کسوی  
 گزرے ہے صدایوں غلف و دانہ کی خاطر  
 ثابت ہو جو دکلا تو نہیں موزونیں کچھ حال  
 کہتا ہے نفرغہ کو صراف سے جا کر  
 یمن کے دیا کچھ تو ہوتی عید و گرنہ  
 اس رنج سے جب چڑھ گئے چھتیس مہینے  
 لیتے ہیں بایں روہی وہ تو دو ماہ  
 قاضی کی جو مسجد ہے گدھا باندھے اس میں  
 ملا جو اذان دیوے تو منہ موند کے اس کا  
 بولا جو خطیب اس میں تواری اُسے اک دھول  
 ریگے ہے گدھا آٹھ پہر گھر میں خدا کے  
 اور وہ جو ہیں کمزور دہاں آن کے بیٹھیں  
 اٹھا ٹھکے کھاتے ہیں انھیں حال وہ اپنا  
 یوں بھی نہ ملا کچھ تو ہر ایک پاکی آگے

دعوا نہ کرے یہ کہ مرے منہ میں زباں ہے  
 اللہ رے اللہ ہی کیا نظم بیاں ہے  
 آرام سے کٹنے کی کوئی طرح بھی یہاں ہے  
 اس امر میں قاصر تو فرشتوں کی زبان ہے  
 ہے وجہ معاش اپنی سو جب کا یہ بیاں ہے  
 تنخواہ کا پھر عالم بالا پہ نشاں ہے  
 شمشیر جو گھر میں تو سپر بنیے کے یہاں ہے  
 تیروں میں ہے پرگیری تو بے چلہ کہاں ہے  
 بی بی نے تو کچھ کھایا ہے فلو سے میاں ہے  
 شوال بھی پھر ماہ مبارک رمضان ہے  
 تنخواہ کا پھر پٹینا اس شکل سے یہاں ہے  
 ہم دھوئیں حر کے کی جنہیں تاب و تواں ہے  
 بیٹھا ہوا اس شکل سے ہر پیر و خواں ہے  
 کہتے ہیں کہ خاموش مسلمان کہاں ہے  
 ہاتھ آگیا واعظ تو تھیں مراد بان ہے  
 نے ذکر نہ صلوٰۃ نہ سجدہ نہ اذان ہے  
 زینہ کے آگے کی جو ہر ایک دکان ہے  
 دربار افس عہد میں جو خورد و کلاں ہے  
 اس سچ سے رسالہ کا رسالہ ہی ریاں سے

کوئی سر پہ کیے خاک گریباں کو کر چاک  
 ہندو و مسلمان کو پھر اس پاکسی اوپر  
 یہ مسخرگی دیکھ کے جا صاحب ارستی  
 گر بجے جا کر کسی عمدہ کے مصاحب  
 وہ جاگے جو راتوں کو تو بیٹھے ہیں دو زانو  
 بیوقت خورش اسکی جو ہوا پی تیں بھوک  
 گھڑیاں کی جب بیٹھے ہوئے گنتے ہیں گھڑیاں  
 خمیانہ پھیمانہ ہے اور چرت اوپر چرت  
 میخہ طبابت کے بھلا آدمی نوکر  
 صحبت ہے اس سے اگر آقا کے تیں چھینک  
 دیتے ہیں منگاتیر و کماں اسد میں اس کے  
 اور احضر اوپر جو وہ نواب کون دیکھے  
 مطبوخ میں ہے خربزہ اور خربزہ پر دودھ  
 یہ بھی تو نہیں ہے کہ اسی سے ہوتی  
 اس میں جو کہیں درد اٹھا پیٹ میں انکے  
 رکھتے ہیں غرض مرگ سے رونے کو سپاہی  
 سوداگری کیجئے تو ہے اس میں یہ مشقت  
 ہر صبح یہ خطرہ ہے کہ طے کیجئے منزل  
 کیے جا جو کسی عمدہ کی سرکایں دے جنس  
 قیمت جو چکاتے ہیں سو اس طرح کی ٹاٹ  
 جب مول شخص ہوا مرضی کے موافق  
 پروانہ لکھا کر گئے عامل کئے جس وقت  
 ادھر سے پھر آئے تو کہا جنس ہی لے جا  
 آخر کو جو دیکھو تو نہ پیسے ہیں نہ وہ جنس  
 ناچار ہو پھر جمع ہووے قلعہ کے آگے

کوئی رو دے ہے منہ پیٹ کوئی ناکرناں ہے  
 اٹھی کا تو ہم ہے جنازہ کا گماں ہے  
 کرتے ہے جو دہاں عرض تو نے پھر نہ ہاں ہے  
 اس کی تواذیت بڑی ہی آفت جاں ہے  
 کیسا ہی اگر اپنے تیں خواب گراں ہے  
 سو کیا کہوں تجھ سے کہ مصیب کیاں ہے  
 اور رنج ظار و دواں میں جوں سپنداں ہے  
 منہ صورت سو فار مگر سکل دہاں ہے  
 سودو سو رو پیے کا جو کسی عمدہ کیہاں ہے  
 آوے تو وہ اس کو بخشونت نگران ہے  
 ٹھنڈی ہوا آنے کا گراں دقت گماں ہے  
 کھانا تو یہ کھاتے ہیں پر اس کو خفقاں ہے  
 ہے دودھ پھپھی تس اوپر گاؤ زباں ہے  
 اس سب پہ تغن کے لیے بیسی ناں ہے  
 پھر بو علی سینا ہے تو دہاں ہچداں ہے  
 گر نوکری سمجھو یہ طبابت کی کہاں ہے  
 دکن میں بکے وہ جو خرید صفہاں ہے  
 ہر شام یہ دل و سوسہ سودو زیاں ہے  
 یہ درد جو سنئے تو عجب طرفہ بیاں ہے  
 سمجھے ہے فروشنہ یہ دزدیکا گماں ہے  
 پھر بیسوں کی جاگیر کے عامل پنشاں ہے  
 کہتا ہے وہ پیسا ابھی مجھ پاس کہاں ہے  
 دیوان و بیوات یہ کہتے ہیں گراں ہے  
 ہر ایک متعدی سے میان اور تیاں ہے  
 جو پاکسی نکلے ہے تو فریاد و فغاں ہے



دو بیل کی جاکر جو کہیں کیجئے کھیتی  
 ہن خشکی و غرق کے تفکر میں شب و روز  
 گر خاں و خوانین کی لے کوئی وکالت  
 ہر عہد کے دروازہ پہ زیں پوش پہ بیٹھا  
 ہر گھر میں وہ چاہے کہیں فوارہ سا چھوٹوں  
 دیوان کے بخشی کی بیوتات کے حاضر  
 ہر بات پلٹا ہی رہے صبح سے تا شام  
 لاوے جو کچہری سے وہ داموں کا سیاہ  
 بتا دے غرض پیسے ادا کر ہوے روپوش  
 سواہر یہ بیٹھے ہے دلے پالو ہے خرچ  
 جس وقت سنایہ دیں آواز بدل کر  
 پھر مو جو موکل سے کہیں راہ میں بہنیا  
 غرضی پہ ہوا میم سیاہی یہ ہوا جیم  
 کا ہے کی غرض غرضی ہے اور کس کا سیاہ  
 انصاف جو کیجئے تو نہیں اس کی بھی تقصیر  
 شاعر جو سننے جاتے ہیں مستغنی الا حوال  
 مشاق ملاقات انہوں کا کس و نا کس  
 گر عید کا مسجد میں پڑھے جا کے دو گانہ  
 تاریخ تولد کی رہے آٹھ پہر فکر  
 اسقاط حمل ہو تو کہیں مرثیہ ایسا  
 ملائی اگر کیجئے ملا کی ہے یہ قدر  
 دن کو تو بچارا وہ پڑھایا کرے لڑکے  
 اور محضرا خونگاب کیا میں بتاؤں  
 تپسہ ستم ہے کہ نہالی تے اس کی  
 بھاگے یہ عمل کر جو وہ شیطان کا لشکر

اور منہ بھی موافق ہے پڑے تو تو ماں ہے  
 نہ امن ہے نل کی تیں نے جیکو اماں ہے  
 اس کا تو بیاں کیا کردں تجھ سے کہیاں ہے  
 پوچھے ہے اجی مرد ہے جی نواب کہاں ہے  
 ہر کو چہ میں جون آب و چکا بودہ دواں ہے  
 مانند کنہیا کے جہاں دیکھو تہاں ہے  
 پیل کے پتوے کی طرح منہ میں نہاں ہے  
 لکچا دے موکل کو یہ کیا خوب مکاں ہے  
 گھر جاکے پکارے جو کوئی لالہ کہاں ہے  
 اور زر کے اجارے کی بھی اردو نیگاں ہے  
 آپ ہی کہاں گھر میں سے کشن چڑکے کہاں ہے  
 اسناد کا جاگیر کے یہ اس سے بیاں ہے  
 پروانہ میں تم پر ہوں تصدق میری جاں ہے  
 کیدھر کا وہ پروانہ وہ جاگیر کہاں ہے  
 سب حاصل ان باتوں کا ایک پاہر ناں ہے  
 دیکھے جو کوئی فکر و تردد کو تو یہاں ہے  
 ملنا انہیں ان سے جو فلاں ابن فلاں ہے  
 بنت قطعہ تہنیت خان زماں ہے  
 گر رحم میں بیگم کے سنے نطفہ خاں ہے  
 پھر کوئی نہ پوچھے میاں مسکین کہاں ہے  
 ہوں دور روپیے اس کے جو کوئی ثنوی خواں ہے  
 یک کاسہ دال عدس و جو کی دوناں ہے  
 شب خرچ بکھے گھر کا اگر ہندسہ داں ہے  
 لڑکوں کی شہرت سے سدا خار نہاں ہے  
 دیوالی کو لے ہاتھ تعاقب میں دواں ہے

اب کیجئے انصاف کہ جس کی ہو یہ اوقات  
 جس روز سے کا تب کا لکھا حال میں تب سے  
 وہ بیت کے سیکڑے نکھنے کو ہے محتاج  
 یہ بھی میں تکلف ہی سے کہتا ہوں وگر نہ  
 امیا ہو جو موتنا کا زما نہ میں سراسر  
 ہر یہ جو سوا پانچ کے گزری میں جا کر  
 دمڑی کو کتابت نکھیں دھیلے کو قہار  
 چاہے جو کوئی شیخ بنے بہر فراغت  
 دیتا ہے دم خر سے کوئی شملہ کو نسبت  
 اور اس کو جو دیکھے کوئی وہ بہر معیشت  
 پوچھے ہے مریدوں سے یہ ہر صبح کو اٹھ کر  
 تحقیق ہوا عرس تو کر دار بھی کو کسنگھی  
 ڈھولک جو لگی بجنے تو وہاں سب کو ہوا وجد  
 بے تالے ہوئے شیخ جو تک دجہ میں آکر  
 گرتاں سے چتا ہے قدم تو سبھی منہ منہ  
 اور حاصل اس ربخ و شفقت کا جو پوچھو  
 سب پیشہ یہ تاج کر جو کوئی ہو متوکل  
 اور بیٹی کے دل کو ہے خرافت کا یتقن  
 پھر جو دم کے جب لڑکے لگے بھوک مرنے  
 جب راہ خدا پیے نکالے کوئی نواب  
 مضمون بھی رقعہ کا کہ کچھ دیجئے اس کو  
 بالفرض اگر آپ ہوئے ہفت ہزاری  
 تک دیکھنا منعمو علی خاں جی کا احوال  
 دنیا میں تو آسودگی رکھتی ہے فقط نام  
 سو اس پہ یتغن کسی کے دل کو نہیں ہے

آرام جو چاہے وہ کرے وقت کہاں ہے  
 ہر صفحہ کا غزپہ قلم اشک فشاں ہے  
 خوبی میں خط اب جسکا بہ از خط بتاں ہے  
 آفاق میں ان چیزوں کی اقبہ کہاں ہے  
 خطاط کی اتنی ہی رہے قدر جو بیاں ہے  
 یا قوت پکارے جو بکا و قیسراں ہے  
 بیٹھے ہوئے وہاں میر علی چوک جہاں ہے  
 چھٹی ہے تو شعرا کی وہ طعون بیاں ہے  
 گنبد سے کوئی پگڑی کو تشبیہ کناں ہے  
 اس فکر و تردد ہی میں ہر ایک زماں ہے  
 ہے آج کہ ہر عرس کی شب روز کہاں ہے  
 لے خیل مریدان گئے وہ بزم جہاں ہے  
 کوئی کو دے ہے کوئی بٹے کوئی غفرناں ہے  
 سرگوشیوں میں پھر بد اصولی کا بیاں ہے  
 کہتے ہیں کوئی حال ہی یہ قص زناں ہے  
 ڈالا ہوا وہاں دال نخود قلبہ و ناں ہے  
 جو رو یہ سمجھتی ہے نکھٹو یہ میاں ہے  
 بیٹے کو جنوں ہونے کا بابا کے گماں ہے  
 ہر خان و خوانین کے ہمراہ دواں ہے  
 تب اس کی سفارش میں یہی اک رقعہ خاں ہے  
 مداح اماموں کا ہے اور مرثیہ خواں ہے  
 یہ شکل بھی مت سمجھو تو راحت جاں ہے  
 چھاتی پہ کرک بکلی ہے اور شیر دیاں ہے  
 عقبی میں یہ کہتا ہے کوئی اس کا نشان ہے  
 یہ بات بھی گویندہ ہی کا محض گماں ہے



یہاں فکرِ معیشت ہے تو وہاں دفعہ حشر آسودگیِ حرفیست نہ یہاں ہے نہ وہاں ہے  
آرام سے کئے کا سنا تو نے کچھ احوال  
جمعیتِ خاطر کوئی صورت ہو کہاں ہے

یہ شعر آشوبِ قصیدہ نہ صرف سودا کی بڑی طبیعت داری سے خبر دیتا ہے۔ بلکہ اس امر کا بھی ثبوت ہے کہ یہ شاعر ہمدانی کی صفت سے متصف تھا۔ سودا کی پورے دیوان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ اپنے عہد کے معاملات کلی و جزوی سے تمام تر باخبر تھا۔ ہندوستان کے ملکی و برابری شہری بازاری سب طرح کے امور اس پر ہو رہے تھے۔ فرارواں کی کیا حالت تھی لشکروں کا انتظام کیا تھا، وزرا اور امراء کے کیا طور تھے۔ ان خلائق کی کیا صورت تھی پیشہ وروں کی کس طرح گذرتی تھی، مساجد و مدارس اور خانقاہوں کی کیفیتیں کیا تھیں۔ اطباء کی اقات ہسری کیوں کر ہوتی تھی۔ شعرا کا گذران کس نہج پر ہوتا تھا ملاؤں کے مشاغل کس طرح کے تھے۔ تاجروں کے کاروبار کیوں کر چلتے تھے۔ نوکری پیشوں کی کمائی کا کیا ڈھنگ تھا۔ کاشتکاروں کی کیسی کٹتی تھی۔ الغرض اسی طرح ہر طبقہ اور ہر درجہ کے آدمی کے حالات سے یہ یکتائے روزگار اطلاع کافی رکھتا تھا۔ اس قصیدہ سے بھی اس کی اطلاع عام کا اظہار مقصود ہے۔ فی الواقع یہ قصیدہ بڑی طباعی اور واقف کاری سے خبر دیتا ہے۔ کلام کی خوبی یہ ہے کہ اس کے بہت اشعار ضرب المثل کی طرح زبانِ ندخلاتی ہو رہے ہیں۔

### نمبر ۶۔ قصیدہ درجواب

ہے چرخ جب سے ابلق ایام پر سوار  
جن کے طویلے پہنچ کئی دن کی بات ہے  
اب دیکھتا ہوں میں کے زمانے کے ہاتھ سے  
تنہا دے نہ دہر سے عالمِ خسراب ہے  
ہیں گے چنانچہ ایک ہمارے بھی مہربان  
نوکر ہیں موردِ پیہ کے دیانت کی راہ سے  
نہ دانہ و نہ کاؤ نہ تیسار نہ ستیس  
ناطقتی کا اس کی کہاں تک کروں بیان  
مانند نقشِ نعلِ زمین سے بجز فنا  
رکھتا نہیں ہے دستِ عنان کا بیک قرار  
ہرگز عراقی و عربی کا نہ تھا شمار  
موجی سے کفش یا کو گنٹھاتے ہیں وہ اُدھار  
خست سے اکثروں نے اٹھایا ہے نگہِ غار  
پاؤں سے منرا جوان کا کوئی نام لے نہ ہار  
گھوڑا بھیں ہیں ایک سواتنا خراب و خوار  
رکھتا ہو جیسے اسپ گلی طفلِ شیر خوار  
فاقوں کا اس کے اب میں کہاں تک کر دں شمار  
ہرگز نہ اٹھ سکے وہ اگر بیٹھے ایک بار

کرتا ہے راکب اس کا جو بازار میں گزرا  
 امیدوار ہم بھی ہیں کہتے ہیں یوں چسار  
 گزرے ہے اس نمط اسے ہر میل دہر نہ ہل  
 دیکھے ہے آسمان کی طرف ہو کے بے قرار  
 چلنے کو انکھیں موند کے دیتا ہے مقہر  
 ہر دم زمیں پہ آپ کو میچے ہے بار بار  
 ہرگز دروغ اس کو تو مت جان زنیہار  
 باد سموم ہو دے دیں گر کرے گزار  
 کھو دے ہے اپنے سم سے کنوئیں ماہیں بار  
 میخیں گر اس کے تھان کی ہو دیں نہ استوار  
 دھونکے ہے دم کو اپنے کہ جوں کھال کو لوہار  
 خارشٹ سے ریسک ہے مجروح بے شمار  
 چنگل سے موزی کے تو چھوڑا اس کو کردگار  
 کہتے ہیں اس کے رنگ کو گسی اس اعتبار  
 اس تین بات سے کوئی جلدی ہو آشکار  
 خوگیر کا بھی سینہ جو دیکھا تو ہے نگار  
 آیا یہ دل میں جانیے گھوڑے پہ ہو سوار  
 مشہور تھا جنھوں کئے وہ اسپ نابکار  
 گھوڑا مجھے سواری کو اپنا دو مستعار  
 ایسے ہزار گھوڑے کروں تم پہ میں نثار  
 یہ واقعی ہے اس کو نہ جانو گے انکار  
 سیرت سے نت ہے جس کی سگ خشکین کو عار  
 بدی میں یہ کہ اہل اوجہ کرے ہزار  
 لاجنب وہ زیں سے ہے چوں میخ استوار  
 دجال اپنے منہ کو سیہ کر کے ہو سوار

اس مرتبہ کو بھوکے پیہا ہے اس کا حال  
 قصاب پوچھتا ہے مجھے کب کرو گے یاد  
 جس دن سے اس قصابی کی کھوٹی بندھا ہے وہ  
 ہر روز اختروں کے تین دانہ بوجھ کر  
 تنکا اگر پڑا کہیں دیکھے ہے گھانس کا  
 خط شعاع کو وہ سمجھ دستہ گیاہ  
 پیدا ہوئی ہے تپہ آگن باد اس قدر  
 گزرے وہ جس طرف سے کبھو اس طرف نسیم  
 دیکھے ہے جب وہ تو بڑھو تھان کی طرف  
 ہے اس قدر ضعیف کہ اڑ جائے باد سے  
 نہ استخوان نہ گوشت نہ کچھ اس کے پیٹ میں  
 سمجھا نہ جائے یہ کہ وہ ابلق ہے یا سرنگ  
 یہ حال اس کے دیکھ غرض یوں کہے ہے خلق  
 ہرزخم پر زک بھنکتی ہیں مکھیاں  
 لے جا دیں چور یا مرے یا ہو کہیں یہ گم  
 تنہا نہ اس کے غم سے ہے دل تنگ زین کا  
 القصہ ایک دن مجھے کچھ کام مختلف ضرور  
 رہتے تھے گھر کے پاس قنارادہ آشنا  
 خدمت میں ان کی میں نے کیا جایہ التماس  
 فرمایا جب انھوں نے کہ اے مہربان من  
 لیکن کسی کے چروٹنے کے لائق نہیں یہ اسپ  
 صورت کا جس کی دیکھنا ہیگا گدھے کو ننگ  
 بد رنگ جیسے لید ہو بد بوے چوں پیشاب  
 مانند میخ جو کی لکڑی زن ہے تھان پر  
 حشری ہے اس قدر کہ چشہ اس کی پشت پر



اتنا وہ سزگوں ہے کہ سب اڑ گئے ہیں دانت  
 ہے پیر اس قدر کہ جو بکاتے اس کا سن  
 لیکن مجھے زرے تو ارنج یاد ہے  
 کم رو ہے اس قدر کہ اگر اس کی فعل کا  
 ہے دل کو یہ یقین کہ وہ تیغ روز جنگ  
 مانند اسپ خاؤ شطرنج اپنے پاؤں  
 ایک دن گیا تھا مانگے یہ گھوڑا برات میں  
 ہنرے سے خط سیاہ وسیہ سے ہوا سفید  
 پہنچا غرض عروس کے گھر تک وہ نوجوان  
 میٹھا تو اس قدر ہے وہ جو کچھ کہ تم سنا  
 دلی تم ان پہنچا تھا جس دن کے مرہٹہ  
 مدت سے کوڑیوں کو اڑایا ہے گھر میں بیٹھ  
 ناچار ہو کے تب تو بندھایا میں اس پیرین  
 جس شکل سے سوا تھا اس دن میں کیا ہوں  
 چابک تھے دونو ہاتھ میں پکڑے تھا منہ میں ہا  
 آگے توجہ اسے دکھلائے تھا سیس  
 ہرگز وہ اس طرح بھی نہ لاتا تھا روبراہ  
 اس مشن کو دیکھ ہوئے جمع خاص و عام  
 پہنچے اسے لگاؤ کہ تا ہوئے یہ رواں  
 میں کیا ہوں غرض کہ ہر اک اس کی شکل دیکھ  
 کہتا تھا کوئی ہے منبر کو ہے نہیں یہ اسپ  
 کہتا تھا کوئی مجھ سے ہوا تجھ سے کیا گناہ  
 کہنے لگا پھر آگے اسی مجمع میں کوئی شخص  
 سمجھوں ہوں تو یہ کہ سپاہی کے جیس میں  
 اس لمحہ میں تھا ہی کہ ناگاہ اک روز

جبرے پہ بسکھو کروں کی نت پڑی ہے مار  
 پہلے وہ لے کے ریگ بیاہاں کرے شمار  
 شیطان اسی پہ نکلا تھا جنت سے ہوسوار  
 لوہا منگا کے تیغ بناوے کبھو لوہار  
 رستم کے ہاتھ سے نہ چلے وقت کارزار  
 جزدست غیر کے نہیں چلتا ہے زینہار  
 دولہا جو بیاہنے کو چلا اس پہ ہوسوار  
 تھا سر و ساجو قد سو ہوا شاخ باردار  
 شیخو خیت کے درجیے کر اس طرف گزار  
 لیکن اب ایک دن کی حقیقت کہوں میں یا  
 مجھ سے کہا نقیب نے آکر ہے وقت کار  
 ہو کر سوار اب کرو میدان میں کارزار  
 ہتھیار باندھ کر میں ہوا جا کے پھر سوار  
 دشمن کو بھی خدا نہ کرے یوں ذلیل و خوار  
 تک تک سے باغ کے مے پاؤں تھے نگار  
 پیچھے نقیب ہانکے تھا لائے سے مار مار  
 ہٹا نہ تھا زمین سے مانند کو ہمار  
 اکثر مدبروں میں سے کہتے تھے یوں پکار  
 یا بادبان باندھ پون کے دواختیار  
 تیغ زباں سے کاٹ کے کرتا تھا گل نثار  
 کہتا تھا کوئی ہو گا دلایت کا یہ ہمار  
 کتوال نے گدھے پہ تجھے کیوں کیا سوار  
 مرکب نہ یہ گدھا نہ یہ راکب گناہ گار  
 ڈان چلی ہے سیر کو ہو چرخ پر سوار  
 فتنہ کو آسمان نے کیا مجھ سے پھر دو چار

دھوبی کپہار کے گدھے اس دن ہوئے تھے گم  
ہر ایک نے اس کو اپنے گدھے کا خیال کر  
دیائے کشمکش ہوا اس آن موج زن  
بدبھی اُسکی دیکھ کے کر خرس کا خیال  
رکھا تھا کوئی لاکے سپاری کو منہ کے بیچ  
کہتا تھا کوئی مجھ سے کہ تو مجھ کو بھی چسڑھا  
کتے بھی بھونکتے تھے کھڑے اس کے گرد و پیش  
اس وقت میں نے اپنی مصیبت پہ کر نظر  
جھگڑوں میں دھوبیوں سے کہ لڑو تو کو دوں جواب  
بارے دعا مری ہوئی اس وقت مستجاب  
دست دعا اٹھا کے میں پھر وقت جنگ کے  
پہلے ہی گولہ چھوٹے اس گھوڑے کے لگے  
یہ کہہ کے میں خدا سے ہوا مستعد بہ جنگ  
گھوڑا تھا بسکہ لاغر و پست و ضعیف و خنک  
جاتا تھا جب ڈپٹ کے میں اسکو حریف پر  
جب فیکھا میں کہ جنگ کی یہاں اُبھ رہی ہے شکل  
دھر دھمکا وہاں سے لوٹا ہوا شہر کی طرف  
گھوڑے مرے کی شکل یہ ہے تم نے جو سنی  
سن کر تب ان سے میں نے یہ قصدا جواب  
گفتن ہیں بس است کہ اسپ من ابلق است

اس ماجرے کو سن کیا دونوں نے وہاں گزار  
پکڑے تھا دھوبی کان تو کھینچے تھا دم کپہار  
تھا عنقریب ڈوبے خفت سے ایک بار  
لڑکے بھی وہاں تھے جمع تماشے کو بے شمار  
موس کے تن سے کوئی اکھاڑے تھا بار بار  
دوں کا شکا تجھے بھی میں نوچند ایتوار  
ماتھاس سمند خرس نما کے ہو چشم چار  
کہنے لگا خدا سے یہ رورود کے زار زار  
کتوں سے یا لڑوں کہ مروں اپنا پیٹ مار  
واں سے بہر نط کیا جنگ گاہ تک گزار  
کہنے لگا جناب الہی میں یوں پکار  
ایسا لگے یہ تیر کے ہووے جسگر کے پار  
اتنے میں مرہا بھی ہوا مجھ سے آدو چار  
کہتا تھا یوں خفیف مجھے وقت کار زار  
دوڑوں تھا اپنے پاؤں سے چوں طفل نحرار  
لے جوتیوں کو ہاتھ میں گھوڑا بغل میں مار  
القصہ گھر میں آن کے میں نے کیا قرار  
اس پردل میں آئے تو اب ہو جیے سوار  
اتنا بھی جھوٹ بولنا کیا ہے ضرور یار  
سمجھوں گا دل میں اپنے اگر ہوں میں ہوشیار

سودا نے تب قصیدہ کہا سن یہ ماجرا

ہے نام اس قصیدہ کا تضحیک روزگار

ہر چند یہ قصیدہ جو کہ ہے مگر سودا کی قابلیت شاعری اس سے تمام تر آشکارا ہے۔ کوئی مضحک  
بات گھوڑے اور سوار کی نسبت چھوٹ نہیں رہی ہے لیکن اس تضحیک کے ساتھ اس کی نتیجہ خیزی محل گفتگو  
نہیں ہے۔ اکثر بھی ہوتا ہے کہ جو حضرات اپنے گھوڑے کو لگتی دینا نہیں چاہتے۔ کچھ ایسا سنگرا غرضیت کرتے



ہیں کہ فی الفور یہ قصیدہ خیال میں آجاتا ہے۔ اور خاص کر شعر۔

”گفتن ہیں بس است کہ اسپ من البق است“

خیر سودا کی ہونگاری ایسی اعلیٰ درجہ کی ہے کہ اس کے ساتھ ناتوجی کا برتاؤ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس طباع نامہ کی ہجو گوئی میں جو نقصان ہے وہ یہ ہے کہ کلام کبھی کبھی فحش گوئی تک پہنچ جاتا ہے۔ اگر یہ نقصان نہ ہوتا تو سودا کی ہونگاری کسی طرح قابل گرفت نہ تھی کس واسطے کہ ہجو گوئی سے کسی ملک کی نظم یا نثر خالی نہیں دیکھی جاتی ہے۔ ہجو گوئی میں کریمہ مضامین سے اعتنا نہ کرنا واجبات سے ہے۔ ہجو کو ایسا ہونا چاہئے کہ مہذب سے مہذب آدمی بھی اس کے پڑھنے یا سننے سے احتراز نہ کرے۔ سلاطین شاعری جو نیل اور انگریزی نثر نگار سوئٹ (SWIFT) بڑے ہجو گو گزرے ہیں۔ ان کی تصنیفوں کو ہر تعلیم یافتہ آدمی نے دیکھا ہے۔ ان کی تحریروں کے اغراض قابل توجہ ہیں۔ ان کی تحریریں تہذیب خیزی سے معرا نہیں ہیں۔ پس کیونکر ایسی تصنیفات قابل توجہ نہیں سمجھی جاسکتی ہیں۔ البتہ قاتالی کی نثر میں جو جواب گلستاں کے طور پر نکھی گئی ہے۔ جہاں جہاں فحش آئیاں عمل میں آتی ہیں تعلیم یافتہ اشخاص کے تحمل سے باہر ہیں۔ بہر حال اس قصیدہ میں صرف ایک شعر کریمہ مضامین سے مشتمل تھا۔ جو ترک کر دیا گیا اور اسی طرح اگر تمام کریمہ اور فحش مضامین سودا کی دیگر تصنیفات سے متروک کر دیئے جائیں تو اس یکتائے روزگار کے کلام کا حسن دوبالا نظر آئے۔ ظاہر ہے کہ سودا کی طباعی فحش گوئی کی محتاج نہیں ہے۔ اسی قصیدہ کو ارباب انصاف ملاحظہ فرمائیں کہ کس قدر طبیعت داری اور خلاق سخن سے خبر دیتا ہے۔ اور اسی سے سودا کی ہمہ دانی کس قدر نمایاں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دانائے روزگار کو اپنے ملک کے ہر کئی اور جزوی امر سے اطلاع کامل حاصل تھی۔ ایسا قصیدہ وہی نکھے گا جو اپنے ملک کے ہر طبقہ کے آدمی اور ان کی معاشرت اور ان کے رسم و رواج سے پورے طور پر باخبر ہوگا۔ پھر اس قصیدہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دلی کے شاہی رسالہ کا یہ حال ہو رہا تھا کہ گھر بیٹھے تنخواہ پایا کرتے تھے۔ تو اندر پر بیٹے کوئی علاقہ نہیں رکھتے تھے۔ جب غنیم نمودار ہوتا تھا تو نقیب انھیں لڑائی پر جانے کو کہہ آتا تھا۔ سبحان اللہ کیا لشکر آرائی تھی۔ کوئی اس عہد کے سرکاری رسالوں کو دیکھے کہ گورے اور کالے سوار کس نہج سے رکھے جاتے ہیں اور کیوں کر انجام خدمت کرتے ہیں۔ آخر میں عرض راقم یہ ہے کہ حضرات ناظرین اس قصیدہ کی ترکیب پر نظر فرمائیں۔ کہ شاعر گھوڑے کی بد حالی کو شاعرانہ پیرایہ میں بیان کر کے ملک اسپ سے اس کی برائیوں کو افراط مبالغہ کے ساتھ کہلاتا ہے۔ پھر مالک کو الزام دروغ گوئی دے کر خود حقیقت حال کہہ دیتا ہے۔ واقعی ذہانت، دکاوت، طبیعت داری، سخن آفرینی، ہمدانی سودا پر ختم ہے۔ ان صفات سے متصف یا فاسد ہیں

سعدی تھے یا انگلستان میں شکسپیر جب ہزار برس نانہ چرخ کھاتا ہے تب دوچار شخص ایسی ترکیبوں کے وجود میں آئے ہیں۔

## ذوقِ ہمیشیت قصیدہ گو

مزارِ رفیع سودا کے بعد قصیدہ گوئی میں شیخِ ابراہیم ذوق ہی کا نمبر ہے۔ مگر ان دونوں شاعران نامی میں پہاڑ اور ٹیلے کا فرق ہے۔ ذوق میں ایک ربیع بھی سودا کی طبیعت داری نہیں ہے سودا ایک نیچرل شاعر تھے۔ ان کی فطری نگاری کی ہوا بھی ذوق کو نہیں لگی تھی۔ ذوق کی مضمون آفرینی کوئی شک نہیں کہ ایک ممتاز درجہ کی ہے۔ مگر یہ مضمون آفرینی اس قسم کی ہے کہ جو ایک درباری شاعر کے لیے درکار ہوا کرتی ہے حضراتِ ناظرین ملاحظہ فرمائیں کہ ذوق کے چوبیس قصیدے ہیں۔ مگر ایک بھی فطری شاعری کی داد نہیں دیتا ہے سب کے سب مصنوعی ترکیبوں سے معمور نظر آتے ہیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر ذوق کو درباری تعلق نہ ہوتا تو ان کی شاعری کچھ نہ کچھ نیچرل رنگ نکالتی۔ مگر خدمتِ شاہی کے کبھی سے انہیں اتنی بھی فرصت نہ مل سکی کہ ایک قصیدہ بھی اپنے پیشوائے دینِ صلح کی شان میں یادگار چھوڑ جاتے حقیقت حال یہ ہے کہ جس دماغ سے ذوق عمر بسر کرتے تھے وہ فطری نگاری کے بہت منافی تھی بہت جاتے افسوس ہے کہ ایک اتنے بڑے طباع کی زندگی ایسی بد حالی سے بسر ہوگئی۔ بایں ہمہ اگر ذوق کو آزادی حاصل رہتی اور فطرتِ نگاری کے سامان بہم رہتے۔ تو نیچرل شاعری سے ان کی قصیدہ نگاری کو اس قدر بے تعلقی نہ ہوتی۔ واضح ہو کہ راقم کو ذوق کی خلاقیت سخن میں کوئی گفتگو نہیں ہے۔ بلاشبہ اس شاعر گرامی کی فکر بہت عالی ہے۔ بندشِ مضامین۔ استماندہ ہے۔ اور روشن ادائے مطلب کی خوب و مرغوب ہے۔ مگر وہ دل آویزی جو نیچرل کلام کی ہوا کرتی ہے اس کا جلوہ کسی قصیدہ میں نمایاں نہیں ہے حضراتِ ناظرین پر ہوتا ہے کہ یہ رائے محض شخصی ہے۔ ممکن ہے کہ راقم نے اس کے قایم کرنے میں دھوکا کھایا ہو کس واسطے کہ کسی اہل رائے کی تحریر یا تقریر سے راقم کو ان امور میں کسی قسم کی مدد نہیں ملی ہے۔ یہ بھی اربابِ نظر سے پوشیدہ نہیں ہے کہ ہندوستان بلکہ فارس میں بھی شعرا کے کلاموں پر رائے زنی نہیں کی جاتی ہے۔ اس وقت تک جو تذکرے فارسی یا اردو کے فقیر کے نظر سے گزرے ہیں۔ ان سے کسی شاعر کے حسن و قبح کلام کا پتا نہیں لگتا۔ مثلاً کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ خاقانی اور اوردی کے قصائد کے امتیازی حسن و قبح کیا ہیں۔ یا بلالی اور سیلی کی غزل سرائیوں میں کون شے ممیز کرنے والی ہے اسی طرح اردو کے شعرا کی نسبت کوئی تالیف یا تصنیف ایسی نہیں دیکھی جاسکتی ہے کہ مثلاً غالب اور مومن



حوالہ قلم کیا ہے اس کا منشا خوشی نیتی کے سوا دوسرا نہیں ہے کبھی اس نے بددیانتی، دل آدادی، بدخواہی، حق فراموشی، حق تلفی، حق پوشی کو دیدہ و دانستہ اپنی تحریر میں جگہ نہیں دی ہے۔ اس معذرت کے ساتھ راقم ذیل میں تصائد ذوق کے استجابات مع اپنی آنادانہ رائے کے ملحد ناظرین کرتا ہے۔

### نمبر ۱: تشبیب قصیدہ در مدح اکبر شاہ صفحہ ۲۹۷ دیوان ذوق

سحر جو گھر میں بہ شکل آئینہ تھا میں تنہا نزار و حیراں  
تواک پری چہرہ، حور طلعت، چمکل بلقیس، ماہ کنعاں  
پری کی صورت، چمن کی رنگت، اگر اس کا شیوہ تو اسکا جلیج  
زبان شیریں، بیان رنگیں، کلام رنداں، خرام مستان  
انیس خلوت جلیس سے جلوت، حریت حکمت، ظرف محبت  
یہ بزم یاراں، بہ دل بہاراں، باہل عزت، گلے بداماں  
جبیں بشکل مہ منور، عرق کے قطرے ہیں اس میں اختر  
ہلال ابرو نگاہ جادو، خدنگ مژگان و چشم فقاں  
بروئے رنگیں، نگار بستاں، شگوفہ خنداں گمر نہ خنداں  
بموسے بیچان سے عشق بیچاں، جو ہیں پریشاں تو دل پریشاں  
وہ گوش پر زرب کجکلا ہی، جو دیکھی بینی تو یا الہی، یا  
دہن میں غنچہ لبوں میں گل برگ روئے روشن ہیں مہرباں  
نگاہ ساغر کش تماشا، بیاض گردن، صراحی آسا  
وہ گول بازو، وہ گورے ساعد و ہنجرہ رنگین بخون مرجاں  
مگر نزاکت سے پکلی جائے، کہ ہے نزاکت کا بار اٹھائے  
اداس پہ سو نور لہر کھائے پھر اس پہ ہیں دو قمر فروزان  
وہ مان روشن، وہ ساق سین، وہ پائے نازک حنا میں رنگیں  
وہ قد قامت، وہ فتنہ قامت، دلوں پہ شامت، جو ہونزراں  
جونا پوچھا، کہا خوشی ہوں جو وصف پوچھا، تو دلبری ہوں  
بہت جو پوچھا تو منکے بولا کہ ذوق تو بھی عجب ہے ناداں

کی غزل سرائی کا فرق دکھلائے یا ان کے کلاموں کے حسن و قبح کو واضح طور پر بتلائے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فن جیسے انگریزی میں کمری ٹی سیزم (CRITICISM) کہتے ہیں۔ فارسی اور اردو میں نہیں مروج ہے۔ یہ وہ فن ہے کہ جو سخن سخنوں کی کیفیت کلام سے بحث رکھتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص دریافت کرنا چاہے کہ پوپ POPE جو ایک انگریزی شاعر ہے کس قابلیت کا سخن بنیگا۔ تو اس کی شاعری کا ایک پورا آزادانہ بیان انگریزی تصانیف میں ملے گا۔ یہ کیفیت فارسی اور اردو کے تذکروں کی نہیں ہے۔ ان ایشیائی تذکروں میں اگر دس نامی شاعروں کے کلاموں کی حقیقت کو دریافت کرنا چاہئے۔ تو سب کی تعریف کمال مبالغہ پر دازی کے ساتھ ایسے انداز سے حوالہ قلم نظر آئے گی کہ کچھ سمجھ میں نہ آئے گا۔ کہ جاسم کیا تھے اور نظامی کیا تھے۔ یا ناسخ کیا تھے اور راسخ کیا تھے۔ یہ تو تذکرہ نگاری کی حالت ہے تقریظ نگاری کی حالت پر نظر ڈالیے تو یہ بد مذاقی اور بے عنوانی تحریر کا دیا امداد کھائی دیتا ہے۔ اگر کسی طفل دبستان نے بھی ایک جزو کا دیوان ترتیب دیا ہے یا چار ورق کی مثنوی لکھی ہے تو اس کے تقریظ نگار نے اسی فریبی سعدی، حافظ، انوری بنا چھوڑا ہے۔ مختصر فارسی یا اردو میں کوئی ایسی تصنیف فقیر کی نظر سے نہیں گزری جو کسی شاعر کی سچی اور واقعی کیفیت شاعری سے خبر دے۔ خدا جانے واقعہ نگاری میں ان دونوں نباؤں کے مصنفین کیوں پس پا نظر آتے ہیں۔ اور افسوس ہے کہ اب تک اس کی اصلاح کی تعریف کسی صاحب علم و صاحب رائے نے توجہ نہیں کی۔ امر بالا کے متعلق فقیر ایک اپنی مایوسی کی سرگزشت عرض کیا چاہتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جب اس عاجز کو معلوم ہوا کہ دیوان ذوق کو شمس العلماء جناب مولوی محمد حسین صاحب آزاد نے کچھ اپنی تحریر کے ساتھ چھپوایا ہے۔ تو یہ امید ہوئی کہ ضرور مولانا نے ممدوح کے انگریزی ترکیب پر اس شاعر نامی کے کلام پر رائے زنی بھی فرمائی ہوگی۔ اس شوق میں ایک نسخہ اس کا دستیاب کر کے شروع سے آخر تک پڑھ ڈالا۔ مگر کہیں سے یہ نہیں معلوم ہوا کہ ذوق داخلی شاعر تھے یا خارجی۔ ان کی غزل سرائی تقاضائے غزل سرائی کے مطابق ہے یا نہیں، ان کی قصیدہ گوئی مناسب رنگ رکھتی ہے یا نہیں۔ انھیں فطرت نگاری کی قدرت حاصل تھی یا نہیں۔ ان کی خلاق سخن اعلا درجہ کی تھی یا نہیں۔ اسی طرح یہ بھی نہیں معلوم ہوا کہ ان میں اور میر، مومن، غالب، آتش، ناسخ میں کیا فرق ہے۔ سودا اور دیگر قصیدہ گو شعرا کو ان کے ساتھ کیا مناسبت ہے۔ الغرض مولانا کا وہ مشرح دیوان کچھ اور ہی مطلب کا نکلا۔

مختصر جب کوئی تصنیف راقم کے مفید مطلب نظر نہیں آتی ہے تو جو کچھ اس کتاب میں اظہار رائے کیا جاتا ہے۔ وہ محض شخصی امر ہے۔ اگر حضرات ناظرین اس عاجز کو برسر خطا پاویں تو اپنی کرمی سے درگزر فرمائیں۔ اس جگہ پر راقم اس امر کو بھی عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہے کہ جو کچھ اس نے بسبیل رائے زنی



وہ شاہ جو ہے محمد اکبر، جہاں میں رشک ہم و سکندر  
جلوس جشن اس کا ہے فلک اسی کے پرتو ہیں سب سماں

یہ سنتے ہی میں نے بالیداشت لکھا وہ مطلع شفق شباہت  
کہ جس کو اس کہے سخنور پڑھے تجسین ہر اک سخنداں

ارباب مذاق و احظ فرمائیں کہ اس تشبیب میں ذوق نے اسی مضمون خوشی کو موزوں کیا ہے جسے سودا  
نے اپنے اس قصیدے کی تشبیب میں نظم کیا ہے جس کا مطلع یہ ہے:  
صبح ہونے جو گئی آنکھ میری آج چھپکٹ  
دی خوشی نے وہیں آکر در دل پہ دستک

اب اہل نظر منصفی فرمائیں کہ سودا نے کسی طباعی کے ساتھ اپنی اشعار تشبیب میں خوشی کی تصویر کھینچی ہے  
اس نے اپنے بیان سے خوشی کو ایک مجسم باجان نئے دکھلایا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خوشی ایک معشوقہ  
و لفریب ہے جو پیش نظر کھڑی ہے شاعری اتنی بھی تو ہو کہ غیر مجسم کو مجسم اور بے جان کو جاندار کر کے دکھائے۔  
ذوق نے سودا کے اسی خیال خوشی کو حوالہ قلم کیا ہے مگر خوشی کی تصویر نہیں کھینچ سکے ہیں۔ اس میں جان کا داخل  
کرنا تو خارج از بحث ہے۔ یہ دونوں تشبہیں سودا اور ذوق کی شاعریوں کا خوب فرق دکھاتی ہیں۔ ظاہر  
ذوق کے اشعار پر زور ہیں شوکت لفظی اعلیٰ درجہ کی رکھتے ہیں۔ بندش چست ہے۔ ترکیب درست ہے۔ یہ  
سب کچھ سہی مگر خوشی شاعری کی جان ہے۔ وہ سودا کے اشعار میں ہے۔ ذوق کے اشعار میں نہیں ہے۔  
حقیقت یہ ہے کہ جب تک شاعری مصوری کا تماشا نہیں دکھاتی ہے بلکہ جب تک جان آفرینی کا کمال  
اس سے نمایاں نہیں ہوتا تب تک شاعری شاعری کا حکم نہیں رکھتی ہے۔ ذوق کا بیان خوشی زیہنہا ایسا نہیں  
ہے کہ خوشی کو ایک مجسم اور ذی جان پیرا میں دکھاتا ہے۔ شاعر کا یہ کام ہے کہ اگر غیر مجسم شے کو مجسم  
کر کے دکھانا چاہتا ہے تو مجسم کر کے دکھاوے اور بے جان کو باجان بنانا ہے تو اعجاز بیانی سے باجان بنانا  
ملٹن نے گناہ اور موت کا بیان کیا ہے اس کے بیان نے گناہ اور موت کو باجسم اور باجان کر کے  
دکھایا ہے صاف معلوم ہوتا ہے کہ گناہ اور موت دو مجسم باجان شے ہیں۔ شاعری اس کو کہتے ہیں ایسی  
طرح میر انیس کے اس مصرع سے:

جب زلف کو کھولے ہوئے یلائے شب آئی  
ہات درک ہوتا ہے کہ شب کوئی مجسم اور زندہ شے ہے۔ حالانکہ شب مجسم رکھتی ہے نہ جان۔

## نمبر ۲: تشبیب قصیدہ غسلِ صحت صفحہ ۳۴۹ دیوانِ ذوق

واہ وا کیا مستدل ہے باغِ عالم میں ہوا  
بھرتی ہے کیا کیا میحائی کا دم بادِ بہار  
ہے گلوں کے حق میں شبنمِ مرہم زخمِ جگر  
ہو گیا موقوف یہ سودا کا بالکل اختراق  
ہو گیا زائل مزاجِ دہر سے یاں تک جنوں  
ہوتا ہے لطف ہوا سے اس قدر پیدا ہو  
پانی یہ اصطلاح صفرانے کہ دنیا میں کہیں  
ہر مزاجِ طبعی میں ہوتی ہے تولیدِ خوں  
نام کو اسکیا میں تلخی رہی نہ سمیت  
کیا عجب جدوار کی تاثیر گر رکھے زقوم  
مینیش کی جانوش ہے دنبالہ زنبور میں  
راحت و آرام کا اس دور میں ہو دور دور  
موتا بند آنکھ میں اپنے جو کھتی تھی صدف  
اگیا اصلاح پر ایسا زمانے کا مسزاج  
نفس پر لکھنے نہ پاتا ہوا شافی طبیب  
فرق چاہا یاں تک اعضائے بدن سے دینے  
لاغروں کو ہو کمال تاب و طاقت یہ شتاب  
صبح صادق کے ہے گو سر میں پید ی آگئی  
بھوک کی شدت سے اسکو اک نفسِ فرصت ہو  
رات بھر لوٹا گیا انجم کے دانے چرخِ پیر  
پہنچی یہ تہنیتیج کی نوبت کہ نوبتِ خانہ میں  
کوس پھولا ہے خوشی سے نفع کا کیا فعل ہے  
ہضمِ کامل اس قدر مدد سے نے پہنچایا بہم

مثلِ بنفص صاحبِ صحت ہے ہر موجِ صبا  
بن گیا گلزارِ عالم رشکِ صد دارالشفاء  
شاخِ بشکتہ کو ہے باران کا قطرہ مومیا  
لالہ بے داغ سیہ پانے لگا نشوونما  
بیدِ محنوں کا بھی محرا میں نہیں باقی پتا  
برگ میں ہر نخل کے سرخی ہے جوں برگِ حنا  
زرد چشم اب دیکھنے کو بھی نہیں ہے کبریا  
چاندنی کا پھول ہو کر ارغوانی ہے بجا  
بن گئی تریاقِ افیون زہرِ میٹھا ہو گیا  
کیا عجب گر آبِ حنظل دیوے شربت کا مزا  
کام میں انہی کے ہو مہرہ بجائے ابلا  
چاہئے واقف نہو دورانِ سر سے آسیا  
اب رکھی ہے روشنی مثلِ دلِ اہل صفا  
تاز بانِ خامہ بھی آتا نہیں صرف دوا  
کہتا ہے بیمار بس کر مجھ کو ہے بالکل شفا  
درد کے جو حزن ہیں وہ آپ ہی ہیں سب جدا  
کیسے دو مہنتے ہلال اک شب میں ہو بدرالدجا  
لیکن اس پیری میں بھی صادق ہے ایسی اشتہا  
قرض سے خورشید سے جب تک نہ کرے ناشتا  
پھر جو دیکھا صبح کو اصلاً شکم میں کچھ نہ تھا  
لیتی ہے جی کھول کر کیا کیا ڈکاریں کرتا  
جوں احباب اس کے نہیں مطلق شکم میں امتلا  
جید الکیموس ہے جو خلق سے اتری غذا



ہے مزاج اہل عالم یہ قسریب اعتدال      ساتوں اقلیمیں ہیں گویا اب بظنا استوا  
 رکھے گا تنوید اور گنڈا کوئی کیوں اپنے پاس      باغ عالم میں یہی عالم جو صحت کا رہا  
 دیگا طاؤس اپنے ال و پر سے سارے نقش و      پھینک دے گی توڑ کر گنڈا گلے سے فاختہ  
 اس قدر جاتی رہی عالم سے بیماری کہ آج      نام گلشن میں نہیں ہے نرگس بیمار گارگا  
 واقعی کس طرح سے صحت نہ اک عالم کو ہو      جبکہ ہو اس کی نوید غسل صحت جاں فزا

وہ ولی عہد زماں سرزا محمد بو ظفر

اس کی قوت گر ضعیفوں کو بنادے اقویا

کوئی شک نہیں کہ اشعار بالا بہت خوب ہیں۔ ذوق کی اطلاع عام سے خبر دیتے ہیں اور ہر چند  
 نیچرل پسند یہ نہیں رکھتے۔ اس پر بھی درباری مذاق کے اعتبار سے ایسے ہیں کہ بہت کچھ قابل تعریف  
 و توصیف ہیں۔

### نمبر ۳۔ قصیدہ مداح صفحہ ۳۵۲

جس کا مطلع یہ ہے:-

شب کو میں اپنے سر بستر خواب راحت      نشہ علم میں سرمست غم سرور نخوت  
 واضح ہو کہ یہ قصیدہ بہت طولانی ہے۔ اس کی گنجائش اس کتاب میں نہیں نظر آتی۔ اس لیے  
 راقم صرف اپنے خیالات اس قصیدہ کی نسبت ذیل میں عرض کر دیتا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ ذوق نے  
 اچھی مضمون خیز طبیعت پائی تھی۔ یہ قصیدہ ان کی انتہائے قوت شاعری سے خبر دیتا ہے۔ اس  
 سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ ان کی درسی اطلاع ایک ممتاز درجہ کی ہے۔ واقعی علوم کی فہرست  
 خوب تیار کی ہے۔ گو اس میں اظہار شاعری بہت نہیں ہے۔ پھر اس علم شماری کا نتیجہ اس قدر  
 مستخرج ہوتا ہے کہ بے قسمت علم سے کچھ فائدہ مترتب نہیں ہوتا۔ یہاں پر ذوق کی فکر نے لغزش کی ہے۔  
 کاش ذوق حصول علم کا نتیجہ کچھ معقول طور پر دکھاتے۔ ایسی تقریر سے انسان کو علم اندوزی کی طرف  
 توجہ نہیں ہو سکتی۔ ایسی تقریر تو سرا سر منافی علم اندوزی ہے۔ مگر درباری شاعر ہونے کے باعث ذوق  
 معذور تھے۔ ان کو باوجود حاصل رہنے تمام علوم دنیا و دین کے بادشاہ کے رو برو تھی۔ قسمت اپنے  
 کو دکھانا ایک امر مجبوری تھا۔ لاریب آزاد شاعر علم کو محتاج قسمت نہیں دکھا سکتا۔ صاحب علم ہونا  
 خود ایک بڑی خوش قسمتی ہے۔ جیسا کہ امیر المومنین فرماتے ہیں :

لا فضل الا لاهل العلم انهم على الهدى لمن استهدى اولا فقم بعلم ولا تبغى له بدلا ظالما  
 موی و اهل العلم احیاء۔ بہر حال یہی قسمتی کے بیان طویل کے بعد ذوقِ جوئیذ بہجت کا مضمون رقم فرماتے  
 ہیں وہی سودا کا گرہا ہوا مضمون ہے۔ اس میں کوئی جدت کا پہلو نظر نہیں آتا۔ جس طرح سودا کی آنکھ لگ  
 گئی اور خوشی سامنے آکھڑی ہوئی۔ اسی طرح ذوق کی آنکھ بند ہوتے ذوق کے روبرو نوید بہجت حاضر  
 آئی۔ اس نوید بہجت کو مجسم پیرا۔ میں ذوق نے بڑے زوروں کے ساتھ بیان کیا ہے۔ بیان کیسا ہی ہو  
 مگر سودا کے مع سے خالی نہیں ہے۔ لیکن اس کے ساتھ انہماک یہی ہے کہ پھر ذوق ہی کا کام تھا کہ  
 سودا کی راہ میں قدم مار کے۔ اس نتیجے کی بدولت بے شک ذوق نے نوید بہجت کو مجسم کر کے دکھا دیا مگر  
 اتنی کسر یہ گئی کہ جسم میں جان نہ دے سکے۔ بیان نوید بہجت کے بعد جو مدحیہ اشعار ہیں وہ دبائی شاعر  
 کے حساب سے اچھے ہیں۔ ارباب مذاق صحیح پران کا بار ملاحظہ ہو تو ہو۔

### نمبر ۴۔ تشبیب قصیدہ مدح صفحہ ۳۷۸ دیوان ذوق

ہے آج جو یوں خوش نما نور سحر رنگ شفق	پر تو ہے کس نور شید کا نور سحر رنگ شفق
یہ جوش نسرین و سمن پہ لالہ و گل کا چمن	گلشن میں گویا چھا گیا نور سحر رنگ شفق
ہر سرو قد غنچہ دہن زیب چمن شان چمن	ہر سبر گل گوں قبا نور سحر رنگ شفق
لب پر بسم ہے کہ ہے جوس بہار و موع گل	دندان پان خویہ میں یا نور سحر رنگ شفق
افشاں جبین پر سبر بہت تاب و انجم جلوہ گر	اور گورے ہاتھوں حنا نور سحر رنگ شفق
ہر مجمع پیر و جوان اک طرفہ مشرق سے کہ داں	روشن دل و رنگیں ادا نور سحر رنگ شفق
جام بلورین میں ہے یوں عکس شراب لالہ گوں	ہو جیسے کیفیت فزا نور سحر رنگ شفق
دیکھے چمن میں برگ گل آلودہ شبنم جو گل	نخلت سے پانی ہو گیا نور سحر رنگ شفق
ہے شوق کو بالیدگی ہے ربط کو چسپیدگی	کس رنگ ہوں ملکر جدا نور سحر رنگ شفق
ساقی مئے عشرت سے بھرنا غر کہ ہے اس رنگ پہ	آب و ہوا جلئے فضا نور سحر رنگ شفق

جشن بہادشاہ ہے روز غلو جاہ ہے

ہے اس لیے بہجت فزا نور سحر رنگ شفق

یہ قصیدہ ایشیائی خیالات شاعری کے اعتبار سے جو کچھ پر مضمون سمجھا جائے ورنہ حقیقت  
 اس کو خوبی مضامین سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ بدلیف کی خوشنمائی نے جو کچھ اس کی شہرت پھیلانی ہو۔



ورنہ اس میں مضمون آوری بہت کم ہے۔ اس قصیدہ میں نہ کوئی حکمت آموز بات ہے اور نہ کوئی فطرت نگاری کا کوئی لطف ہے۔ قصیدہ گوئی کی غرضیں تو تمام تر فروت ہیں۔ الایہ کہ تعلیم یافتہ دماغوں کو خوش کرنے کا اچھا آلہ ہے۔ اسی سے ایشیائی درباروں کے مذاقوں کو سمجھنا چاہئے کہ وہاں شاعری سے کیا نئے مراد لی جاتی ہے۔ اور وہ کیسی شاعری ہے جس کی قدر کی جاتی ہے۔

### نمبر ۵۔ تشبیب قصیدہ مدح ۲۸۴ دیوان ذوق

لا آتا ہے نیرنگ سے بے رنگ ہے چرخ میل  
وہ بگڑا ہے کچھ اس خم میں عجب رنگ سے نیل  
دُر زمانہ سے وہ عیار ہے یہ ہوش ربا  
لاکھ ہوشیوں سے جس کی بھری ہے زنبیل  
ہے توکل کا احاطہ وہ غریمت کا حصار  
کہ بجز حفظ خدا جس کے نہ خندق نہ فیصل  
گم ہوں ظاہر کی خرابی سے صفات اصلی  
رنگ دیتا ہے چھپا جو ہر شمشیر اخیل  
پیش دشمن نہ گزرتی سے نہیں سلج کو آہنخ  
بلکہ ہے آتش نورد گلستان خلیل  
ہوتے سیرت سے ہیں مردان دلاور ممتاز  
ورنہ صورت میں کو کچھ کم نہیں شہباز سے چیل  
نہیں بے قید علاتی کسی عالم میں بزرگ  
رسم تحریر میں بھی چھوٹے نہ زنجیر سے فیل  
ہے تہر خاک بھی قارون کو سفر حشر تلک  
نہیں ماتحت ثمری منزل آرام بخیل  
عید اک روز جہاں میں رمضان ہے یک ماہ  
بعد ہے کثرت تکلیف کے یا عیش قلیل  
کشت مہر فلک دون ہے نہ رکھ چشم مثر  
خوشہ فیض سے بے بہرہ ہے یہ مزرع نیل  
قابل انسان کی محبت کے ہے انسان نہ ملک  
بن گیا پیش بنی صورت دھیا جہری  
جتنا خورشید ہے اتنی ہی بارش ہو سوا  
عشق کھینچوائے ہے اک نابغہ فاش سے بزور  
ہو دے کیونکر تپش عشق نہ رحمت کی دیل  
نہ لگے چرخ کو گزرا لہ عاشق کی ہوا  
بارہ کوہ الم بے عمل جبر تغیل  
شمع کشتہ کے لیے ہے دم عیسیٰ آتش  
دم میں اجزائے دفائی کی طرح ہوں تھیل  
معتبر ہے جو کرے نالہ دل درد اظہار  
سوز عشق سے زندہ ہوں محبت کے قلیل  
دل کے ہے ایک ورق میں وہ حقیقت ساری  
نالہ ہے دل کی زباں دل ہے موکل کیل  
دل کے ہے ایک ورق میں وہ حقیقت ساری  
جس کا اجمال قضا اور قدر ہے تفصیل

جی میں ہے اور پڑھوں میں کوئی مطلع ایسا  
گوہر مخزن معنی سے جو بس کی تاویل

اس قصیدہ کے اشعار تشبیب ویسے ہیں کہ جیسا اشعار تشبیب کو ہونا چاہئے۔ ان میں کچھ اقوال حکیمانہ اور محققانہ بھی ہیں۔ پھر شاعری کا پیرایہ بھی اچھا رہا ہے۔ مزید برآں کلام احاطہ غزلیت سے بھی نکلا ہوا ہے۔ ان اشعار کا رنگ بعض عربی قصائد کے اشعار کا رنگ رکھتا ہے۔ اکثر عربی قصائد کے اشعار تشبیب بکار آمد مضامین سے مشتمل ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ متنی کے اشعار تشبیب بھی حکیمانہ اور محققانہ مضامین سے خالی نہیں ہوتے۔ فقیر کی دانست میں اتنے بکار آمد مضامین ذوق کے اور کسی قصیدہ میں نظر نہیں آتے۔

واضح ہو کہ قصائد بالا کے علاوہ اور بھی چند قصائد ذوق کے ایسے ہیں کہ توجہ طلب ہیں۔ ایشانی مذاق کے رو سے تو لاریب ذوق کے یہ سب قصائد اس شاعر نامی کی بڑی خلاق سخن طبیعت داری عالی پروازی اور بلند خیالی سے خبر دیتے ہیں مگر سچی شاعری کے تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر جو ان کا موازنہ کیجئے تو ان میں چند نقصانات پائے جاتے ہیں۔ اول یہ کہ شاعری کو جو آزادی خیالات دیکر ہے ان میں نہیں ہے۔ دوم یہ کہ ان میں معاملات فطرت کا جلوہ کہیں نظر نہیں آتا۔ سوم یہ کہ ان میں ایسے اقوال کہ مفید اخلاق و تمدن معاشرت ہوں کمتر پائے جاتے ہیں۔ چہاں یہ کہ ان میں ایسے مضامین مغفود ہیں کہ جن سے مذاق شاعری کی اصلاح مقصود ہو۔ بہر حال ان سب نقصانات کی معذرت استاد ذوق کی طرف سے صرف ایک جملہ کے ذریعہ سے کی جاسکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت کو افتاد وقت سے درباری شاعر بننا پڑا تھا۔ ورنہ جو قابلیت شاعری حضرت کو مودعہ تھی اس قابلیت کا شاعر ایک آزاد ملک میں بہت کچھ بکار آمد تصانیف سے شاعری کو زینت اور قوم کو عزت دے سکتا ہے۔ اس جگہ ایک امر بہت قابل لحاظ ہے کہ ہر چند تقریباً ہی سے حضرت کی شاعری کو بڑا نقصان پہنچا۔ مگر ان کے فانی معاملات اور اخلاق میں کوئی فساد واقع نہ ہوا۔ ذوق جس طرح کے سچے خوش نیت قانع خدا پرست آدمی تھے تا دم مرگ رہے۔ ان کی قناعت ایک ممتاز درجہ کی تھی۔ ظاہر ہے کہ جس دربار سے ان کو تعلق تھا وہ غایت بد حالی میں مبتلا ہو رہا تھا۔ ناچار ان کو ایک قلیل رقم تنخواہ کے طور پر وصول ہوا کرتی تھی۔ اس پر بھی انہوں نے شاہ نصیر کی چال نہیں اختیار کی کبھی ملک دکن کا مسند نہ دیکھا۔ دہلی میں رہے اور دہلی میں مرے۔ اگر شاہ صاحب کی طرح جادۂ قناعت سے قدم باہر نکالتے تو شاہ صاحب سے زیادہ مال دنیا حاصل کر لیتے۔ اس واسطے کہ درباری شاعری میں ان کو شاہ صاحب سے بہت زیادہ دخل تھا۔ لیکن ذوق نے اس قناعت کو نہ چھوڑا۔ جیسا کہ خود فرماتے ہیں:

گرچہ ہے ملک دکن میں ان دونوں قدر سخن کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر



واضح ہو کہ شاہ نصیر کے متواتر سفر دکن اختیار کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے زمانہ میں ملک دکن ایک اچھا نڈ اندوزی کا میدان تھا۔ یہ وہی زمانہ ہے کہ جس وقت راجہ چندو لعل کی اول جلول فیاضی برسر طغیان تھی۔ لیکن اس عہد میں بھی ملک دکن کچھ کم مرجع اہل حاجت نہیں ہے۔ ہزاروں بے روزگار اب بھی بشکل امیدوار آتے جاتے ہیں۔ اور ہزاروں بیرونی اشخاص سرکار دکن سے تعلق خدمت رکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب سے افلاس میں مسلمانان ہند مبتلا ہو رہے ہیں۔ اگر یہ ریاست نہ ہوتی تو بہت سے ایسے نوکر پیشہ لوگوں کو جن کو انگریزی نوکری کا بلنا معلوم اوقات بھری کی صورت سخت دشوار ہو جاتی۔ واقعی یہ ریاست بہت فیض رساں ہے۔ مگر اس کی فیض رسائی سے ہم مسلمانوں کی بد حالی کا پتا خوب لگتا ہے۔ اس کی فیض رسائی کہہ رہی ہے کہ اے مسلمان ہند تم اپنے دیاروں کے غیر اقوام سے قابلیت میں بہت پیچھے پڑ گئے ہو تب تو میرے ہاں روٹی ڈھونڈھنے آتے ہو۔ خدایا کاش وہ دن ہم کو جلد نصیب ہو کہ ہم لوگ کافی طور پر میرا یہ قابلیت حاصل کر کے اکتساب معاش میں اپنے ہم وطن غیر اقوام کے برابر ہو جائیں۔ بلکہ ان سے بڑھ جائیں۔ تاکہ ہم کو دکنیوں کے حقوق کو غصب کرنے کی محتاجی باقی نہیں رہے۔

## قطعہ

قطعہ۔ عروضی ترکیب اس صنف شاعری کی وہی ہے جو قصیدہ کی ہے۔ الا یہ کہ اس صنف شاعری میں ہمیشہ مطلع ندارد ہوتا ہے۔ اودا شعار کے عدد چار سے کم نہیں ہوتے۔ مضامین کے اعتبار سے یہ صنف شاعری ایک املا درجہ رکھتی ہے۔ اس کے مضامین کو مسائل اخلاق، وحکمت پر مشتمل ہونا چاہئے۔ قطعہ نگاری کا تقاضا یہی ہے۔ مگر بعض شعرا نے اس صنف شاعری کو سبب مضامین کی بندش سے درجہ ابست ذال کو پہنچا دیا ہے، واضح ہو کہ قطعہ نگاری کے لیے داخلی شاعری درکار ہے۔ چنانچہ فارسی اور اردو کے جتنے عمدہ قطعات ہیں اسی پہلو کے مضامین سے مزین نظر آتے ہیں۔ مگر اس جگہ ایک امر قابل غور یہ ہے کہ قطعہ نگاری میں شاعر کو یہ بات ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہئے کہ اس کا کلام غرملیت کا رنگ پیدا نہ کرے۔ الا اس حال میں کہ قطعہ بند اشعار وہ کسی غزل میں موزوں کرنے کو ہے۔

## فارسی کی قطعہ نگاری

راقم کی دالست میں اکثر فارسی شعرا کی قطعہ نگاری کا مذاق اچھا ہے۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ صنف شاعری درباری شاعری کے اغراض کے لیے قصیدہ کے برابر موزوں و مناسب نہیں ہے اس لیے درباری اغراض میں کمتر صرف ہوئی ہے۔ اگر کسی شاعر نے اس میں مدح سرائی وغیرہ کی ہے تو اس کی مثال محض شاذ و اتفاقی ہے۔ واضح ہو کہ فارسی میں ابن یسین نے اچھے قطعات نظم فرمائے ہیں۔ بلکہ ان کے قطعات نے مدون ہو کر ایک مختصر دیوان کی صورت پیدا کی ہے۔ ابن یسین کی شہرت شاعری قطعات نگاری کی بدولت ہے ہر کہ وہ قطعات اہل یسین سے خبر رکھتا ہے حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب منظوم از سرتاپا مسائل حکمت سے معمور ہے۔ اور اباب مذاق کے قابل توجہ ہے۔ ذیل میں کچھ ابن یسین کے قطعات نذر ناظرین ہوتے ہیں:-

### انتخاب قطعات ابن یسین

#### نمبر ۱ قطعہ

دانی چہ موجب است کہ فرزند از پدر	منت نگیرد ارچہ سرادان دہد عطا
یعنی درین جہاں کہ محل حوادث است	در محنت و جود تو انگسندہ سرا

#### نمبر ۲ قطعہ

ساتے حال جہاں راز کیے کرد سوال	آں شنیدی کہ چہ فرمود حکیمش بہ جواب
گفت دنیا و نعیمش چو بیا بان سراب	یا خیالست کہ صاحب نظرش دید بخواب
خواب را مردم بیدار دل اصلا ندہند	نہ شود اہل خرد غرہ بہ تمویہ سراب

#### نمبر ۳ قطعہ

مرد آزاد در میان گر وہ	گر چہ خوش خود و عاقل و دانا است
مستم آنگہ تواند بود	کہ از ایشاں بالمش استفنا است
و آنکہ محتاج خلق شد خوار است	گر چہ در علم بوعلی سینا است



واضع ہو کہ یہ ترجمہ قول حضرت امیر المومنین علیہ السلام کا ہے

### نمبر ۴ قطعہ

گر نواز د فلکت غرہ مشوا ز پے آں      کہ صعودے نبود کش کہ مقوطے ز پے است  
گر بلندی دہرت بخت برد نیز مناز      کار تفاعے نبود کش کہ ہبوطے ز پے است

### نمبر ۵ قطعہ

اگرچہ بے ہنرے رادم فزوں باشد      گمان مبر تو کہ ناداں برابر دانا است  
پیچ حال ابو جہل چوں محمد نیست      اگرچہ طینت ہر دوز آدم خواست

### نمبر ۶ قطعہ

کسے کو طریق تواضع رود      کند بر سر پرشرف سلطنت  
ولیکن مجلس بداں و ممکن      ملک سیرتی در گہ شیطنت  
تواضع بود با بزرگان ادب      بود با فسر و یگان مسکنت  
یہ بھی قول امیر المومنین علیہ السلام کا ترجمہ ہے۔

### نمبر ۷ قطعہ

ہر کہ موجود حقیقی را شناخت      ذات ایزد را بلا اشتباہ گفت  
نہ بہ یزدان پیچ میدانی کہ برد      آنکہ لا موجود الا اللہ گفت

### نمبر ۸ قطعہ

چو میدانی کہ احوال نماز      مبدل می شود ساعت بساعت  
گرت باید کہ یابی لذت اندر سر      و گر خواہی کہ یابی ذوق طاعت  
ندام حرص چوں سیرغ گریز      نشین ساز بر قاف قناعت

## نمبر ۹ قطعہ

ہر کہ دارد کفاف عیش جہاں      کہ نباشد دران بکس محتاج  
کلمہ نیز بایدش کہ ازاں      نہ کند ہر دیش کسے اخراج  
در جہاں بادشاہ وقت خود است      دین چنین کس نہ بنگرد سوئے تاج  
بیشتر زین مجوے ابن یسین      تابسانی مگر ازین محتاج  
کاغچہ افزدوں ازین کنی حاصل      بہرہ دادنی است یا تاراج

## نمبر ۱۰ قطعہ

مرد باید کہ ہر کجا باشد      عزت خویش تن نگہ دارد  
خود پسندی واپس نہ کند      ہر چہ کبر و منی است بگزارد  
بطریقے رود کہ مردم را      سرموے ز خود نیا زارد  
ہم کس را ز خویش بہ داند      ہیج کس را حقیر نہ شمارد  
سرد زر در طلب نہد و انگہ      تا مگر دوستے بدست آرد

راقم تے قطعات بالا اس لیے انتخاب کیے ہیں کہ قطعہ نگاری کی غرض ظاہر ہو جتنے مضامین قطعات بالا کے ہیں تلے اور چھپے ہوئے ہیں۔ ارباب دانش سے پوشیدہ نہیں ہے کہ ان سے قطعہ نگاری کی غرض ہویدا ہے حقیقت یہ ہے کہ اس رنگ کی قطعہ نگاری ایک بڑے حکمت آف شاعر کا کام ہے۔ ہر شعر راستی کا مرقع ہے اور سچی شاعری کا نمونہ ہے۔ اب ذیل میں کچھ قطعات سعدی کے عرض کیے جاتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ اس صنف شاعری میں بھی حضرت ایک بڑا ممتاز پایہ رکھتے ہیں۔ بلکہ فقیر کی دانست میں کوئی فارسی کا شاعر قطعہ نگاری میں ان کا ہمسر نظر نہیں آتا ہے جو صفائی خیالات، جدت مضامین، حق پسندی، راست گفتاری، اثر انگیزی کا جلوہ حضرت کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ کسی اور شاعر کے کلام میں نہیں دیکھا جاتا۔ حق یہ ہے کہ ہر چند ابن یسین بڑے قطعہ نگار ہیں مگر سعدی کی صفائی خیالات اور اثر انگیزی کو نہیں پہنچتے ہیں۔

بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگر



## انتخاب قطعات سعدی

### نمبر ۱ قطعہ

اے کریمے کہ از خزانہ غیب      گبر و ترسا وظیفہ خورداری  
دوستان را کجا کنی محروم      تو کہ بادشمنان نظر داری

### نمبر ۲ قطعہ

اہر و بادومہ و خورشید و فلک در کار اند      تا توانے بکف آری و بغفلت نخوری  
ہماز بہر تو سرگشتہ و فرمان بردار      شرط انصاف نباشد کہ تو فراں نہری

### نمبر ۳ قطعہ

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و دہم      وز ہر چہ گفتہ اند و شنیدیم و خواندہ ایم  
دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر      باہمچنان در اول وصف تو ماندہ ایم

### نمبر ۴ قطعہ

گر کسے وصف اوز من پرسد      بیدل از بے نشان چہ گوید باز  
عاشقان کشتگان معشوق اند      بہر نیاید ز کشتگان آواز

### نمبر ۵ قطعہ

اے مرغِ سحر عشق ز پروانہ بیاموز      کان سوختہ را جان شدہ آواز نیامد  
ابن مدعیان در طلبش بے خبر اند      کان را کہ خبر شد خبرش باز نیامد

### نمبر ۶ قطعہ

گلے خوشبوئے در حمام روزے      رسید از دست محبوبے بدستم  
بدو گفتم کہ مشک باغبیرے      کہ از بوئے دل آویز تو مستم

بگفتا من نگلے نا چپیز بودم      ولیکن مدتے باگل نشستم  
جمال ہم نشین در من اثر کرد      وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

نمبر ۷ قطعہ

کنونت کہ امکان گفتار هست      بگو اے برادر بہ لطف و خوشی  
کہ فردا کہ پیک اجل در رسد      بہ حکم ضرورت زباں در کشی

نمبر ۸ قطعہ

زبان درد بان خردمند چسیت      کلید در بگ صاحب ہنر  
چو در بستہ باشد چہ داند کسے      کہ جوہر فروش است یا بیشہ گیر

نمبر ۹ قطعہ

اگر چہ پیش خردمند خامشی ادب است      بوقت مصلحت آں بہ کہ در سخن کوشی  
دو چیز طیرۂ عقل است دم فرو بستن      بوقت گفتن و گفتن بوقت خاموشی

نمبر ۱۰ قطعہ

بس نامور بزمیر زمیں دفن کردہ اند      کز ہستیش بروئے زمین یک نشان نہاند  
آں پیر لاشہ را کہ سپردند زیر خاک      خاکش چنان بچندہ کزد استخوان نہاند  
زندہ است نام فرخ نوشیرواں بخیر      گر چہ بے گزشت کہ نوشیرواں نہاند  
خیرے کن لے فلاں و غنیمت شمار عمر      زان پشتر کہ بانگ برآید فلاں نہاند

نمبر ۱۱ قطعہ

آں شنیدی کہ لاغرے دانا      گفت روزے باطل ہے فرہ  
اسپ تازی اگر ضعیف بود      ہمچنان از طویلہ خسہ



## نمبر ۱۲ قطعہ

نیم نانے گر خورد مرد خدائے      بذل درویشاں کسند نیمے دیگر  
ہفت تلیم از بگیدر بادشاہ      ہیمناں در بند اتلیے دگر

## نمبر ۱۳ قطعہ

ابرگر آب زندگی بارد      ہرگز از شاخ بید بر نخودی  
بافر دایہ روزگار مبر      کزنے پوریا شکر نخوری

## نمبر ۱۴ قطعہ

پسر لوح بابدان بہ نشست      خاندان نہوتش گم شد  
سگ اصحاب کہف روزے چند      پے نیکاں گرفت مردم شد

## نمبر ۱۵ قطعہ

شمسیر نیک ز آہن بد چوں کند کسے      ناکس بہ تربیت نشود اے حکیم کس  
باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست      در باغ لالہ روید و در شور بوم خس

## نمبر ۱۶ قطعہ

زمین شور سنبل بزیار      در و تخم عمل ضایع مگر داں  
نکوئی بابدان کردن چناں است      کہ بد کردن بجائے نیک مرواں  
دافع ہو کہ یہ سب قطعات راقم نے کتاب گلستاں سے داخل ہذا کیے ہیں۔ ظاہر ایسا  
معلوم ہوتا ہے کہ اگر اس کتاب کے تمام قطعات اور بھی وہ قطعات جو کلیات سعدی میں مندرج  
ہیں۔ مدون کر دیئے جائیں تو ایک عمدہ مجموعہ قطعات سعدی کا ترتیب پا سکتا ہے فقیر کی دانست  
میں فارسی کا کوئی قطعہ نگار شاعر سعدی کے حسن بیان، صفاتی خیال پر تاثری مضامین،  
حق پسندی، حق آموزی، حق جوئی، حق گوئی، راست گفتاری، راست کرداری کو نہیں پہنچتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو خوبیاں سعدی کے قطعات میں ہیں، زہرا ابن سینا کے قطعات میں نہیں ہیں  
لاریب سعدی قطعہ نگاری میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتے ہیں۔ ذیل میں کچھ قطعات ان کی کلیات  
سے بھی درج ذیل کیے جاتے ہیں ۱

### نمبر ۱۷ قطعہ

کہ فلاں راحل وعدہ رسید	ناگہاں بانگ در سراے فتد
قدمے چند د باز پس گردید	دوستاں آمدند تالب گور
مال و ملک و قبالہ برد و کلید	وانکہ او دوست تر بھی داری
عمل تست و نفس پاک و پلید	آنکہ پیوستہ با تو خواہد بود
کہ بد و نیک باز خواہی دید	نیک دریاب و بد ممکن ز نہار

### نمبر ۱۸ قطعہ

ز عیب خویش نیاید کہ بے خبر باشد	کسے بحسد و ثنائے برادران عزیز
کہ عیب در نظر دوستان ہنر باشد	ز دشمنان شنوائے دوست آچہ گویند

### نمبر ۱۹ قطعہ

یکے نصیحت من گوش دار جان عزیز	پدر کہ جاں عزیزش لب رسید چہ گفت
کہ دوست نیز بگوید بد وستان عزیز	بدوست گر چہ عزیز است راز دل مکشای

### نمبر ۲۰ قطعہ

وقت دیگر طفل بودی شیر خوار	ایک وقت نطفہ بودی بے خبر
مرد بالا کئے شدی سین عذار	مدتے بالا گرفتے تا بلوغ
فارس میدان و مرد کار زار	ہمناں نام آدمی اور شدی
و آنچہ بینی ہم نہاند بر سرار	آنچہ دیدی بر سرار خود نہماند
بخت و تخت و امر و نہی گیر و دار	ایں ہمہ بیچ است چوں می بگذرد



نام نیک رفتگان ضائع ممکن      ناباند نام نیکت یادگار  
ذیل میں کچھ اور استادوں کے بھی ایسے قطعات جن سے قطعہ گوئی کی غرضیں  
ہویدا ہیں عرض کیے جاتے ہیں :-

### قطعہ فردوسی

بیابگوئے کہ پرویز از زمانہ چہ خورد      بروپرسس کہ کسریٰ روزگار چہ برد  
گراو گرفت ممالک بدگیراں بگزاشت      ورایں نہاد خزائن بدگیراں بسپرد

### قطعہ نظامی

دوش رنتم بہ خرابات مرا راہ نبود      میزدم نعرہ فریاد کس اذمن نشنود  
یا نہ بدیچ کس از بادہ فروشاں بیدار      یا نہ من بیچ کسم ہیچکسم ورنہ کشود  
پاسے از شب چو بشد بیشترک یا کمتر      رندے از غرقہ بروں کرد مسرورخ بہ نمود  
گفت خیر است دریں وقت کرامی خواہی      بے محل آمدنت بردر ما بہر چہ بود  
گفتش در بکشا گفت برو ہرزہ گوئے      کا نذرین وقت کسے بہر کسے در نکشود  
این نہ مسجد کہ بہر لحظہ درش بکشایند      کہ تو دیر آئی داند صف پیش استی زود  
ایں خرابات مناں است در ورنہ اند      شاہد و سمع و شرابے شکر و نائے و سرود  
ہر چہ از جملہ آفاق در آنجا حاضر      مومن دار منی و گبر و نصاریٰ و یہود  
گر تو خواہی کہ دل از صحبت ایناں بزنی      خاک پائے ہمہ شو تاکہ بیابانی مقصود  
دافع ہو کہ اس قطعہ کی عروضی ترکیب غزل کی ہے کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ قطعہ میں مطلع بھی  
لکھتے ہیں مگر یہ غزل نہ ترکیب قلیل الوجود ہے لیکن عرض قطعہ بگاری سے قطعہ کو خالی نہیں ہونا  
چاہیے اس قطعہ کا مصراع آخر اس قطعہ کی غرض پر مشتمل ہے۔

### قطعہ سنائی

گویند چو پیغمبر مافت ز دنیا      میراث خلافت بظلال دادز بیگیاں  
نے نے مکے ملک بیگانہ نداست      رودنر شاہان جہاں جسدہ تو برخواں

بادختر و ابن عم و داماد و دو فرزند میراث بہ بیگانہ دہدیچ مسلمان

قطعہ

روزے زمر سنگ عقاب نہ واخاست  
از کبر و منی ہا کہ در او بود ہی گفت  
ناگہ ز کمین گاہ یکے سخت کمانے  
ہر بال عقاب آمدہ آن تیر جگر دوز  
در حیرت آن بود زمانے بہ تفکر  
چوں نیک نگہ کرد بر خویش در آن دید  
واندر طلب طعمہ ہر وبال بیمار است  
امروز ہمہ ملک خدا زیر پرما است  
تیرے بڑہ آورد و فرستاد بدراست  
در سینہ بروں رفت و پس پشت ہی گاست  
کاین آہن و این چوب بریدن ز کجا خواست  
گفتا کہ نالیم کہ از ما است کہ بر ما است

قطعہ غالب دہلوی

فرصت اگر ت دست دہر مغنم آنکار  
زنہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند  
ساقی و مغنی و شربانی و سرودی  
حق را بہ سجودی و نبی را بہ درودی

قطعہ غالب دہلوی

بہ آدم زن بہ شیطان طوق لعنت  
ولیکن در اسیری طوق آدم  
سپردند از رہ تکریم و تذلیل  
گران تر آمد از طوق عزازیل

واضح ہو کہ قطعات بالا میں شوخی کا لطف ہے۔ غالب کے قطعات فارسی میں بہت ہیں مگر بیشتر درباری رنگ کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے قطعات بغیر درت تصنیف ہوئے ہوں گے۔ اور چوں کہ اغراض قطعہ نگاری کے موافق نظر نہ آئے درج ہذا نہیں کیے گئے یہی حالت عرفی کے قطعات کی بھی نظر آتی ہے کہ حکیمانہ مضامین پر کمتر مشتمل ہیں۔

اردو کی قطعہ نگاری

معلوم ہوتا ہے کہ اردو کے شعراء نے قطعہ نگاری کی طرف بہت کم توجہ فرمائی ہے۔ اردو کا کوئی شاعر اس صفت شاعری میں نہ سہی کا نظیر نظر آتا ہے نہ ابن یسین کا جواب دکھائی دیتا ہے۔



ذیل میں اردو کے کچھ قطعات بہ سبیل انتخاب عرض کیے جاتے ہیں۔

## قطعات ذوق

کل ایک تارک دنیا سے میں نے پوچھا ذوق  
گندرتی ہوگی بہ آرام زندگی تیسری  
کہا یہ اس نے کہ قیدِ حیات میں انساں  
اٹھائے ہاتھ جہاں سے دلیک کیا امکان  
چھٹا جو کوئی گرفتاریوں سے دنیا کی  
رہا وہ خدمتِ مرشد کی قید میں برسوں  
گر ایک عمر میں پہنچا مقامِ عالی پر  
جو دستگاہِ تصوف میں بھی ہوئی اس کو  
ہمیشہ جنگ رہی بعد صلح کل کے یہی  
جو ہو شیار ہے تو ہے وہ شرع کا پابند  
نہیں ہے دامِ علاق سے مطلق آزادی  
کہا ہے خوب کسی نے یہ شعر برجستہ  
کہ کر قطع تعلق کلام شد آزاد  
بریدۂ زہمہ با خدا گرفتار است

## قطعہ

دیکھتے ہیں جلوۂ گلہائے رنگارنگ ہم  
آخرین ہوگا وہی ایک دن خزاں کے ہاتھ سے  
ہے غنیمت کوئی دمِ نظارۂ رنگ بہار  
در عدم بودیم و دیگر در عدم خواہیم رفت  
مثل نگرں جب تک کہ اس چمن میں چشمِ دا  
جو کہ عالم اپنا اس نشوونما سے پہلے تھا  
پھر کہاں یہ سبز و گل اور یہ ابرو ہوا  
ایں تماشا نے جہاں رامفت می بینم ما

## قطعہ

جن کو اس وقت میں اسلام کا دلوں کا مال  
جیسے محل میں ہنسائے کو مسلمانوں پر  
غور سے دیکھا تو اسے ذوق ہے ان کا یہ حال  
نقل کرتا ہو مسلمان کی کافر نعتال

## قطعہ

تو بھلا ہے تو برا ہو ہی نہیں سکتا اے ذوق  
اور اگر تو ہی برا ہے تو وہ سچ کہتا ہے  
ہے برا وہی کہ جو تجھ کو برا جانتا ہے  
کیوں برا کہنے سے تو اس کے برا مانتا ہے

## قطعات غالب

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشین  
وہ ہرزہ زار ہائے مہمناک ہے غضب  
اک تیر میرے سینہ میں مارا کہ ہائے ہائے  
وہ نازنین بتاں خود آرا کہ ہائے ہائے  
صبر آزمایا وہ ان کی نگاہیں کہ حق نظر  
طاقت ربا وہ ان کا اشار کہ ہائے ہائے  
وہ میوہ ہائے تازہ شیریں کہ واہ واہ  
وہ باد ہائے تاب گورا کہ ہائے ہائے  
اس قطعات میں صرف شوخی ہے کوئی شعر حکیمانہ مذاق نہیں رکھتا ہے۔ اس قطعہ پر کیا  
موقوف ہے جتنے قطعات دیوان غالب میں موجود ہیں کسی مسئلہ علمی سے علاقہ نہیں رکھتے ہیں۔

## قطعہ

اے شہنشاہ آسمان اور نگ  
تھیں اک بینوائے گوشہ نشین  
تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی  
کہ ہوا مجھ سا زرہ ناچیز  
گرچہ از روئے ننگ بے ہنری  
کہ گراپنے کو میں کہوں خاکی  
شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں  
اے جہاں دارا آفتاب آثار  
تھیں اک درد مند سینہ فگار  
ہوں میری وہ گرمی بازار  
روشناس ثوابت و ستار  
خود ہوں اپنی نظر میں اتنا خوار  
جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عل  
بادشہ کا غلام کار گزار



خانہ زاد اور مرید اور مداح  
 بارے نوکر بھی ہو گیا صد شکر  
 نہ کہوں آپے تو کس سے کہوں  
 پیرو مرشد اگرچہ مجھ کو نہیں  
 کچھ تو جاڑے میں چاہئے آخر  
 کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش  
 کچھ خسریدا نہیں ہے ابجے سال  
 رات کو آگ اور دن کو دھوپ  
 آگ تا پے کہاں تک انسان  
 دھوپ کی تابش آگ کی گرمی  
 میری تنخواہ جو مقرر ہے  
 رسم ہے مردہ کی چھ ماہی ایک  
 مجھ کو دیکھو تو ہوں بقید حیات  
 بسکہ لیتا ہوں ہر مہینے قسطن  
 میری تنخواہ میں تہائی کا  
 آج مجھے سا نہیں زمانے میں  
 رزم کی داستان گر سنیے  
 بزم کا التزام گر کیجیے  
 ظلم ہے گرد دو سخن کی داد  
 آپ کا بندہ اور پھپھروں ننگا  
 میری تنخواہ کیجیے ماہ بسا  
 ختم کرتا ہوں اب دعا پر کلام  
 تھا ہمیشہ سے یہ عریفہ نگار  
 نسبتیں ہو گئیں مشخص چار  
 مدعا ئے ضروری الاظہار  
 ذوق آرائش سرود ستار  
 تاندے باز مہریر آزار  
 جسم رکھتا ہوں ہے اگرچہ زار  
 کچھ بنایا نہیں ہے اب کے بار  
 بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار  
 دھوپ کھائے کہاں ملک جاندار  
 وقار بتنا عذاب النار  
 اس کے ملنے کا ہے عجب ہنسا  
 خلق کا ہے اسی چلن پر مدار  
 اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار  
 اور رہتی ہے سود کی تکرار  
 ہو گیا ہے شریک سا ہو کار  
 شاعر نغز گوئے خوش گفتار  
 ہے زبان میری تیغ جو ہزار  
 ہے قلم میرا ابر گوہر بار  
 قہر ہے گرد نہ مجھ کو پیار  
 آپ کا نوکر اور کھاؤں اودھار  
 تانہ ہو مجھ کو زندگی دشوار  
 شاعری سے نہیں مجھے سروکار

تم سلامت رہو ہزار برس

ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

اس قطعہ میں جس قدر شوخی ہے محتاج بیان نہیں مگر راقم نے اس قطعہ کو اس لیے منتخب

کیا کہ اس میں مرزا غالب نے بڑی قطعہ نگاری خروج کی ہے۔ ہندوستانی سرکاروں کا بیشتر یہی طور ہے کہ بدانتظامیوں کے باعث تنخواہیں بڑی دشواریوں سے ملتی ہیں۔ ہندوستانی ریاستیں سرکار انگریزی نہیں ہوتیں کہ مشاہرہ ہر مہینے کی پہلی تاریخ ملازموں کو وصول ہو جایا کرے۔ یہ قطعہ بہت عبرت خیز ہے۔ ظاہر ہے کہ جن سرکاروں کی یہ حالت ہو کہ ملازموں کو مزدور خدمت دقت پر نہ ملا کرے تو بالضرور یا وہ چوری کریں گے یا مارے تکلیف کے بھاگ کھڑے ہوں گے۔ ارباب مذاق سے پوشیدہ نہیں ہے کہ یہ قطعہ ہجو کا ایک نہایت مطبوع پیرا رکھتا ہے۔ گو ایسی نیت سے لکھا میں گیا۔

ایک قطعہ ذیل میں میر پرورش علی صاحب مرحوم متخلص بہ سخی کا نذر ناظرین ہوتا ہے۔

ایک دن وہ لے کے کچھ لوگوں کے ساتھ	خبر بتیں یہ کہہ کے دکھلانے رہے
اس میں جنوں ہے اور اس میں کوہن	عاشقان ناز تھے جباتے رہے
بعد اس کے پھر ہماری قبر پر	دیر تک افسوس فرماتے رہے
پوچھا جب سب نے کہ اس میں کون ہے	آپ جو رہ رہ کے پچھتاتے رہے
بولے ہے یہ سخی کا مزار	جان دے دی لاکھ سمجھاتے رہے

## رباعی

رباعی وہ صنف شاعری ہے جس کے لیے حکیمانہ مضامین کی حاجت ہے۔ شاعر کو لازم ہے کہ مسائل اخلاق و تمدن و معاشرت و مذہب و دیگر مضامین جلیلہ سے اپنے کلام کو زینت دے۔ اگر بہت خیالی کی طرف اس کے کلام کو میلان ہوگا تو اس کی رباعی نگاری بامراد تاثیر پیدا نہ کر سکے گی۔ جاننا چاہئے کہ جیسی غالی خیالی قطعہ نگاری کے لیے درکار ہے اس صنف شاعری کو بھی اُسی قدر اس کی حاجت ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ قطعہ میں گنجائش مضامین زیادہ ہے اس لیے کہ قطعہ صرف چار مصرعوں میں محدود نہیں رہتا۔ اور رباعی کو چار مصراع کے سوا چارہ نہیں ہے۔ چونکہ یہ صنف شاعری عروضی ترکیب کی رو سے بہت محدود صورت ہے شاعر کو لازم ہے کہ منفع مسائل کو اس طرح موزوں کرے کہ تنوع لفظوں سے بہت معنی پیدا ہوں اور چوتھا مصراع بہت پر مضمون اور پُر زور اور ایسا ہو کہ گویا ہر مصراع ہائے سابق کا خلاصہ یا نتیجہ ہو۔ اہل واقفیت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ اس صنف شاعری کے لیے زیادہ تر داخلی مضامین کی حاجت ہے۔ مسائل اخلاق و تمدن



ومعاش و معاد کے علاوہ عشقہ مضامین بھی اس میں موزوں کیے جاسکتے ہیں بشرطیکہ اسے مضامین بہت خیالی کے عیب سے پاک متصور ہوں۔

## فارسی کی رباعی نگاری

فقیر کی دانست میں فارسی کی رباعی نگاری فارسی کی قطعہ نگاری کی طرح ایک اصطلاح ہے کی شاعری سے خبر دیتی ہے۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ فارسی میں جو عمدہ رباعی نگار گزرے ہیں وہ عموماً حکمائے وقت سے بھی تھے۔ ذیل میں بعض شعرائے نامی کا ذکر رباعی نگاری تعلق کیساتھ حوالہ قلم کیا جاتا ہے۔ امدان کے کلام کے نمونے بھی نذر ناظرین ہوتے ہیں :-

فردوسی کی شہرت رباعی کے ذریعہ سے نہیں ہے مگر اس شاعر گرامی کی رباعی نگاری سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس کے عہد میں رباعی نگاری فارسی میں مروج ہو چکی تھی۔ یہ صنف شاعری اہل عرب کا ایجاد ہے۔ جیسا کہ کتب تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے۔

## رباعی فردوسی

تا چند نہی بردل خود غصہ و درد      تا جمع کنی سیم سفید و زرد  
ناں پیش کہ گرد نفس گرم تو مرد      بادوست بخور کہ دشمنت خواہد خورد  
ظاہر ہے کہ رباعی بالا اخلاق و تمدن و معاشرت کے ایک بڑے مسئلہ سے خبر دیتی ہے۔  
یہ رباعی تمام تر اپنے تقاضوں کے مطابق ہے۔

مولاناے رومی کی شہرت رباعی نگاری کی وجہ سے نہیں ہے۔ بہر حال دور باعیاں مولانا کی درج ذیل ہوتی ہیں :-

## نمبر ۱۔ رباعی رومی

درد مہربان شقاں قرارے دگر است      دیں بادۂ ناب را خارے دگر است  
ہر سلم کہ در مدرسہ حاصل کردیم      کارے دگر است عشق کارے دگر است

## نمبر ۲ رباعی رومی

ہر دیدہ کہ در جمال جاناں نگرہ      شک نیست کہ در قدرت یزداں نگرہ  
بیزاںم ازاں دیدہ کہ در وقت اجل      از یافسرد ماند و در حال نگرہ  
واضح ہو کہ رباعیات بالا عشقیہ ہیں مگر ہواہوسوں کی عشق بازی کے مضامین سے تمام تر بے لگاؤ  
ہیں یہ وہ عشق ہے جس کی نسبت یہ کہا گیا ہے ۔  
تعالیٰ العشق عن فہم الرجال

## خاقانی بحیثیت رباعی نگار

خاقانی کی شہرت قصیدہ نگاری کی بدولت ہے بہر حال اس شاعر نامی کی ایک رباعی ذیل  
میں عرض کی جاتی ہے :

## رباعی خاقانی

توفیق رفیق اہل تصدیق شود      زندیق دریں طریق صدیق شود  
گر راز مرا نہ دانی انکار مکن      تقلید کن آن قدر کہ تحقیق شود

## انوری بحیثیت رباعی نگار

انوری قصیدہ گو ہیں۔ مگر ان کی ایک رباعی ذیل میں نذر ناظرین ہوتی ہے :-

## رباعی انوری

باگن گفتم ابر چہرامی گرید      ماتم زدہ نیست ہر کجای گرید  
گل گفست اگر راست ہی باید گفست      بر عمر من و عہد شما می گرید  
پیرایہ شاعری میں تعلیم کا پہلو اچھا رہا ہے۔ غرض رباعی نگاری ہویدا ہے۔



## عمر خیام بحیثیت رباعی نگار

اس شاعر کی شہرت مجسّد نگاری کی بنیاد پر ہے جس طرح ابن دین قطعہ نگاری کی بدولت مشہور دیار و امصار ہو رہے ہیں اسی طرح رباعی نگاری کی وجہ سے عمر خیام کا نام شہرہ آفاق ہو رہا ہے۔ یورپ میں بھی رباعیات عمر خیام کی بڑی قدر کی جاتی ہے۔ چنانچہ ملک انگلستان میں ایک کلب یعنی جلسہ اس شاعر گرامی کے نام سے قائم ہے۔ ذیل میں خیام کے کچھ حالات بہ سبیل تذکرہ عرض کیے جاتے ہیں

دافع ہو کہ اس مشہور عالم کا نام غیاث الدین ابوالفتح عمر بن ابراہیم النخام ہے۔ اور وطن نیشاپور جو صوبہ خراساں کا ایک شہر ہے۔ عمر خیام سلطان سنجر کے عہد میں تھے۔ اور ان کی وفات کا سن ۵۱۷ھ معلوم ہوتا ہے۔ نظام الملک جو آلپ ارسلان اور ملک شاہ شاہان سلجوقیہ کے ناناں میں وزیر رہے۔ اپنی کتاب وصایا میں لکھتے ہیں کہ ہم اور خیام عہد طالب علمی میں ہم سبق اور ہم استاد تھے۔ بعد اختتام تعلیم کے ہم سیر و سفر کو چلے گئے۔ اور بعد معاودت کے وزیر ہوئے۔ ہماری وزارت یابی کے بعد خیام ہمارے پاس آئے ہم ان کے ساتھ تعظیم و تکریم کے ساتھ پیش آئے۔ اور ان سے یہ کہا کہ آپ کی قابلیت کے آدمی کو خدمت سلطان میں درآنا چاہئے۔ خیام نے اس کو پسند نہیں کیا۔ اور کہا کہ مجھے علم اندوزی کے لیے چھوڑ دو۔ مجھے گوشہ عافیت درکار ہے۔ جب ہم نے خیام کو اس خواہش میں مستحکم پایا تو شاہی خزانہ سے بارہ سو اشرفیاں سالانہ کفالت کے طور پر مقرر کر دیں۔ آلپ ارسلان کے بعد جب ملک شاہ تخت نشین ہوئے تب خیام مردہ آئے۔ اس وقت ان کے علم و فضل کا شہرہ تھا سلطان نے بڑی توقیر کی۔ اور بڑے بڑے عہدے ان کو بخشے۔ ابوالفدا کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ مردہ جس عہدے پر خیام کو سلطان نے مقرر فرمایا تھا وہ علم الافلاک کے شاہی سررشتہ کی افسری تھی۔ اس خدمت کے زمانے میں خیام نے مرزوسے تقویم سال فارسی کی اور بہت سے زچ تیار کیے۔ جو زچ ملک شاہی کے نام سے مشہور ہیں! اسی تقویم کو جلالی کہتے ہیں اور وہ اس کی تسمیہ کی یہ ہوئی کہ سلطان وقت جلال الدین ملک شاہ تھے اور انہیں کی توجہ فرمائی سے یہ کار دشوار انجام کو پہنچا۔ ابن خلدون کی تحریر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خیام کو علم جبر و مقالہ میں بھی بڑا دخل تھا اور اس علم میں ان کی تصنیف موجود ہے۔ ایک کتاب ان کی تصنیف سے جس کا موضوع اقلیدس کی تعریفات کی دشواریاں ہیں لیسن

LEODEN کے کتب خانہ میں ابھی تک موجود ہے۔ شہرستانی خیام کی نسبت لکھتے ہیں کہ اپنے زمانہ کا یہ عالم ترین شخص تھا۔ علم الافلاک اور فلسفہ میں اس کا کوئی نظیر نہ تھا۔ مختصر یہ ہے کہ خیام ان علماء میں ہے کہ جن کے نام نامی تامل و ہوراسنہ خلائق پر جاری رہ جائیں گے۔ خیام کے عقائد دین کی نسبت طوسی لکھتے ہیں کہ اسے تدہر کی طرف میلان تھا اور یہ میلان اس کو انہماک علمی کے باعث تھا۔ ابو الفدا کی تحریر سے ہو دیا ہوتا ہے کہ خیام کو شاعری سے بڑی رغبت تھی۔ مگر راقم کو اس یکتائے روزگار کی رباعیات کے علاوہ اس کے اور اصناف کلام منظوم سے خبر نہیں ہے۔ یہ رباعیاں مختلف مضامین پر مشتمل نظر آتی ہیں کچھ تو شکایت روزگار میں ہیں اور کچھ بچہ میں بچہ کچھ فراقیہ اور وصالیہ میں تھوڑی بہار یہ بھی ہیں۔ علاوہ ان کے کفریہ اور مناجاتیہ ہیں۔ یورپ میں خیام کی رباعیوں کی بڑی قدر ہے۔ اس کا سبب اور کوئی نہیں معلوم ہوتا ہے۔ الا یہ کہ خیام کے کفریہ مضامین مذاق یورپ کے قرن ہیں۔

## انتخابِ رباعیات عمر خیام

نمبر ۱

آمد محرمے نداز میخانہ ما      کاے رند خسرا باقی دیوانہ ما  
برخیسز کہ پرکنیم پیما زے      زان پیش کہ پرکنند پیما زے

نمبر ۲

رخسز و بیابا برائے دل ما      حل کن چہ حال خویشہ مشکل ما  
یک کوزہ می بیار تا نوش کنیم      زان پیش کہ کوزہ کنند از گل ما

نمبر ۳

گر مے خوری طعن مزین مستان را      گردست دہد تو بہ کنم یزداں را  
تو فخر بدی کنی کہ من مے نخورم      صد کار کنی کہ مے غلام است آن را



نمبر ۴

باط می گفت ما ہی در تب و تاب  
باش که بجوئے رفته باز آید آب  
بط گفت چو من و تو دگشتم کباب

نمبر ۵

ایں کوزه چو من عاشق زارے بود است  
در بند سر زلف نگارے بود است  
ایں دستہ کہ در گردن او می بینی  
دستیت کہ بر گردن یارے بود است

نمبر ۶

پیش از من و تو لیل و نہارے بود است  
گر دندہ فلک زہر کارے بود است  
ز نہار قدم بہ خاک آہستہ نہیں  
کان مرد مک حشم نگارے بود است

نمبر ۷

پر خون ز فرافت جگرے نیست کہ نیست  
شیدائے تو صاحب نظرے نیست کہ نیست  
با آنکہ نداری سر سوداے کسے  
سوداے تو در پیچ سرے نیست کہ نیست

نمبر ۸

در فصل بہار اگر بت خود مرشت  
پرو می قدحے دہد مرا بر لب کشت  
ہر چند بہ نزد عام بد باشد این  
از سگ بترم اگر کنم یاد بہشت

نمبر ۹

مے نوش کہ عمر جاودانی این است  
خود حاصلت از دور جوانی این است  
ہنگام گل است و مل دیاراں مرست  
خوش باش دے کہ زندگانی این است

نمبر ۱۰

چوں جاں بلب آمد چه نشا پور و چه بلخ  
پیمان چو پر شود چه شیریں و چه تلخ  
مے نوش که بعد از من و تو ماه بے  
از سلخ به غسره آید از غسره به سلخ

نمبر ۱۱

ایں قافله عمر عجب می گزرد  
دریاب دے که از طرب می گزرد  
ساقی غم فردائے حریفان چه خوری  
پیش آر پیاله که شب می گزرد

نمبر ۱۲

آن قوم که سجاده پرستند خسند  
زیرا که به زیر بار سالوس درند  
وین از همه طرف ترک در پرده زهد  
اسلام فروشنند و ز کافر برترند

نمبر ۱۳

افسوس که سرمایہ زکف بیرون شد  
وز دست اجل بے جگر با خون شد  
کس نامد از آن جہاں که پرسم از دے  
کا حوال مسافران عالم چوں شد

نمبر ۱۴

از گردش روزگار بهرے برگیر  
بر تخت طرب نشین بکف ساغر گیر  
از طاعت و معصیت خدا مستغنی است  
بارے تو مراد خود ز عالم برگیر

نمبر ۱۵

عمر تو چه دو صد و چه سه صد چه هزار  
گر باد شے دگر گدائے بازار  
زین کہنہ سرا بروں بر ندت ناچار  
ایں هر دو به یک نرخ بود آخر کار



نمبر ۱۴

گر گوہر طاعت نسفتم ہرگز      گرد گنہ از چہرہ نہ رفتم ہرگز  
نوسیدہ نیم ز بارگاہ کرم      زیراکہ یکے را دوزخ گفتم ہرگز

نمبر ۱۵

از حادثہ زماں آئندہ مپرس      وز ہرچہ رسد چون نیست پایندہ مپرس  
ایں یک دمہ نقد را غنیمت میدان      از رفتہ میندیش وز آئندہ مپرس

نمبر ۱۸

ایں صورت کون جملہ نقش است و خیال      عارف نہ بود ہرکہ ندارد ایں حال  
بہنشین قدح بادہ بنوش و خوش باش      فارغ شوازیں نقش و خیالات محال

نمبر ۱۹

بانفس ہمیشہ در بزد مچہ کنم      وز کردہ خویشتن بدردم چہ کنم  
گیسم کہ زمین در گزرائی بہ کرم      زان شرم کہ دیدی کہ چہ کردم چہ کنم

### سعدی بہ حیثیت رباعی نگار

سعدی علیہ الرحمہ سے رباعیاں بھی ہیں۔ ذیل میں کچھ رباعیاں سعدی کی نذر ناظرین ہوتی ہیں :-

### رباعیات سعدی

ناداں ہمہ جا با ہمہ خلق آمیزد      چون غرق بہر چہ دید دست آویزد  
بامردم زشت نام ہمراہ مباحث      کز صحبت دیگدان سیاہی خیزد

نمبر ۲

بشنو بہ ارادت سخن پیر کہن  
خواہی کہ کسے را نرسد بر تو سخن  
تا فہم کنی کار جہاں را مرد بن  
بنگر تو دہر چہ آں نہ نیکو است ممکن

نمبر ۳

تا کہ بجمال و مال دنیا نازی  
اے دہر نشستہ وقت آنست کہ جاے  
وقت است کہ برگ راہ عقبی سازی  
یک چند بنو خواستگان پر وازی

نمبر ۴

زانگہ کہ ترا بر من مسکین نظر است  
گر خود ہمہ عیبہا بدین بندہ در است  
آثارم از آفتاب مشہور تر است  
ہر عیب کہ سلطان بہ پسند ہم تر است

نمبر ۵

دانی کہ چہ گفت زال بارستم گرد  
دیدیم بے آب زمر چشمہ خورد  
دشمن نتوان حقیر و بیچارہ شمرد  
چوں بیشتر آمد شتر و بار بہ برد

نمبر ۶

نیزم چونانذ بیش ازین تدبیرم  
گردست رسد کہ آستینش گیرم  
خضم ارہمہ شمشیرنہ یاسیرم  
ورنہ بردم بر آستانش میرم

اردو کی رباعی نگاری

اردو میں جس طرح کوئی مدون سوزہ قطعات ابن یمن کے رنگ کا نہیں ہے۔ اسی طرح رباعیات عمر خیام کے طور کی بھی کوئی کتاب نظر نہیں آتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ شعرائے اردو نے شعرائے فارسی کے برابر رباعی نگاری میں ترقی نہیں کی ہے۔ اردو شعرائے کوئی شاعر رباعی نگار عمر خیام



کے درجہ کا نظر نہیں آتا۔ مرزا سودا اور میر صاحب نے رباعیاں لکھی ہیں، مگر ان کی رباعیاں اعلیٰ درجہ کی شاعری سے کمتر خبر دیتی ہیں۔ ذوق نے تو جو کچھ رباعیاں لکھی ہیں، ان میں بادشاہِ وقت کی خوشامد کے سوا کوئی ایسا مضمون نہیں پایا جاتا ہے کہ جس کو اخلاق و تمدن معاشرت معاد مذہب وغیرہ سے کسی طرح کا تعلق حاصل ہو۔ قریب قریب یہی کیفیت غالب کی رباعیوں کی بھی ہے۔ نہایت جلتے افسوس ہے کہ ذوق اور غالب سے نامی شاعروں نے بھی اس صنفِ شاعری کی طرف توجہ نہیں فرمائی۔ بلکہ خوشامدانہ اندازِ تحریر سے اس کو درجہ ابتذال تک پہنچا ڈالا ہے۔ یہ ہے کہ شاعری کو درباری تعلق سے ہمیشہ ضرر مترتب ہوا ہے۔ اگر کاش ذوق اور غالب کو درباری تعلق نہ ہوتا تو ان کے مدحیہ قصائد قطعات اور رباعیات سے شاعری کو اس قدر ذلت نصیب نہ ہوتی اور تب یہ ہر دو شاعران نامی آزادی کے ساتھ تصانیف معقول سے شاعری کو زینت دیتے۔ ذیل میں کچھ رباعیاں خواجہ میر درد صاحب اور مومن خاں کی نذر ناظرین کی جاتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب کو رباعی نگاری کو مذاق حاصل تھا۔ مگر مومن خاں اس صنفِ شاعری سے چنداں مناسبت نہیں رکھتے تھے۔ بہر حال ان کی بہت سی رباعیوں سے کچھ رباعیاں چن لی جاتی ہیں۔ آخر میں چند رباعیاں میر انیس صاحب اور مرزا دبیر صاحب کی منسلک ہذا کی جاتی ہیں حقیقت یہ ہے کہ ہر دو بزرگوار رباعی نگاری کے اعتبار سے بہت قابلِ قدر ہیں۔ بلکہ اردو شعرا میں یہی حضرات ہیں جنہوں نے رباعی نگاری کی شرم رکھ لی ہے۔

### خواجہ میر درد درجہ شیت رباعی نگار

#### رباعیات خواجہ میر درد

پیدا کرے ہر چند تقدس بند  
جنت میں بھی اکل و شرب سے کب ہے نجات  
مشکل ہے کہ حرص سے ہو دل بر کندا  
دو رخ کا بہشت میں بھی ہو گا دھندا

نمبر ۲

ہم نے بھی کبھی جام و سودیکھا تھا  
ان باتوں کو اب غور جو کرے اے درد  
جو کچھ کہ نہیں ہے رو برو دیکھا تھا  
کچھ خواب سا تھا وہ کہ کبھو دیکھا تھا

نمبر ۳

آرام نہ دن کو بقراری کے سبب      نے رات کو چین آہ وزاری کے سبب  
واقعہ نہ تھے ہم تو ان بلاؤں سے کبھو      یہ کچھ دیکھا سوتیری یاری کے سبب

### رباعیات مومن خاں

تشریف وہ یاں نہ لائے افسوس افسوس      مرتے دم بھی نہ آئے افسوس افسوس  
سب رہ گئیں دل کی حسرتیں دل ہی میں      افسوس افسوس ہائے افسوس افسوس

نمبر ۲

مومن شوق گناہگاری کب تک      اے تیرہ دروں سیاہ کاری کب تک  
مان اپنے خدا کو باز آہرہ خدا      اے دشمن دین بتوں سے یاری کب تک

نمبر ۳

شوخ بھتی یہ سرے ستانے کے لیے      گرمی تھی یہ آگ پر لٹانے کے لیے  
دشمن پہ نگاہ سرد مہری کے سبب      تم آگ ہوئے مرے جلانے کے لیے

### رباعیات میر انیس

اب خواب سے چونک وقت بیداری ہے      نے زاد سفر کوچ کی تیاری ہے  
مرمر کے پہنچتے ہیں مسافروں تک      یہ قبر کی منزل بھی غصہ بھاری ہے

نمبر ۲

راہی طرف عالم بالا ہوں میں      دنیا سے عدم کو جانے والا ہوں میں  
یارب تیرا نام پاک جھپنے کے لیے      گویا اکٹ ہڈیوں کا مالا ہوں میں



نمبر ۳

مرمر کے مسافر نے بسایا ہے تجھے      رخ سبے پھر کہ منہ دکھایا ہے تجھے  
کیوں کر نہ لپٹ کے تجھ سے سوؤں لے قبر      میں نے بھی تو جان دے کے پایا ہے تجھے

نمبر ۴

زیبا ہے وقار بادشاہی کے لیے      جرأت واجب ہے کج کلاہی کے لیے  
لازم ہے کہ ہواہل سخن تیسر زبان      تلوار ضرور ہے سپاہی کے لیے

نمبر ۵

چوٹے ہے فنا اُسے بقا سمجھا ہے      جو چیز ہے کم اسے سوا سمجھا ہے  
ہے بحر جہاں میں عمر مانند جاب      غافل اس زندگی کو کیا سمجھا ہے

نمبر ۶

خاموشی میں یاں لذت گویائی ہے      آنکھیں جو ہیں بند عین بینائی ہے  
نہ دوست کا جھگڑا ہے نہ دشمن کا فساد      مرقد بھی عجب گوشہ تنہائی ہے

نمبر ۷

ہر برگ سے قدرت احد پیدا ہے      ہر پھول سے صفت صمد پیدا ہے  
سینہ ہے بشر کا وہ محیط ذخار      ہر ایک نفس سے جزو مد پیدا ہے

نمبر ۸

گلشن میں پھروں کے میر صحراد کیوں      یا معدن و کوہ و دشت و دریا د کیوں  
ہر جاتری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے      حیران ہوں کہ دوا لکھوں سے کیا کیا د کیوں

نمبر ۹

آغوشِ لحد میں جب کہ سونا ہوگا  
تنہائی میں آہ کون ہوئے گا انیس  
جز خاک نہ تکیہ نہ بچھونا ہوگا  
ہم ہوتیں گے اور قبر کا کدۂ ہوگا

نمبر ۱۰

کھینچے ہوئے سر کو تو کہاں پھرتا ہے  
عرصے جہاں کا اس قدر تنگ و حقیر  
پیری میں ٹسکل نو جوان پھرتا ہے  
خم ہو کے زمیں پہ آسماں پھرتا ہے

نمبر ۱۱

یارب کبھی جلد وہ زمانہ ہووے  
لیکن یہ دعا ہے یا عجیب الدعوات  
بندہ سوئے کر بلا ردانہ ہووے  
جانا ہووے تو پھر نہ آنا ہووے

نمبر ۱۲

بیجا ہر کوشش و طلب کو ماما  
مطلوب ملا ابن علی طالب سے  
اپنی اپنی غرض کا سب کو پایا  
جب شاہ عرب طے تورب کو پایا

نمبر ۱۳

دم الفت حیدر کا جو پھرتا ہوں میں  
مکن میں صفات واجب اللہ اللہ  
حال آتا ہے دل کو دھج کرتا ہوں میں  
کیا آگے کہوں خدا سے ڈتا ہوں میں

نمبر ۱۴

نا کام بھی کامیاب ہو جاتا ہے  
گر اک نظر مہر سے دیکھیں حیدر  
بے قدر فلک جناب ہو جاتا ہے  
ذرا اسی آفتاب ہو جاتا ہے



نمبر ۱۵

گر صورت دریا ہر تن جوش ہوں میں      لب لٹک ہی چشم تر ہے خالوش ہوں میں  
کیا پوچھتے ہو مقام و مسکن میرا      مانند حباب خانہ بردوش ہوں میں

نمبر ۱۶

آئینہ خاطر کی جلا ہے رونا      اور دیدہ مردم کی ضیا ہے رونا  
پوچھا جو علاج دل میمانے کہا      ہر درد کی دنیا میں دوا ہے رونا

نمبر ۱۷

عزت ہے یار و آشنا کے آگے      محبوب نہ ہوں شاہ و گدا کے آگے  
یہ پاؤں چلیں تو راہ مولا میں چلیں      یہ ہاتھ جب انھیں تو خدا کے آگے

نمبر ۱۸

آنکھ ابرو بیلاری سے لڑتی رہتی ہے      اشکوں کی ردا منہ پہ پڑی رہتی ہے  
دونوں آنکھیں ہیں میری سادون بھادوں      یاں سارے برس ایک جھڑی رہتی ہے

نمبر ۱۹

افسوس جہاں سے دوست کیا نہ گئے      اس باغ سے کیا کیا گل و عناب نہ گئے  
تھا کونسا نخل جس نے دیکھی نہ خزاں      وہ کون سے گل کھلے جو مرجب نہ گئے

نمبر ۲۰

دنیا میں نہ چین ایک ساعت دیکھا      برسوں نہ کبھی روز فراغت دیکھا  
راحت کا مکان امن کا گھر خانہ عیش      دیکھا تو جہاں میں کنج عزت دیکھا

## نمبر ۲۱

جز مدح سخن منہ سے کوئی کم نکلے  
ہر دم سینے سے آہ پر خم نکلے  
روحی بغدادک یا حسین ابن علیؑ  
نکلے تو محبت میں تری دم نکلے

## نمبر ۲۲

پیری آئی عذار بے نور ہوئے  
یاراں شبابِ پاس سے دور ہوئے  
لازم ہے کفن کی یاد ہر وقت انیس  
جو مشک سے بال تھے وہ کافور ہوئے

## نمبر ۲۳

کس منہ سے کہوں لائق تحسین میں ہوں  
کیا لطف جو گل کہے کر رنگین میں ہوں  
ہوتی ہے حلاوت سخن خود ظاہر  
کہتی ہے کہیں شکر شیریں میں ہوں

## نمبر ۲۴

آدم کو عجب خدا نے رتبہ بخشا  
ادنا کے لیے مقام اعلیٰ بخشا  
عقل و ہنر و تمیز و جان و ایمان  
اس ایک کف خاک کو کیا بخشا

## نمبر ۲۵

دل کو مرے شغلِ غمگساری کا ہے  
غفلت میں بھی طور ہو شکاری کا ہے  
گردوں کو اگر ہے سرکشی کا غرہ  
ہم کو بھی غرورِ خاکساری کا ہے

## نمبر ۲۶

جس شخص کو عقبی کی طلب گاری ہے  
اک چشم میں کس طرح سماں دونوں  
دنیا سے ہمیشہ اُسے بے زاری ہے  
خافل یہ خواب ہے وہ بیداری ہے



نمبر ۲۷

پیری سے بدن زار ہوا زاری کر  
کہتے ہیں زبان حال سے موئے سپید  
دنیا سے انیس اب تو بیزاری کر  
ہے صبح اجل کوچ کی تیاری کر

نمبر ۲۸

کیا کیا دنیا سے صاحب مال گئے  
پہنچا کے لحد ملک پھر آئے سب لوگ  
دولت نہ گئی ساتھ نہ اطفال گئے  
ہمراہ اگر گئے تو اعمال گئے

نمبر ۲۹

دنیا کو نہ جانو کہ دل آرام ہے یہ  
ہاں سوچ کے پاؤں اس زمین پر رکھو  
اے پختہ مزا جو طمع خام ہے یہ  
چھٹا نہیں پھنس کے جس سے وہ دام ہے

نمبر ۳۰

کیوں زری ہوس میں دربد پھرتا ہے  
اللہ رے پیری میں ہوس دنیا کی  
جانا ہے مجھے کہاں کدھر پھرتا ہے  
تھک جانے میں جب پاؤں تو سر پھرتا ہے

نمبر ۳۱

راحت کا مزہ عدوئے جان نکلا  
پیاسے رہے آکے چاہ دنیا پہ انیس  
دل سے نہ کبھی غم نہسانی نکلا  
نکلا بھی کبھی تو شور پانی نکلا

رباعیات مرزا دبیر

میزان سخن بے غم میں ملتا ہوں میں  
دل رہتا ہے بند قفل ابجد کی طرح  
فکر گہر نظم میں گھلتا ہوں میں  
جب حرف شناس ہو تو کھلتا ہوں میں

نمبر ۲

جور و ضہ میں باریاب ہو جاتا ہے      وہ اوج میں لا جواب ہو جاتا ہے  
جلتا ہے جو شب کو قبر جلد پہ چسراغ      وہ صبح کو آفتاب ہو جاتا ہے

نمبر ۳

حیدر نے دم بزل نہ کیا کیا بخشا      قطرے کے طلبگار کو دریا بخشا  
قربان مروت علی وقت اخیر      قاتل کو بھی شربت گوارا بخشا

نمبر ۴

بن بن کے ہزار بار آئی دنیا      پرچشم علی میں نہ سائی دنیا  
جس طرح گرایا تھا درخیر کو      نظروں سے اُسی طرح گرائی دنیا

نمبر ۵

جو مجلس تمام میں یہاں روتا ہے      ہر فرد گنہ اس کے خدا دھوتا ہے  
ثابت ہے حدیثوں سے کہ یہ قطرۂ اشک      ہر زخم حسین کی دوا ہوتا ہے

نمبر ۶

ہر چند ہزار سال آدم روئے      یعقوب بھی فسر زند کو پیہم روئے  
جس دم کیا حاسبان قدرت نے حساب      سجاد کے رونے سے بہت کم روئے

نمبر ۷

اس بزم کو دغا ہے کہ جنت میں ہوں      آنسو ہیں رواں کہ بحر رحمت میں ہوں  
کہتا ہے یہ دل سے درہم داغ حسین      گنجینہ مغفرت کی قیمت میں ہوں



نمبر ۸

یارب خلاق ماہ و ماہی تو ہے      بخشنده تاج و تخت شاہی تو ہے  
بے منت و بے سوال و بے استحقاق      دیتا ہے جو سب کو یا الہی تو ہے

نمبر ۹

زہرا کی دلا میں ہند صادق نکلی      کیا معتد منبر صادق نکلی  
زنداں میں جوشب کو آئی تھاشام میں غل      کاذب کے محل سے صبح صادق نکلی

نمبر ۱۱

میدان میں جب آئے شہ عرش پناہ      بولا بن سعد کیجئے بیعت باشاہ  
منہ پھیر کے حضرت نے یہ غصہ سے کہا      لا حول ولا قوۃ ————— الا باللہ

نمبر ۱۲

تکلیف دکھاتا ہے زمانہ ہم کو      دیتا ہے نہ دولت نہ خزانہ ہم کو  
اد گردش چرخ ہم سمجھتے ہیں تجھے      تو پیٹا ہے جان کے دانہ ہم کو

نمبر ۱۳

ہے کشور دل کو فوج غم نے لوٹا      اور شیشہ مبرسنگ غم سے ڈوتا  
یہ ماہ رجب وہ ہے کہ اس میں شہ سے      نانا کی لحد چھٹی مدینہ چھوٹا

ثنوی

ثنوی : یہ وہ صنف شاعری ہے کہ مقفا اشعار پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس کے واسطے اشعار کی تعداد معین نہیں ہے۔ لیکن ہے کہ چار شعر کی ثنوی ہو یا چار لاکھ کی۔ مفاہین کے اعتبار سے جو وسعت اس صنف شاعری کو حاصل ہے کسی اور صنف کو نہیں ہے۔ ہر طرح کے داخلی

اور خارجی مضامین اس میں گنجائش پاتے ہیں۔ تب ہی تو جیم اور ضخیم کتابیں۔ شاہنامہ، سکندر نامہ یوسف زلیخا وغیرہ کی سی اس میں لکھی جاسکتی ہیں۔ لاریب یہ وہ صنف شاعری ہے کہ جس میں شاعر شاعری کا کمال حسب مراد دکھلا سکتا ہے۔ چنانچہ اس صنف شاعری میں دنیا کی بڑی بڑی منظوم تصنیفیں انجام کو پہنچتی گئی ہیں۔ عروضی ترکیبوں کو نظر انداز کر کے دیکھئے تو ہر زبان میں شاعری کا کمال اسی صنف میں آشکارا ہے۔ ہولر، ورجل، ملٹن، فردوسی، بالیکی اور ویاس نے اس صنف میں اظہار کمال کیا ہے۔ ہاں میرانیس صاحب اس صنف کے پابند نہیں رہے ہیں۔ اگر مرثیہ نگاری کے لیے یہ صنف مروج شعرا ہوتی تو حضرت بھی کوئی نہ کوئی تصنیف ایلیڈا ایمنڈ پیرڈیائز لاسٹ شاہنامہ۔ راماتن اور مہابھارت کے رنگ کی چھوڑ جاتے حقیقت یہ ہے کہ میر صاحب کے کمال نے سدس نگاری کو اس درجہ تک پہنچا دیا ہے کہ جس تک شعرائے بالا کی بدولت ثنوی نگاری پہنچ گئی ہے۔ اس پر بھی نہایت قرین خوش مذاقی ہوتا ہے۔ اگر کوئی تصنیف منظوم بشکل ثنوی کتب بالا کے رنگ کی یادگار حضرت رہتی۔ ایسی تصنیف میر صاحب کے لیے کچھ مشکل نہ تھی۔ مگر اس جانب تقاضائے ملکی سے ان کو توجہ فراقی کا موقع نہ ملا۔

جاننا چاہئے کہ ثنوی نگاری صرف اس شاعر سے حسب مراد انجام پاسکتی ہے کہ جس کو امور ذہنی اور معاملات خارجی کو بھی موزوں کرنے کی صلاحیت معقول حاصل رہتی ہے۔ وہ شاعر جو صرف امور ذہنی کو یا صرف معاملات خارجی کو حوالہ قلم کر سکتا ہے۔ ثنوی نگاری کی داد نہیں دے سکتا۔ آئندہ معلوم ہوگا کہ بہت سے ایسے شعرا گذرے ہیں کہ انھوں نے ثنوی نگاری کی ہے مگر ان سے یہ کام پورے طور پر انجام نہیں ہو سکا ہے۔ ہر زبان میں انھیں شعرائے حسب مراد ثنویاں لکھی ہیں کہ جو داخلی اور خارجی دونوں طرح کے مضامین کی بندش پر پوری قدرت رکھتے تھے ثنوی نگاری کے لیے۔ شاعر کو بڑی اطلاع عام کی حاجت ہے۔ اسے معاملات عالم سے بحد طاقت بشریہ پورے طور پر باخبر ہونا چاہئے۔ اس کے ساتھ اسے مصور عالم بھی ہونا درکار ہے۔ اگر بندش مضامین میں اسے مصوری کی قدرت نہیں ہے تو اس کی ثنوی نگاری لطف کمال نہیں دکھلا سکیں گی۔

ثنوی میں کیسے کیسے مضامین کی گنجائش ہے مدات ذیل سے اس کی حقیقت ظاہر ہوگی۔

نمبر ۱۔ رزمی مضامین۔ اس کی مثال فارسی میں شاہنامہ، انگریزی میں پیرڈیائز لاسٹ۔ یونانی میں ایلیڈ اور اڈیسی، لاطینی میں اینڈ اور سنسکرت میں راماتن اور مہابھارت



ہیں۔ اردو میں کوئی مثنوی ان کتابوں کے رنگ کی نہیں ہے۔ اور عربی میں تو یہ صنف شاعری ہی نہیں ہے۔ واضح ہو کہ رزمی مثنوی کے لیے ضرور ہے کہ جو قصہ منظوم کیا جائے۔ وہ ایسا ہو کہ اخلاقی تمثیلی اور مذہبی اعتبارات سے کسی خاص قوم یا اقوام دنیا کے عام اغراض سے متعلق ہو۔ یہ سب کتابیں اسی اہم شکل کی ہیں۔ اب کوئی واقعہ بزرگ جو بوضع کتب بالا رزمی شاعری کے برتنے کے قابل نظر آتا ہے۔ واقعہ کربلا ہے۔ اگر فارسی یا اردو کا کوئی شاعر گرامی اس واقعہ کے متعلق کوئی رزمی مثنوی لکھتے تو اس کی تصنیف شاہنامہ، ایلید، ایضید، پیرمید، انزل اسٹ، مہا بھارت اور رامائن کا جواب نکلے گی۔ اگر وہ حضرات جو مرثیہ نگاری کا شغل رکھتے ہیں اس طرف اپنی توجہ مبذول فرمائیں تو کامیابی کی حالت میں ان کی تصنیف خالی قدرت سے نہ ہوگی، فقیر کی دانست میں اس وقت وہ حضرات جو شہرت شاعری کی غرض سے مرثیہ نگاری میں انہماک رکھتے ہیں کسی طرح کا نفع شاعری کو نہیں پہنچاتے ہیں۔ اب تک اس عاجز کی نظر سے کسی متبع میرانیں کا ایسا مرثیہ نہ گزرا جو میر صاحب کے باندھے ہوئے مضامین سے علیندہ ہو کر کسی قسم کا لطف خاص رکھتا ہو۔ اکثر تو یہی دیکھا کہ جن صاحب نے کچھ اُچ کی لی۔ بے آلے بے سرے ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ میر صاحب نے سدس نگاری کی شکل میں آئندہ کے شعرا کے واسطے کچھ نہیں چھوڑ رکھا ہے اب جو کسی کا مرثیہ چمکیلا نظر آئے تو سمجھنا چاہئے کہ اس کے لکھنے والے نے میر صاحب کی مرثیہ سے ضرور اقتباس نور کیا ہے۔ اور اگر اس کی تحقیق کی جائے گی تو یہ بات روشن ہو جائے گی کہ حضرت ہی کے کلاموں کی شعاں اس میں ہر طرف جلوہ گر ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی مرثیہ نگاری شاعری نہیں ہے۔ نقالی ہے۔ پس ایسی نقالی سے کوئی نقال میر صاحب کا ہمسر نہیں ہو سکتا۔ حضرت پر فوق لے جانا تو محالات سے ہے۔ اختصر جب سدس نگاری کی شکل میں میر صاحب نے رزمی شاعری کا خاتمہ کر دیا تو اب ضرور ہے کہ جو حضرات رزمی شاعری کی طرف توجہ فرمائیں۔ اس غرضی صنف کو چھوڑ کر اور کوئی غرضی صنف کو رزمی شاعری کے برتنے کے واسطے اختیار فرمائیں ظاہر ہے کہ مثنوی کے سوا کوئی اور غرضی صنف نہیں ہے کہ جس میں رزمی شاعری برقی جاسکتی ہے اور حقیقت حال بھی یہی ہے کہ اس صنف میں دنیا کے تمام بڑے بڑے رزمی معالے حوالہ قلم ہوتے گئے ہیں۔

نمبر ۲۔ رزمی مضامین : اس کی مثال فارسی میں یوسف زلیخا، یلی مجنوں و دیگر عشقیہ مثنویاں ہیں۔ ساتی نامے اور شکار نامے بھی اس میں داخل ہیں۔ کوئی شک نہیں کہ مغربی مثنویاں۔ شعرائے فارس نے خوب لکھی ہیں۔ جیسا کہ آئندہ ظاہر ہوگا۔ ان کے شاعری کے نقصانات بھی

حوالہ قلم کیے جاتیں گے۔ اس مدکی مثنویاں ہر زبان میں موجود ہیں۔ انگریزی میں لارڈ بائرن، سروالٹر اسکاٹ، الگزینڈر پوپ مور اور بھی دیگر شعرا نے خوب خوب مثنویاں لکھی ہیں۔ ان شعرا نے فرنگ کا کمال یہی ہے کہ بندش مضامین تبعیت فطرت کے ساتھ کرتے ہیں۔ یہ خوبی فارسی اور اردو کے مثنوی نگاروں میں کمتر پائی جاتی ہے۔

نمبر ۳۔ حکمت آموز مضامین : اس کی مثال بوستان ہے۔ اس مدکی مثنویاں اور زبانوں میں بھی جیسا کہ آئندہ ظاہر ہوگا۔

نمبر ۴۔ تصوف آموز مضامین : اس کی مثال مثنوی ملائے روم ہے اس مدکی مثنویاں یورپین زبانوں میں کم ہیں لیکن اگر تصوف علم اخلاق کا مترادف سمجھا جائے اور جیسا کہ اس کو مترادف سمجھنا چاہئے تو ایسی حالت میں ایسی مثنویوں کی قلت یورپین زبانوں میں نہیں پائی جاتی ہے۔

نمبر ۵۔ متفرق مضامین : اس کی مثالیں آئندہ حوالہ قلم ہوں گی۔

واضح ہو کہ رزمی اور بزمی مثنویوں کا کمال یہ ہے کہ ان کی بندش مضامین اس درجہ کی سلجھی ہو کہ قریب قریب ڈراما کا لطف پیدا کر سکے۔ لاریب وہی مثنوی ڈراما کا رنگ پیدا کر سکتی ہے جو فطری مضامین اور فطری ترکیبوں پر مشتمل ہوگی۔ ہومر کی ایلیڈ کا یہی طور ہے کہ قریب قریب ڈراما کی خوبیوں کو پہنچ گئی ہے اور حقیقت حال بھی یہی ہے کہ یونان میں ڈراما کا ایجاد اسی کتاب کی بنیاد پر ظہور میں آیا۔ ماقبل میں ایجاد ڈراما کے اسباب حوالہ قلم کر چکا ہے۔ المختصر رزمی اور بزمی مثنویوں کو اس قدر نیچرل ہونا چاہئے کہ اگر ان کے مضامین ڈراما کی شکل میں بندش پائیں تو اس صنف شاعری میں آسانی اور لطافت کے ساتھ درآسکیں۔ حکمت آموز اور تصوف آموز مثنویوں کے لیے یہ امر درکار ہے کہ مسلم اور متبع مسائل حکمت و تصوف سے ان کا کوئی مضمون خلاف نہ ہو۔ اور دلیل و استدلال میں جہول واقع نہ ہو۔ ان قسموں کی مثنویوں میں بعد امکان شاعر کو مبالغہ پرداز سے تمام تر احتیاط لازم ہے۔ علاوہ اس کے طریقہ بیان ایسا ہو کہ سامع کے دل پر جب مراد اثر پیدا کر سکے متفرق مضامین کی مثنویوں کو بھی فطرتی بیانات سے خالی ہونا نہیں چاہئے۔ علاوہ اس کے ان کے مضامین کو مفید نام ہونا ضروری ہے فہم کش کوئی اور ہدیان سرائی کو مثنوی نگاری سے کوئی تعلق نہیں ہے۔



## فارسی کی مثنویاں

رزمی مثنویاں - فارسی میں رزمی مثنویاں بکثرت موجود ہیں، جیسا کہ قبل میں بہت سی ایسی مثنویاں نام بنام مذکور ہو چکی ہیں، لیکن ان سبھوں میں ممتاز ترین مثنوی شاہنامہ ہے۔ پس اغراض کتاب ہذا کے لیے راقم اس کتاب مبسوط کی نسبت اپنے خیالات ذیل میں گزارش کرتا ہے۔

## حکیم ابوالقاسم فردوسی بہ حیثیت مثنوی نگار

### شاہنامہ فردوسی

فردوسی کی شہرت اس کے شاہنامہ کی بدولت ہے۔ یہ ایک رزمی مثنوی ہے اور ایسی ہی مثنوی ہے کہ جس کا مذکور ہو مراہیڈ درجل کی اینیڈ ملٹن کی پریڈائز لاسٹ بالیچی کی رامائن ویاس کی مہابھارت اور میرانیس کے مراٹھ کے ساتھ زبان اہل اطلاع پڑتا ہے۔ شاہنامہ اہل عجم کی ایک قومی رزمی کتاب ہے۔ شاہنامہ کی ساخت الیڈ اینیڈ پریڈائز لاسٹ مہابھارت اور مراٹھ انیس سے اس طور پر علیحدہ ہے کہ یہ سب رزمی تصنیفات علیحدہ علیحدہ خاص خاص واقعات سے تعلق رکھتی ہیں اور شاہنامہ ایک منظوم تاریخ کا رنگ رکھتا ہے یعنی اس میں کسی واقعہ خاص کا ذکر نہیں ہے۔ یہ کتاب ملک ایران کو فتح کرنے تک کے حالات درج ہیں۔ لاریب پوری تاریخی حیثیت اس کتاب کو حاصل نہیں ہے۔ اس لیے کہ ان میں غیر فطری امور بے حد داخل ہیں۔ مثلاً چند بادشاہوں اور پہلوانوں کی عمریں عمر بنی آدم سے دو چند زیادہ درج پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح دیو وغیرہ کے فسانے حوالہ قلم دیکھے جاتے ہیں۔ کوئی شک نہیں کہ رستم ایک پہلوان تھا۔ مگر شاہنامہ کا رستم جو ہے بقول فردوسی وہ فردوسی کا رستم ہے۔

منش کردہ ام رستم داستاں و گرنہ یلے بود در سیستان

مختصر ہے کہ یہ کتاب جمیمہ اس کو تاریخی پایہ حاصل ہے اور اس کا انداز رزمی تصنیفات بالا کا ہے۔ اس کتاب میں بہت سے رزمی معاملات اس طور پر جگہ پاتے گئے ہیں کہ خاص خاص واقعات سے تعلق رکھتے ہیں اور علیحدہ علیحدہ رزمی شاعری کے برائے خود نمونے ہیں مثلاً نغین جنگ رستم با فراسیاب جنگ رستم با دیوسفید، جنگ رستم با سہراب، جنگ رستم با برزو، جنگ رستم با اسفندیار وغیرہ وغیرہ مگر

معاملات فرداً فرداً ایسے واقعات بزرگ نہیں ہیں کہ جو ایلید، اینیڈ، پیرنڈائز لاسٹ، رمان ہابھارت اور مراٹھ انیس کے معاملات سے اہم ہوں۔ یہ افتاد خود ایک ایسی ہے کہ جو فردوسی کے رزم نگاری کو بلند پائے کی کامراییہ پورے طور پر نہیں بخش سکتی ہے۔ ایسی حالت میں بمقابلہ ہومر درجل، ملٹن، ہالیکی و ہاس اور میرانیس کے ان شعرا سے فردوسی کا گوئے سبقت کا لے جانا ان کا مقابل ہونا دشوار نظر آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس قدر کسی رزمی تصنیف کا سرمایہ عمدہ ہوگا۔ وہ تصنیف بھی اسی قدر عمدہ ہوگی بشرطیکہ شاعر بھی عمدگی سرمایہ سے کام لینے کی عمدہ صلاحیت رکھتا ہو۔ واقعہ کر بلا کا معاملہ ایک عمدہ سرمایہ ہے۔ لاریب رزمی تصنیف کے لیے اس سرمایہ سے بہتر سرمایہ نصیب نہیں ہو سکتا۔ مگر اس سرمایہ سے کام لینے کے لیے میرانیس ہی سا شاعر درکار ہے۔ بالخصوص فردوسی کو سرمایہ حسب مراد کے نہیں حاصل رہنے سے شعرائے بالا سے مقابلہ کا اچھا موقع نظر نہیں آتا ہے۔ یہ تو حالت موجودگی سرمایہ کی ہے۔ لیکن اگر تنہا دیر کے لیے مان بھی لیا جائے کہ سرمایہ کلام فردوسی کا شعرائے بالا کے ساتھ ہم پائیگی نہیں حاصل ہے اور شعرائے بالا سے ہومر کو انتخاب کر کے اگر ہومر کے ساتھ فردوسی کا موازنہ اختیار کیا جائے تو ہومر کا پلہ گراں ثابت ہوگا۔ یہ صرف اس بنیاد پر کہ ہومر میں کیرکٹر نگاری کی طاقت فردوسی سے بہت زیادہ دیکھی جاتی ہے شاعر کیرکٹر نگار نہیں ہو سکتا جب تک کہ جزئیات کے بیانات پر اس کو پوری قدرت نہ ہو۔ ہومر کو یہی فردوسی کے مقابل میں زیادہ تھی۔ میں اپنے بیان کی توضیح تحریر ذیل سے کرتا ہوں۔

ہومر کی شاعری کی بحث جلد اول میں آچکی ہے اور اس جلد میں اس کی تصنیف ایلید ہے ذکر پاچکی ہے۔ اس ایلید میں بہت سے مرد و زن کے بیانات داخل ہوتے گئے ہیں۔ اسی طرح پرشہنام میں بہت سے مرد و زن کے مذکور آتے گئے ہیں۔ مثلاً ایلید میں ذکر طبقہ میں پیرایم پیرس، کھنر کلینر وغیرہ اور اناٹا میں ہیکو، اباہن، اندرویکی وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح شاہنام میں سام نرمیانڈال، رستم گود، زرگیو، بیزن، طوس گستہم وغیرہ طبقہ ذکر میں اور دواہ، سوواہ، تہمینہ، فرنگیش، منبہ، وغیرہ وغیرہ طبقہ اناٹا میں۔ ہومر نے اپنے بیانات مرد و زن میں ہر فرد کے کیرکٹر یعنی امور خاصہ کو اس خوبصورتی سے حوالہ قلم کیا ہے کہ ہر فرد ایک دوسرے سے اس کے مختصات کی وجہ سے صاف صاف علیحدہ معلوم ہوتا ہے۔ یعنی خوبی بیان یہ ہے کہ ذکر طبقہ کا ہر شخص مثلاً پیرایم پیرس کھنر کلینر وغیرہ وغیرہ اپنے امور خاصہ کے باعث ایک دوسرے سے ممتاز طور پر ممیز ہوتا ہے اور اسی طرح اناٹا میں سے ہر عورت مثلاً ہیکو، اباہن، اندرویکی وغیرہ



اپنے کیرکٹروں کی بدولت ایک دوسرے سے علامہ نظر آتی ہیں۔ یہی چیز ہے کہ جس کی کمی فردوسی کو ہوتر کے برابر ہونے نہیں دیتی ہے اور یہی چیز ہے کہ میرانیس کو ہومر سے مرع کیے دیتی ہے۔ میرانیس کی کیرکٹرنکاری اس مرحوم کی رزمی شاعری کے بیان میں ذکر پاتے گی۔ بالخصوص جس وضاحت امتیازی کے ساتھ ہومر نے اپنے فسانہ کے افراد کا بیان حوالہ قلم کیا ہے۔ فردوسی اپنی تصنیف کے افراد کو اس قدرت کے ساتھ احاطہ تحریر میں نہیں لاسکے ہیں۔ شاہنامہ کے پڑھنے سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ سام کی شجاعت سے زریان کی شجاعت کس طور پر علیحدہ رنگ رکھتی ہے۔ امور خاصہ طور اور گستم کے کیا تھے۔ گوداز اور سام میں کیا فرق تھا۔ پہل ستم اور گویو کس کس رنگ کے شجاع تھے۔ بہمن اور پشوتن میں کیا امتیازی بات تھی۔ فرامرزا اور گویو کے امتیازی کیرکٹر کیا تھے۔ خود رستم کے امور خاصہ بہت وضاحت کے ساتھ نہیں بیان ہو سکے ہیں۔ روئین تنی کے مضامین کے مضمون سے علامہ ہو کر رستم اسفند پار سے کیوں کر ممیز ہوتا ہے۔ سہراب اور برزو کے کیرکٹر کا فرق مطلق نہیں دکھلایا گیا ہے۔ اسی طرح عورتوں کے امور خاصہ ممتاز طور پر حوالہ قلم نہیں کیے گئے ہیں۔ روداہ اور تہمینہ، یامینزہ اور فرنگیش کیوں کر ایک دوسرے سے کیرکٹر کے اعتبار سے پورے طور پر ممیز کی جاسکتی ہیں۔ شاہنامہ سے کچھ پتا نہیں لگتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی کو امور عامہ کے بیان کی بڑی قدرت تھی مگر امور خاصہ کے بیان میں اسے حسب مراد دستگاہ نہ تھی، جو شاعر امور خاصہ کے بیان پر قدرت رکھتا ہے وہ ہی کیرکٹرنکار ہوتا ہے کیرکٹرنکاری رزمی شاعری کی جان ہوتی ہے اس قدرت کی بذلت شاعر کی رزمی تصنیف ڈراما کا عالم پیدا کرتی ہے۔ چنانچہ ہومر کی تصنیف ڈراما کی ایجاد کا وسیلہ ہوئی جو شاعر کیرکٹرنکار نہیں ہے ڈراما نگار نہیں ہو سکتا۔ فردوسی کو امور عامہ کے بیان میں پوری صلاحیت دیکھی جاتی ہے۔ مثلاً جب یہ شاعر گرامی مضمون شجاعت کو حوالہ قلم کرتا ہے تو شجاعت کو پوری قابلیت کے ساتھ احاطہ تحریر میں در لاتا ہے مگر ہر شجاع کے اندر شجاعت کو علامہ علامہ نہیں دکھلا سکتا ہے۔ یہی حال اور مضامین کا بھی ہے۔ مثلاً اس شاعر کے حسن کا بیان بھی امر عام کی حیثیت سے لا جواب ہوتا ہے۔ مگر افراد کے حسن کے مختصات کی تحریر کا انجام اس سے حسب مراد رنگ پر عمل نہیں آتا ہے۔ صاحب شاہنامہ تہمینہ کے حسن بیان یوں فرماتے ہیں۔

دوا بروکمان و دو گیسو کمند بقامت بکردار سرور بلند

یہ ایسی عام تعریفیں حسن کی ہیں کہ ہر محبوب دلکش کی شان میں کہی جاسکتی ہیں۔ یہ تعریف تہمینہ کو فرنگیش یا مینزہ سے ممیز نہیں کر سکتی ہے۔ لاریب فردوسی کو کیرکٹرنکاری کی بہت صلاحیت حاصل تھی

اس لیے اس کے رزمی معاملات سب کے سب ایک ہی انداز کے نظر آتے ہیں۔ اور اس عدم جہت کے باعث ہومر کے رزمی معاملات کے اعتبار سے کنٹرول آویزی رکھتے ہیں۔ فردوسی کا ایک بیان جنگ پڑھ کر طبیعت سیر ہو جاتی ہے دوسرا بیان جنگ چونکہ اول بیان جنگ کے طور کا ہوتا ہے۔ دوسرے کے پڑھنے سے کوئی لطف تازہ نہیں اٹھتا ہے۔ اگر فردوسی کا شاہنامہ کیرکٹر نگاری کی خوبیاں رکھتا تو ایران میں ڈراما نگاری رواج پا جاتی۔ جاننا چاہتے کہ فردوسی کا شاہنامہ وہ کتاب ہے کہ جو فارسی کے اصناف شاعری کی جڑ ہے جیسا کہ راقم الحروف سابق میں عرض کر چکا ہے لیکن ڈراما نے جو اس کتاب کے ذریعہ سے رواج نہیں پایا اس کا سبب یہی ہے کہ یہ کتاب کیرکٹر نگاری کی خوبیوں سے بہت کچھ محروم ہے۔ برخلاف اس کے ایلید کا معاملہ ہے کہ اس کی کیرکٹر نگاری کی بدولت ڈراما نگاری بھی دیگر اصناف شاعری کی طرح یونان میں وجود میں آئی۔

## نخستین جنگ رستم با افراسیاب

چہ گوئد پورسا ز جنگ و نہر د	چو رستم بدید آنک قارن چہ کرد
کہ پداست تابان درفش بہ نفس	چہ پوشد کجا بفرساز و درفش
میان پلاں سرفرازم بدو	نشان دہ کہ پیکار سازم بدو
کشانش بیارم بہ نزدیک شاہ	اگر یار باشد مرا ہو و ماہ
من و گرز و میدان و پور پشنگ	مراجہ بدو نیت امر و جنگ
بگیرم کشانش بیارم برو	من امر و بند کمر گاہ او
اگر کوہ باشد بر آرم ز جاتے	بفرمان جان آفریں یک خدائے
مراں بدکش مرد سپہ راہ و داد	بہ بندم بیارم بر کیقباد
یک امر و باخویشتن ہوش دار	بدو گفت زال اے پسر گوش دار
دم آہنخ و در کینہ ابر بلاست	کہ آں ترک در جنگ نثار دباست
ز آہنش ساعد ز آہن کلاہ	درفش سیاہ است و خفتاں سیاہ
درفش سیاہ بہ بر خود سر	ہمہ روئے آہن گرفتہ بزر
بہ رزم اندر کش وہ برابر بود	بہیما کہ گردد دلاور بود
چنین است آئین پور پشنگ	بہ کجائے ساکن نہ باشد بجنگ



نہنگ اوز دریا بر آرد بدم  
 از خویشتن را نگہدار سخت  
 شود کوہ آہن جو دریائے آب  
 بدو گفت رستم کہ اے پہلوان  
 جہاں آفرینندہ یارمن است  
 اگر اژدہا باشد دیو نر  
 بہ منی کنوں در صفت کارزار  
 بدانگونہ بادے بر آیم بجنگ  
 برا نگخت آن خرس روئینہ سُم  
 دال رفت تا سوتے توران سپاہ  
 جو افراسیابش بہ ہاموں بدید  
 زگرداں بہ پرسید کیں اژدہا  
 کدام است کیں را ندانم بنام  
 بود تمش نام و بس سرکش است  
 نہ منی کہ باگز سام آمد است  
 بہ پیش سپہ آمد افراسیاب  
 چو رستم دراد بفرسود راں  
 چو تنگ اندر آورد باو زمین  
 چو افراسیابش بدانگونہ دید  
 زمانے بکوشید با پور زال  
 بہ بند کرش اندر او بخت جنگ  
 ہی خواست بردن بہ پیش قباد  
 زہنگ سپہدار و چنگ سوار  
 گشت و بجاگ اندہ آمد سرش  
 تہمتن فرد برد چنگ دراز  
 زہشتا درش نیست بالاش کم  
 کہ مرد دلیر است پیروز بخت  
 اگر بشنود نام افراسیاب  
 توازن مدارا بج رجبہ رواں  
 دل دیتغ و بازو حصارمن است  
 بیارش بگرفتہ بند کمر  
 کزاں شاہ حسگی بر آرم دمار  
 کہ بروئے بگریہ سپاہ پشنگ  
 بر آمد خردشیدن گادوم  
 یکے نعرہ زد شیر لشکر پناہ  
 شگفتید زان کودک نارسید  
 بدیں گونہ از بند گشتہ رہا  
 یکے گفت اپن پور دستان سام  
 نگہ جنگ چوں آب و چوں آتش است  
 جوان است و جویائے نام آمد است  
 چو کشتی کہ موجش بر آرد در آب  
 بگردن بر آورد گرز گراں  
 فرد کرد گرز گراں را بہ زین  
 نبرد جنگ دیتغ از میاں بکشید  
 تہمتن برا فراختہ جنگ و بال  
 جدا کردش از پشت زین پلنگ  
 دید جنگ روز نخستینش یاد  
 نیامد دوال کمر پاندار  
 سواراں گرفتند گرداندرش  
 رہود از سرش تاج آن سرفراز

سپہد چو از چنگ رستم بہ جت  
 چرا گفت نہ گرفتیش زیر کش  
 چوں گردان ایران ہمتن بہ تن  
 چو تارن چو گشود و گردان ہمہ  
 تہمتن کیے را بر خویش خواند  
 بگفتا گرفتہ کمر بند شاہ  
 گستاخ شد از ہم کمر بند و لے  
 چو برخواست از خاک آں پیکر ش  
 رہودم بہ توفیق جاں آفرین  
 کہ تا بر کم تیغ تیز زار میاں  
 چوں آواز زنگ آمد از پشت پیل  
 کیے مژدہ بردند نزدیک شاہ  
 بہ نزد سپہدار ترکان رسید  
 گرفتیش کمر بند و افکند خوار  
 گرفتند گردن دلادر سران  
 سپہدار ترکان چو شد زیر دست  
 پس آنگاہ راہ سیاہان گرفت  
 چوں ایں مژدہ بشنید از و کی قباد  
 بیکبارہ بر خیل تو راں زنند  
 ز جلتے اندر آمد چوں آتش قباد  
 ز دست و گر زال و مہر اب  
 بر آمد خردشیدن دار و گیر  
 بر آں ترک زرین و زرین پسر  
 تو گفتی کہ ابرے بر آمد ز گنج  
 دوشکر بیکد گیر او بختند

نجائید رستم ہی بشت و دست  
 ہی بر کمر ساختم پنجہ لیش  
 برفتند نزدیک آں سیلتن  
 برستم شدند آفرین خوان ہمہ  
 ہمہ کار رستم بد و باز راند  
 بد اں تا بیارم بہ ایران سپاہ  
 بے فتاد از دست پیوند و بے  
 چو خورشید رخشنده تاج سرش  
 بزودی برش نزد شاہ گزین  
 کنم رستم رے بہ تو رانیاں  
 خردشیدن کوس از چند میل  
 کہ رستم بد رید قلب سپاہ  
 درفش سپہدار شد تا پدید  
 خروشے بر آمد ز ترکان نزار  
 پیادہ بہ برندش آں سردار  
 کیے بارہ تیز تک از نشست  
 سپہ را رہ کرد و خود جان گرفت  
 بفرمود تا شکرش ہمچو باد  
 برویخ ایشاں ز بن برکنند  
 بہ جنبید شکر چو دریا ز باد  
 برفتند بر خاش جو دود لیسر  
 درخشیدن خنجر و زخم تیر  
 غمیں شد سر از چاک چاک بتر  
 ز شخرف نیرنگ زد بر تر تاج  
 تو گفتی ہمہ اندر آمیختند



غزویدن مردو غنہ کوس	ہی کرد بر غسراں فوس
زاسیب شیران پولاد چنگ	دریہ دل شیر و چرم پلنگ
زمین کردہ بد سرخ رستم بنگ	یکے گرزہ گا و سپکر بنگ
بہر سو کہ مرکب برانگیختے	چو برگ خنزاں مفرور ریختے
بشمیر براں چو بگذاست دست	سر فرزاں ہی کرد پست
اگر بزدلے بر سر آں مفرور	بد و نیمہ کردیش با اسپ و ساز
چو شمشیر برگردن افسراختے	چو گواز سواراں سرا انداختے
ز خون دلیراں بدشت اندر دل	چو دیار زمین موج زن شد زخون
ہم روئے صحر اسر و دست دپا	بزیر تم اسپ جنگ آزما
زم ستودان در آں پہن دشت	زمین شد شش و آسمان گشت
فرود رفت و بر رفت روز نبرد	بہا ہی نم خون و بر ماہ گرد
بزور نبرد آں مل ارجمند	بشمیر و خنجر بہ گرز کمند
برید و درید و شکست و بہت	پلان را مرد سینہ و پا و دست

بزمی مثنویاں : اس قسم کی مثنویاں فارسی میں بہت ہیں، نظامی، امیر خسرو، خواجہ کرمانی جامی، ہاتفی، بکتی، ہلالی، عرفی، فیضی، وغیرہ وغیرہ نے بہت سی بزمی مثنویاں لکھی ہیں۔ ان سب شعرا کی مثنویوں پر رپوی کی گنجائش اس کتاب میں نہیں ہے۔ راقم الحروف مولانا نظامی کی اس مثنوی سے جس کا نام خسرو شیریں ہے اور بھی جامی کی زلیخا سے کچھ اشعار ذیل میں درج کرتا ہے:

### در بزم خسرو پرویز با شیرین وصف بہار می فرماید

چو پیر سبز پوش آسمان	ز سبزہ بر کشد صبح جوان
جوانا نراد پیران را و گربار	بسر سبزی در آرد سرخ گلنار
گل از گل تخت کاوسی بر آرد	بنفشہ پر طاسی بر آرد
بسا مرغان کہ عشق آوازہ گردد	بسا عشق کہن کان تازہ گردد
چو خرم شد بشیریں جان خسرو	جہاں می کرد عہد خسرو نو
چوں خرم نہاد و خورمی دوست	ز گلہا برد درید از خرمی پوست

گل ارشادی علم در باغ میزد      سپاہ فاخستہ بر زناغ میسزد  
 سمن ساقی و نرگس جام در دست      بنفشہ در غمار و سرخ گل مست  
 صبا برقع کشادہ سادگان را      صلا در دادہ کار افتادگان را  
 شمال انگشت ہر سو خسرو شے      زدہ برگاؤ چشے پیل گوشے  
 زمین نطع شقائق بوش گشتہ      شقائق مہد مرزن گوش گشتہ  
 ہی سرواز چین قامت کشیدہ      ز عشقش لالہ پیراہن دریدہ  
 بنفشہ تاب زلف انگندہ بردوش      کشادہ بانسین رانبا گوش  
 عروساں رباعین دست بر رویے      شکر فغان شگوفہ شازہ در رویے  
 نمودہ ناف خاک البستینہا      زنان آوردہ بیرون استینہا  
 ہوا بر سبزہ گوہر بار گشتہ      ز مرد را بہ مردارید بستہ  
 غزال و شیر مست از دلنوازی      بہ گرد سبزہ بامادر بازی  
 تدریان بر ریاحین پر فشانده      ریاحین بر تدریان سرفشانده  
 زہر شاخے شگفتہ نو بہارے      گرفتہ ہر گلے بر کف نثارے  
 صبا از سبزہ در ہر باغ و راغے      ز گل افروختہ ہر دم چسراغے  
 گل از ہر منظر نظارہ کردہ      قبائے صرخ را صد پارہ کردہ  
 درم ریزہ شدہ ہر شاخسارے      ز سر ہر یک جدا کردہ نثارے  
 بطرف ہر چین سروے چہان      بہر جوئے شدہ آبے روان  
 صنوبر در بر سنبل نشستہ      چوستان در میان گل نشستہ  
 چنیں فصلے بدیں عاشق نوازی      خطا باشد خطا بے عشق بازی  
 خراماں خسرو شیرین شب و روز      بہر نہایت کہے شاد دل افروز

گہے خوردندے در سر غزارے

گہے چیدند گل در کوہ سارے

واضح ہو کہ مولانا نظامی ایک معروف سنوی نگار ہیں اور بحیثیت مجموعی فارسی کے ایک مستند شاعر ہیں۔ اس پر بھی بہت بڑے فطرت نگار شاعر نہیں معلوم ہوتے۔ اشعار بالا میں بہار کے وصف منظوم فرماتے ہیں نظم کا اسلوب کیا شک ہے کہ بہت اچھا ہے۔ مگر کوئی عمدہ بیان کسی بہاری



سنتری کا حوالہ قلم نظر نہیں آتا ہے۔ وہ ہی نگل و صبا و سنبھل کی بندش غیر فطری انداز کے ساتھ بالا میں پائی جاتی ہے۔ جیسا کہ اکثر فارسی کی مثنویوں میں دیکھی جاتی ہے۔ خارجی مضامین کی بندش اس فطری ترکیب کے ساتھ جیسا کہ سروالٹر کی لیڈی آف دی لیک میں دیکھتے ہیں۔ کسی فارسی کی مثنوی میں نہیں دیکھتے۔ راقم الحروف کی دانست میں خارجی مضامین جس قدر فطری انداز کے ساتھ میر حسن کی مثنوی میں بندش پاتے گئے ہیں۔ فارسی کی کوئی مثنوی یہ ترکیب بندش کی نہیں رکھتی فارسی کی تمام بڑی مثنویوں کے مقابل میں اردو کی مثنوی بہت زیادہ نیچرل پیراء بیان رکھتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ فارسی کے مثنوی نگار شعرا عموماً فطرت نگاری کا کم مذاق رکھتے ہیں۔ ان کی ساری تصنیفیں نیچرل معاملات سے کم و بیش طور پر علیمدگی دکھلاتی ہیں۔ جہاں دیکھو مبالغوں کی بھرمار ہے۔ یا اسی طرح کے مصنوعی اندازوں سے ان کے کلام بھرے ہوئے ہیں۔ فارسی کی شاعریاں عام طور پر اس نامطبوع پیراء سے بدنام ہو رہی ہیں۔ صرف مثنوی نگاری ہی کا یہ طور نہیں ہے۔ اب کے شعرا اگر اصلاح مذاق کی طرف اپنی توجہ مبذول فرمائیں تو فارسی کی شاعری ان کی اس توجہ فرمائی سے بہت کچھ فائدے اٹھائے گی۔ ذیل میں کچھ اشعار مولانا جامی کی زینبا سے نذر ناظرین ہوتے ہیں:

## خواب دیدن یوسف سجدہ آفتاب و ماہتاب و یازدہ ستارہ و

### استماع اخوان و ازدیا و حسد ایشاں

خوش آن کر بند صورت و باز رستہ	ز سحر چشم بنذاں چشم بستہ
دلش بیدار و چشمش در شکر خواب	ندیدہ کس چنین بیدار در خواب
پوشیدہ زنا پائندہ دیدہ	ولے پوشیدہ آئیندہ دیدہ
شعبہ یوسف بہ پیش چشم یعقوب	کہ پیش او چشمش بود محبوب
بجواب خوش نہادہ سر بالین	بخندہ لعل نوشیں کرد شیریں
ز شیریں خنداں لعل شکر خند	بدل یعقوب را شورے در انگند
چو یوسف نرگس سیراب بکشاد	چو بخت خوش چشم از خواب بکشاد
پدر گفت اے شکر شرمندہ تو	چہ موجب داشت شکر خندہ تو
بگفتا خواب دیدم مہر و مدد	در خندہ کو اکب یازدہ را

که کس را داد تعظیم بدادند  
 پدر گفتا که بس کن این سخن بس  
 مبادا این خواب را احوال بدانند  
 ز تو دل هزارا غصه دارند  
 بیداری صد آزارت رسانند  
 درین غصه کیت فارغ گذارند  
 که بس روشن بود تعبیر این خواب  
 بیارے بگسلد زنجیر تدبیر  
 نهاد آن را با خواں در میان  
 باندک وقت و در هر زبان گشت  
 که سرخواهی سلامت مرنگهدار  
 دگر نتوان بدستان پائے اولست  
 ز غصه پیر بن بر خود در یدند  
 که نشناسد ز نفع خود ضرر را  
 که طفلی جز طفلی را نشاید  
 دہد زان گوهر خود را فروغ  
 شود از صحبت آن ناشکیبے  
 برو مهر پدر فرزند می  
 بیفتد این قدر حشمت پسندش  
 بسجده پیش او افتیم بر خاک  
 نباید جہ جوی این قدر ہم  
 پدر را ما ہوا داریم نے او  
 دگر شب خانہ اس را پاس بانیم  
 برا حباب آبروئے رویش از ما است  
 کریمیاں بر سر ما برگزید است  
 مہر را ہش توان آوارہ سازیم  
 دواے او بجز آوارگی نیست  
 کہ کس را داد تعظیم بدادند  
 پدر گفتا کہ بس کن این سخن بس  
 مبادا این خواب را احوال بدانند  
 ز تو دل ہزارا غصہ دارند  
 بیداری صد آزارت رسانند  
 درین غصہ کیت فارغ گذارند  
 کہ بس روشن بود تعبیر این خواب  
 بیارے بگسلد زنجیر تدبیر  
 نهاد آن را با خواں در میان  
 باندک وقت و در ہر زبان گشت  
 کہ سرخواہی سلامت مرنگهدار  
 دگر نتوان بدستان پائے اولست  
 ز غصہ پیر بن بر خود در یدند  
 کہ نشناسد ز نفع خود ضرر را  
 کہ طفلی جز طفلی را نشاید  
 دہد زان گوہر خود را فروغ  
 شود از صحبت آن ناشکیبے  
 برو مهر پدر فرزند می  
 بیفتد این قدر حشمت پسندش  
 بسجده پیش او افتیم بر خاک  
 نباید جہ جوی این قدر ہم  
 پدر را ما ہوا داریم نے او  
 دگر شب خانہ اس را پاس بانیم  
 برا حباب آبروئے رویش از ما است  
 کریمیاں بر سر ما برگزید است  
 مہر را ہش توان آوارہ سازیم  
 دواے او بجز آوارگی نیست



باید چاره سازی را میاں بست  
نرفته اختیار چاره از دست

چو خارے بردم از شور بخنجه  
باید کند ناگتہ درختے

بقصد چاره سازی عهد بستند

بعزم مشورت یکجانشینند

اہل واقفیت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ یہ خواب حضرت یوسف علیہ السلام کا تورات میں اور یہی قرآن شریف میں مذکور ہے۔ لاریب مولانا جامی نے اس کو خوش اسلوبی کے ساتھ منظوم فرمایا ہے یہ مثنوی جامی کی ایک دلکش پیرا رکھتی ہے۔ فردوسی کی یوسف زلیخا ہرگز اس کو نہیں پہنچتی ہے۔ فردوسی نے اپنی مثنوی کے لیے وہی رزمی بحر اختیار کیا ہے۔ جو شاہنامہ کی ہے۔ اور اختلاف تقاضائے قصہ یوسف و زلیخا بیانات کا انداز بھی رزمی رکھا گیا ہے فردوسی کے انداز بیان کی بدولت حضرت یوسف رستم نامعلوم ہوتے ہیں۔

حکمت آموز مثنویاں : یہ مثنویاں ایک بکار آمد قسم شاعری کی ہیں۔ اس میں مسائل علم الاخلاق تدبیر المنزل اور سیاست الدن کے منظوم پیرایہ میں حوالہ قلم ہوتے ہیں۔ مثال اس قسم کی مثنوی کی سعدی مرحوم کی بوستاں اور حضرت فخر الدین عطار کا پند نامہ ہے۔ انھیں دونوں کتابوں سے بہ سبیل انتخاب کچھ اشعار درج ہذا ہوتے ہیں۔ واضح ہو کہ بوستاں سعدی میں ہر قسم کی حکمت آموز مضامین دیکھے جاتے ہیں۔ ہزار ہا مسائل جو حکمت عملی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کتاب لا جواب میں حضرت مصنف نے داخل کیے ہیں۔ تدوین مضامین کی بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ دس بابوں میں کی گئی ہے، بلاشبہ یہ کتاب حضرت شیخ سعدی کی بڑی پایہ رکھتی ہے۔ دو چار حکایتوں کے سوا جتنی حکایتیں اس میں دکھی جاتی ہیں نہ صرف حضرت کے وفور اطلاع سے خبر دیتی ہیں بلکہ ہر طرح پر ایسی حکمت آموز ہیں کہ اس کتاب گرامی میں تمام تر دسج ہونے کا پورا استحقاق رکھتی ہیں۔ یہ سب حکایتیں ایک ہی بحر میں منظوم ہوئی ہیں اور حضرت مصنف کی حیرت انگیز قوت شاعری کا جلوہ دکھلاتی ہیں جاننا چاہیے کہ حکمت آموز مثنویاں اس قسم کی شاعری سے تعلق رکھتی ہیں کہ جس کو زبان انگریزی میں ڈائیڈیکٹک شاعری کہتے ہیں۔

## سعدی بہ حیثیت مثنوی نگار

### حکایت انابک مرحوم تکلم بن سعد زنگی

در اخبار شاہان پیشین هست	کہ چون تکلم برفت زنگی نشست
بد و رانش از کس نیاز رکس	سبق برد کز خود ہمیں بود و بس
چنین گفت یکرم بھاحب دے	کہ عمرم بسر رفت بجھا صلے
چومی بگزرد ملک و جاہ و سریر	نبرد از جہاں دولت الا فقیر
بخوام بہ کنج عبادت نشست	کہ دریا ہم این پنجہ روزے کہ هست
چو بشنید امانے روشن نفس	بہ تندہی بر آشفت کالے تکلم بس
طریقت بجز خدمت خلق نیست	تسبیح و سجادہ دلق نیست
تو بر تخت سلطانی خویش باش	بہ اخلاق پاکیزہ درویش باش
ز صدق و ارادت کمر بستہ دار	رطامات و دعوا زبان بستہ دار
قدم باید اندر طریقت نہ دم	کہ اصلے ندارد دوم بے قدم

بزرگان کہ نقد صفا داشتند

چنیس خرقہ زیر قبا داشتند

حضرت فرید الدین عطار علیہ مرحوم کا چند نامہ بھی نہایت توجہ طلب کتاب ہے کچھ کلام

حضرت کا مندرجہ ذیل ہوتا ہے:-

### در بیان عمل خالص

ہر کہ باشد اہل ایماں اے عزیز	پاک دارد چار چیز از چار چیز
از حسد اول تو دل را پاک دار	خوشتن را بعد از ازاں مومن شمار
پاک دارد از کذب و غیبت زبان	تا کہ ایمانت نیفتد در زبان
پاک گرداری غسل را از ریا	شمع ایماں ترا باشد ضیا
چون شکم را پاک داری از حرام	مرد ایماں دار باشی والسلام



ہر کہ دارد این صفت باشد شریف      ورنہ دارد دار و ایمان ضعیف  
 ہر کہ باطن از حرامش پاک نیست      روح اورا رہ سوائے افلاک نیست  
 چوں نباشد پاک اعمال از ریا      ہست بے حاصل چو نقش بویا  
 ہر کہ اندر عمل اخلاص نیست      در جہاں از بندگان خاص نیست

ہر کہ کارش از برائے حق بود

کار او پیوستہ بار و نفع بود

ہر چند حضرت عطار کا چند نامہ حضرت سعدی کی شوخی تحریر سے معرا ہے اور قریب قریب صرف نظم ہی نظم انداز رکھتا ہے۔ تاہم بکار آمد مضامین سے ملو ہے اور اس لیے بہت کچھ قابل تعریف ہے۔

تصوف آموز مثنویاں : جاننا چاہئے کہ تصوف سے مراد علم روحانیت ہے۔ یہ علم اہل ہند میں درجہ کمال کو پہنچ گیا تھا۔ اور اب بھی ہندوستان میں بیشتر ہندو فقرا اس سے باخبر ہیں۔ اس زمانہ میں وہ ہندوستانی حضرات جنہوں نے یورپین تعلیم پائی ہے اس علم کو تہیا سوئی کہتے ہیں۔ یہ علم جو مرکوز اہل ہند ہے امریکہ وغیرہ سے ہندوستان میں شکل جدید آیا ہے۔ گو ماخذ اس کا وہی ہے ہندوستان کا تصوف قدیم ہے۔ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں یہ علم پہلے زرتشتیوں کے میل جول سے داخل مذہب ہوا۔ پھر جب مسلمان ہندوستان میں آئے ہندی تصوف نے ان کے دماغ میں اچھے طور پر گھر کر لیا۔ یہاں تک کہ ہندوستانی مسلمانوں کے ایک زیادہ حصہ کا مذہب تصوف ہی دکھلائی دیتا ہے۔ نفیر کا قول یہ ہے کہ اگر تصوف سے کلام خدا اور رسول مراد ہے تو مجھے تصوف سے انکار نہیں۔ لیکن اگر تصوف سے مراد کوئی اور شئے ہے تو تصوف کو سات سلام۔ بہر حال فارسی میں تصوف آموز مثنویاں بہت ہیں۔ مثلاً نان و حلوا تصنیف حضرت بھائی آملی کی۔ اور من و سلوئی جناب شمس العلماء مفتی سید محمد عباس صاحب کی مگر سب سے زیادہ قابل لحاظ تصنیف اس فن کی مثنوی مولانا جلال الدین رومی علیہ الرحمہ کی ہے۔

## مولانا روم بحیثیت مثنوی نگار

مولانا روم علیہ الرحمہ کی شہرت حضرت کے علم و فضل کے علاوہ مثنوی نگاری کی بنیاد پر ہے۔ اہل اسلام میں خاص کر اہل سنت حضرات کی اس تصنیف منظوم کو جو مثنوی مولانا کے روم کے نام سے مشہور ہے۔

بعد کتاب اللہ کے قابل قدر جانتے ہیں۔ چنانچہ یہ شعر ہے

مثنوی و مولوی و معنوی

ہست قرآن در زبان پہلوی

فقیر کے قول کے صحت پر دال ہے۔ اسی طرح اس تصنیف گرامی کی وجہ سے حضرت مولانا ایک بہت اعلیٰ درجہ کے بزرگ مانے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے :-

من چہ گویم وصف آل علیہم السلام نیست پیغمبر و لے دارد کتاب

لاریب مولانا روم بڑے پایہ کے بزرگ گزرے ہیں۔ فرقہ امامیہ میں بھی حضرت بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ اہل اسلام کے ایک پابند شریعت جماعت نے اس مثنوی کے اشعار کو تعلیم قرآنی اور اسلامی توحید کے مخالف قرار دیا ہے۔ اور ان اعتراضات کے جوابات مولانا کے معتقدین نے مثنوی کی شرح وغیرہ میں قلم بند کیے ہیں۔ جنہیں حضرات معترفین محض تاویلات و درازکار کہتے ہیں۔ بہر حال اگر اس بحث سے درگزر کیا جائے تو اس میں شک نہیں کہ مولانا ایسے ہی بزرگ ہیں کہ اسلام کے ہر فرقہ میں حضرت کی توقیر کی جائے۔ حضرت کی مثنوی بہت سے قرآنی آیات کی تفسیر ہے۔ بہت سے احادیث نبوی کی شرح ہے اور بہت سے مسائل فلسفہ و حکمت کی توضیح ہے۔ تصوف کی عبارت ہے صفائی خیالات سے اس کتاب کا جواب میں عجب خوش جمالی کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ واردات قلبیہ اور جذبات مدحیہ کے بیانات حیرت انگیز انداز رکھتے ہیں۔ تعلیمات روحانیہ کا پیرایہ تمام بے نظیر آتا ہے۔ تزکیہ روحی اور تصفیہ قلبی کے اعتبار سے کتر کوئی کتاب مولانا کی اس مثنوی مبسوط کے برابر نکلے گی۔ نفس شاعری اس مثنوی کی بہت رفیع ہے یہ مثنوی اپنے تعلیمات کے اعتبار سے انگریزی کی صفت شاعری میں محسوب ہوئی ہے جس کو ذاتی ڈکٹنک کہتے ہیں۔ ذیل میں کچھ اشعار نمونہ کلام کے طور پر درج کیے جاتے ہیں :-

بشنواز نے چوں حکایت میکند      وز جدا یہا شکایت می کند

کز نیستان تا مرا بہریدہ اند      از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

سینہ خواہم شرعہ شرعہ از فراق      تا گویم شرح درد اشتیاق

ہر کہے کو درد ماند از اصل خویش      باز جوید روزگار و صل خویش

من بہر جمعیتی نالاں شدم      جفت بد حالان و خوشحالان شدم

ہر کہے از ظن خود شد یار من      از دردن من نخبب اسرار من



سرمن از ناله من دور نیست      لیک چشم و گوش را آن نور نیست  
 تن ز جان و جاں زن مستور نیست      لیک کس را دید جان دستور نیست  
 آتش است ابن باگملئے ذمیت باد      ہر کہ این آتش ندارد نیست باد  
 آتش عشق است کا ندر نے افتاد      بوشش عشق است کا اندر می افتاد  
 نے حریف ہر کہ از یاری برید      پیرو ہائش پیرو ہائے ما درید  
 ہچونے زہرے و تر یاقے کہ دید      ہچونے دما ز مشتاقے کہ دید  
 نے حدیث راہ پر خوں می کند      قصہ ہائے عشق مجنوں می کند  
 محرم این ہوش جز بہوش نیست      ہرزبان را مشتری جز گوش نیست  
 گرنودے نالائے را شمس      نے جہاں را پر نکر دی از شکر  
 در غم مار و زہم بیگاہ شد      روز ہا با سوز ہا ہمراہ شد  
 روز ہا گر رفت گورد باک نیست      تو بہان اے آنکہ چوں تو پاک نیست  
 ہر کہ جز ما ہی ز آبش سیر شد      دانکہ بے روزیت روشن دیر شد  
 در نیابد حال پختہ پیچ خام      پس سخن کوتاہ باید والسلام  
 بند بگسل باش آزاد اے پسر      چند باشی بند سیم و بند زر  
 گزہریزی بحسرا در کوزہ      چند گنجد قسمت یک روزہ  
 کاسہ چشم حریفان پر شد      تا صدف قانع نشد پر در شد  
 ہر کہ اجامہ ز عشقے چاک شد      اوز حرص عیب کلی پاک شد  
 شاد باش اے عشق خوش سودائے ما      اے طیب جسد علت ہائے ما  
 اے دوائے نخوت و ناموس ما      اے تو افلاطون و جالینوس ما  
 جسم خاک از عشق برا فلاک شد      کوہ در قلع آمد و چالاک شد

عشق جان طور آمد عاشقا

طور مت و خسرو منی صاعقا

متفرق مضامین کی مثنویاں : واضح ہو کہ مثنوی چار شعر کی بھی ہوتی ہے اور چار شعر سے  
 زیادہ کی بھی جیسا کہ بالا میں حوالہ قلم ہو چکا ہے۔ مثنوی ہر بحر میں نہیں لکھی جاتی ہے۔ اس کے  
 واسطے چند بحر مخصوص کر دی گئی ہیں۔ چوں کہ کسی عروضی ترکیب سے اس کتاب کو بحث نہیں ہے

اس لیے ذکر مثنوی کی بحروں کا بیان نہیں کیا جاتا ہے۔ بہر حال جاننا چاہئے کہ متفرق مضامین کی مثنویاں ہر طرح کی ہوتی ہیں۔ کوئی رزمی کوئی بزمی کوئی حکمت آموز اور کوئی تصوف آمیز اور ان کا کبھی مرکب انداز ہوتا ہے۔ مگر ہر حال میں ان کے مضامین رفیع اور منقح ہوتے ہیں۔ ذیل میں حضرت سعدی کی کچھ متفرق مضامین کی مثنویاں درج ہذا ہوتی ہیں:-

ایں حکایت شنو کہ در بغداد	رایت دپردہ را اخلاف افتاد
رایت از گرد راه رنج رکاب	گفت با پردہ از طریق عتاب
من تو ہر دو خواجہ تا شنیم	بندہ بارگاہ سلطانیم
من ز خدمت دے نیا سودم	گاہ و بیگاہ در سفر بودم
تو رخ آزمودہ نہ حصار	نہ بیابان و باد و گرد و غبار
قدم من بہ سعی بیشتر است	پس چرا عزت تو بیشتر است
تو بر بندگان مہر دوی	با کنیزاں یا من بوی
من فادہ بدست شاگرداں	بہ سطر پائے بند و سرگرداں
گفت من سر بر آستان دارم	نہ چو تو سر بر آسماں دارم
ہر کہ بیہودہ گردن افرازد	خویشتر را بہ گردن اندازد

## مثنوی سعدی

دیدم گل تازہ چمن دستہ	بر گنبدے از گیاہ بستہ
گفتم چہ بود گیاہ ناچیز	تا در صف گل نشیند از نیش
بگربت گیاہ و گفت خاموش	صحبت نہ کند کرم فراموش
گزینت جمال درنگ ہویم	آخر نہ گیاہ باغ ادیم
من بندہ حقیرت کریم	پرودہ نعمت قدیم
کر بے ہنرم و گر ہنرمند	لطفست امیدم از خداوند
با آنکہ بفنا عتے ندارم	سرایہ طاعتے ندارم
او چارہ کار بند داند	چوں پیچ و سبیلش نماند
رسم است کہ مالکان محسیر	آزاد کنند بندہ پیر



اے بار خدائے عالم آرائے      بر سعدی پیر خود بہ بخنائے  
سعدی رہ کعبہ رضا گیر      اے مرد خدا رہ خدا گیر  
بد بخت کسے کہ سر مباد      زین در کہ در دگر نیاید

## مثنوی سعدی

درختے کہ اکنوں گرفت تپاے      بنیر دے مردے بر آید ز جاے  
درش ہچمنان روزگارے ہلی      بگردش از یخ برنگ سلی  
مرچشمہ شاید گرفتن پسیل      چو پرشد شاید گزشتن پسیل

## اردو کی مثنویاں

رزمی مثنویاں : اردو میں کوئی رزمی مثنوی فردوسی کے شاہنامہ یا نظامی کے سکندر نامہ کے مدارج کی نظر نہیں آتی۔ جو رزمی مثنویاں ہیں وہ انہیں کتابوں کے مختصر ترجمے ہیں۔ ابھی تک اردو کے کسی شاعر نے اپنی فکر سے کوئی اصلی مثنوی جو کسی واقعہ بزرگ پر مشتمل ہو نہیں لکھی ہے۔ ظاہر اردو میں میراجیس یا مرزا دبیر کے سوا کوئی شاعر بھی فردوسی یا نظامی کی فکر و قابلیت کا نہیں گزرا ہے۔ مگر ان بزرگوں نے مثنوی نگاری کی طرف کبھی اپنی توجہ مبذول نہیں فرمائی۔ اب بھی اگر شعرائے وقت سے کچھ حضرات اس قسم کی مثنوی نگاری کی جانب میلان فرمائیں تو اردو سے رزمی مثنویوں کی ناداری کا داغ مٹ جائے۔ یہ اسباب ظاہر واقعہ کربلا ایک ایسا معاملہ رزمی ہے کہ اگر اعلا درجہ کی طباعی اور قابلیت کے ساتھ بشکل مثنوی منظوم کیا جائے تو ہومر فردوسی ورجل، ملٹن، ہالیکی اور ویاس کی تصانیف سے کم تماشائے سخن نہیں دکھلا سکتا ہے۔

بزمی مثنویاں : فارسی کی بعض عشقیہ مثنویوں کے ترجموں کے علاوہ شعرائے اردو نے برائے خود بہت عشقیہ مثنویاں لکھی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بزمی مثنویوں کی طرف اکثر شعرا متوجہ رہے ہیں۔ ذیل میں بعض ان شعرائے نامی کی قابلیت تصنیف پر اظہار رائے کیا جاتا ہے جنہوں نے عشقیہ مثنویاں تحریر فرمائی ہیں۔



رب لامکاں کا صد شکر ہے کہ اس نے ہمیں توفیق دی کہ ہم اردو ادب کی کتب کو سافٹ میں تبدیل کر سکتے۔ اسی صورت میں یہ کتاب آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ مزید اس طرح کی عمدہ کتب حاصل کرنے کے لئے ہمارے گروپ میں شمولیت اختیار کریں۔

انکھامیہ برقی کتب

گروپ میں شمولیت کے لئے:



محمد ذوالقرنین حیدر: +92-3123050300

اکالر سدرہ طاہر صاحبہ: +92-334 0120123



## میر تقی میر بحیثیت ثنوی نگار

میر تقی میر - میر لاریب سلطان المتغزلین تھے۔ مگر حضرت کی ثنوی نگاری سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو درجہ غزل سرائی میں حاصل ہے وہ ثنوی نگاری میں نہیں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کو صرف مضامین داخلی کی بندش کی بڑی قابلیت حاصل تھی لیکن ثنوی نگاری کی وہی شاعر داد دے سکتا ہے جو مضامین خارجی کی بندش پر بھی پوری قدرت رکھتا ہے۔ یہ قدرت آپ کو بہت حاصل نہ تھی۔ اس لیے آپ کی ثنویاں تمام تر داخلی پہلو کی شاعری سے خبر دیتی ہے درحقیقت آپ کی ثنوی نگاری بھی مضامین کے اعتبار سے ایک قسم کی غزل سرائی نظر آتی ہے۔ آپ کی ثنویوں میں خارجی مضامین گویا نادر ہیں۔ کہیں آپ صحرا جنگل و جبال بخور خسزاں بہار، برق، باراں، سرما، گرما، طیور، ونوش، آب و سراب وغیرہ کے خوش آئند مضامین کو بیان نہیں فرماتے ہیں۔ اس پر بھی جس قدر آپ کی ثنویاں ہیں قابل توجہ ہیں۔ کس واسطے کہ روحانی اور قلبی معاملات کے بیانات سے مملو ہیں جتنی عاشقانہ کیفیتیں آپ نے تحریر فرمائی ہیں۔ اکثر بے حیائی کی ذلتوں سے بری دکھائی دیتی ہیں۔ کمتر کوئی جزو تصنیف ایسا ہے کہ تہذیب کی آنکھیں اسے دیکھ کر شرم اٹھائیں۔ ذیل میں کچھ آپ کی عشقیہ ثنویوں کے اشعار نمونے کے طور پر درج کیے جاتے ہیں :-

### انتخاب اشعار از ثنویات میر

عشق ہے تازہ کار تازہ خیال	ہر جگہ اس کی اک نئی ہے چال
دل میں جا کر کہیں تو درد ہوا	کہیں سینے میں آہ سرد ہوا
کہیں آنکھوں سے خون ہو کے بہا	کہیں سر میں جنون ہو کے رہا
کہیں رونا ہوا ندامت کا	کہیں ہنسنا ہوا جرات کا
گہ نہک اس کو داغ کا پام	گہ پتنگا چسراغ کا پایا
ناگہ اک کوچہ سے گزار ہوا	آفت تازہ سے دو چار ہوا
ایک غرغہ سے ایک مہ پارہ	بھٹی طرف اس کے گرم نظارہ
پڑ گئی اس پہ اک نظر اس کی	پھر آئی اسے خبر اس کی
بھٹی نظر یا کہ جی کی آفت بھٹی	وہ نظر ہی وداع طاقت بھٹی
ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ	صبر خصمت ہوا اک آہ کے ساتھ

بے قراری نے کج ادائی کی  
منہ جو اس کا طرفے اس کی پھیرا  
وہ تو رکھتی نہ تھی خیال اس کا  
بھاڑ دامن کے تئیں وہ مہ پارہ  
دہ گئی اس کے سر بلا آئی  
دل پہ کرنے لگا طپسیدن ناز  
ہاتھ جانے لگا گریباں تک  
چاک کے پیلے پاؤں داماں تک

### ثنوی میر تقی میر

محبت نے ظلمت سے کاٹھا ہے نر  
محبت مسبب محبت مسبب  
محبت بن اس جانہ آیا کوئی  
محبت ہی اس کارخانے میں ہے  
محبت سے کس کو ہوا ہے فراغ  
محبت اگر کار پرداز ہو  
محبت ہے آب رخ کار دل  
محبت عجب خواب خونریز ہے  
محبت کی ہیں کار پردازیاں  
محبت کی آتش سے اگلے دل  
محبت کو ہے اس گلستاں میں راہ  
محبت ہی سے دل کو رو بیٹھے  
محبت لگاتی ہے پانی میں آگ  
محبت سے ہے انتظام جہاں  
محبت سے روتے گئے یار خوں  
محبت سے آتا ہے جو کچھ کہو

نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور  
محبت سے آتے ہیں کارعجب  
محبت سے خالی نہ پایا کوئی  
محبت سے سب کچھ زمانے میں ہے  
محبت نے کیا کیا دکھائے ہیں داغ  
دلوں کے تئیں سوز سے ساز ہو  
محبت ہے گرمی آزار دل  
محبت بلائے دل آویز ہے  
کہ عاشق سے ہوتی ہیں جانبا زیاں  
محبت نہ ہوئے تو پتھر ہے دل  
کلی کے دل تنگ میں ہے یہ چاہ  
محبت میں جی مفت کھو بیٹھے  
محبت سے ہے تیغ و گردن میں آگ  
محبت سے گردش میں ہے آسماں  
محبت سے ہو ہو گیا ہے جنوں  
محبت سے ہو جو وہ ہرگز نہ ہو



محبت سے پروانہ آتش بجاں      محبت سے ببل ہے گرم فغاں  
اسی آگ سے شمع کو ہے گداز      اسی کے لیے گل ہے سرگرم ناز

## اشعار از ساقی نامہ

ہے قابل حمد وہ سر انداز      جو سب میں ہوا ہے جلوہ پرداز  
اس کو مے حسن نے چکھایا      ہستی کا لہ اس سے پایا  
پی ان نے شراب خود پرستی      طاری ہوئی اس پہ زور بستی  
وہ مست شراب ناز ہے فرد      خورشید ہے اس کا جام پر درد  
ہے گردش چشم اس سے افسوں      پھر جائے ہے جس کے ساتھ گروں  
ظلمت ہے دہلی کی تجھ سے احوال      آخر ہے وہی روی ہے ادل  
عالم ہے قسرا بہ مے خام      ہے دور سپہر گردش جام  
مشہور جہاں جو کیف و کم ہے      بے نشہ جو ہوئے تو ستم ہے  
وہ مست نیاز ہے حرم میں      وہ رفتہ ناز ہے صنم میں  
ہے آب رخ زمانہ اس سے      روشن ہے تمام خانہ اس سے  
مینا میں جو سرکش ہے وہ ہے      صہبا میں جو دل کش ہے وہ ہے  
شمشاد ہے سرفراز اس سے      گل دیدہ نیم باز اس سے  
خوگر اسے ناز پیشگی ہے      وہ ہے کہ جسے ہمیشگی ہے  
جو کس پڑا ہے جام مے میں      آتی ہے صدا اسی کی نے میں

ہر چند میر صاحب نے اچھا لطف سخن دکھایا ہے۔ مگر ظہوری کے ساقی نامہ کو نہیں پہنچتے ہیں  
حق یہ ہے کہ اگر میر حسن کی مثنوی اردو میں نہ ہوتی تو فارسی کے مقابل میں اردو کی کوئی مثنوی قابل  
ذکر نہ ہوتی۔

واقع ہو کہ منجملہ بزمی مثنویات کے میر صاحب نے ایک مثنوی لکھی ہے کہ جس میں  
نواب آصف الدولہ کی شکار انگلی کے حالات رقم فرمائے ہیں۔ یہ مثنوی ان حضرات کی جو فن صید  
انگلی کے ماہر ہیں کسی طرح لذت بخش نہیں ہو سکتی۔ صبا نے بھی ایک ایسی مثنوی لکھی ہے۔ وہ  
بھی مذاق صیح نہیں رکھتی۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ میر نہ صبا۔ دو میں کوئی صاحب بھی علم صید سے

واقف نہ تھے۔ پس ان کی اس قسم کی مثنویاں کیا لطف سخن پیدا کر سکتی ہیں۔ ان دونوں استادوں کی شکاری مثنویاں غایت صید انگنی سے مطلق خبر نہیں دیتی ہیں۔ اور نہ ان سے کسی علمی مسئلہ کی تحقیق ظہور میں آتی ہے۔ اگر صید انگنی سے مجرّد شیر و شغال کی جان لینی مراد ہے تو مثنویاں خوب ہیں۔ مگر ارباب واقفیت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ شکار علمائے با مذاق کا کام ہے۔ اس کام کے کرنے والے سرگوبل، بیکر سنڈرسن، اسٹرنڈیل، بالڈون، کیمل، رابن کوکس وغیرہ وغیرہ گزرے ہیں۔ یہ لوگ اعلا درجہ کے صاحب علم اور صاحب تحقیق تھے۔ بلاشبہ ان کی تصنیفات حضرات اہل علم کے ملاحظہ کے قابل ہیں اور وہ خود فوائد سے معمور ہیں جس نے ان مصنفین کی تصانیف کو بغور پڑھا اور ان کی ہدایتوں کے مطابق شغل صید انگنی کو ملحوظ رکھا ہوگا اسے میر اور صبا کی شکاری مثنویوں سے کیا حظ حاصل ہو سکتا ہے۔ ان مثنویوں میں علم ریاضی، علم حیوانات، علم نباتات، علم معدنیات وغیرہ وغیرہ کا کوئی مسئلہ نظر نہیں آتا۔ جتنے بیانات ہیں فطرت خداوندی سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے۔ کوئی بات تعلیم تعلیم کی کہیں پر دکھائی نہیں دیتی۔ البتہ بد مذاق کے ساتھ جگہ جگہ نواب اودھ کی تعریفیں پائی جاتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مثنویاں مجرّد مدحت سرائی کی غرض سے لکھی گئی ہیں۔ ان کو تحقیق و تدقیق مسائل علیہ سے کیا علاقہ۔ یہ بھی امر قابل لحاظ ہے کہ چوں کہ یہ مثنویاں درباری رنگ رکھتی ہیں۔ ان میں وہ لطف کلام زینہار نہیں پایا جاتا ہے۔ جو امرا القیس کے قصیدہ لایمہ کے ان محدودہ اشعار سے اٹھتا ہے۔ جن میں اپنی صید انگنی کے حالات کو حوالہ قلم کرتا ہے۔ حضرات ناظرین راقم کی تحریرات سابق کو ملاحظہ فرمائیں۔ ان کے اعادہ کی یہاں حاجت نہیں ہے۔

## مومن خاں بہ حیثیت مثنوی نگار

مومن خاں : استاد مومن کی کلیات میں چھ مکمل مثنویاں دیکھی جاتی ہیں۔ یہ سب کی سب مثنویاں تمام تر داخلی شاعری کا رنگ رکھتی ہیں۔ اس اعتبار سے ان مثنویوں کو میر تقی صاحب کی مثنویوں کی قسم کے ساتھ اتحاد حاصل ہے۔ مگر انداز کلام کا جو فرق ہے وہ وہی ہے جو ان دونوں استادوں کی غزل سرائیوں میں محسوس ہوتا ہے۔ مومن خاں کی مثنویات دقت انگیز ہرگز رکھتی ہیں۔ اس نامطبوع انداز سے میر صاحب کی مثنویاں تمام تر بری ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مومن خاں بالقصد مضامین داخلی کو ایسی دشوار بندش دیتے ہیں کہ فہم کو ایذا لاحق ہوتی ہے۔



برخلاف اس کے میر صاحب اپنی دائمی کیفیت سوز و گداز و حسرت کے ساتھ ادائے مضامین میں ایسی آسانی کی راہ اختیار فرماتے ہیں کہ ان کے کلام کی پرتاثری میں کسی قسم کا نقصان لاحق نہیں ہوتا ہے۔ خیر اب حضرات ناظرین مومن خاں کی مثنویوں کو بلا مقابلہ احدے موازنہ فرمائیں فقیر کی دانست میں استاد مومن کی مثنویاں ہر چند زور طبیعت اور سخن آفرینی سے خبر دیتی ہیں۔ مگر ان میں اخلاقی یا تمدنی یا مذہبی مضمون کا نشاء نہیں پایا جاتا ہے۔ ان کی کوئی مثنوی ایسی نہیں دکھائی دیتی ہے خوش بہا بر بھی مفید معاشرت ہو یا جس سے بال برابر بھی فائدہ عقبی مترتب ہو اکثر مضامین عشقیہ ہیں۔ مگر وہ بھی ایسے ہی ہیں کہ جن سے یا کوچہ گردی کی بو آتی ہے یا ایسے ہیں کہ سوائے نوجوانان غیر مقید کے ان کا گزار کسی اور کے دماغ میں ہو ہی نہیں سکتا ہے۔ مختصر فقیر کی دانست میں مومن خاں کی کوئی مثنوی مفید بنی آدم نظر نہیں آتی ہے۔ ذیل میں استاد مومن کی دو مثنویوں کے نسبت راقم اظہار خیال کرتا ہے۔

مثنوی نمبر ۱۔ جس کا سرنامہ یہ شعر ہے:

ایں نامہ شکایت ستم نام      با من خود گفت سال اتمام

واضح ہو کہ اس مثنوی میں اول مومن خاں اپنی عاشق مزاجی کو بیان کرتے ہیں۔ پھر ایک نوجوان عورت پر اپنے عاشق ہو جانے کو تحریر فرماتے ہیں پھر اپنے عشق کی بد حالیوں کا مرقع کھینچتے ہیں۔ اس کے بعد اپنی محبوبہ سے اپنے ہی گھر میں ملاقات ہو جانے کی صورت دکھاتے ہیں۔ اور وہ اس طور پر کہ اس کا آنا ان کے گھر ایک شادی کی تقریب سے ہوا۔ یوں تو ساری مثنوی غیر فطری اور بے سرو پا ہے۔ مگر اس مقام پر کچھ خلاف قرائن ہے۔ شادی کی تقریب میں کسی ناکہ خدا عورت کا تنہائی میں ملاقات کا نصیب ہونا اس ملک ہندوستان میں بہت خلاف قیاس ہے۔ اس ملک میں ناکہ خدا شریف زادیاں اس طور پر مطلق العنان نہیں رہتی ہیں کہ ان سے کوئی شخص نامحرم شادی وغیرہ کی تقریب میں بحالت تنہائی عشق بازی کی باتیں کرے۔ یہ بالکل رسم ملکی کے خلاف ہے۔ اول تو اس ملک کی ناکہ خدا لو کی کیوں تقریب شادی میں عاشقانہ گفتگو کا محفل ڈھونڈھنے لگی۔ دوم یہ کہ اگر وہ ناہمواری سے ڈھونڈھے بھی تو اس کی رشتہ مند بی بی یاں کب اس کو ایسا موقع ہاتھ لگنے دیں گی۔ یہ قصہ عجیب مربوط معلوم ہوتا ہے۔ صاف ایسا دکھائی دیتا ہے کہ جس عورت کا مومن خاں تذکرہ کر رہے ہیں۔ ہندوستان کی شریف زادی نہ تھی اور اگر تھی بھی تو شریف زادیوں کے اس کے انداز نہ تھے۔ اس جگہ آپ فرماتے ہیں:

ہوئی شادی ہمارے ہاں اکبار      آئی مہمان وہ دولت بیدار  
 شکر ت مفضل سرا پا زیب      اس کے آنے کی ہو گئی تقریب  
 ایک خالی مکان میں آکر      مل گئی چمکے چمکے ڈھپ پا کر  
 کیا ملاقات رشک تنہائی      دسمدم تازہ مسرت افسانائی

اس ملاقات کی گفتگو کو طول دیکر آپ اس کی رخصت کو بیان فرماتے ہیں پھر اس کے مرجانے کا حال حوالہ قلم پایا جاتا ہے۔ اس سے صدمہ کا منبع ہونا امر طبعی ہے۔ مگر آخر کار معشوق کے غم کا نائل ہو جانا چہ معنی دارد۔ یہ وہ غم نہیں ہے جو کبھی نائل ہو معشوق کا بدل معشوق کے ساتھ ہو نہیں سکتا۔ انسان کو عشق دوبارہ نہیں ہوتا ہے۔ معشوق کے مرنے کے بعد یا معشوق سے مفارقت کے بعد پھر عشق نہیں پیدا ہو سکتا ہے۔ ایک دل میں دو دلبر کی جگہ نہیں ہوتی۔ خواہ اُن واحد اور خواہ اُن مختلف میں۔ لیکن مومن خان کو معشوق اول کے مرنے بعد معشوق دوم ہاتھ لگ گیا۔ پھر معشوق اول کو ایسا بھول بیٹھے کہ گویا کوئی ایسا شخص کبھی وجود ہی میں نہ تھا۔ اس نئے معشوق کے ساتھ جو معاشرت کا طول بیان کیا جاتا ہے۔ وہ ویسا نظر آتا ہے۔ جیسا کہ عیش مزاج نوجوانوں کا ہوا کرتا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ یہ مثنوی از ابتدا تا انتہا اخلاقی پایہ سے بہت گری ہوتی ہے۔ اس کو میر تقی صاحب کی ان مثنویوں کی روحانیت سے کیا علاقہ۔ جن کے کچھ اشعار داخل کتاب ہذا کیے گئے ہیں۔

واضح ہو کہ مثنوی نگاری کے لیے داخلی شاعری کے ساتھ خارجی شاعری کی بھی بڑی حاجت ہے۔ مومن خاں خارجی شاعری سے کوئی بہرہ نہیں رکھتے تھے۔ اس لیے ان کی مثنویاں امور خارجیہ سے تمام تر معرا ہیں ان کی مثنویوں میں کہیں بھی کوئی سسیری کا بیان نہیں دیکھا جاتا ہے۔ کوئی بیان ایسا نہیں پایا جاتا ہے جس سے بیچ شام سرا گرا، برق باران جبال، بحور صحرادشت وغیرہ وغیرہ کی کچھ بھی کیفیت ظاہر ہوتی ہے۔ میر حسن نے جس قدر امور خارجیہ کو کو اپنی مثنوی میں حوالہ قلم کیا ہے اس کا میسواں حصہ بھی مومن خاں کی کسی مثنوی میں نہیں پایا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مجرد داخلی شاعری کا برتنے والا شاعر حسب مراد مثنوی لکھ نہیں سکتا ہے۔ ایسا شاعر اچھا غزل سرا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ مومن خاں ایک اچھے غزل سرا ہیں۔ مگر اچھے مثنوی نگار نہیں ہیں۔ ان کی مثنویاں صرف انھیں اشخاص کو اچھی معلوم ہوں گی۔ جو تقاضائے مثنوی نگاری سے واقفیت نہیں رکھتے ہیں۔ ظاہراً ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مومن خاں نے مضامین غزل



اپنی مثنویوں میں بھر دیے ہیں ایسے مضامین غزل سرائی میں جو کچھ بھلے دکھائی دیں۔ مثنوی نگاری میں تو یقیناً بے محل نظر آتے ہیں۔ کلام کے لیے موقع و محل کا لحاظ واجبات سے ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو فردوسی کی یوسف و زلیخا جامی کی یوسف و زلیخا سے بہتر ہوتی۔ لاریب فردوسی طوسی ایک بڑے رزمی شاعر تھے۔ مگر یوسف و زلیخا سے عشق مثنوی لکھنے کے واسطے وہ مخلوق نہیں ہوئے تھے۔ مختصر مومن خاں بہ حیثیت مثنوی نگار بڑے شاعر نہ تھے ان کی مثنویاں صرف داخلی مضامین سے بھری ہوئی ہیں جو نقصان مثنوی نگاری پر ڈال ہے۔ علاوہ اس کے جتنے داخلی مضامین ان کی مثنویوں میں پائے جاتے ہیں۔ ان کو حکمت آموزی سے کوئی علاقہ نظر نہیں آتا ہے۔ دس شعر بھی ان کی سادگی مثنویوں میں ایسے دکھائی نہیں دیتے ہیں کہ جن میں کسی اعلا قسم کے ذہنی مسائل حوالہ قلم ہوئے ہوں۔ عموماً جتنے داخلی مضامین منظوم کیے گئے ہیں وہ ایسے ہی ہیں کہ غیر محصل اور نا تعلیم یافتہ نوجوانوں کی پسندیدگی کے قابل ہیں۔ کوئی مضمون ارفع درجہ کے واردات قلبیہ سے خبر نہیں دیتا ہے ایسے مضامین کسی حکیم کو تو کیا مطبوع ہو سکتے ہیں معمولی درجہ کے ارباب فہم و فراست بھی ان کی طرف رغبت نہیں کر سکتے۔ واقعی ایسی شاعری کہ جس سے تخریب اخلاق کا خوف ہو جس سے کوئی اخلاقی نتیجہ نہیں نکل سکے نہ صرف ایک بے کار بلکہ قابل استرازا امر ہے۔ اب راقم مومن خاں کی مثنوی نمبر ۲ کی نسبت ذیل میں اظہارِ اذکار کرتا ہے۔ اس کے سرنامہ کا شعر یہ ہے۔

نام ایں چند نالہ پیہم      ہاچوں تاریخ گشت قصہ غم

واضح ہو کہ اس مثنوی کی نسبت بھی خیالات راقم وہی ہیں جو بالا میں عرض کیے گئے لیکن اس کے اجزا کی نسبت مختصر طور پر اور بھی رائے زنی کی جاتی ہے۔ حضرات ناظرین سے توجہ فرمائی کی امید ہے۔ اس مثنوی میں مومن خان پہلے ساقی کی طرف مخاطب ہو کر طالب بادہ ہوتے ہیں اور فصل کی خوبیوں کو ارشاد فرما کے ساقی کو خبر دیتے ہیں کہ پھر دلولہ عشق پیدا ہوا ہے۔ بعد ازاں معشوقوں کی یوفانی کا ذکر کر کے ایک عشقہ داستان بیاں فرماتے ہیں یہ مضامین بہت طول و بط کے ساتھ حوالہ قلم ہوئے ہیں۔ مگر فطری خوبیوں سے تمام تر معرا ہیں۔ اس مثنوی میں فصل بہار کا بیان فطرت سے سروکار نہیں رکھتا۔ بقیہ مضامین جتنے ہیں اعلا درجہ کے واردات قلبیہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ جیسا کہ مضمون کا ایک شعر بھی دکھائی نہیں دیتا اخلاق آموز کلام کی جھلک بھی اتنے اشعار میں کہیں پر نظر نہیں آتی کوئی جزو کلام روحانیت کی داد نہیں دیتا جتنے خیالات ہیں جو امانہ ہیں اور جو امانہ بھی ایسے کہ کسی تعلیم یافتہ نوجوان کے دماغ میں گنہا نہیں سکتے ان سب

ہاں بطور کیفیتوں کے ساتھ بندش مضامین کی ترکیب کچھ ایسی دشوار ہے کہ داغ کو ان سے ایذا ہوتی ہے۔ بلکہ اس عدم سلاست سے اور بھی زیادہ طبیعت مآذی ہوتی ہے۔ جب مضامین مفید کی معدومی ہر شعر میں پائی جاتی ہے یہ سب اشعار ”کوہے کندیدن و کاہے برآوردن“ کا حکم رکھتے ہیں۔ خیر اب راقم مضمون داستان عرض کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ دہلی میں ایک نوجوان مومن نام عاشق مزاج تھا ہمیشہ حسیں کی صحبت میں لطف عیش اٹھایا کرتا تھا۔ مومن خاں لکھتے ہیں کہ ہم کو اس سے بہت محبت تھی۔ اتفاقاً وہ کسی عورت پر مائل ہوا۔ اس عورت نے بھی اس کی طرف میلان دکھایا۔ ایک ناز تک دونوں مشغول عیش و عشرت رہے۔ وہ نوجوان اس عورت کا ایسا شفیق ہو گیا کہ اس نے ہم سے بھی ملاقات ترک کی اور باوجود بڑی تلاش و تجسس کے کئی برس تک اس کا نشان نہیں ملا۔ ایک روز جی چاہا کہ سیر و محرا کیجئے۔ مگر وہاں کے سبزہ دلا کو گل سے دل بستگی نہ ہوتی۔ وحشت ہمیں کشاں کشاں دشت کی طرف لے گئی۔ وہاں ایک شخص بد حال نظر آیا۔ جو حالت غم میں اپنے عشق کی سرگزشت بک رہا تھا۔ دیکھا تو یہ وہی شخص مومن جو ہمارا دوست تھا اور جس کی ہم کو ”اش تھی۔ قصہ اس ثنوی کا اسی قدر ہے۔ مگر اس کا شاعرانہ بیان طولانی ہے اور بلاشبہ مومن خاں کے زور طبیعت اور خلاق سخن سے خبر دیتا ہے لیکن اسی کے ساتھ لطف تناسب سے سارا بیان معرا ہے اور زیادہ قابل افسوس امر یہ ہے کہ اس عدم تناسب کے ساتھ عدم تہذیب کی قباحیت بھی اس میں لاحق ہے۔ مثلاً راقم ذیل میں کچھ اشعار درج ہذا کرتا ہے۔ جس سے عدم تناسب اور عدم تہذیب دونوں ظاہر ہوتے ہیں۔

وہ منہ میں زبان کی لذتیں ہائے	ظاہر حرکت سے رغبتیں ہائے
اہنا جو ہوا کچھ اور ارادہ	جی چاہا کچھ اس سے بھی زیادہ
پھر کیا ہی ادا سے کج ادائی	کس ناز سے کرتی ہاتھ پائی
وہ ہاتھ کو رکھ کے جوش انکار	وا کرنے نہ دیتا بند شلوار
وہ ہاتھ کو دم بدم جھٹکنا	وہ تکیہ پہ سر کو دے پٹکنا
آہستہ لگاتی آہ لائیں	حیلہ کی وہ کیسی کیسی باتیں
وہ ہاتھ کو زور سے چھڑانا	وہ ہو کے بتنگ کاٹ کھانا
ہر جان کی چشکیاں وہ لیتی	آرودہ ہو گالیاں وہ دیتی
وہ نیچے پڑے ہی تلملانا	قابو سے تڑپ کے نکلے جانا



وہ جی سے بٹنگ ہوئے لگت      کچھ بس نہ چلا تو رونے لگتا  
 وہ چین بہ جہیں ہو کے کہتا      بیکیوں سے روکے کہتا  
 ہے تم کو تو یہ ہی شغل دن رات      اچھی نہیں لگتی مجھ کو یہ بات  
 بھرتا ہی نہیں ہے میرا جی بس      کرتا ہی نہیں ہے تو کبھی بس  
 اتنا تو نہ چاہئے ستانا      ہر شام سے صبح تک جگانا  
 اس ظلم کا کچھ ٹھکانا بھی ہے      آخر کسی اور کے بھی جی ہے  
 یہ ظلم اٹھائے کوئی کب تک      آپہنچی ہے اب تو جان لب تک  
 کیا جان ہی لینے کی ہے جی میں      ہے فائدہ کچھ تمہیں اسی میں  
 منظور یہی ہے گر تو کہو      گر جان ہی لینے ہے تو لے لو  
 ہاں ہاں تری بات اب میں سمجھی      ہے بات یہی قسم خدا کی  
 چاہے ہے تو یہ کہ اس کو موت آئے      مرجائے یہ اور مری بلا جائے  
 پھر اور کسی سے دل لگاؤں      آنکھ اور ہی شوخ سے لڑاؤں  
 جس کیا ہی سلوک ناشقانہ      یہ رہ گئی الفت زمانہ  
 بے رحم تو اب تو مجھ کو دے چھوڑ      بس چھوڑ خدا کے واسطے چھوڑ  
 اتنا نہ ستا کہ جی ہی جائے      فرصت دے کہ جان میں جان آئے

بیزاری میں اس کا لطف کیا ہے

آسور ہیں وقت خواب کا ہے

حضرات ناظرین باتمکین راقم کو معاف فرمائیں اشعار بالا کے اعادہ کی مجبوری لاحق تھی۔  
 بسا اوقات اصلاح مذاق عوام کے خیال سے نامطبوع کلاموں کے اعادہ کی حاجت لاحق  
 ہو جاتی ہے۔ خیر یہ تو اخلاقی حالت ان اشعار کی ہے۔ عیاں را چہ بیاں۔ اب ان کے عدم  
 تناسب پر غور فرمائیے۔ افسوس ہے کہ اس مرض میں زیادہ تر ایشیائی مصنفین مبتلا دیکھے جاتے  
 ہیں۔ جاتے لحاظ ہے کہ اس شہوی میں مومن خاں تحریر فرماتے ہیں کہ ان کا دوست مومن جو عزم  
 سے بے نشان ہو رہا تھا۔ انہیں ایک دشت میں ملا۔ اور انہوں نے اسے آہ و نالہ کرتے ہوئے  
 پایا۔ جب کان دھکر سنا تو بدشکاری معلوم ہوا کہ ایام گزشتہ کا بیان کر رہا ہے۔ یہ ایام گزشتہ کا  
 بیان سلسلہ واری کے ساتھ طولانی ہے۔ زینہار ایسے بیان پر ایک ایسا شخص جواز خود رفتہ ہو

اور غایت وحشت عشق سے دشت گزریں ہو گیا ہو قادر نہیں ہو سکتا۔ اس پر طرہ ہے کہ اس کی زبان سے ایسی باتیں کہلائی گئی ہیں جو اشعار بلا میں منظوم ہیں۔ ممکن نہیں ایسا شخص جو مبتلائے مصائب عشر ہو کر دشت میں جا بیٹھے وہ بند شلوار کو یاد کرے اور ایسے خیالات کو دل میں جگہ دے۔

## میر حسن دہلوی جیشیت ثنوی نگار

میر حسن اس شاعر گرامی کی شہرت اس کی ثنوی کی بدولت ہے۔ گواہی غزل سرائی بھی پراز مذاق اور قابل لحاظ ہے۔ میر حسن سادت کرام سے تھے اور فصاحت و بلاغت میں جو ائمہ ہدی کی خاص شان ہے اپنی قوم کے نمونہ تھے۔ ان کی ثنوی ایک بہت حیرت انگیز تصنیف ہے۔ اس ثنوی میں شاعری کا خاتمہ نظر آتا ہے۔ اردو میں تو یقیناً ایسی کوئی ثنوی نہیں لکھی گئی ہے۔ فارسی میں بھی اس کی مجموعی خوبیوں کی کوئی ثنوی نظر نہیں آتی ہے۔ فقیر کی دانست میں فارسی اور اردو کے کسی ثنوی نگار نے میر حسن کے برابر فطرت نگاری کا لطف نہیں دکھلایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس شخص نے اس ثنوی کو حکیم کی نگاہ سے نہ دیکھا اس نے گویا شاعری کا لطف ہی نہیں اٹھایا اس ثنوی سے بے خبر رہنا ویسا ہی ہے کہ جیسے کوئی شخص سب کتابیں پڑھ ڈالے اور شکسپیر الف لیلا اور گلستان سعدی کے مطالعہ اور ملاحظہ سے محروم رہ جائے۔ کوئی صاحب مذاق آدمی ایسا نہیں ہے جو اس ثنوی سے لطف کثیر نہ اٹھائے۔ اور زبان اردو سے باخبر ہو کر اس سے بے خبر رہنا پسند کرے۔ یہ ثنوی اخلاقی تہدنی اور مذہبی پہلوؤں سے پراز فوائد ہے۔ اس ثنوی کی قدر دانی سوائے حکیم کے کسی سے ہو نہیں سکتی۔ اس کی خوبیاں قابل ذکر ہیں۔ اول یہ کہ اس کی زبان فطری سلاست رکھتی ہے۔ دوم یہ کہ جو قصہ منظوم کیا گیا ہے اس کے اجزائے متناسب کے اعتبار سے خوب ہیں۔ سوم یہ کہ تشبیہات استعارات فطری انداز رکھنے کے باعث مخالف مذاق صحیح نہیں ہیں۔ چہارم یہ کہ مبالغہ ان پاشناپ نہیں ہیں۔ ان کا اعتدال ایسا ہے کہ سچی شاعری کا منافی نہیں ہے۔ پنجم یہ کہ رسم و رواج ملک کے بیانات بڑی صحت کے ساتھ حوالہ قلم ہوئے ہیں۔ ششم یہ کہ جو سین یعنی معاملہ خارجی بیان ہوا ہے تصویر کا حکم رکھتا ہے۔ ہفتم یہ کہ تمام امور ذہنیہ اور واردات قلبیہ پیرایہ شاعری میں بڑی راستی اور پرتائیری کے ساتھ زیب رقم ہوئے ہیں۔ ہشتم یہ کہ ہر جزو قصہ کچھ نہ کچھ اخلاقی یا تہدنی نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ نہم یہ کہ تمام امور ذہنیہ اور معلومات خارجیہ



کے بیانات فطری اسلوب رکھتے ہیں جس کے باعث بے اختیار دل ان کی جانب کھینچتا ہے۔  
 المفقریہ ثنوی داخلی اور خارجی دونوں قسم شاعری کا پورا لطف دکھاتی ہے۔ اور اپنے مصنف  
 کی قابلیت عام کی بڑی مثبت ہے۔ ہر چند یہ ممکن نہیں کہ اس کتاب میں اس ثنوی کے تمام اشعار  
 کی خوبیاں بیان کی جاتیں۔ تاہم اس ثنوی کی عمدگی کے دکھانے کے لیے ضرور ہے کہ اس کے  
 بعض اجزا پر ریویو لکھا جائے۔ واضح ہو کہ دنیا میں کوئی تصنیف ایسی نہیں ہے کہ جو نقصان  
 سے تمام تر پاک ہو آدمی ناقص پیدا ہی ہوا ہے پس اس ریویو میں اس ثنوی کے جو عیب  
 ہوں گے وہ بھی ظاہر کیے جاتیں گے گو اس ثنوی کے عیوب و اغبیائے آفتاب کی طرح نہ بہت ہیں  
 اور نہ بد نما ہیں۔

## میر حسن کی ثنوی پر ریویو

ریویو: میر حسن اپنی ثنویوں کو حسب دستور مصنفین اہل اسلام حمد کے ساتھ شروع کرتے  
 ہیں۔ یہ حمد ایسی نکھی گئی ہے کہ عالم سے عالم کو حمد کو بھی اس کی پسندیدگی سے چارہ نہیں۔ اسلامی  
 حکمائے متاہین اس کی جو کچھ قدر فرمائیں بجا ہے۔ اس حمد کو دیکھ کر دل کو صاف اس اسر کا  
 اعتراف ہوتا ہے کہ سچا شاعر صاحب الہام ہوتا ہے۔ واقعی یہ حمد ایسی ہے کہ عبادت کا پورا حکم  
 رکھتی ہے اور درود و وظیفہ کے کام کی ہے۔ کون شخص مقررات باری ایسا ہے کہ جو اس کو پڑھ کر روحانی  
 لطف نہیں اٹھا سکتا۔ کون مذہبی آدمی ایسا ہے جو اس حمد کو پڑھ کر دلولہ شوق کبریائی میں  
 بے تاب نہیں ہو سکتا ہے۔ اس حمد کا کوئی شعر ایسا نہیں ہے کہ جو منتخب نہ ہو۔ وقت انتخاب قوت  
 انتخاب جواب دینے لگتی ہے۔ نہیں معلوم ہوتا کہ کس شعر کو انتخاب کیجئے اور کس کو ترک کیجئے۔ سلا  
 سخن ایسا خوب ہے کہ اس کی درہمی طبیعت گوارا نہیں کرتی۔ ناچار چند شعر بلا قصد انتخاب  
 ذیل میں عرض کیے جاتے ہیں۔

### بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

کروں پہلے توحید یزداں رقم	جھکا جس کے سجدے کو اذل قلم
قلم پھر شہادت کی انگلی اٹھا	ہوا حرف زن یوں کہ رب العلا
نہیں تیرا کوئی نہ ہوگا شریک	تری ذات ہے وحدہ لا شریک
پرستش کے قابل ہے تو اے کریم	کہ ہے ذات تیری غفور الرحیم

رہ حسد میں تیسری عز و جل      تجھے سجدے کرتا چلوں سر کے بل  
 وہ الحق کہ ایسا ہی معبود ہے      قلم جو نیکے اس سے افزد ہے  
 سمجھوں گا وہی دین و ایمان ہے      یہ ہیں دل تمام اور وہی جان ہے  
 وہ ظاہر میں ہر چند ظاہر نہیں      یہ ظاہر کوئی اُس سے باہر نہیں  
 نہیں اُس سے خالی غرض کوئی شے      وہ کچھ شے نہیں پر ہر اک شے میں ہے  
 نہ گوہر میں ہے وہ نہ بے سنگ میں

ولیکن چمکتا ہے ہر رنگ میں

ذیل میں کچھ اشعار نعت عرض کیے جاتے ہیں: میر حسن نے نعت ایسی لکھی ہے کہ قوت انتخاب کو  
 اس میں دخل نہیں ہے۔

نبی کون یعنی رسول کریمؐ      نبوت کے دریا کا دُرِ قیم  
 ہوا گو کہ ظاہر میں امی لقب      یہ علم لدنی کھلا دل پہ سب  
 بغیر از نیکے اور کیے بے رقم      چلے حکم پر اس کے لوحِ دستم  
 ہوا علم دیں اس کا جو آشکار      گزشتہ ہوئے حکم تقویم پار  
 امّا کفر اسلام ظاہر کیا      بتوں کو خدائی سے باہر کیا  
 محمدؐ کے مانند جگ میں نہیں      ہوا ہے نہ ایسا نہ ہوگا کہیں  
 یہ تھی رمز جو اس کے سایہ نہ تھا      کہ رنگِ دولیٰ داں تک آیا نہ تھا

اس کے بعد میر حسن سایہ کے نہ ہونے کی اور وجہیں بھی لکھتے ہیں: سبحان اللہ کیا قادر الکلامی ہے۔  
 اہل شوق بقیہ اشعار کو ان کی تنوی میں ملاحظہ فرمائیں۔ حمد و نعت کے بعد منقبت امیر المومنین علیہ السلام  
 کے اشعار ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

نہیں ہمہ اس کا کوئی جز علیؑ      کہ بھائی کا بھائی وصی کا وصی  
 ہوئی جو نبوت نبی پر تمام      ہوئی نعمت اس کی وصی پر تمام  
 جہاں فیض سے ان کے ہے کامیاب      نبی آفتاب و سنی ماہِ تاب  
 علیؑ دین دنیا کا سردار ہے      کہ مختار کے گھر کا مختار ہے  
 دیارِ امامت کے گلشن کا گل      بہارِ ولایت کا باغِ سنبل  
 علیؑ راز دار خدا و نبیؐ      خبردار سترِ خفی و جلی



علیؑ سا لک درہرو راہِ حق	علیؑ بندہ خاص درگاہِ حق
لقب شاہ مردان و زوجِ بتول	علیؑ ولی ابنِ عسم رسولؑ
پر نسبت علیؑ کو نہیں غیر سے	کہے یوں جو چاہے کوئی میر سے
دگر رافضیت کجا ماندہ است	خدا نفس پیغیرش خواندہ است
نبیؑ و علیؑ میں جدائی نہیں	یہاں بات کی اب سائی نہیں
دوتاؤ کیے چوں زبانِ مسلم	نبیؑ و علیؑ ہر دو نسبت بہم
علیؑ کا موجبِ جنتی جنتی	علیؑ کا عدو دوزخی دوزخی
حسین ابنِ حیدر یہ ہیں پنج تن	نبیؑ و علیؑ فاطمہ اور حسن
انہوں پر درود اور انہوں پر سلام	ہوئی ان پہ دوجگ کی خوبی تمام
یہ ہیں ایک نورِ خدائے برین	علیؑ سے لگاتا بہ مہدی دین
کہ بارہ ستون ہیں یہ اثنا عشر	انہوں سے ہے قائم امامت کا گھر
حساب علیؑ سے یہ بے پاک ہیں	صغیرہ کبیرہ سے یہ پاک ہیں
کہ بہتر ہوئی سب سے آلِ رسولؑ	ہوایاں سے ظاہر کمال رسولؑ

راضی ہو کہ اشعار بالا کس قدر مبالغہ سے پاک ہیں۔ دوستدارِ خاندانِ محمدؐ کا جیسا عقیدہ ہونا چاہئے اس سے کوئی شعر ایک حرف برابر بھی کم و بیش نہیں۔ سبحان اللہ کیا شاعری ہے کہ مبالغہ سے تمام تر پاک ہے۔ وہ حقیقت میر حسن کی حمد و نعت و منقبت میں مبالغہ کی جھلک بھی نظر نہیں آتی ہے۔ اس کے ساتھ شاعری کا جلوہ وہی ہے جیسا کہ ہونا چاہئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کچھ شاعری مطلق مبالغہ پرداز کی محتاج نہیں ہے۔

میر حسن نے اصحابِ پاک رضوان اللہ علیہم کی تعریف بھی ایسی لکھی ہے کہ کیا کہنا اس سے زیادہ کیا جتنی تعریف ہو سکتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں:-

سلام ان پر جو اس کے اصحاب ہیں	وہ اصحاب کیسے کہ اصحاب ہیں
خدا نے انہوں کو کہا مومنین	وہ ہیں زینتِ آسمان و زمین
خدا ان سے راضی رسول ان سے خوش	علی ان سے راضی بتول ان سے خوش
ہوئی فرض ان کی ہیں دوستی	کہ ہیں دل سے وہ جانِ نثار نبی

مناجات کے اشعار و رد رکھنے کے قابل ہیں۔ اس سے بہتر مناجات بدگاہ قاضی الحاجات کیا ہو سکتی ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میر حسن جس شے کو نکھتے ہیں اس کے مغز کو پہنچ جاتے ہیں۔ پوست و استخوان و لغو و حشو سے تمام تر کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں۔

## اشعار مناجات

ابو بحق رسول امین	بحق علی و باصحاب دین
بحق بتول و آل رسول	کردن عرض جو میں سو ہو دے قبول
الہی میں بندہ گہنگار ہوں	گناہوں میں اپنے گرانہار ہوں
مجھے بخشو میرے پروردگار	کہ تو ہے کریم اور آمرزگار
مری عرض ہے کہ جب تک جیوں	شراب محبت کو تیسری پیوں
سواتیری الفت کے ادب ہے پہنچ	یہی ہو نہواد رکھ اچھ پنچ
جو غم ہو تو ہو آل حسد کا غم	سوا اس الم کے نہ ہو کچھ الم
سے سب طرف سے مرے دل کو چین	بحق حسن اور بحق حسین
کسی سے نہ کرنی پڑے التبا	تو کر خود بخود میری حاجت روا
صحیح اور سالم سدا مجھ کو رکھ	خوشی سے ہمیشہ خدا مجھ کو رکھ
میری آل و اولاد کو شاد رکھ	مرے دوستوں کو تو آباد رکھ
میں کھاتا ہوں جس کا تک لے کریم	سدا جسم کران پہ تو اے مریم
جیوں ابر و اود حرمت کے ساتھ	رہوں میں عزیزوں میں عزت کیساتھ

برآویں مرے دین و دنیا کے کام

بحق محمد علیہ السلام

واقع ہو کہ اس مناجات میں میر حسن نے اپنے آقا کو فراموش نہیں کیا۔ بحضور خداوند دو جہاں بھی ادائے حق نہک میں پہلو تہی جائز نہ رکھی۔ اس انداز کلام سے کس قدر اخلاقی تعلیم مترشح ہے۔ پاس نہک کیا عظیم شے ہے۔ آدمی کو ناسپاس نہیں ہونا چاہیے ناسپاس دشمن خدا اور بدخواہ بنی آدم ہوتا ہے۔ اسی لیے اسلام شکر گزاری کا موکد ہے۔

حمد و نعت و منقبت و تعریف صحابہ و مناجات کے بعد میر حسن سخن کی تعریف ذیب رقم فرماتے ہیں۔ بلا قصد انتخاب دو شعراؤں کی تعریف سخن سے ذیل میں عرض کیے جاتے ہیں۔



سخن کا سدا گرم بازار ہے سخن سنا اس کا خریدار ہے  
 رہے جب ملک داستان سخن الہی رہیں قدر دان سخن  
 اس کے بعد حضرت مصنف شاہ عالم بادشاہ کی مدح صرف چار شعروں میں ختم کر کے نواب  
 آصف الدولہ کی مدح میں بہت اشعار حوالہ قلم فرماتے ہیں۔ مگر اس مختصر مدح میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ  
 شاہ عالم اور آصف الدولہ کے فرق مراتب کو دکھلا دیتے ہیں۔

وہ ماہ منور یہ ماہ منیر اور اس کا یہ نجم سعادت وزیر  
 آصف الدولہ کی مدح ویسی ہے جیسی کہ ایشیائی شعراء لکھا کرتے ہیں۔ مگر دو مقام اس میں قابل  
 لحاظ ہیں۔ ایک یہ کہ ممدوح کی سخاوت کے بیان میں میر حسن یوں لکھتے ہیں۔

سو اس کے ہے اور یہ داستان کہ ہو جس پہ قربان حاتم کی جاں  
 ہوئی کم جواک بار کچھ برشنگال گرانی سہی ہونے لگی ایک سال  
 غریبوں کا دم سا نکلنے لگا توکل کا بھی پانوں چلنے لگا  
 وزیر الممالک نے تدبیر کی خدا کی دیا راہ میں مال و زر  
 محلہ محلہ کا حکم یہ کہ باڑی سے اس غم کے کھولیں گرہ  
 یہ چاہا کہ خلقت کسی ڈھب جئے کئی لاکھ لاکھ ایک دن میں دیئے  
 یہ لغزش پڑی ملک میں جو تمام لیا ہاتھ نے اس کے گرتوں کو تھام

ان اشعار کی حکمت آموزی میں کیا گفتگو ہو سکتی ہے۔ اس کی تمدنی خوبیاں محتاج بیان  
 نہیں ہیں۔ اس صدی کے شاید حکمران بھی اگر کریں گے تو اتنا ہی کریں گے ہوشیار سے ہوشیار  
 گورنمنٹ اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتی۔ سخاوت کی تعریف میں کمتر کسی شاعر نے ایسا بکار آمد مضمون  
 حوالہ قلم کیا ہے۔ دوسرا مقام قابل لحاظ یہ ہے کہ شجاعت کے بیان میں حضرت مصنف ممدوح کے  
 مذاق شکار کا ذکر فرماتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مذاق شکار بڑی سپاہی مزاجی سے خبر دیتا ہے۔  
 افسوس ہے کہ ہم مسلمانان ہند خاص کر مسلمانان بہار سے اس کا مذاق بالکل جاٹا رہا ہے۔ اگر یہ مذاق  
 ہمارے ہم وطنوں کو باقی رہتا تو یہاں کے نوجوانوں کو ایسی مہل چیزوں کی طرف میلان نہ ہوتا کہ جن  
 سے قومی غارت ہو جاتے ہیں۔ خیالات پست ہو جاتے ہیں جپتی اور چالاک جاتی رہتی ہے اور ہر  
 طرح کی کامیاں لاحق ہو جانے سے وہ نہ دنیا اور نہ دین کے رہتے ہیں۔ اللہ ہر احفظنا من  
 شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا وارحمنا یا ارحم الراحمین

مرح نواب کے بعد میر حسن اپنی مثنوی کو عجز و انکسار کے ساتھ پیشکش ممدوح فرماتے ہیں۔ اور عائدہ تقصیر ایک خوش اسلوب پیرائے شاعری میں بجالاتے ہیں۔ مصنف کا عجز و انکسار و غنڈہ سب کا سب فطری سلاست سے معمور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت مصنف ایک بڑے نچرل شاعر تھے جیسا کہ آئندہ ظاہر ہوتا جائے گا۔

اب راقم اس مثنوی کی ہر داستان پر علیحدہ علیحدہ ریویو تحریر کرتا ہے جن حضرات ناظرین بامکین سے امید توجہ فرمائی ہے۔

## آغاز داستان

اس مثنوی کا قصہ اس طرح شروع ہوتا ہے کہ کسی شہر میں کوئی شہنشاہ تھا جس کے ماتحت کئی خسراج گزار بادشاہ تھے۔ اس کا ملک نہایت آباد تھا اور اس کی رعایا نہایت مرفہ حال تھی۔ اسے لاولدی کے سوا کوئی غم نہ تھا اس غم سے وہ ایسا شکستہ ہو رہا تھا کہ آخر اس نے سلطنت چھوڑ کر فقیری اختیار کرنے کا قصد کیا۔ وزیروں نے بہت سمجھایا۔ اور یوں عرض کی کہ

فقیری جو کیجئے تو دنیا کے ساتھ نہیں خوب جانا اُدھر خالی ہاتھ  
پھر اولاد کے غم کو دور کرنے کی نظر سے اس طرح عرض پر داز ہوئے۔

مگر ہاں یہ اولاد کا ہے جو غم سو اس کا تردد بھی کرتے ہیں ہم  
عجب کیا کہ ہو دے تمہارے خلف کرد تم نہ اوقات اپنی تلف  
نہ لاد کبھی یا اس کی گفتگو کہ قرآن میں آیا ہے لا تقنطوا  
بلاتے ہیں ہم اہل تنجیم کو نصیبوں کو اپنے ذرا دیکھ لو

اس طرح بادشاہ کو تسلی دے کر وزرانے نجومی، رمال اور برہمن بلائے۔ ان سبھوں نے اپنے اپنے علم کی رو سے بادشاہ کو اولاد کی خوش خبری دی۔ ان طالع شناسوں سے برہمن نے یوں گزارش کی۔

مقرر ترے چاہے ہو پسر کہ دیتی ہے یوں اپنی پوتھی خبر  
دلکین مقدر ہے کچھ اور بھی کہ ہیں اس بھلے میں بڑے طور بھی  
یہ لڑکا تو ہو گا ولے کیا کہیں خطر ہے اسے بارہویں سال میں  
نہ آوے یہ خوشید بالائے بام بندی سے خطرہ ہے اس کو تمام



نہ نکلے یہ بارہ برس رشک مر رہے برج میں یہ مہ چار دہ  
بادشاہ نے یہ کیفیت دریافت کر کے نہایت فطری انداز سے پوچھا کہ اس کی جان کا خطرہ تو نہیں ہے  
تسپر برہمن نے کہا۔

کہا جان کی سب طرح خیر ہے مگر دشت غربت کی کچھ میر ہے  
اس کے سننے سے

ہوئی کچھ خوشی شہ کو اور کچھ الم کہ دنیا میں تو ام ہیں شادی و غم  
ان سب گفتگو کے بعد اہل تنجیم زحمت ہوئے۔ بادشاہ نے بڑے اعتقاد کے ساتھ خدا سے  
اولاد کی دعا مانگنی شروع کی جو دعا دل سے کی جاتی ہے وہ قبول بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا  
خدا نے بادشاہ کو ایک صاحب جمال جیتا جاگتا بیٹا مرحمت فرمایا۔ اس داستان کا خلاصہ اسی قدر ہے  
مگر میر حسن نے طول و بسط کے ساتھ منظوم کیا ہے لیکن بندش مضامین میں تناسب کلام کا بڑا لحاظ  
رکھا ہے۔ اس داستان کے پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے تمام مضامین ایک ایشیائی  
بلکہ ایک ہندوستانی مسلمان بادشاہ کے معاملات ذاتی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اولادی کے غم میں  
ترک سلطنت کا خیال کتر کسی یورپین بادشاہ کے دماغ میں جگہ کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ دزرا کا  
اہل تنجیم کو بلوانا اور ان سے طالع بادشاہ کی کیفیت کو دریافت کرنا بھی ہندوستانی ریاستوں کے  
معمولات سے خبر دیتا ہے۔ واضح ہو کہ شاہان دہلی اور دیگر فرماں بردار ہندوستان کے درباروں سے  
ہمیشہ اہل تنجیم متعلق رہتے تھے اہم اور اکثر امور انہیں طالع شناسوں کی ہدایتوں کے مطابق تعمیل پاتے تھے۔  
اسلام کے رو سے علم نجوم درمل وغیرہ لاشعۃً متصور ہیں بلکہ ان پر کسی قسم کا اعتقاد رکھنا منوعات  
ہے مگر چونکہ یہ سب علوم کہ درحقیقت علم کا حکم نہیں رکھتے ہیں۔ ایک عرصہ دراز سے شاہان ہندو کے  
زمانہ میں مروج تھے۔ اسلامی بادشاہوں نے بھی انہیں جاری رہنے دیا۔ یہاں میر حسن نجومیوں  
کی طالع شناسی کے حالات کو لکھ کر بادشاہ کے اسلامی عقیدہ کی طرف فوراً رجوع کرتے ہیں۔ اگر  
کسی ہندو بادشاہ کا معاملہ بیان کرتے تو برہمن کی پونجی کے خلاف یہ نہ کہتے۔

کہا نے اس پر نہیں اعتبار جو چاہے کرے میرا پروردگار

سبحان اللہ حضرت مصنف چوں کہ عجب شاعر واقعہ نگار ہیں۔ ہر قدم پر تناسب کلام کو کس  
قدر ملحوظ رکھتے ہیں۔ اسی طرح حضرت کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کی چند بی بیائیں تھیں  
ان میں سے ایک حاملہ ہوئی۔ یہ کثرت از وواج برائے خود ایک ایشیائی معاملہ سے خبر دیتا ہے۔

المختصر اس داستان میں میر حسن نے ایک حسب مراد ایشیائی بادشاہ کی پوری تصویر کھینچی ہے۔ اجرائے داستان پر از تناسب ہیں اور حضرت مصنف کی بڑی قابلیت شاعری سے خبر دیتے ہیں۔ وہ جسز و داستان جس میں نجومی، رمال اور برہن کے معاملات حوالہ قلم ہیں۔ بہت قابل لحاظ ہے۔ یہ ایک پورا فوٹو ہندوستان کے مختلف طالع شناسوں کا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مصنف کو ایسے فن والوں کے حالات سے کافی اطلاع تھی

## داستان تولد ہونے شاہزادہ بنظیر کی

اس داستان میں بادشاہ کے بیٹا پیدا ہونے کا بیان ہوا ہے۔ ایسی خوشی کی تقریبیں ہندوستانی سلاطین کے محلوں میں کیوں کر خوشی رچائی جاتی ہے۔ اس کی پوری تصویر میر حسن نے کھینچی ہے۔ سانی نام کے رنگ کے دو شعر لکھ کر حضرت مصنف لکھتے ہیں کہ جب نو مہینے گزرے تو ایک فسر زند صاحب جمال پیدا ہوا۔ خواصوں اور خواجہ سراؤں نے بحضور بادشاہ حاضر ہو کر نذریں گزارتیں اور وارث تاج و تخت پیدا ہونے کی مبارکبادیاں دیں۔ جب بادشاہ کو یہ مژدہ پہنچا بادشاہ نے جانماز بچھا کر بہت کچھ سجدہ شکر ادا کیا۔ اور یہ کہا کہ اے بے نیاز

تجھے فضل کرتے نہیں لگتی بار نہ ہو تجھ سے مایوس امید دار

اس کے بعد خواصوں اور خوجوں کی نذرین قبول فرما کر انھیں خلعت و زربخشا۔ بعد ازاں جشن کا حکم دیا۔ ہر طرح کے ارباب نشاط حاضر ہوتے گئے۔ اس جگہ حضرت مصنف تفصیل اور ہر قسم کے باجوں کا ذکر کرتے ہیں اور معاملات موسیقی سے پوری اطلاع دکھاتے ہیں۔ کوئی سامان طرب و نشاط کو اٹھا نہیں رکھا ہے۔ پھر خوشی کی تقریبوں میں جو سلاطین انعامات تقسیم کرتے ہیں اس کا شرح بیان بڑی خوش اسلوبی سے حوالہ قلم کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

دیئے شاہ نے شاہزادے کو نانوں	مشائخ کو اور پیر زادوں کو گائوں
امیروں کو جاگیر شکر کو زر	وزیروں کو الماس و عسل و گہر
خوجوں کو جو جوں کو جوڑے دیئے	پیادے جو تھے ان کو گھوڑے دیئے
خوشی میں کیا یاں تلک زر نثار	جسے ایک دنیا تھا بخشنے ہزار

المختصر اس داستان میں یہ خوشی کی تقریب ایسی قابلیت کے ساتھ حوالہ قلم ہوئی ہے کہ کیا کہنا واقعی لطف بیان سے حضرت مصنف نے اس خوشی کا ایک نادر فوٹو کھینچا ہے۔ کمال شاعری یہ ہے کہ



سارے بیانات مصوری کا حکم رکھتے ہیں۔ واقعی میر حسن کی فطرت نگاری بڑے غضب کی ہے۔ ایسی تقریروں میں جو راگ رنگ اور دھوم دھام کی کیفیتیں ہندوستان میں ہوا کرتی ہے۔ سبحان اللہ کس خوبصورتی کے ساتھ پیرایہ نظم میں درآئی ہیں۔ کہ ان کے پڑھنے سے غیر ملک کے آدمی کو اس قسم کے رواج ملکی سے بڑی صحت کے ساتھ اطلاع پیدا ہو جاسکتی ہے۔ یہی کیفیت الف لیلہ کی بھی ہے کہ ملک مشام و مصر وغیرہ کے رسم و رواج اس میں بڑی عمدگی کے ساتھ ذکر پاتے ہیں۔ پیدائش مولود کی کیفیت لکھ کر میر حسن اس کی چھٹی کا ذکر کرتے ہیں۔ پھر اس کے دودھ بڑھانے کا حال رقم کرتے ہیں۔ پھر جب اس نے اور زیادہ سن پایا تب اس کے واسطے ایک باغ اس کے باپ نے تیار کیا۔ اس کا بیان بڑی قابلیت شاعرانہ کے ساتھ داستان ذیل میں حوالہ قلم فرماتے ہیں۔ سبحان اللہ کیا حسن کلام اور تناسب بیان ہے۔

## داستان تیاری باغ کے بیان میں

حضرت مصنف اس داستان میں باغ و مکان کی ایسی تصویر کھینچتے ہیں کہ جس سے ایشیائی مذاق باغ و مکان کی پوری کیفیت نمایاں ہوتی ہے۔ ایشیائی سلاطین و امرا کے باغات و مکانات ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اب البتہ ہندوستان میں ترتیب باغات و مکانات میں یورپین مذاق کو بڑا دخل ہو گیا ہے۔ درہ پہلے علامہ کے باغات و مکانات اسی ڈھب سے آراستہ کیے جاتے تھے۔ جس طرح پر اس مثنوی میں زیب رقم ہونے ہیں۔ یہ بیانات میر حسن کی بڑی قوت شاعری سے خبر دیتے ہیں۔ واقعی خارجی شاعری میں بھی اس شاعر گرامی کو بڑی قوت حاصل تھی۔ یہ وہ قوت ہے کہ میر صاحب اور مومن خاں کو فطرت نے نہیں بخشی تھی۔ جیسا کہ ان شاعران نامی کی فنویوں سے ہویدا ہے۔ جاننا چاہئے کہ مثنوی نگار کے لیے خارجی شاعری پر بھی بڑی قوت کا حاصل رہنا واجبات سے ہے۔ اس قوت کی عدم موجودگی سے مثنوی نگار کے پورے حقوق ادا نہیں ہو سکتے۔ حضرات ناظرین ملاحظہ فرمائیں کہ اشعار ذیل میں حضرت مصنف نے کس قدر اپنی اس قوت کا اظہار فرمایا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی ایشیائی سلطان یا امیر کا مکان اور باغ پیش نظر ہو رہا ہے۔

دیا شہ نے ترتیب ایک خانہ باغ	ہوا رشک سے جس کے لالہ کو داغ
عمارت کی خوبی درون کی وہ شان	لگے جس میں زربفت کے سات بان
چھتیں اوپر دے بندھے زر نگار	دروں پر کھڑی دست بستہ بہار

کوئی ڈور سے در پہ اٹکا ہوا      کوئی زہ پہ خوبی سے لٹکا ہوا  
 وہ مقیش کی ڈوریاں سر بسر      کہہ کا بندھا جس میں تار نظر  
 چقوں کا تماشہ آنکھوں کا جال      نگہ کو وہاں سے گزرنا محال  
 سنہری مغرق چھتیں ساریاں      وہ دیوار اور در کی گلکاریاں  
 دیئے ہر طرف آئینے جو لگا      گیا چوگستا لطف اس میں سما  
 وہ ٹہل کا فرش اس کا مستقر کہ بس      بڑھے جس کے آگے نہ پائے ہوس  
 رہیں لٹخے اس میں روشن مدام      معطر شب و روز جس سے مشام  
 چھپر کھٹ مرصع وہ دالان میں      چمکتا دمکتا صفت ہر آن میں  
 زمین پر سستی اس طور اس کی جھک      ستاروں کی جیسے فلک پر چمک  
 زمین کا کروں اس کی کیا میں بیاں      کہ صندل کا اک پارچہ تھا عیاں  
 بنی سنگ مرمر کی چوڑ کی نہر      گئی چار سو اس کے پانی کی لہر  
 قرینے سے گرد اس کے سرو ہی      ذرا دور دور اس سے سیب وہی  
 کہوں کیا میں کیفیت دار بست      لگائے ہیں تاک واں مے پرست  
 ہوا سے بہاری سے کچھ پہلے      چمن مارے شاداب اور ڈھلے  
 زمرود کے مانند سبزے کا رنگ      روش پر جواہر گنا جیسے سنگ  
 روش کی صفائی پہ بے اختیار      گل اشرفی نے کیا زرنشمار  
 چمن سے بھرا باغ گل سے چمن      کہیں نرگس و گل کہیں باسمن  
 چنبیلی کہیں اور کہیں موتیا      کہیں رائے بیل اور کہیں موگرا  
 کھڑے شاخ شبو کے ہر جان نشان      مدن بان کی اور ہی آن بان  
 کہیں ازغواں اور کہیں لال زار      جدی اپنے موسم میں سب کی بہار  
 کہیں جعفری اور گیسندہ کہیں      سماں شب کو داؤ دیوں کا کہیں  
 عجب چاندی میں گلوں کی بہار      ہر اک گل سفیدی سے مہتاب دار  
 کھڑے سرو کی طرح چنپ کے جھاڑ      کہے تو کہ خوشبوئوں کے پہاڑ  
 کہیں زرد نسرن کہیں نسترن      عجب رنگ کے زعفرانی چمن  
 پتا آب جو ہر طرف کو بہے      کریں قمریاں سرد پر چھپے



گلوں کا لب نہر پر جھومنا      اسی اپنے عالم میں منہ چومنا  
 وہ جھک جھک کے گنا خیابان پر      نشے کا سا عالم گلستان پر  
 لیے ہاتھ میں بیلچے مالنسن      چمن کو لگیں دیکھنے بھانے  
 کہیں تخم پاشی کریں گود کر      پنیری جنادیں کہیں کھود کر  
 کھڑے شاخ در شاخ باہم نہال      رہیں ہاتھ جوں مست گردن میں ڈال  
 لب جو پے آئینے میں دیکھ قد      اکوٹا کھڑے سرو کا جد نہ تد  
 خرامان صبا صحن میں چارو      دماغوں کو دیتی ہر اک گل کی بو  
 کھڑے نہر پر قاز اور سرقرے      لیے مائتہ مرغایوں کے پرے  
 صد اقرقروں کی بطوں کا وہ شور      درختوں پہ بگلے مند پروں پہ مور  
 چمن آتش گل سے دھکا ہوا      ہوا کے سبب باغ مہکا ہوا  
 صبا لگی ڈھیریاں کر کے بھول      پڑے ہر طرف موسریوں کے پھول  
 وہ کیلوں کی اور موسریوں کی چھاتوں      لگی جاتیں آنکھیں لیے جس کا ناؤں  
 خوشی سے گلوں پر سدا بلبلیں      تفسیق کی آپس میں باتیں کریں  
 درختوں نے برگوں کے کھولے ورق      کہیں طوطیاں بوستاں کا سبق

سماں قمریاں دیکھ اس آن کا

پڑھیں باب پنجم گلستان کا

یہاں تک باغ و مکان کا حال بیان کر کے میر حسن دوا دایاں مغلانیاں خواص وغیرہ کا ذکر جو  
 اس باغ میں خدمت بے نظیر کے واسطے مقرر تھیں کرتے ہیں۔ بیان بھی تمام تر ایشیائی سلاطین و  
 امرا کے محلوں کی تصویر ہے۔ اس کے بعد بے نظیر کی تعلیم و تربیت کا مذکور ہے۔ یہ بھی ایک ایشیائی  
 شہزادے یا امیر زادے کے طریقہ تعلیم کی تصویر ہے۔ شاہان اسلام کے وقت میں جو اصل ثروت  
 کی تعلیم کا طور تھا اس کا پورا فوٹو حضرت مصنف نے کھینچا ہے۔ یہ بیان بھی خالی از نفع نہیں ہے۔  
 میر حسن مختلف علوم و فنون کا ذکر کر کے بے نظیر کے تبحر اخلاقی تعلیم کے مضمون کو بھی فراموش کرتے۔  
 جیسا کہ فرماتے ہیں:-

سوا ان کمالوں کے کتنے کمال      مروت کی خواہد میت کی چال  
 رزالوں سے نفروں سے نفرا سے      سدا قابلوں سے ہی صحبت اسے

گیا نام پر اپنے وہ دلپذیر ہر اک فن میں پچھ ہوا بے نظیر

## داستان سواری کی تیاری کے حکم میں

اس داستان میں بادشاہ کا یہ حکم صادر فرمانا مذکور ہے کہ کل شاہزادہ سیر و باغ کو جائے گا اس سیر میں مطلب بادشاہ کا کہ شاہزادہ جب شہر ہو کر گزرے گا تو شہر کی رعایا کو وارث تاج و تخت کے دیکھنے کا موقع ملے گا۔ اس کی پولیٹیکل مصلحت محتاج بیان نہیں ہے۔ بادشاہ کو سیر کی اجازت دینے کی یہ وجہ ہوئی کہ جو روز شاہزادہ سیر کو نکلنے کو تھا وہ شاہزادہ کی عمر کے بارہویں سال آخر کے دن کے بعد کا قیاس کیا گیا تھا یعنی اہل تنجیم کے قول کے مطابق وہ دن قرار دیا گیا تھا کہ جس کے ایک دن پہلے خطرہ کی گرہ کٹ جا چکی تھی مگر آئندہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ دن کے حساب میں غلطی سرزد ہوئی تھی جس سے نتیجہ بد مترتب ہوا اور اہل تنجیم کا قول راست پایا۔ واضح ہو کہ اہل تنجیم کو ہر قوم میں دخل رہا ہے۔ البتہ اس وقت کی علم پر دور قومیں نجومیوں کے اقوال پر نہ کچھ اعتبار رکھتی ہیں۔ اور نہ ان کے فن کو وقعت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں۔ اقوام دنیا میں سب سے پہلے اہل اسلام نے نجومیوں کو جھوٹا سمجھا اور اس رو سے کہ ان کے پیشوا حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تکذیب فرمائی اور حقیقت حال بھی یہی ہے کہ فن تنجیم کو جسے اہل ہند جوتش کہتے ہیں علم ہئیت کا رتبہ حاصل نہیں ہے۔ عہد اسلام کے پہلے جتنی بت پرست قومیں تھیں۔ اہل تنجیم کو قابل اعتبار جانتی تھیں اور اس وقت کی بت پرست قومیں بھی انہیں اسی عظمت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ کبھی کبھی اہل تنجیم کا قول صادق آجاتا ہے۔ مگر ان کے اقوال ہرگز اس قابل نہیں ہونے کہ ان پر ہمیشہ تکیہ کیا جائے۔ جس طرح اس کہانی میں میر جن اہل تنجیم کے قول کا صادق آنا دکھتے ہیں اسی طرح کے جولیسن سنبر یعنی روم کے قیصر اول کی حکایت مندرج کتب تاریخ دیکھی جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ قیصر مذکور سے ایک منجم نے کہا تھا کہ مارچ کی چند رھویں تاریخ سے ہوشیار رہنا۔ جب وہ تاریخ آئی قیصر کی اس منجم سے راہ میں ملاقات ہوئی۔ قیصر نے منجم سے کہا کہ آج چند رھویں تاریخ مارچ کی ہے۔ منجم نے کہا ہاں وہ تاریخ آئی ہے مگر ابھی تک گزر نہیں گئی ہے۔ اس کے غور سے ہی دیر کے بعد قیصر مارا گیا۔ اور منجم کا قول راست نکلا۔ بہر حال اس داستان میں میر جن نے ساقی نامہ کے اشعار ذیل میں خوب لکھتے ہیں:-

پلا ساقیاں مجھ کو اک جامِ مئل جوان میں آئے ہیں ایامِ گل



نفیست شمر صحبت دوستان      کہ نکل پنج روز ست در بوستان  
 مٹرے بھلائی کا گر ہو سکے      شابی سے بولے جو کچھ بول سکے  
 کہ رنگ چمن پر نہیں اعتبار      یہاں چرخ میں ہے خزاں و بہار

## داستان حمام میں نہانے کی لطافت میں

اس داستان کا خلاصہ یہ ہے کہ جب صبح ہوئی تو بادشاہ نے بیٹے سے فرمایا کہ بابا نہا دھو کر میرے لیے تیار رہو۔ جب حکم شاہ بے نظیر حمام میں گیا اس کے بعد شاہی سواری بڑی تیاری سے نکلی۔ جب میرے پھر کر بے نظیر واپس آیا تو اس نے شب ماہ میں کوٹھے پر آرام کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ بادشاہ نے اجازت دی، مگر وہ رات عرصہ دراز وہ سال کے اندر پڑتی تھی، لیکن حساب کی غلطی کے باعث اس کی خبر بادشاہ کو نہ تھی جب بے نظیر نے کوٹھے پر آرام کیا، ہونے والی بات جو ہونے کو تھا ظہور میں آیا۔ پہرا چوکی سے کوئی کام نہ نکلا، ومن المکتوب کا مفرد کلام مہرب۔

یوں تو میر حسن کا کوئی شعر لطیف شاعری سے خالی نہیں ہونا، مگر اس داستان کے دو جزو اس جگہ قابل داد ہیں۔ اول بے نظیر کا حمام میں غسل کرنا، دوم سواری کی تیاری یہ دونوں جزو خارجی شاعری کے بڑے کمال سے خبر دیتے ہیں، آفریں صد آفریں، حقیقت یہ ہے کہ جب تک خارجی شاعری پر اتنی قدرت نہ ہو شاعر کو مثنوی نگاری کا قصد نہیں کرنا چاہیے، واقعی میر حسن ہمارے ہندوستان کے شکسپیر ہیں جو خارجی اور داخلی دونوں شاعریوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں، اگر اردو میں ڈراما نگاری ہوتی تو ہندوستان میں میر حسن ہی کا لید اس کے ہم پلہ اس صنف شاعری کے اعتبار سے نکلتے، بہر حال اب حضرات ناظرین پہلے کیفیت حمام کے بیان پر توجہ فرمائیں حضرت مصنف فرماتے ہیں:-

ہوا جبکہ داخل وہ حمام میں      عرق آگیا اس کے اندام میں  
 تن نازنین نم ہوا اس کا کل      کہ جس طرح ڈوبے ہے شبنم میں گل  
 پرستار باندھے ہوئے لنگیاں      مہ و مہر سے طاس لے کر دہاں  
 لگے لئے اس ملبدن کا بدن      ہوا ڈھنڈا آب سے وہ چمن  
 نہانے میں فیل تھی بدن کی دیک      برسنے میں بھل کی جیسے چمک  
 لبوں پر چوہاں پڑا سر بسر      نظر آئے جیسے دو گل برگ تر  
 ہوا قطرہ آب میں چشم بوس      کہے تو پڑی جیسے نرگس پہ ادس

لگا ہونے ظاہر یہ اعجازِ حسن      ٹپکنے لگا اس سے اندازِ حسن  
 گیا حوص میں جب شے بے نظیر      پڑا آب میں عکس ماہِ منیر  
 وہ گورا بدن اور بال اس کے تر      کہے تو کہ سادون کی مشام و سحر  
 نمی سے تھا بالوں کا عالم عجب      نہ دیکھی کوئی خوب تر اس سے شب  
 کہوں اس کی خوبی کی کیا تجھ سے بات      کہ جوں بھیگتی جائے صحبت میں رات  
 زمیں پر تھا ایک موجِ زرخیز      ہوا جب وہ فوارہ ساں آب ریز  
 زمرہ کے لے ہاتھ میں سنگ پا      کیا خادموں نے وہ آہنگ پا  
 ہنسا کھل کھلا وہ گلِ نو بہار      یا کھینچ پانوں کے بے اختیار  
 عجب عالم اس نازنین کا ہوا      اثرِ گدگی کا جبین پر ہوا  
 ہنسا اس ادا سے کہ سب ہنس پڑے      ہوئے جی سے قربان چھوٹے بڑے  
 دعائیں لگے دینے بے اختیار      کہا خوش رکھے تجھ کو پرور دگار  
 کہ تیری خوشی ہے سب کی خوشی      مبارک تجھے روز و شب کی خوشی  
 نہ آوے کبھی تیری خاطر پہ میل      چمکتا ہے یہ فلک کا سہیل  
 کیا غسل جب اس لطافت کیساتھ      اُمیسا کھیس لائے اسے ہاتھوں ہاتھ

نہادِ حق کے نکلا وہ گل اس طرح

کہ بدلی سے نکلے ہے مہ جس طرح

اہل انصاف جو کچھ اس فطری شاعری کی داد دیں بجا ہے۔ بعدِ غسل کرنے کے بے نظیر نے جو  
 پوشاک پہنی اور جس طرح زیورات سے آراستہ کیا گیا اس کا بیان بھی ایک ایشیائی شاہزادہ کے  
 تمام تر حسبِ حال ہے۔ خونِ طوالت سے راقمِ حضرت مصنف کے ان اشعار کو یہاں درج نہیں کرتا ہے۔  
 دوسرا فوٹو جو حضراتِ ناظرین کے قابلِ توجہ ہے یہ ہے کہ میر حسن بڑی خوبی کے ساتھ بادشاہ اور  
 بادشاہزادے کی سواری کی تیاری اور روانگی کو بیان فرماتے ہیں۔ یہ بیان ایسا ہے کہ جس میں جنس  
 پھر بھی مبالغہ یا جھوٹ کو لگاؤ نہیں ہے۔ لاریب میر حسن کے بیانات رسمِ درواجِ ملکی سے نہایت صحت  
 کے ساتھ خبر دیتے ہیں جس داستان میں دیکھیے کچھ نہ کچھ ملکی بیانات ایسے ہیں کہ تمام تر اہل مذاق  
 کی پسندیدگی کے قابل ہیں۔ یہی کیفیت کتاب الف یلہ کی ہے کہ اس میں چند اسلامی ملکوں کے مرام  
 وغیرہ نہایت عمدگی کے ساتھ اندراج پائے ہیں۔ اہل واقفیت الف یلہ کی نسبت لکھتے ہیں کہ بہت سے



مضامین رسم و رواج اس کتاب میں ایسی خوبی کے ساتھ درج پائے ہیں کہ سیاحتوں کو بھی ان سے ایسی صحت کے ساتھ مطلع ہونے کا موقع نہیں ملتا ہے۔ اسی طرح اس تنوی میں بھی بہت سے مکی معاملات ایسی عمدگی کے ساتھ مکھ گئے ہیں کہ ان سے بہتر بیان صورت امکان نہیں رکھتا ہے۔ بڑے بڑے شامان دہلی کی سواریاں جس طور پر نکلتی تھیں اس کی پوری تصویر اشعار ذیل میں نظر آتی ہے فقیر کی دانست میں یہ بیان ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے اور ایسے سین کو پیش نظر کرتا ہے کہ جس سے اکبر جہاں گیر شاہ جہاں اور عالمگیر کے زمانے آنکھوں میں گھوم جاتے ہیں۔

نکل گھر سے جس دم ہوا وہ سوار      کیے خان گوہر کے اس پر نثار  
زبں تھا سواری کا باہر، نجوم      ہوا جب کہ ڈنکا پڑی سب میں دھوم  
برابر برابر کھڑے تھے سوار      ہزاروں ہی تھی ہاتھیوں کی قطار

## سواری شاہزادہ بے نظیر جانب باغ

سنہری روپہلی وہ عساریاں      شب دروز کی سی طرح داریاں  
چمکتے ہوئے بادے کے نشاں      سواروں کے غٹ اور بانوں کی شان  
ہزاروں ہی اطراف میں پانکی      جھلا پور کی جگمگی ناکی  
کہاؤں کی زربفت کی کرتیاں      اور ان کے دبے پاؤں کی پھرتیاں  
بندھیں پگڑیاں طاش کے مراد پر      چمکا چوند میں جس سے آدے نظر  
وہ ہاتھوں میں سونے کے موٹے کڑے      جھلک جس کی ہر ہر قدم پر پڑے  
وہ ماہی مراتب وہ سرورواں      وہ نوبت کا دولہہ کی جیسے سماں  
وہ شہنائیوں کی صدا خوشنا      سہانی وہ نوبت کی آدے صدا  
وہ آہستہ گھوڑوں پہ نقار چی      قدم با قدم بالباس زدی  
بجاتے ہوئے شاد بالے تمام      چلے آگے آگے لے شاد کام  
سوار اور پیادے صغیر و کبیر      جلو میں تہالی امیر اور وزیر  
وہ نذرین کہ جس جس نے تھیں ٹھانیاں      شہ و شاہزادے کو گزاناں  
ہوئے حکم سے شاہ کے پھر سوار      چلے سب قرینے سے باندھے قطار  
بچے اور سبائے سبھی خاص و عام      لباس زدی میں ملبتس تمام

طرق کے طرق اور پرے کے پرے      کچھ ادھر ادھر کچھ ورے کچھ پرے  
 مرصع کے سازوں سے کوتل سمند      کہ خوبی میں روح القدس سے دوچند  
 وہ فریاں کی اور میگڈنبر کی شاں      جھلکتے وہ نقیش کے سائبان  
 چلے پایہ تخت کے ہو قسریب      بدستور شام نہ نیتی جسریب  
 سواری کے آگے پئے اہتمام      لیے سونے روپے کے غاصے تمام  
 نقیب اور جلو دار اور چوہدار      یہ آپس میں کہتے تھے ہر دم پکار  
 اسی اپنے معمول و دستور سے      ادب کے تفاوت سے اور دور سے  
 یانہ جوانو بڑھے حباتو      دو جانب سے باگیں لیے آیتو  
 بڑے جائے آگے سے چلتا قدم      بڑھے عمر و دولت قدم با قدم  
 غرض اس طرح سے سواری چلی      کہ تو کہ بلا بہاری چلی  
 تماشائیوں کا جدا تھا، ہجوم      کہ ہر طرف تھی لاکھ عالم کی دھوم  
 لگا قلعے سے شہر کی حد تک      دکانوں پر سخی بادے کی جھلک  
 منہ سے تھے تہامی سے دیوار و در      تہامی تھا وہ شہر سونے کا گھر  
 کیا تھا زبں شہر آئینہ بند      ہوا چوک کا لطف واں چارچند  
 رعیت کی کثرت، ہجوم سپاہ      گزرتی تھی رگ رگ کے ہر جانگاہ  
 ہوئے جمع کوٹھوں پہ جوں مرد و زن      ہر اک سطح سخی جوں زمین چمن  
 یہ خالق کی بس قدرت کاملہ      تماشے کو نکلی زن حائلہ  
 لگا لٹخ سے تا ضعیف و نحیف      تماشے کو نکلی وضع و شریف  
 و حوش و طیور اس گھڑی بر محل      پڑے آشیانوں سے اپنے نکل

نہ پہنچا جواک مرغ قبل نما

سودہ آشیانے میں تر پا کیا

حضرت مصنف بادشاہ اور شاہزادہ کی سر سے داہیں آنے اور شاہزادہ کے کوٹھے پر  
 سونے کے حالات رقم کر لے کے بعد دنیا کی بے اعتباری میں جو اشعار لکھتے ہیں ذیل میں اندر ناظرین  
 ہوتے ہیں۔ واقعی یہ اشعار آب زر سے لکھے جانے کا استحقاق رکھتے ہیں۔

تفنا ما وہ دن تھا اسی سال کا      غلط دہم ماضی میں تھا حال کا



سخن مولوی کا یہ سچ ہے قدیم      کہ آگے قضا کے ہوا حق حکیم  
 پڑے اپنے اپنے یہ سب عیش پنج      نہ سمجھے زمانے کی کچھ ادب پنج  
 یہ جانا کریں ہی رہے گا یہ دور      نہ معلوم تھے اس زمانے کے طور  
 کہ اس بے وفا کی نئی ہے ترنگ      یہ گرگٹ بدلتا ہے ہر دم میں رنگ  
 کرا بادۂ عیش در حباب ریخت      کہ برفرق صحبتیں نہ صد شام ریخت  
 نداری تعجب نہ سرنگ دہر      کہ آرزو یک حقہ تریاق دزہر

## داستان شہزادہ کے کوٹھے پر سونے کی اور پری کے اڑا لیجانے کی

اس داستان میں اسی قدر بیان ہے کہ بے نظیر کوٹھے پر سوتا تھا کہ ایک پری اس کی مغنوں ہو کر اُسے پرستان میں اڑالے گئی۔ مگر اس داستان میں بھی حضرت مصنف نے شاعری کا خاتمہ کر دیا ہے پہلے تو ساقی نامہ کے اشعار ابدار لکھے ہیں۔ ان میں سے یہ شعر بہت قابل لحاظ ہے۔

جوانی کہاں اور کہاں پھر یسبن      مثل ہے کہ ہے چاندنی چار دن

بعد ازاں شاہزادہ کے پلنگ کا بیان صفت راستی کے باعث نہایت مطبوع معلوم ہوتا ہے۔ ایشیائی سلاطین کے امرا کے پلنگ اسی ساز و سامان کے ہوتے ہیں۔ ان اشعار میں سے پلنگ کی چادر کی تعریف کا یہ شعر نہایت قابل تحسین و آفرین ہے۔

کھینچی چادر اک اس پشیم کی صاف      کہ ہو چاندنی اس صفا کی غلاف

خوف طوالت سے راقم اختصار پر اکتفا کرتا ہے۔ ورنہ اور بھی اشعار اس جگہ درج کرنے کے قابل تھے۔ واقعی حضرت مصنف کی شاعری کے کمالات کچھ ایسے نظر آتے ہیں کہ بے اختیار دل چاہتا ہے کہ ہر شعر پر ریو یو لکھیے۔ بہر حال منجملہ بہت سے کمالات کے حضرت مصنف کے چند کمالات بہت کچھ قابل توجہ ہیں۔ اول یہ کہ جہاں صنعت و تشبیہ کو دخل فرماتے ہیں وہاں تشبیہ کا ایسا انداز دیکھا جاتا ہے کہ دل کو تشبیہوں سے نفرت پیدا ہونے کے عوض ان کی طرف رغبت ہوتی ہے تشبیہوں کا استعمال خوش مذاقی کے ساتھ ہر شاعر کا کام نہیں ہے۔ نہایت جلتے تعجب ہے کہ میر حسن کثرت سے استعمال تشبیہات فرماتے ہیں اور ان کی سب تشبیہات خوش آئند معلوم ہوتی ہیں۔ بلکہ اکثر تشبیہات تو ایسی ہوتی ہیں کہ ان کی جدت خوش مذاقی لطافت اور صفائی کا تاثیر سے روح کو ایک حیرت انگیز تلمذ نصیب ہوتا ہے۔ ان کی تشبیہات کے اس قدر مطبوع ہونے کا ظاہر سبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ

تشبیہات میں بھی وہ فطرت کے راہ سے انحراف نہیں فرماتے ہیں۔ یہ ایک خاص بات ہے جو ہر شاعر کو نصیب نہیں ہوتی۔ دھڑم یہ کہ ان کے استعارات ان کی تشبیہات کی طرح فطری انداز کے ہوتے ہیں اور کبھی اساطیر فطرت سے باہر نہیں جاتے۔ ستھم یہ کہ ان کی مبالغہ پردازی جادۂ فطرت سے دور نہیں پڑتی ہے۔ اس لیے ان کے مبالغے مبالغہ کی طرح نفرت انگیز نہیں ہوتے۔ چہارم یہ کہ سلسلہ بیان ایسا فطری ہوتا ہے کہ نفس دین کو اس سے اسائن نصیب ہوتی ہے۔ پنجم یہ کہ کلام میں ہر جگہ تناسب موجود رہتا ہے۔ یہ وہ صفت ہے کہ اس صفت کے بغیر نہ حسن ظاہری اور نہ حسن باطنی کا وجود ممکن ہے۔ مششہد یہ کہ ان کا کوئی بیان بغیر کسی مارل یعنی نتیجہ اخلاقی کے نہیں ہوتا۔ چنانچہ اس داستان کا آخری شعر بھی مارل سے خالی نہیں ہے جیسا کہ فرماتے ہیں:-

کبھی خوش ہے دل اور کبھی درد مند

نمانے کا جیسے ہے پست و بلند

## داستان حالت تباہ کرنے ماں باپ کی شاہزادے کے غائب ہونے سے

یہ داستان داخلی اور خارجی دونوں صنف شاعری پر مشتمل معنوم ہوتی ہے جسفرت مضمفنے شاہزادہ کے غائب ہونے سے جو کیفیت محل دالوں کی بولی خوب منظوم فرمائی ہے۔ لاریب ان کی خوبی بیان سے تحیر و غم کی تصویر پریش نظر ہو جاتی ہے۔ اس بیان میں غم کرنے دالوں کی ظاہری اور باطنی دونوں انداز برسی تبعیت فطرت کے ساتھ حوالہ قلم ہوتے ہیں بلاشبہ یہ بیان داخلی اور خارجی دونوں شاعریوں کا ایک عمدہ مجموعہ ہے۔ اشعار ذیل محل سرا کی حیرت زدہ اور غم زدہ عورتوں کا ایک پورا فوٹو دکھا رہے ہیں۔ سبحان اللہ کیا قادر الکلامی ہے۔ آفریں صد ہزار آفریں۔

کردوں حال بھراں زدوں کا رقم	کہ گزرا جدائی سے کیا ان پہ غم
کھلی آنکھ جو ایک کی واں کہیں	تو دیکھا کہ وہ شاہزادہ نہیں
نہ ہے وہ پلنگ اور نہ وہ ماہرو	نہ وہ گل ہے اس جانہ وہ اس کی بو
رہے دیکھ یہ حال حیران کار	کہ یہ کیا ہوا ہائے پروردگار
کوئی دیکھ یہ حال رونے لگی	کوئی غم سے جی اپنا کھونے لگی
کوئی بلبلائی سی پھرنے لگی	کوئی ضعف کھا کھا کے گرنے لگی
کوئی سر پر رکھ ہاتھ دل گیر ہو	گئی بیٹھ ماتم کی تصویر ہو



کوئی رکھ کے زیر زرخداں چھڑی رہی نرگس آسا کھڑی کی کھڑی  
 رہی کوئی انگلی کو دانتوں میں اب کسی نے کہا گھر ہوا یہ خراب  
 کسی نے دیئے کھول سنبل سے ہاں  
 طمانچوں سے جوں گل گئے سرخ گال  
 اس کے بعد جب بادشاہ کو شاہزادہ کے گم ہونے کی خبر پہنچی تو بادشاہ اور بادشاہ بیگم کا کیا  
 حال ہوا اس کی فطری تصویر حضرت مصنف یوں کھینچتے ہیں :-

سنی شہ نے القصد جب یہ خبر گرا خاک پر کہہ کے ہائے پر  
 کلیجہ پکڑ ماں تو بس رہ گئی کلی کی طرح سے بکس رہ گئی  
 اس جگہ پر باپ اور ماں کے غم کا فرق کس خوبصورتی کے دکھلایا ہے۔ سبحان اللہ کیا فطرت  
 نگاری ہے۔ حضرت مصنف اس کے بعد بادشاہ بیگم کا کوئی ذکر نہیں فرماتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ عورت  
 میں اتنی قدرت کہاں کے ایسی آفت میں تفتیش حالات کر کے بیٹے کے صدمے سے اسے عموماً چپ لگ  
 جاتی ہے۔ یکام مرد کا ہے۔ چنانچہ بادشاہ نے دریافت حقیقت کی طرف توجہ کی، جیسا کہ اشعار ذیل سے  
 نمایاں ہے۔ الحق یہی چیزیں ہیں کہ سچے شاعر کے سوا کسی کو نہیں آتیں۔

ہوا گم وہ یوسف پڑی یہ جو دھوم کیا خادمان محل نے ہجوم  
 کہا شہ نے دان کا مجھے دو پتا عزیز و جہاں سے وہ یوسف گیا  
 گئیں لے وہ شہ کو لب بام پر دکھایا کہ سوتا تھا یاں سیمبر  
 یہی تھی جگہ وہ جہاں سے گیا کہا ہائے بیٹا تو یاں سے گیا  
 مرے نوجوان میں کہ ہر جاؤں پیر نظر تو نے مجھ پر نہ کی بے نظیر  
 عجب بحسرم میں ڈبویا مجھے غرض جان سے تو نے کھویا مجھے  
 کروں اس قیامت کا کیا میں بیاں ترقی میں ہر دم تھا شور و فغاں

اس کے بعد اس خبر کے شہر میں مشہور ہونے کا بیان ہے۔ پھر جس باغ میں بے نظیر رہا کرتا تھا اس کے  
 بے رونق ہو جانے کی کیفیت نہایت شاعرانہ مذاق کے ساتھ تحریر ہے۔ ہر چند حضرت مصنف نے ویرانی  
 باغ کے مضمون کو شاعرانہ پیرایہ میں طول دیا ہے۔ مگر کہیں فطرت کی باگ ہاتھ سے نہیں چھوڑی ہے۔  
 تشبیہات استعارات اور مبالغہ پر دازیوں میں تمام تر فطرت کا رنگ عیاں ہے۔ لاریب بے رونق باغ  
 کا مضمون نہایت فطری انداز رکھتا ہے۔ حالت غم میں مکان اور باغ کی صورت ایسی ہی دکھائی دیتی

ہے جیسا کہ حضرت مصنف نے ضبط تحریر فرمایا ہے۔ مولانا حالی سلمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :-  
 ان کے جانے سے ہوئی اور ہی گھر کی صورت  
 نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت  
 حضرت ازل اعلیٰ اللہ مقامہ فی الجنۃ کا یہ مطلع بھی مطلع بالاکا فطری رنگ رکھتا ہے۔  
 بغیر یار ہر اک گل ہے خار آنکھوں میں  
 کھنک رہی ہے چمن کی بہارا آنکھوں میں

اس داستان کے آخر میں وزیر اکا بادشاہ کو سمجھانا مذکور ہے۔ اس فہاش میں حضرت مصنف نے حسب معمول کچھ مارل اشعار حوالہ قلم فرمائے ہیں اور یہ بھی بڑی خوبصورتی کے ساتھ دکھا دیا ہے کہ کسی حال میں دنیا کے کام بند نہیں ہوتے۔ ہزار آفت کیوں نہ آئے۔ دنیا جس طور پر چلا کی ہے چلا کرے گی۔  
 خدا کی خدائی ہمیشہ رہے گی جو ہوتا رہا ہے وہ ہوتا رہے گا  
 ذیل میں حضرت مصنف کے اشعار نذر ناظرین ہوتے ہیں :-

وزیروں نے دیکھا جو احوال شاہ	کہ ہوتی ہے اب اس کی حالت تباہ
کہا گو خدائی گوارہ نہیں	ولیکن خدائی سے چارہ نہیں
نہیں خوب اتنا تمہیں اضطراب	نصیبوں سے شاید ملے وہ شتاب
خدا جانے اب اس میں کیا بعید ہے	یہ کہتے ہیں جیتوں کو امید ہے
خدا کی خدائی تو معمور ہے	غرض اس کے نزدیک کیا دور ہے
نہیں ایک صورت پہ کوئی مدام	اسی کی غرض ذات کو ہے قیام
یہ کہہ اور نہ کو بچا تخت پر	بہر نوع رہنے لگے یک دگر

لہذا بہت باپ نے مال و زر  
 ولیکن نہ پانی کچھ اس کی خبر

## داستان پرستان میں لے جانے کی

واقع ہو کہ میر حسن اب ایک ایسا قصہ لکھتے ہیں کہ جو ہمارے علم محسوسات سے باہر ہے۔ یعنی اس داستان میں عہد مصنف پری اور پرستان کا ذکر فرماتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ واقعات کے رد سے کوئی ایسا معاملہ کسی بنی آدم کو پیش نہیں آیا ہے۔ تاریخ و سیر و آثار و اخبار وغیرہ میں کہیں نہیں دیکھا جاتا ہے



کسی نے کبھی پری دیکھی ہو یا کوئی پری کبھی آدمی کو پرستان میں اڑالے گئی ہو۔ اس طور کے غیر معمولی بیانات صرف فناء اور شاعری کی تصانیف میں دیکھے جاتے ہیں لیکن ایسے بیانات کو نایت شائستگی کی بنیاد پر مذموم نہیں سمجھنا چاہئے۔ یہ بیانات اس غرض سے حوالہ تلم نہیں کیے جاتے ہیں کہ لوگ انہیں قرین واقعات سمجھیں ان سے مجرد فناء گوئی اور شاعری کی غرضیں متعلق رہتی ہیں ہر خواندہ آدمی جانتا ہے کہ ایسے بیانات فناء نگاروں اور شعرا کی قوت تخیل کے نتائج ہوتے ہیں۔ کون آدمی ہے جو ٹکسیر کے اس پلے کو پڑھ کر جس کا نام مڈسمرنائٹس ڈرم — MIDSUMMAR NIGHTS DREAM

ہے یہ نہیں سمجھتا ہے کہ اس میں پرلوں کا جو ذکر ہے وہ مجرد اس شاعر عدیم المثال کی قوت تخیل کا نتیجہ نہیں ہے۔ یا اہلیت میں جو بھوت کا مذکور ہے وہ شاعرانہ بیان نہیں ہے۔ یا ایلڈ ایسنڈ وغیرہ میں جو کثرت کے ساتھ دیوتاؤں کی کارروائیاں اور دیگر عجائبات مندرج ہیں وہ سب کے سب ایسے ایجاد شاعرانہ نہیں ہے کہ جن کو اس وقت میں کوئی شخص امور واقعی مانتا ہے۔ اسی طرح الف لیلا میں جو پریوں کی حکایت ہیں وہ تخیلی بیانات نہیں ہیں یا مور HAMLET شاعر انگریزی نے جو ایک پری کا فناء منظوم ہے۔ وہ فناء نہیں ہے۔ پس مجرد اس بنیاد پر کہ ایسے قصے قرین واقعات نہیں ہیں۔ اہل مذاق ان سے نفرت نہیں کر سکتے۔ ایسے قصے قابل گرفت تب ہی سمجھے جاسکتے ہیں۔ جب ان کے بیانات میں تناسب کی خوبی نہارد ہوتی ہے۔ یہ وہ خوبی ہے کہ جس کی عدم موجودگی سے ہر کلام ذلیل اور بے تکلف معلوم ہوتا ہے۔ پری، دیو، جنات، خباثت وغیرہ سے وہی قصے قابل تنصیر ہیں جن کے بیانات میں تناسب نہیں پایا جاتا ہے ٹکسیر، ہومر، درجل، مور، فردوسی، بلیکی، کالی داس صاحب الف لیلا وغیرہ ایسے مشنفین ہیں کہ پہلے بھی ان کی توقیر ہوا کی ہے اور آئندہ بھی ہوا کرے گی۔ یہ محض تنگ چشمی کی بات ہے کہ کوئی شخص ٹکسیر یا ہومر یا صاحب الف لیلا کو نہی نظر سے دیکھے۔ حال کی شائستگی اس کی مفتضح ہے نہ آئندہ کی شائستگی اس کی مفتضح ہوگی۔ ایسی تنگ چشمی کا غرض صرف انہیں حضرات کو لاحق دیکھا جاتا ہے جن کی وسعت نظر بہت کم ہے اور اسی کی وسعت نظر کے ساتھ اپنے کو بلند نگاہ بالا ہیں اور حقیقت آگاہ سمجھتے ہیں نعوذ باللہ اس زمانہ میں شائستگی کا مرض ایسا پھیلا ہے کہ خداتیری پناہ۔ ایسے حضرات جہاں کچھ ادھوری یورپین کے پابند ہو گئے اپنے کو شایستہ سمجھنے لگے۔ اگر ظاہری وضع نہ بھی بدلی تو اپنے نئے خیالات کو عین حکماء و علمایورپ کے خیالات جاننے لگے۔ یہ مرض طاعون، چیچک، ہیضہ، سیاه بخار، وغیرہ سے زیادہ مضر قوم ہے اور کیوں نہ ہو جبکہ ایسے لوگ زبان و علوم یورپ سے بے بہرہ رہ کر فضل و کمالات یورپ کی راہ کے خطر اپنے کو

بتلاتے ہیں۔

اذا کان الغراب دسیل قوم سیہد ہسیم طریق الہا لکین  
 انحصرایے قصے جن میں دیو پری وغیرہ کے بیانات مندرج پائے جاتے ہیں تب ہی مذموم پائے  
 جاسکتے ہیں۔ جب ان میں تناسب کی خوبی نہیں پائی جاتی ہے۔ اب حضرات ناظرین میر حسن کے حسن  
 بیان کی طرف توجہ فرمائیں۔ اس شاعر لاجواب کا انداز سخن زینہار ایسا نہیں ہے کہ اس سے ختم پوشی  
 کی جائے۔ سبحان اللہ تناسب کلام ایسا ہے کہ اہل مذاق سے طلب داد میں کبھی ناکام نہیں رہتا۔ حضرت  
 مصنف اس داستان میں اشعار ساقی نامہ کے بعد پہلے بے نظیر کو پرستان میں اڑا لے جانے کے مضمون  
 کو یوں حوالہ قلم فرماتے ہیں۔

اڑی جو پری داں سے لے کر اُسے اتارا پرستان کے اندر اُسے  
 اس کے بعد پرستان کی کیفیت بیان فرماتے ہیں: ظاہر ہے کہ پرستان کو نہ میر حسن نے  
 دیکھا تھا اور نہ آج تک کسی بنی آدم نے دیکھا ہے۔ اس سے پرستان کا بیان سوائے خالی ہونے  
 کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ مگر حضرت مصنف کا یہ بیان بھی قابلیت شاعرانہ سے خالی نہیں ہے۔ ہر شعر  
 اچھی فکر پر دل ہے، اور حسب مراد قوت تخیل سے خبر دیتا ہے۔ کچھ شعر ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

وہاں ایک تھا سیر کا اس کے باغ	کہ جس کے گلوں سے ہوتا زہ دماغ
ریاحین دگل اس میں انواع کے	طلسمات کل اس میں انواع کے
طلسمات کے سارے دیوار و در	نہ یاں کیسے کوٹھے نہ یاں کیسے در
نہ آتش کا خطرہ نہ بارش کا ڈر	نہ سردی نہ گرمی کا اس میں خطر
کسی کو جو جس چیز کا اشتیاق	نظر آوے وہ چیز بالائے طاق
جواہر کے ذی روح وحش و طیور	خراہاں پھرین صحن میں دور دور

پھرین دن کو سارے وہ حیوان ہو

کریں رات کو کام انسان ہو

اس خیالی بیان باغ کے بعد بے نظیر کے پلنگ کا اس باغ کے جنگل میں لایا جانا مذکور ہے۔ وہ تو عالم  
 خواب میں تھا جب بیدار ہوا تو کیا دیکھتا ہے اور کیا اس پر گزرتی ہے۔ اشعار ذیل سے ظاہر ہوگا۔

تضار اکھلی آنکھ اس گل کی جو	نہ پائی وہاں شہر کی اپنے بو
نہ وہ لوگ دیکھے نہ وہ اپنی جا	تعجب سے اک ایک کو تک رہا



اچھے کا یہ خواب دیکھا جو داں لگا کہنے یارب میں آیا کہاں  
زبس تننا وہ لڑکا تو سہاں بھی کچھ ہوا کچھ دلیرا درجسراں بھی کچھ

اس فطرتی بیان کے بعد حضرت مصنف فرماتے ہیں :-

مرا بنے جو دیکھی مسہ چار وہ کہ ہے اجنبی سی وہ اک رشک م  
کہا کون ہے تو کس کا ہے گھر لے آیا مجھے کون گھر سے ادھر  
پھرانے کو لے اور ادھر سے نقاب دیا اس پری نے یہ ہنس کر جواب  
خدا جانے تو کون ہے میں کون ہوں مجھے بھی تعجب ہے میں کیا کہوں  
پر اب تو تو مہان ہے میرے گھر لے آئے ہیں تجھ کو قضا و قدر  
یہ گھر گو کہ میرا ہے تیرا نہیں پر اب گھر یہ تیرا ہے میرا نہیں

اس کے بعد اخفا کو بے ضرورت سمجھ کر پری بے نظیر کو حقیقت حال سے یوں آگاہ کر دیتی ہے :-

ترے عشق نے مجھ کو شیدا کیا ترا غم مرے دل میں پیدا ہوا  
چھرا کر ترا تجھ سے شہر و دیار یہ بندی ہی لائی ہے تقصیر دار  
پری ہوں میں اور پرستان ہے یہاں سب یہ قوم بنی جان ہے

اس کے بعد حضرت مصنف صحبتِ ناجنس کی کیفیت یوں رقم فرماتے ہیں :-

کہاں صورت جن کہاں شکل انس غرض قہر ہے صحبت غیر جنس  
پری کو ہوتی شادی اس مہ کو نعم یہ ناچار کیا کر کے وہ صنم  
کبھی یوں بھی ہے گردش روزگار کہ معشوق عاشق کے ہوا اختیار  
غرض دل کو جوں توں لگایا وہاں کہا اس نے جو کچھ کہا اس کو ہاں  
دیکھ نہ عقل و نہ ہوش و حواس رہے وحشیوں کی طرح وہ ادا اس  
کبھی اشک آنکھوں میں بھرائے وہ کبھی سانس لے کر کہے ہاے وہ  
وہ محلوں کی چلبلیں وہ گھر کا سماں رہے روبرو دھیان میں ہر زباں  
وہ شفقت جو ماں باپ کی یاد آئے تو راتوں کو رو کے دریا بہائے  
کبھی اپنی تنہائی کا غم کرے کبھی اپنے اوپر دعا دم کرے  
کرے یاد جب اپنے ناز و نعم فناں زیر لب وہ کرے دم بدم  
بہانے سے دن رات سویا کرے نہ ہو جب کوئی تب وہ رویا کرے

غرض انتظار اسکو ہر حال میں کہ جوں مرغا تو پے نیا جال میں  
 اشعار بلا کی فطری خوبیاں ممت بیاں نہیں ہیں۔ واقعی حضرت مصنف نے اس جگہ شاعری کی  
 اچھی داد دی ہے۔ اے حضرات ناظرین اس جگہ پر کیا موقوف ہے انسان یہی ہے کہ ہر جگہ پر جہاں جس  
 صنف شاعری کا موقع آیا ہے وہاں اپنے کمال شاعری کا جلوہ دکھلا جاتے ہیں۔ داخلی اور وہ بھی خارجی  
 شاعری پر اس قسم کی قدرت صرف چند شاعران دنیا کے سوا کسی میں نہیں دیکھی جاتی ہے۔ اتنے بیانات  
 کے بعد اسی پری کے زندگانی کا طریقوں حوالہ قلم پایا جاتا ہے کہ ماہر خ نے بے نظیر سے پوشیدہ طور پر  
 تعلق پیدا کیا تھا۔ اس لیے باپ کے پاس بھی حاضری دے آیا کرتی تھی۔ تا افشائے راز نہ ہو جائے اس  
 حاضری سے جو وقت بچتا تھا اسے بے نظیر کی صحبت میں بسر کرتی تھی۔ مگر بے نظیر روز بروز وطن سے  
 کاہیدہ ہوتا جاتا۔ ماہر خ ہر طرح کی خاطر داری کرتی تھی۔ اور اسباب آسائش کی فراہمی میں جس بھر  
 کمی نہیں کرتی تھی۔ لیکن ان سب کوششوں سے کوئی حسب مراد نتیجہ پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہ پری پریوں  
 میں نہایت ہوشیار شعور مند اور فہیم تھی بے نظیر کو اس طور مبتلائے رنج و الم دیکھ کر سوچتی کہ اس کی  
 دل بستگی کا سامان کیجئے۔ یہ سوز کر کہ اہل غم کو سیر ہو خوار سی سے فائدہ عظیم مترتب ہوتا ہے۔  
 ایک دن شاہزادہ سے یوں کہنے لگی۔

کہا ایک دن اس نے سن بے نظیر	مرے دام میں تو ہوا ہے اس پر
تو اک کا اکراک پیر بہر کہیں	کیا کر تک اک میر ردے زمیں
تو رک رک کے دل کو نہ کرا پئے بند	نہ پہنچے کہیں تیرے جی کو گزند
مر شام جاتی ہوں میں باپ پاس	اکیلا تو رہتا ہے اس جا اُداس
یہ گھوڑا میں دیتی ہوں کل کا تجھے	دلیکن یہ دے تو پھلکا مجھے
کہ گر شہر کی طرف جا دے کہیں	و یا دل کسی سے لگا دے کہیں
تو پھر حال ہو جو گنسہ گار کا	وہی حال ہو تجھ سے دل دار کا
کہا کیوں کہ میں تم کو جاؤں گا بھول	مجھے جو کہا تم نے سب ہے قبول
کہا ماہر خ نے کہ تجھے تیرے بخت	کہ بخشا تجھے سلیمان کا تخت
جو اترے تو کل اس کی یوں جوڑیو	جو برکس جائے تو دودں موڑیو

زمین سے لگا اور تا آسماں

جہاں چاہیو جاؤ تو وہاں



اشعار بالا کہانی کی مزہ داری کے ساتھ کیسی فطرتی خوبیوں سے معمور نظر آتے ہیں۔ ماہر بخ شاعرانہ کوادل مضمون اسیری یاد دلاتی ہے۔ تادہ خود اختیار ہو کر اس سے آنا دی کی نہ لے۔ بعد ازاں اسے ایک پہر سیر کی اجازت دیتی ہے۔ اور یہ اس لیے کہ معشوق کی صحت میں خلل واقع نہ ہو۔ اور پھر سیر کا وقت بتاتی ہے کہ جب وہ مجھوٹا باپ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتی ہے۔ پھر گھوڑا دے کر اس سے چلکا لیتی ہے۔ پھر شاہزادہ اتنی فرصت کو بھی قیمت سمجھ کر ماہر بخ کی تشفی کر دیتا ہے۔ اس کے بعد ماہر بخ شاہزادہ پر اپنا احسان جتانے ہے اور احسان جتانے کے بعد گھوڑے سے کام لینے کی ترکیب بتاتی ہے۔ سبحان الشکر کیا انداز ہے۔ لاریب حضرت مصنف اردو کے شکسپیر ہیں۔ اس جگہ امر کل کے گھوڑے کی نسبت عرض کر دینے کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ سابق میں پرستان کے بیان میں یہ مذکور آچکا ہے کہ وہاں طلسماتی چیزیں بہت تھیں۔ پس طلسمی گھوڑے کا بھی ایسی جگہ میں موجود ہونا خلافت توقع نہیں ہے۔ حضرت مصنف کی شاعری کا یہ بڑا کمال ہے کہ کوئی بات بے وجہ حوالہ قلم نہیں فرماتے ہیں۔ اکثر اس تنوی میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ اگر کوئی بات کسی جگہ پہلے فرما جاتے ہیں۔ تو دس بیس سو پچاس شعر کے بعد اس بات کو کہنے کی وجہ ہویدا ہوتی ہے۔ یہی کیفیت شکسپیر اور صاحب الف لیلہ کی ہے کہ دور جا کر پہلے کی کہی ہوئی باتوں کا سبب کھلتا ہے۔ کل کے گھوڑے کا مضمون کتاب الف لیلہ میں بھی دیکھا جاتا ہے۔ یہ عجب نہیں ہے کہ میر حسن نے اس خیال کو اس کتاب سے حاصل کیا ہو مگر پرستان میں کل کے گھوڑے کا موجود ہونا زیادہ قرین پذیرائی نظر آتا ہے۔ گو جس طور پر الف لیلہ میں کل کے گھوڑے کا بیان ہے بجائے خود عجب فطرتی خوش نمائی کے ساتھ حوالہ قلم ہوا ہے۔

### داستان گھوڑے کی تعریف میں

حضرت مصنف کی اطلاع عام بہت جبرت انگیز نظر آتی ہے۔ اطلاع عام سے مراد راقم یہ ہے کہ اپنے ملک کے ہر قسم کے امور سے انہیں واقفیت تھی۔ یہی کیفیت حضرت سودا کی بھی معلوم ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ بے اس طرح کی اطلاع عام کے کوئی شاعر نہ میر حسن کی سی تنوی لکھ سکتا ہے اور نہ سودا کی طرح اصناف شاعری پر قادر ہو سکتا ہے۔ شکسپیر کی بھی اسی رنگ کی اطلاع و کفائی درستی ہے میر حسن اور سودا کی اطلاع عام شکسپیر کی اطلاع عام کا فرق یہ ہے کہ یہ دونوں ہندوستانی شاعر صرف ہندوستان کے معاملات، اخلاق، تمدن و معاشرت وغیرہ سے خبر رکھتے تھے اور شکسپیر کو اس طرح کی اطلاع تمام معاملات یورپ سے حاصل تھی۔ یہاں پر میر حسن گھوڑے کی تعریف میں ایسی باتیں رقم کرتے ہیں جو اہل ہند کے مذاق کے تمام تر موافق معلوم ہوتی ہیں۔ حضرت

مصنف کے اس جگہ کے اشعار جلد اول میں درج ہو چکے ہیں۔ اس لیے یہاں پر چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔  
بہر کیف اس کل کے گھوڑے پر بے نظیر روز میر کو نکلتا تھا۔ جیسا کہ فرماتے ہیں :-

یہ گھوڑا جو اس گل کی تھا بخش کا      فلک میر تھا نام اس خوش کا  
میر شام وہ بے نظیر جہاں      اسی خوش پر ہو کے جلوہ کسناں  
ہر اک طرف سے ہو گزرتا تھا وہ      وہی اک پہر سیر کرتا تھا وہ  
پہر جب کہ بچتا تو پھر تھا شباب      کہ پھر نہ رہتا تھا ماہ رخ کا عتاب

## داستان وار دھونے میں بے نظیر کے باغ میں بدر منیر کے

یہ داستان الف لیلہ کے اس قصہ سے مشابہت رکھتی ہے جس میں فارس کے بادشاہ ہزادہ کے کل کے گھوڑے کا بیان دیکھا جاتا ہے۔ اس قصہ میں فارس کے بادشاہ ہزادہ بنگالہ کی بادشاہ زادی کے پاس اس طرح کل کے گھوڑے کے ذریعے پہنچا تھا۔ جس طرح کے بے نظیر کا بدر منیر کے باغ میں پہنچا اس داستان میں بیان کیا گیا ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ الف لیلہ کے قصہ میں شاہ ہزادہ فارس اتفانہ بنگال کی شاہ زادی کے محل کے چھت پر جا اترا تھا۔ یہاں یہ کیفیت گزری کہ ہنگام میر بے نظیر کو اتفانہ ایک باغ نظر پڑا جس میں ایک عمارت بلند اس نے دیکھی اور بالقصد اس کے کوٹھے پر اس نے اپنے گھوڑے کو اتارا۔ اس کے بے نظیر کا بدر منیر سے ملنا بھی الف لیلہ کے قصہ سے مشابہت رکھتا ہے۔ گردونوں کا فرق جو ہے وہ اخلاقی پہلو کے لحاظ سے بہت قابل لحاظ ہے۔ الف لیلہ کا قصہ بڑی عمدگی اخلاقی سے خبر دیتا ہے۔ برعکس اس کے مثنوی کی کہانی جو بے نظیر اور بدر منیر کی ملاقات پر مشتمل ہے۔ اخلاقی تنزل سے خبر دیتی ہے۔ وہاں بنگال کی شاہ زادی ایک شریف و صنع، مہمان نواز، خوش خلق، پاک خیال، پاک کردار ناکہ خدا عورت کے پہرے میں دکھلائی گئی ہے۔ برعکس اس کے یہاں بدر منیر کا ایسا فوٹو کھینچا گیا ہے کہ شرم کی ناکہ خدا لڑکیاں یا شرف کی عورتیں خدا نخواستہ اس طرح کی ہو ہی نہیں سکتی ہیں۔ ظاہر ہے بڑے تعجب کی بات معلوم ہوتی ہے کیوں کہ میر حسن ایک ایسے عمدہ شاعر نے اپنی کہانی ہیروئن۔ HEROINE کے بیان کو ایسی بد ترکیبی کے ساتھ حوالہ قلم فرماتے ہیں۔ مگر حقیقت حال یہ ہے کہ حضرت مصنف نے اپنے اس طرح کے بیان کی رو سے اس اخلاقی تنزل کی تصویر کھینچی ہے جو عہد محمد شاہ بادشاہ دہلی کی عیاشیوں کا نتیجہ کہا جاسکتا ہے۔ شاہی اخلاق کے تنزل کی مثالیں انگلستان کے بادشاہ جارج سوم و جارج چہارم کے زمانے میں بھی ہیں۔ ان بادشاہوں



کے زمانوں میں کیا کیا اخلاقی بے عنوانیاں ظہور میں نہیں آئی تھیں اور اب وہی دربار ہے کہ حضرت ملکہ معظمہ آنجہانی کی بدولت کس قدر دار لہذیب ہو رہا ہے۔ مختصر میں حسن کے ایسے بیانات بے بنیاد نہیں ہیں جس طبقہ کے متعلق حضرت مصنف کا بیان ہے اس طبقہ کے اخلاقی معاملات اسی انداز کے ہو رہے تھے۔ لاریب ہندوستان کا ایک ناواقف شریف و وضع آدمی ایسے بیانات عیث و تلیش کو جو چند آئینہ کے داستانوں میں مندرج ہیں پڑھ کر منغص ہو سکتا ہے۔ اور واقعی بات بھی منغص ہونے کی ہے۔ مگر جاننا چاہئے کہ یہ بیانات ایک عہد کے اخلاقی حالتوں کو دکھا رہے ہیں اور اس سے ناقابل توجہ نہیں ہیں۔

واقعہ ہو کہ ہر چند اس چند داستان کے بہت ہی جوانہ پیرایہ ہیں۔ مگر جوانان صالح ان سے فائدہ بھی اٹھا سکتے ہیں۔ اس لیے کہ حضرت مصنف بڑے نچرل شاعر تھے اور اپنے بیانات کو مارل یعنی نتیجہ اخلاقی کے قرن کرنا خوب جانتے تھے۔ اس داستان میں آپ باغ و محل کا بیان حوالہ فلم کر کے بے نظیر کی نسبت ایک عجب مضمون لکھتے ہیں۔ جو تمدنی پہلو کے رد سے اس وقت کے ہونہار نوجوانوں کو بہت مفید نظر آتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:-

لی جنس کی اپنی جو اس کو بو لگا کئے حیرت سے ہر ایک سو

اے حضرات نورسیدگان جوانی اگر آپ صاحبوں کی نظر سے اس شہوی کا یہ جزو گذرے تو بغور اس شعر کو ملاحظہ فرمائیے گا۔ یہ عجب شعر ہے اس سے بڑی تعلیم منجھتی ہوئی ہے۔ آپ ملاحظہ فرمائیے کہ میر حسن پہلے بے نظیر کا پرستان میں گرفتار رہنا بیان کرتے ہیں پھر پرستان میں غیر جنسیت کے باعث بے نظیر کا دل برافستار رہنا تحریر کرتے ہیں پھر بے نظیر کا ایک ایسے باغ میں پہنچنا جو مسکن بنی آدم تھا رقم کرتے ہیں یہاں پہنچ کر اسے ہم جنسوں کی بولی اسے ذکر کرتے ہیں۔ یہ ذکر تمدنی جہت سے بہت قابل ملاحظہ ہے حضرت مصنف کے آئینہ بیانات سے معلوم ہوگا کہ اس جنسیت کی بنیاد پر بے نظیر نے ایک ناجنس کے مقابلہ میں اپنی جنس اور اپنے رجبہ کی ایک معشوقہ کے ساتھ وصل و پیوند کرنا پسند کیا۔ یعنی ہر چند ماہر جنس کی عاشق تھی گو کس طرح کی حسین ہوش مند فہیم اور سلیقہ مند تھی مگر اس نے اس سے دل نہ لگایا۔ جب اس نے موقع پایا۔ اپنی ہی جنس سے آملا۔ افسوس ہے ان ہندی نوجوانوں پر جو غیر قوم کی عورتوں سے وصل و پیوند کرتے ہیں اور آخر کار اپنے کیے کا نتیجہ بھگتے ہیں اس زمانہ میں ہندی نوجوان تعلیم کی نظر سے بہ کثرت انگلستان جاتے ہیں وہ ملک ہندیوں کے لیے پرستان کا حکم رکھتا ہے پس وہاں ہزاروں ماہر جنسوں سے ان کو سامنا پڑتا ہے۔ تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جو بے نظیر کی روش اختیار کرتے ہیں ان کی

بقیہ زندگی عافیت سے کٹ جاتی ہے۔ لاریب غیر جنس کے ساتھ مواصلت کبھی صورت عافیت نہیں ہوتی ایسی مواصلت میں سوائے نقصان کے کوئی فائدہ منظور نہیں ہے۔ یہ بنیاد تجربہ نہ فائدہ مواصلت کرنے والے کو ہوتا ہے۔ اور نہ اس کے خاندان کو اور نہ اس کی قوم کو ایسی مواصلت کے نتائج یہ ہوتے ہیں کہ مواصلت کرنے والے کو ایک ناجنس ساتھی کی بدولت تمام عربیہ واقعات سے علاوہ رہنا پڑتا ہے یعنی اکثر وہ ماں باپ بہن بھائی سب سے چھوٹ جاتا ہے۔ اور اس کی بقیہ زندگی خارج از خاندان کے طور پر بسر ہوتی ہے۔ اس طرح کی مواصلت خرچ کثیر کا سبب بھی ہوا کرتی ہے۔ جو بہت سی حالتوں میں مالی مصالح کے خلاف منظور ہے ذاتی نقصانات کے علاوہ خاندانی نقصانات بھی ایسی مواصلت میں بہت ہیں ظاہر ہے کہ اس سے خرابی نسل واقع ہوتی ہے۔ مجنسون کا پیدا ہونا کبھی خاندان کو مفید نہیں ہو سکتا۔ یہ جنس ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا وصل پیوند ان کے باپ اور ماں دونوں کی قوم سے دشوار ہوتا ہے۔ ابھی وہ وقت نہیں آیا ہے کہ اہل ہند فاتح قوم سے مواصلت پیدا کریں اور ان کی مجنس اولاد اپنی قوم یا قوم فاتح سے بلا تکلف رشتہ و پیوند کر سکے۔ خاندانی نقصانات کے علاوہ قومی نقصانات بھی کثیر ہیں۔ سردست نقصان میں تو یہی ہے کہ جب ایک قابل آدمی غیر جنس عورت سے بیاہ کرتا ہے تو اس کی قوم اس کی ذات سے وصل و پیوند کے اعتبار سے محروم رہ جاتی ہے یعنی اگر ایسا شخص اپنی قوم میں بیاہ کرتا تو اس کی قوم کی ایک لڑکی اس کی مواصلت سے ایک قابل شوہر پاتی۔ برخلاف اس کے اچھے ہونے کا نفع ایک غیر جنس عورت اٹھاتی ہے۔ علاوہ اس کے بسا اوقات ایسی مواصلت کے کرنے والے اطوار وادات کے اعتبار سے اپنی قوم کے نفع و ضرر سے علاوہ ہوجھتے ہیں کہ ان کا شمار قوم میں فضول ہوتا ہے جس نہایت بھی خواہی سے اپنے ملک کے نوجوان حضرات کی خدمت میں یہ عرض کرتا ہوں کہ تعلیم ولایت کے بعد وہ جس محمود صاحب کی روش اختیار فرمائیں۔ محمود صاحب کو سب سے زیادہ موقع انگلستان میں مواصلت پیدا کرنے کا تھا اور ہند میں بھی ان کو اس قسم کی مواصلت کا موقع حاصل تھا۔ جوانی خوب روئی، تعلیم یافتگی، بلند پائے کی، نہایت شرافت، عالی خاندانی سب ہی باتیں حسب مراد تھیں مگر مجنوں کے پیدا کرنے کی طرف مطلق مائل نہ ہوئے۔ المختصر حضرت مصنف نے مضمون جنسیت کو پیش نظر رکھ کر ایک عمدہ ہدایت نامہ اس عہد کے نوجوانوں کے لیے چھوڑا ہے۔ فقیر کی دانست میں یہ جنسیت کا مضمون ایسا قابل توقیر ہے کہ ہر باپ کا فرض منصبی ہے کہ لڑکے کو ولایت بھیجنے سے پہلے میر جنس کی ثنوی کو خوب سمجھا کر پڑھائے۔ واقعی یہ تصنیف ایک حکیمانہ رنگ رکھتی ہے۔ جناب والا والد ماجد مرحوم نے راقم کو سترہ برس کی عمر میں درس کتاب کے طور پر ایک ثنوی کو پڑھایا تھا۔ عنفوان شباب کا انطباع بہت



قوی ہوتا ہے۔ اس کتاب سے راقم نے آئندہ دن بہت فائدے اٹھائے۔ فقیر نے بھی اپنے لڑکوں کو اس کتاب کے بہت اجزا پڑھ کر سنائے ہیں۔ اور الحمد للہ کہ وہ سب انگلستان سے باہر واپس آکر اور داخل خاندان رہ کر عافیت تمام کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں۔

اس داستان حضرت مصنف بدر منیر کے باغ و محل کا بیان اسی فطرتی رنگ سے جو ان کی شاعری کا طور ہے زیب رقم فرماتے ہیں۔ یہاں ان کی تحریر کا اعادہ خون طوالت سے ترک کیا جاتا ہے۔ مگر آخر کے کچھ اشعار جو تصوف کا رنگ رکھتے ہیں ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

نظر جس طرف جائے نزدیکے دور      اسی ایک مسہ کا ہر حبا ظہور  
نکل اپنی وحدت سے کثرت میں آ      وہی نور ہے جلوہ گر جا بحبا  
حقیقت کو لیکن بصارت بھی ہو      کہ دیکھے نہ اس کے سوا غیر کو

## داستان تعریف بدر منیر اور عاشق ہونا بے نظیر کا

اس داستان میں حضرت مصنف پہلے بدر منیر کے حسن جمال سج و سج لباس پوشاک زیور آرائش وغیرہ کو نہایت فطری اور خوش اسلوب رنگ سے بیان کرتے ہیں۔ بعد ازاں بدر منیر کا سراپا رقم کرتے ہیں۔ یہ سراپا فحش وغیرہ سے تمام تر پاک ہے۔ لاریب یہ سب مضامین اعلیٰ درجہ کی قوت شاعری سے خبر دیتے ہیں اور حضرت مصنف کی اطلاع عام کے مثبت ہیں۔ سراپا نگاری کے بعد مضامین یہ ہیں کہ بے نظیر بدر منیر کو دیکھ کر نہایت متعجب ہوا اسی حال میں اُسے کسی نے دیکھ لیا۔ اور اسے درختوں میں چھپا ہوا پا کر محل کی خواہیں وغیرہ کمال حیرت کے ساتھ آپس میں گفتگو کرنے لگیں۔

کسی نے کہا کچھ نہ کچھ ہے بلا      کسی نے کہا چاند ہے یاں چھپا  
کسی نے کہا ہے پری یا کہ جن      کسی نے کہا ہے قیامت کا دن  
لگی کہنے ماننا کوئی اپنا کوٹ      ستارہ پڑا ہے فلک پر سے ٹوٹ  
ہوئی صبح شب کا گیا اٹھ حجاب      درختوں میں نکلا ہے یہ آفتاب  
کسی نے کہا دیکھو اے بوا      کھڑا ہے کوئی صاف یہ مردوا  
کسی نے کہا کچھ یہ امرا ہے      کسی نے کہا یہ تو دل دار ہے

اس کے بعد بدر منیر کو اس واقعہ عجیب سے خبر ہوئی اور وہ خود بے نظیر کو دیکھنے گئی۔ دیکھتے ہی بتلائے عشق ہو گئی۔ واضح ہو کہ انسان کو عشق دو طور پر ہوتا ہے۔ ایک تو معشوق سے رفتہ رفتہ اور دوسرا معشوق کو

دیکھ کر فی الفور اسے انگریزی فرسٹ سائٹ لو. FIRST SIGHT LOVE کہتے ہیں۔ دونوں طور کے عشق بشرطیکہ ان میں نفسیات کو دخل نہ ہو حکم عشق رکھتے ہیں: بہر حال جب بے نظیر اور بد منیر لے ایک دوسرے کو دیکھا غایت فریفتگی سے انہوں نے غش گیا۔ مگر وہاں نجم النساء دخت و زینے جو بد منیر کی ہم عمر رفیقہ تھی ان دونوں پر گلاب چھڑکا۔ جس سے انہیں ہوش آگیا۔ افاقہ کے بعد بے نظیر تو فرط حیرت سے وہاں کا وہاں ہی رہ گیا۔ مگر بد منیر شرم کھا کر اپنے محل کی طرف چلی گئی۔

واضح ہو کہ اس ملک میں رواج ملکی کے باعث کسی شریف مرد کو کسی شریف عورت کے دیکھنے کا اس طرح پر موقع نہیں مل سکتا ہے۔ لیکن اہل یورپ کو ہمیشہ عورتوں سے ملنے کا موقع حاصل رہتا ہے۔ وہ بغیر دیکھنے کسی عورت سے وصل پیوند نہیں کرتے۔ اس میں ظاہری مصلحتیں ہیں۔ مگر تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وصل و پیوند کے مبارک اور مبارک ہونے میں دیکھ بھال کو دخل نہیں ہے۔ خیر اس داستان کا جو سین ہے وہ اس ملک کی معاشرت شراب کے مطابق نہیں ہے۔ لیکن حضرت مصنف کے یہ سارے بیانات تناسب سے خالی نہیں ہے اس لیے کہ جو سختی پردہ کی یہاں کے شرفاء کے درمیان ہے وہ دیگر بلاد اسلام میں پائی نہیں جاتی ہے۔ علاوہ اس کے جس طبقے افراد کا ذکر اس داستان میں ہے۔ ان کے یہاں ایسا سخت پردہ ہے اور نہ ایسے پردہ کا التزام مناسب حال ہے۔ اگر اس طرح کا سخت پردہ شاہان اسلام میں مروج ہوتا تو نور الدین جہانگیر بادشاہ دہلی کو نور جہاں کے دیکھ لینے کا کب موقع ملتا۔ یہ یگم کد خدائی کہ پہلے جلال الدین اکبر شاہ کے محل میں اپنی ماں کے ساتھ آیا جایا کرتی تھی۔ ایام شاہزادی میں جہاں گیر کو اکثر اس کے دیکھنے کا موقع ملا کیا تھا۔ اس واسطے وہ اس پر فریفتہ ہو رہا تھا اگر یہ موقع حاصل نہ رہتا۔ تو جہاں گیر کو فریفتگی لاحق ہوتی اور شیرانگن کی جان جاتی۔ المختصر جس طبقہ کا ذکر حقیقت مصنف اس داستان میں کر رہے ہیں۔ اس سے اس ملک کے عامہ شرفاء کو ذاتی اطلاع نہیں ہے۔ پس حضرت مصنف کے ان بیانات کو غیر فطری یا بعید از قیاس یا خلاف رسم ملک نہیں سمجھنا چاہئے۔ اور قسمی یہی ہے کہ حضرت مصنف نے کہیں بھی سلسلہ تناسب کلام کو ہاتھ سے نہیں دیا ہے۔ اور حق یہ ہے کہ حضرت مصنف ایک بڑے واقعہ نگار شاعر ہیں اور ان کی واقعہ نگاری حضرات اہل مذاق کی توجہ فرمائی کی تمام تر مستحق ہے۔

## داستان زلف اور چوٹی کی تعریف میں

حضرت مصنف زلف کی تعریف اس طرح پر حوالہ قلم کرتے ہیں کہ جس کی تعریف میں خامہ



سو سوچ و تاب کھاتا ہے۔ سہانہ تشبیہات میں کیا کیا جدیں نمایاں ہیں۔ لیکن ایک شعر ایسا ہے جو فردوسی کے اس شعر کا ہے

چو برہست آل طرہ مشکنا ب  
گرہ داد شب را پس آفتاب  
قریب قریب ترجمہ معلوم ہوتا ہے اور وہ شعر یہ ہے:  
موبان زری نے کیا ہے غضب  
دیا ہے گرہ دن کو دنبال شب  
غیر زلف اور چوٹی کی تعریف کے بعد کہانی کا عنوان یہ ہے:-

غرض وہ مڑی جب دکھا اپنے بال تو گویا کہ مارا محبت کا حبال  
ادائیں سب اپنی دکھائی چلی چھپا منہ کو اور مسکراتی چلی  
غضب منہ پہ ظاہر لے دل میں چاہ نہاں آہ آہ اور عیاں واہ واہ  
یہ ہے کون کم بخت آیا یہاں میں اب چھوڑ گھرا پنا جاؤں کہاں  
یہ کہتی ہوئی آن کی آن میں چھپی جل کے اپنے وہ دالان میں  
دیا ہاتھ سے چھوڑ پردہ مشتاب چھپا ابر تاریک میں آفتاب

ظاہر ہے کہ یہ ترکیب اس ملک کی شریف عورتوں کی نہیں ہوتی۔ مگر ایک ایسی جوان عورت کی نسبت جو پوری آزادی اور مطلق العنان کے ساتھ باپ اور ماں سے علیحدہ اور ایک پرتکلف باغ کے پرتکلف مکان میں ہم عمر رفقا اور خواہوں کے ساتھ قیام پذیر ہو کوئی ایسا بیان جیسا کہ اس داستان میں دیکھا جاتا ہے کبھی بے محل یا بے موقع نہیں قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس بیان میں خس برابر بھی مناسب کلام میں نقصان لاحق نہیں ہے۔ خیر جب بدر منیر اس طور پر بے نظیر کو چھوڑ کر اپنے مکان میں جا چھپی تب نجم النساء اس کے پاس پہنچ کر یوں کہنے لگی۔

مجھے چو چلے تو خوش آنے نہیں ترے ناز ہے جا تو بھاتے نہیں  
مڑی سمت ہم دیکھ تو ہائے ہائے شل ہے کہ من بھائے منڈیا ہلائے  
کیا ہے اگر تو نے گھائل اسے تو مت چھوڑ اب نیم بسمل اُسے  
ہم ایک سزا اٹھا زندگانی کا تو مزادیکھ اپنی جوانی کا تو  
مے عین کا جام اب نوش کر غم دین و دنیا فراموش کر

یہ سن و جوانی ۽ جوش و خروش      غفور است ایزد تو ساغر نبوش  
 کہاں ۽ جوانی کہاں ۽ بہار      یہ جوبن کا عالم رہے یادگار  
 سدا عیش و دوراں دکھاتا نہیں      گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں  
 بھی یوں تو دنیا کے ہیں کار و بار      ولے حاصل عمر ہے وصل یار  
 خوشا وہ زمانہ کہ دواک جگہ      کریں یک دگر جلوہ مہر و دم

ظاہر ہے کہ ایسی نہایتیں سوائے ایک نوجوان ہم رفیق کے کون کر سکتا ہے۔ مگر اس سلسلہ  
 تقریر کے چند اشعار تو ایسے ہیں کہ ایک سن رسیدہ فلسفی بھی ان کی خوبی سے چشم پوشی نہیں کر سکتا  
 ہے۔ خیر اس تقریر کو سن کر بدر منیر نے جو کہا اور جو اس کا جواب نجم النساء نے دیا اس کا بیان کس قدر  
 فطرت رنگ رکھتا ہے۔ حضرت مصنف فرماتے ہیں:-

یہ سن کے وہ نازنین مسکرا      لگی کہنے اچھا بھلا ری بھلا  
 میں سمجھی ترا دل گیا ہے ادھر      بہانے تو کرتی ہے کیوں مجھ پہ دھر  
 لگی کہنے منس منس کے وہ ماہ و دوش      ہوئی تھی اُسے دیکھ میں ہی تو غش  
 تمہیں نے تو چھڑکا تھا مجھ پر گلاب      بھلا میری خاطر بلا لوشتاب

اس آپس کی رمزوں کی باتوں کے بعد نجم النساء بے نظیر کو بلا لائی۔ پھر بدر منیر کا ہاتھ پکڑ کر اسے  
 بے نظیر کے پاس بٹھلایا۔ اس جگہ پر حضرت مصنف نے ایک ہم عمر اور شفیق رفیق کی کارروائی کو بڑی  
 خوش اسلوبی کے ساتھ حوالہ قلم کیا ہے۔ واقعی فطرت نگاری حضرت مصنف پر ختم ہے۔ یہی شاعری  
 فطرت کی بخشش کے بغیر نصیب نہیں ہوتی اور فطرت کی بخشش کے بغیر سمجھ میں نہیں آتی۔

## داستان ملاقات کرنا بدر منیر کا بے نظیر سے

جب نجم النساء نے بدر منیر کو بے نظیر کے پاس بٹھلایا تو بدر منیر کے اس وقت کے انداز نشست  
 کو حضرت مصنف یوں زیب رقم فرماتے ہیں:-

وہ بیٹھی عجب ایک انداز سے      بدن کو چرائے ہوئے ناز سے  
 منہ آنجل سے اپنا چھپائے ہوئے      لبائے ہوئے شرم کھائے ہوئے  
 پسینے پسینے ہوا سب بدن      کہ جوں شبم آلود ہو یا سمن  
 گھڑی دوتک وہ مہ و آفتاب      رہے شرم سے پائے بند حجاب



ظاہر ہے کہ یہ حجاب ایک فطری امر تھا۔ اس کے دفع کرنے کے واسطے نجم النساء نے شیشہ و ساغر سامنے لاکر رکھا اور قسمن دیکر بدر منیر سے کہا کہ بے نظیر کو مے پلا۔ جب بادہ نوشی کا شغل جاری ہوا تو سارا حجاب جاتا رہا۔ بے نظیر و بدر منیر ایک دیگر تفتیش حال کرنے لگے۔ شراب کا خاصہ یہ ہے کہ اس سے حجاب جاتا رہتا ہے اور راز پنہاں آشکارا ہو جاتا ہے چنانچہ ایسا ہی ہوا جیسا کہ اشعار ذیل سے ظاہر ہوتا ہے۔

کھلا جبکہ بند درگفتگو      جوان نے حقیقت کہی مو بہ مو  
کہی ابتدا سے جو گزری تھی سب      بتایا سب اپنا حسب اور نسب  
پری کا بھی احوال ظاہر کیا      چھپے راز سے اس کو ماہر کیا  
کہا اک پہر کی ہے رخصت مجھے      زیادہ نہیں اس سے فرصت مجھے  
اس گفتگو کو سن کر بدر منیر نے تقاضائے فطرت کے مطابق یوں جواب دیا۔

مرد تم پری پر وہ تم پر مرے      بس اب تم ذرا مجھ سے بیٹھو پرے  
میں اس طرح کا دل لگاتی نہیں      یہ شرکت تو بندی کو بھاتی نہیں  
عبث تم سے کیوں دل لگائے کوئی      بھلے چنگے دل کو حبلائے کوئی  
بہے شمع ساں کیوں کوئی اشک سے      جلے کس لیے آتش رشک سے

یہ جواب پا کر بے نظیر کو بدر منیر کے پاؤں پر گر پڑنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ ذیل کا سین نہایت فطری رنگ رکھتا ہے۔

یہ سن پاؤں پر گر پڑا بے نظیر      کہا کیا کروں آہ بدر منیر  
کوئی لاکھ جی سے ہوا مجھ پر فدا      میں تجھ پر فدا ہوں مجھے اس سے کیا  
کہا چل سراپنا قدم پر نہ دھر      کسی کے مجھے دل کی ہے کیا خبر  
یہ رمز و کنایہ جو ہونے لگے      تو آپس میں ہنس ہنس کے رونے لگے  
رہی دل ہی میں آخرش دل کی بات      پھر بھر گئی اتنے عرصے میں رات  
خبر رات کی سن اٹھا بے زلمر      کہا اب میں جاؤں بدر منیر  
اگر قید سے چھوٹنے پاؤں گا      تو پھر آج کے وقت کل آؤں گا  
یہ مت سمجھو ہوں میں آرام میں      کروں کیا پھنسا ہوں عجب دام میں  
دل اس جا سے اٹھنے کو کرتا نہیں      کوئی آپ سے جان مڑتا نہیں  
کرم مجھ پر رکھو ذرا میسر ہی جاں      میں دل چھوڑے جاؤں اپنا یہاں

بے نظیر یہ کہہ کر روانہ ہوا۔ اور جدائی کا قلق ساتھ لیتا گیا۔ بقیہ رات اس نے پری کے ساتھ بے چینی میں بسر کی۔ ادھر بدر منیر بھی غلاب فراق میں مبتلا رہی۔ جب صبح ہوئی تو بدر منیر کی اندرونی حالت یہ تھی:

کچھ امید دل میں کچھ اک جی کو یاس لبوں پر منہسی لیک چہرہ اُداس  
نجم النساء نے جو بدر منیر کی یہ کیفیت دیکھی تو باتوں میں لگا کر اس سے کہنے لگی کہ میرا یہ جی چاہتا ہے کہ تو  
آج خوب اپنا سنگار کرے اور اپنے حسن کی بہار مجھے دکھلائے۔ بدر منیر کو تو یہ منظور ہی تھا مگر اس نے  
نجم النساء کو اس طرح پر ایک ناز آمیز جواب دیا۔

کردوں کس کے خاطر میں اپنا سنگار

وہ ہے کون جس کو دکھاؤں بہار

اس کے بعد اس داستان میں بدر منیر کے سنگار اور مکان کی آرائش کے بیانات ہیں۔ یہ بیانات  
ایک ایشیائی شاہزادی اور ایک ایشیائی محل شاہی کی آرائش کی پوری تصویر ہے۔ اور حضرت مصنف کی  
بڑی اطلاع عام سے خبر دیتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی شاعر جب تک کلیات و جزئیات سے با مراد  
طور پر با خبر نہ ہوگا۔ اپنے بیانات میں مصوری کا عالم نہیں پیدا کر سکتا ہے۔ مثنوی کے لیے اطلاع عام کی  
بڑی حاجت ہے۔ ایسے شاعر کو امور خارجہ اور معاملات ذہنیہ سے کافی طور پر مطلع رہنا چاہئے۔ ورنہ ہزاروں  
غلطیاں اس سے سرزد ہوں گی۔ یہ ممکن ہے کہ اس سے زبان کی کوئی غلطی سرزد نہ ہو۔ مگر مضامین کی غلطیوں  
کا سرزد ہونا ایک امر یقینی ہے۔ اس عدم اطلاع کی وجہ سے حضرت غالب اپنی مثنوی میں یہ مصرع ۷

نیک شد و پنجہ زد ن ساز کرد

نظم مالئ میں اگر حضرت غفران مآب کو یہ معلوم ہوتا کہ ٹوک جانور سبائی نہیں ہے یعنی از قسم گرہ اور نہ از قسم سگ  
تو مرزا باطلی مکرانی کو موقع اعتراض کیا ملتا۔ اس واسطے کہ اس مصرع میں زبان کی گرفت کا کوئی موقع  
پایا نہیں جاتا ہے۔ مختصر سچا مثنوی نگار وہی شاعر ہو سکتا ہے جو امور ذہنیہ اور معاملات خارجہ کے  
کلیات و جزئیات سے حسب مراد واقفیت رکھتا ہے۔ سعدی تنکسیر اور صاحب الف لیلہ کی حیرت انگیز  
کامیابیوں کا سبب سوائے اطلاع کے دوسرا نہیں ہے۔

## داستان بے نظیر کے آنے کی اور باہم صحبت کرنے کی

اس مثنوی کی داستانوں سے صرف نام مطبوع داستان بھی ہے کاش میر حسن اس داستان کو  
داخل مثنوی نہ کیے ہوتے یا اس داستان میں اس طرح کے بے باکانہ وصل کے پہلو کو رقم نہ کرتے۔ اس



داستان کے مضامین کوئی روحانی جلوہ نہیں رکھتے۔ زینہاں کسی مہذب ملک میں ایسا نہیں ہوتا کہ ایک ہی صحبت کے کوئی ناکہ خدا عورت اپنے عاشق سے اس طور پر ہم آغوش ہونا گوارا کر سکے۔ یہ ایک اسلامی شاہزادہ اور شاہزادی کی کہانی ہے۔ وصل قبل از نکاح چہ معنی۔ یہ طور زنان بازی کے سوا اور کس کا ہو سکتا ہے کسی شریف طبقہ کی ناکہ خدا لڑکی تو اس طرح کا فوری وصل گوارا نہیں کر سکتی۔ یہ داستان ثنوی زہر عشق وغیرہ کا اخلاقی انداز رکھتی ہے۔ فرق اسی قدر ہے کہ اس کے بیانات فطری خوبیوں سے خالی نہیں ہیں۔ خوب ہوتا اگر میر حسن اس داستان میں انتظار وصل دکھاتے اور محبت کی بھنگی کی تدریجی حالتوں کو بیان کرتے۔ اس سے اس داستان کی وقعت بڑھ جاتی۔ اس فوری وصل نے بدر منیر اور بے نظیر کو بے وقور کر دیا۔ لیکن اگر یہ دکھایا جاتا کہ بے نظیر روز آ یا کرتا تھا اور بدر منیر کی صحبت میں ایک پہر رہا کرتا تھا اور اس کا موقع ڈھونڈتا تھا کہ کس طرح بے پری کی گرفتاری سے غلطی حاصل کر کے بدر منیر سے دستور لگی کے مطابق مواصلت کی صورت پیدا کیجئے۔ تو یہ واقعی داستان مطبوع صورت ہو جاتی۔ اگر اس کی روزانہ کی حاضری اس داستان کی بیان کی جاتی تو بیشک اس کی یہ آمد و شد درنگ پیدا کرتی جیسا کہ اہل فرنگ کا طور عقد کے پہلے ہوا کرتا ہے۔ اسے زبان انگریزی میں کورٹ شپ کہتے ہیں۔ کورٹ شپ گو ملک ہندوستان کے رواج کے خلاف ہے مگر اہل یورپ میں مذموم نہیں ہے بشرطیکہ کورٹ شپ کا زمانہ غیریت سے گزر جائے حقیقت یہ زمانہ انتظار کشی کا زمانہ ہوتا ہے اور کہتے ہیں کہ اس سے محبوب تر زمانہ اس رواج کے پابندوں کو میران کی تمام عمر میں نہیں آتا ہے۔

جو مزا انتظار میں دیکھا      نہ کبھی وصل یار میں دیکھا  
خیر وصل کے بیان تک تو لاریب ہری لغزش حضرت مصنف سے ظہور میں آئی ہے۔ لیکن اس کے بعد کے مضامین پھر وہی حسن لا جواب رکھتے ہیں۔ جو نچرل شاعری سے منفک نہیں ہو سکتے۔ اشعار ذیل قابل توجہ ہیں :-

یہ بیٹھے تھے خوش ہو کے باہم ادھر	کہ اتنے میں ادھر سے با جا پہر
پہر کے وہ بجے اٹھا بے نظیر	ہوئی غم کی تصویر بدر منیر
نہ بولی نہ کی بات نہ کچھ کہا	نہ دیکھا ادھر آنکھ اپنی اٹھا
کہا مجھ سے پیاری نہ بے زار ہو	پھر آؤں گا بولی کہ مختار ہو
نفا اس کے ہونے سے وہ نوجوان	گیا تو دلے منہ پہ آنسو روان

## داستان پاناما رخ کا زبانی دیو کے عشق نے نظیر اور بدمنیر سے اور قید کرنا نے نظیر کو

یہ داستان داخلی شاعری کا خاتمہ نظر آتی ہے شکسپیر! سخن داخلی شاعری کا مالک ہے مگر قابلیت کی رو سے میر حسن بھی اس یکتائے روزگار سے کم دکھائی نہیں دیتے۔ اس داستان میں دو سین حوالہ قلم ہوئے ہیں۔ ایک وہ جو بے نظیر سے متعلق ہے اور دوسرا وہ جو بدمنیر سے تعلق رکھتا ہے۔ دونوں سین نہایت اعلیٰ درجہ کے داخلی پہلو رکھتے ہیں۔ ان کے مضامین کہہ دیتے ہیں کہ میر حسن کو امور ذہنیہ کے بیان کی عجب حیرت انگیز قدرت حاصل تھی۔ واقعی ان کے داخلی بیانات عالم درونی کی تصویر ہیں۔ حسب دستور پہلے حضرت مصنف ساقی نامہ کے چند آبدار اشعار رقم کرتے ہیں اور وہ یہ ہیں:

پلا بھر کے ساقی مجھے بھر کے جام	کہ ہے چرخ بھی درپے انتقام
یہ دودل کو اک جا بٹھا آہنیں	کسی کا اسے وصل بھاتا نہیں
یہ ہے دشمن وصل ددل سوزا بھر	کرے ہے شب وصل کو روز، بھر
جدائی انہوں کی خوش آئی اسے	پھراتی بھی صحبت نہ بھائی اسے

اس کے بعد اہ رخ کے خبر پانے کے مضامین کو اس طرح پر حوالہ قلم کرتے ہیں۔

کسی دیونے دی پری کو خبر	کہ معشوق عاشق ہوا اور پر
یہ سن کر وہ شعلہ بھوکا ہوئی	لگی کہنے این یہ بلا کیا ہوئی
قسم مجھ کو حضرت سلیمان کی	ہوئی دشمن اب اس کے میں جان کی
کہا دیو سے وے مجھے تو بتا	کہا وہ کسی باغ میں تنہا کھڑا
کوئی نازنین سی تھی اک اس کے ساتھ	کھڑی تھی دیئے ہاتھ میں اس کے ہاتھ
تفارا اڑا میں جو ہو کر اُدھر	وہ دونوں مجھے داں پڑے تھے نظر
یہ اڑتی سی اس کی خبر سن پری	کہا دیکھنے پاؤں اس کو ذری
تو کھا جاؤں کچا اسے موت ہو	لگی ہے مری وہ تو اب موت ہو
وہ آئے تو آگے مرے نا بکار	گریاں کو اس کے کروں تار تار
یہی قول واقرا تھا میرے ساتھ	بھلا اس کا دامن ہے اور میرا ہاتھ

ہمارے بزرگوں نے چ ہے کہا  
کہ ہیں آدمی ذات کُل بے وفا



حضرت ناظرین اشعار بالا اس غضب ناک عورت کی ایک پوری تصویر ہیں جس کو اپنے معشوق سے یونانی کے صدمہ کے اٹھانے کا اتفاق ہوا ہو۔ حضرت مصنف نے ایسی عورت کے معاملات دردنی کی مختلف اور پے در پے کیفیتوں کو جس قابلیت کے ساتھ حوالہ قلم کیا ہے۔ بہت کچھ قابلِ قدر و لحاظ ہے۔ واہ واہ کیا فطری طریقہ بیان ہے۔ معشوق کے اوپر عاشق ہونے کی خبر پڑنے پر بلا دریافت حقیقت پر بلا شغل بھوکا ہوتی ہے۔ پھر فرط سیرت و غضب سے جو بولتی ہے تو اسی قدر بولتی ہے کہ اس پر بلا کیا ہوئی۔ پھر تحقیق حال کی طرف مائل نہیں ہوتی ہے۔ دفعتاً بے نظیر کی دشمن جان ہونے کی قسم کھا بیٹھتی ہے۔ یہ اضطرابی فعل کس قدر فطری انداز رکھتا ہے۔ پھر جب پہلی کیفیت شدت غضب کی کم ہوتی ہے۔ تب مختصر طور سے دیو سے جو رائے حال ہوتی ہے اس کے پوچھنے پر دیو جس کو نہ بے نظیر اور نہ پری کے معاملات عشقہ کے ساتھ کسی قسم کا تعلق تھا ایک بے لگاؤ شخص کی طرح بے نظیر اور بدر منیر کے دیکھنے کی سرگزشت بیان کر دیتا ہے۔ اس کیفیت کو سن کر پری کو بدر منیر کے ساتھ فی الفور سوتیا ڈاٹھ پیدا ہوتی ہے اور بدر منیر کی نسبت ایسے الفاظ زبان پر لاتی ہے کہ ایک غضب ناک سوتن کے سوا کسی کی زبان پر آ نہیں سکتے اس اظہار عداوت کے ساتھ ہی پھر پری بے نظیر کو خیال میں لاتی ہے اور اس سے انتقام کا ارادہ مضمم کرتی ہے اور اس انتقام کی وجہ معمول سابق کے قول و اقرار کو ٹھہراتی ہے۔ بالاخر ان سب پے در پے غضبناکی کیفیتوں کے بعد اپنے عشقی تعلقی پر اظہار ندامت کرتی ہے اور قول بزرگوں سے اپنے انحراف درزی پر سخت پشیمان ہوتی ہے۔ آخر صد آفریں میرسن آپ کی شاعری آئینہ عالم درونی نظر آتی ہے اگر آپ زبان اردو کے شاعر نہ ہوتے تو اردو میں شکسپیر کی شاعری کا اندازہ کہاں دکھائی دیتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کے معاملات خارجی کے بیانات تک شکسپیر نہیں پہنچتے ہیں۔ مگر آپ کے امور ذہنیہ کے بیانات بھی ایسے ہیں کہ قریب قریب شکسپیر کا مزاد سے جاتے ہیں اور تعجب بالائے تعجب یہ ہے کہ آپ شکسپیر کی شاعری پابندی قوافی و ردیف کے ساتھ برتتے ہیں اور یہ وہ سخت پابندی ہے کہ جس نے شکسپیر کو تمام تر آزادی نصیب تھی۔

پری کی غضبناکی حالتوں کو بیان کر کے حضرت مصنف بے نظیر کا اس کی حالت غضبناکی میں سامنے آنیوں ارشاد کرتے ہیں:-

گھنٹنا کی بیٹھی تھی یہ تو ادھر	کراتے میں آیا وہ رشک قمر
اسے دیکھ غصے میں وہ ڈر گیا	کہے تو کہ جیتے ہی جی مر گیا
بلاسی وہ دیکھ اس کے پیچھے لگی	کہا سن تو اے موزی و مدعی
نچے سیر کو میں نے گھوڑا دیا	کہ اس مالزادی کو جوڑا دیا

الگ ہم سے یوں رہنا اور چھوٹنا یہ اوپر ہی اوپر مزے لوٹنا  
 چمکا دیا تھا نہ تو نے۔ یہی بھلا اس کا بدلہ نہ لوں تو یہی  
 پھر جیسے راتوں کو دل شاد تو کرے گا دنوں کو بہت یاد تو  
 مزا چاہ کا دیکھ اپنے ذرا جھکا تو ہوں کیسے کنویں رہ بھلا  
 تجھے جیسے ماروں تو کیا اے غریب دے چاہتے ہیں یہ تیرے نصیب  
 کہ چاہ الم میں پھنساؤں تجھے  
 ہنسا ہے تو جیسا رولاؤں تجھے

اشعار بالا کی فطری خوبیاں حضرات اہل مذاق پر ہویدا ہیں۔ راقم یہاں تک سمع خراشی کرے اس  
 غضبناک اور انتقام طلب تقریر کے بعد پری ایک دیو کو بے نظیر کے کنویں میں بند کرنے کا حکم دیتی ہے۔  
 بے نظیر کے کنویں میں بند ہونے کے مضامین بھی نہایت شاعرانہ خوبیاں رکھتے ہیں اور اس عاجز کی  
 دانست میں ملا جاتی علیہ الرحمہ کے بیان قید چاہے جو ان کی مثنوی یوسف و زلیخا میں پایا جاتا ہے زیادہ سن شاعرانہ رکھتے ہیں۔  
 واضح ہو کہ یہاں تک کا سین بے نظیر سے متعلق ہے۔ اب حضرات ناظرین سین ذیل پر توجہ فرمائیں  
 تو بدر منیر کی درونی کیفیتوں سے تعلق رکھتا ہے حضرت مصنف فرماتے ہیں:

پھنسا اس طرح سے جو وہ بے نظیر پڑی بے قراری میں بدر منیر  
 ہم دو دلوں میں جو ہوتی ہے چاہ تو ہوتی ہے دل کے تئیں دل سے لہ  
 قلوں داں جو گزرا تو یاں غم ہوا رکا جی دہاں یاں خفا دم ہوا  
 کتنی دانا جو آیا نہ وہ رشک ماہ نظر میں ہوا اس کے عالم سیاہ  
 لگی کہنے نجم النساء سے بوا خدا جانے اس شخص کو کیا ہوا

واضح ہو کہ امر فطری ہے کہ جب دو دل میں راہ ہوتی ہے تو ان میں سے اگر ایک بتلائے غم  
 ہو جائے تو دوسرا بھی بتلائے ہو جاتا ہے۔ اس کا ذاتی تجربہ اکثر اشخاص کو حاصل ہوا ہے حضرت مصنف نے  
 یہاں دل را بدل رہیت کے مضمون کو خوش اسلوبی کے ساتھ حوالہ قلم کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ بے نظیر  
 کی مفارقت سے جو غم بدر منیر کو ہوا وہ نجم النساء کو ہونہیں سکتا تھا۔ گو نجم النساء بدر منیر کی ایک بڑی دردمند  
 دوستدار تھی۔ بدر منیر کا تعلق بے نظیر کے ساتھ عشق کی بنیاد پر بالاصل اور نجم النساء کو بالعرض تھا۔  
 اس تعلق کو بدر منیر کے حضرت مصنف نے شعر آخر میں خوب دکھلایا ہے۔ رفیق سے ایسا خطاب کہ خدا  
 جانے اس شخص پر کیا ہوا وہی شخص کرے گا۔ جس کا تعلق قلبی انتہا کو پہنچ گیا ہوگا۔ اندری کلام کی بلاغت۔



اللہ ری کیفیت درونی کی مصوری۔ اللہ ری واقعات بندی۔ اللہ ری فطرت نگاری یہی چیزیں ہیں کہ تائیدِ غیبی کے بغیر نہیں آتی ہیں۔ بعض عنایتِ ایزدی ہے۔ اگر یہ ٹٹے کبھی نہ ہوتی۔ وہی نہ ہوتی تو ہر لائے مدسہ سعدی شکسیر اور میر حسن بن بیٹھا۔ اس خطاب کا جواب جو نجم النساء نے دیا گورو کا معلوم ہوتا ہے بگڑ مصلحت آمیز ہے۔ اس کے جواب سے ہویدا ہوتا ہے کہ وہ مدبرانہ مزاج کی عورت تھی۔ جیسا کہ وزیرِ زادی کا باشعور اور دور اندیش ہونا چاہئے وہ تمام تر ویسی تھی۔ اشعار ذیل نجم النساء کے مشتمل ہیں۔

کہا اس نے بی تم کو سودا ہے کچھ      وہ معشوق ہے اس کو پردا ہے کچھ  
خدا جانے کس خفل میں لگ گیا      مری چڑھ ہے اتنا بھی ہونا فلا  
وہ رہ رہ کے تم کو دلاتا ہے چاہ      عبت آپ کو تم کرو مت تباه  
رکے جو کوئی اس سے رک جائے      جھکے آپ سے اس سے جھک جائے  
تقول بھلا کچھ نکالا کرو      ذرا آپ کو تم سنبھالا کرو

یہ جواب پاکر بدر منیر چپ رہی اس کی خاموشی تمام تر متعقنائے فطرت تھی۔ ایسے جواب کے بعد کوئی مبتلائے غم پھر زبان کھول نہیں سکتا۔ بدر منیر کی خاموشی اس طور پر شعر ذیل میں حوالہ قلم ہوتی ہے:

یہ سن چپ رہی دل میں کھل چڑا پ      دیا پھر نہ اس بات کا کچھ جواب

سبحان اللہ حضرت مصنف انسان کے کوائف درونی سے کس قدر باخبر تھے۔ لاریب میر حسن اردو کے شکسیر ہیں۔ اسی باخبری کی بدولت شکسیر کو الہامی شاعرِ دنیا نے مانا ہے اور بصورتِ اطلاع میر حسن کو بھی دیا ہی مان سکتی ہے۔ انصاف یہی ہے کہ میر حسن شکسیر کی طرح الہامی شاعرانے جانے کے تمام تر مستحق ہیں۔ اگر میر حسن انگلستان ایسے قد شناس ملک میں ہوتے تو بے شک ایسے ہی مانے جاتے۔

القہہ جب کئی دن گزر گئے اور بے نظیر کی کوئی خبر بدر منیر نہ پا سکی تو اس سے اس کی کیا حالت ہو چلی اس کی پوری کیفیت اشعار ذیل سے جوید ہوتی ہے، سبحان اللہ کیا فطرت نگاری ہے۔ شاعری عبارت اسی سے ہے ان اشعار میں امور قلبیہ کا بیان نہیں ہے۔ امور قلبیہ کی مصوری ہے۔ فی الواقع میر حسن کی نیچرل شاعری کو دبی سمجھے جس نے شکسیر کی تحفیل میں برسوں جان بکھی کی ہو۔ نیچرل شاعری کا مذاق کمیل نہیں ہے۔ بڑی مشقوں سے یہ دولت نصیب ہوتی ہے۔

گئے اس پہ جب دن کئی اور بھی      پھر منے لگے پھر تو کچھ طوہ بھی  
دیوان سی ہر طرف پھرنے لگی      دختوں میں جا جا کے گرنے لگی  
ٹھہرنے لگا جان میں اضطراب      لگی دیکھنے دشت آلودہ خواب

تب ہجر گھر دل میں کرنے لگی      دشا شک سے چشم بھرنے لگی  
 خفا زندگان سے ہولے لگی      بہانے سے جا جا کے سونے لگی  
 تب غم کی شدت سے وہ کانپ کانپ      اکیلی رونے لگی منہ ڈھانپ ڈھانپ  
 نہ اگلا سا ہنسنا نہ وہ بولنا      نہ کھانا نہ پینا نہ لب کھولنا  
 جہاں بیٹھنا پھر نہ اٹھنا اسے      محبت میں دن رات گھٹنا اسے  
 کہا اگر کسی نے کہ بی بی چلو      تو اٹھنا اسے کہہ کے ہاں جی چلو  
 جو پوچھا کسی نے کہ کیا حال ہے      تو کہنا یہی ہے جو احوال ہے  
 کسی نے جو کچھ بات کی بات کی      یہ دن کی جو پوچھی کہی رات کی  
 کہا اگر کسی نے کہ کچھ کھائیے      کہا خیر بہتر ہے منگوائیے  
 کسی نے کہا سیر کیجئے ذرا      کہا سیر سے دل ہے میرا بھرا  
 جو پانی پلانا تو پینا اسے      غرض غیر کے ہاتھ جینا اسے  
 نہ کھانے کی سدھا درد نہ پیئے کا ہوش      بھر دل میں اس کے محبت کا جوش  
 چمن پر نہ مائل نہ گل پر نظر      وہی سامنے صورت آنکھوں پہر  
 نہفتہ اسی سے سوال و جواب      سدا رو برد اس کے غم کی کتاب  
 جو آجائے کچھ ذکر شر و سخن      تو پڑھنا یہ دو تین شعر حسن

## غزل

یہ کیا عشق آفتِ اٹھانے لگا      مرے دل کو مجھ سے چھڑانے لگا  
 ملا میرے دلبر کو مجھ سے خدا      نہیں تو مرا جی ٹھکانے لگا  
 گزشتہ خونباز کا کچھ نہیں      مراد دل ہی مجھ کو ڈبانے لگا  
 فلک لے تو اتنا ہنسایا نہ تھا      کہ جس کے عوض یوں رلانے لگا  
 نہیں مجھ کو دشمن سے شکوہ من

مراد دوست مجھ کو ستانے لگا

غزل یار باغی و یا کوئی نسر      اسی ڈھب سے پڑھنا کہ جس میں درد  
 سو بھی جو مذکور نکلے کہیں      نہیں تو کچھ اس کی بھی خواہش نہیں



سب کیا کہ دل سے تعلق ہے سب      دہو دل تو پھر بات بھی ہے غلب  
 گیا ہو جب اپنا ہی جوڑا نکل      کہاں کی رباعی کہاں کی غزل  
 حضرات ناظرین ملاحظہ فرمائیں کہ ایک مہجور غم دیدہ آفت رسیدہ ربیع کشیدہ مضطرب مبتلائے  
 ملال بیقرار بے آرام سوختہ جان باختہ کی اس سے بہتر کیا تصویر کھینچ سکتی ہے۔ حق یہ ہے کہ اہل انصاف  
 جس قدر داد سخن دیں بجا ہے اور اہل ہند جس قدر اس ثنوی کو سراہیں ناز بکھیں سزاوار ہے

## داستان بدر منیر کے غم و اندوہ کی اور عیش بانی کے بلانے میں

بدر منیر کی حالت ہجر بے نظیر سے جو ہمہ ہی بھتی اس کی کیفیت بالائیں لکھی جا چکی ہے لیکن ایک دن  
 کی سرگزشت یہ ہے کہ بدر منیر خواب روز سے جوا بھی تو اس کا جی چاہا کہ سیر حن کیجئے کہ شاید اس سے کچھ تفریح  
 کی صورت پیدا ہو کر کثرت اندوہ ملال میں کبھی انسان کے دل سیر و تفریح کی طرف میلان ہوتا ہے۔ یہ امر  
 خلاف فطرت نہیں ہے۔ اس خواہش سے وہ محل سے برآمد ہو کر حن میں ایک زمر دی موڑھے پر جا بیٹھی حضرت  
 مصنف اس کے انداز نشست اس کی خاموشی کیفیت اس کی حقہ نوشی اس کی خواہشوں کی حاضری ادھن کے  
 سماں کو جس قادر الکلامی کے ساتھ زیب رقم کرتے ہیں۔ اس کی داد راقم کی احاطہ قدرت سے باہر ہے۔ امور  
 خارجہ کا بیان اس ستھرے پن کے ساتھ شکسیر کے کسی پلے میں نظر نہیں آتا ہے۔ صرت سردالتراسکاٹے  
 "یڈی آن دی لیک" میں تو البتہ مرقع نگاری دکھی جاتی ہے بہر کیف اس بیان کے بعد حضرت مصنف  
 لکھتے ہیں کہ سیر حن میں بدر منیر کو نغمہ کا خیال آیا۔ یہ امر خلاف فطرت نہیں ہے سیر حن میں نغمہ کی طرف میلان  
 مقتضائے طبیعت ہے۔ ایسا میلان الم کش کو بھی ہوتا ہے۔ گو نغمہ سے اس کے اندوہ ملال میں کمی نہیں ہوتی  
 آپ فرماتے ہیں :-

کہ اتنے میں کچھ جی میں جو آگیا      ادا سے لگی کہنے وہ دلبر با  
 اسے ہے کوئی ہاں ذرا حبا تو      مری عیش بانی کو لے آتو  
 عجب وقت ہے اور عجب ہے سماں      کرے دو گھڑی آ کے مجسرا یہاں  
 خفا ہو مرا جی بھی مشغول ہو      کوئی دم تو داغ جگر پھول ہو  
 کسی طرح سے دل تو لگتا نہیں      جھے ہے جگر دل سٹلگتا نہیں

یہ حکم پاتے ہی ایک خادمہ عیش بانی کو بلالائی۔ وہ عیش بانی بھی شاہی بھرائی تھی۔ اس کے حسن و جمال لباس  
 زیور آرائش ساز و سامان آداب و لحاظ کا کیا کہنا تھا۔ جب بدر منیر کے حضور میں حاضر آئی۔ وقت کے

مطابق گوری کا حکم ہوا۔ اس نے گانا شروع کیا۔ حضرت مصنف اس صحبتِ رقص کے سماں کی تصویریں کھینچتے ہیں:-

ہوا حکم گوری کا جو بر ملا	لیے ساز اپنے سبوں نے اٹھا
دیا آسماں پر جو طبلوں کو کچھ	ہر اک تھاپ میں دل یا سب کا انچ
نگی گانے پُہ وہ اس آن سے	نکلنے لگی حبان ہر تان سے
عجب تان پڑتی تھی انداز سے	کہ بے کل تھی ہر تان آواز سے
وہ تھی گسکری یا لڑی نور کی	مسل سخی اک بچھڑی نور کی
گل دغنیہ کی طرح محبوب تھی	کھلی اور موندی دل کو مرغوب تھی
غرض کب کہوں اس کا میں ماجرا	عجب طرح کی بندھ گئی تھی ہوا
وہ گانے کا عالم وہ حسن بیان	وہ گلشن کی خوبی وہ دن کا سماں
گھڑی چار دن باقی اس وقت تھا	سہانہ ہر اک طرف سایہ ڈھلا
درختوں کی کچھ چھاؤں اور کچھ دھوپ	وہ دھانوں کی ہنری وہ میروں کا ڈپ
پیسے ہوئے پوستوں پر ہر سام	رو پہلے سنبھری دق صبح و شام
وہ لالے کا عالم ہزارے کا رنگ	وہ آنکھوں کے ڈورے نشہ کا ترنگ
گلابی سا ہوجانا دیوار و در	درختوں سے آنا شفق کا نظر
وہ چادر کا چھٹنا وہ پانی کا زور	ہر اک جانور کا درختوں پہ شور
وہ سرو سہی اور آبِ رداں	وہ مستی سے پانی کا بہنا وہاں
وہ اڑتی سی نوبت کی دھیمی صدا	کہیں دور سے گوش پڑتی تھی آ
وہ رقص بتاں اور ستھرا الاپ	وہ گوری کی تانیں وہ طبلوں کی تھاپ
وہ دل پسینا ہاتھ پر دھر کے ہاتھ	چھلنا وہ دامن کا ٹھوکر کے ساتھ
نہ انسان ہی کا ہوا دل اس میں بند	ہوئے محوسن کر چہرہ دہند
غرض جو کھرے تھے کھرے رہ گئے	اڑے جس جگہ کو اڑے رہ گئے
جو پیچھے تھے آگے نہ وہ ہیں سکے	جو بیٹھے سو بیٹھے نہ پھر ہیں سکے
نگی دیکھنے آنکھ نہر گس اٹھا	گلوں نے دیئے کان اور دھڑکا
لگے ہلنے آوجہ میں سب درخت	کھرے رہ گئے مہر و ہو کر درخت



درختوں سے گرنے لگے جانور بنے مثل آئینہ دیوار و در  
عجب راگ کو بھی دیا ہے اثر کہ ہو جائے پتھر کا پانی جگر  
بندھا اس طرح کا جو اس جاساں ہو اسب کے دل کا عجب حال داں

حضرت مصنف کی اطلاع عام بہت قابل لحاظ ہے جتنی باتیں قص و نغمہ سے متعلق ہیں۔ پوری واقفیت کے ساتھ حوالہ قلم ہوتی ہیں۔ تاثیر نغمہ کے بیانات عجب پرتاثری کے ساتھ رقم ہوتے ہیں۔ بہت کچھ تو ان میں واقعات ہی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بقیہ استعارات قریب کے ساتھ اور فطری رنگ پر بندش پاتے ہیں کہ دل کو ان کی جانب عجب طرح کی رغبت ہوتی ہے۔ علاوہ اس کے مجمع خوبان صحبت قص تازگی چمن کیفیت وقت ان سب کا سماں ایسی خوبی کے ساتھ دکھلایا گیا ہے کہ میر حسین کے سخن البیان ہونے میں ہر کہ شکر آرد کا فرگرد کا مضمون صادق آتا ہے۔ تناسب کلام کی یہ خوبی ہے کہ اس سے زیادہ تناسب کی صورت پیدا نہیں ہو سکتی۔ جن صاحب لے اس شعر پر

درختوں کی کچھ چھاؤں اور کچھ دھوپ

وہ دھانوں کی سبزی نہ سرسوں کا ٹوپ

یہ اعتراض واضح فرمایا ہے کہ دھانوں اور سرسوں کا ایک وقت نہیں ہوتا، ان کا یہ اعتراض یا فن باغبانی یا فن زراعت کے اصول پر وارد کیا جاسکتا ہے۔ ان دو پہلوؤں کے سوا اور کوئی پہلو سے اس شعر پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا ہے۔ اگر زبان کی بدترکیبی پر کو اعتراض وارد کیا جائے تو راقم کو اس میں مہال گفتگو نہیں ہے کس واسطے کہ یہ ناچیز زبان داں ہے ذہل زبان سے ہے۔ بہر کیف اگر فن باغبانی کی رو سے یہ اعتراض وارد کیا گیا ہے اور قرینہ بھی ایسا ہی ہے کہ فن باغبانی کی رو سے یہ اعتراض وارد کیا گیا ہوگا کس واسطے کہ یہ دھان اور سرسوں بدترکیبی کے بانگ کے اندر واقع تھے۔ جہاں گنا سن رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ مترگشتی کے لیے زراعتی کھیتوں میں تو وہ نہیں گئی تھی۔ پس اس کا جواب باغبانی کے فن کی رو سے یہ ہے کہ امرا کے باغوں میں مجرّد سبزی کے خیال سے دھان اور جو بوئے جاتے ہیں ان سے پیداوار کی غرض متعلق نہیں ہوتی جس فصل میں جو کوئی چاہے سبزی کی غرض سے دھان یا جو بوکر دیکھ لے پس جب ہر وقت میں دھان یا جو کا سبز تختہ تیار کیا جاسکتا ہے تو پھولی ہوئی سرسوں کے ساتھ دھان کے تختہ کا موجود رہنا خلاف امکان کیا ہے۔ سرسوں بونے کے وقت جب دھان بویا جائے گا تو سرسوں کے پھولنے کے وقت دھان کا تختہ ہر دکھائی دے گا۔ البتہ ایسے غیر فصل کے بوئے ہوئے دھان سے جو عموماً پیداوار کی امید نہیں کی جاسکتی ہے مگر جس غرض سے وہ بویا جائیگا اس میں

نہ کامیاب لائق نہیں ہوگی۔ مشکل ثانی اکثر اعراض بالازراعت کے اصول پر وارد کیا گیا ہے تو بھی میر حسن کے کلام میں عدم تناسب کا نقصان پایا نہیں جاتا ہے۔ کس واسطے کہ جن ملکوں میں دو فصلیں یا تین فصلیں دھان کی ہوا کرتی ہیں، وہاں دھان کی بھری مسروں کے پھولنے میں پانی جاتی ہے۔ علاوہ اس کے ایک قسم دھان کی ہوتی ہے جسے بورو کہتے ہیں۔ یہ قسم مسروں کے پھولنے کے وقت نہایت بھری ہوتی ہے۔ یہ قسم دھان کے محاصل کے اعتبار سے فصل گرما میں تیار ہوتی ہے۔ اس وقت کے بہت پہلے مسروں تیار ہو کر کٹ جاتی ہے۔ حضرت معترض کے ایسے اعتراض وارد کرنے کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اکثر دیسوں میں جب مسروں پھولتی ہے تو دھان میں بھری نہیں باقی رہتی ہے۔ لیکن اگر حضرت معترض کو پورے طور سے زراعتی معاملات سے اطلاع ہوتی تو ایسے اعتراض کے وارد کرنے پر جرأت نہیں فرماتے۔ ایسے دیسوں میں بھی کبھی مسروں کے پھولنے کے وقت دھانوں کے بعض کھیتوں میں کافی طور پر بھری باقی رہتی ہے۔ اس کی یہ صورت ہوتی ہے کہ جب دھان پچھتا اور مسروں اگات ہوتی ہے کہ تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ جاننا چاہئے کہ مسروں کے بونے کے دو زمانے ہیں ایک ہتھیا پھتر کے بعد اور دوم عین سرما میں پہلی قسم جب سویرے ہوتی جاتی ہے تو اس کے پھولنے کے وقت دیر کے ہوئے دھانوں کا بھری ہونا خلاف توقع نہیں ہے۔ المختصر میر حسن کا شعر نیمچہ لٹا عری کے خلاف نہیں ہے۔ عام اس سے کہ باغبانی یا زراعتی نگاہ سے دیکھا جائے۔

الفہم ہر چند گانا بڑی خوبی کے ساتھ ہو، مگر بد منیر کو تفریح طبع کی صورت پیدا نہیں ہوتی۔ چوٹ کھایا ہوا دل کہیں گانے بجانے سے بہتا ہے۔ سماں و قیص سے تو غم دالم کی افزائش ہوتی ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا جیسا کہ اشعار ذیل سے ظاہر ہوتا ہے:-

لگا تھار بس عشق کا اس کو تیر	لگی کھینچنے آہ بدر منیر
بندھا اس کو عاشق کا اپنے خیال	لگی رونے آنکھوں پہ دھر کر رومال
کہیں کا کہیں لے اڑا اس کو راگ	ہوا سے ہوتی اور گلزار آگ
لگی کہنے ہے یہ دیکھوں میں میر	نہو پاس میرے وہ یادش بخیر
دہی جلنے ہو جس کے کچھ دل کو لاگ	کہ معشوق بن سب ہے گلزار آگ
بھلا کیوں کہ جی اس کا خوش حال ہو	کہ ہجران کا غم جس کے دنبال ہو
جگر میں اگر آہ کی سول ہو	لگے خار کیسا ہی گو پھول ہو
درختوں کے عالم سے کیا ہو نہال	جسے یاد شمشاد کی ہو کمال



گرے گلشن و گل پہ کیا وہ نظر جسے اپنے گل کی نہ ہو وے خبر  
 یہ کہہ کر اٹھی واں سے وہ دلریا چھپر کھٹ میں جا کر گری منہ چھپا  
 خوشی کا جو عالم تھا ماتم ہوا ورق کا ورق ہی وہ برہم ہوا  
 سب اٹھتے ہی بس اس کے جاتی ہیں طوائف کہیں اور خواص کہیں  
 یہ سچی تصویر اس شخص کی ہے جو حالتِ غم میں جلسہ رقص و سرود کا شریک ہوتا ہے نغمہ دے  
 ان کے لیے سرتِ خیز ہے جن کے دل بند غم سے آزاد ہیں۔ نالیوں کے واسطے جو قیدی رنج و محن میں ممولفہ  
 نغمہ دے کا ذکر مست چھڑو بحر میں ناگوار ہیں دونوں  
 حضرت سودا نے خوب فرمایا ہے۔

جن کو وصل گلِ خاں ہے ان کو بھاتی ہے بہا ہم سے محوروں کو لیکن کب خوش آتی ہے بہار  
 دید گل کیا کیجے بڑھتی ہے دونی بیکلی خارِ حیراں اور بھی دل میں چھپاتی ہے بہار  
 آخر میں حضرت مصنف بن شعر اخلاقی رنگ کے یوں حوالہ قلم فرماتے ہیں۔  
 مری عقل اس جا پہ حیران ہے کہ یارب یہ کیسا گلستان ہے  
 ہر ایک وقت ہے اس کا عالم جدا جو چاہو یہ پھر ہو تو امکان کیا  
 کبھی ہے خزاں اور کبھی ہے بہار نہیں اک و تیرے پہ لیل و بہار  
 داستانِ بے نظیر کے غم بھر سے بدر منیر کی بے قراری میں

حضرت مصنف نے اس داستان میں بدر منیر کی غم زدگی کا فوٹو اس طرح پرکھنچا ہے  
 زبان پر تو باتیں ولے دل اداس پر اگندہ حیرت سے ہوش و حواس  
 نہ منہ کی خبر اور نہ تن کی خبر نہ سر کی خبر نہ بدن کی خبر  
 اگر سر کھلا ہے تو کچھ غم نہیں جو کرتی ہے میلی تو محرم نہیں  
 جو مستی ہے دودن کی تو ہے وہی جو کنگھی نہیں کی تو یوں ہی ہسی  
 جو سینہ کھلا ہے تو دل چاک ہے غم آلودہ صبح طرب ناک ہے  
 نہ منظورِ سرمد نہ کاجل سے کام نظریں وہی تیرہ نجی کی شام  
 اس کے بعد حضرت مصنف فرماتے ہیں کہ حسین بے آرائش بھی بھلے لگتے ہیں۔ بلکہ بے آرائش ان کا  
 حسنِ دو بالا ہو جاتا ہے۔ یہ قول نہایت راست ہے۔ اس میں بالو خوش برابر بھی دخل نہیں ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔  
 ولکن یہ خوبوں کا دیکھنا سبھاؤ کہ بگڑے سے دونا ہوا ان کا بستاؤ  
 نہیں حسن کی اس طرح بھی کمی جو بگڑی ہے بیٹھی تو گویا بنی

غرض بے ادائی ہے یاں کی ادا  
جوتا تھے پہ چین جسیں غم سے ہے  
دہ آنکھیں جو روئی ہیں بس پھوٹ پھوٹ  
تپ غم سے یوں تنائے ہیں گال  
گر یاں سینہ پہ ہے جو کھلا  
نقاہت سے چہرہ اگر زرد ہے  
ادا سے نہیں یہ بھی عالم جدا  
حضرت مصنف کی شاعری کا یہ بڑا کمال ہے کہ اکثر متغے مسائل بیان کر جاتے ہیں۔ واقعی حسن  
محتاج آرائش نہیں ہے۔ جیسا کہ حضرت سودا فرماتے ہیں :-

نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا نے دی  
کہ جیسے خوشنما لگتا ہے دیکھو چاند بن گئے

## داستان بقراری بدرنیر کی بے نظیر کے فراق میں اور نغم النساء کے تسلی دینے میں

بدرنیر جس بے نظیر میں یوں تو برابر بے قرار تھی مگر جب پورا ہسینہ گزر گیا اور بے نظیر نہ آیا تب  
اس کا تعلق بڑھنے لگا۔ عشق نے انداز جنون کا پیدا کیا۔ بقول حضرت مصنف :-

محبت کا سودا سا ہونے لگا  
سہرکنے لگا پاس ناموس و ننگ  
جنون نغم و حشت کا ہونے لگا  
نگی عقل اور عشق میں ہونے جنگ  
غموشی اٹھانے لگی دل میں شور  
جٹانے لگی ناتوانی بھی زور

واضح ہو کہ عشق ایک دوا اس مرض ہے اگر اس کا علاج وقت پر نہیں کیا جائے تو جنون کی طرف  
منتقل ہو جاتا ہے۔ عشق کا بہترین علاج وصل معشوق ہے مگر یہ علاج دشوار صورت ہے۔ ظاہر ہے کہ بحالت  
موجودہ اس طور پر بدرنیر کے علاج کی کوئی شکل نہ تھی۔ اگر اس کے عشق سے آثار جنون نمایاں ہونے لگے  
تو امر تہماتر قسین فطرت تھا۔ واقعی حضرت مصنف بہت بڑی اطلاع عام رکھتے تھے۔ زہنہارا ایسی شاعری  
ایک لایعلم شاعر سے انجام نہیں پاسکتا ہے۔ القصہ جب بدرنیر کی یہ حالت پہنچی نغم النساء نے اس  
کے جوش عشق کو مصلحت آمیز باتوں سے کم کر دینا چاہا مگر جیسا کہ اشعار ذیل سے ظاہر ہوگا۔

یہ احوال دیکھ اس کا دخت وزیر  
تو وہ ہے کہ سب کے تئیں بے وقوف  
نگی جلکے کہنے کہ بدرنیر  
کہ ہر دل گیا تیرا اے یوقوف



مسافر سے کرتا ہے کوئی بھی ہیت  
 مثل ہے کہ جوگی ہوئے کس کے میت  
 اسے چار دن کے ہیں یہ آشنا  
 ملا دل کو آخر کریں ہیں جدا  
 گئے آسمان گہ زمین کے ہیں یہ  
 جہاں بیٹھے جابس وہیں کے ہیں یہ  
 تو بھول ہے کس بات پر اسے یوا  
 خبر لے دیوانی تجھے کیا ہوا  
 سونو جانی اپنے پہ کوئی مرے  
 تو دل پہلے اپنا بھی صدقہ کرے  
 اگر آپ پر کوئی شیدا نہ ہو  
 تو پھر چاہئے اس کی پردا نہ ہو  
 وہ خوش ہوگا اپنی پری کو لیے  
 عبث اس پہ بھی ہو تم جی دیئے  
 تمہاری اسے چاہ ہوتی اگر  
 تو اب تک وہ تم کو نہ آتا نظر

نجم النصار کی تقریر بڑے طبی اصول پر مبنی معلوم ہوتی ہے عشق کے علاج کا ایک یہ بھی طریقہ  
 ہے کہ معشوق کے حالات نفرت افزا اور خصال زشت کو عاشق کے آگے بیان کرتے ہیں۔ منکر یہ طریقہ افراط  
 عشق کی حالت میں سود مند نہیں ہوتا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جیسا کہ اشعار ذیل سے ہوتا ہے:

نگی کہنے تب اس کو بد مزیسر  
 کہ سنتی ہے اے میری دخت وزیر  
 کسی کی بدی تو نہ کر عیب ہے  
 کہ اس کا خدا عالم الغیب ہے  
 وہ اپنے دلوں سے تو ہے نیک ذات  
 ہوئی اس پہ کیا جانے کیا واردات  
 ہوا قید آنے پایا نہ ہو  
 گئے اتنے دن اب تک آیا نہ ہو  
 مجھے رات دن اس کا رہتا ہے ڈر  
 پری نے سنی ہو نہ یاں کی خبر  
 نہ باندھا ہو اس کو کسی صید میں  
 کیا نہ ہو اس کے تیں قید میں  
 پری نے کہیں طیش کھالان میں  
 دیا ہو نہ پھینک اس کو کہ قاتان میں  
 ہستان سے بھی نکالا نہ ہو  
 کسی دیو کے منہ میں ڈالا نہ ہو  
 نہ لٹنے کی دکھ اس کے سب میں ہے  
 بھلا اپنے جی سے وہ جیتا ہے  
 یہ کہہ حال دل اپنا روئے لگی  
 گھر آنسوؤں کے پردے لگی  
 گمتی منڈ کرمی مار آخر کو لیٹ  
 چھپر کھٹ کے کونے میں سر منڈ لپیٹ

اشعار بالا کس قدر فطری رنگ رکھتے ہیں۔ اول تو معشوق کی برائی کا یقین ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔  
 معشوق ہمیشہ خوش خصال ہی نظر آتا ہے، جیسا کہ قول ارسطو ہے۔ العشق می حبس العاشق و یقہ عن  
 ادراک عیوب معشوقہ۔ ایسی صورت میں بد مزیر بے نظیر کی برائی کو کیوں کر مان سکتی تھی پس ضرور ہوا کہ

نجم النساء کو بدگوئی سے روکے اور نجم النساء کی تردید میں بے نظیر کو خوبی کے ساتھ یاد کرے پھر بے نظیر کی نسبت تعلق کے ساتھ اس کی غیر حاضری کے احتمالات کو کہہ جائے۔ سبحان اللہ کیا شاعری ہے اس کے بعد بے نزن کی عاشقی کا اظہار خوب قلم حوالہ ہوا ہے۔ آخر میں بکیں کا رو دینا کیا بچل رنگ رکھتا ہے۔ اور رونے کے بعد منڈکری مار کر اور جھپکھٹ کے کونے میں سر منہ پیٹ کر سو جانا کیا ہی واقعہ نگاری ہے۔

**خواب یکھنا بدر منیر کا بے نظیر کو کوئیں میں اور جو گن بن کر نکلتا نجم النساء کا اس کی تلاش میں**

واضح ہو کہ ترکیبہ روح میں ریاضت کو بڑا دخل ہے۔ تن پوری حجابہ حیرہ جاں ہوتی ہے۔ فقرا نفس کشی سے روح کی صفائی پیدا کرتے ہیں فقیر کا تو بڑا درد ہے اس کی مشقتیں اگر تصفیہ قلب و روح کی شکل پیدا کریں تو عجب کیا ہے ہم اصل دنیا بھی تکلیف دلی اٹھا کر کچھ نہ کچھ صاف دل ہو جاتے ہیں۔ اس عاجز کا ذاتی تجربہ ہے کہ دلی مصائب کے زمانہ کے خواب نہایت حیرت انگیز ہوتے ہیں۔ صاف ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آلام قلبی کے اثر سے کچھ نہ کچھ دل کی اصلاح ہو جاتی ہے جس کے باعث روح میں بھی حسب استعداد قلبی کم و بیش طور پر صفائی آ جاتی ہے پس قلبی تکلیفیں اٹھا کر ایسا خواب جیسا کہ اس داستان میں حضرت مصنف نے حوالہ قلم کیا ہے۔ اگر بدر منیر نے دیکھا تو خلافت فطرت مقصود نہیں ہے۔ بلکہ ظلم ذہنیات کے رو سے اس کا ایسے خواب کا دیکھنا نہایت قرین قیاس ہے۔ کس واسطے کہ مضمون خواب قریب قریب وہی دکھائی دیتا ہے جو عالم بیداری میں اس کے ذہن میں موجود تھا۔ اور جسے بتلائے خواب ہونے کے قبل وہ نجم النساء سے اعادہ کر چکی تھی۔ بہر کیف یہ خواب خالی از حیرت نہ تھا۔ حیرت انگیز خواب بہت لوگوں نے دیکھے ہیں منجملہ ان کے ایک یہ خواب ہے جس کو ڈاکٹر ابرار کرامنی نے اپنی کتاب فلسفہ میں خواب کی بحث میں درج کتاب کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ لندن میں ایک شخص نے اپنے دوست کی نسبت جو پارلیمنٹ کا ممبر تھا یہ خواب تھا کہ وہ فلاں کا کوٹ پہنے ہوئے ہوں آن کا منس میں اسپیج دے رہا ہے۔ اسی حالت میں ایک شخص آیا اور اس نے اس ممبر پر چھری چلائی مگر اس چھری کی نوک اس ممبر کے کوٹ کے ایک ٹین پر جا لگی جس کے باعث وہ ممبر زخمی ہونے سے بچ گیا۔ جب خواب دیکھنے والا بیدار ہوا تو فوراً اس ممبر کے پاس چلا گیا۔ اور ملما معاملہ خواب کا کہہ سنایا۔ اور تقاضائے دوستی سے التجا کی کہ اے دوست زینہار ہوں آن کا منس میں نہ جانا۔ مجھے تمہاری جان کا خطرہ نظر آتا ہے مگر تمہاری دوست نے کچھ توجہ نہ کی۔ اور جواب میں یہ کہا کہ یہ سب خواب و خیال کی باتیں ہیں۔ بروز حاضری جب وہ ممبر ہوں آن کا منس میں گیا اور جس وقت



وہ اسچ دے رہا تھا ایک شخص آیا۔ اور اس نے اس پر چھری ماری، چھری کی نوک کوٹ کے پٹن پر پڑ کے ٹوٹ گئی۔ اور وہ قتل ہونے سے بچ گیا۔ اتفاق وقت سے وہ ممبر اس وقت اسی رنگ کا کوٹ بھی پہنے ہوئے تھا۔ جیسا کہ اس کے دوست نے خواب میں دیکھا..... یہ ممکن تھا کہ کیفیت خواب سن کر وہ ممبر کوئی اور رنگ کا کوٹ پہن کر حاضر پارلیمنٹ ہوتا۔ مگر اس نے اپنے دوست کے خواب کو محض خیالی امر سمجھا تھا کوٹ کے پہننے کے وقت اس ممبر کو کوٹ کے رنگ کا مضمون کچھ یاد نہ رہا۔ ایسے خوابوں کی توجہ ابھی تک کسی ملک کے علمائے ظاہری سے نہیں ہو سکتی ہے۔ لاریب یہ ایسے خواب ہیں کہ مجرد ہمارے ادہام اور خیالات کے نتائج نہیں ہیں۔ کوئی شک نہیں کہ ان کو ہمارے معاملات سے تعلق ہے جس کو ہم اہل ظاہر کچھ نہیں جانتے۔ حضرات انبیاء کے بعض خواب کتب سادہ میں مندرج پائے جاتے ہیں۔ ان کی صحت سے بے دین کے سوا کون انکار کر سکتا ہے۔ خوابوں میں وہ خواب بھی بہت قابل لحاظ ہے کہ جس کی تعبیر حضرت یوسف علیہ السلام نے زندان مصر میں فرمائی تھی عوام بھی کبھی کبھی حیرت انگیز خواب تکلیفات قلبی کی حالت میں دیکھتے ہیں۔ یہ شخص بھی حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ محبوس زنداں تھا۔ عجب نہیں کہ مصائب قلبی اٹھاتے اٹھاتے اس کی روح میں کچھ تزکیہ کی کیفیت پیدا ہو گئی ہو جس کے باعث اس نے یہ عجیب خواب دیکھا۔ انبیاء علیہ السلام کے خواب روئے صادق ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کی روح پر فتوح مصفا و مزکا ہوتی ہے لیکن کسی قسم کے تزکیہ کے باعث عوام بھی بعض اوقات ایسے خواب دیکھتے ہیں کہ حیرت سے خالی نہیں ہوتے۔ بیشتر عوام الناس کے خواب ان کے خیالات کے نتائج ہوتے ہیں۔ مثل مشہور ہے کہ مرغ کے خواب میں دانہ ایسے خواب احلام کا حکم رکھتے ہیں۔ اور مطلق قابل توجہ تصور نہیں ہیں۔ اب حضرات ناظرین میر حسن کے اشعار پر جو بدر منیر کے مضامین خواب پر مشتمل ہیں۔ توجہ فرمائیں:-

نفسانے دکھایا عجب اس کو خواب	کہ دشمن نہ دیکھے یہ حال خراب
جو دیکھی تو صحرا ہے اک لٹ و دق	کہ رستم جسے دیکھ ہو جائے فق
نہ انسان ہے واں نہ حیوان ہے	نقطہ اک کف دست میدان ہے
مگر بچ میں اس کے ہے اک کنواں	کہ اٹھتا ہے آہوں کا واں نے بھواں
کنویں کا ہے منہ بند اور اس سے اڑی	کئی لاکھ من کی ہے اک سل پڑی
ہدا واں سے ہے یہ کہ بدر منیر	ترے چاہ غم میں ہوا ہوں اسیر
میں بھولا نہیں تجھ کو اسے مری جان	کہوں کیا کہ ہے قید مجھ پر گراں

پراس قید میں بھی ترا دھیان ہے      نقطہ تیرے لئے کا اداں ہے  
 تو اپنی جو صورت دکھائے مجھے      تو اس قید غم سے چھڑا دے مجھے  
 نہیں مجھ کو مرنے سے کچھ اپنے ڈر      یہ غم ہے کہ تجھ کو نہ ہو دے خبر  
 تجھے کاش میں اس وقت دیکھ لوں      جیوں میں اگر تیرے آگے مردوں  
 لیکن یہ ہے خام میرا خیال      نہیں وصل ممکن بغیر از وصال  
 کوئی دم کا مہماں ہوں آج کل      اسی چاہ میں جائے گا دم نکل

ان اشعار کے مضامین کی خستگی پرستگی سوز و گداز محتاج بیان نہیں ہے۔ کلام کی خوبی ایسی ہے کہ ہر چند بے نظیر ایک غرضی شخص ہے مگر اس کی بیچارگی بے کسی رنج کشی مصیبت زدگی یا اسی پیش نظر ہو کر دل کو سخت چوٹ پہنچاتی ہے۔ علاوہ اس کے عشق میں استقلال بے غرضی محبت کی ثابت قدمی معشوق کی ایذا یا بی کا خیال بے نظیر کی بڑی وقعت آنکھوں میں پیدا کرتی ہے۔ سبحان اللہ کیا انداز بیان ہے۔ خلاق سخن اسے کہتے ہیں۔ یہی چیزیں ہیں کہ سیکھنے سے نہیں آتیں۔

ایں سعادت بروز باز و نیست      تازہ بخشد خدائے بخشنده

انقصہ بے نظیر کو خواب میں اس طرح کلام کرتے دیکھ کر بدرنیر نے چاہا کہ کچھ بات کرے مگر اتنے میں اس کی آنکھ کھل گئی۔ یہ بیان بھی فطری ہے اکثر حالات خواب میں ایسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ حضرت مصنف نے انداز بیان رکھا ہے۔ آنکھ کھلنے پر جو حالت بدرنیر کی ہوتی ہے یہ کیفیت بھی بہت خوش سلوبی کے ساتھ حوالہ قلم ہوتی ہے۔ پہلے تو بدرنیر نے اپنی حالت غم کو چھپایا۔ مگر جب راز غم پنہاں نہ رکھ سکی تو ہمزاد خواصوں سے معاملہ خواب کا بیان کیا۔ جب نجم النساء حقیقت حال سے مطلع ہوئی تو اس کو بڑی بے قراری لاحق ہوئی۔ اس جگہ کا سین زبان مصنف سے ذیل میں عرض کیا جاتا ہے۔

لگی کہنے وہ یوں نہ آنسو بہا      تیرے واسطے میں نے اب دکھ سہا  
 بس اب سر پہ مچرائکتی ہوں میں      اسے ڈھونڈھ لانے کو چلتی ہوں میں  
 جو باقی رہا کچھ مرے دم میں دم      تو پھر آ کے یہ دیکھتی ہوں قدم  
 و گر مر گئی تو بلا سے موی      تو یوں جانو مجھ پر صدقہ ہوئی  
 کہا شاہزادی نے سُن اے رفیق      ہوئی میں اس چاہ غم میں غرق  
 بھلی چنگی اپنی نہ کھو جان تو      کہ وہ ہے پری اور انسان تو  
 رسائی تری ہوگی کیوں کر وہاں      مجھے بھی نہ دے ہاتھ سے مری جاں



میں جیتی ہوں اس آسیرے پر فقط      کہ ہوتا ہے تجھ سے مرا غم فلت  
 وگرنہ میں رک رک کے مرجاؤں گی      اسی طرح جی سے گذر جاؤں گی  
 کہا اس نے کیا کیجئے پھر ہبلا      پڑی اب تو اپنے ہی سر بلا  
 میں اس عشق کا یہ سبھی تھی ڈول      ترے غم سے آنے لگا مجھ کو ہول  
 تجھے دیکھنا یوں گوارا نہیں      اس اندوہ کا مجھ کو یارا نہیں  
 یہ کہہ اس نے رو رو اتارا سنگار      کیا اپنے پشتواز کو تار تار  
 گریباں کو مثل گل چاکٹ کر      دیا خاک پر پھینک ایدھر اُدھر  
 پھر آئے جو کچھ اس کو پوش و حواس      سجا تن پہ جوگن کا اس نے لباس

اس کے بعد اس کے جوگن بننے کا فولو حضرت مصنف نے بڑی خوبصورتی اور بڑی دانست کے ساتھ کھینچا ہے جوگ کے بھیس میں تلاش معشوق میں نکلنے کا مضمون ملک ہندوستان سے خصوصیت رکھتا ہے۔ بہت سے ہندی گیت دیکھے جاتے ہیں جن میں جوگی اور جوگن کے مضمون بڑی لطافت کے ساتھ بندش پاتے گئے ہیں۔ اس بھیس کے اختیار کرنے کا ظاہر اسباب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں جوگ ایک مردوج امر ہے۔ بہت سے زن و مرد خیالات کی پابندی سے یہ شیوہ اختیار کرتے ہیں پس اگر کوئی شخص جوگ کا پیرا یہ کسی خاص ضرورت سے بھی اختیار کرتا ہے تو اس پر نفیس کی آنکھ نہیں پڑتی ہے۔ اور صورت سے اس کی حقیقت حال سے پوشیدہ رہ جاتی ہے۔ انگریزی شاعری میں جوگ کا مضمون قریب قریب نادر معلوم ہوتا ہے فقیر کو صرف دو تین ایسی انگریزی نظم سے اطلاع ہے جس میں فقیرانہ بھیس کا مضمون بندش پایا ہے۔ ان میں سے بہت پرورد اور دل آویز وہ فساد ہے جسے گولڈ اسمتھ نے منظوم کیا ہے اور جو گولڈ اسمٹس برٹ کے نام سے معروف ہے۔ لفظ برٹ انگریزی ہے اس کے معنی تارک الدنیا اور فقیر ہے مگر یہ لفظ پورے طور پر جوگی کا مترادف نظر نہیں آتا ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ یہ قصہ اس کتاب کا جلد رابع میں درج پائے گا۔ واضح ہو کہ نظم النساء کا جوگن بن کر بے نظیر کی تلاش میں نکلنا اس کی بڑی پختہ مزاجی و درمندی اور دل سوزی سے خبر دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ عورت وخت و زیر تھی اور بلا گفتگو عیش و آرام میں پالی گئی تھی مگر دوست پر بُرا وقت جو آپڑا تو ساری ذاتی راحتوں کو چھوڑ کر بے دھڑک مصیبت کشی اور جان بازی کے لیے تیار ہو گئی۔ اسی کو وفاداری کہتے ہیں۔ البتہ بُرے وقت میں کام آنا دستداری ہے۔ ورنہ بھلے وقت میں دوست کھلانے کے لیے دنیا موجود رہتی ہے۔

دوست مشمار آنکہ در نعمت زند لاف یاری و برادر خواندگی  
 دوست آن باشد کہ گیرد دست دوست در پریشاں حالی و در ماندگی  
 یہ قصہ بڑا اخلاقی آموز پیرایہ رکھتا ہے۔ واقعہ نم النساء کی یہ کارروائی اس کی بڑی شرافت نفس سے  
 خبر دیتی ہے۔ اگر ذاتی غرض سے یہ عورت جوگن کا بھیس اختیار کرتی تو اس کی یہ کارروائی معمولی طور  
 کی ہوتی ہے کس واسطے جوش عشق میں کسی کارروائی اکثر زن و مرد کی نسبت بیان کی گئی ہے مگر دوست  
 کی ہمدردی کے تقاضے ایسی دشوار کارروائی کو اختیار کرنا ایک وقعت خاص رکھتا ہے۔ جب  
 نم النساء جوگن کا بھیس لے چکی اور تلاش بے نظیر میں جانے لگی۔ اس وقت کاسین حضرت مصنف نے  
 بڑی خوبیوں کے ساتھ حوالہ قلم کیا ہے۔ اس کی رخصت کی بندش نہایت فطری رنگ رکھتی ہے۔ کلام  
 کا عنوان ایسا نہیں ہے کہ جس سے دل نہ بھرائے بغیر کی دانست میں کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو اس  
 کی رخصت کو پڑھے اور متاثر و متالم نہ ہو۔ حضرات ناظرین اشار ذیل سے لذت یاب سوز و درد ہوں:

وہ رخصت جو اس طرح ہونے لگی	تو وہ صاحب خانہ رونے لگی
وہ رو کے دو ابرغموں لے	کہ جس طرح سادہ بھادوں لے
یہاں تک بندھا اس کے رونے کا آہ	بہ پھوٹ دیوار و در ایکٹ بار
کھڑے تھے وہ جوگن کے جو گرد گل	وہ رو رہوئے شبنم آلودہ گل
نہ دیکھا کسی نے جو کچھ اختیار	کہا حق کو سو نیا تجھے لے سدا بار
چلی جس طرح پیٹھ اپنی دکھا	اسی طرح دکھلا ہیں منہ پھرا
کسی نے کہا بھولیومت مجھے	خدا کے تئیں میں نے سو نیا تجھے
کہا اس نے خیر اب تو جاتی ہوں میں	جو ملتا ہے تو اس کو لاتی ہوں میں
تہیں بھی خدا کو میں سو پنا سنا	مرا بخشیتو تم کہا اور سنا

یہ رخصت پر از درد سوز ہونے کے علاوہ نسوانی پیرایہ کیا خوب رکھتی ہے۔ طریقہ بیان ایسا  
 ہے کہ جس سے سادہ سادہ عورت کی رخصت اپنی بھولیوں کے مجمع سے عیاں ہوتی ہے۔ یہاں بھی  
 حضرت مصنف نے مصوری کا عالم دکھلایا ہے۔ لاریب خوش اسلوبی بیان ایسی ہی ہے کہ ایک عالم  
 مصوری اس کی مدد سے نم النساء کی رخصت کی ایک سچی تصویر کھینچ لے سکتا ہے۔

بقیہ داستان نم النساء کی صحرانوردی کی کیفیتوں پر مشتمل ہے۔ اشعار ذیل بڑی قوت شاعری

سے خبر دیتے ہیں۔



جدا ہو کے القصر دونوں کو چھوڑ  
 زندہ بدھ کی لی در نہ منگل کی لی  
 لیے بن پھرتی تھی صحرا نورد  
 کہ شاید کوئی شخص ایسا ملے  
 جہاں بیٹھ کر وہ بجاتی تھی بن  
 بجاتی وہ جوگن جہاں جوگیا  
 اے منکر آتا تھا صحرا کو جوش  
 گل نغمہ جو اس سے گرتے ہزار  
 کہیں حلقہ حلقہ کہیں لخت لخت  
 بجاتی تھی جون وہ بن بن کے بن  
 نظر جو کہ پڑتی تھی بوٹی جڑی  
 تماشا دیکھتا تھا جو یہ کبھی  
 یہاں تک کہ وہ میں جو تھے نقش پا  
 گل نغمہ ترک تھی یہ بہار  
 سن آواز کی اس کی شان و شکوہ  
 نہ پاتی ہی سن شور اس کا چلے  
 نہ چشم ہی کچھ اب دیدہ رہے  
 ہوا بسل و نخل کا یاں تک ہجوم  
 نیمبر کا تھا داں ہراک کو مقام  
 چمن کرتی پھرتی تھی جنگل کے میں  
 یہ ہر جا پہنچتا اس دم سے ظلم  
 شب دروزہ مگرشتہ مثل صبا  
 چلی اپنے گھر بار سے منہ کو موڑ  
 نکل شہر سے راہ جنگل کی لی  
 تن چاک چاک اور رخ گرد گرد  
 کہ جس سے وہ شیدا کا شیدا لے  
 تو سننے کو آتے تھے آہوے چین  
 وہاں بیٹھتی خلیق دھونی لگا  
 صدا سے درختوں کو آتا خسرویش  
 تو لیتا انہیں دست دامن پار  
 کھڑے ہو کے گرد اس کے سننے درخت  
 خس و خوار سننے تھے بن بن کے بن  
 ہراک عالم ثوق میں تھی کھڑی  
 دود و دشت غش ہو پڑے تھے بھی  
 وہ بیٹھے تھے کان اپنے اُدھر لگا  
 کہ صحرا کے گل اس کے آگے تھے خار  
 نکلنے لگی دب کے آواز کوہ  
 کنویں کے بھی دل میں اٹھے دلولے  
 گریباں کر چاک دیا ہے  
 کہ گرتی تھی داں ڈالیاں جہوم جہوم  
 زباں کا نکلتا تھا باتوں سے کام  
 بسا تھی جنگل میں جنگل کے میں  
 بندھا تھا اسی دم قدم سے ظلم  
 اسی طرح پھرتی تھی وہ جا بجا

واضح ہو کہ ان اشعار میں حضرت مصنف نے مبالغوں کا استعمال کثرت کے ساتھ کیا ہے۔ ہر چند  
 کثرت مبالغہ کلام میں بے تاثری پیدا کرتی ہے مگر چون کہ یہاں ایسے مبالغوں سے کام لیا گیا ہے  
 کہ فطری کیفیتوں سے علیحدہ نہیں رکھتے۔ طبیعت کو ان سے نفرت پیدا ہونے کے عوض رغبت پیدا

ہوتی ہے واقعی یہ حضرت مصنف ہی کا کام ہے کہ استمال مبالغہ میں بھی فطری شاعری کے لطف کو ہاتھ سے نہ دیں۔

## داستان فیروز شاہ جنون کے بادشاہ کے بیٹے کا عاشق ہونا جوگن پر

جیسا کہ بالا میں ذکر ہوا ہے۔ نجم النساء جوگن کے بھیس میں جا بجا پھرا کرتی تھی۔ آخر کار اس کی نیل مرام کی صورت مسبب الاسباب نے پیدا کر دی۔

مسبب کے اسباب دیکھو ذرا      کہ قدرت میں اس کی ہے کیا کیا بھرا  
پسید و سیر اس کے ہے اختیار      بنایا ہے اس نے یہ لیل و نہار  
جہاں میں ہے اندوہ عشرت بہم      کہیں صبح غیش اور کہیں شام غم  
دورنگی زمانے کی مشہور ہے      کہیں سایہ ہے اور کہیں نور ہے

اشعار بالا آب زر سے لکھے جانے کے مستحق ہیں۔ ان میں قدرت خداوندی کا بیان خوب ادا ہوا ہے۔ واقعی مسبب الاسباب کے معاملات سمجھ میں نہیں آتے۔

انچہ درد و ہمت نہ آید آں کند

بسا اوقات بے سرو سامانی کی حالت میں ایسے ایسے سرور سامان ہمایا ہو جاتے ہیں کہ ان کے ظہور کا احتمال بھی نہیں ہوتا ہے۔ اگر کوئی میر سامان نہیں ہے تو ایسے سرور سامان کہاں سے موجود ہو جاتے ہیں۔ انسان کو چاہئے کہ بے سرو سامانی کی حالت میں پریشان نہ ہو۔ خدا پر تکیہ رکھ کر ہمت نہ ہارے اپنی کوشش فکر سے باز نہ آئے۔ خداوند تعالیٰ محنت کی مزدوری دیتا ہے۔ کوئی نہ کوئی صورت سے حصول مدد کی شکل پیدا ہی کر دیتا ہے۔ البتہ انہیں کو حرامی نصیب ہوتی ہے کہ جو جدوجہد سے جان چراتے ہیں اور اپنی کاہل وجودی کا نام توکل رکھتے ہیں۔ ایسوں کو جو اپنے کو مدد نہیں دیتے۔ کبھی خدا مدد نہیں دیتا۔ اس کہانی میں جب نجم النساء نے کوشش کی مصیبت اختیار کی تب خدا نے اس کی بامرادی کا سامان ہم فرمایا حضرت مصنف اس سامان فرمائی کی سرگزشت اس طور پر اہتہ کر رہے ہیں۔

تضار اسہانا سا اک دشت متقا      کہ اک شب ہوا اس کا واں بسترا  
وہ سخی اتفا شب چار دہ      ادا سے وہ بیٹھی وہاں رشک مہ  
بجھی ہر طرے چادر نور متقی      یہی چاندنی اس کو منظور متقی  
کدرا بجانے لگی شوق میں      دوزانوں سنبل کر وہ زہر جیس



کدرا، بجانے لگی شوق میں      لگی دست دپا مارنے ذوق میں  
 کدرا یہ بجنے لگا اس کے ہاتھ      کہ مہسنے کیا دائرہ یکے ہاتھ  
 بندھا اس جگہ اس طرح کا سماں      صبا بھی لگی رقص کرنے دہاں  
 وہ سنان جنگل وہ نور قمر      وہ برق سا ہر طرف دشت و در  
 وہ اجلا سا میدان چمکتی سی ریت      اگا نور سے چاند تاروں کا کھیت  
 درختوں کے پتے چمکتے ہوئے      خس و خوار سارے جھمکتے ہوئے  
 درختوں کے سایہ سے مہکا ظہور      گرے جیسے چھلن سے چھن چھن کے نور  
 دیا یہ کہ جو گن کا منہ دیکھ کر      ہوا نور سایہ کا مکرے جگر  
 گیا ہاتھ سے بین سنکر جو دل      گئے سایہ و نور آپس میں مل  
 وہ صورت خوش آئی جو اس نور کی      دل اپنے پر سایہ نے منظور کی  
 ہوا بندھ گئی اس گھڑی اس اصول      بسرا گئے جانور اپنا بھول  
 درختوں سے لگ لگ کے باد صبا      لگی وجد میں بولنے واہ واہ  
 کدراے کا عالم یہ تھا اس گھڑی      کہ تھی چاندنی ہر طرف غش پڑی

سبحان اللہ ثم سبحان اللہ سین عجب خوش اسلوبی اور راستی کے ساتھ حوالہ قلم ہوا ہے: مگر اس کی حقیقت تو وہی سمجھ سکتا ہے کہ جسے ایسے سین کا ذاتی تجربہ حاصل ہوا ہے۔ اس سین کے بیان میں خس و خوار بھی حضرت مصنف نے واقعات سے انحراف نہیں کیا ہے۔ اگر بے دیکھے ایسے سین کو حوالہ قلم کیا ہے تو معاملہ الہامی کے سوا اس کو کیا کہہ سکتے ہیں فقیر کو اپنے ایک دورہ شکار انگلی میں پورے طور ایسے سین کے دیکھنے کا اتفاق پڑا ہے فرق اسی قدر ہے کہ اس وقت فقیر تنہا دشت نور نہ تھا جمیت کے ساتھ جس طرح سفر شکار کا اختیار کیا کرتا ہے تبس چالیس آدمی شامل تھے۔ دورہ سنان جنگل شب چارہ سہانا دشت اجلا سا میدان چمکتی سی ریت نور درختوں کے پتے چمکتے خس و خوار جھمکتے درختوں کے سایہ سے مہکا ظہور یہ شب کیفیتیں حضرت مصنف کے بیان کے مطابق موجود تھیں۔ ایسے سماں میں موسیقی کی جیسی ضرورت متصور ہے۔ محتاج بیان نہیں فقر نے بن کار کو چاندنی راگ کی فرمائش کی (کدرا اور چاندنی واحد راگ کا نام ہے) وقت کی چیز کا کیا کہنا ہے ایسی بین بچی کہ شاید وہاں سامعین کے دل ہاتھوں سے جاتے رہے۔ اس وقت فقیر نے اس سین کے دو تین شعر بھی پڑھے۔ قول راست کا عجب اثر ہوتا ہے۔ احباب با مذاق جنہوں نے دعوت شکار قبول فرمائی تھی اور غایت کرم فرمائی سے

شریک حال ہو رہے تھے حالت انشراح میں یک زبان ہو کر حضرت مصنف کی طبائی کی نسبت فرمانے لگے کہ شاعری نہیں ہے یہ الہام نہیں ہے اور حقیقت امر بھی یہی ہے کہ شاعری الہام نہیں ہے خالی نہیں ہو سکتی جو شاعری الہام نہیں ہے خالی ہو وہ شاعری نہیں ہے۔ مجھک بندی ہے۔ القصہ ایسے سان میں نجم النساء بین بجا رہی تھی کہ اتفاق وقت سے فیروز شاہ جنوں کے بادشاہ کا بیٹا شب ماہ میں ہوا پر اپنا تخت اڑائے ہوئے چلا جا رہا تھا۔ بین کی صدا سن کر اپنے تخت کو زمین پر اتار لایا۔ اور نجم النساء کے حسن و جمال کو دیکھ کر فریفتہ ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی سمجھا کہ حقیقت میں وہ کوئی جوگن نہیں ہے یہ سب بناوٹ کا بھیس ہے یہ سمجھ کر اس سے اس طوط پر سوال کیا :-

ہذا تم پر ایسا کہو کیا جوگ لیا داسطے کس کے تم نے یہ جوگ

کدھر سے تم آئے کدھر جاؤ گے دیا ہم پر بھی فرماؤ گے

اس سوال سے وہ سمجھی کہ دل آئے بغیر یہ سوال نہیں ہوا ہے جیسا کہ حضرت مصنف فرماتے ہیں :

وہ سمجھی کہ اس کا دل آیا ادھر کہ دل بھی تو رکھتا ہے دل کی خبر

یہ تو عام حالت دل کی ہوتی ہے مگر قابل لحاظ امر یہ ہے کہ عورت کو ایک خاص صلاحیت مودعہ ہے جس کے ذریعہ وہ فوراً کیفیت عشق کو پہچان جاتی ہے گو کتنا ہی اس کا عاشق اخفائے عشق میں کوشاں ہو اس شعر کے بعد حضرت مصنف یہ دو شعر رقم کرتے ہیں جو محض امور فطری پر مشتمل ہیں اور جن کی خوبی بیان محتاج بیان نہیں ہے :-

خس و خار ہے عشق حسن آگ ہے مداحن اور عشق میں لاگ ہے

دلے راگ ہے اور ان میں ہوا کہ دونوں طرف آگ دے ہے لگا

یہاں دل کے آنے کے اسباب ہمہ وجود ہیں کیوں کہ بے چارہ فیروز شاہ مبتلائے عشق نہ ہوتا اس جگہ پر راگ کا مضمون بہت قابل لحاظ ہے۔ واقعی راگ سے حسن و عشق دونوں کا عالم بے انتہا ترقی کر جاتا ہے۔ اول تو حسن خود بلائے جان ہے۔ اس پر سے راگ پس عشق کا ٹمر جہاں تک پہنچ جائے وہی تعجب ہے۔

فیروز شاہ کی کیفیت عشق کو سمجھ کر نجم النساء نے اس سے کہا ہر بول ہر تو جدھر سے آیا ہے ادھر ہی چلا جا۔ مگر یہ جو کہا تو ہنس کر کہا۔ اس کا مطلب وہی سمجھیں گے جو انداز خواہاں سے واقفیت رکھتے ہیں۔ واقعی اس ایک لفظ سے شاعر کے کلام نے اس سین پر جان دے دی ہے۔ اگر نجم النساء ہنس کر فیروز شاہ کے سوال کا جواب نہ دیتی تو ایسے روکھے جواب سے فیروز شاہ کے دل پر چوٹ لگتی۔



اور جو مطلب نغم النساء کا اپنی تقریر سے تھا ہرگز نہ نکلتا فیروز شاہ نے گو روکھا جواب پایا مگر اس سے  
بے دل نہ ہوا اس واسطے کہ معشوق کا ہنس کر جواب دینا گو روکھا ہی سہی بہت امید افزا ہوتا ہے۔ ظاہراً  
ایسا ترش اور باطناً ایسا شیریں جواب پا کر

کہا تب پریزا دلے واہ جی بہت گرم ہیں آپ اللہ جی  
نہ روکھے ہو اتنا بھلا جاؤں گا ذرا بین سن کر چلا جاؤں گا  
ایسے جواب کی توقع تو نغم النساء تھی ہی یہ سنکر

کہا ہوتے سوتے سے اپنے کہو فقیروں کو چھیڑو نہ بیٹھے رہو  
یہی تو فیروز شاہ کی مانگی مراد تھی ان آپس کے لطیفوں کے بعد نغم النساء کے رد برد اسی ریت میں وہ  
آبیٹھا حضرت مصنف اس جگہ فیروز شاہ کی محویت کا فوٹو اس طور پر کھینچتے ہیں :-

نظر حسن پر گاہ گر بین پر سراپا دل اس لبت چین پر  
رہا تن بدن کا نہ کچھ اس کو ہوش بنا کل وہ جوں نقش پا چشم دگوش  
وہ جو گن جو تھی درد و غم کی اسیر ہوا غم میں جو گن کے یہ بھی نقیر  
نہ مدد گھر کی لی اور لی نہ راہ کی جب آئی ذرا سدھ تو پھر آہ کی

نغم النساء صبح تک بین بجاتی رہی اور فیروز شاہ برابر زار زار روتا رہا۔ جب صبح ہوئی نغم النساء نے کانڈھے  
پر بین دھری اور انگڑائی لے کر اٹھی مگر وہ کہاں جانے پاتی۔

پریزا دلے تب پکڑا اس کا ہاتھ شتابی، ٹٹا تخت پر اپنے ساتھ  
زمین سے اڑا آسمان کے تنیں وہ کتنا کہا کی نہیں رے نہیں  
نہ مانا اور اس نے اڑایا اسے پرستان میں لا بٹھایا اسے

فیروز شاہ کا ایک غیر قوم کی جوان عورت کو پرستان میں لانا کب اس کے باپ سے چھپا رہتا۔ اس لیے  
نہایت خوش خوش باپ سے حقیقت حال یوں عرض کی :-

یہ جوگی ہیں ایک صاحب کمال ذرا بین سینے اور اس کے خیال  
بہت آپ اسے سے اٹھا مینگے حظ بہت بین سے اس کی پائیں گے حظ  
فیروز شاہ کا باپ پارہ عقل رکھتا تھا جوان بیٹے کی رضا مندی ملحوظ رکھ کر

کہا اس نے بابا بہت خوب ہے ہمیشہ سے راگ اپنا مرغوب ہے  
کہا آؤ جوگی جی بیٹھو ادھر کمر روشن اپنے قدم سے یہ گھر

کھلے بخت بیٹے کے اور باپ کے سروں پر ہمارے قدم آپ کے  
الغرض اس کے باپ نے مصلحت وقت کو خیال کر کے

بہت اس کی تعظیم و تکریم کی جگہ ایک پاکیزہ رہنے کو دی  
واضح ہو کہ یہ جزو داستان تدبیر المنزل کے ایک بڑے ضروری مسئلہ سے خبر دیتا ہے۔ اکثر  
جو باپ اور بیٹے کے درمیان جھگڑے پیدا ہوتے ہیں اس کا سبب یہی ہوتا ہے کہ باپ کمال نادانی  
سے جوان بیٹے کو مولود تازہ کے برابر بے اختیار اور مجبور سمجھتا ہے۔ یہ ایک بڑی غلطی ہے۔ اس نا فہمی کا  
باعث عجب عجب طرح کے خانگی فسادات پیدا ہوتے ہیں ہر باپ کا فرض منصبی ہے کہ جب بیٹا  
جوان ہو جائے تو اس کی آزادی میں خلل انداز نہ ہو فقیر نے اپنی آنکھوں سے چند ایسے قصے دیکھے ہیں  
جن میں باپ کی طرف سے حضرت مصنف کے بیان کے برعکس کارروائیاں ظہور میں آتی ہیں عموماً  
ایسی بد عقلی کی کارروائیوں کے نتائج آپس کی پھوٹ اور خانہ بربادی کے سبب ہوا کرتے ہیں۔

### داستان فیروز شاہ کی مجلس آرائی اور جوگن کے بلانے میں

جب رات ہوئی نجم النساء کو فیروز شاہ کے باپ نے مجلس میں بلایا اور اس کی بڑی خاطر  
داری کی پریزاد سارے جوگن کی بین سننے کو جمع ہوئے۔ جب نجم النساء آکر مجلس میں بیٹھی۔ جنون کے  
بادشاہ بڑی تمنا کے ساتھ اُس سے

کہا ہم ہیں مشتاق کچھ گائے سماں بین کا ہم کو دکھلائیے  
نجم النساء نے بڑی بے پروائی مگر معقول انداز کے ساتھ کہا

کہا کچھ بجا ناہیں اپنا کام ہر اک طرح لینا نہیں ہر کا نام  
ہے بے زار فرمائشوں سے فقیر دلے کیا کریں اب ہوئے ہیں امیر

اس جواب کو پا کر بادشاہ جن نے منذرت کے طور پر اور بڑی دلجوئی کے ساتھ

کہا جوگی صاحب یہ کیا بات ہے کرم آپ کا ہم پہ دن رات ہے  
جو مرضی ہو تو تم کو تکلیف دیں نہیں جس میں راضی ہو تم سو کریں

نجم النساء نے ایسی نرمی کا جواب پا کر

کہا اس طرح سے جو فرماؤ گے تو ہاں بندگی ہی میں کچھ پاؤ گے

مگر اس نے بین کا دھڑے دھڑے اور ایسی خوبی کے ساتھ یہاں تک بھائی کہ اہل مغل کے



دل بچیں گئے۔ اور سبھوں کی آنکھیں شمع محفل کی طرح اشکوں سے بھرا آئیں۔ مگر فیروز شاہ جو مبتلائے  
عشق ہو رہا تھا اس کا حال اشعار ذیل ہی سے خوب عیاں ہوتا ہے:-

کبھی سامنے آ کے کرتا نظر	کبھی دیکھتا چھپ کے ادھر ادھر
ستون کے کبھی اوٹ میں ہر کے وہ	کھڑا دیکھتا اس کو رہ کے وہ
کبھی ادھر ادھر سے پھر پھر کے آ	چھپے اس کے مکھڑے لیتا بلا
وہ گو کچھ نہ سنتی نہ کہتی اسے	کن آنکھیوں سے پردہ کھیتی رہتی اُسے
نظر اس کی جب آن پڑتی ادھر	توہ اور کی طرف کرتی نظر
اس آن دادا پر وہ فیروز شاہ	دل و جان سے کرتا تھا ہر لحظہ آہ
اگر کوئی جو گن کی کرتا ثنا	تو کھا رشک کہتا کہ پھر تم کو کیا

ایسی بے چینی محفلِ نغمہ میں سوا عاشق کے کس کو ہو سکتی ہے۔ الغرض نغم النساء کی بین کاری نے جمع  
سامعین کو محو کر ڈالا۔ جیسا کہ اشعار ذیل سے اس صحبت کی کیفیت ظاہر ہوتی ہے:-

بچی پہلی صحبت میں واں ایسی بہن	کہ غش کر گئے دے جو تھے بختہ چین
سمرام پر یزاد کے باپ نے	کہا کی دیا جوگی جی آپ نے
اسی طرح ہر شب کرم کیجئے	مری بزم رشک ادم کیجئے
مقدم ہمارا رجھانا کرو	ہیں اپنا مشتاق جانا کرو
یہ گھر بار ہے آپ ہی کا تمام	ہوئے آج سے ہم تمہارے غلام
تکلف کو موقوف کر دیجئے	جو کچھ تم کو درکار ہو لیجئے
کہا اس نے مطلب نہیں کچھ ہیں	تمہارا مبارک رہے گھر تمہیں
کہاں ہم کہاں تم ہوا یہ جو ساتھ	یہ تھی بات سب آب و دانہ کے ساتھ

گانے بجانے کے بعد نغم النساء اپنی قریام گاہ میں چلی گئی۔ مگر اس شب سے اس کا یہ معمول بندھا کہ  
وہ ہر شب بادشاہ جن کی خدمت میں جاتی اور اسے اپنے نغموں سے سرور و مضمون کرتی اس درمیان  
میں فیروز شاہ کا عشق ترقی کرتا گیا۔ اس کی حالت روز بروز تباہ ہوتی گئی۔ اس کی بد حالیوں کی  
کیفیت بڑی صراحت اور قابلیت کے ساتھ حضرت مصنف نے حوالہ قلم کی ہے۔ بخوف طوالت  
یہاں اس کا اعادہ نہیں کیا جاتا۔ یہ جزو داستان بھی دیدنی ہے۔ اباب ثوق خود دشمنی میں  
ملاحظہ فرمائیں۔ المختصر جب فیروز شاہ کے عشق کی حالت برداشت سے باہر ہو گئی تو اس نے

ایک موقع پاکر نجم النصار سے اظہارِ معارف کیا۔ نجم النصار نے بڑے رد و کد کے بعد وصل کی امید دلائی۔ مگر اس شرط کے ساتھ کہ اس کی کہانی غور سے سنکر فیروز شاہ اس کے برابر مدعا میں کوٹھاں ہو۔ فیروز شاہ نے وعدہ واثق کیا۔ تیسرے نجم النصار نے سرگزشت بدر منیر کے عشق ادا اپنے جوگن کے بھیس اختیار کرنے کی کہہ سنائی جن کے شاہزادہ نے اپنی قوم کو بلا کر ان سے کہا کہ پرستان میں ایک آدمی قید ہے تم جاؤ اور اس کا پتہ لگاؤ۔ کامیابی کی صورت میں حسب دستور ملک انعام پاؤ گے۔ پر یزاد تلاش میں نکلے۔ آخر ان میں سے ایک کا وہاں گزر ہوا۔ جہاں ماہِ رُخ کا قیدی مبتلائے چاہ الم تھا۔ نگہاں چاہ سے بھید لے کر وہ پر یزاد شاہزادہ کے پاس واپس آیا اور اس سے حقیقت حال عرض کی۔ پھر ادائے مجرا کے بعد انعام کا طالب ہوا۔ حسب معمول شاہزادہ نے انعام میں اس کے جواہر کے پر لگا دیئے۔ واضح ہو کہ سب مضامین اس داستان میں بڑی خوبی کے ساتھ بیان ہوئے ہیں لیکن بخوف طوالت راقم ان کے ریویو سے قلم کو روک لیتا ہے۔

### داستان پیغام بھیجنے میں فیروز شاہ کے ماہِ رُخ کو

مُجرب سے دریافت حقیقت کر کے فیروز شاہ نے ماہِ رُخ کو ایک سخت حکم بھیجا وہ ڈری اور شاہزادہ سے غدرِ قصیر چلا۔ جیسا کہ اشعار ذیل سے ظاہر ہوگا۔

کہا مجھ سے تقصیر اب تو ہوئی      کہو اس کو یجائے یاں سے کوئی  
اگر اب میں لاگو ہوں اس کی کبھی      تو پھر بھونک دیجو تم بھی تبھی  
پر اتنا یہ احسان مجھ پر کرو      کہ اس کا پرستان میں چرچا نہ ہو  
مرے باپ کو یہ نہ ہو دے خبر      کہ پھر میں نہ ادھر کی ہوں نے ادھر

یہ انتباہی نہایت نچرل رنگ رکھتی ہے۔ اکثر اشخاص جو اس طرح کے بد اطواری کے مرکب ہوتے ہیں اپنے عیب کے پنہاں رہنے کے بڑے متمنی ہوتے ہیں مگر ان کے افعال قبیحہ کبھی پوشیدہ نہیں رہتے۔ شیطان گھر گھر ان کی بد فعلیوں کی منادی کرتا ہے۔ ماہِ رُخ کا جواب پاکر فیروز شاہ وہاں گیا۔ جہاں بے نظیر قید تھا اس کے حکم سے ایک دیوبے نظیر کو بڑی حفاظت کے ساتھ کنویں سے باہر نکال لایا۔ یہ سب مضامین بڑی قابلیت شاعری کے ساتھ حضرت مصنف نے حوالہ قلم کیے ہیں۔ سبحان اللہ کیا سحر البیانی ہے شاعری ہے کہ اعجاز ہے۔



## داستان کنویں سے نکلنے میں بے نظیر کے

جب بے نظیر کنویں سے نکلا تو اس طرح کی قید شدید سے جو اس کی حالت ہو رہی تھی اس کی تصویر اشعار ذیل میں کھینچی ہے :-

وہ جیتا تو نکلا دے اس طرح	کہ بیمار ہو نزع میں جس طرح
زبں اد پر آنے کا تھا اس کو غم	کہے تو کہ بھرتا تھا اد پر کا دم
جی خاک تن پر بزرگ زمیں	گڑا جیسے نکلے ہے پتلا کہیں
نہ آنکھوں میں طاقت نہ تن میں تپ	کہ جوں خشک ہو نرگس بوستاں
وہ تن سرخ جو تھا سو پیلا ہوا	وہ جوڑا جو تھا سبز نیلا ہوا
وہ سر میں جو تھے اس کے سنبل سے بال	ہوئے لاغری سے بدن کی وبال
نقطہ پوست باقی تھا یا استخوان	نہ تھا خون کا رنگ بھی درمیاں
بدن سے رگوں کی تھی اس ڈھب نمود	کہ الجھی ہو جیون ریسماں کبود
بدن خشک و زرد اس طرح تھا دگل	خزاں دیدہ ہو جس طرح برگ گل
وہ ناخن جو تھے اس کے مثل ہلال	سو وہ ہو گئے بڑھ کے بد کمال

حسن بیان محتاج ستائش نہیں ہے۔ میر حسن کے مبالغے بھی فطرت سے علاحدہ نہیں ہوتے۔ ایسے مبالغوں سے کجی شاعری میں بٹا نہیں لگتا۔ واقعی حضرت مصنف بڑے نچرل شاعر ہیں۔ یہی حال شکسپیر کا ہے کہ اس کے مبالغہ خواہ تشبیر اور خواہ استعارہ کی بنیاد پر ہوں کبھی فطرت سے بے لگاؤ نہیں ہوتے۔ القلم جب بے نظیر اس طرح پر کنویں سے نکلا۔ فیروز شاہ اس کی حالت دیکھ کر رونے لگا۔ بعد ازاں بے نظیر کو اپنے ساتھ تخت پر بٹھا کر وہاں لے آیا۔ جہاں نجم النساء تھی مگر پہلے فیروز شاہ نے اُسے کسی جگہ مصلحتاً چھپا رکھا۔ پھر نجم النساء سے جا کر بے نظیر کے آنے کی خبر کی۔ چونکہ وہ بے نظیر کے لیے بد حال ہو رہی تھی ایسی غیر متوقع خبر پا کر اضطراب کے ساتھ حقیقت حال دریافت کرنے لگی اور وہاں چلنے کے لیے جہاں بے نظیر تھا جلدی کرنے لگی۔ فیروز شاہ نے اس امر کو خیال کر کے کہ خوشی میں بہت عاجلانہ کام نہیں کرتے۔ نجم النساء سے کہا کہ اس قدر عجلت کو راہ نہ دو۔ پھر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اطمینان کے ساتھ اُسے وہاں لے آیا۔ جہاں بے نظیر کو وہ تخت پر بیٹھا چھوڑ آیا تھا۔ اس جگہ نجم النساء اور بے نظیر کے آپس میں

لے کاسین حضرت مصنف یوں رقم فرماتے ہیں:-

یہ اس تخت کے گرد پھرنے لگی      بلا اس کی لے لے کے گرنے لگی  
گلے لگ کے رونے لگی ناز ناز      کیا اپنے تن من کو اس پر نثار  
وہ دیکھے جو تک آنکھ اٹھا بے نظیر      تو نغم النساء ہے یہ دُخت وزیر  
کہا تو کہاں اور کس کا یہ جوگ      کہاں یہ لباس اور کہاں تم بہ سوگ  
کہا تیرے غم نے دیوانہ کیا      کہ عالم سے اپنے بے گانہ کیا  
بغل کھول کر پھر تو آپس میں مل      وہ رویا کیے دیر تک متصل  
بیاں دونوں اپنا جو کرنے لگے      دُرباشک بے چشم بھرنے لگے  
کہی سرگزشت اس نے اس دم تلک      کہ اس طرح پہنچے ہو تم ہم تلک

اس کے بعد فیروز شاہ نے بے نظیر اور نغم النساء کو ایک روز وہاں مقام کر کے مرکب ہوائی یعنی تخت کے ذریعہ بدر منیر کے باغ میں جا اترے بدر منیر سے نغم النساء کے پھر لے کاسین بطرز ذیل بیان ہوا ہے:

یکایک جو آوہ قدم پر گری      تو جھمکی وہ شہزادی اور کچھ ڈری  
پھر آخر جو دیکھا تو جو گن ہے یہ      مرے درد و غم کی بردگن ہے یہ  
کہا میری نغم النساء تو ہے جان      ارے تیرے صدقے مری مہربان  
ہیں تیرے لے کی کب آس تھی      کہ جینے سے اپنے ہمیں یا س تھی  
بہت اس نے چاہا کہ ہو دے کھڑی      کھڑی ہوتے ہوتے وہیں گر پڑی  
کہا بار غم سے افاقہ نہیں      ارے کیا کروں مجھ میں طاقت نہیں  
بلا میں لگی لینے نغم النساء      لگی گرد پھرنے برنگ صبا

ان اشعار کی قدماہل مذاق صحیح کے سوا کون کر سکتا ہے۔ واقعی ایسے اشعار کی قدردانی کے لیے بڑی تعلیم یافتگی کی حاجت ہے۔ نا تعلیم یافتہ زبانوں میں فطرت نگاری کبھی اپنے حق کو نہیں پہنچتی ہے جس وقت میں شک پھرنے اپنے حیرت انگیز پلے تصنیف کیے تھے۔ اس وقت اس نادر روزگار کی کچھ بڑی قد نہیں ہوئی تھی مگر جیوں جیوں تعلیم یافتگی دنیا میں پھیلی گئی اس شاعر الہامی کی قد بڑھتی گئی۔ اس طرح ایک وقت آئے گا جب میر حسن کی غنوی بھی دیدہ حیرت سے دیکھی جائے گی اور اس کی ناپرسانی زائل ہو جائے گی۔

اس سین کے بعد حضرت مصنف بدر منیر اور تمام محل و باغ کی اس انقلابی حالت کو جو



نغم النساء کی غیبت میں پیدا ہوئی تھی یوں رقم فرماتے ہیں :-

اسے شاہزادی کا تھا حال یاد	جو دیکھا تو یاں اس سے کچھ ہے زیاد
نہ گھر کی وہ رونق نہ اس کا وہ حال	گلوں سے لگا دل تلک پائمال
پڑے سارے بیداشت دیوار و در	محل کو جو دیکھا تو ٹوٹا سا گھر
خواصیں جو تھیں پاس وہ نازنین	سوہلی کھلی کہیں کی کہیں
جو چوٹی گندھی اود نہ کنگھی درست	جو چالاک بھتی بن گئی وہ بھی مست
ہر اک اپنے عالم میں دیکھو تو زنگ	اڑا رنگ چہرے کا مثل پتنگ
نہ آپس کی چہلیں نہ وہ چہچہے	نہ گانا نہ بھانا نہ وہ قہقہے
نغم آلودہ ہر ایک زار و نزار	نہ آرام جی کو نہ دل کو قرار
جو بیٹھیں تو رونا جو اٹھیں تو غم	غرض بیٹھے بیٹھے ان پرستم
چمن سارے دیران سے ہیں پڑے	شجر گل کے اک جھاڑے ہیں کھڑے
جو خود ہے تو حیران و بیمار سی	کہ چوں نرد و شیشے کی ہوا رسی
نہ تاب و توان نہ وہ ہوش و حواس	ضعیف و نحیف و پریشان اُداس
یہ دیکھ اس کا احوال نغم النساء	جلی شمع کی طرح آنسو بہا

اس کے بعد کا سین وہ ہے کہ جب نغم النساء کے آنے کی خبر رہنے والیوں کو معلوم ہوئی تو انہوں نے اسے گھیر لیا۔ یہ سین نہ صرف فطری خوبی رکھتا ہے بلکہ اس میں زنا نہ روم ملکی بھی خوب ادا ہوتے ہیں۔ اشعار ذیل قابل لحاظ ہیں :-

دیکھن محل میں پڑی جب یہ دھوم	کیا مثل پردانہ اُس پر ہجوم
سُنی ایک سے ایک نے خبر	مبارک سلامت ہوئی یک دگر
کوئی غنچہ کی طرح کھلنے لگی	کوئی دودڑ کر اس سے ملنے لگی
مکے کوئی صدے کو لانے لگی	کوئی سر سے روٹی چھوٹنے لگی
کوئی آنی باہر سے گھر سے کوئی	ادھر سے کوئی اور ادھر سے کوئی
حقیقت لگی پوچھنے آ کوئی	لگی کرنے آپس میں چرچا کوئی
ہوا سر پر اس کے زبس اژدہام	لگی گھبرا کے کرنے سب کو سلام
کہا بیویو کل کہوں گی میں حال	کہ اب راہ کی ماندگی ہے کمال

جب زنان محل کی بھیڑ چھٹی تب بڑی تمیزداری کے ساتھ نجم النساء بدر منیر کو خلوت میں لے گئی اور بے نظیر کے آنے سے مطلع کیا۔ یہ سنکر بدر منیر غایت مسرت سے غش کر گئی پھر افاقہ کے بعد افراط حیرت کی حالت میں اُس نے پوچھا کہ کیا یہ سچ ہے یا اس سے کوئی چھڑ مراد ہے نجم النساء نے بدر منیر کی بڑی خوبصورتی کے ساتھ تشفی کردی بعد ازاں ساری سرگزشت کہہ سنائی۔ علاوہ اس کے پریزاد کے آنے سے بھی خبر دی۔ بدر منیر نے پوچھا کہ پھر وہ دونوں کہاں ہیں۔ تب نجم النساء نے کہا کہ ہم نے انہیں درختوں میں چھپا رکھا ہے۔ اب نجم النساء کی بقیہ گفتگو اور بقیہ کیفیات اس داستان کی ذیل میں بزبان حضرت مصنف عرض کی جاتی ہیں۔

عجب دقت میں میں ہوئی تھی جدا	کہ دلبر کو تیرے دیا لا ملا
مگر ایک یہ آپڑی بے بسی	کہ میں تیرے خاطر بلا میں پھنسی
سواب ایک کو تولے آتی ہوں میں	ہوا دوسرے کو بتاتی ہوں میں
یہ سن شاہزادی ہنسی کھکھلا	کہاں کیوں اڑاتی ہے نجم النساء
ارے ایک ہے تو بڑی قہر ہے	کہیں تو ہے امرت کہیں زہر ہے
چل اب چوچلے بس زیادہ نہ کر	انہیں جل کے جلدی لے آ تو ادھر
کہا پھسر پریزاد کے رو برو	بغیر از کہے کسی طرح ہو گی تو
کہا وہ تو ایسا دیوانا نہیں	وہ اس بات کو کیا کہے گا نہیں
اگر دل میں کچھ تیرے دوسواں ہے	نہیں دور وہ بھی ترے پاس ہے
ذرا پوچھ لیجو تو اس بات کو	کہ وہ رو برداس کے ہویا نہ ہو
یہ سن کر شتابی گئی وہ نگار	لیا جا کے آہستہ ان کو پکار
چھپائے ہوئے لا بٹھایا وہاں	وہ خلوت کا جو تھا قدیمی مکان
پھر اس سے پوچھا کہ اے بے نظیر	کہے تو چلی آوے بدر منیر
کہا خبر ہے تجھ کو رشک چمن	چھپے ہیں کہیں بھائی سے بھی بہن
مراجان مال اس پر قربان ہے	کہ اس کے سبب سے مری جان ہے
مرا یہ تو ہمدم ہے دن رات کا	مجھے اس سے پردہ ہے کس بات کا

یہاں حضرت مصنف نے پردہ کے اصول کی نسبت ایک ایسی بات حوالہ قلم فرمائی کہ بہت کچھ قابل لحاظ ہے۔ اس ملک میں بڑے سخت پردہ کا رواج دیکھا جاتا ہے۔ ایسا پردہ نہ ایران میں ہے نہ



روم میں اس پر بھی شرعی پردہ ندارد ہے یعنی عورتیں ایسے لوگوں سے حضور ہوتی ہیں جو ان کے محض غیر ہیں مثلاً شوہر کے چھوٹے بھائیوں یا شوہر کی بہنوں کے شوہروں سے ظاہر صرف رواج ملکی کی بنیاد پر یہ حضور ہوتا ہے ورنہ ایسے رشتہ مندوں سے حضوری کی قرآنی اجازت نہیں ہے۔ لیکن راقم کی دانست میں جب ایسے رشتہ مندوں سے حضوری رواجاً مجاز مان لی گئی ہے تو میر حسن کا قائم کردہ اصول خلاف قیاس نہیں معلوم ہوتا۔ واقعی چار شخص بے نظیر، بدر منیر، فیروز شاہ اور نجم النساء کی خصوصیت اور آزاد مشربی کے کہیں ہوں تو ان کے آپس میں پردہ کا التزام نہ صرف ذریعہ تکلیف بانود ہا بلکہ تمام تر محفل عیش و نشاط ہوگا۔ اس جگہ حضرت مصنف نے بدر منیر کے خیال فرماں برداری کو بھی خوب دکھلایا ہے یعنی فیروز شاہ سے حضور ہونے کی بات کو بے نظیر کے استمراج پر موقوف رکھا ہے۔ عورت کو شوہر کی اتباع کا خیال ایسا ہی چاہئے جس عورت میں یہ خوبی نہیں وہ کبھی اپنے شوہر کو رضا مند نہیں رکھ سکتی جس کا نتیجہ یعنی تنگی نافیت اور بربادی عاقبت ہے۔

### داستان بے نظیر و بدر منیر کے ملنے اور اس کے باپ کو بیاہ کا رقعہ لکھنے میں

فطری طریقہ بیان تو میر حسن پر ختم ہے مگر جہاں پُر اخلاقی لغزشیں موجود ہیں ان کا دکھا دینا سبھی کام کریٹک کا ہے۔ یہ لفظ انگریزی کا ہے اور اس سے مراد وہ شخص ہے جو مصنف کے کلام کے حسن و قبح پر نظر ڈال کر اظہار رائے کرتا ہے۔ اس داستان میں حضرت مصنف نے پہلے بے نظیر اور بدر منیر کے ملنے کو رقم فرماتے ہیں۔ اس کا سین نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ کھینچا ہے۔ واقعی جب دو بچے ہوئے عاشق و معشوق ملتے ہیں تو اسی طرح ملتے ہیں پھر مفارقت کے بعد کی پہلی شب کو جو گفتگو آپس میں ہوتی ہے اس کا وہی انداز ہوتا ہے۔ جسے مصنف نے حوالہ قلم فرمایا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ یہ سب بیانات بہت کچھ قابل توجہ ہیں اور راقم بہ طوالت ان کی خوبیوں کو حوالہ قلم کرتا مگر ضرورت اختصار کے باعث قلم روک لیتا ہے اور صرف کلام کی اخلاقی لغزش کی طرف متوجہ ہوتا ہے جاننا چاہئے کہ اس داستان کے انداز بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بدر منیر اور بے نظیر کی طرح فیروز شاہ اور نجم النساء بھی ناجائز طور پر زن و شوہر کی طرح رہنے لگے۔ یہ دوسری لغزش حضرت مصنف کی ہے۔ پہلی وہ تھی کہ جو قبل کی ایک داستان میں بدر منیر اور بے نظیر کی نسبت بیان کی جا چکی ہے اس وضع کی مواصلت کسی مذہب میں جائز نہیں ہے بے شک اخلاقی پایہ سے یہ بیان گرا ہوا نظر آتا ہے بہت خوب ہوتا اگر حضرت مصنف نے ان دونوں عورتوں کا قبل از نکاح کنواری حالت میں قائم رہنا بیان

فرمایا ہوتا۔ کہانی کے پہلو کو بدل دینے سے یہ اخلاقی لغزش ظہور میں نہیں آتی۔ موجودہ صورت اس کہانی کی ایسی ناجائز مواصلت کے باعث میوب دزشت نظر آتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس ناجائز مواصلت کے بیانات سے یہ مثنوی بدنام ہو گئی ہے۔ ورنہ جس قدر اخلاق آموزیاں اس مثنوی میں ہیں کسی اردو مثنوی میں پائی نہیں جاتی ہیں۔ اگر حضرت مصنف نے بدر منیر اور نجم النساء کو صرف مبتلائے عشق دکھایا ہوتا اور قبل از نکاح آلودہ مواصلت نہ بیان کیا ہوتا تو اس کہانی کا روحانی پہلو بہت ترقی کر جاتا۔ اور یہ مثنوی اخلاقی پایہ کے اعتبار سے اپنا جواب نہیں دیتی۔ لیکن افسوس ہے کہ بدر منیر اور نجم النساء کے بے نظیر اور فیروز شاہ کے ساتھ ایسی مواصلت دکھائی گئی ہے کہ ان چاروں اشخاص نے اپنی حالتوں کو ناپسندیدہ سمجھ کر ان کی اصلاح کی طرف مائل ہونا۔ ایک امر ضروری جانا۔ چنانچہ ان سبھوں میں رے قائم ہوتی گئی۔ کہ بدر منیر اور نجم النساء اپنے اپنے باپ کے گھر چلی جائیں اور بے نظیر و فیروز شاہ رسمی طور سے بیاہ کے خواستگار ہوں۔

### نامہ بھیجا بے نظیر کا مسعود شاہ کو خواستگاری میں بدر منیر کی

بے نظیر نے جو رقعہ لکھا یہ ایسا ہی ہے کہ جیسا کہ صدی ہائے ماضی کے بادشاہوں کی خواستگاری کے رقعہ اکثر ہوتے تھے۔ یہ واقعہ خواستگاری کا ہے کوہے۔ یہ تو خاصا پیام جنگ ہے۔ اگر مخاطب نا فہم ہو تو لڑائی کے نہ ہنسنے میں کیا باقی رہ جاتا ہے۔ ہندو راجاؤں میں اکثر بیاہ لڑائیوں کے بعد انجام پاتے ہیں۔ اسی لیے ایک بیاہ ان کے یہاں ہوتا تھا کہ جسے رکشاس کہتے ہیں۔ اس بیاہ کا یہ طور تھا کہ دولہا صاحب سُر سارے سب کو لڑائی میں قتل کر کے دہن کو میدان جنگ سے روٹی ہوئی اپنے ہاک لے جاتے تھے۔

### جواب نامہ بے نظیر کا ملک مسعود شاہ سے

رقعہ خواستگاری کا جواب بھی ترکی بہ ترکی نظر آتا ہے۔ بہر حال مسعود شاہ نے درخواست بے نظیر کی منظور کی۔ اور طرفین سے شادی کے سامان ہونے لگے۔

### داستان بے نظیر اور اس کے تھل میں

اس داستان میں حضرت مصنف نے ہندوستانی امیروں کی بارات کی ایسی ہی تصویر کھینچی ہے کہ کسی اور شاعر سے نہیں کھینچ سکتی۔ اسی طرح بارات کی مغل آرائی اور سارات کے معاملات کے بیانات



اپنا جواب نہیں رکھتے ہیں۔ سبحان اللہ سبحان اللہ ملکی رسومات بڑی قوت شاعری کے ساتھ اس طور پر حوالہ قلم ہوتے ہیں کہ غیر ملک کا ستیا ج محمد میر حسن کے بیانات کو پڑھ کر ہندوستانی بارات اور سارات کے جزوی معاملات کو آسانی کے ساتھ درک کر لے سکتا ہے۔ کیا خوبی بیان ہے کہ اس داستان کو پڑھنے سے محسوس ہونے لگتا ہے کہ کوئی بھاری بارات بڑی تیاری کے ساتھ جارہی ہے۔ پھر بارات کی قیام گاہ میں ایک نہایت آراستہ و پیراستہ محفل ہو رہی ہے۔ اسی طرح سارات میں جو کیفیتیں گزرتی ہیں وہ سب کی سب پیش نظر ہو رہی ہیں۔ واقعی میر حسن عجب حیرت انگیز شاعر گزرے ہیں کہ معاملات خارجی و داخلی دونوں کے بیانات پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ لاریب شکسپیر کو معاملات ذہنی کے بیان کی لا جواب قدرت ہے۔ مگر معاملات خارجی کی مصوری میر حسن کے برابر شاعر گرامی نہیں کر سکتا ہے۔ راقم الحروف کی دانست میں اس قدرت کے اعتبار سے میر حسن کو شکسپیر پر یقینی ترجیح ہے۔

### نکاح ہونا بے نظیر کا بدر منیر سے اور شادی نجم النساء کی پر یزاد سے اور خصلت ہونا آپس میں

یہ داستان بھی میر حسن کے کمال شاعری کا ایک نمونہ ہے اس میں حضرت مصنف پہلے بے نظیر کے نکاح کا ذکر فرماتے ہیں بعد ازاں پھر اس کے محل میں دولہ بن کر جانے کو بیان کرتے ہیں ان امور کے ساتھ جو رسوم انجام پاتے ہیں وہ اس و فور اطلاع اور خوش اسلوبی کے ساتھ حوالہ قلم ہوتے ہیں کہ پڑھنے والے کو حیرت و منگیں ہوتی ہے پھر صبح کو خصلت کا سین جو بیان کیا گیا ہے اور اس کے متعلق کے رسوم جو احاطہ تحریر میں در آئے ہیں نہایت ہی قابل لحاظ ہیں۔ اس سین کا داخلی معنی SUBJECTIVE پہلو بھی کمال قابلیت کے ساتھ مذکور ہوا ہے۔ دلہن کو اپنی عیش گاہ میں لانے کے بعد بے نظیر پر یزاد کے بیاہ کا سامان کرتا ہے۔ اس کے بیاہ کی چوتھی کے ساتھ ایسی دھوم دھام سے پر یزاد اور نجم النساء کی شادی انجام پاتی ہے۔ اس شادی کے انجام کے بعد پر یزاد اور نجم النساء پرستان کو چلے جاتے ہیں مگر بے نظیر سے اس کا اقرار کر جاتے ہیں کہ گو اس وقت کی مفارقت کی ایک امر مجبوری ہے۔ مگر آئندہ ہمیشہ آپس میں ملتے رہیں گے۔ پر یزاد اور نجم النساء کی روانگی کے بعد بے نظیر بدر منیر کے ساتھ اپنے باپ کے ملک کی طرف رخ کرتا ہے۔ تمام اجزا اس داستان کے کس قدیر نچرل اور خوش اسلوب ہیں۔ سبحان اللہ سبحان اللہ۔

داستان بے نظیر کا بدرنیر کو اپنے وطن لے جانے اور ماں باپ کے ملاقات کرنے میں

باپ کے شہر کے نزدیک پہنچ کر بے نظیر نے ایک دریا کے کنارے قیام کیا۔ جب لوگوں نے اُسے دیکھا تو تمام شہر میں اس کے آنے کا شور مچ گیا۔ اس کے ماں باپ کو خبر ہوئی ایسی خبر سن کر جوان کا حال ہوا اس کو حضرت مصنف کس نہچرل خوبیوں کے ساتھ ذیل میں منظوم فرماتے ہیں۔

خبر ہوئی جبکہ ماں باپ کو	کیا گم انھوں نے وہیں آپ کو
زبس دل تو تھا یا س ہی سے بھرا	یہ سن ہاتھ اور پا گئے تھر تھرا
نگے رونے آپس میں زار و نزار	کہا ہائے ہم کو نہیں اعتبار
ملا دے گا ہم سے ہمارا حبیب	یہ دشمن نہیں اپنے ایسے نصیب
یہ ہوگا کوئی دشمن ملک و مال	سوسن کر وہ ہم کو گرفتار حال
کوئی اس کا وارث تو آخر نہیں	وہی لے کے جائے یہ جھگڑا کہیں

ظاہر ہے کہ مصیبت زدگی میں اچھی خبر ایسا ہی حال پیدا کر دیتی ہے۔ سبحان اللہ فطرت کی تبعیت حضرت مصنف کو کس قدر ملحوظ رہتی ہے۔ اس جگہ داخلی پہلو کے حقوق کیا خوب ادا ہوتے ہیں۔ کیا کہنا ہے کہیں حضرت مصنف شکسیر کی داخلی شاعری اور کہیں سردالتراسکاٹ کی خارجی شاعری کا تماشا دکھلاتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ وہی شاعر شنوی نگاری کی داد دے سکتا ہے جس کو بیان کی یہ دہری قوت خدائے تعالیٰ کی جانب سے مودع ہوتی ہے۔ ظاہر حضرت مصنف شکسیر اور سردالتراسکاٹ کی قوتوں کے مجموعہ معلوم ہوتے ہیں۔ خیر جب لوگوں نے بے نظیر کے باپ کو بے نظیر کے آنے کا یقین دلایا اور مکرر بے نظیر کا نام اس کے آگے یا گیا تب تو باپ صاحب ننگے پاؤں بیٹے کی طرف دوڑے۔ ادھر سے بیٹے صاحب بھی چلے ہی آئے تھے۔ باپ پر جو نظر پڑی باپ کے پاؤں پر بے نظیر یہ کہہ کے کہ خدا نے دکھائے قدم آپ کے گر پڑا۔ اس کے بعد حضرت مصنف یوں فرماتے ہیں:-

سنی جو صدا جوں ہی اس ماہ کی	تو اس غم رسیدہ نے پھر آہ کی
اتھا سر قدم پر سے چھائی لگا	پٹ کے گھڑی دو ملک خوبسا
یہ رویا شدت کہ غش کر چلا	کہے تو کہ آنسو کا شکر چلا
لے پھر تو آپس میں وہ خوب سے	کہ یوسف لے جیسے یعقوب سے

پھر تو چھوٹے بڑے سب کو دلی مسرت حاصل ہوئی۔ اجڑا گھر سرنو سے آباد ہوا۔ بے نظیر نے بدرنیر



کی سواری کو محل سرا میں لے جا کر بدرنیر کو آرا۔ اسی عرصہ میں بے نظیر کی آنکھیں جو ماں پر پڑی تو قدموں پر گر پڑا۔ دونوں تقاضائے فطرت سے خوب روئے۔ ماں نے بہو اور بیٹے دونوں کو چھاتی سے لگایا۔ اس جگہ پر حضرت مصنف کا فرمودہ مندرج ذیل ہوتا ہے۔

وہ ماں خوب بیٹے کے لگ کر گئے یہ روئی کر آنسو کے نالے چلے  
 بہو اور بیٹے کو چھاتی سے لگا وہ دونوں کی لے ہاتھ سے وہ بلا  
 ہوئی جان اور جی سے اس پر نثار پیا پانی ان دونوں پر دار دار  
 اس کے بعد حضرت مصنف اس کہانی کو اس طور پر تمام فرماتے ہیں کہ شاہی گھرانے والے سب کے  
 سب مل ملا کر آپس میں رہنے لگے بے نظیر کے باپ ماں نے بے نظیر کا سر نو سے بیاہ کیا۔ خوب توصلے  
 دل کے نکالے۔ ذیل میں خوشی اور بہبودی کے مضامین بزبان حضرت مصنف درج پاتے ہیں۔

محل میں عجائب ہوئے چھپے وہ مرجھائے گل پھر ہوئے ہلے  
 ہوا شہر فتنہ نسل پروردگار وہی شاہزادہ وہی شہسریار  
 وہی لوگ اور وہی چرچے تمام وہی ناز و انداز کے اپنے کام  
 وہی بلبلیں اور وہی بوستاں شگفتہ گل و مجمع دوستاں  
 اس کہانی کے اتمام پر حضرت مصنف کچھ دعائیہ مضامین یوں زیب رقم فرماتے ہیں۔

انہوں نے کے جہاں ہیں پھرے جیے دن ہمارے تمہارے پھرے دیے دن  
 ملیں سب کے بچھڑے ابی تمام بہ حق محمد علیہ السلام  
 ہوئے جیسے وہ شاد ہوں شاد ہم رہیں شہر میں اپنے آباد ہم  
 رہے شاد نواب عالی جناب کہ ہے آصف الدولہ جکا خطاب  
 خوشی اس کی رہے سر دباغ مراد ہے اس کا روشن چراغ مراد  
 بحق حسین و بحق حسن رہوں شادیں بھی غلام حسن

حضرت مصنف کو جس طرح ہر قسم کے مضامین کی بندش پر قدرت ہے۔ اسی طرح دعائیہ  
 مضامین کی بندش پر بھی اختیار حاصل ہے۔ پہلے سب بنی آدم کی خیر چاہتے ہیں۔ پھر آقا کے لیے  
 دعا فرماتے ہیں اور آخر میں اپنی ذات خاص کی نسبت دست بدعا رہتے ہیں۔ سبحان اللہ کیا خوش  
 مذاقی ہے۔ کیا خوش کلامی ہے۔ یہ خوش اسلوبی ایک امر مودع ہے۔ سیکھنے سے نہیں آسکتی ہے  
 ایں سعادت بزور بازو نیست آہ بخشد خداے بخشندہ

اس کے بعد حضرت مصنف اپنی اس مثنوی کی داد مانگتے ہیں اور حقیقت حال بھی یہی ہے کہ اگر ایسی مثنوی کی داد نہ ملے تو اس سے بڑھ کر انصاف کشی اور کیا ہو سکتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔

ذرا منصفو داد کی ہے یہ جا	کہ دریا سخن کا دیا ہے بہا
ز بس عمر کی اس کہانی میں صرف	تب ایسے یہ نکلے ہیں موتی سے حرف
جوانی میں جب بن گیا ہوں میں پیر	تب ایسے ہوتے ہیں سخن بے نظیر
نہیں مثنوی ہے یہ اک پہلج مری	مسلل ہے موتی کی گویا لڑی
نئی طرز ہے اور نئی ہے زبان	نئی مثنوی ہے یہ سحر البیان
رہے گا جہاں میں مرا اس سے نام	کہ ہے یادگار جہاں یہ کلام
ہر اک بات پر دل کو میں خون کیا	تب اس طرح رنگیں یہ مضمون کیا
اگر واقعی غور ملک کیجئے	صلہ اس کا کم ہے جو کچھ دیجئے
غرض جس نے اس کو سنا یہ کہا	حسن آفریں مرعبا مرعبا
جو مصنف سنیں گے کہیں گے یہی	نہ ایسی ہوتی ہے نہ ہوگی کبھی

انصاف یہی ہے کہ حضرت مصنف نے اپنی مثنوی کی تعریف بالا میں کوئی امر احاطہ حق سے باہر نہیں ارشاد فرمایا ہے۔ اشعار بالا میں جس برابر بھی مبالغہ نے جگہ نہیں پائی ہے۔ بلاشبہ یہ مثنوی ایسی ہی ہے کہ ”نہ ایسی ہوتی ہے نہ ہوگی کبھی“ مرزا قنیل کا مصرع تاریخ بھی جاوہر راستی سے باہر نہیں ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ ”بریں مثنوی باد ہر دل فدا“ حقیقت حال بھی یہی ہے کہ حضرات جو شاعری کا مذاق صحیح رکھتے ہیں اس مثنوی پر دل سے فدا ہیں حضرت مصطفیٰ کا فرمایا کرتے تھے چہن لیے بے دل ”تمام ترقین حق ہے۔ واقعی یہ مثنوی ایک ناجواب بت خلد چین سے بھی نیلہ خوش نما اور دل آویز ہے۔

## مثنوی گلزار نسیم

یہ مثنوی بھی جڑی شہرت رکھتی ہے اس کے مصنف حضرت نسیم خواجہ حیدر علی آتش کے شاگرد تھے۔ کہتے ہیں کہ خواجہ نے اس کی اشاعت کے پہلے اس کی نظر ثانی فرمائی تھی۔ خیر بحالت موجودہ یہ مثنوی بہت توجہ طلب ہے۔ اس کی نظم حیرت انگیز اختصار کا عالم رکھتی ہے اس پر بھی ادلے مطلب کا ایک جلوہ دکھاتی ہے کہ شاید د باید زبان کی عمدگی اپنا جواب نہیں رکھتی ہے۔ یوں



تو کوئی کلام بشری اعتراض سے پاک نہیں ہو سکتا۔ اس پر بھی اس کی خوبی نظم اور عمدگی زبان بہت کچھ لائق تحسین ہے۔ البتہ اس مثنوی میں مثنوی میر حسن کی فطری خوبیاں کم ہیں اور وہ تناسب خیالات جو مثنوی میر حسن میں دیکھا جاتا ہے اس مثنوی میں گویا نہیں ہے۔ میر حسن ایک نیچرل شاعر تھے۔ ان کے امور ذہنیہ اور امور خارجیہ کے بیانات تناسب سے کبھی بھی جدا نہیں دیکھے جاتے ہیں۔ یہ خوبی اس مثنوی میں کم تر نظر آتی ہے میں مثلاً یہ عرض کرتا ہوں کہ تاج الملوک کے چاروں بیٹوں کا ذکر حضرت نسیم یوں فرماتے ہیں۔

خالی نے دیئے تھے چار فرزند  
عاقل و دانا زکی خردمند

لاریب زبان کیا خوب ہے اور نظم کیا چست ہے مگر کلام میں تناسب حسب مراد نہیں دکھائی دیتا ہے حضرت نسیم کی ساری مثنوی پڑھ جانے کے بعد بھی کہیں سے ان چاروں صاحبزادوں کی عقلندی، دانائی، ذکاوت اور خردمندی کا کوئی پتہ نہیں لگتا۔ بلکہ حضرت نسیم کے آئندہ کے بیان خیالات سے ان کی بے وقوفیاں، اور بہ ترکیبیاں ظاہر ہوتی ہیں۔ برخلاف اس کے میر حسن کی مثنوی کا انداز ہے کہ ساری مثنوی میں سلسلہ کلام ایسے تناسب کے ساتھ دیکھا جاتا ہے کہ بے اختیار دل میر حسن کے حسن کلام کا معترف ہو جاتا ہے۔ جاننا چاہئے کہ تناسب ہی حسن ہے۔ انسان اسی تناسب کے حاصل رہنے سے حسین کہلاتا ہے اور ہر شے جو تناسب رکھتی ہے دل آویز ہوتی ہے۔ اگر یہ تناسب گلزار نسیم کو حاصل رہتا تو اس مثنوی کی دل آویزی نہایت اعلیٰ درجہ کی ہوتی۔ بہر حال یہ مثنوی اپنے رنگ میں اچھی ہے ذیل میں کچھ اشعار اس مثنوی کے عرض ہوتے ہیں :-

آوارہ ہونا بکادلی کا تاج الملوک گلچیں کی تلاش میں

گل کا جو الم چمن چمن ہے	یوں بلبل خامہ نعرہ زن ہے
گلچیں نے وہ بھول جب اڑایا	اور غنچہ صبح کھکھلایا
وہ سبز باغ خواب آرام	یعنی وہ بکادلی گل اندام
جاگی مرغِ حشر کے غل سے	اٹھی بکھبت سی فرش گل سے
منہ دھونے جو آنکھ ملتی آئی	پر آب وہ چشم حوض پائی

دیکھا تو وہ گل ہوا ہوا ہے      کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے  
 گھبرائی کہ ہیں کدھر گیا گل      جھنجھلائی کہ کون دے گیا گل  
 ہے ہے مرا پھول لیا گیا کون      ہے ہے مجھے خار دے گیا کون  
 ہاتھ اس پہ اگر پڑا نہیں ہے      بو ہو کے تو پھول اڑا نہیں ہے  
 نرگس تو دکھا کدھر گیا گل      سون تو بتا کدھر گیا گل  
 سنبل مرا تازیانہ نہ لانا      شمشاد انھیں سولی پہ چڑھانا  
 تھرائیں خواصیں صورت بید      ایک ایک سے پوچھنے لگی بھید  
 نرگس نے نگاہ بازیاں کیں      سون نے زبان درازیاں کیں  
 پتا بھی پتے کو جب نہ پایا      کہنے لگیں کیا ہوا خدایا  
 اپنوں میں سے پھول لے گیا کون      بیگانہ تھا سبزے کے مرا کون  
 شبنم کے سوا چرانے والا      ادھر کا تھا کون آنے والا  
 جس کف میں وہ گل ہو داغ ہو جائے      جس گھر میں ہو گل چسراغ ہو جائے  
 بولی وہ بکا دلی کہ افسوس      غفلت سے یہ پھول پر پڑی ادس  
 آنکھوں سے عزیز گل مرا تھا      پتلی وہی چشم حوض کا تھا  
 نام اس کا صبا نہ لیتی تھی میں      اس گل کو ہوا نہ دیتی تھی میں  
 گلیمیں کا جو جائے ہاتھ ٹوٹا      غنچے کے بھی منہ سے کچھ نہ پھوٹا  
 ادغار پڑا نہ تیسرا چنگل      مشکیں کس لیں نہ تو نے سنبل  
 ادب ادصبا ہوا نہ بتلا      خوشبو ہی سونگھا پتا نہ بتلا  
 بلبل تو چہک اگر خبر ہے      گل تو ہی مہک بتا کدھر ہے

لاریب زبان کی خوبی اور بندش کی نجاستی اپنا جواب نہیں رکھتی ہے مگر اشعار بالا کے مضامین نہ جذبات قلبیہ کا کوئی زور دکھلاتے ہیں اور نہ کسی سین یا سبزی کا تماشا پیش نظر کر دیتے ہیں۔ شاعری کے اعتبار سے یہ اشعار اعلیٰ درجہ کے داخلی یا خارجی مضامین کی کوئی خوبیاں نہیں رکھتے حکمت و فلسفہ سے تو ان کا لگاؤ ہی نہیں ہے اور اخلاقی تعلیم کی بھی ان کو ہوا نہیں لگی ہے۔ فطری شاعری کے نمونے یہ اشعار ہرگز نہیں مانے جاسکتے ہیں ان کی جو خوبیاں ہیں مصنوعی انداز کی ہیں فطرت پسندوں کے لیے اور ہی انداز کی شاعری درکار ہے۔ جو حضرات میر حسن اور



شکسیر کے کلاموں کے لذت یاب ہیں۔ ان کو اس ترکیب کے مضامین سے بہت قلبی کیوں کر نصیب ہو سکتی ہے۔ کلام کا فطری انداز کچھ عجب لطف رکھتا ہے۔ ذیل میں کچھ اشعار شبنوی کی ترکیب کے کتاب مذہب عشق معروف بہ گل بکا دلی سے درج کیے جاتے ہیں بہرچند یہ اشعار کوئی علمی مسئلہ سے خبر نہیں دیتے مگر چوں کہ ان میں ایک امیر گھر کے ہندوستانی دلہن کا سچا فوٹو ہے۔ یہ اشعار لطف سے خالی نہیں ہیں۔ یہ اشعار بکا دلی کے عرس بنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور اہل مذاق کے قابل توجہ ہیں۔

پرستاروں نے یہ اس کو بنایا	جہاں میں حور جنت کو دکھایا
عجب صورت سی کہ بالوں میں گنگھی	کہ بکھرا دیکھ کر ہر ایک کا جی
لپٹ آئی جویوں زلفوں کی کیار	ہوئی کافور بوئے مشک تاتار
بھوری کوندھی وہ پاکیزہ چوٹی	کہ سب اہل نظر کی جان لوٹی
جب اس کی موتیوں سے لگ بھری	فلک نے کہکشاں قربان کر دی
جو میکا اس کے ماتھے پر لگایا	قمر نے اپنے دل پر داغ کھایا
برنگ مہر تاباں تھا جو چہرہ	ہوا تار شاعی منہ پہ سہرا
وہ آنکھیں بند کرنا بھی ادا تھی	حق مزگاں میں پوشیدہ تھی
جب اس کے کان میں پہنایا جھمکا	پریشان ہو گیا عقد شریا
پہن کر نتھ خوشی سے رنگ دمکا	وہ مکھڑا چاند سا گھونگھٹ میں چمکا
مسی آلودہ دندان پیارے پیارے	چمکتے تھے شب ہلدا میں تارے
مسی ملکر جب اس نے پان کھایا	یہ مطلع پڑھ کے ناسخ کا سنایا
مسی مالیدہ لب پر رنگ پان ہے	تماشا ہے آتش دھواں ہے
بنایا خال کا جل سے ذقن پر	عجب جو بن تھا اس رشک جن پر
چڑھی منہ پر دو لہن کے ایسی شیریں	کہ بھیک پوگئی نظروں سے شیریں
گلے میں پہنا جب موتی کا مالا	بنات انش کو حیرت میں ڈالا
اگر ہاتھوں میں ہیرے کے کڑے تھے	زرد خالص کے زیب پا چھڑے تھے
بہت اس کے سوا بھی اور گہنا	مناسب جس جگہ تھا اس نے پہنا

ظاہر ہے کہ یورپ کا کوئی آدمی جو ہندوستان کی رسی اور رواجی باتوں سے واقف نہیں ہے۔

اشعار بالا سے کوئی حظ نہیں اٹھا سکتا۔ مگر ہر تعلیم یافتہ ہندوستانی آدمی جو شاعری کا مذاق صحیح رکھتا ہے ضرور ہے کہ بیانات بالا سے متلذذ ہو۔ اس لیے کہ یہ اشعار واقعات سے تہا متر تعلق رکھتے ہیں حقیقت حال یہ ہے کہ ہندوستان دہنیں دولت مند گھروں کی اسی طور پر سنواری جاتی ہیں ہیں ایسا سچا بیان واقعات کا جو شاعرانہ انداز کے ساتھ ہو کیوں کر مطبوع اہل مذاق نہیں ہو سکتا۔

**حکمت آموز مثنویاں :-**

اس ترکیب کی مثنوی اردو میں بوستان سعدی اور پند نامہ عطار کے پایہ کی کوئی نہیں ہے۔

**تصوف آموز مثنویاں :-**

اس قسم کی مثنویاں بھی اردو میں اعلیٰ درجہ کی نہیں ہیں۔ کوئی مثنوی ایسی نہیں ہے کہ جو

مولانا کے روم کا جواب سمجھی جائے۔

متفرق مضامین کی مثنویاں۔ اس انداز کی مثنویاں بہت ہیں۔ سیکڑوں قصص و حکایات

رنگ برنگ کے منظوم ہوتے گئے ہیں۔ ذیل میں ایک مثنوی غالب کی جو آم کی تعریف میں ہے درج کی جاتی ہے۔

ہاں دل درد مند زمزمہ ساز	کیوں نہ کھولے دُخسزینہ راز
خامہ کا صفحہ پر رواں ہونا	شاخ گل کا ہے گل فشاں ہونا
مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا لکھئے	نکتہ ہائے خسرو فزا لکھئے
بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے	خامہ نخل رطب فشاں ہو جائے
آم کا کون مرد میدان ہے	نمرو شاخ گونی و چوگاں ہے
تاک کے جی میں کیوں رہے اراں	آئے یہ گوئے اور یہ چوگاں
آم کے آگے پیش جائے خاک	پھوڑتا ہے جلے پھپھولے تاک
نہ چلا کسی طرح مقدور	بادۂ ناب بن گیا انگور
یہ بھی ناچار جی کا کھونا ہے	شرم سے پانی پانی ہونا ہے
مجھ سے پوچھو تمہیں خبر کیا ہے	آم کے آگے نیشکر کیا ہے
نہ گل اسمیں نہ شاخ و برگ نہ بار	جب خزاں آئے تب ہوا سکی بہار
اور دوڑائے قیاس کہاں	جاں شیریں میں یہ مٹھاس کہاں



جان میں ہوتی مگر یہ شیرینی      کوہ کن با وجود غم گینی  
 جان دینے میں اسکو کیسا جان      پردہ یوں پہل دے نہ سکتا جان  
 نظر آتا ہے یوں مجھے یہ ثمر      کہ دواخانہ ازل میں مگر  
 آتش گل یہ قند کا ہے قوام      شیرہ کے تار کا ہے ریشہ نام  
 یا یہ ہوگا کہ فسرط راحت سے      باغبانوں نے باغ جنت سے  
 انگلیں کی حکم رب الناس      بھر کے بھیجے ہیں سر پہ سرگلاس  
 یا لگا کر خضر نے شاخ نبات      مدتوں تک دیا ہے آب حیات  
 تب ہوا ہے ثمر فشاں یہ نخل      ہم کہاں در نہ اور کہاں یہ نخل  
 تھا ترنخ زر ایک خسرو پاس      رنگ کا زور پر کہاں بو باس  
 آم کو دیکھتا اگر ایک بار      پھینک دیتا طلّائے دست فشار  
 رونق کار گاہ برگ و نوا      نازش دو دمان آب و ہوا  
 رہر در راہ خلد کا توشہ      طوبی و سدرہ کا جگر گوشہ  
 صاحب شاخ و برگ بار ہے آم      ناز پروردہ بہار ہے آم

واقع ہو کہ مرزا سودا نے بہت سی مثنویاں مختلف مضامین کی لکھی ہیں۔ یہ مثنویاں ان کے کلیات میں موجود ہیں۔ حضرت سودا کی طباعی جواب نہیں رکھتی۔ اس شاعر گرامی کو اصناف شاعری پر قدرت حاصل تھی۔ ان مثنویوں میں چند جو کی مثنویاں ہیں جن سے کم و بیش طور پر عام و خاص واقف ہیں۔ لاریب حضرت سودا کو ہجو نگاری میں بڑا دخل تھا اور زہنہار ان کی طباعی اس کی محتاج نہ تھی کہ فحش گوئی سے وہ کسی قسم کی اعانت لیتے۔ مگر اس قبیح انداز سے اپنے کو بچا نہ سکے۔ اگر ایسے نازیبا اشعار ان کی مثنویوں سے نکال دیئے جائیں تو ان کی ہجو نگاری اہل تہذیب کے لیے بھی قابل توجہ ہو سکتی ہے۔ اس لیے ان مثنویوں سے حضرت سودا کی طباعی کا اظہار اس درجہ ہوتا ہے کہ اس کے لطف سے کوئی شخص طبیعت دار اپنے کو محروم رکھنا پسند نہیں کر سکتا ہے۔ یہ مثنویاں علاوہ اظہار طباعی کے حضرت سودا کے اطلاع عام سے بہت کچھ خبر دیتی ہیں۔ وہ مثنویاں جو قابل ملاحظہ ہیں۔ ان کے نام درج ہوتے ہیں۔

ہجو پیل راجہ نہر پت سنگیہ      ہجو شیدی کو تو ال  
 ہجو امیر دولت مند      ہجو ضاحک

بجو حکیم غوث      بجو چیک مرزا فیضو

کمال حضرت سودا کا یہ ہے کہ بسبب اطلاع عام کے جس چیز کو لکھتے ہیں اس کے متعلقات کو اپنے بیان میں فرو گذاشت نہیں کرتے۔ ذیل میں نمود کے طور پر کچھ اشعار مثنوی ہائے بالا سے درج کیے جاتے ہیں۔

### اشعار از مثنوی بجو پیل راجہ نرپ سنگھ

کیا ساقی نے مجھ کو سیہ مست	تو کر فکر بلند اے ہمت پست
قلم سے کہہ کہ ہوسرگرم تحریر	بنے تا صفحہ کا غنڈہ زنجیر
قوی ہاتھی سے بھی اپنا سخن ہے	زبان خامہ پر یاں کھلی بن ہے
اگر ہم فیصل معنی کا بنا دیں	تو بہتر ہاتھیوں سے کر دکھا دیں
پھر اس کو جو کوئی سمجھے سو جھوٹے	قدم آ حضرت سودا کا چوٹے
یہ دعویٰ گو کوئی شاعر نہ مانے	پراس کو جو سخن رس ہو سو جانے
کہ طرز شاعری انسب یہی ہے	سخن کا ہے جو کچھ فن سب یہی ہے
کیوں میں پیل معنی کی جو اوقات	تو سخن ہے کہ چھوٹا منہ بڑی بات
بند ہے ہی وہ سدا آ کر مری یاں	جگہ ہے گشت کی فہم سخن سراں
تو ارد سے اگر وہ چھوٹ جاوے	کوئی شاعر ہی اس کو بانڈھ لاوے
دبے ہے اس سے جو کوئی ہو کج فہم	کہ اس کی طبع کو آنکس کرے دہم
بنا ہے پاک طینت اس قدر وہ	قدم ہرگز نہ رکھے خاک پر وہ
سبک چلنا کوئی کیا اسکو بتلائے	جہاں تک بھیجو کاغذ پر چلا جائے
کریں ہے آفریں اس پر ہو کیا ہے	گویا اس کی وہ آواز دراہے
نہ لگوائے کبھی مستک پہ سیندھ	بہت اس کی بزرگی سے ہے یہ دور
ہوا کیا گر نہیں کرتا ہے تزیین	اے کہتے ہیں اہل طبع رنگین
نہو دے قد و قامت میں وہ موجود	بلندی عرش سے ہے اس کی افروز
بجلا اس شان کا باقی کہیں ہے	کہ جس پر ہر کوئی ایسا تعین ہے
مہادت دل ہے نالہ بجالہ بردار	ہے چہرخی چمپیش آہ مشربار



نہ کچھ پیوے کھو نہ کچھ وہ کھائے      نظر بھی اس بزرگی پر نہ آوے  
 کوئی ہاتھی کی ہوتی ہے یہ اوقات      نہیں دم مارنے کی اس جگہ بات  
 غرض ہاتھی خدا دیوے تو ایسا      نہ فیصل راجہ نہ پت جیسا  
 اس کے بعد اس ہاتھی کی ہجو ہے۔ ہاتھی سے جو باتیں متعلق ہیں ایک بھی نہیں اٹھا رکھی گئی ہے۔  
 افسوس کہ اس کتاب میں ہر پہلو سے اختصار ہی کی ضرورت ہے۔ ورنہ ہجو کے اشعار کم از کم  
 دس بیس تو ضرور داخل کتاب ہذا کر دیئے جاتے سبحان اللہ کیا شاعر گرامی سودا گدرا ہے۔  
 حقیقت یہ ہے کہ سوا حضرت سودا کے اس قابلیت کی مثنویاں کسی شاعر سے انجام نہیں  
 پاسکتی ہیں۔

### اشعار از مثنوی ہوشیدی کو تو ال

قوت انتخاب جواب دینے لگتی ہے کیا کلام ہے سبحان اللہ مجبوراً ذیل میں کچھ اشعار عرض کر دیئے  
 جاتے ہیں۔ ورنہ لطف کلام تو پوری مثنوی پڑھے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔

گشت جب آکا پھرتا آتا ہے	یہی نرسنگیا بجا ہے
سُن لو چورو یہ مختصر قصہ	صبح کو بھیج دیجو حصہ
شہر کے بیچ کیا کہوں میں اب	زور محشر کی دھوم ہے ہر شب
شب ہے نرسنگیوں کی قال قبل	گویا پھینکتی ہے صورا سرا فیل
کتے آہٹ سے ان کے بھونکتے ہیں	مردے خواب اندم سے چونکتے ہیں
آنکھ تو کس بشر کی لاگے ہے	چوروں کے ڈر سے فتنہ جاگے ہے
آسمان پر بھی مندم ہے خواب	کھلا رہتا ہے دیدہ مہتاب
بزم میں شب ہر ایک پیرد جوان	بیٹھے ہے کر کے رزم کا سامان
نس پہ یہ ہے کہ ہر طرہ زر	لگے ہے چور شمع سے آکر
طرہ شمع یک طرف اے یار	گم ہے خورشید کی بھی شب ستار
شام سے صبح تک یہی ہے شور	دوڑیو گٹھری لے چلا ہے چور
صبح شبنم جو گل پہ ہوتی ہے	بقیچہ کو غنچہ کے وہ روتی ہے

اس مثنوی میں کوئی بات جو کو تو ال کے متعلق ہے اس شاعر نامی سے چھوٹ نہیں رہی ہے۔

اپنی اطلاع عام سے کام لینا حضرت سودا ہی کا کام ہے۔ اس زور کا شاعر جو اصناف شاعری پر اس قدر قادر ہوا اردو میں کوئی نہیں ہے حضرت سودا اپنے جواب آپ ہی ہیں۔

### اشعار از مثنوی جو امیر دولت مند

حضرت سودا اس مثنوی میں لکھتے ہیں کہ آپ کے ایک آشنا ایک امیر کی ملاقات کو گئے اور ان کے دہاں جاتے ہی ابر گہر آیا اور بارش ہوئے لگی، وہ امیر محل میں چلا گیا اور انہیں وہ رات مجبوری سے اس کے گھر رہنا پڑا۔ بکا دلی سے حسب ہدایت امیر جو کھانے کے واسطے کہا تو اس نے اس امیر کے بحالت کی حالات کچھ کچھ بیان کیے۔ یہ بیانات حضرت سودا کی بڑی طباعی اور مضمون آفرینی سے خبر دیتے ہیں بکا دلی نے یہ باتیں کہیں جو اشعار ذیل میں منظوم ہیں۔

ایک فرزند یہ رکھے تھا اولاد	سارے گھر کا تھا اسکے چشم و چراغ
اس نے ایک روز یہ حماقت کی	آشنا اپنے کی ضیافت کی
ضیافت کہ جس میں ہوزنگ رس	اک رکابی طعام و دیگر بس
تس پہ یوں پیش آیا یہ مردود	یاد آیا اُسے چھٹی کا دودھ
چاہتا تھا کرے یہ اس کو نفاق	اور ماں کو بھی اسکے دیوے طلاق
بارے لوگوں نے آکے سمجھایا	تب یہ جو رد کے حق میں فرمایا
پتھر اس کے عوض یہ کیوں نہ جنی	کاش پھنس مزا داں یہ ناشدنی
یار و مجھ سے تولد و لد بہت سہر	مرا بیٹا اور اس قدر ابر
اس کا دادا بھی گرچہ تھا عیاش	اس سلیقہ سے پر کرے تھا معاش
جو کوئی اس کے گھر میں نوکرتے	رات کو اس پہ یہ مقرر تھے
پھر تا وہ مکرے مانگتا گھر گھر	لانا آقا کے آگے جھولی بھر
اچھے چن چن کے آپ کھاتے تھے	بری تنخواہ میں لگاتے تھے
پیدا جو کر گئے تھے یوں اجداد	سو یہ بد بخت دے ہے یوں برباد
جاننا تھا میں آپ ہی کو فضول	پر یہ مجھ سے بھی نکلا نامقول
گر دے پیسے یہ سب اڑا دے گا	اینٹوں تک بیچ بیچ کھا دے گا
اس کے دادی کے باپ کا اک ریز	آشنا تھا سودہ نیٹ دلسوز



لایا کھجڑی پکا شراکت سے      دونوں کھانے لگے رفاقت سے  
ان نے اک دو لیے نوالے بڑے      جد مرقوم ددھن ہو کے کھڑے  
لگے کہنے نہیں شراکت نیک      میرے سولتے اور تیرا ایک  
تھی بزرگوں کی اپنی تو یہ چال      کرتی ہیں یاں ضیافتیں پامال  
خوب جو کچھ اٹھا خزینہ سے      لواتی تھیں کے مہینہ سے  
منا اس گھر کا یار تو نے حال      مجھ سے کھانے کا پھر نہ کیو سوال

خوبی بیان کا کیا کہنا۔ بکا دل اپنے آقا کے حالات بیان کرتا ہے۔ پھر بکا دل خود کچھ نہیں کہتا۔ صرف اپنے آقا کے اقوال کا اعادہ کرتا ہے۔ اس اعادہ میں آقا کی بی بی، بیٹے، دادا، پردادا، سب کی ہجو ہو جاتی ہے۔ یہ ترکیبیں حضرت سودا کے سوا کس سے انجام پا سکتی ہیں۔ واہ رے طباعی واہ مضمون آفرینی، واہ رے خوش اسلوبی بیان کیا حیرت انگیز قدرت شاعری کی اس شاعر گرامی کو عطا ہوئی تھی۔ اہل اطلاع حضرت سودا کی جس قدر قدر فرمائیں بجا ہے۔

## اشعار از مثنوی ہجو ضاحک

اس مثنوی میں میر ضاحک کی بسیار خواری کی ہجو ہے معلوم ہوتا ہے کہ میر ضاحک نے سودا کی ہجو کی تھی۔ یہ مثنوی ان کی ہجونگاری کی مکافات ہے۔ خلاتی سخن حضرت سودا پر ختم ہے۔ ذیل میں کچھ اشعار اس مثنوی کے درج ہوتے ہیں۔ پوری مثنوی دیدنی ہے۔ مگر اس کتاب میں اس کی گنجائش نہیں ہے۔

جواے مہماں بلاوے ہے      آفت اپنے وہ گھر پہ لاوے ہے  
یہی کہتا پھر اس کے گھر بیٹھے      اور کوئی نہ کھانے پر بیٹھے  
بولتا آوے ہے قدم بقدم      کہو کھانے کو جلد دیویں دم  
سلام علیک نہ کچھ بات      صاحب خانہ سے کرے بد ذات  
بیٹھتے ہی بی نکالے ہے یہ ذکر      پریت کی میرے تم کو ہے کچھ فکر  
بھوک کچھ ان دنوں ہے کم میری      روٹیاں سو پچاس ادھ میری  
نان باکو کہو یہ بلوا کر      جلد ان کو تنور لگوا کر  
جب تک کھانے پاک چلیں سارے      ان کو لا کے میرے سر مارے

جتنے دنیا کے پنج ہیں اشکال  
جب تلمک کھانا آوے ہی آوے  
کھا آوے تو اس طرح ٹوٹے  
مارے لقمے تو اس طرح بد ذات  
دہ جونو کر کھڑے ہوں جس تس کے  
دیگے جب یہ چاٹ کر چھوڑے  
اشتہا ان میں تھا منا ہے محال  
اسی بک بک میں جان کھایا جاوے  
جیسے کوئی کسی کا گھر لوٹے  
جیسے جھاڑے کوئی پٹے کے بات  
منہ کو حیران ہو تک رہیں اس کے  
منہ کو کھانے سے موڑے تو موڑے

### اشعار از ثنوی ہجو حکیم غوث

حضرت سودا کی بڑی اطلاع عام اور حیرت انگیز قابلیت شاعری کا ثبوت یہ ثنوی بھی ہے۔ واقعی مضمون آفرینی اس شاعر جادو نگار پر ختم ہے۔ کچھ اشعار اس ثنوی کے نذر ناظرین ہوتے ہیں۔

کہتے ہی بیمار تھے اور ایک گھر  
آن کے بیٹھا وہ ستم گار جب  
چھٹے ہی ایک شخص کی دیکھی جو نہیں  
کچھ نہیں کرنے کا بحر اس کے سود  
اور غذا اس کو یہ بتلائی دوست  
صاحب پیش کو بتلایا کٹول  
لکھ دیا مجنوں کو شیر شتر  
پوچھا جوان نے کہ غذا کیا کہی  
یہ کہا اس کو جسے تھی اشک  
کہنے لگا دیکھ کے ایک اور کو  
بیٹھ کے پھر پاس وہ ایک ڈولی کے  
دیکھ چکا نبض کو جب بے تمیز  
درد کمر اس کو ہے یا درد سر  
کر کے پھر آخر کو مقرر مصرع  
سو ہی تو وہ گور سے تھا تنگ تر  
گرو ہوئے اس کے یہ بیمار سب  
کہنے لگا تجھ کو بدلتا ہے قبض  
لکھ دیا یہ کہہ کے سفوف یہود  
ماش کی روٹی سے تو کھا ساگ پوست  
واسطہ ہیضہ کے لکھا اسپنول  
کہ دیا مستقی کو جا کر قصہ ذکر  
ساتھ کلتھی کے کہا کھا وہی  
موضع مخصوص پہ چھڑ کو نہک  
زخم کو ذہل کے کر دانا رفو  
نبض کہا دیکھوں میں لا ہاتھ دے  
خادمہ سے اس کی کہا اے کینز  
پر مجھے نفرس کا ہے ڈر بیشتر  
کہنے لگا دوا سے ماء القرع



اور جو کھانے کی نگے اس کو لو      کچھ نہ اسے دیکھو بجز آتش جو  
کہنے لگی سُن کے یہ کیا تہر ہے      واسطے اس کے یہ دوا زہر ہے  
لقوہ و فاج اسے ہے پیر زال      کرتے ہو کیوں قتل کا اس کے خیال  
لقوہ فاج ہو جسے یا صرع      دیکھئے اس کے تئیں ماء القرع

یہ کمال ہجو نگاری ہے مریض شخص کے خلاف دوا اور غذا کی تجویز کیا۔ خوش اسلوبی کے ساتھ دکھلائی گئی ہے حقیقت یہ ہے کہ حضرت سودا کی طباعی اپنا جواب نہیں رکھتی ہے۔ لاریب حضرت سودا ایک بڑے شاعر گزرے ہیں فطرت نے انہیں شاعری کی بے حد قابلیت بخشی تھی۔ اپنے اطلاع عام سے جس قدر انہیں کام لینے کی صلاحیت حاصل تھی دنیا میں بہت تھوڑے شاعروں کو نصیب ہوتی ہے۔

### اشعار از مثنوی ہجو چپک مرزا فیضو

اہل اطلاع سے پوشیدہ نہیں ہے کہ اطلاع عام مرزا رفیع سودا کی ایک حیرت خیز انداز رکھتی ہے۔ ہندوستان کے ہر قسم کے معاملات سے اس شاعر گرامی کو خبر تھی حضرت سودا کی کلیات کی سیر سے صاف ہوتا ہے کہ اپنی اطلاع عام کی بدولت حضرت سودا ہر قسم کی شاعری پر قدرت رکھتے تھے۔ واقعی کون سی بات شاعری کے متعلق ایسی ہے جو حضرت کی کلیات میں نہیں ہے۔ اس مثنوی کے اشعار بھی حضرت کی بڑی اطلاع عام سے خبر دیتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت میر شکاری کے فن سے بھی پوری اطلاع رکھتے تھے۔ نادائق فن ہرگز اس خوب صورتی کے ساتھ ایسی مثنوی نہیں لکھ سکتا ہے حضرت سودا نے اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ شاعر کو ہمہ دان ہونا چاہئے حقیقت حال بھی یہی ہے کہ اصناف شاعری پر قادر ہونے کے لیے اطلاع عام کی بڑی ضرورت ہے۔ میری دانست میں حضرت سودا اطلاع عام کے اعتبار سے ہندوستان میں اپنے جواب آپ ہیں۔ جیسا کہ شکسپیر انگلستان میں ذیل میں کچھ اشعار اس مثنوی کے بدیہ ناظرین ہوتے ہیں۔

آہ دوا دلا زدرست روزگار      قوش خانوں میں یہ غم ہے آشکار  
سر سے ہر یک باز نے سپٹکی کلاہ      رخت ہر شاہین نے پہنا سیاہ  
رہو گئے جردوں کے دل غم سے دویم      باشہ دباشین و شکری بھی یتیم

ترمی کیا کوئی کیا کیا باسرا  
 صیدا گر چاہیں کریں پڈری کے تیں  
 آہ کت پوچھو اب اسکا سبب  
 مرزا فیضو کی چپک مرگئی  
 کس قدر ہے آسمان بے امتیاز  
 وضع دوران سخت نا انصاف ہے  
 مرزا غم گین ہوں چڑیاں شاد ہوں  
 دیکھ تو سارو کو کیا خرسند ہے  
 ہائے کیا تیر کے گھر شاہی ہے آج  
 کبک کیا کیا مارتی ہے تمقبے  
 ہائے وہ مرزا کہ جس کا سن کے نام  
 سو کیا فلک نے اس کو یوں ذلیل  
 جب نکلتے گھر سے وہ بازار کو  
 دیکھ کر ان کے تیں نیے تمام  
 ان سے یہ کہتے اگر منظور و ہرم  
 مت چھوڑاؤ بھت کیوں کے جانور  
 بیج دد جلدی نہو ایسا کہیں  
 اس سخن کو جس گھڑی سنتے تھے وہ  
 یہ تو بنیے کیا ہیں کئی ایک روز میں  
 جب سے مرزا ہو گیا اس کا یقین  
 ایک بیک ان سے زمانہ پھر گیا  
 پنجوں میں اتنی بھی گیرائی نہیں  
 کیا کہوں یار د میں تم سے ہے غضب  
 خوش خانے جگ کے دیران کر گئی  
 آہ کیا مارا ہے اس نے شاہ باز  
 دیکھو یارو یہ کیا انصاف ہے  
 گھونسلے چہیوں کے یوں آباد ہوں  
 ڈھڈھو کو اس سے خوشی وہ چند ہے  
 سبرک غوغائی کے گھر آیا ہے راج  
 کیسی دہیر کر رہی ہے چھپے  
 اب ہو سب مرغ کا زہرہ تمام  
 مرتے ہی چپک کے بگڑا ہے یہ نیل  
 تیز کرتے داں چھری کی دھار کو  
 بند کر آنکھوں کو کہتے رام رام  
 ہے تمہیں اور دھرم کی اپنی ہی شرم  
 جتنے ہوں پیسے انھوں کے جمع کر  
 کھو لو نہیں پتو اسے چپک کے تیں  
 وہیں کہتے تھے کہ جو چاہو سولو  
 راجو تانہ سے آئیں رشوتیں  
 ایک خر مہرہ کوئی دیتا نہیں

ذیل میں ایک حکایت منظوم بھی اس شاعر گرامی کی داخل کر دی جاتی ہے۔ یہ ترکیب حضرت  
 سعدی کی بوستان کی ہے۔ اگر حضرت سودا نے اس صنف شاعری کی طرف توجہ فرمائی ہوتی تو  
 اردو میں ایک کتاب بوستان کا جواب ہوتی۔



## حکایت

سنا ہے کہ اک مرد اہل طریق  
 صفت سے تواضع کی موصوف تھا  
 غرض چاہیے آدمی میں جو چیز  
 قضا کار مجلس میں ہوتا کہیں  
 کسی نے کیا اس سے اک دن سوال  
 جو ہلتے ہیں ہمک ہاتھ کے ہوئے کام  
 کہا راستی ہے جو تم نے کہا  
 پس ہمت کے نزدیک ہے کیا بھلا  
 غرض جتنے گزرے ہیں اہل کمال  
 تو کز محنت دیگران بے غمتی  
 نہایت ہی واقع ہوا تھا خلیق  
 کریمی کے عالم میں معروف تھا  
 رکھے تھا سبھی خوبیاں وہ عزیز  
 اڑاتا نہ منہ سے گس کے تئیں  
 کہ اس وضع سے کیا ہے تیرا مال  
 تو حاصل اٹھانے سے تکلیف نام  
 دلے اس سے یہ ہے مراد دعا  
 کہ میں اور پر مالوں اپنی بلا  
 ہر اک کا سمجھتے تھے اپنا ساحل  
 شاید کہ نامت نہ ہند آدمی

## مثلث و مخمس

یہ دونوں تضمینیں ہیں عام اس سے کہ شاعر خود اپنے کلام یا کسی دوسرے شاعر کے کلام پر  
 تضمین کرے مثلث عبارت ہے تین مصراعوں سے جس میں اول مصراع تضمین کا ہوتا ہے اس طرح  
 مخمس مراد ہے پانچ مصراعوں سے جس میں تین مصرعے تضمین کے ہوا کرتے ہیں یہ عروضی ترکیب مثلث  
 اور مخمس کی ہے مگر نفس شاعری کے اعتبار سے مثلث اور مخمس کو ایسا ہونا چاہیے کہ تضمین  
 کے مصرعے اہل مصراعوں سے ایسے دست و گریباں ہوں کہ سر مو بھی ان کے آپس میں کوئی امتیازی  
 امر لاحق نہ ہو۔ یعنی تینوں یا پانچوں مصراعوں میں ایسی چسپانی پیدا ہو کہ اہل مصراعوں سے تضمین  
 کے مصرعے نام کو بھی جدا نہ معلوم ہوں۔

اکثر غزلوں پر تضمین کی جاتی ہے مگر مثلث کے اعتبار سے مخمس تضمین زیادہ دیکھی جاتی ہے  
 سلاموں کی بھی تضمین ہوتی ہے اور زیادہ مخمس ہی ہوتی ہے۔



## تضمین فارسی

ذیل میں حضرت حافظ علیہ الرحمہ کی ایک غزل کا خمیہ عرض ہوتا ہے:-  
 ہر کسے رادر دروں خلوت دل را نیست      ہر گدائے لائق قرب جوارش اہ نیست  
 حق شناسی کار ہر بد طینت گمراہ نیست      ناہ ظاہر پرست از حال آگاہ نیست  
 در حق ما ہر چہ گوید جلّے بیچ اگر اہ نیست  
 ایک مارا دست مطلب خالی از ہر مدعاست      دوش ہمت عاری از انداز و شال و قباست  
 بندہ پروردگار الہا از تو نا لیدن خطا است      ہر چہ بہت از قامت ناما زوج اندازا است  
 ورنہ تشریف تو بر بالائے کس کوتاہ نیست  
 جاہلان و فکر شرب شاہد و نقل و شراب      آنکہ دانا سینہ بریاں و بگر خون دل کباب  
 فاش گویم برملہ گو جسم باشد یا صواب      صاحب دیوان ما گویا یسند اند حساب  
 کاندیں طغرا نشانے جتہ للہ نیست  
 از حریف جملہ گر غافل کجا خواہیم ماند      گرچہ با ما مہرہ ہا بر تخته حیلست نشانند  
 اسپ مارا پیل دولت کے جلو خواہد ستاند      تاچہ بازی رخ نماید سیرتی خواہیم راند  
 عرصہ شطرنج رندا نما مجال شاہ نیست

یہ مصرعے جناب حضرت سید شاہ عبدالودود صاحب کے ہیں۔ آپ کا شیراز وطن ہے۔ ترک دنیا کر کے  
 ۱۸۶۵ء میں اپنے دیس سے ہندوستان میں تشریف لائے پٹنہ میں ۲۳ برس تک قیام پذیر رہے۔  
 بہت ذی علم اور ظاہراً صوفی مشرب تھے۔ فقر کی ساری باتیں ان کی ذات با برکات میں موجود تھیں۔  
 کیا اگر ہونے کا شبہ ان پر لوگ کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ کسی شخص نے انہیں دنیاوی غرض سے مسموم  
 کر ڈالا۔ وقت رحلت ان کی عمر ۹۶ برس کی تھی۔ نور اللہ مرقدہ۔

## تضمین غزل مرزا فاخر میں از مرزا رفیع سودا

ماخانہ کس بہر مدارات نہ رفتیم      جائے بے گزرانندن اوقات نہ رفتیم  
 این ننگ بخود کردن اثبات نہ رفتیم      در دیر و حرم بہر مناجات نہ رفتیم  
 جز کوئے توائے قبلہ حاجات نہ رفتیم



بستیم اگر بہر طواف جسم احرام      ما تو بہ نکر دیم وجے از مے گلفام  
در میکدہ چوں ساختہ زنداں مرا بدنام      صد بار گرفتیم رہ کعبہ و یک گام  
بے مصلحت پسر خرابات نرفتیم

اں شوخ ازاں روز کہ باماشدہ باغی      داریم دل غمزہ چوں بلبل باغی  
کو خسری عید دریں سینہ داغی      صد عید شد و رفت در آشفته داغی  
برگز بہ کسے مہر ملاقات نرفتیم

جستیم بہ آفاق ہمدردئے زمیں را      دیدیم بزر فلک استاد خزیں را  
بر خاک درش رفتہ بسائیم جبیں را      اشعار شنیدیم و ندیدیم مکیں را  
مشغول صفائیم و پے ذات نرفتیم

## تضمین اُردو

اردو میں غزلوں اور سلاموں پر زیادہ تضمینیں دیکھی جاتی ہیں اردو غزلوں اور سلاموں کے علاوہ فارسی غزلوں اور سلاموں پر بھی اردو تضمینیں پائی جاتی ہیں ذیل میں کچھ اردو تضمینیں شکلِ مثلث و منس ہدیہ ناظرین ہوتی ہیں۔

## مثلث اُردو

یہ مثلث میر پرورش علی مرحوم کا ہے۔ آپ کرا مانک پور علاقہ فتحپور ہسوا کے ساکن تھے۔ سخی نخلص فرماتے تھے۔ آپ کا زمانہ اور خواجہ آتش کا زمانہ ایک تھا۔ استاد مصحفی کے تقاضا سے شعر گوئی کا شغل شروع کیا تھا۔ صاحب دیوان ہیں۔ مگر آخر عمر میں نوحے اور سلام کہا کرتے تھے موسیقی میں پورا دخل رکھتے تھے۔ بے انتہا خوش آواز بھی تھے۔ اکثر پوربی زبان میں پانی۔ یعنی نامے تصنیف کر کے بڑی خوش الحانی سے پڑھتے تھے اور رویا کرتے تھے آپ سادات کرام سے تھے اور مولوی وحید صاحب الہ آبادی کے چچا ہوتے تھے۔ مولوی صاحب ممدوح بھی جن کا ذکر سابق میں آچکا ہے۔ سندھی سادات میں تھے۔ میر پرورش علی صاحب جس وقت پٹنہ میں تشریف لائے تھے۔ بن شریف ان کا انشی سے متجاوز تھا۔ آدمی بہت قد آور جسم اور وجیہ تھے۔ ایک قطعہ آپ کا سابق میں درج ہذا ہو چکا ہے۔ اب ذیل میں آپ نے جو غزل کو مثلث فرمایا ہے۔ یہ بھی

نذر ناظرین ہوتا ہے:-

مثال شمع ہم ثابت قدم ہیں سرکاتے ہیں مزا کیا ضربت شمشیر قاتل کا اٹھاتے ہیں  
 شہادت کی جو ہم کو بھوکھ ہے تلوار کھاتے ہیں  
 وہاں سے قاصد آتا ہے کہ عزرائیل آتے ہیں بڑا اندیشہ ہے دیکھیں کہ ہر قدرت میں جاتے ہیں  
 خدا پہلے بلاتا ہے کہ وہ پہلے بلاتے ہیں  
 کسی دن مہربانی اور عنایت پر جو آتے ہیں یہ فرماتے ہوئے کوٹھے سے وہ جلوہ دکھاتے ہیں  
 کلیجہ انتقام لو کھر کی کا پردہ ہم اٹھاتے ہیں  
 تعالیٰ شانہ کیا دقت ہے اور کیا زنا ہے عجب سی ناشی کا الٹا پلٹا کارخانہ ہے  
 ہمیں روٹھے ہیں ان سے اور میں اکونٹاتے ہیں  
 ذرا سننا کہ میرا ماجرا سننے کے قابل ہے جہاں تھا بیٹھا شکل وہاں سے اٹھنا مشکل ہے  
 کہ پاؤں کے انگوٹھے سے مراد امن ہلاتے ہیں  
 مزا تھی بے تحاشا جو زمین پر منہ کے بل آئے ابھی روکا تھا اشکوں کو مگر باہر نکل آئے  
 یہ لڑکے کیا کسی کی بات کچھ خلط میں لاتے ہیں  
 یہ کوئی بات ہے اپنی نگاہوں میں سمائے گا فلک کیا چودھویں کا چاند تو ہو کہو دکھائے گا  
 ہم ایسے طشت میں تو اک حسین کا منہ دھلاتے ہیں  
 کریں اہل زمین تدبیر کچھ اپنے مکانوں کی فرشتوں سے کہو اب خیر مانگیں آسمانوں کی  
 وہ نالے کرتا ہوں جو عرش کے پائے ہلاتے ہیں  
 کوئی پوچھے تو ان سے اسیں کچھ میرا بھی ہے مقصد سنی ہے میدا ہو کے لیے کس شوخ کی آمد  
 سنی جو خار بے دشت پر آنکھیں بچھلاتے ہیں

اردو میں غزل حافظ شیراز کی نچیں

عادل گل روئے تو گل غدار انند امیر دام بلائے تو دل شکار انند  
 غبار راہ دفائے تو شہسوار انند غلام نرگس مست تو تاجدار انند  
 خراب بادۂ لعل تو ہوشیار انند



ہمارے منظر تھے بہت نشیب و فراز      نہ کوئی واقف اسرار تھا نہ محرم راز  
یہ کیا کریں کہ یہ ہے اقتضائے راز و نیاز      ترا حیا و مرا آبدیدہ شد غماز  
وگر نہ عاشق و معشوق راز دار      انہ

خوام ناز سے پامال ہے جہاں یکسر      ہے عاشقوں کا ترے ساتھ ساتھ اک لشکر  
ولے نہیں تجھے احوال پر کسی کے نظر      ز زیر زلف دو تاپوں نگہ کنی بنگر  
کہ درمیں و بسات چہ بے قرار      انہ

کہے ہے ہیر مغاں دیکھنا یہ رنگ سخن      ہے تازہ تو ابھی یاد کر شراب کہن  
بکے ہے تیرہ دروں داعظا کی بات سن      بیاہ میکہدہ و چہرہ ارغوانی کن  
مرو بضمومہ کا بخاسیاہ کارا      انہ

سیاہ پوش ہے اک خلق اک جہاں غمگین      وہ کون ہے کہ پریشاں و خستہ حال نہیں  
ہمارے کہنے کا تجھ کو اگر نہ آئے یقین      گزار کن چو صبا بر بنفشہ زار وہ بین  
کہ از تطاول زلفت چہ ہو گوارا      انہ

ہیں امید رہائی نہ آرزوئے خلاص      نہ عادت تک دو دہنے نہ جستجو ہے خلاص  
ہے ناگوار بہت جی کو گفتگوئے خلاص      ز دام زلفت تو دل را مہلے روتے خلاص  
کہ بستگان کنند تو رستگار      انہ

ہے سر پہ خاک کلمہ گرد ہے لباس بدن      کہ دورت دل غمگین عبیر پیرا ہن  
غبار فرق سے آئینہ جبیں روشن      ز نقش چہرہ حافظ ہی توازن دیدن  
کہ ساکنان درد دست خاکسارا      انہ

یہ خمیس استاد مومن خاں کی ہے۔ حافظ علیہ الرحمہ کے شعروں پر اردو کے مصرعے لگائے ہیں مطلع میں  
فارسی کی تشمین سے چارہ نہ تنہا۔

## تخمیس غزل رند از رند

جسے کہ یاد نہ ہوا اپنا آشتیاں صیاد      بھلا وہ خاک کہے حال بوستاں صیاد  
عبث عبث تو ہو مجھ سے بدگماں صیاد      کھل ہے کنج قفس میں مری زباں صیاد  
میں اجرائے چمن کیا کردوں بیان صیاد

خواب تھا مرے ہمراہ سایہ سادون صیاد      چمن میں تھا کبھی بن میں رداں دواں صیاد  
غرض کے ساتھ ہی پہنچا جہاں تہاں صیاد      جہاں گیا میں گیا دام لے کے واں صیاد  
پھر اتلاں میں میری کہاں کہاں صیاد

پتنگ کر دیا دنیا کے کارخانے نے      بٹھایا خاک مذلت پہ سراٹھانے نے  
پھنسیا لا کے کہاں حیف اٹانے نے      دکھایا کج قفس مجھ کو آب و دانے نے  
وگرنہ دام کہاں میں کہاں کہاں صیاد

کچھ اور مجھ کو شکایت نہیں ہے یہ گلا      بہار کیا کہ خزاں میں چھوڑا اک تنکا  
عبث یہ اوسم ایجاد کیوں غضب توڑا      اجاڑا موسم گل ہی میں آئیاں میرا  
ابھی ٹوٹ پڑے تجھ پر آسماں صیاد

بیان کر نہیں سکتا جو میری حالت ہے      حواس باختہ ہوں مجھ پر اک مصیبت ہے  
ابھی ہوں تازہ گرفتار زور و حشت ہے      عجیب قصہ ہے دلچپ اک حکایت ہے  
سناؤں گا گل و بلبل کی داستاں صیاد

کلام کرتا ہے وہ دلو جو خوش آتا ہے      حکایت گل و بلبل مجھے سناتا ہے  
ہر اک بات میں سو سو طرح بھاتا ہے      اداس دیکھ کے مجھ کو چن دکھاتا ہے  
کئی برس میں ہوا ہے مزاج داں صیاد

خدا گواہ ہے تعریف ہو نہیں سکتی      زیادہ گھر سے ہے راحت مجھے قفس میں بھی  
کب اس کی ذات سے اتنی مجھے توقع تھی      عزیز رکھتا ہے کرتا ہے خاطر میں میری  
ملا ہے خوبی قسمت سے قدر داں صیاد

میں اس کے دام میں آنا نہ زینہا لے بند      یہ کشمکش نہ اٹھاتا میں زینہا اے رند  
کبھی قریب نہ جاتا میں زینہا اے رند      فریبِ دانہ نہ کھاتا میں زینہا اے رند  
نہ کرتا دام اگر خاک میں نہاں صیاد

حضرت رند نے خود اپنی غزل کی تضمین حسب ارشاد امجد علی شاہ بہادر مرحوم کی ہے۔

میر تقی میر کی غزل کی تخمیں

میری دشت کا جو کچھ حال سنا میرے بعد      ہو گیا جوش جنوں حد سے سوا میرے بعد



سونا جنگل جو نظر اس کو پڑا میرے بعد آکے سجادہ نشین تیس ہوا میرے بعد

نہ رہی دشت میں خالی مری جا میرے بعد

باغ عالم میں وہ بلبل ہوں کہ ہوں جان چین میں نہ ہوں گا تو نہ ہوگا کوئی خواہان چین

پھاڑ ڈالیں گے گریباں کو جو اناں چین منہ پہ رکھ دامن گل روئیں گے مرغان چین

ہر روش خاک اڑائے گی صبا میرے بعد

کیا کہوں اس سے کہ وہ تو ہے نہایت کسن یاد کا ہے کوہیں گے اسے طفلی کے دن

سب پہ ظاہر کیے دیا ہوں میں حال باطن اب تو منس منس کے لگاتا ہے مہندی لیکن

خون رلائے گا اسے رنگ خا میرے بعد

سنسناہٹ سی اک اٹھتی ہے بدن میں ہر صبح جان آجاتی ہے گویا میرے تن میں ہر صبح

اے بھر کر یہی کہتا ہوں کفن میں ہر صبح وہ ہوا خواہ چن ہوں کہ چن میں ہر صبح

پہلے ہی جاتا تھا اور باد صبا میرے بعد

میں ہی دیوانہ اکیلا نہیں صحرا میں ہوں بعد میرے ابھی ہوتیں گے بہت سے مجھوں

کتنے تمہوں کا ابھی تجھے کو بہانا ہے خوں تیز رکھنا سر ہر خار کو اسے دشت جنوں

شاید آجائے کوئی آبلہ پا میرے بعد

مر گیا جبکہ امانت تو پھری کچھ تقدیر غم ہوا اس کو بہت ہو گئی حالت تغیر

جیتے جی تو نہ خبر لی نہ ذرا کی تدبیر بعد مرنے کے مری قبر پر آیا وہ میسر

یاد آئی مرے عیسیٰ کو دو میرے بعد

## محرم سلام فصیح از مونس رحمہما اللہ تعالیٰ

السلام اے گہر معدن عالی نبی السلام اے شمع گلشن والا حبی

السلام اے قمر برج رسول عربی السلام اے جگر فاطمہ وحبان نبی

انت مولائی ناند یک با می دانی

خسر و کون و مکان حق نے دیا تجھ کو لقب کس نے پایا ہے جہاں میں یہ حب و نسب

عابد و زاہد و محشوق خدا عاشق رب جگر شیر خدا حبان شہنشاہ عرب

فخر حمزہ مشرف ہاشمی و طبیبی

کٹ گیا دشت مصیبت میں گلستان نبی      چاک اس غم سے نہ کیونکر ہو گریبان نبی  
کس طرح ترنہ ہے اشکوں سے امان نبی      جان بقربان لب خشک تو اے جان نبی

پدرت زیب لب کو ثرو تو تشنہ لبی

لب زگیں ترے اے بادشہ عالی جود      رات دن جن پہ رہا ذکر خدا معبود  
داد ریغا ہوئے پیاس کی گرمی سے کبود      آہ آن سینہ کہ آغوش نبی جایش بود

پانہد شمر براں سینہ بایں بے ادبی

قبلہ خلق سمجھتے ہیں تجھے کعبہ پرست      عرش اعلیٰ بھی تیرے پایہ نعمت سے ہے پرست  
ایک دن وہ تھا کہ تھی دوش محمدیہ نشست      اس چہ حال است کہ در خاک منت عریاں است

کفن از خلد نیاورد رسول عربی

تیری توقیر سے آگاہ ہے دنیا ساری      ہے رسولان سلف سے ترا پلا بھاری  
تو نے سردے کے کیا دین کا سکہ جاری      اللہ اللہ کہ عجب تر بہ عالی داری

آنکہ با حمزہ شاہ شہدا ہم لقبی

کیا قیامت ہے کہ قبر نہیں ہوئے دفن لعین      رہ گئی لاش تری بے کفن اے سردردین  
تن نازک یہ ترا ہے غضب اور گرم زمین      مگر از حال تو آگاہ نشد روح الامین

مہد جنبان تو مے بود در ایام صبی

دل لرز جائیں جدھر ہو تری آواز بلند      سن کے تقریر تری نطق نصیحوں کے ہوں بند  
اے شہنشاہ زماں چھیر کے میدان میں سمد      رجز از بہر چہ خوانی ہمہ کس میدان بند

خسرو ملک حجازی شہ والا حسبی

چاہتا تو جو سپاہ ستم آرا کی شکست      جتنے سرکش تھے وہ اک آن میں ہو جائے پرست  
لائے شک اور نہ کچھ دل میں کوئی ظلم پرست      راز در سجدہ بزمیر دم خنجر اس است

مغفرت بہر غلاماں ز خدا می طلبی

کام لکھا تھا ترے نام پہ جو راز است      حق نے وہ ختم بھی پر کیا اے رحم پرست  
جانتے ہیں یہ وہی جوئے غناں سے ہی مت      بخشش امت عاصی دبت خو تو ہست

بہر آسائش امت تو بہ رنج و تعب

فیض پاتا ہے ترے در سے ہر اک حاجتمند      تیری ہر بات ہے اللہ و محمد کو پسند



مثل خورشید فلک بزم جہاں میں ہر چند چارہ نور بلاشبہ و شک یکساںند  
 توازاں ہاں گمراہے نور خدا منتجی  
 ہے بجا روح محمد جو ہو تجھ سے گلہ مند گوشہ قبر میں پہنچائے ہیں زہرا کو گزند  
 باغ فردوس ہے گھر جنکا وہ زندانی ہیں بند آل حسین بریں آل زیاد آزادانند  
 داداے چرخ جفا کار بایں بوا بعبی  
 چھوڑ مونس کی طرح الفت ذیائے قبیح درد رکھتا ہے تو مولے تجھے کر دیں گے صحیح  
 عرض کر چل کے تمنائے دلی ہمیش فرج قدر دان تو امام تو حسین است نصیح  
 بس چرا مطلب خود از دگراں می طلبی

## مدرس

عروضی ترکیب مدرس کی یہ ہوتی ہے کہ ایک بند چھ مصرعوں کا ہوتا ہے۔ چار مصرعے تو ایک ہی قافیہ رکھتے ہیں مگر آخر کے دو مصرعے جو ٹیپ کے مصرعے کہلاتے ہیں پہلے چار مصرعوں سے علیحدہ قافیہ رکھتے ہیں اردو میں اس عروضی ترکیب کی پابندی کے ساتھ تین قسموں کی شاعریاں برقی جاتی ہیں۔ وہ یہ ہیں۔

- (۱) واسوخت۔ جیسے واسوخت امانت۔ واسوخت مومن وغیرہ وغیرہ
- (۲) مدرس حکمت آموز۔ جیسے مدرس کریما۔ مدرس حالی مدظلہ وغیرہ وغیرہ
- (۳) مرانی حال۔ جیسے مرثیہ ہائے میر ضمیر و مرزا داگیر و مرزا انیس و مرزا دبیر و میر مونس وغیرہ وغیرہ

واضح ہو کہ فارسی میں یہ قسمیں شاعری کی اس عروضی ترکیب کے ساتھ کمتر دیکھی جاتی ہیں اور اگر ہیں تو حسب مراد تصنیفین راقم الحروف کے نظر سے نہیں گزری ہیں۔ اس لیے فارسی کی کوئی ایسی تصنیف درج ہذا نہیں کی جاتی ہے۔ اب حضرات ناظرین صرف اردو کی مدرس نگاریوں پر نظر توجہ فرمائیے۔

## نمبر ۱۔ واسوخت

یہ ایک عاشقانہ رنگ شاعری کا ہے۔ اور مسلسل طور پر غزل سے زیادہ اس میں موقع

جذبات قلبیہ اور واردات ذہنیہ کی بندش کا حاصل ہے۔ مگر افسوس ہے کہ کوئی واسوخت آج تک حسبِ مراد تصنیف نہیں ہوا ہے اس وقت تک جتنے واسوخت اردو میں لکھے جاتے ہیں نہایت پوچ خیالات سے بھرے ہوئے نظر آتے ہیں بلکہ اس قدر بے ربط خلافِ فطرت اور پست مضمون ہیں کہ طبیعت ان کے پڑھنے سے گریز کرتی ہے۔ ایسے واسوخت کسی تعلیم یافتہ خوش مذاق شریف طبیعت پاک طینت شخص کو پسند نہیں آ سکتے۔ ایسے واسوخت کے وہی حضرات قدر دان ہو سکتے ہیں جن کے دل و دماغ خیالات فاسد سے خراب ہو رہے ہیں حقیقت یہ ہے کہ اگر عشق کی تفسیح کی سیر کسی کو دیکھنا ہو تو اردو کے واسوختوں کو دیکھے فقیر کی دانست میں اردو کا جو بہترین واسوخت سمجھا جاتا ہے وہ عشق کی تفسیح کا بڑا سے بڑا کارنامہ ہے جس واسوخت کو دیکھے اس میں عشق تمام تر فسق کے پیرایہ میں دکھلایا گیا ہے۔ واسوخت میں عموماً اسی طرح کے مضامین باندھے جاتے ہیں جو قابلِ اعادہ متصور نہیں ہیں مگر مثلاً اصلاح مذاق کے خیال سے درج ذیل ہوتے ہیں۔

پہلے شاعر صاحب اپنے ایسے زمانہ کو بیان فرماتے ہیں کہ جب انھیں عشق سے سروکار نہ تھا۔ عشق کے نام سے انھیں وحشت ہوتی تھی مگر ان کا ایک دوست تھا۔ جو بتلائے عشق ہو رہا تھا۔ اس سے شاعر صاحب نے پوچھا تو جو عاشق ہے تو یہ بتا کہ عشق کیا چیز ہے۔ دوست صاحب نے فرمایا کہ نہایت تعجب کی بات ہے کہ تو نے کبھی کسی کو نہیں دیا شربت وصل نہیں پیا۔ کسی سے ہم بغل نہیں ہوا۔ لذت بوس و کنار سے واقف نہیں ہوا۔ اپنے دوست سے ایسی تقریر سن کر شاعر صاحب کے دل میں عشق جگہ کر گیا۔ اسی کا سودا پیدا ہو گیا کہ عشق کرنے کے واسطے کسی خوب صورت کو ڈھونڈ نکالے۔ اب ہر جمع میں شاعر صاحب تلاش معشوق کی نظر سے جانے لگے۔ کہاں گئے کہاں گئے۔ آخر ایک معشوق نظر آ گیا۔ اب اس کے وصل کی فکر میں اس کے کوچہ میں روز جانے لگے۔ اس کے دروازے کے سامنے کھڑے ہونے لگے پھر اشارہ بازی شروع کی پھر اس سے اس کے گھر کے اندر جانے کی تمنا دکھلائی۔ وہ معشوق بھی چونکہ کسی اصول زندگی کا پابند نہ تھا اس نے شاعر صاحب کو اندر گھر کے بلا لیا۔ گھر کے اندر کچھ بے سرو پا گفتگو آپس میں ہوتی گئی۔ اس روز سے عاشق و معشوق ساتھ رہنے لگے۔ شاعر صاحب نے اپنے معشوق کو معاشرت کے طریقے بتلائے۔ لباس و آرائش کے ڈھنگ سکھلائے۔ جب کچھ روز اس طرز پر گزرے اور شاعر صاحب کی عیش سے گزرنے لگی۔ تو ان کے معشوق نے پہلے پوشیدہ



طور سے پھر کھلے ڈلے رنگ پر اغیار کے گھر جانا شروع کیا۔ ایسے معشوق سے اور کیا چیز کی اُمید ہو سکتی تھی۔ ایسا معشوق ایسا نہیں کرتا تو کیا کرتا۔ بہر حال بیچارے شاعر صاحب نے اس آوارہ مزاج معشوق کو بہت کچھ سمجھایا۔ اپنے احسانات بتائے۔ ذکر احسانات میں بھی فرمایا کہ تو فن معاشرت سے بالکل بے بہرہ تھا۔ تجھ کو لباس پہننا نہیں آتا تھا۔ چوٹی کنگھی کے طریقہ سے تو کچھ بھی واقف نہ تھا۔ تجھے مٹی لگانا نہیں آتی تھی۔ گفتگو کا طریقہ تجھے کچھ نہیں معلوم تھا۔ یہ سب کمالات تجھ میں میری بدولت پیدا ہوئے۔ جب تو سب کچھ مجھ سے سیکھ چکا تو اب میرے پاس نہیں رہتا ہے۔ دس دس روزوں تک غیروں میں پڑا رہتا ہے۔ خیر شاگرد احسان فراموش کب استاد کی سُننا۔ بیچارے شاعر کی فہمائشیں کچھ کارگر نہیں ہوتیں۔ اور وہ آوارہ مزاج معشوق مبتلائے بد حالی رہا۔ تب شاعر صاحب نے ایک اور معشوق پیدا کیا۔ جس کے ساتھ شب و روز صحبت گرم رکھنے کے لیے پھر حضرت نے معشوق سابق کو اپنے اس نئے معشوق کی خبر کی۔ اور اس کے کمالات صوری و معنوی اس پر یعنی معشوق سابق پر ایک بیان طولانی کے ساتھ ظاہر کیے۔ اس سے معشوق سابق کے دل میں رقابت کی آگ جو اٹھی دوڑ کر شاعر صاحب کے گلے لگ گیا اور پوچھنے لگا کہ واقعی تم نے کوئی نیا معشوق پیدا کیا ہے۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ اب تم سے میں انحراف درزی نہ کروں گا۔ جب وہ قسم کھا چکا تو شاعر صاحب نے بھی قسم کھائی۔ کہ صرف تجھ کو چھیرنے کے لیے معشوق کا قصہ گڑھا تھا۔ اس روز سے معشوق سابق کے ساتھ شاعر صاحب کی پھر عیش سے گزرنے لگی۔

حضرات اہل مذاق میری اس سمیع خسرانی کو معاف فرمائیں۔ ظاہر ہے کہ سارا قصہ بالا طو مار خسرافات ہے۔ اس کے جتنے مضامین ہیں غیر فطری مہل اور ناپاک ہیں۔ اگر اسی کا نام داسوخت نگاری ہے تو ایسی شاعری پر سو سو نفرین حضرات شاعری کوئی بے کاری نہیں ہے اس سے دنیا اور دین دونوں کو نفع پہنچ سکتا ہے یہ کون سی شاعری ہے جس سے نہ دنیا کا فائدہ حاصل ہو نہ دین کا۔ یہ شاعری کیا ہے۔ یہ تو ادب باشی کا ہدایت نامہ ہے۔ ادب باش سے ادب باش شخص اور کیا کر سکتا ہے تعجب ہے ان اشخاص سے جو ایسے داسوخت ذوق شوق سے پڑھتے ہیں۔ اور ایسی زبان سسرایوں کو شاعری سمجھتے ہیں۔ جب خدائے تعالیٰ کسی قوم پر ادب نازل کرتا ہے تو پہلے اس کے اخلاقی انداز خراب ہو جاتے ہیں۔ ایسی شاعریاں معاذ اللہ قوم کے کس و فوراً بت ذال سے خبر دیتی ہیں۔ ارحمتنا یا ارحم الراحمین۔ اگر کاش صحت مذاق کے

ساتھ کوئی داسوخت لکھا گیا ہوتا تو اردو میں عاشقانہ شاعری کا عجب تماشا نظر آتا۔ چوں کہ غزل کے اعتبار سے داسوخت کا دائرہ وسیع تر ہے اس میں جذباتی مضامین زیادہ گنجائش کے ساتھ جگہ پاسکتے ہیں۔ اگر شعرائے حال غیر فطری مہل اور ناپاک مضامین سے بچ کر داسوخت نگاری مذاق صحیح کے ساتھ فرادیں تو اردو کی شاعری بڑی ترقی مقصور ہے۔ یہ میدان حضرت شعرائے باکمال کی توجہ کے قابل ہے۔ داخلی (SUBJECTIVE) شاعری غزل سرائی کے اعتبار سے داسوخت نگاری کے طریقہ پر زیادہ وسعت کے ساتھ برتی جاسکتی ہے۔

## نمبر ۲۔ مسدس حکمت آموز

اس عروضی ترکیب کے ساتھ دو تصنفین بہت قابل توجہ ہیں۔ ایک تو مسدس کریا اور دوسرا مسدس حالی۔ کریا برائے خود شیخ سعدی کی ایک لاجواب تصنیف ہے۔ اس کے اشعار کی تصنیف جو نظیر اکبر آبادی سے ہے مضامین کے اعتبار سے اچھی ہے۔ اچھے شعر کا یہی تقاضا ہے کہ اس کی تصنیف بھی اچھی ہو۔

راقم الحروف کی دانست میں ہر شخص کو چاہیے کہ ایک بار نظیر کے اس مسدس کو پڑھ لے اور لوگوں کو ضرور پڑھائے۔ کریا کے پہلے شعر کی تصنیف جو اس فطری مشاعر کے افکار سے ہے۔ درج ذیل ہوتی ہے۔

حسد دل سے اے مومن پاکباز وضو کر کے پڑھ پنج وقتی نماز

بوقت مناجات با صد نیاز تو کہہ اپنے ہاتھوں کو کر کے دراز

کریا بہ بخشائے بر حال ما

کہ ہستم اسیر کمند ہوا

جس وقت میں تصنیف بالا کو پڑھتا ہوں تو مجھے وہ زمانہ یاد آتا ہے کہ جب مسلمانوں میں نماز ایک ضروری فرض خداوندی سمجھی جاتی تھی۔ اور بے نماز کو پیرواں اسلام گمراہ اور قابل احتراز سمجھتے تھے۔ اور اب وہ زمانہ آگیا ہے کہ نماز گزار ذلیل اور بے وقوف سمجھا جاتا ہے۔ یورپین تعلیم کا یہی تقاضا ہے کہ نماز، روزہ، حج، خمس اور زکوٰۃ کو نئی روشنی والا۔ یعنی نفل سمجھتے ہیں کہ کوئی تعجب کی بات نہیں اس لیے کہ یورپین تعلیم کا وہی اثر یورپین عیسائیوں پر ہوتا ہے جو مسلمانوں پر ہوتا ہے یعنی یورپین عیسائی کی عیسائیت بھی اسی قدر ضعیف ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ یورپین تعلیم سے



مسلمانوں کے اسلام میں ضعف آجاتا ہے میں اس جگہ مسلمانان ہند کی نسبت عرض کر رہا ہوں کہ ترک و ایران کے مسلمان سو میں ایک ہی دو ایسے نظر آتے ہیں جو پنج وقتی نماز کے پابند ہیں۔ ورنہ پنج وقتی نماز تو درکنار عید کے نمازی بھی ایسے تعلیم یافتہ مسلمانوں میں قریب قریب ندارد ہیں۔ یورپین تعلیم جو عیسائی اور مسلمان دونوں کو اپنے اپنے مذہب میں ضعیف کر دیتی ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ یہ تعلیم خس برابر روحانی انداز نہیں رکھتی ہے۔ یہ تعلیم سراسر ادیات سے تعلق رکھتی ہے۔ اس تعلیم کو معاد سے کوئی بحث ہی نہیں ہے۔ اس تعلیم کی غرض معاش ہی معاش ہے تعجب ہے کہ اس نقصان عظیم پر بھی یہ تعلیم بنی آدم کے لیے مفید سمجھی جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انبائے زمانہ کے نزدیک انسان بے روح بنا ہے۔ اور جب بے روح اس کی خلقت واقع ہوتی ہے تو اس کو روحانی تعلیم کی حاجت ہے۔ میری دانست میں تمام یورپ کی حالت قابل گریہ ہے کہ کہاں حضرت مسیح۔ اپنی دنیا طلب امت پر فوہ کیوں نہیں فرماتے۔ کہاں اس جناب کی روحانی تعلیمات اور کہاں آپ کی امت کے تعلقات مادی سے بہیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا۔

اے نوجوان مسلمانوں تم بالیقین جانو کہ تمہاری تعلیم کی غایت میز کرسی چھری کا نام کوٹ پتلون نہیں ہے۔ افسوس ہے کہ تم اپنے روحانی معاملات سے غافل بن بیٹھے ہو۔ تم کو یاد رکھنا چاہیے کہ تم کو دنیا اور دین دونوں سے یکساں تعلق ہے۔ صرف دنیا کے ہو رہنا پڑے بڑے خسارے کی بات ہے۔ فرائض خدا مندی کی پابندی ایک ضرور امر ہے۔ مردا خسرین مبارک بندہ است۔ دوسرا حکمت آموز مسدس شمس العلماء مولانا حالی مدظلہ کا ہے۔ یہ مسدس مسلمانوں کے سابق اور موجودہ حالات کی تصویر ہے اور غرض اس تصنیف کی یہ ہے کہ مسلمانان حال جو بتلائے بد حالی میں ترقیوں کی راہیں اختیار کریں جس سے دنیا کی سربر آوردہ قوموں کی طرح ان کو بھی خوش حالی نصیب ہو۔ مسدس نامطبوع رنگینوں سے نامتراپک ہے اور حقیقت حال یہ ہے کہ مولانا حالی کے سوا کوئی دوسرا شاعر ایسا مسدس لکھ بھی نہیں سکتا تھا ایسے مسدس کے لکھنے کے واسطے شاعر کو تاریخ معاملات سے پورے طور پر باخبر ہونا ضرور ہے۔ علاوہ اس کے اس کو مبالغہ تشبیہ استعارہ وغیرہ کی طرف فطری طور پر کم میلان ہونا چاہیے واقعی یہ مسدس ایک ابلی کچھڑی اور بے مہرچ سالن ہے اور ایسا ہی ہے کہ ہر کچی بریان اور مرغ مسلم پکانے والے طعام پر سے پک نہیں سکتا۔ میں اطمینان کے ساتھ عرض کر سکتا ہوں کہ میر ہونن غالب

آتش اور دیگر رنگین طبع شعرا ہرگز ایسی سدس نگاری پر قادر نہیں ہو سکتے تھے۔ ان کے اعلیٰ رنگین مزاجی ایسی سادہ تصنیف پر ان کو نہیں قادر ہونے دے سکتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر کارے و ہر مردے.. ی طرح مولانا حالی ہرگز اساتذہ بالا کے مقابلہ میں غزل سرائی کے میدان میں گونے سبقت لے جانا چاہتے۔ تو ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔ جیسا کہ میرے اس بیان کی تائید خود مولانا کا دیوان کرتا ہے۔

ذیل میں کچھ بند سدس حالی کے نذر ناظرین ہوتے ہیں۔

### بیان ملک عرب و بعثت آل صلعم

عرب جس کا مذکور ہے یہ وہ کیا تھا جہاں سے الگ اک جزیرہ نکلتا تھا  
زمانہ جس سے پیوند اس کا جدا تھا نہ کشورِ ستاں تھا نہ کشورِ کشتا تھا

تمدن کا اُس پر پڑا تھا نہ سایا

ترقی کا تھا داں قدم تک نہ آیا

نہ آب و ہوا ایسی تھی روح پرور کہ قابل ہی پیدا ہوں خود جس سے جوہر  
نہ کچھ ایسے سامان تھے داں میر کنول جس سے کھل جائیں دل کے سرسبز

نہ بہرہ تھا صحرائیں پیدا نہ پانی

بدقت بسر ہوتی تھی زندگانی

زمین سنگلاخ اور ہوا آتش فشاں لوؤں کی لپٹ باد صحر کے طوفان

پہاڑ اور ٹیلے سراب اور بیابان کھجوروں کے جھنڈ اور خار منیلاں

نہ صحرائیں غلہ نہ جنگل میں کھیتی

عرب اور کل کائنات اس کی یہ تھی

نہ واں مصر کی روشنی جلوہ گر تھی نہ یونان کے علم و فن کی خبر تھی

وہی اپنی فطرت پر طبع بشر تھی خدا کی زمین بن حتیٰ سر بسر تھی

پہاڑ اور صحرائیں ڈیرا تھا سب کا

تلے آسمان کے بسیرا تھا سب کا



کہیں آگ بجتی تھی واں بے حجابا      کہیں تھا کو اک پرستی کا چہرچا  
 بہت سے تھے تھلیٹ پڑل سے شیدا      بتوں کا عمل سوسو جابجا تھا  
 کرشموں کا راہب کے تھا صید کوئی  
 طلسموں میں کاہن کے تھا قید کوئی  
 وہ دنیا میں گھر سب پہلا خدا کا      خلیل ایک معمار تھا جس بنا کا  
 ازل میں مشیت نے تھا جس کو تا کا      کہ اس گھر سے ابلے گا چشمہ ہری کا  
 وہ تیر تھ تھا اک بت پرستوں کا گویا  
 جہاں نام حق کا نہ تھا کوئی جو یا  
 قبیلہ قبیلہ کا بت اک جدا تھا      کسی کا ہل تھا کسی کا صفا تھا  
 یہ عزت پہ وہ نالہ پر فدا تھا      اسی طرح گھر گھر بنا اک خدا تھا  
 نہاں ایز طلعت میں تھا مہر انور  
 اندھیرا تھا ماراں کی چوٹیوں پر  
 چلن ان کے جتنے تھے سب وحشیانہ      ہر اک لوٹ اور مار میں تھا یگانہ  
 فسادوں میں کٹا تھا ان کا زمانہ      نہ تھا کوئی قانون کا تازیانہ  
 وہ تھے قتل و غارت میں چالاکی سے  
 دزدے ہوں جنگل میں بے باک جیسے  
 نہ ملتے تھے ہرگز جوارہ میٹھے تھے      سلجھتے نہ تھے جب جھگڑا میٹھے تھے  
 جو دشمن آپس میں لڑا میٹھے تھے      تو صلہ قبیلے بگڑا میٹھے تھے  
 بلند ایک ہوتا تھا گردان شرارا  
 تو اس سے بھڑک اٹھا تھا ملک سارا  
 وہ بکرا اور غلب کی باہم لڑائی      صدی جس میں آدھی انہوں نے گنوائی  
 قبیلوں کی کردی تھی جس نے صفائی      تھی اک آگ ہر موعرب میں لگائی  
 نہ جھگڑا کوئی ملک دولت کا تھا وہ  
 کرشمہ اک ان کی جہالت کا تھا وہ

کہیں تھا موٹی چسرنے پہ جھگڑا کہیں پہلے گھوڑا بڑھانے پہ جھگڑا  
لب جو کہیں آنے جانے پہ جھگڑا کہیں پانی پینے پلانے پہ جھگڑا

یوں ہی روز ہوتی تھی تکرار ان میں

یوں ہی چلتی رہتی تھی تلوار ان میں

جو ہوتی تھی پیدا کسی گھر میں دستر تو خوف شامت سے بے حم مادر

پھرے دکھتی جب تھی شوہر کے تہور کہیں زندہ گاڑ آتی تھی اس کو جا کر

وہ گود ایسی نفرت سے کرتی تھی خالی

جنے سانپ جیسے کو جننے والی

جوان کی دن رات کی دل لگی تھی شرب ان کی گھٹی میں گویا پڑی تھی

نعیش تھا غفلت تھی دیوانگی تھی غرض ہر طرح ان کی حالت بُری تھی

بہت اس طرح گزری تھیں انکو صیاں

کہ چھائی ہوئی نیکیوں پر تھیں بدیاں

یکایک ہوئی غیرت حق کو حرکت بڑھا جانب بوقبیس ابر رحمت

ادا خاک بطنی نے کی وہ ودیعت چلے آتے تھے جس کی دیتے شہادت

ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہویدا

دعائے خلیل و نوید سیجا

ہوئے محو علم سے آثار ظلمت کہ طالع ہوا ماہ برج سداوت

چھپکلی مگر چاندنی ایک مدت کہ تھا ابر میں ماہتاب رسالت

بہ چالیسویں سال لطف خدا سے

کیا چاند نے کھیت غار حرا سے

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا مرادیں غریبوں کی برلانے والا

مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا وہ اپنے پرانے کا غم کھانے والا

فقروں کا لمبا ضعیفوں کا مادا

قیموں کا والی غلاموں کا مولا



خطا کار سے درگزر کرنے والا      بداندیش کے دل میں گھر کرنے والا  
مفسد کا زیر و زبر کرنے والا      قبائل کو شیر و شکر کرنے والا  
اتر کر حراسے سوتے قوم آیا  
اور اک نسخہ کیمیا ساتھ لایا

### نمبر ۳۔ مرثی

اس زمانہ میں مرثی بشکل مسدس لکھے جاتے ہیں۔ میر ضحیر مروتوم کے عہد کے پہلے اس کی عروضی ترکیب مربع اور مخمس کی ہوا کرتی تھی۔ جاننا چاہیے کہ عہد میر انیس سے اردو میں مرثیہ نگاری شاعری کی دشوار ترین صنف ہو گئی۔ اور اس کا درجہ اس قدر رفیع ہو گیا کہ اس کے ذکر کے ساتھ مردِ اجل ملٹن والکی بیاس اور فردوس کی رزمی تصنیفات کا ذکر اتفاقاً نہایت قرین محل دکھلائی دیتا ہے۔ فارسی میں یہ صنف شاعری کی گویا ندارد ہے۔ اہل ایران کی مرثیہ نگاری اردو کی مرثیہ نگاری کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں رکھتی ہے۔ میر انیس کے مرثی معاملات محمد دآل محمد سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان معاملات کو دینی حیثیت کے ساتھ تاریخی حیثیت بھی حاصل ہے۔ مصائب کشی کی بنیاد پر ممتاز ترین ان معاملات سے واقعہ کر بلا ہے۔ اس واقعہ کے سمجھنے کے لیے اسلام کی تاریخی معاملات تمدن و مذہب سے پوری واقفیت کا حاصل رہنا ایک امر ضروری ہے۔ مگر یہاں ایسے معاملات کے درج کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ پس جن حضرات کو اس واقعہ عظیمہ کے اسباب و مایات تعلق بہا پر نظر ڈالنا منظور ہو تو فقیر کی کتاب معروف بہ نذر آل محمد کو ملاحظہ فرمائیں۔

میر انیس صاحب ہندوستان کے اردو بولنے والے حصوں میں مرثیہ نگاری کی شہرت رکھتے ہیں۔ جاننا چاہئے کہ میر صاحب کی مرثیہ نگاری ایک رزمی مرثیہ نگاری ہے۔ یہ اس لیے کہ واقعہ کر بلا کی مرثیہ نگاری رزمی شاعری کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے۔ پس حضرت کی شاعری کا شمار ہو مرد و اجل ملٹن، فردوسی اور بیاس کی شاعریوں کے ساتھ ایک ضرور امر ہے۔ جس طرح یہ سب شعرائے نامی رزمی مضامین حوالہ قلم کرتے گئے ہیں۔ میر صاحب بھی اسی طرح رزمی مضامین کو تقاضائے واقعہ کے باعث اپنے مرثی میں کثرت کے ساتھ جگہ دیتے گئے ہیں۔ ایسی حالت میں میر صاحب کو شعرائے مسبق الذکر کی طرح رزمی شاعری کہنا بے محل نہ ہوگا۔ واضح ہو کہ انگریزی میں رزمی شاعری کو ایکپوٹری (EPIC POETRY) اور رزمی شاعر کو ایکپوٹ (EPIC POET)

کہتے ہیں پس میر صاحب اصطلاح انگریزی کے مطابق ایک ایکک پوٹ تھے مگر کس درجہ کے ایکک پوٹ تھے اس کی حقیقت راقم کی آئندہ کی تحریروں سے منکشف ہوگی۔

راقم اس وقت تک صرف ہومر درجہ اول اور فردوسی کی رزمی شاعریوں پر اپنے خیالات کا اظہار کر چکا ہے۔ بلٹن والکی اور میاس کی رزمی شاعریوں پر اُسے رائے زنی کا ابھی تک موقع نہیں ملا ہے۔ اگر حیات نے وفا کی، ان شعرائے نامی کے کلام پر بھی انشاء اللہ ریویو کی نوبت آہی جائے گی۔ بہر حال ان تینوں شعرائے نامی یعنی ہومر درجہ اول اور فردوسی میں صرف ابوالشعر ہومر ہی ہے جس کے ساتھ میر صاحب کا موازنہ صورت رکھتا ہے۔ ورنہ درجہ اول جو ہومر کا متبع ہے میر صاحب کا ہرگز ہمایہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اور نہ ہمایہ کی کا استحقاق فردوسی کو حاصل ہے میر صاحب کو فردوسی ہند کہنا بے شک میر صاحب کی ایک بڑی ناقدہر شناسی ہے۔ حضرات ناظرین راقم کے اس ریویو پر نظر غور ڈالیں۔ جسے اس نے کتاب شاہنامہ پر سابق میں لکھا ہے۔ تب طالبان تحقیق پر روشن ہو جائے گا کہ فردوسی میں اور میر صاحب میں کیا فرق حائل ہے۔ میری دانست میں ہومر ایک بڑا رزمی شاعر تھا لیکن اگر ہومر سیر تھے تو میر صاحب سوا میر تھے۔ یا یہ کہ میر صاحب کو سبجکٹ SUBJECT

یعنی شاعری کا موضوع ایک ایسا واقعہ بزرگ ہوتا ہے کہ جس کا جواب دنیا میں نظر نہیں آتا ہے۔ اس واقعہ عظیمہ کے ساتھ واقعہ (مثنوی) کو کوئی نسبت حاصل نہیں ہے۔ شاہزادہ ثرائی کا قصہ ایک نایاب قصہ ہے اور ہر گز قابلِ نفیس ہے۔ یہ ہومر ہی کی قابلیت شاعری تھی کہ جس نے اسے قابلِ توجہ بنا دیا ہے۔ ورنہ شاہزادہ ثرائی کے قصہ میں کوئی ایسی عظمت کی بات نہیں پائی جاتی ہے جس کی طرف اہل مذاق کو کسی طرح کی رغبت خاص پیدا ہو سکے۔ برخلاف اس کے کہ بلا کا معاملہ ہے کہ نہایت اعلیٰ درجہ کے امور دین امور اخلاق امور تدبیر المنزل اور امور سیاست مدن وغیرہ پر مشتمل ہے۔ ایسے معاملات کی طرف توجہ کرنا ہر دین دار ہر ذی علم ہر حکیم ہر فلسفی کا کام ہے۔ یہ واقعہ معاملات عالم کی تمام خوبیوں کا خلاصہ ہے پس کچھ تعجب نہیں اگر میر صاحب کی شاعری کو اس طرح کے ارفع مضامین نے ایک بے قیاس مدد دی ہے جس سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک عمدہ سبجکٹ کے دستیاب ہونے سے میر صاحب ہومر سے سوا میر معلوم ہوتے ہیں۔ لاریب یہ امر میر صاحب کے مزاج سمجھے جانے کا ایک بڑا سبب دکھائی دیتا ہے مگر نفس شاعری کے اعتبار سے بھی راقم کی دانست میں میر صاحب کی کیرکٹر نگاری ہومر کی کیرکٹر نگاری سے بڑی معلوم ہوتی ہے۔ اگر رائے راقم کی صحیح ہے تو ایسی صورت میں شاعر ہونے کی صورت سے



میرانیس صاحب ہوم پر فوقیت رکھتے ہیں۔ میر صاحب کی کیرئیرنگاری کی بحث آئندہ آنے کو ہے:-

## میرانیس کے معاملات شاعری

واقعہ کر بلا ہر پہلو سے ایک اہم امر دکھائی دیتا ہے۔ اس کو اپنا بجٹ بنانے کے لیے لاریب میرانیس شایستہ ترین شخص نظر آتے ہیں۔ کوئی شک نہیں کہ میر صاحب نے رزمی شاعری کا خاتمہ کر دیا ہے۔ میر صاحب کے مرثیہ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعری ایک فطری امر ہے۔ زہار کہیں نہیں ہے اگر کہیں ہوتا تو ہر شخص جو پڑھا لکھا ہے میر صاحب کا کمال پیدا کر لیتا ہے بلاشبہ و شک میر صاحب وہ الہامی شاعر گرامی ہیں کہ تائید غیبی کے بغیر میر صاحب کا کمال کوئی بنی آدم پیدا کر نہیں سکتا۔ یہ امر راقم کے داخل عقیدہ ہے کہ شعرا خدا کے شاگرد ہوتے ہیں اور جو ان میں زیادہ صلاحیت شاعری کی رکھتا ہے اس کے ساتھ زیادہ تائید غیبی شامل حال ہوتی ہے۔ ہر ملک میں شعرا مورد الہام ہوا کرتے ہیں شکسپیر کی روح جو ارواح خوانی کے ذریعے طلب کی گئی تو مشکل ہو کر اس نے بیان کیا۔ کہ فلاں فلاں (PLAY) ہم نے محض الہامی طور پر حوالہ قلم کیے ہیں۔ ان پلے کی تحریر کے وقت مجھے کچھ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ میں کیا لکھ رہا ہوں۔ البتہ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تائید غیبی میرا ساتھ دے رہی ہے اور میں لکھ رہا ہوں۔ مگر کیا لکھ رہا ہوں اس کو سمجھ نہیں سکتا تھا میرے خیال میں میر صاحب بند پر بند لکھ جاتے ہوں گے۔ جو حضرات تائید غیبی کے قائل نہیں ہیں لازم ہے کہ ارواح خوانی کا فن سیکھیں۔ میں بھی ایک زمانہ میں الہام و تائید غیبی و دعوت ارواح و استمداد ہمت سے انکار رکھتا تھا۔ مگر الحمد للہ کہ پہلے کے وہ سب ملحدانہ خیالات ائمہ معصومین کی روحانی تعلیمات کی بدولت رفع دفع ہو گئے۔ اب میں بدیہیات کی طرح مانتا ہوں کہ ائمہ معصومین اپنے غلاموں کی ہر طرح پر تائید کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں۔ میں اب شیخ نجدی کے اس خیال کا ہرگز مشرک نہیں ہوں کہ جس کو اس نے اپنی غایت و شامت سے قبر رسالت مآب پر ظاہر کیا تھا۔ اہل اطلاع پر پوشیدہ نہیں ہے کہ جب یہ تنگ حوصلہ ظاہر میں خود پرست قبر شہنشاہ کونین پر گیا تو اس نے نہایت بے ادبانہ انداز سے قبر پاک کی طرف رخ کر کے یہ کہا کہ اے وہ شخص جو اس میں مدفون ہے اس وقت تجھ سے میرا عرصہ بہتر ہے۔ اس راندہ درگاہ کو نہیں معلوم ہو سکا کہ انبیاء و اوصیاء بعد وفات بھی احیا کا حکم رکھتے ہیں۔ اور جو واقعات و حالات

گذرتے ہیں ان سے باخبر رکھتے ہیں۔ اس کم بخت نجدی کے دماغ میں یہ بات پیچیدہ تھی کہ سرور کائنات جب دو دلیعت حیات فرما چکے تو خاک ہو گئے۔ پس خاک ہو کر اس جناب میں کیا باقی رہ گیا پس آنحضرت سے اس شامتی نجدی کا عصا ضرور بہتر ہو گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب نے ایسے ہی نجدیوں میں تعلیم پائی ہے جو رسول دال رسول کے مقابلہ ایسی بے ادبیوں سے پیش آتے ہیں، لاجل شرم لاجل۔ یہ بات کوئی تعجب کی نہیں ہے۔ جب میں بھی شیخ نجدی کے پیرواں میں تھا تو اسی طرح کی شامت کی باتیں کیا کرتا تھا۔ خیر جاننا چاہیے کہ شعرا کو تائید غیبی ضرور شامل حال ہوا کرتی ہے۔ میرانیس صاحب کا موید من اللہ ہونا ایک امر یقینی ہے۔ اگر بلا تائید غیبی کوئی شخص میر صاحب کے برابر شاعر ہونا چاہے تو کوشاں ہو کر دیکھ لے۔ میر صاحب کے کلام میں اس قدر خوبیاں ہیں کہ خود میر صاحب اپنے کلام کے تصنیف کے وقت ان سے خبر نہیں ہوتے ہوں گے۔ بعد تصنیف جب اپنے کلام معجز نظام پر نظر ڈالتے ہوں گے تو اس پر بھی بہت سی خوبیاں ان کے کلام کی ان سے مخفی رہ جاتی ہوں گی۔ الہامی کلام کا یہی حال ہوتا ہے کہ وقت تصنیف کہنے والا ان کی تمام خوبیوں پر اطلاع نہیں پاتا ہے بلکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کہنے والے کو تمام عمر اپنے کلام کی بہت سی خوبیوں سے بے خبری رہ جاتی ہے یہی مثلاً ایک شعر میر صاحب کا اس موقع پر درج کرتا ہوں جس کی نسبت میرا گمان یہی ہے کہ میر صاحب خود اس کی تمام خوبیوں سے واقفیت نہیں رکھتے تھے۔ وہ شعر یہ ہے:

طائر ہوا میں نحو ہرن سبزہ زار میں  
جگل کے شیر منگ رہے تھے کچھار میں

یہ شعر مضامین صبح سے تعلق رکھتا ہے مگر اس شعر سے وہی شخص حسب مراد متلذذ ہو سکتا ہے جو علم حیوانات سے باخبر ہے۔ علم حیوانات سے مراد وہ علم ہے کہ جس کو انگریزی میں ذولوجی 2004007 کہتے ہیں اس علم کی دانست سے انسان تمام حیوانات روئے زمین کی بنی کیفیتوں سے بحسب طاقت بشریہ اطلاع پاسکتا ہے۔ یہ علم کوئی ظنی یا خیالی نہیں ہے اس علم کی بنا تحقیق پر واقع ہوئی ہے اس لیے کہ اس کے مسائل تصفیح اور استقرا کے ذریعے تنقیح پاتے گئے ہیں اور اس بنا پر یہ علم تمام تر علم کا حکم رکھتا ہے یہ علم مسلمان ہند سے بالکل جا آ رہا ہے۔ اس وقت اس علم کی کوئی حسب مراد کتاب عربی فارسی یا اردو میں نہیں دکھائی دیتی ہے۔ عربی میں علامہ فخر الدین رازی کی کتاب مولید مثلثہ ہے جس میں علم حیوانات سے علامہ موصوف نے بحث کی ہے۔



مگر وہ ایک ناکافی ہی تصنیف ہے اور اس عہد کے لیے کوئی بھاری سرمایہ تحقیق نہیں ہے۔ بلاشبہ حضرات علمائے ہند تہا متراں علم سے دور ہیں۔ صرف دور ہی نہیں ہیں بلکہ اس علم کو چنداں قابل توجہ نہیں سمجھتے ہیں۔ صرف وہی اشخاص ہندی اس علم سے مناسبت رکھتے ہیں کہ جنہوں نے ہندوستان یا انگلستان میں انگریزی یا کسی یورپین زبان کے ذریعے اس علم کی تحصیل کی ہے۔ اردو میں جو کتاب عجائب المخلوقات دیکھی جاتی ہے وہ ایک لغو کتاب ہے اور علم حیوانات سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی ہے۔ خیر میر صاحب کے شعر بالا سے وہی شخص لذت یاب ہو سکتا ہے کہ جس کو علم حیوانات سے بہرہ حاصل ہے۔ جاننا چاہئے کہ صبح کے وقت طیور کو ہوا کے ساتھ محویت رہتی ہے۔ یہ محویت طیور کو ہوا کے ساتھ دوپہر یا شام کو نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صبح طیور کو اس کی حاجت ہوتی ہے کہ قبل اس کے کہ تلاش رزق میں اڑیں اپنے بازوؤں کو پرواز کے قابل بنالیں۔ شب بھر ہیکار رہنے سے ان کے بازوؤں تازہ کے محتاج ہو جاتے ہیں اس لیے کچھ طیور تو آسمان میں گھنٹے آدھ گھنٹے تک ادھر ادھر پر مارتے پھرتے ہیں اور کچھ جنگلوں اور باغوں میں درزش کی ترکیب سے جھاڑی جھاڑی اور درخت درخت اڑتے پھرتے ہیں اس ریاضت کی محتاجی تمام ایسے طیور کو ہوتی ہے کہ جن کو اپنے پرواز کے ذریعے دن بھر سامان رزق ہم کرنا ہوتا ہے پس صبح کو طیور کا نحو ہونا ایک فطری امر ہے اور کس قدر تحقیقات علم حیوانات کے قرین ہے۔ ہرن کو صبح کے وقت ہبزہ زار کی محویت ہوتی ہے کہ جس قسم کے ہرن کو صبح کے وقت ہبزہ زار کے ساتھ محویت ہوتی ہے وہ قسم بیشتر ہبزہ زار ہی میں رہتی ہے۔ جنگلوں میں نہیں رہتی۔ چوں کہ اس قسم کے ہرن شب کو چری نہیں کرتے اور چری کے عوض شب بھر جگالی کرتے ہیں۔ صبح ہوتے نہایت بھوکے ہو جاتے ہیں۔ پس صبح کے ہوتے ہی چسری میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ چوں کہ صبح کو انھیں بھوک کی شدت پیدا ہو جاتی ہے۔ بھوک ان کو ہبزہ زار کے ساتھ محویت پیدا کر دیتی ہے۔ یہ ہرن اقسام غزال سے ہوتے ہیں۔ انہیں ہرن کی پہاڑوں میں رہتی ہیں۔ یا جنگلوں میں صبح کے وقت یہیں ہبزہ زار کی طرف نہیں رخ کرتیں اس لیے کہ شب کو چری کر کے آسودہ رہتی ہیں۔ برخلاف غزالوں کے جو شب کو چری کرتے ہیں۔ اور جن سے مراد شاخہ شعر بالا میں ہے۔ دوسرے مصراع میں میر صاحب جنگل کے شعر کے ہونکنے کا ذکر فرماتے اور اس کے ہونکنے کی جگہ کو کچھ اقرار دیتے ہیں۔ سبحان اللہ سبحان اللہ کیا تناسب کلام ہے۔ عالم علم حیوات کے سوا کون شخص ایسا پیرایہ بیان اختیار کر سکتا ہے۔ جائے لحاظ ہے کہ اس شاعر گرامی نے صرف شیر کا مذکور نہیں فرمایا بلکہ جنگل کے شیر کی قید نگاری جاننا چاہیے کہ



شیر دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک کا مسکن پہاڑ ہوتا ہے اور دوسرے کا جنگل۔ عادات و خواص میں بھی یہ دونوں قسم کے شیر موافقت نہیں رکھتے مزاج بھی دونوں کے دو طرح کے ہوتے ہیں اور معاشرت کے طور بھی دونوں کے جداگانہ دکھائی دیتے ہیں پہاڑی شیر رات بھر تلاش رزق میں ادھر ادھر پھر کر صبح کو پہاڑ کے کسی غار میں جو اس کا مسکن ہوتا ہے جا چھپتا ہے اور شام کے قریب تک سوتا رہتا ہے۔ پھر شام ہوتے تلاش رزق میں نکلتا ہے۔ یہ شیر کچھارے کوئی علاقہ نہیں رکھتا۔ مگر جو جنگل کا شیر ہوتا ہے وہ دن بھر کچھارے ہی میں بسر کرتا ہے اور صبح کو بیشتر ہونکا کرتا ہے۔ راقم نے دونوں طرح کے شیر دیکھے ہیں اور شکار بھی کیے ہیں۔ لاریب علم حیوانات کی اطلاع اور ذاتی معلومات کے حاصل رہنے سے میر صاحب کا یہ شعر ان کے پڑھنے والے کو عجب لطف کلام بخشتا ہے۔ راقم کو اس کی اطلاع نہیں ہے کہ میر صاحب علم حیوانات سے واقفیت رکھتے ہیں یا نہیں۔ زیادہ قرینہ اسی کا ہے کہ اس علم کے غیر مردج ہونے کے باعث حضرت کو اس کی تحصیل کا موقع نہیں ملا تھا۔ یہ بھی راقم کو نہیں معلوم ہے کہ حضرت سفر شکار اختیار فرمایا کرتے تھے یا نہیں۔ زیادہ تو اسی کا قرینہ ہے کہ سیر و شکار کی طرف توجہ فرمانے کا کم موقع رکھتے تھے مگر علم حیوانات کی بڑی اطلاع سے جو یہ شعر خبر دیتا ہے اس کی تاویل اس کے سوا اور کیا کی جاسکتی ہے کہ میر صاحب کو الہامی طور پر ایسے ایسے عالی مضامین دستیاب ہوا کرتے تھے۔

کیر کٹر نگاری کی بحث راقم نے شاہنامے کے لگاؤ میں کی ہے۔ فردوسی کی کیر کٹر نگاری کا نقص دکھلایا جا چکا ہے۔ اسی کے ساتھ ہومر کی کیر کٹر نگاری کی خوبیاں بھی نہ صرف شاہنامہ کے لگاؤ سے دکھلائی جا چکی ہیں بلکہ خود ہومر کے شاعری کے بیان میں حوالہ قلم ہو چکی ہیں۔ لاریب ہومر کی کیر کٹر نگاری بہت اعلا درجہ کی ہے اور ایسی ہی ہے کہ اس کی کیر کٹر نگاری کی بنیاد پر ڈراما جیسی صفت شاعری کا ایجاد ظہور میں آیا۔ اب ہم میر انیس صاحب کی کیر کٹر کی خوبیوں کو عرض کرنا چاہتے ہیں۔ یہ خوبیاں دشوار پیرایہ رکھتی ہیں اور میر صاحب کی بڑی قابلیت شاعری سے خبر دیتی ہیں۔ یوں تو میر صاحب کی کیر کٹر نگاری بھی ایجاد ڈراما کے باعث ہو سکتی تھی۔ اگر دنیا میں ڈراما کو وجود نہیں ہوا ہوتا۔ مگر میر صاحب کی کیر کٹر نگاری کی بڑی دشواری یہ ہے کہ میر صاحب کو اپنی کیر کٹر نگاری میں معاملات روحانیہ کو پیش نظر رکھنا پڑا ہے۔ معاملات روحانیہ کا التزام کوئی آسان کام نہیں ہے۔ میر صاحب کے کیر کٹر *CHARACTERS* وہ اشخاص گرامی ہیں جو واقعہ کر بلا سے تعلق رکھتے ہیں۔ شاہنامہ اور ایلید کے رسم دیگیا ہٹر



واکلیئر نہیں ہیں۔ یہ وہ حضرات ہیں کہ امام من جانب اللہ اور عزیزان و پیرداں امام من جانب اللہ  
 ہیں۔ یہ سب کے سب ایسے ہیں جو دنیا کو ایک ذلیل شے جاننے اور حیات و ثروت دنیا کو خس برابر  
 نہیں سمجھتے ہیں۔ ان کے دل توحید و عدل و معرفت کے انوار سے روشن ہیں اور کفر و ظلم و حرص  
 و ہوا کی ظلمتوں سے تمام تر پاک ہیں۔ یہ سب کے سب ایسے ہی ابرار ہیں کہ معاد و آخرت کے خیالات  
 کے سوا کوئی اس دنیا کا خیال ان کا مرکز خاطر نہیں ہو سکتا۔ تمام صفات روحانیہ سے متصف ہیں۔  
 اور ایسے ہی ہیں کہ اپنے کمالات باطنی کے ذریعہ سے فعلاً و قولاً دین محمد کو حق ثابت کر سکے ہیں بلٹن  
 کی رزمی تصنیف جو پیر ایڈائز لاسٹ کے نام سے مشہور ہے۔ ہر چند معاملات عالم بالا سے سراسر  
 تعلق رکھتی ہے مگر روحانی لغزشوں سے خالی نہیں ہے بلٹن نے اس تصنیف نامی میں دکھلایا ہے  
 کہ خدائے تعالیٰ سے شیطان نے کس طرح بغاوت کی۔ اور نافرمانی سے کس طرح وہ لعین معدود زرخ  
 میں ڈالا گیا پھر اپنی دریافت کو لے کر اس عاقبت برباد نے کیوں کر خدائے تعالیٰ کے شکر ملائکہ  
 سے مقابلہ کیا۔ اور کس طرح پر شکر خدا کو اس نے شکست دی مگر میری دانست میں یہ مشاعر نامی  
 اپنی تصنیف گرامی میں شان خداوندی کو اس شکست کے بعد قائم نہیں رکھ سکتا ہے بلٹن لکھتے ہیں  
 کہ شیطان نے زمین کے اندر بیٹھ کر لوہے نکالے اور توپیں ڈھالیں اور بارود ترکیب دی۔ جب  
 لشکر ملائکہ سے صف آرائی ہوئی تو اس نے جبریل و میکائیل اور دیگر ملائکہ پر ایسی گولہ باری کی کہ  
 سارے ملائکہ سخت زخمی ہوتے گئے اور گولیوں کے صدمے سے یہ کیفیت گزری کہ غیر مقرب ملائکہ  
 مقرب ملائکہ پر چوٹ کھا کھا گرے۔ بالآخر لشکر ملائکہ کو سخت ہزیمت نصیب ہوئی۔ جب اس  
 شکست کی خبر خدائے تعالیٰ کو ہوئی تو خدائے تعالیٰ کو سخت تشویش دامنگر ہوئی۔ جناب باری کو  
 اس کا یقین ہو گیا کہ شیطان اس ذات پاک اور جمیع ملائکہ کو آسمانی مقامات سے نکال پھینکے گا۔  
 اس حالت بیچارگی میں خدائے تعالیٰ کو چین نہیں آتا تھا حضرت جبرائیلؑ کو شیطان کے  
 غضب سے بچنے کی کوئی تدبیر نہیں سوچتی تھی۔ بالآخر حالت پریشانی میں خدا صاحب اپنے  
 اکلوتے بیٹے حضرت مسیح کے پاس تشریف لے گئے اور خدا زادے سے شکست فوج ملائکہ اور  
 اپنی بے بسی کا معاملہ کہہ سنایا۔ خدا زادے نے اپنے پدر محترم کی پریشانیوں کے حالات سن کر  
 نہایت تشفی بخش کلمات فرمائے جس سے فی الجملہ خدا صاحب کو تسکین کی صورت پیدا ہو گئی۔  
 اس کے بعد خدا زادے ایک تخت نور پر سوار ہو کر شیطان کے مقابلہ کو تشریف لے گئے۔  
 اور شیطان کو شکست فاش دی۔ مصدع۔ اگر پدر نتواند پسر تمام کند۔ واضح ہو کہ



ہر چند پیرمندانزلاست ایک ایسی تصنیف ہے کہ جس کو تمام تر روحانیت سے تعلق ہے۔ مگر ظاہراً اس کتاب کے بعض معاملات روحانیہ کچھ ایسی بد ترکیبی سے حوالہ قلم ہوئے ہیں کہ دل میں عظمت پیدا کرنے کے عوض طبیعت کو ان سے متنفر پیدا ہوتا ہے۔ لاریب ملٹن کے بیانات بالاد صرف عزت و جبروت خداوندی کے کم کر دینے والے نظر آتے ہیں۔ بلکہ اپنے ابتدائی انداز سے بے حد محفراً و مضحک بھی دکھائی دیتے ہیں۔ برخلاف اس کے میر صاحب کے بیانات ہیں کہ جس سے خدائے تعالیٰ کی تہجد و تقدیس کی ایسی شکل قائم ہوتی ہے کہ شان کبریائی پیش نظر ہو جاتی ہے۔

واضح ہو کہ رزمی شاعری جن جن زبانوں میں دیکھی جاتی ہے نہ صرف تمام دنیا میں انھیں بلند پایگی حاصل رہی ہے۔ بلکہ قومی اعتبار سے ان زبانوں کے بولنے والوں کو بھی وجاہت اور ثروت حاصل رہی ہے۔ ہومر اہل یونان سے تھا اور اس کی شاعری کی زبان یونانی ہے۔ ورجل اہل ایطالیہ سے تھا۔ اور اس کی شاعری کی زبان لاطینی ہے۔ ملٹن اہل انگلستان سے تھا اور اس کی شاعری کی زبان انگریزی ہے۔ فریسی اہل غم سے تھا اور اس کی شاعری کی زبان فارسی ہے۔ والکی اہل ہند سے تھا اور اس کی شاعری کی زبان سنسکرت ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب زبانیں پایہ امتیاز رکھتی ہیں اور ان کے بولنے والے بھی قومی اعتبار سے اہل ثروت سے شمار کیے جانے کا استحقاق رکھتے ہیں۔ مگر میر انیس صاحب نے رزمی شاعری کا جلوہ ایک ایسی زبان میں دکھلایا ہے کہ نہ وہ زبان ابھی تک اعلیٰ درجہ کی سمجھی جاتی ہے۔ اور نہ اس کے بولنے والے کسی طرح کا دنیاوی امتیاز رکھتے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر میر انیس صاحب کے کمالات اہل دنیا سے پوشیدہ رہ جائیں۔ تو جاتے تعجب نہیں ہے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ ابھی تک یورپ اور امریکہ میر صاحب کے نام سے بھی واقف نہیں ہے۔ تعلیم یافتہ دنیا ابھی تک نہیں جانتی ہے کہ بزمانہ حال ہندوستان کی ایک ناپرسان اور منظوم زبان میں ایک ایسے شاعر نے رزمی شاعری کی اتنی بڑی داد دی ہے کہ اگر ہومر اس وقت زندہ ہوتا تو اس ناپرسان شاعر کی طباعی سے حیرت زدہ ہوتا۔ میر صاحب کو کم از کم عباس اعظم کے عہد میں پیدا ہونا اور فارسی زبان میں اپنے کلام کا جلوہ دکھلانا تھا۔ مگر ایسی مرضی الہی نہ تھی۔ جیسا کہ حیف کہ میر صاحب نے ایسے زمانہ میں نشوونما پکڑی کہ جب مسلمانان ہند اخلاقی تمدن اور تمام جہتوں سے انتہائی استبدال کو پہنچ چکے تھے۔ لاریب یہ زمانہ میر صاحب کی طباعی کو ذہنی شہرت کے حاصل کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ اب اس کی کم امید ہوتی ہے کہ میر صاحب کی شہرت اردو بولنے والے صوبہات ہند سے باہر قدم رکھ سکتے۔ اردو کی یہ حالت ہو رہی ہے کہ سرکار انگلشیہ مردود ہے۔ اور اردو بولنے والے مسلمان ایسی پستی میں مبتلا ہیں کہ ممتاز اقوام دنیا سے ان کا کسی میں شمار نہیں ہے۔ اگر زبان کی حیثیت سے



اردو کوئی ممتاز زبان ہوتی اور اس کے بولنے والے کسی طرح کا وقار دنیا میں رکھتے تو میر صاحب کی شہرت آپ ہی آپ تمام تعلیم یافتہ میں پھیل جاتی بحالت موجودہ باوجود حاصل رہنے ایک عظیم المثال قوت شاعری کے میر صاحب کی نسبت یہ ہرگز امید نہیں کی جاسکتی ہے کہ میر صاحب یورپ و ایشیا اور امریکہ میں ہومر، درجل، ملٹن، فردوسی، والملکی بیاس کی طرح ایک معروف شاعر مانے جائیں گے۔ کس قدر جائے تعجب ہے کہ یورپ میں عمر خیام کے نام کے کلب قائم ہوتے گئے ہیں مگر ابھی تک کوئی ایس کلب قائم نہیں ہوا ہے اور نہ ایسے کلب کے قائم ہونے کی کوئی امید کی جاسکتی ہے۔ حالانکہ شاعری کے اعتبار سے میر صاحب عمر خیام سے کہیں ارفع درجے کے شاعر ہیں۔ واقعی دنیا کے لیے یہ ایک ستم کی بات ہے کہ میر صاحب جیسا شاعر دنیا میں آیا۔ اور دنیا اس سے بے خبر رہ گئی۔ اسی کو افتاد زمانہ کہتے ہیں۔ خیر اگر دنیا میر صاحب سے واقف نہ ہو سکی تو اس کا علاج ہی کیا ہے مگر زیادہ تر ستم کی بات یہ ہے کہ ہندوستان کے اردو بولنے والے صوبہات بھی میر صاحب کے کمالات سے حسب مراد طور پر اطلاع نہیں رکھتے ہیں۔ ہندو اصحاب میں بہت تھوڑے حضرات ہیں۔ جو فی زمانہ اردو شاعری کا مذاق رکھتے ہیں۔ پس ہندوستانیوں میں میر صاحب کی قدر شناسی کیوں کر ہو سکتی ہے۔ مسلمانوں کی یہ کیفیت ہے کہ وہ بھی شاعری کا مذاق صحیح بہت کم رکھتے ہیں۔ کچھ مسلمانوں کو مذہبی اسباب میر صاحب کی شاعری کی طرف توجہ نہیں ہونے دیتے ہیں۔ کچھ مسلمان حضرات مولویت کے تعاضف سے عموماً شاعری سے اجتناب رکھتے ہیں بغرض ہندوستان کے اردو بولنے والے صوبوں میں بھی میر صاحب قریب قریب میر صاحب ایک غیر معروف شخص ہو رہے ہیں۔ خدا بھلا کرے مولانا شبلی، مولانا اشہری اور بعض دیگر اہل مذاق کا جو میر انیس کو روشناس اہل ہند بنانے میں کوشاں ہوئے ہیں۔ کاش ایسے صاحبان علم و فضل اہل یورپ کو بھی میر صاحب کے کمالات سے باخبر کر دینے کی سعی مناسب فرماتے۔ ایسی کارروائی سے نہ صرف اہل یورپ کی آنکھوں کے آگے ایک نیا اور بڑا میدان خیالات رفیع کا پیش ہو جاتا۔ بلکہ خود اردو بھی ایک غیر متوقع توفیر پیدا کرتی۔

## رزمی شاعری کی رفعت

اہل واقفیت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ رزمی شاعری کا درجہ ہر زبان میں ارفع دکھائی دیتا ہے اس صنف شاعری کے برتنے میں شاعر کو داخلی (SUBJECTIVE) اور خارجی (OBJECTIVE) دونوں پہلوؤں کے مضامین بندی پر یکساں اختیار حاصل رہنا چاہیے۔ جس شاعر کو ان دونوں پہلوؤں

کے مضامین بندی پر یکساں اختیار حاصل نہیں ہے۔ اس سے رزمی شاعری کا مرحلہ طے نہیں پاسکتا ہے۔ ہومیر دس جہاں اندرونی معاملات کو حوالہ قلم کرتا ہے وہاں اندرونی معاملات کی تصویر پیش نظر کر دیتا ہے۔ اس کے بیان سے غضب، غصہ، رحم، محبت، عداوت، رشک وغیرہ وغیرہ جو اندرونی کیفیتیں ہیں سامع کی نظر میں مشکل ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح جب یہ شاعر نامی اشیائے خارجیہ کو زیب قلم کرتا ہے تو خارجی چیزیں تمام تر آنکھوں کے سامنے ہوتی ہیں۔ اس کی صورت نگاری لڑائی کے میدانوں کو اور بہادران جنگ کی نبرد آزمائیوں کو فوٹو سے بھی زیادہ واضح طریقہ پر آنکھوں کے آگے قیام کر دیتی ہے۔ یہی حال میر انیس کی شاعری کا بھی ہے میر صاحب کے حسن بیان سے معاملات خواہ اندرونی ہوں خواہ بیرونی یکساں طور پر پیش نظر ہو جاتے ہیں۔ اس کی توضیح آئندہ آئے گی۔ داخلی اور خارجی پہلوؤں پر قدرت رکھنے کے علاوہ رزمی شاعر کو ان دونوں پہلوؤں کی آمیزش پر بھی اختیار حاصل رہنا چاہیے۔ رزمی شاعر کو اس آمیزش کی اکثر حاجت ہوتی ہے اس آمیزش کی صلاحیت حسب مراد طور حاصل نہیں رہنے سے شاعر کا کلام سیٹھا اور بد مزہ معلوم ہوتا ہے۔ ہومر کو اس کی بڑی صلاحیت مودہ تھی۔ اور میر صاحب بھی اس کی بے حد قابلیت رکھتے تھے۔ مثلاً ہر خیمہ گاہ کا مضمون خارجی پہلو کے سوا داخلی پہلو نہیں رکھ سکتا۔ اور جب کسی خیمہ گاہ بیان قابلیت کے ساتھ انجام پائے گا تو اس خیمہ گاہ کا فوٹو پیش نظر ہوگا۔ مگر خیمہ گاہ امام حسین علیہ السلام کا بیان ایسا ہونا چاہیے کہ مجرد ظاہری فوٹو کی کیفیت پیدا نہ کرے بلکہ ایسا ہو کہ رنج و ملال و بے چارگی و بے بسی و مظلومیت وغیرہ کے داخلی پہلوؤں کو بھی لیے ہوئے ہو جس سے امام حسین کی خیمہ گاہ اور خیمہ گاہوں سے صرف میز نہ ہو سکے بلکہ دل پر حسب مراد محزونیت کا عالم بھی پیدا ہو سکے۔

اب ہم ذیل میں کچھ خارجی اور کچھ داخلی مضامین کی مثالیں پیش کرتے ہیں یہ تو ناممکن ہے کہ اس کتاب کے تنگ دائرہ میں تمام ایسے ایسے مضامین کو جگہ مل سکی ہیں جن کو میر صاحب حوالہ قلم فرما گئے ہیں۔ تاہم ذیل کی مثالوں سے کسی قدر اس کا اندازہ نہ ہو سکے گا کہ آپ کو والعطانی کس درجہ کا شاعر بنایا تھا۔ اور آپ کی قوت شاعری کیا عظیم المثال پیرایہ رکھتی ہے۔ جو خارجی اور داخلی دونوں قسم کی مضمون بندی کا کمال یکساں طور پر دکھلاتی ہے۔

پہلے راقم خارجی مضامین کی مثالیں پیش کرتا ہے۔



## خارجی مضامین کی مثالیں

منمبر ۱۔ شام سے عمر سعد کا کر بلا میں آنا اور امام علیہ السلام کے فوجی معاملات کا دریافت حال کرنا۔

اس کثرت سیاہ پہ ناگہ ہوئی یہ دھوم      آپہنچا شام سے سپر سعد نحس و شوم  
جس کے جلو میں لاکھ سواروں کا ہے ہجوم      اکثر ہیں یکہ تاز جوانان شام و روم  
بس کھل گیا نہ طور صفائی کا ہوئے گا  
اب کل سے بندوبست لڑائی کا ہوئے گا

یہ ذکر تھا کہ دور سے ظاہر ہوا نشان      امڈا زمین پہ ظلم کا دریائے بیکران  
موجوں کی طرح سب تھیں صغیں پیش و پس روان      لہراتے تھے ہوا سے علم مثل بادبان  
لما تھا دشت کین دہل اس طرح بجتے تھے  
باجوں کا ستھایہ شور کہ بادل گر جتے تھے

جنگی وہ رومیوں کے پرے شایروں کے دل      خوف خدا نہ جن کو نہ اندیشہ اجل  
مکار و بد شعار و دغا باز و پر و غل      شکلیں مہیب دیو سے قدا بردوں پہ بل  
بدخواہ خاندان رسالت پناہ تھے

ایسے جلے ہوئے تھے کہ چہرے سیاہ تھے  
تلوار کھینچے بڑھ کے جے دو طرف سوار      نعل ہو گیا سلامی کے باجوں کا ایک بار  
ڈنکے کی دم بدم تھی صدا آسمان کے بار      آگے بڑھے جلوہ نقیبروں کی بھٹی پکار  
گھوڑوں پہ گرد و پیش رسیان شام تھے  
زرین کمر جلو میں ہزاروں غلام تھے

اترا قریب خیمہ فرس سے وہ خیمہ سر      سر پر لگایا دوڑ کے خادم نے چتر زر  
پہلے تو اپنی فوج پہ ظالم نے کی نظر      بولا کسی سے پھر وہ سوتے نہر دیکھ کر  
خیمہ ہے کس طرف کوشہ خوش خصال کا  
دریا پہ تو عمل نہیں زہرا کے لال کا

خوبی نے تب کہا کہ ہماری طرف سے نہر اُتے تھے یاں اُترنے کے خاطر امام دہر  
فراتے تھے یہ نہر تو ہے میری ماں کا مہر ہم نے اٹھا دیا انھیں لیکن بہ جبر و قہر

عباس مستعد تھے سبوں سے لڑائی کو

شبیر پھر لے گئے سمجھا کے بھائی کو

وہ دھوپ میں ہے خیمہ زنگاری حسین راحت ذرات کو ہے کوئی دم نہ دن کو چین

پہروں علی کی بیٹیاں روتی ہیں کر کے بین آفتیں مبتلا ہے محسّر کا نور عین

بچوں کے مارے پیاس کی حالت عجیب ہے

خیمہ نہ سائے میں ہے نہ دریا قریب ہے

بولا شعی کہ کتنی ہے فوج شہ امم ملتے تھے داہ سپاہ حسینی کی دھوم ہم

اس نے کہا حسین کے یاد ہے بہت ہیں کم فاقوں کے مارے دم میں کسی کے نہیں ہے دم

ایسی نہ فوج کچھ ہے نہ ایسے نشان ہیں

میں نے خود گنا ہے اکا سی جوان ہیں

ہے اک علم یہ قلتِ لشکر کا ہے نشان یہ حال ہے لٹا ہوا جیسے ہو کاروان

اردو میں جنس غم کے سوا جنس گران غلّہ کی یہ کمی ہے قحط آب و نان

اسوار بھی قلیل ہیں پیادے بھی تھوڑے ہیں

کُل سترہ تو اونٹ ہیں اور بیس گھوڑے ہیں

## بند ہائے بالا پر ریلوے

بند ہائے بالا ارض کربلا میں عمر ابن سعد کی آمد کا سین پیش کرتے ہیں۔ ابن سعد شام سے

ایک لاکھ سوار لے کر میدان کربلا میں پہنچتا ہے۔ اس کی فوج کے نشانات نمودار ہوتے ہیں۔ اس کا لشکر

عظیم پیکر ہے۔ یا ظلم کا ایک موج زن سمندر۔ جن کے باجے اس کے لشکر کے بادل کی طرح

گر جتے ہیں۔ اس کے لشکر کی رومی اور شامی ہیں۔ یہ ایسے ہیں کہ نہ خدا سے ڈرتے ہیں۔ اور نہ موت

کی پروا کرتے ہیں۔ اطوار ان کے نامحسوس نکلیں ان کی مہیب اور ان کے دیو کے سے۔ یہ سب کے

سب خاندان یغبر سے عداوت رکھنے والے ہیں۔ جس وقت ابن سعد پہنچا۔ سلامی کے باجے بجنے

لگے۔ نسیان شام گھوڑوں پر اس کے گرد و پیش تھے۔ اور ہزاروں غلام زرین کمر جلو میں۔



سبحان اللہ کیا سچی تصویر میر صاحب نے ایشیائی فوج اور ایک ایشیائی میر لشکر کے کھینچی ہے۔ خاص کر ایک ایسے میر لشکر کی جو خلیفہ وقت یعنی یزید کی طرف سے امام حسین کے انسداد اور مقابلہ کو بھیجا گیا۔ خیر اپنے خیمے کے قریب گھوڑے سے ابن سعد اترتا ہے۔ حسب دستور خادم اس کے سر پر چتر زر لگاتا ہے۔ چوں کہ یہ شخص میر لشکر ہے۔ پہلے اپنی فوج کی طرف نظر کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی فرات کی طرف دیکھ کر کسی سے پوچھتا ہے کہ امام حسین کا خیمہ کدھر ہے۔ اور فرات پر تو کہیں ان کا قبضہ نہیں ہے۔ یہاں میر صاحب ایک ہوشیار جنرل کا فوٹو اپنے ناظرین مراٹھ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ لاریب کیمپ پر پہنچ کر تپولین اور ویلیگٹن بھی غنیم کی نسبت اسی طرح پر دریافت حال کرتے ہوں گے۔ جیسا کہ ابن سعد سے ظہور میں آیا۔ المختصر حاضرین سے خولی نے فوراً ابن سعد کا اطمینان کر دیا کہ دریا لشکر یزید کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے بعد اُس کے خبر دی کہ امام علیہ السلام دنیا کے کنارے اترنا چاہتے تھے مگر اترنے نہیں پائے اس پر عباس مستعد جنگ ہوئے مگر ان کے بھائی امام حسین انہیں سمجھا کر پھیر لے گئے۔ اب خیمہ امام حسین کا دھوپ میں استادہ ہے۔ انہیں اور ان کے تمام لوگوں کو نہ دن کو راحت اور نہ رات کو چین نصیب ہے۔ ان کے بچوں کا پیاس سے بُرا حال ہے۔ اُن کا خیمہ دھوپ میں ہے اور ان سے دیا دور پر واقع ہے اس امر سے اطمینان پا کر دریا امام حسین کے قبضہ میں نہیں ہے اب ابن سعد لشکر امام علیہ السلام کا حال پوچھتا ہے کہ آپ کی کتنی فوج ہے۔ شام میں تو فوج حسینی کی بڑی دھوم سنتے ہیں۔ یہ سُن کر خولی جواب میں کہتا ہے کہ امام علیہ السلام کے مددگار بہت تھوڑے ہیں۔ وہ بھی فاقوں سے تباہ حال ہو رہے ہیں۔ نہ کچھ ایسی فوج ہے اور نہ کچھ ایسے نشان ہیں گنتی کے فقط اکا سی جوان ہیں۔ لشکر میں صرف ایک غلم ہے جس سے ہویدا ہے کہ فوج کم ہے۔ لشکر کا حال لٹے ہوئے کارواں کا حال ہو رہا ہے۔ کھانے پینے کا کوئی سامان نہیں ہے۔ سوار پیادے بہت تھوڑے ہیں۔ سترہ اونٹ اور بیس گھوڑے ہیں۔ سبحان اللہ کیا اسلوب کلام ہے۔ میر صاحب کے مناسب کلام کا کوئی جواب نہیں ہے۔ یہی مناسب ہے جو کسی مرثیہ نگار کو اب تک نصیب نہیں ہوا ہے۔ یہ مناسب اگر کہیں ہے تو ہو پھر ہو مرثیہ کے کلام میں دیکھا جاتا ہے۔ میر صاحب کے کسی پورے مرثیہ پر نظر ڈالیے یا اُس کے کسی جزو کو ملاحظہ کیجیے تو اس کے کل یا جزو کو تناسب سے خالی نہیں پائے گا۔ یہ تناسب کی خوبی میر صاحب کے حصہ کی ہے۔ جاننا چاہیے کہ دوسرا نام تناسب کا اعتدال ہے۔ دائمی جو اعتدال میر صاحب کے مراٹھ میں موجود ہے کسی شاعر کے مراٹھ میں نہیں ہے۔ میر صاحب کی تشبیہوں میں اعتدال ہے۔ میر صاحب کے

استعارات میں اعتدال ہے اور میر صاحب کے مبالغوں میں اعتدال ہے۔ یہی اعتدال ہے جس نے میر صاحب کو جمیع مرثیہ نگارانِ عالم سے علاحدہ کر رکھا ہے۔ جاننا چاہیے کہ تمام عالم کا انتظام اعتدال پر موقوف ہے۔ حکیم کی نظر سے دیکھئے تو معلوم ہو کہ نظامِ شمسی اور جمیع نظامِ فلکی کا مدار اعتدال پر ہے۔ یہ نظامِ شمسی جس سے ہم کو تمام تر تعلق ہے اس کا مرکز آفتاب ہے۔ اس کے ارد گرد بہت سے سیارے گھومنا کرتے ہیں۔ اہلِ واقفیت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ اگر آفتاب اور سیارات میں جہی تناسب نہ ہوتا تو یہ نظامِ شمسی حالتِ موجودہ پر نہیں رہتا۔ آج جہاں آفتاب کی دوڑی ہو جائے تو سب سیارے کھینچ کر آفتاب سے چپاں ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ سال و ماہ کون و خصوف وغیرہ وغیرہ سب کو ندارد ہی سمجھیے گا۔ صرف یہ تناسب ہی ہے جس سے رزقِ آفتاب طالع ہوتا ہے۔ اندر و رب ہوتا ہے۔ چاند ٹھکتا ہے اور ڈوبتا ہے۔ اور جو کچھ ہوتا رہتا ہے یہ تناسب ہی ہے جس سے جس کو وجود حاصل ہے۔ یہ تناسب ہی ہے کہ جس سے ہر ذی حیات زندہ ہے۔ اگر تناسب نہیں تو کچھ نہیں۔ اسی طرح یہ تناسب ہی ہے کہ جس نے میر صاحب کے کلام کو لا جواب بنا رکھا ہے۔ بند ہائے بلا از ابتدا تا انتہا سبحان اللہ کس طرح زیورِ تناسب سے آراستہ ہیں کہ خط و خال کو بھی بے اعتدال کہیں پر نظر نہیں آتی ہے۔ یہ طرزِ بیان لاریب عینِ تناسب ہے اور اسی لیے کمالِ محسن کا منظرِ اتم ہے حضراتِ ناظرین آخر کے حیرت کے دونوں منراعوں کو ملاحظہ فرمائیے کہ تناسب کے پورے نمونے اور بے تکلفی کی پوری تصویر ہیں۔

## نمبر ۲۔ شکر اعدا سے حضرت قاسم علیہ السلام کی جنگ

کیوں کر تمام فوج سے وہ تشنہ لب لڑے      اک اک لڑا نہ آہ بہم ہو کے سب لڑے  
کھا کھلے زخمِ مثلِ امیرِ عرب لڑے      جانبا زیاں غنص کی دکھائیں غضب لڑے  
جلوہ میان تشنہ دہانی دکھا دیا  
بچپن میں لڑکے زور جوانی دکھا دیا  
لٹکارا جس لے بس دیں گھوڑا ڈپٹ کے آئے      یوب آئے جیسے شیرِ دلاور جھپٹ کے آئے  
بھلی گری ادھر کو جدھر کو پلٹ کے آئے      صف کو بچا کے آئے پرے کو پلٹ کے آئے  
منہ سرخ تھا کھلے ہوئے تھے زخمِ سینے کے  
بن کر لہو میکتے تھے قطرے پسینے کے



کاٹے تیغ سے کارِ سلم لیا دستِ یمن نے جنگ سے آرام کم لیا  
پھر دستِ چپ میں تیغِ دوسر کو بہم لیا تیورائے سنبھلے منہ سے ہو پوچھا دم لیا  
یاں بند ہو کے آنکھ کھلی جتنی دیر میں  
سو تیر دل کو توڑ گئے اتنی دیر میں

آخر گھرا سپاہ میں وہ چودھویں کا ماہ روکے تھے فوج تیروں سے اور بھٹیوں کے گراہ  
لشکر کے ساتھ تھا سپر سجدہ سیاہ تلوار چل رہی تھی کہ اللہ کی پناہ  
غلّ تھا کہ روند ڈالا ہے لشکر کے باغ کو  
ہاں غازیو، بھگادو حسن کے چراغ کو

تینیں چڑھائی تھیں بولعینوں نے سانپ پڑتی تھیں وہ قریب سے اس ناتواں پر  
تیروں پہ تیسرے کمانیں کمان پر ہلہ تمام فوج کا تھا ایک حبان پر  
یوں برچھیاں تھیں چار طرف اس جناب کے  
جیسے کرن نکلتی ہے گرد آفتاب کے

غنم میں جھکا فرس پہ جو وہ غیتِ قمر مارا کسی نے فرق پہ اک گرز کا دوسر  
برجھی لگی جو سینہ پہ مکر مے ہوا جگر گرتے تھے اسپ سے کمر پر پڑا بتر  
طارق کی تیغ کھا کے پکارے امام کو  
فرادیا سین بجاؤ غلام کو

یہ سین دکھلا رہا ہے کہ حضرت قاسم علیہ السلام لشکر اعداد میں گھرے ہوئے ہیں۔ اور تن تنہا  
بہادری کے ساتھ ایک فوج کثیر سے لڑ کر زخمی ہو رہے ہیں اور آخر کار زخموں سے چور ہو کر گھوڑے  
سے زمین پر گرتے ہیں۔ لاریب یہاں بھی مناسب کلام وہی ہے جو میر انیس کی شان ہے۔ تناسب  
تو آپ کا کلام کبھی خالی نہیں ہوتا۔ ان بندوں میں بھی وہی اعتدال ملحوظ رہا ہے جس سے آپ کی شاعری  
ہمیشہ ممتاز نظر آتی ہے۔ کوئی شک نہیں کہ تبعیتِ فطرت میر صاحب کا کلام ہے۔ یہی تبعیتِ فطرت  
آپ کے کلام میں تناسب اور اعتدال پیدا کرتی ہے جس سے آپ کی شاعری مصوری کی داد دیتی  
ہے۔ واضح رہے کہ میر صاحب کے مرثیے کے بند ایسے نہیں ہیں کہ صرف فرداً فرداً خوب ہیں۔ بلکہ  
اجمالی حیثیت سے ان کے تناسب اور اعتدال کا جلوہ اور بھی واضح طور پر دکھلائی دیتا ہے۔  
تناسب کی خوبی عجب خوبی ہوتی ہے بغیر تناسب کے حسن کا وجود ناممکن ہے۔ اگر کسی شخص کے

جسم کے اعضا فرداً فرداً خوبصورت ہیں مگر ان میں تناسب موجود نہ ہو تو ایسا شخص حسین نہیں کہا جاسکتا۔ تناسب کی معدولی کے ساتھ علیحدہ علیحدہ ہر جزو بدن کی خوبصورتی وہ اجمالی حیثیت نہیں پیدا کر سکتی۔ جس کو حسن کہتے ہیں۔ میر صاحب کا ہر مرثیہ جو اس قدر حسین انداز رکھتا ہے۔ اس کا سبب یہی ہے کہ حضرت کا مرثیہ مطلع سے مقطع تک تناسب کی خوبی سے خالی نہیں پایا جاتا ہے یہ وہ خوبی ہے کہ ان کے صاحبزادے میر نفیس صاحب کے مرثیوں میں بدرجہ اتم نہیں پائی جاتی ہے۔ اس لیے میر نفیس صاحب کے مرثیوں میں صاحب کے مرثیوں کے درجہ کو نہیں پہنچتے ہیں۔ میر انیس صاحب کا اعتدال کلام ایک حیرت انگیز انداز رکھتا ہے۔ سبحان اللہ آپ کے مبالغہ تشبیہات اور استعارے بھی اعتدال سے خالی نہیں ہوتے ہیں۔ آپ بالائیں ایک بند کی ٹیپ یوں رسم فرماتے ہیں:-

یوں برجیاں تھیں چار طرف اس جنا کے  
جیسے کرن نکلتی ہے گرد آفتاب کے

اس تشبیہ کا اعتدال قابل لحاظ ہے اور صفت اس تشبیہ میں یہ رکھی گئی ہے کہ یہ تشبیہ اپنی ذاتی حیثیت سے مدح کا ایک نفیس پہلو پیدا کر دیتی ہے۔ لاریب میر صاحب کا کلام بید بلوغ ہوا کرتا ہے۔ یہ عوام کی لاعلمی ہے جو کہا کرتے ہیں کہ میر صاحب صرف فصیح تھے۔ بلوغ نہ تھے۔ کسی قدر یہ قول بے معنی ہے۔ فصاحت و بلاغت سے جدا نہیں ہوتی۔ چوں کہ میر صاحب کی بلاغت ہمیشہ احاطہ اعتدال میں رہتی ہے۔ اس لیے آپ کا کلام بادی النظر میں بلوغ نہیں معلوم ہوتا ہے۔ عوام غیر معتدل بلاغت کو بلاغت جانتے ہیں۔ اس لیے انھیں میر صاحب کے کلام کی بلاغت بلاغت نہیں معلوم ہوتی۔

### نمبر ۳ تلوار کی تعریف۔ خارجی مضامین کی تیسری مثال

اک آگ سی تھی چار طرف شعلہ نشاں برق      وہ برق کہ خود مانگتی ہے جس سے اماں برق  
یاں موج تو واں سیل جو یاں ابر تو واں برق      منہ نہ برش قہر بدن آگ زباں برق  
سکرش تھا جو ناری یہ جب لاتی تھی اسی کو  
لوہے پہ بھی گرتی تھی تو کھاتی تھی اسی کو



اٹھ کر کبھی ٹھہری کبھی بچکی کبھی چپکی مگر گئے گردن جدھر اس تیغ نے خم کی  
سیدھی صف دشمن کو ملی راہ عدم کی سیفی تھی کہ گویا دم شمشیر پر دم کی  
دم بھر میں صفیں صاف تھیں بیدار گرس کی

تھیں مینہ کی طرح خاکت بوجھار سردوں کی  
کس کے سر و گردن میں جدائی نہ دکھائی صف کون سی تھی جس کو صفائی نہ دکھائی  
کس کو اسد حق کی لڑائی نہ دکھائی مقتل میں کسے عقدہ کشائی نہ دکھائی  
ریلا جو ہوا ناریوں کا رول کے نکلی

شیرازہ اجڑائے بدن کھول کے نکلی  
اک ضرب میں ہاتھ اس کے اڑائے تو سرا سکا شاخیں کٹیں اس نخل ستم کی ثمر اس کا  
دل اس کا دو پارہ کیا کاٹا جگر اس کا دم ہو گیا آخر اُدھر اس کا اُدھر اس کا  
جس جا پہ جھکے خون کی ندی وہیں بہ جائے  
کیا دخل تھا اس کا کہ کسی بات پہ رہ جائے

تھا صورت آئینہ تمام اس کا بدن صاف خون پیتی تھی پردیکھو تو منہ صاف دہن تھا  
چلتی تھی جو سن سن یہ نکلتا تھا خون تھا ہوں میں تو وہ جاذب کئے کر دیتی ہوں رن تھا  
نااہل ہیں نامرد ہیں ناپاک ہیں اعدا

میں برق غضب ہوں خس خاشاک ہیں اعدا  
چم خم سے ہلال فلک نیلوفر تھی مارا تھا ہزاروں کو مگر خون سے بری تھی  
شوخی تھی نئی اور نئی جلوہ گری تھی تھی تیغ کہ قبضہ میں سلیمان کے پری تھی

اک آگ لگی دار جدھر چل گیا اس کا

جو آگیا سایہ میں بدن جل گیا اس کا

ایک اور ٹیپ تلوار کی تعریف میں نہایت لاجواب ہے وہ یہ ہے:

اشرف کا بنائے ڈیسوں کی شان ہے

شاہوں کی آبرو ہے سپاہی کی جان پر

واقعی یہ کیا سچی تعریف تلوار کی ہے یہ سچ یہ ہے کہ واقعہ نگاری میر صاحب پر ختم ہے۔

واضع ہو کہ کسی زبان میں تلوار کی تعریف ان ترکیبوں سے نہیں دیکھی جاتی ہے۔ اہل عرب

ہمیشہ سے شمس و دست رہے ہیں۔ مگر ذکر شمس کے علاوہ کوئی خاص تعریف شمس کی عربی زبان میں راقم کی نظر سے نہیں گزری ہے۔ ہومر کی ایلٹا اور دجل کی اپنیڈ بھی ایسی تعریفات سے معرا نظر آتی ہیں۔ خیر فطری حد تک ہر شے کی تعریف کوئی مضائقہ نہیں رکھتی ہے مگر جب تلوار کی تعریف میں زمین اور آسمان کے قلابے ملائے جاتے ہیں۔ تو ایسی تعریفوں کا مطلق اثر دل پر نہیں ہوتا۔ بلکہ ایسی تعریفیں موجب نفرت ہو جاتی ہیں۔ ایسی تعریفیں جو مدوح کے ہمتی گھوڑے اور تلوار کو عجائب المخلوقات بنادیتی ہیں۔ قصیدہ گو شعرا کا ایک خاص شیوہ ہے مگر بعض مرثیہ گو یوں نے بھی وہی روش اختیار کی ہے۔ لاریب یہ قبیح نہایت ناپسندیدہ ہے۔ بہر حال میر انیس صاحب نے ہر چند تلوار اور گھوڑے کی تعریفیں اکثر نظم کی ہیں لیکن فطری انداز سے آپ کے بیانات چنداں علاحدہ نہیں رہے ہیں۔ اس لیے دل آویزی سے بھی چنداں خالی نہیں پاتے جاتے ہیں۔

### نمبر ۴ گھوڑے کا بیان

لکھتا ہے ادھم قلم اب سرعت عقاب      نعل اسکی ماہ نو میں تو سم ترک آفتاب  
بستی میں سیل ہے تو بلندی میں ہے سحاب      سرعت میں برق گرم روانی میں جوئے آب

اڑنے میں اس فرس کو پرندوں پہ ادج ہے

اک شور تھا قدم نہیں دریا کی موج ہے

افزوں ہے زلف حور سے خوشبوایاں کی      دیکھیں تولین بلائیں مس! ہاں ہاں کی  
پریاں غرام نلزمین شاگرد چال کی      غصہ میں جست شیر کی شوخی غزال کی

وہ حسن تن پر سار کا جو بن یراق کا

دلراں کے ہاتھ پاؤں تو چہرہ براق کا

نازک مزاج و فستق انعام و تیسر رو      گردن سیرا دیہ پیماں و برق دو

اس کا نہ اک قدم نہ زغندین ہرن کی سو      دور روز سے نہ کاہ ملی تھی اُسے نہ جو

رفار میں ہوا تھا اشارے میں برق تھا

سرعت میں کچھ کمی تھی نہ چھیل بن میں فرق تھا

صرصر سے تند بو سے سبک رد ہوا سے تیز      چالاک فہم و فکر سے ذہن رسا سے تیز

طاؤس و کبک نے سر و عقاب ہما سے تیز      جانے میں اڑ کے ہر ہر سب سے تیز



توفیق کا مہدا ہے توجہ کوئی دم کر گننام کو اعجاز بیانوں میں رقم کر  
 جب تک یہ چمک مہر کے پر تو سے نہ جائے  
 اقلیم سخن میسری قلمرو سے نہ جائے  
 اس باغ میں چٹھے ہیں تیرے فیض کے جاری بلبل کی زباں پر ہے تری شکر گزاری  
 ہر نخل برومند ہے یا حضرت باری پھل ہم کو بھی مل جائے ریاضت کا ہماری  
 وہ گل ہوں عنایت چین طبع نکو کو  
 بلبل نے بھی سونگھا نہ ہو جن پھولوں کی بو کو  
 خواص طبیعت کو عطا کر وہ لالی ہو جن کی جگہ آج سرسبز پہ خالی  
 ایک ایک لڑی نظم ثریا سے ہو عالی عالم کی نگاہوں سے گرے قطب شمالی  
 سب ہوں درمیتانہ علاقہ ہو کسی سے  
 نذران کی یہ ہونگے جنہیں رشتہ ہے نبی سے  
 بھر دے درمقصود سے اس دج دہاں کو دریائے معانی سے بڑھا طبع رواں کو  
 آگاہ کر انداز تکلم سے زباں کو عاشق ہو نصاحت بھی وہ دے حسن بیاں کو  
 تحسین کا سموت سے نعل تابہ سمک ہو  
 ہر گوش بنے کان ملاحات وہ نمک ہو  
 ساقی کے کرم سے ہو وہ دور اور چلیں جام جس میں عوض نشہ ہو کیفیت انجم  
 ہرست فراموش کرے گردش ایام صوفی کی زباں بھی نہ ہے فیض سے ناکام  
 باں بادہ کشو پوچھ لومینخانہ نشیں سے  
 کوثر کی یہ موج آگئی ہے خلد بریں سے  
 آؤں طرف رزم ابھی چھوڑ کے جب بزم خیبر کی خبر لائے میری طبع ابوالعزم  
 قطع سراعدا کا ارادہ ہو جو بالجزم دکھلائے یہیں سکوزباں معرکہ رزم  
 جل جائیں گے عدا و گ بھرکتی نظر آئے  
 تلوار پہ تلوار چمکتی نظر آئے  
 ہو ایک زبان ماہ سے تا مسکن ماہی عالم کو دکھا دی برکش سیف الہی  
 جرات کا دھنی تو ہے یہ چلائیں مسپاہی لاریب تیرے نام ہے سکے شاہی

ہر دم یہ اشارہ ہودوات اور قلم کا  
تو مالک و مختار ہے اس قلم و قلم کا

بند مے بالا پر ریلو :-

یہ مناجات طولانی ہے۔ یہاں صرف چند بند ابتدائے مطلع سے نمونہ کے طور پر درج کیے گئے ہیں لاریب شاعری کی مناجات اس سے زیادہ خوش اسلوبی کے ساتھ حوالہ قلم نہیں ہو سکتی ہے۔ یہ ایسی ہی مناجات ہے کہ درگاہ مجیب الدعوات میں قرین اجابت ہوئی، میر صاحب جس نعمت کے طالب ہوئے لاریب اس سرکار و اہب العطایا سے انہیں مل گئی ورنہ عنایت ایزدی کے بغیر ایسے کلام کا نصب ہونا توقع سے باہر ہے۔ سبجان اللہ داخلی مضامین پر بھی میر صاحب کی طبیعت عالی کس قدر اختیار رکھتی ہے۔ اس مناجات کے مضامین تمام تر داخلی پہلو رکھتے ہیں اور کس قدر حُسن قبول کی شان ان سے آشکارا ہے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ کوئی شاعر رزمی شاعر نہیں ہو سکتا جب تک کہ اُسے خارجی اور داخلی مضامین کی بندش پر یکساں قدرت حاصل نہیں رہتی ہے۔ اب ذیل میں اور بھی دو مثالیں داخلی مضامین کی بدیہ ناظرین ہوتی ہیں۔

نمبر ۲۔ حالت قلب نام حسین علیہ السلام حضرت بانو کی بوقت خوصت علی اکبر

ہتھیار پر سجتا ہے گھبراتے ہیں ما باپ      سرتا بقدم بید سے تھراتے ہیں ما باپ  
رُخم اس نے نہیں کھائے غم کھاتے ہیں ما باپ      اکبر ابھی جیتے ہیں موئے جاتے ہیں ما باپ  
اللہ رے اکفت پسر ماہ بقا کی  
دل سینے میں کہتا ہے دہائی بے خدا کی  
سر پیٹ کے جب گرد پر پھرتی ہے، مادر      میں بال کھلے سر سے گری پڑتی ہے چادر  
آہستہ اشارہ ہے کہ یا سبط چمبصر      رو کو انہیں ہاتھوں سے چلے اب علی اکبر  
میں صاحب الفت انہیں رحم آئیگا تم پر  
تم بیٹے کو رو کو نہیں گرتی ہوں قدم پر  
صاحب میرے فرزند کو چھاتی سے لگاؤ      رشتے ہوں تو مجھے علی اکبر کو مناؤ  
ماں ان کی ہیں زینب انہیں اس وقت بلاؤ      اس دافع سے لونڈی کے کلیجے کو بچاؤ



اٹھا ہر برس سامنے آنکھوں کے رہے ہیں  
 پالا ہے بڑے دکھ سے بڑے رنج ہے ہیں  
 بانو سے اشارے میں یہ فرماتے ہیں شبیرؒ اس وقت کلیجے پہ مرے جلتی ہے شمشیر  
 ہے ہے میں کروں کیا کوئی بنتی نہیں تدبیر بابا سے چھڑا ق ہے ترے لال کو تقدیر  
 کس طرح سے میں روک لوں اس ماہ لقا کو  
 تنہائی شبیرؒ ہے منظور خدا کو  
 اتنے میں کمر باندھے چلے اکبرؒ جزار سینے میں دھڑکنے لگا بانو کا دل زار  
 فرزند کا منہ تکنے لگے سید ابراہیمؒ ہم شکل پیمبر ہوئے رخصت کے طلبگار  
 ہاتھوں سے کلیجہ شہ بے پر نے سنبھالا  
 گرنے جو لگی ماں علی اکبرؒ نے سنبھالا  
 فرما! پدر صدقے ہواے اکبرؒ ذی شان کیا کہتے ہو رخصت کسے کہتے ہیں مری جان  
 دم کس میں ہے دے کون تمہیں رخصت میداؒ دنیا سے یہ شبیرؒ کی رحلت کا ہے سامان  
 ماں باپ چراغ سحری ہیں علی اکبرؒ  
 ہم تم سے بھی پہلے سفری ہیں علی اکبرؒ  
 کس طرح سب ادا داغ جوانی ہو گوارا سہرا بھی تو دیکھا نہیں بابا نے تمہارا  
 عباس سے قوت تھی وہ دنیا سے سدھارا اب کوئی نہیں ہے مری پسیری کا سہارا  
 میدان بلا میں یہ دغا کرنے کے دن ہیں  
 بتلا علی اکبرؒ یہ ترے مرنے کے دن ہیں  
 اکبرؒ نے کہا شرم سے گردن کو جھکا کر میں قبلہ و کعبہ کی رضا سے نہیں باہر  
 ہے آپ سے انصاف طلب آپ کا دلبر سب قتل ہوں اور جان بچائے علی اکبرؒ  
 فرزند جس کی تو شجاعت کا بیاں ہو  
 اور جو ہر شمشیر حسینیٰ نہ میاں ہو  
 جو ہر بہن خالق نے شجاعت کا دیا ہے مردوں سے عوض خون عزیزاں کا لیا ہے  
 مولا کوئی دنیا میں ہمیشہ بھی جیا ہے دور روز سے پانی نہیں خادم نے پیا ہے

اب جان حزیں جسم میں گھبراتی ہے بابا  
 کوثر پہ ہمیں پیاس لیے جاتی ہے بابا  
 مکڑے ہوا تقریر سپر سے دل سرور      کچھ بس نہ چلا رو دیئے گردن کو جھکا کر  
 فرمایا کہ پانی مجھے ہوتا جو میسر      تم کا ہے کو بابا سے بچھڑتے علی اکبر  
 کوثر پہ چلے تشنہ دہاں باپ کے گھر سے  
 افسوس تمہیں پیاس چھڑاتی ہے پدر سے  
 اکبر نے کہا میں نے بہت پیاس کو مارا      حضرت کی قسم ہے نہیں اب ضبط کا یارا  
 شہ نے کہا یہ داغ بھی کر لیں گے گوارا      رونا تو ہے اس لیے کہ نہیں کوئی ہمارا  
 آفت کا کبھی دکھ میں نہ شکوہ کیا ہم نے  
 عباس علی مرگئے تب کیا کیا ہم نے  
 تم ہوتے تو یہ ہوتا کہ لاشے کو اٹھاتے      اور قبر ہماری اسی جنگل میں بناتے  
 ہم غسل و کفن ہاتھ سے فرزند کے پاتے      اس دشت میں مرتے تو مہلا دھوپ کھاتے  
 مرضی تو تمہاری نہیں بس باپ کا کیا ہے  
 کچھ غم نہیں پر خیر ہمارا بھی خدا ہے

## بند ہائے بالا پر ریویو :-

بند ہائے بالا میں عجب درد انگیز سین میرا میں صاحب کی فطرت نگاری نے پیش نظر کر دیا ہے  
 حضرت علی اکبرؓ شکر یزید سے سامنا کرنے کے لیے تشریف لے جا رہے ہیں۔ امام حسینؓ دو بھانجوں  
 حضرت عون و محمد سبجائی حضرت عباسؓ اور بھتیجے حضرت قاسمؓ کے داغ غم اٹھا چکے ہیں اور اب آپ  
 کے بیٹے علی اکبرؓ کی شہادت کی باری آرہی ہے حضرت شہر بانو کے دم میں دم نہیں ہے حضرت امام  
 حسینؓ علیہ السلام کے دل پر جو گزر رہی ہے کچھ کہا نہیں جاسکتا مادر و پدر کی جو حالت ایسے وقت  
 میں تقاضائے فطرت سے ہو سکتی ہے اُسے میرا صاحب کی قابلیت شاعری نے خوب دکھلایا ہے۔  
 مادر و پدر کے فراق غم کی تصویر نہایت تبعیت فطرت کے ساتھ کھینچی گئی ہے۔ اضطراب مادر اور  
 استقلال پدر کے بیانات ایک حیرت انگیز انداز رکھتے ہیں۔ لاریب حضرت علی اکبرؓ کی رخصت کا  
 سین بند ہائے بالا میں اس وقت ڈراما نگاری کے ساتھ حوالہ قلم ہوا ہے جو شکسپیر اور کالی داس کو



واہب العطاء نے بخشی تھی۔

نمبر ۱: حال استقلال حضرت زینب علیہا السلام وقت رخصت حضرت عون و محمد  
مضامین داخل کی تیسری مثال :-

نگاہ ہوا شور مبارک ز طلبی کا پھر قصد لعینوں نے کیا بے ادبی کا  
منہ سرخ ہوا غیض سے ہم شکل نبی کا رایت بھی بڑھا فوج رسول عربی کا

حیدر کے نواسوں کے بھی ابرو پہ بل آیا  
چھوٹا تو یہ بگڑا کہ پرے سے نکل آیا

گھبرا کے پکارے جو انہیں سید ابرار بس پھر کے گرے پاؤں پہ آقا کے وہ حرار  
کی عرض بصد عجز کہ اے کل کے مددگار ہم دونوں غلام اب ہیں اجازت کے طلبگار

بی تاب ہیں دل جاں مصیبت میں پڑی ہے  
اے نور خدا ذرہ نوازی کی گھڑی ہے

مرنے کو اگر پہلے گئے قاسم و اکبر پاشاہ ہیں دودھ نہ پھر بخشیں گی مادر  
شبیر کی وہ تصویر یہ ہم شکل پیمر توقیر اسی میں ہے کہ ہم صدقہ ہوں ان پر

مالک ہیں خداوند ہیں سردار ہیں دونوں

ہم ان کے بزرگوں کے نمک خواہیں دونوں

بسل جو ہوئے مسلم مظلوم کے پیارے ہم خیمہ میں جا سکتے نہیں شرم کے مارے  
اماں نے کہا ہوگا کہ اب تک نہ سدھارے جانوں کو بچاتے ہیں جگر بند ہمارے

قاصر ہیں جو توقیر شہادت نہیں ملتی

کیا جانیں اے وہ کہ اجازت نہیں ملتی

حضرت یہ ہے روشن جو ہمارا ہے ارادا سن کم ہے پہ ہمت ہے جوانوں سے نیا دا  
نانا تو غی جعفر طیار ہے دادا ہم ڈھونڈتے ہیں صبح سے فردوس کا جادا

شیروں کی طرح ہمیشہ حیدر ہیں پلے ہیں

تکواروں سے ہم کھیل کے اس گھر میں پلے ہیں

وہ تیغ کے مالک ہیں تو مختار ہیں ہم بھی دادا کی طرح مرنے پہ تیار ہیں ہم بھی

نا اٹھے جو کرار توجہ ترا میں ہم بھی سروے کے شہادت کے طلب گاہ ہیں ہم بھی  
 ہے جوش و فاعل کے پیمانے بھرے ہیں  
 ہم صبح سے سوزندہ کو ہاتھوں پہ بھرے ہیں  
 ہم آپ کے مرنے کے لیے جا نہیں سکتے زخم تبر و تیر و سنان کھا نہیں سکتے  
 بے حکم جو مطلب ہم اُسے پا نہیں سکتے آداب کے کچھ لب پہ سخن لا نہیں سکتے  
 ہم پیچھے ہیں سب کے یہ تقدیر ہماری  
 ہاتھ آپ کے ہے عزت و توقیر ہماری  
 ہم دونوں غلام اکبر و اصغر کے ہیں پاشاہ الفت کو بس اب دل سے اٹھائیجئے لہ  
 اماں کا تونا زکے مزاج آپ ہیں آگاہ بنت اسد حضرت باری ہیں وہ ذی جلال  
 پوچھیں گی فنا ہو کے تو کیا اُن سے کہیں گے  
 آزر دہ ہوئیں وہ تو کہیں گے نہ میں گے  
 عورت ہیں یہ خوبوشہ مردان کی ہے ساری شب کو بھی یہ فرمایا تھا ہم سے کئی باری  
 تم یہ نہ سمجھو کہ میں عاشق ہوں تمہاری بھائی سے مجھے جان نہ اولاد ہے پیلری  
 کس کام کے پھر سر جو تصدیق نہ کرو گے  
 تب دودھ میں خشونگی جو عزت سے مرو گے  
 یہ کہہ کے جو رونے لگے زینب کے جگر بند حضرت نے کہا میں ہوں بہر حال رضا مند  
 کھوئے ہیں کسی بھائی نے ہمیشہ کے فرزند کس مزے کہوں آہ کہ ہو خاک کے پیوند  
 تنہائی کا دکھ فاطمہ کا ال ہے گا  
 لاشے کے اٹھانے کو بھی کوئی نہ ہے گا  
 اکبر کو تو ہمیشہ نے میں نے تمہیں پالا ماؤں سے جدا ہوتے ہو جب ہوش بہنالا  
 اب کون ہے غربت میں مرا متاع منے والا دل کا کوئی انداز نہیں تم سے نکلا  
 دس سال بھی پورے نہیں دو نوے کے سن نہیں  
 دنیا سے اجل لے چلی بچپن کے دنوں میں  
 دونوں سے یہ فرما کے ادھر روئے تھے شیر چپ چچی تھی رائدوں میں شاہ کی ہمیشہ  
 سوزناؤ پہ تخافکر میں اور لب پہ یہ تقریر محبوب کیا بیٹوں نے ہے ہے مری تقدیر



میں جانتی تھی پہلے اجازت وہی لیں گے  
اس کی نہ خبر تھی کہ دغا وقت پہ دیں گے

آتا ہے دم صبح سے یاں لاشے پہ لاشا ان کے لیے اوروں کی لڑائی ہے تماشا  
پائی نہ اجازت یہ سخن خوب تراشا باتیں ہیں یہ ساری مجھے باور نہیں حاشا  
رکتے ہیں دلاور کہیں روکے سے کسی کے  
وہ سب بھی تو پیارے تھے حسین بن علی کے

بانو نے کہا دونوں کی عمریں ہیں ابھی کیا نہ گھر سے وہ نکلے نہ کوئی معرکہ دیکھا  
میراں کی رضادیتے نہ ہوں گے شہ والا آزدہ نہ ہوں آپ یہ غصہ کی نہیں جاسا  
سن لیجیے گارن میں جو کچھ کام کریں گے  
حیدر کے نواسے ہیں تیسرا نام کریں گے

فرمایا کہ ہاں جو مجھے تقدیر دکھائے جی جاؤں گی مرکز جو وہ میدان سے آئے  
کیوں شاہ سے رخصت کا سخن بپہ لائے کیا جانتے کس فکر میں ہیں وہ مرے جائے  
جو چاہیں کریں بیٹوں کے قابل میں کہاں ہوں

اب وہ مرے فرزند نہ میں دونوں کی ماں ہوں  
یہ ذکر تھا فاضل جو خبر لے کے یہ آئی فرمایا کہ اب لاشی ہے زینب کی کسائی  
لو میرے خورادوں نے رضا جنگ کی پائی اسے بنت علی رو رہے ہیں آپ کے بھائی  
بچے بھی شمر یک شہدا ہوتے ہیں لوگو

دو بھانجے ماموں پہ فدا ہوتے ہیں لوگو  
فطر سے یہ سنا تھا کہ بس رونے لگے سب سجدے میں جھکیں حضرت زینب  
فرمایا کہ صد شکر بر آیا مرا مطلب عزت مرے بچوں کی ترے ہاتھ ہے یا رب  
بہتر ہے جو لڑنے کو وہ پیارے گئے دونوں  
یہ خوش خبری آئی کہ مارے گئے دونوں

فطرت نگاری میرا نیس صاحب کا حصہ ہے بند ہاتھ بالاتما متر ڈرامائی خوبیوں کا انداز دیکھتے  
میں حضرت زینب کا کیریکٹر خوب ہی حوالہ قلم ہوا ہے جو جو صفیں شہنشاہ لافلی کی بیٹی میں ہونی  
چاہیں آپ میں موجود تھیں۔ چوں کہ بھائی کی فدائی تھیں۔ بیٹوں کو بھی بھائی پر تصدیق کر ڈالنا

آسان سمجھتی تھیں۔ ظاہر میں تو ایسا ہی دکھائی دیتا ہے کہ امام علیہ السلام کی محبت میں اپنے لڑکوں کا خیال بھی آپ کو باقی نہیں رہا تھا۔ مگر اصل وجہ اس شیفگی کی یہ تھی کہ بالیقین آپ اپنے بھائی کو امام من جانب اللہ جانتی تھیں۔ اس لیے بیٹیوں کی شہادت کی بھی آپ کو پروا نہیں رہی تھی، یہ بات آپ ہی کے ساتھ مختص نہ تھی جتنے ذکور و اثنا حضرت امام علیہ السلام کے شریک حال تھے ان سب افراد کا بھی یہی عقیدہ تھا کہ امام علیہ السلام امام من جانب اللہ ہیں۔ من جانب الناس نہیں، ظاہر ہے کہ اس زور عقیدہ کے ساتھ کون کبخت ایسا ہو سکتا تھا کہ امام علیہ السلام کا فدائی نہ ہوتا، خاندان پیغمبر کے حضرات اور ان کے تابعین جو شریک واقعہ کر بلا تھے یہ سب حضرات تو امام علیہ السلام کو امام من جانب اللہ جانتے ہی تھے مگر یہی سمجھ حضرت کو بھی لشکرِ یزید سے نکال لائی ورنہ حضرت امام کا طرفدار ہو جانا ایک ایسے غیر شخص کا جس کو دنیاوی فائدہ کی خس برابر امید نہ ہو محض خلافِ فطرت ہوتا لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ حرنے امام علیہ السلام کو امام من جانب اللہ مانا اور حضرت کے لیے مرجانے کو ایک آسان امر جانا، ظاہر ہے کہ اس زور عقیدہ کے بغیر کوئی شخص اپنی ہلاکت گوارا نہیں کر سکتا ہے پس حضرت زینب اس یقین کے ساتھ کہ امام علیہ السلام امام من جانب اللہ ہیں کیوں کر اپنے بیٹوں کو حضرت پر تصدق کر ڈالنا ایک امر ضروری نہیں سمجھتیں۔ واضح ہو کہ حضرت زینب کے کیر کیر کے علاوہ حضرت امام حسین علیہ السلام حضرت بانو حضرت عون حضرت محمد اور حضرت فضہ کے پارٹ (PART) یعنی ان کے قولی اور فعلی معاملات میر صاحب نے ڈراما نگاری کے اعلیٰ اصول کی پابندی کے ساتھ حسنِ نہج پر حوالہ قلم فرماتے ہیں۔ ہومراؤٹسکس پیر بھی اس سے زیادہ ڈراما نگاری کا جوہر نہیں دکھلا سکتے تھے۔

### میر صاحب کے مراقب کس طرح کے مضامین پر مشتمل ہیں

واضح ہو کہ میر صاحب کے مضامین مراقب عموماً ایسے ایسے مضامین پر مشتمل ہیں جیسے حمد و احکام خداوند تعالیٰ جل شانہ، ثنا و کلام حضرت رسالت مآب صلعم۔ مناقب کلام حضرت امیر علیہ السلام، مدح و کلام حضرت خاتونِ جنت علیہا السلام، مدح جناب حضرت امام حسن علیہ السلام، مدح جناب امام حسین علیہ السلام، مدح حضرت عباس علمدار علیہ السلام، مدح حضرت علی اکبر و حضرت قاسم و حضرت عون و حضرت محمد سلام اللہ علیہم، مدح حضرت زینب علیہا السلام، مدح حضرت شہر بانو علیہا السلام، ذکر ولادت حضرت امام حسن علیہ السلام، ذکر ولادت حضرت امام حسین علیہ السلام



وصایا و کرم و اخلاق و مناجات و کلمہ صبر و رضائے آنحضرت، حال روانگی آنحضرت از مدینہ منورہ  
جانب مکہ معظمہ، حال روانگی آنحضرت جانب کوفہ از مکہ معظمہ، حال زحمت سفر، ذکر انصار جناب امام  
حسین علیہ السلام، تیاری ہائے جنگ فریقین در مقام کربلا، رجز حضرت امام حسین علیہ السلام  
مع کلمات و عظم و پند و جنگ امام علیہ السلام با اعدائے دیں۔ رجز و جنگ علی اکبر علیہ السلام،  
رجز و جنگ حضرت عباس علیہ السلام رجز و جنگ حضرت قاسم علیہ السلام رجز و جنگ حضرت عون  
و محمد علیہما السلام، رجز و جنگ حضرت حُر علیہ السلام، حالت قلب حضرت امام حسین علیہ السلام  
وقت رخصت و شہادت حضرت علی اکبر علیہ السلام حالت قلب آنحضرت وقت شہادت علی اصغر  
علیہ السلام، حالت قلب آنحضرت وقت رخصت و شہادت حضرت عباس علیہ السلام، حالت قلب  
آنحضرت، وقت شہادت حضرت قاسم علیہ السلام، وفاداری حضرت عباس علیہ السلام، جلال  
حضرت عباس علیہ السلام، وفاداری و دین داری، حضرت حُر علیہ السلام، قدر دانی و عزت  
افزائی حضرت حُر علیہ السلام از جانب حضرت امام حسین علیہ السلام، استقلال حضرت زینب وقت  
رخصت حضرت مون و حضرت محمد علیہما السلام، اضطراب حضرت زینب وقت روانگی حضرت امام  
حسین علیہ السلام جانب میدان جنگ و شہادت آنحضرت۔ جنگ امام علیہ السلام با اعدائے  
دین و شہادت آنحضرت، ہنگامہ میدان جنگ، صبر و استقلال حضرت امام زین العابدین  
علیہ السلام در حالت مصیبت روانگی اہل حرم جانب شام، دربار یزید، زندان شام، سامان  
جہانداری از جانب شیریں کنیز آزاد کردہ حضرت امام حسین علیہ السلام، بیانات مناظر قدرت،  
بیانات صبح و شام، بیانات امور خارجیہ، بیانات امور ذہنیہ، تعریف اسپ، تعریف شمشیر،  
بیان لشکر یزید، بیان مبارزان لشکر یزید، بیانات بے ثباتی، دنیا، و انقلابات عالم، ظاہر  
ہے کہ یہ ایک مختصر فہرست میر صاحب کے مضامین مرثی کی ہے۔ ان میں سے کچھ بند جو مضامین  
بالا سے تعلق رکھتے ہیں ذیل میں درج پاتے ہیں۔

نمبر ۱ حضرت عباس علیہ السلام کی وفاداری

(مضامین بالا کا پہلا نمونہ)

گھبرا کے بڑھا خود سپر سعد بہ انجام عباس سے کی عرض کر لے صاحب صمیم  
سُن لیجیے کچھ شام کے حاکم کا ہے پیغام پر آب تک آتے ہوئے گھبرا ہے اندام

جھنجھلائے ہوئے شیر سے اندیشہ ہے جاں کا

میں چند نفس آپ سے طالب ہوا ماں کا

کی چین بہ جبین ہو کے یہ عباس نے تقریر پیغام مجھے بھیجے گا کیا حکم بے پیر  
بندہ ہوں میں حاکم ہیں مرے حضرت شبیر شیوہ ہے تمہیں لوگوں کا یہ حیلہ و تزویر

ہے کام و فاسا ہیں اور ہم سے وفا کو

فرزند سلی ننگ سمجھتے ہیں دغا کو

وہ تم ہو جو کرتے ہو دغا اہل وفا سے مطلب ہے محمد سے تمہیں کچھ نہ خدا سے  
سادات کا سر کاٹتے ہو تیغ جفا سے مہمان ہیں کس کے جو ہیں دور دزنے پیاسے

کھا کھا کے قسم پھر گئے تم اپنے سخن سے

ہم وہ ہیں جو لکھنے پہ چلے آئے وطن سے

گر صلح کا پیغام بھی لایا ہے تو بے کار میں کہتا ہوں مانگیے نہیں سید ابرار  
دو بھانجے مارے گئے اک بھائی کا دلدار صدمہ یہ اٹھایا ہے کہ ہے زلیت سے بزار

کھلجائے گا شمشیر و سیر بانڈھ چکے ہیں

وہ دیر سے مرنے پہ مکر بانڈھ چکے ہیں

کچھ سوچ کے یہ کہنے لگا ظلم کا بانی سچ ہے کہ بچے گا نہ یہ اللہ کا بانی  
پر آپ گنواتے ہیں عبث اپنی جوانی کوئی تو رہے خلق میں حیدر کی نشانی

غصہ کے نہ اندوہ کے نہ طیش کے دن ہیں

راتیں ہیں یہ آرام کی یہ غیش کے دن ہیں

کیوں کرتے ہو بے فائدہ جینے سے کنار چھوٹا ہے ابھی عمر میں فرزند تمہارا

جب آپ نے دی جان تو گویا اُسے مارا عباس جدائی کر دیجائی کی گوارا

ما بین لحد ساتھ برادر نہیں جاتا

بھائی کوئی بھائی کے لیے مرنے نہیں جاتا

یہ سنتے ہی تھرا گیا اس شیر کا اندام غصہ کے سبب سرخ ہوئی چشم یہ فام  
قبضہ کو جو دیکھا تو اگلنے لگی صمصام فرمایا کہ ظالم مجھے دیتا ہے یہ پیغام



شاید نہیں آگاہ مرے جد و پدر سے  
 ایسا ہوں کہ پھر جاؤں گا زہر کے پیر سے  
 بس دودھ ہوا گے نہیں سننے کی مجھے تاب      سترن سے اتاروں ترا و ظالم کذاب  
 میں بھائی کا دشمن ہوں یہ ہے کونسا آداب      کیا قدر پھر اس کی ہے جو موتی کی گئی آب  
 تجھے یہ سب شاہ ولایت کا تصدق  
 ہم جانتے ہیں جان کو عزت کا تصدق  
 آگے مرے تو ذکر پسر کا مرے لایا      شبیر کے بچوں پہ تجھے حرم نہ آیا  
 اصغر سے تو ہے سن میں زیادہ مرا جایا      پانی تو کہاں دودھ بھی جس نے نہیں پایا  
 دل سینہ میں مچھلے ہو کہ صدمہ ہو جگر پر  
 سو بیٹے ہوں تو صدقہ کروں اسکے پسر پر  
 ہوتا ہے چین فاطمہ کا ظلم سے برباد      موسم یہ مرے عیش کا ہے اسے ستم ایجاد  
 مارا گیا بیوہ کا پسر قاسم ناشاد      روتے ہیں نبی شیر خدا کرتے ہیں فریاد  
 ہم سے جنہیں الفت ہے وہ تم میں رہینگے  
 ماحشر اسے حشر کا دن لوگ کہیں گے  
 بھائی کے لیے جی سے گزر جاتا ہے بھائی      جاتا ہے برادر بھی جدھر جاتا ہے بھائی  
 کیا بھائی ہو تیغوں میں تو ڈر جاتا ہے بھائی      آپرے آتی ہے بھائی پہ تو مر جاتا ہے بھائی  
 نعشیں بھی ہم زیر زمیں ہوتی ہیں اکثر  
 قبریں بھی پس از مرگ قبریں ہوتی ہیں اکثر  
 بھائی نے مری کون سی کی مجھ سے برائی      پالا ہے مجھے جانتی ہے ساری خدائی  
 کیا کچھ نہیں ملا کون سی عزت نہیں پائی      جان اُن پہ تصدق ہے اجل اُئی تو آئی  
 ہم پاتیں گے جو شرط محبت کی جزا ہے  
 ناہم اسی موت میں جینے کا مزا ہے  
 کافر ہوں کہ منہ قبلہ ایماں سے پھراؤں      تو کوہ طلا دے تو میں لاپرچ میں نہ آؤں  
 فاقے ہوں تو بھائی کے عوض بچھیاں کھاؤں      مقتل سے ترپتا ہوا ان قدموں پو جاؤں

کس سے کہوں میں کہ قرابت میں قری ہوں  
 بھائی تھے حسن میں تو غلام شہدیں ہوں  
 بلبل کو کبھی ہجر گل تر نہیں بھاتا      پروانہ کہیں شمع کو ہے چھوڑ کے جاتا  
 ہے موت جو معشوق کو عاشق نہیں پاتا      قمری کو سوا سرود کے کچھ خوش نہیں آتا  
 شبیر جہاں یہ دل فرزانہ وہیں ہے  
 محفل میں جہاں شمع ہے پروانہ وہیں ہے  
 کہنے پہ چلوں تجھ سے جفا جو کہ زہے فہم      دوں بربخ میں دل کو شہ خوشخو کے زہے فہم  
 پہنچے انھیں دکھ ہاتھ سے بازو کے زہے فہم      آنکھوں کی بڑی سامنے ابرو کے زہے فہم  
 ہٹ جا نہیں تیغ اب مری دانش چلے گی  
 شیروں سے نہ یہ بازی رو باہ چلے گی  
 جرأت کو جری نے کبھی چھوڑا ہو تو کہدے      آقا کو کسی نے کبھی چھوڑا ہو تو کہدے  
 شبیر کو انھی نے کبھی چھوڑا ہو تو کہدے      احمد کو علی نے کبھی چھوڑا ہو تو کہدے  
 وہ ہم نہیں کرتے جو زمانے کا چلن ہے  
 دنیا میں دفا اپنے گھرانے کا چلن ہے  
 میں حسرت دنیا کی تمنا نہیں رکھتا      قطرہ کی طبع فیض کا دریا نہیں رکھتا  
 اعلیٰ جو ہے ادنیٰ کی وہ پروا نہیں رکھتا      پتے سے علاقہ سرطوبے نہیں رکھتا  
 کافر کی طرف صاحب ایماں نہیں جاتے  
 بُت خانہ کو کعبے سے مسلمان نہیں جاتے

### بند ہائے بالا پر ریویو

واضح ہو کہ بند ہائے بالا میں میر انیس صاحب نے داخلی شاعری کے پہلو کو بڑی خوش اسلوبی  
 کے ساتھ بتا ہے۔ اور ڈراما نگاری کا لطف بڑی قابلیت شاعرانہ کے ساتھ دکھلایا ہے۔ ہر چند  
 میر صاحب مذہبی شاعری برتتے ہیں مگر یہ امر محقق ہے کہ اعلا درجہ کی رزمی شاعری سے ڈراما نگاری  
 نے وجود پکڑا۔ پس کوئی جانتے تعجب نہیں ہے کہ میر صاحب کے مرثیٰ اعلا درجہ کے ڈرامہ کا حسن  
 انداز رکھتے ہیں۔ ہومر کی رزمی شاعری سے بھی یہ صنف شاعری وجود پذیر ہو سکتی تھی۔ اگر اس



عہد کے عوض میر صاحب ہو مر یا ہو مر کے پہلے کا زمانہ اپنے ظہور کے لیے پائے ہوتے۔ خیر بحالت موجودہ میر صاحب کی رزمی شاعری بہت کچھ ڈرامہ کی اعلا درجہ کی خوبیاں رکھتی ہے۔ اور اس پہلو سے بھی اہل مذاق صبح کی بہت کچھ قابل توجہ ہے۔ اہل واقفیت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ ڈرامہ نگاری کی کامیابی کے لیے شاعر میں نہ صرف داخلی اور خارجی امور کی بندش کی بڑی صلاحیت دیکار ہے بلکہ ان دونوں کی آمیزش کی بھی بڑی قوت حاصل رہنا چاہیے۔ میر صاحب کو یہ قوت بھی واہب العطا یا نے بہ درجہ اتم بخشی ہے۔ آپ کے تمام مرثی آپ کی اس قوت کی شہادت دیتے ہیں۔ اور حقیقت حال بھی یہی ہے کہ اس قوت کے بغیر کوئی شاعر رزمی شاعری کی داد نہیں دے سکتا ہے کمالا بحفی اعلیٰ اہل التحیق۔ جاننا چاہیے کہ بندہ اپنے بالا میں میر صاحب نے ابن سعد کی ترغیب دہی کے مضمون کو حوالہ قلم فرمایا ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ یزیدیوں کی طرف سے یہ کوشش عمل میں لائی گئی تھی کہ آل مرتضیٰ سے کوئی آدمی بھی یزیدیوں کا ساتھ دینا۔ یہ ایسی ترکیب تھی کہ اگر کوئی بھی آل مرتضیٰ سے ان کا ساتھ دیدیتا تو واقعہ کربلا کا اور ہی نقشہ پیدا ہو جاتا۔ بالغرض اگر حضرت عباس علمدار عمر ابن سعد کے کہنے سے لشکر امام علیہ السلام سے کنارہ کش ہو جاتے تو دنیا کو یہ کہنے کو ہو جاتا کہ یہ واقعہ ایسا تھا کہ حسین علیہ السلام کے مخالفوں میں خود حضرت کے بھائی بھی تھے۔ مگر حضرت عباس کب امام علیہ السلام کے مخالف بن سکتے تھے۔ یا کوئی بھی آل ہاشم سے حضرت کی مخالفت گوارہ کر سکتا تھا۔ اس وقت کے علویں کسی حالت میں اپنے خاندانی تعلقات سے علاحدہ نہیں ہو سکتے تھے اور خاندانی دینی اور دنیوی تعلقات سے علاحدہ ہونے کو ننگ جانتے تھے۔ جیسا کہ کہا گیا ہے۔

اذا العلوی تابع ناصیاً      بمنزہ فہا ہومن امیہ  
وان الکلب خیمتہ طبعاً      فان الکلب طبع امیہ فیہ

یعنی جو علوی سیدنا صبی کا مذہب اختیار کرتا ہے۔ تو اس سے کتا بہتر ہے اس لیے کہ کتا اپنے اپنے باپ کا طور قائم رکھتا ہے۔ اس وقت کے آل مصطفیٰ اور اولاد مرتضیٰ جو طریقہ آبائی سے علاحدگی اختیار کرتے گئے ہیں ان چار مصرعوں پر نظر غور ڈال کر اپنی موجودہ حالت کا موازنہ فرمائیں خیر میر انیس صاحب اسی ترغیب دہی کو پیش نظر رکھ کر فرماتے ہیں کہ عمر ابن سعد ضرورت وقت دیکھ کر حضرت عباس سے کہتا ہے کہ کچھ حاکم شام کا پیام ہے بن یحییٰ۔ مگر حضرت عباس اس کے پیام سننے کے متحمل نہیں ہوتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ حاکم شام مجھے کیا پیغام



بھیجے گا میں حضرت شبیر کا بندہ ہوں مجھ سے بے وفائی ممکن نہیں تو اور تیری قوم کا شیوہ مکر اور بے وفائی ہے۔ میں فرزند علی ہوں فرزند علی دغا کے مرکب نہیں ہو سکتے۔ بالفرض اگر تو صلح کا پیام بھی لایا ہے تو اب صلح کا وقت نہیں رہا۔ حضرت شبیر کے دو بھانجے اور ایک بھتیجا مارے جا چکے ہیں حضرت امام ہرگز صلح پر راضی نہ ہوں گے حضرت والا شمشیر و سپر باندھ کر جنگ کے لیے مستعد ہو چکے ہیں اس تقریر کو سن کر ابن سعد بولا کہ لڑائی میں شبیر تو مارے ہی جائیں گے۔ آپ اپنے کو کیوں تباہ کرتے ہیں۔ آپ جوان ہیں اور ابھی آپ کا لڑکا صخر سن ہے۔ آپ اپنی ہلاکت کیوں گوارا کرتے ہیں۔ کوئی تو جہاں میں حید کی نشانی رہے۔ آپ اپنی جان نہ کھوئیں۔

حضرت عباس نے اس کے جواب میں جو کچھ فرمایا وہ سراپا وفا شجاری سے مملو نظر آتا ہے۔ لاریب ان بندہائے بالا میں حضرت عباس کا کیریکٹر جس خوبصورتی کے ساتھ دکھلایا گیا ہے احاطہ توصیف سے باہر ہے۔ حضرت عباس کی اخلاقی قوتیں از قسم شجاعت، وفاداری، استقلال، خود داری، بے غرضی، انکساری، وضع داری، آزادی، استغناء وغیرہ وغیرہ اس ندرت کیساتھ دکھلائی گئی ہیں کہ اس کا جواب شاہنامہ تو کیا ایلید کے کسی حصہ میں بھی نہیں پایا جاتا ہے۔ یہ چند بند حضرت عباس کے کیریکٹر کو اس صفائی کے ساتھ دکھلاتے ہیں کہ آپ دیگر شجاعان شکر امام علیہ السلام سے ایک علاحدہ رنگ کے شجاع دکھائی دیتے ہیں۔ آپ کے کردار سے ایک خاص طرح کا جلال نمایاں ہے اور آپ کی گفتار سے آپ کا ایک خاص طرح پر حضرت امام علیہ السلام کے ساتھ متمسک ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ واہ کیا حسن بیان ہے۔ آپ نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ اپنے کو امام علیہ السلام کا بھائی بھی دکھلاتے ہیں پھر امام حسن کے مقابلہ میں اپنے کو امام علیہ السلام کا ایک بندہ بھی قرار دیتے ہیں۔ یہ فرق مراتب کا مضمون نہایت عمدہ انداز سے حوالہ قلم ہوتا ہے مختصر یہ کہ اپنے زور قلم سے میر صاحب نے حضرت علمدار کی ایک سچی تصویر کھینچی ہے کہ دیکھنے والا ہزار شجاعوں میں آسانی کے ساتھ آپ کو پہچان لے سکتا ہے۔ اہل واقفیت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ یہی کیریکٹر نگاری رزمی شاعری کی جان ہے۔ اور اس طرح ہومر بھی بڑی قابلیت شاعرانہ کے ساتھ بہادری و یونان کے مختلف انداز کی ایسی تصویریں کھینچتا ہے کہ ہر بہادر ایک دوسرے سے علاحدہ دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً اس کے بیان سے اکیلینز اور ہڈر ایسے دو بہادر نظر آتے ہیں کہ جن کو ایک دوسرے سے ممیز کرنے کے لیے کوئی بڑی صلاحیت درکار نہیں ہے اکیلینز ایک سفاک، بیباک، پر غیظ و غضب نبرد آزما کی تصویر پیش کرتا ہے۔ اس کے



برخلاف کٹر ایک متین، رحم دل، مستقل مزاج اور مال اندیش مرد میدان کا فوٹو سامنے لا کر رکھ دیتا ہے۔ اس کیرئیر نگاری نے ہومر کو جس کا ذکر ابو الفدا مورخ اپنی کتاب المختصر فی احوال البشر میں کرتا ہے۔ ابو الشعرا کہلایا ہے۔ اور لاریب اب اس خطاب کے تمام تر مستحق میر صاحب ہیں، کیا کسی کو معلوم تھا کہ زمانہ ہومر سے سیکڑوں صدیوں کے بعد ہندوستان میں پھر ایک ایسا شاعر گرامی اردو زبان کا پیدا ہوگا جو ابو الشعراء نہیں کہنا ایک عظیم حق تلفی کا حکم رکھتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ جس قدر ہومر کی شہرت دنیا میں پھیلی ہوئی ہے اسی قدر میر صاحب کی شہرت دنیا کے ایک تنگ دائرہ میں محدود ہو رہی ہے۔ میر صاحب کی قوت شاعری سے یورپ کو بے خبر رہنا نہیں چاہیے مسلمانوں میں ماشاء اللہ اس وقت نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی صاحب بالقابہ ایک ایسے جوہر کی مانند موجود ہیں کہ اگر نواب ممدوح میر صاحب کی قابلیت شاعری سے انگلستان کو باخبر کرنا چاہیں تو ان صاحب کے یہ کار دشوار کسی حد تک انجام پاسکتا ہے۔ میں نواب ممدوح کی تخصیص اس لیے کرتا ہوں کہ وہ صاحب انگریزی زبان کے پورے ماہر ہیں۔ انگریزی میں جو ان کی نظیں فقیر کی نظر سے گزری ہیں وہ اس کی شاہد ہیں کہ نواب ممدوح انگریزی زبان پر غیر معمولی طور سے قادر ہیں اور انگریزی شاعری کا عمدہ مذاق بھی رکھتے ہیں۔ علاوہ فارسی غزل وغیرہ کے اردو ان کے لیے زبان مادری کا حکم بھی رکھتی ہے۔ اگر نواب ممدوح میر انیس کی روح کو خوش نہ کر سکیں تو پھر یہ مسلمانوں میں ظاہر نواب ممدوح کے بعد مضر حامد علی خاں صاحب بارسر لکھنؤ کو مستثنیٰ کر کے کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا ہے جو اردو اور انگریزی پر یکساں قدرت اور اس کے ساتھ اچھا مذاق شاعری بھی رکھتا ہے۔

## نمبر ۲ صبح شب عاشورہ اور نماز صبح کا بیان

(مضامین بالا کا دوسرا نمونہ)

جب رات عبادت میں لہر کی شہ دینے      سجدوں میں مہم عشق کی سر کی شہ دینے  
دیکھا جو سپیدی کو سحر کی شہ دینے      مژکے رخ اکبرہ نظر کی شہ دینے  
فرمایا سحر قتل کی ظاہر ہوئی بیٹا  
لواتھ کے اناں دو کہ شب آخر ہوئی بیٹا  
دنیا میں ازل سے سحر ایسی نہیں آئی      یہ صبح دکھائے گی بھرے گھر کی صفائی

دولت نہ رہے گی نہ بضاعت نہ کمائی بیٹے سے جدا ہوگا پدر بھائی سے بھائی  
آج احمد وحید کے گریبان پھٹیں گے  
اٹھارہ نبی فاطمہ کے حلق کٹیں گے

بندہ وہی جو دکھ میں رہے صابر و شاکر اک جان ہے سوز و جود ہے اک سر ہے سو حاضر  
بہتر ہے اٹھے جتنا سبک بار مسافر یہ مرحلہ عمر کی ہے منزل آخر  
خلقت ہمیں سر پیٹے گی روئے گی جہاں ہیں  
اسے صبح کوئی ہم کو نہ ہوئے گی جہاں ہیں

جواہل حرم پردہ عصمت میں ہیں مشہور کھل جائیں گے انبوہ میں ان کے سر پہ نور  
جملے سے نئی رائد نہ بکھلے ہے یہ دستور ان رائدوں کا خیمہ بھی جلا دیں گے یہ مقہور  
غش ہوگی کبھی اور کبھی اشتر سے گرے گی  
زہرا کی بہوشام میں سر ننگے پھرے گی

مرا ہے پدر جس کا اسے دیتے ہیں پر سا ہوئے گی یتیموں پر مرے قید کی ایذا  
آزار میں عابد پرستم ہوں گے کیا کیا لیجائیں گے تا شام اسے کانٹوں پر اندھا  
اک حشر پاتا تحت میں اور فوق میں ہوگا  
بیڑی میں قدم ہوں گے گلا طوق میں ہوگا

یہ کہہ کے بڑھے بہر تہیم شصت در جنگا میں اذان دینے انکا دلبر سرور  
وہ موت حسن اور وہ خوش الحانی اکبر ہر شخص کو یاد آگئی آواز یہ سمبر  
ہر ننگا کو اک وجہ تھا اس ظلم کے جن میں  
تھا بلبل حق کو کہ چمکنا تھا جن میں

اکبر کا مدد سنتے ہی زینب یہ پکاری تاحشر رہے خلق میں آواز تمہاری  
قربان توذان کے نوازی کے میں داری قائم یہ جماعت رہے یا حضرت باری  
ہر شام یونہی طاعت مہر ادا ہو  
ہر جمع کو اس دین کے ڈنکے کی صدا ہو

آگے تھا عباد اور تھے ہوئے شاہ حجازی پیچھے تھے صفیں باندھتے ہوئے سارے نوازی  
ابراہیم جہاں، فخر زماں، صفدر و غادی تھی اپنے خدا کو نظر بندہ نوازی



دنیا میں یہ رتبے نہ کبھی ہوں گے کسی کے

معراج میں تھے ساتھ حسین ابن علی کے

وہ چاند سے چہرے وہ پیدائگی صہائیں وہ خشک زبانون پہ اثر دار دعائیں

لہجے وہ عرب کے وہ خوش آئند صدائیں مشتاق تھیں قوریں کہ یہ جلدی ادھر آئیں

اک جوش محبت انھیں دکھلاتا تھا کوثر

کیا سب کی ملاقات پہ لہراتا تھا کوثر

تبسوع و وظائف سے ہوئی جبکہ فراغت حضرت نے پڑھی اٹھ کے محمد کی زیارت

بس ہو گئی اک مجلس ماتم وہ جماعت فرما کے یہ ان سب سے گئے منیمہ میں حضرت

باہر علم فوج خدا لاتے ہیں جلدی

سب لوگ مسلح ہوں کہ ہم آتے ہیں جلدی

بند ہائے بالا پر ریویو

حضرات ناظرین میرا نیس صاحب کے کن کن کلام کی داد دی جائے۔ جہاں سے جس مرثیہ کو پڑھیے اس کا ہر شعر ہر مصرع داد طلب ہے۔ بند ہائے بالا صبح عاشورہ اور نماز صبح کی کیفیتوں سے خبر دیتے ہیں۔ ان بندوں میں مضامین کے خارجی اور داخلی (SUBJECTIVE AND OBJECTIVE) دونوں پہلو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ حوالہ قلم ہوتے گئے ہیں۔ مگر ان کی آمیزش نے اور بھی زیادہ مزا پیدا کر دیا ہے۔

مضامین بند ہائے بالا یہ ہیں کہ حضرت امام علیہ السلام رات عبادت میں بسر کر چکے ہیں۔ صبح ہوتی آتی ہے معلوم ہے کہ آج شہادت کا دن ہوگا۔ حضرت علی اکبر کی طرف مڑ کر ارشاد فرماتے ہیں۔ بیٹا اٹھو اذان صبح دو۔ یہ کام کے روز قتل کے پہلے کی رات اس اطلاع کے ساتھ کہ روز قتل آنے کو ہے۔ انسان عبادت میں بسر کرے سو اس کے کسی اور کا نہیں ہو سکتا ہے کہ جس کو خدائے تعالیٰ نے اپنی جانب سے شہ دیں اور امام المؤمنین بنایا ہے۔ اللہ اکبر۔ خدا پر آپ کا یہ اطمینان اور تکیہ۔ اس طرح پر راضی بہ رضا رہنے کی توفیق پھر جب وقت فریضہ بھری کا آتا ہے۔ تو امام عالی مقام اپنے صاحبزادے کو اذان صبح کی ہدایت فرماتے ہیں بغرض کسی وقت عبادت کا سلسلہ تو ٹوٹتا نہیں ہے۔ یہ سب ایسی باتیں ہیں کہ صرف امام من جانب اللہ کیلئے

مختص کی گئی ہیں۔ امام کو جیسا ہونا چاہیے اور امام کو جیسا کرنا چاہیے۔ اس بات کو میر صاحب کا بند  
اول نہایت خوش اسلوبی سے دکھا رہا ہے۔ پھر امام علیہ السلام بیٹے کو خبر دیتے ہیں کہ یہ عاشورہ محرم  
کی سحر ہے اولاد پیمبر کے قتل کا دن ہے۔ اٹھارہ نبی فاطمہ کو پھر نماز سحر نصیب نہ ہوگی۔ ایسی سحر جو  
بھرے گھر کی صفائی دکھلائے گی پھر دکھائی نہ دے گی۔ مگر بندہ کو صابر و شاکر رہنا چاہیے۔  
مرضی مولیٰ از ہمہ ادنیٰ۔ اس کے بعد آپ کے اہل حرم کا کیا حال ہوگا اور کیا کیا مصیبتیں انہیں  
لاحق ہوں گی ان باتوں کو ارشاد فرما کر حضرت امام علیہ السلام تمیم کے لیے بڑھے۔ پانی تو بند ہی  
تھا وضو کس سے فرماتے۔ خیر علی اکبر اس صحر میں اذان دینے لگے۔ خوش الحان بہت تھے ہر شخص کو  
آواز ہمیں یاد آگئی۔ سامعین کا جو حال ہوا ہوگا محتاج بیان نہیں ہے حضرت علی اکبر کی صدائے  
اذان سن کر حضرت زینب دعائیں دینے لگیں۔ یہ تعلق حضرت زینب کا حضرت علی اکبر کے ساتھ  
ایک خاص وجہ رکھتا تھا۔ وہ یہ کہ آپ نے انہیں پالا تھا۔ میر صاحب اپنی فطرت نگاری سے کہیں  
چوکتے نہیں ہیں۔ اذان ہونے کے بعد امام علیہ السلام نے امامت فرمائی۔ نماز جماعت کے ساتھ  
انجام پائی۔ امام اور نمازیوں کی تصویر جیسی میر صاحب کھینچتے ہیں کب کسی سے کھنچ سکتی ہے بعد نماز  
حضرت خیمہ اطہر میں یہ فرما کر تشریف لے گئے کہ سب لوگ مسلح ہو جائیں ہم خدا کا علم لے کر ابھی  
آتے ہیں۔ سبحان اللہ سبحان اللہ کیا شاعری کا انداز ہے۔ خیالات کا سلجھاؤ۔ بیانات کا بے ساختہ  
پن مضامین کا ارتقاع، فطرت کی تبعیت، طبیعت کی روانی، ادائے خیالات کا زور۔ کلام کا  
تناسب اور ان سب خوبیوں کے ساتھ مرثیت کا قیام۔ یہ سب کی سب ایسی باتیں ہیں کہ غیور  
مؤید من اللہ شاعر کا حوصلہ پست کر دینے والی ہیں۔ واضح ہو کہ بندہ اے بالاتمام ترمذی پہلو  
رکھتے ہیں۔ جو اشخاص نہ خدا کے قائل ہیں اور نہ عبادت خدا کی توفیق رکھتے ان کو ایسے کلام سے  
کیا حظ نصیب ہو سکتا ہے۔ صبح کی نماز کیا دولت ہے اس کو وہ کیا جانے جس نے نہ پڑھی نہ قضا  
کی۔ افسوس ہے کہ نماز کی قید ان حضرات میں نہیں دیکھی جاتی ہے۔ جو ہندوستان میں اب تعلیم  
یافتہ مسلمانوں کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔ اس وقت شاید ہزار تعلیم یافتہ اشخاص میں ایک  
شخص نکلے گا جو فریضہ پنجگانہ کو ادا کیا کرتا ہوگا۔ یورپ کی تعلیم عجیب ملحد خیز انداز رکھتی ہے۔  
عیسائی عیسائیت سے آزاد اور مسلمان مسلمانیت سے دور جاتا ہے۔ پھر کالے گورے سب ملکر  
ایک ہو جاتے ہیں۔ معاد کا مضمون ہی درمیان سے اٹھ جاتا ہے۔ واہ ری تعلیم یورپ تیرا کیا  
کہنا ہے۔



کفر والحاد کے جلوے نے ترے ایک کیا  
ہاتھ پر ہاتھ نہ کیوں شیخ و برہمن مارے  
رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا۔

(مضامین بالا کا تیسرا نمونہ)

وہ صبح اور وہ چھانوساروں کی اور نور دیکھے تو غش کرے ارنی گوتے ادب طرہ  
پیدا گلوں سے قدرت اللہ کا ظہور وہ جا بجا درختوں پہ تسبیح خواں طہور  
گلشن نخل تھے وادی مینو اساس سے  
جنگل تھا سب بسا ہوا پھولوں کی باس

ٹھنڈی ہوا میں سبزہ صحرا کی وہ لپک شرمائے جس سے اطلس رنگاری فلک  
وہ جھومنا درختوں کا پھولوں کی وہ مہک ہر برگ گل پہ قطرہ شبم کی وہ چمک  
ہیرے نخل تھے گوہر یکت انشا تھے  
پتے بھی ہر شجر کے جواہر نگار تھے

قربان صنعتِ قلم افسرید گار تھی ہر ورق یہ صنعت ترصیح آشکار  
عاجز ہے فکر ث شعرائے ہنر شعار ان صنعتوں کو پائے کہاں عقل سادہ کار  
نالم تھا تو قدرت رب عباد پر  
مینا کہا تھا وادی مینو سواد پر

وہ نور اور وہ دشت سہا سادہ نفا در آج و کبک دتیر دطا دس کی صدا  
وہ جوش گل وہ نالہ مرغان خوش نوا سردی جگر کو بخشی تھی صبح کی ہوا  
پھولوں کے سبز سبز شجر سرخ پوش تھے  
تھالے تھے نخل کے سبد گل فروش تھے

وہ دشت دہ نسیم کے جھونکے وہ سبزہ زار پھولوں پہ جا بجا وہ گہر ہائے آبدار  
اتھنا وہ جھوم جھوم کے شاخوں کا بار بار بالائے نخل ایک جو بلبل تو گل ہزار  
خواہاں تھے زہر گلشن زہر جو آب کے  
شبم نے بھردے تھے کٹورے گلاب کے

وہ قریوں کا چار طرن سرد کے ہجوم کو کو کا شور نالہ حق سرہ کی دھوم

سبحان ربنا کی صدا تھی علی العموم جاری تھے وہ جوانی عبادت کے تھے رسوم  
 کچھ گل فقط نہ کرتے تھے رب عطا کی مدح  
 ہر خار کو بھی نوک نہاں تھی خدا کی مدح  
 جیونٹی بھی ہاتھ اٹھا کے یہ کہتی تھی بار بار اے دانہ کش ضعیفوں کے رازق ترے نثار  
 یا حی یا قدير کی تھی ہر طرف پکار تسبیح تھی کہیں کہیں تہلیل کر دگار  
 طائر ہوا میں مچھرن سبزہ زار میں  
 جنگل کے شیر ہو تک رہے تھے کچھار میں  
 کانٹوں میں اک طرف تھے ریاض نبی کے پھول خوشبو سے جسکی خلد تھا جنگل کا مریض نپول  
 دنیا کی زیب زینت کا شائد بتوں وہ باغ تھا لگا گئے تھے خود جسے ربوں  
 ماہِ عزا کے عشرہ اول میں لٹ گیا  
 وہ باغیوں کے ہاتھ سے جنگل میں لٹ گیا

### بند ہائے بالا پر ریویو

اہلِ واقفیت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ مناظر قدرت کے بیانات فارسی کی شاعری میں  
 گویا مفقود ہیں۔ اس زبان کی شاعری کا مدار تشبیہ استعارہ اور مبالغہ پر معلوم ہوتا ہے خاقانی  
 کو دیکھئے یا قافانی کو پڑھیے کہیں بھی نہ صبح نہ شام نہ کسی سینری یا سین کا بیان فطری انداز پر  
 دکھائی دیتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ اتنے بڑے بڑے شعراء کو بھی مناظر قدرت کی طرف  
 میلان طبعی نہ تھا۔ یا ان کی شاعری کی ضرورتیں ان کو دل آویز معاملات کی طرف متوجہ  
 ہونے نہیں دیتی تھیں۔ اردو کے شعراء کا بھی یہی حال دیکھا جاتا ہے مگر مناظر قدرت کی  
 طرف حسبِ مراد طور پر توجہ کرنے کی پہلی مثال میر انیس صاحب ہیں۔ بند ہائے بالا میں میر صاحب  
 نے صبح کی کیفیت کو مرثیت کے ساتھ نہایت دلکش انداز پر زیب رقم فرمایا ہے۔ حقیقت یہ  
 ہے کہ حضرت نے صبح کی ایک لاجواب تصویر کھینچی ہے۔ صبح کا نور ستاروں کی چھاؤں،  
 گلوں کی نمود، طیور کی تسبیح خوانی پھولوں کی بو سے جنگل کا بسنا ہوا کی ٹھنڈک، سبزہ محرابی  
 کی مہک، درختوں کا جھومنا، پھولوں کی مہک، برگ گل پر قطرہ شبنم کی جھلک، دشت کا سہانا  
 پن، دراج و کبک و تیر و طلوس کی آوازیں، کثرت و خوش مرغان خوش الحان کے نالے



گلبائے گوناگوں کی کثرت جگر کو خنکی پہچانے والی صبح کی ہوا، پھولوں کے سبز سبز درخت ان پر لال لال پھول نسیم کے جھونکے سبز زار کا عالم ہشاموں کا جھوم جھوم کر بار بار اٹھنا، قریوں کا شور اور ان کے نالہ حق سرہ کی دھوم زبان حال سے صرف گلوں کا مدح خداوند تعالیٰ نہیں کرتا بلکہ خاروں کا بھی نوک زبان سے خدمتِ حمد بجالانا۔ چیونٹی تک کا ہاتھ اٹھا اٹھا کر ادائے سپاس الہی کرنا ہر طرف سے تسبیح و تحلیل کی صدا۔ طیور کی محویت ہوا کے ساتھ۔ ہرن کی محویت مہرہ زار سے جنگل کے شیروں کا کچھار میں ہونکنا یہ سب کے سب صبح کے متعلق ایسے مضامین ہیں کہ کسی فارسی یا اردو کے شاعر کو اس خوش اسلوبی کے ساتھ خواب میں بھی نصیب نہیں ہو سکے ہیں۔ واقعی اس جگہ میر صاحب نے اپنی خارجی شاعری کا کمال دکھلایا ہے۔ پھر ان خارجی مضامین کے داخلی اثر جو نفس ذہن پر پیدا ہوتا ہے۔ وہ ایسا عالم رکھتا ہے۔ جو بیان سے باہر ہے۔ اگر اسے کمال فن نہیں کہیں گے تو کہیں گے۔ ایسی صبح فردوسی کو تو کیا ہومر کو بھی نصیب نہیں ہوئی ہے۔ واقعی میر صاحب ایک حیرت انگیز شاعر گزرے ہیں۔ تبعیت فطرت کے ساتھ آپ کے مضامین کی پرواز ہمیشہ اعلیٰ کی طرف ہوتی ہے۔ بستی کی طرف تو کبھی طبیعت رُخ نہیں کرتی۔ اس شاعر کو اعجاز نہیں تو کیا کہیں۔ الحق میر صاحب کی شاعری ایک الہامی شاعری ہے۔ کیا کسی کو مجال ہے کہ اس دلا دیزی کے ساتھ بڑے بڑے نازک اور بلغ خیالات کو اس رواں دواں طور پر سامعین کے گوش قبول تک پہنچا سکے۔ بند ہائے بالا سے ظاہر ایہی معلوم ہوتا ہے کہ معاملات فطرت پر بڑی نظر حاصل تھی اور علم حیوانات وغیرہ میں بھی پورا دخل تھا۔ مگر کب حضرت دشت و صحرا میں قیام پذیر ہوئے۔ صحرائی گلوں لالہ کی سیر دیکھی۔ وحوش و طیور پر متفقانہ نظر ڈالی یا کب آپ نے علم حیوانات کی تحصیل فرمائی۔ اس کا کوئی پتہ راقم کو نہیں ملتا۔ لاریب تاثیر غیبی کے بغیر ایسے اشعار کسی شاعر کے قلم سے نہیں نکل سکتے ہیں۔ راقم کو تو میر صاحب کی نسبت پورا عقیدہ ہے کہ آپ ہمہ امر مویذ من اللہ تھے۔

واضح ہو کہ بند ہائے بالا سے پورے طور پر وہی شخص لذت یاب ہوگا جس نے صحرائیں اور دشت نور دی میں اپنی عمر کا ایک کافی حصہ بسر کیا۔ خانہ نشین کیا جانے کہ صحرا جنگل دشت وغیرہ کا کیا عالم ہوتا ہے۔ کیونکر گل صحرائی پھولتے ہیں جنگل کی ہوا کیسی ہوتی ہے۔ طیور و وحوش کیا عالم رکھتے ہیں۔ اسی طرح کی ہزاروں باتیں ہیں جسے صحرائیں اور دشت نور دی جانتے ہیں۔ اور دوسرا نہیں جانتا۔ اس وقت میر صاحب کے بندوں نے راقم کو کیا کیا گزشتہ سیریں یاد دلادی ہیں۔

کیا کیا دشت و صحرا دل کی آنکھوں کے سامنے پھر رہے ہیں۔ کیا کیا مناظر قدرت جو اس وقت پنہاں ظاہر کے سامنے نہیں ہیں۔ دیدہ باطن کے پیش نظر ہو رہے ہیں۔ واہ میر صاحب کیا کہنا ہے سبحان اللہ۔ آپ بڑے پُر تاثیر فطرت نگار ہیں۔ مگر آپ کے کلام سے لذت یاب ہونے کے لیے مجبور ہے کہ انسان خود بھی فطرت پسند اور فطرت فہم طبیعت رکھے اور معاملات فطرت سے بقدر طاقت بشریہ خوب واقف بھی ہو۔ کوپر (COUPER) اور ٹامسن، دو انگریزی شاعر ایسے تھے کہ جو خلقت سے صحرا پسند تھے اور آبادی سے ویرانہ کو زیادہ دست رکھتے تھے۔ ان دونوں کے کلام ان کی افتاد طبیعت کا پورا رنگ دکھلاتے ہیں۔ ظاہر باہمی معلوم ہوتا ہے کہ اگر صحرا اپنی ان کی سرشت میں داخل نہیں ہوتی تو ان کے کلام کا رنگ ایسا نہیں ہوتا۔ جیسا کہ دیکھا جاتا ہے تعجب ہے کہ میر صاحب سے کہ نہ جنگل میں رہے نہ صحرا میں مگر جنگل صحرا و وحش و طیور سب کی تصویریں ہو ہو کھینچ لیں کسی طرح کا مضمون ہو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب کے ذاتی تعلقات کے اندر ہے۔ یہ الہامی شاعری نہیں ہے تو در کیا ہے۔ اگر یہ شاعری الہامی نہیں ہے اور اس حیثیت سے ہر شخص برت سکتا ہے تو دنیا کے مولوی مولانا پیر فقیر، عابد زاہد، عالم فاضل، ناظم منشا سے کیوں کوئی حضرت چار بند بر صاحب کے انداز کے تحریر فرما کر سخن سنجی کا جلوہ نہیں دکھلاتے ہیں۔

بروز رجز امام حسین علیہ السلام

(مضامین بالا کا چوتھا حصہ)

ہم وہ ہیں کہ اللہ نے کوثر ہمیں بخشا سرمداری فردوس کا افسر ہمیں بخشا

اقبال علی خلق ہمیں بخشا قدرت ہمیں دی زور ہمیں زور ہمیں بخشا

ہم نور ہیں گھسٹو طور بجلی ہے ہمارا

تمخت بن داؤد مصلاً ہے ہمارا

کس جنگ میں سینہ کو سپر کر کے نہ آئے کس مرحلہ صعب کو سر کر کے نہ آئے

کس فوج کی صف زیر زبر کر کے نہ آئے تھی کون سی شب جس کو بحر کر کے نہ آئے

تھا کون جو ایمان نہ مصمماً نہ لایا

اس شخص کا سر لائے جو اسلام نہ لایا



اصنام بھی کچھ کم تھے نہ کفار تھے تھوڑے طاقت تھی کہ عزا کو کوئی لات سے توڑے  
بدکشوں لے سجدے بھی کیے ہاتھ بھی جوڑے بے توڑے وہ بت حیدر صفدر نے نہ تھوڑے

کعبہ کو صفا کر دیا خالق کے کرم سے

نیکلے اسد اللہ اذان دے کے حرم سے

دیکھو تو یہ ہے کون سے جرار کی تلوار کس شیر کے قبضہ میں ہے کرار کی تلوار  
دریا نے بھی دیکھی نہیں اس دھار کی تلوار بجلی کی یہ بجلی ہے تو تلوار کی تلوار

قہر و غضب اللہ کا ہے کاٹ نہیں ہے

کہتے ہیں اسے موت کا گھر گھاٹ نہیں ہے

گرفیض ظہور شبہ لولاک نہ ہوتا بالائے زمین گنبد افلاک نہ ہوتا

کچھ خاک کے طبقے ہیں بحر خاک نہ ہوتا ہم پاک نہ کرتے تو جہاں پاک نہ ہوتا

یہ شور اذان کا سحر و شام کہاں تھا

ہم عرش پہ جب تھے تو یہ اسلام کہاں تھا

### حضرت عباس کا رجز

روکے ہمیں نکل کے جو طاقت کسی میں ہو لے تیغ میان سے جو شجاعت کسی میں ہو

گرمائے رخس کو جو حرارت کسی میں ہو آئے جو حرب و ضرب کی قدرت کسی میں ہو

دو ہاتھ میں علی کے سپردار پا رہیں

دریا نہیں کہ رک گیا ہم ذوالفقار ہیں

تم کیا پہاڑ بیچ ہیں گر ہو تو مال دیں شیردوں کو ہم ترائی سے باہر نکال دیں

مہلت نہ ایک کو دم جنگ جدال دیں پانی تو کیا ہے آگ میں گھوڑے کو ڈال دیں

منہ دیکھتے ہیں جو ہیں نگہبان گھاٹ کے

لے جائیں گھر پہ تیغ سے دیا کو کاٹ کے

مکرش ہیں سب ہماری زبردستیوں کے زیر دادا شجاع باپ جو انمرد ہم دلیسر

جب رن پڑا ہے کر دتے ہیں زخموں کے ڈھیر لائے ہیں جا کے آگ سے پانی خدا کے شیر

عفريت بھی گئے ہیں جو چوہیں ہماری ہیں  
 بیرالعلم میں کود کے تلواریں ماری ہیں  
 جرأت جلوں رہتی ہے نصرت رکاب میں سرکاٹتے ہیں پیر کے تیغوں کی آب میں  
 نکلے ہوئے ہیں شیراں کے حلقے کتاب میں نصیلس ہیں اپنے زور کی خیر کے باب میں  
 ناصر ہیں بارگاہ فلک بارگاہ کے  
 دفتر الٹ دیے ہیں عرب کی سپاہ کے

بند ہائے بالا پر ریویو

واضح ہو کہ بہادران عرب کا یہ دستور تھا کہ میدان جنگ میں اپنے ہم نبرد کے آگے  
 کچھ فخریہ کلام بیشتر نظم کی شکل میں پڑھا کرتے تھے اور بعد ازاں مشغول پیکار ہوتے تھے۔  
 اس خود شنائی کو رجز کہتے ہیں۔ رجز خوانی کا دستور مومنین اور ملاحدہ دونوں میں تھا۔ مثلاً  
 میں جنگ خیر کی مثال پیش کرتا ہوں۔ اس جنگ کی سرگزشت یہ ہے کہ خیر کا قلم یہودیوں کی  
 ملکیت تھا اور اس کے سردار مرحب اور اس کا بھائی حارث تھے۔ یہودیوں نے رسول اللہ  
 کے اہل بی کو مار ڈالا اس لیے آنحضرت نے ان پر شکر کشی تھی۔ مدینہ سے رسول اللہ کی روانگی  
 کے وقت علی علیہ السلام کی آنکھیں جوش کرتی تھیں جس کے باعث آپ مجبوراً مدینہ میں رہ گئے  
 تھے۔ جب یہودیوں نے خبر سے مسلمانوں کا سامنا ہوا تو مرحب اور اس کے بھائی نے دور دور  
 تک سپہم مسلمانوں کو شکست دی۔ دو دن تک یہ حالت گزری کہ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ  
 جو لشکر اسلام کے ساتھ تھے ان دونوں بھائیوں سے شکست کھاتے رہے۔ اور وہ دونوں بھائی  
 ان دونوں علم برداران لشکر اسلام کا تعاقب خیمہ رسول اللہ تک کرتے رہے۔ خیمہ رسول اللہ  
 کے قریب پہنچ کر مرحب اور اس کے بھائی سخنان نامنرا مسلمانوں کو سناتے تھے مگر لشکر اسلام  
 میں ایسا کوئی بہادر نہ تھا کہ ان ملعونوں کا سامنا کرتا ایسی نازک حالت میں علی حضرت رسول  
 کی پیش گوئی کے مطابق حضور رسالت مآب میں آ پہنچے۔ رسول اللہ نے لشکر اسلام کا علم علی کو  
 تفویض فرمایا۔ ابھی تک فاتح خیر کی آنکھوں کا جوش کم نہیں ہوا تھا۔ مگر رسول اللہ نے اپنا  
 لعاب دہن علی مرتضیٰ کی آنکھوں پر لگا دیا۔ جس سے وہ جوش چشم جاتا رہا۔ علی مرتضیٰ نے قلعہ خیر  
 کے سامنے مرحب سے مقابلہ فرمایا وقت مقابلہ مرحب نے یہ شعر رجز کا پڑھا۔



قد علمتني خيبراني مرحب      شاکی السلاح بطل مجرب  
اس پر علی مرتضیٰ نے جواب میں فرمایا:-

انا الذی سمتنی امی حیدرہ      نکیلکم بالسيف کيل السند  
الحاصل ذوالفقار حیدر کرار نے دونوں بد بختوں کوئی النار کر دیا۔ خیبر کا قلعہ فتح ہو گیا۔ اور  
رسول اللہ نے کامیابی کے ساتھ مدینہ کو معاودت فرمائی۔ معلوم ہوتا ہے کہ علی مرتضیٰ نصرت دین  
خدا کے واسطے مخصوص ہوتے تھے۔ لاریب اگر علی کی تلوار نہ ہوتی تو بدر، خندق، خیبر، اور حنین کی  
فתיحیں دین خدا کو نصیب نہیں ہوتیں۔ (دیکھو جلد اول اس کتاب کی) اور بھی اسلام کو کس طرح  
کا استحکام حاصل نہیں ہو سکتا۔ پیغمبر خدا کے زمانہ کا اسلام بلاشبہ شک بہت کچھ علی  
کی تلوار کا منت کش نظر آتا ہے۔

شمس العلماء مولانا محمد سعید صاحب حنفی رئیس عظیم آبادی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مطلع کس قدر  
قرین حق ہے۔ آپ فرماتے ہیں:-

جوہر نصرت عیاں از تیغے ابروئے علی

شد قوی دین نبی از زور بازوئے علی

بالمختصر رجز خوانی مبارزان عرب کا عام طریقہ تھا۔ فارس کے بہادروں میں اس کا رواج  
کمتر دیکھا جاتا ہے۔ شاہنامہ فردوسی میں ایک مقام پر رجز خوانی کا انداز پایا جاتا ہے۔ وہ  
اس طرح پر ہے کہ جب رستم نے گیکو کو شاہزادہ کیخسرو کے ملک افراسیاب سے لے آنے کے  
لیے روانہ کیا تھا تو گیکو اپنی تعریف میں اپنے دشمن کے مقابلہ میں کہتا ہے کہ میں رستم سے نبرد آزما  
میں کم نہیں ہوں میری قوت اور میری بہادری کا امتحان پہلے رستم نے کر لیا تھا تب مجھے اپنی بیٹی  
دی وغیرہ وغیرہ۔

دونوں رجز بالا جو ایک منسوب امام علیہ السلام اور دوسرا حضرت عباس کی طرف ہے  
کیا خوب پیرا بیان رکھتے ہیں۔ دونوں رجز کا بین فرق یہ ہے کہ ایک امام وقت کا رجز ہے اور  
دوسرا اس بہادر کا جو قریب رشتہ مند، پیرو اور جاں نثار امام علیہ السلام کا ہے۔ میرزا  
صاحب کو کیر کٹر نگاری اور فرق مراتب کے دکھلانے میں ایک حیرت انگیز دستگاہ حاصل  
تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ باتیں رزمی شاعری کی جان ہیں۔ انہیں باتوں نے ہومر کو ابوالشعر کہلایا  
ہے۔ اور انہیں باتوں سے ملٹن نے رزمی شاعری میں ایک بڑی شہرت حاصل کی ہے۔

نمبر ۵ شیریں امام علیہ السلام کی آمد کی خبر پاکر مہمانی کا سامان کرتی ہے۔

(مضامین بالا کا پانچواں نمونہ)

یہ کہہ کے اس نے فرش کیا گھر میں سر بسر      مومن کے دل کی طرح مصفا ہوا وہ گھر  
مسند بچائی بہر شہنشاہ بحسب و بر      تکیوں کو صاف کر کے لگایا ادھر ادھر  
کہتی تھی میرے گھر میں ابھی سے جو نور ہے

یہ آمد امام زمن کا ظہور ہے

دالان ہے یہ شاہ کی خواہر کے واسطے      یہ نرم فرش ہے علی اکبر کے واسطے  
جھولے کی جایہ ہے علی اصغر کے واسطے      یہ گھر ہے شاہ دین کے برادر کے واسطے

راحت سے شہ نشین ہے امام زمن رہیں

حجرہ یہ اس لیے ہے کہ دولہا دلہن رہیں

کرسی کو لاکے جلد کسی جا بچھاتی تھی      تحفوں کشتیوں میں کبھی وہ لگاتی تھی  
بجڑے میں بہر شکر کبھی سر جھکاتی تھی      گھبرا کے صحن سے کبھی ڈیوڑھی پہ جاتی تھی  
چہرے پہ اک خوشی تھی پہ دل بے قرار تھا

فرزند فاطمہ کا اسے انتظار تھا

جا کر کبھی خوابوں سے کرتی تھی یہ کلام      کھانا پکاؤ جلد کہ آتے ہیں اب امام  
بھر بھر کے آب سرد کے رکھ دو ہوا میں حلیم      لبریز آب گرم کے کر دو سبوتاں تمام  
پردیسیوں کو خیر سے جب گھر میں لاؤں گی

ہاتھوں سے اپنے پاؤں سبھو کدھلاؤں گی

ہمسایوں سے کہتی تھی ہنس نہس کے بار بار      اب کیجیو زیارت سلطان نامدار  
ہے باغ فاطمہ یہ عجب حسن کی بہار      رشک یا صحن خلد ہے ایک ایک گلزار

سب نو نہال گلشن دیں لا جواب ہیں

قد سرد باغ حسن ہیں رُخ آفتاب ہیں

شمشاد بوستاں پمپیر کو دیکھو      سرد ریاض حضرت شبیر کو دیکھو  
کیا نو جوان ہیں شہ کے برادر کو دیکھو      سب ایک سمت تم علی اکبر کو دیکھو



ہوگا کبھی یہ حسن ملک کا نہ خور کا  
جلوہ ہے اس جری میں محمد کے نور کا

خالق رکھے اُسے صدوی سال برقرار نام خدا ہے شادی کے قابل وہ گلخزار  
بہنیں فدا ہیں باپ تصدق ہے ماں نثار سر پر پھوپھی نے پیار سے گیسو رکھے ہیں چار  
چہرے کے آگے نیر تاباں بھی ماند ہے  
عالم کی روشنی ہے اندھیری کا چاند ہے

اب خیریت سے گزر گیا اٹھارہواں جو سال شادی کریں گی بیٹے کی بانوئے خوشنصال  
زینب کو اس کے بیاہ کا ارمان ہے کمال ہر دم یہی دعا ہے کہ دو لہا بنے یہ لال  
آئی ہیں بستیں حلب و شام و روم سے  
شادی خدا جو چاہے تو ہو دیگی دھوم سے

جب ڈھل گئی اسے انھیں باتوں میں پہر شوہر سے پھر وہ کہنے لگی وہ نکو سیر  
اب تک آئے گھر میں شہنشاہ بحر و بر اترے کہاں کسی سے مفصل سنی خبر  
بستی سے ساتھ لے کے ہر اک اپنے بھائی کو  
جا پیشوائے خلق کی تو پیشوائی کو

کیومرے طرف سے یہ چوم کر قدم لوندی کو سرفراز کر دیا شہ امم  
کرتے ہیں اغیار غبار پر سدا کرم اب بے حضور چین میں مجھ کو ایک دم  
کچھ آج ہے پیش سی دل بقرار میں  
آنکھیں سپید ہو گئی ہیں انتظار میں

قربان ہو گئی مرا گھر کچھ نہیں ہے دور خاصہ تناد ل آن کے اس جا کریں حضور  
ہم لوگ مشت خاک میں حضرت خدا کے نور ہوگا یہ کوہ آپ کے آنے سے رشک طور  
کہنا حضور راہ ہدایت کی شمع ہیں  
پروانے یاں سحر سے زیارت کو جمع ہیں

عصا بھی ہے آپ کے آنے میں کچھ اگر آنے میں کیوں حرم کے ہوئی دیر اسقدر  
ڈیوڑھی یہ بند و بست ہے یا شاہ بحر و بر گزوار بھی میں میں نے تنائیں ادھر ادھر

## محمل میں گھٹی ہوئیں گی زہرا کی پیاریاں عباس لے کے آئیں زنانی سواریاں

### بند ہائے بالا پر ریویو

عوام میں یہ قصہ مشہور ہے کہ جب اہل حرم میدان کربلا سے قید ہو کر شام کو روانہ ہوئے تو راہ میں ان حضرات کو قلعہ شیریں جو ایک کوہ پر واقع تھا ملا۔ وہاں شیریں اپنے شوہر کیساتھ رہتی تھی۔ شیریں ایک آزاد کردہ لونڈی حضرت امام علیہ السلام کی تھی۔ آزاد ہونے پر اُسی قلعہ دار سے اس کا بیاہ ہو گیا تھا۔ شیریں اپنے شوہر کے ساتھ نہایت آرام سے زندگی بسر کرتی تھی۔ اور اس کو پوری خوش حالی نصیب تھی۔ جب اہل حرم کی آمد کی خبر شیریں کو ہوئی تو اس نے مہمانی کا سامان کیا۔ یہ خبر اسے نہیں پہنچی تھی کہ امام علیہ السلام مع علی اکبر و قاسم و عباس و عون و محمد شہید ہو چکے ہیں۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ امام علیہ السلام اپنے لوگوں کو لیے ہوئے اس کی جانب تشریف لارہے ہیں۔ بند ہائے بالا شیریں کی مہمان داری کے مضامین سے تعلق رکھتے ہیں میرا نیس صاحب کے بیانات ہمیشہ فطرتی انداز کے ہوتے ہیں۔ یہاں بھی مہمانداری کے تمام امور کس قدر فطرت نگاری کے ساتھ حوالہ قلم ہوئے ہیں۔ کس قابلیت شاعرانہ کے ساتھ مہمانداری اور اس کے متعلقات کی تصویر کشی اپنے فرمائی ہے۔ میر صاحب کس قادر الکلامی کے ساتھ اعلیٰ درجہ کی مہمانداری کے سامان ایسے محترم مہمانوں کی آمد کی خوشی جو شیریں کو بھی ہمسائیوں سے اس کا اظہار پھر یہ کیسے مہمان ہیں اس کے پُر جوش محبت آگیں اور عقیدت مندانہ بیانات پھر مہمان عالی مقام کی تشریف آوری میں جو دید ہوئی تو شیریں کا شوہر سے یہ کہنا کہ توجا اور دیکھ کے حضرت امام علیہ السلام اب تک کیوں نہیں تشریف لائے۔ یہ انتظار اور اضطراب کا عالم پھر شوہر کو حضور امام علیہ السلام میں پیام لے جانے کی ہدایت وغیرہ وغیرہ۔ ایسی خوب صورت مصواریاں ہیں کہ انجام میر صاحب ہی کے قلم کا کام تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر مرثیہ میں مرثیت کا قائم رکھنا تناسب کلام کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا اور ہر قدم پر فطرت کا پیرو رہنا یہ خاص انداز میر صاحب کا ہے۔ یہی خوب صورت تصویر کشیاں ہومر کی ایلید میں دیکھی جاتی ہیں۔ اور درجل اور ملٹن نے بھی ہومر کے تتبع میں شاعرانہ مصوری کا کمال دکھلایا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ یہ دونوں شاعر ہومر کی ایلید سے پوری واقفیت رکھتے تھے۔ پس اگر ان دونوں نامی شاعروں نے اپنی اپنی



تصنیف میں اس ابو شعراء کی جمعیت سے بہت سی مددیں پائیں۔ تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ حیرت ہے میرا نہیں کے کلام پر کہ جو یقیناً ان تینوں شعرائے نامور سے مطلق خبر نہیں رکھتے تھے مگر فطرت نگاری اور شاعرانہ مصوری میں کم سے کم اپنی استعداد خاصی کی بدولت خود چمکے ہم پلہ نکلے یا اس سے بھی گرامی تر ثابت ہو سکے۔

## مرزا دبیر صاحب کے کمالات

واضح ہو کہ ایک مرثیہ سلطان الذاکرین جناب مرزا دبیر صاحب اعلیٰ اللہ مقامہ فی الجنۃ کا فیکر کی نظر سے گزرا ہے جو بندہ ہائے بالا کے مضامین سے تعلق رکھتا ہے یعنی جب اہل حرم واقع کر بلا کے بعد حالت اسیری میں دشمن کو چارہ ہے تھے تو قلم شیریں تک جس وقت پہنچے شیریں اس کی امید دار ہوئی کہ جناب امام علیہ السلام اس کے مہمان ہوں۔ جناب مرزا صاحب غفران مآب کے مرثیہ کا پہلا مصرع یہ ہے کہ

”جب حرم قلعہ شیریں کے برابر آئے“

یہ مرثیہ لاریب دیدنی ہے اس مرثیہ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعی جناب مہدوح بڑے خلاق سخن اور عالی طبیعت تھے۔ لاریب آپ سلطان الذاکرین تھے۔ آل مرثیہ نگاری کا بکا ہے اور کوئی شک نہیں یہ مرثیہ حضرت کا بہت مبکی ہے۔ اسی طرح حضرت کے بہت سے اور بھی مراث ہیں جو نہایت مبکی ہیں۔ میری دانست میں حضرت کو سلطان الذاکرین نہیں کہنا ایک بڑی حق کشی ہے۔ جناب غفران مآب ایک بڑے مذہبی شاعر تھے حضرت کو اس کی بھی بقدر استعداد پابندی تھی کہ بالکل وضعی روایات سلسلہ نظم میں دخل نہ پائیں۔ لاریب میرا نہیں صاحب مرحوم ایک بڑے رزمی شاعر تھے اور رزمی شاعر ہونے کی حیثیت سے ہو مر یا اور کسی رزمی شاعر کے ساتھ آپ کا موازنہ نامناسب نہیں سمجھا جاسکتا ہے۔ مگر میر صاحب کا موازنہ مرزا صاحب کے ساتھ جب کہ یہ دونوں شاعری کے جدا گانہ پہلوؤں کو برتتے ہیں۔ کوئی معقول شکل نہیں رکھتا ہے۔ رزمی شاعر کا موازنہ رزمی شاعر کے ساتھ اور مذہبی شاعر کا موازنہ مذہبی شاعر کے ساتھ لطف سے خالی نہیں ہو سکتا۔ مگر بے جوڑ موازنہ سے نہ کوئی معقول نتیجہ مترتب ہو سکتا ہے۔ اور نہ اہل ذوق کو ایسے موازنہ سے کوئی حظ کی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ شاعری سے علاحدہ ہو کر جناب مرزا دبیر صاحب اعلیٰ اللہ مقامہ فی الجنۃ کا درجہ حوصلے انسانی کو پست کر دینے والا نظر آتا ہے۔

آپ تمام تر صفات ملکوتی سے اور لاریب خاصان خدا سے تھے۔ اولیاء خدا کی خویاں و اہب العطا یا نے حضرت کو بخشی تھیں آپ کی سخاوت اور ایثار شہرہ آفاق ہے۔ علم و فضل کے ساتھ توفیق عبادت بہت کچھ خدائے پاک نے عطا فرمائی تھی۔ اخلاق محمدی کے آپ پورا نمونہ تھے جو دو سخا ہذا عطا میں اپنے جواب آپ تھے۔ طبیعت بے حد شریف اور غیور پائی تھی۔ منکسر مزاجی خاکساری اور فروتنی میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔ خوش مزاجی، خوش اخلاقی خوش اوقاتی آپ پر ختم تھی۔ عمر بھر کبھی کسی کی غیبت نہیں کی تازیت کسی سے ترش ہو کر نہ بولے رفتار گفتار کردار سب میں یکمائے وقت تھے۔ بالآخر حضرت کی خویاں حضرات اہل بیت علیہم السلام کی خوبیوں کا تمام تر پرتو تھیں حقیقت یہ ہے کہ جن حضرات کے آپ مداح تھے ان کے تفضلات آپ کے شامل حال تھے۔ جناب ممدوح فقیر کے والد ماجد شمس العلماء سید وحید الدین خاں بہادر مرحوم و مغفور کے بڑے دلی دوست تھے۔ راقم الحروف کو بڑی عقیدت مندی جناب غفران مآب سے تھی اور آج تک ہے۔ خدایا تو مجھ بندہ گنہگار کے جرائم کو اس سلطان الذاکرین کے صدقہ میں معاف فرما۔ اور اس کے ممدوحین معصومین کے طفیل میں مجھ مبتلائے عصیاں کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

### نمونہ کلام مرزا دبیر صاحب اعلیٰ الشہ مقامہ

بانو کا ہوا عقد جو سلطان امم سے ہمراہ کنیزیں کئی آئی تھیں غم سے  
ایک ایک کو آزاد کیا فرط کرم سے شیریں رہی خدمت کو پر آزاد تھی غم سے  
کیا بانو و شبیر کی شیریں کو دلا تھی  
دل ان پہ تصدی تھا تو جاں ان پہ فدا تھی  
اک دن لب شیریں سے کہا شنہ یہ ناگاہ کیا چشم ہے شیریں کی زہے صفت اللہ  
آراستہ بانو نے کیا اس کو بصد چاہ اور عرض کی لاریب یہ خوش چشم ہے پاشاہ  
سب خاک ہیں تم فاطمہ کے نور بصر ہو  
ہے عین خوشی میری جو منظور نظر ہو  
شیریں تو ہے کیا چیز بجلالتم یہیں داری ہے جان جو شیریں وہ نہیں آپ کے پیاری  
شیریں میری لونڈی ہے میں لونڈی ہوں تمہاری لونڈی میں کرتی ہوں یہ اے عاشق باری



مطلب تو ہے خوشنودی شاہ دو جہاں سے

بخشادل و جاں سے اُسے بخشادل و جاں سے

شہ لے کہا تم دل سے خیال اور رکھو دور کی مدح جو آنکھوں کی فقط مدح تھی منظور

ہے خلق پیمبر کے گھرانے کا تو مشہور اور شہ کرم اپنے گھرانے کا ہے دستور

واللہ بدوں پر بھی مجھے نیک نظر سے

دو آنکھیں ہیں پر سب پر مری ایک نظر سے

پھر پوچھا کہ بخشا اسے وہ بولی کہ بخشا شہ بولے ہم آزاد اسے کرتے ہیں اچھا

کچھ خرچ دو اس کو نہ کرے راہ میں فنا پوشاک بھی پہناؤ کہ حق تم پر ہے اس کا

شیریں کوئی چیز آن کے اب ہم سے نہ لے گی

اک روز وہ ہو گا کہ یہ چادر تمہیں دے گی

تب دوڑ کے بانو نے گلے اس کو لگایا شبیر کی بہنوں نے لباس اس کو پہنایا

پھر اپنے برابر اسے زینب نے بٹھایا تعظیم کی تکریم کی اور منہس کے سنایا

فطرس کا شرف آج تجھے حق نے دیا ہے

شہزادہ جبریل نے آداب کیا ہے

شیریں نے تب اندوہ جدائی سے بھری آہ اور شہ کے قدم چوم کے بولی وہ حق آگاہ

ہے عرض جو مجھ کو کسی قابل کرے اللہ تو ہدیہ شیریں ہو قبول حرم شاہ

بھجواؤں جو سوغات نہ رو کیجو میسری

مشکل میں پکاروں تو مدد کیجو میسری

تب حضرت سجاد پر شیریں ہوئی قربان اور بولی خوزادے تہا اللہ نگہبان

بابا سے سفارش مری تم کیجو ہر آن میں نے تمہیں پالا ہے ذرا اسکا رہے دھیان

عابد سے عجب طرح جدا ہوتی تھی شیریں

یاں روتے تھے سجاد وہاں روتی تھی شیریں

گہوارے سے شیریں نے تب اکبر کو اٹھایا آنکھوں سے بہت ننھے سے تلوں کو لگایا

پھر جھولے کے اندر دینے غادے کے لٹایا اللہ نبی کا مرے شہزادے یہ لٹایا

دنیا کا تجھے سچا چشم و جاہ ہوا کبر

اور سونے کے سہرے سے ترا بیاہ ہوا کبر

اب عرض ہے شیریں کی تم اقرار یہ فرماؤ ایسا ہو تم بیاہ میں لونڈی کو نہ بلواؤ

یہ خادمہ بھی دیکھے دہن بیاہ کے تم لاؤ آباد رہو چین کرو زیت کا پھل پاؤ

ہاتف کی ندا آئی یہ مظلوم ازل ہے

تقدیر میں اکبر کی فقط برہمی کا پھل ہے

القصد گئی شاہ کے مجرے کو جو شیریں تب ہچکیاں لے لے کے لگے رونے شہ دین

گردشہ دیں پھر کے لگی کہنے وہ غمگین قربان گئی روتے ہو کیا دو مجھے تسکین

پاشاہ میں صدقے میں فدا پھر نہ ملو گے

اس طرح روتے ہو تو کیا پھر نہ ملو گے

اب دو مرے مقصد میں خدا اس کا ہے اگلہ یا تو مجھے قدموں سے نگا رہنے دو پاشاہ

یا گھر میں مرے آنے کا وعدہ کر دلشہد فرزند نبی کی میں ضیافت کروں دل خواہ

میراث نبی پائی ہے فرزند علی نے

فصّہ کی ضیافت تو نہ رد کی تھی نبی نے

شیریں سے مخاطب ہوئے یوں سدا برابر اچھا ترے گھر آنے کا میں کرتا ہوں اقرار

اس دن کا تحمل نہ تجھے بھولے گا زہر عابد تو پیادہ مرے ہوئے گا میں اسوار

پیاسا کئی دن کا ترے گھر آؤے گا شبیر

پیاسا ہی ترے گھر سے چلا جائے گا شبیر

وہ بولی بھلا جائے میں دزدگی تجھے پیاسا حضرت نے کہا خیر سمجھ لیں گے جو ہو گا

پہنچانے کو شیریں کو گئے دور تک آقا رستے سے کہا لے مجھے اللہ کو سونپا

یکجویہ دعا چین لے غم سے ہمیں بھی

آزاد خدا کر لئے جہنم سے ہمیں بھی

قلعہ پر رہ شام کے تھا مسکن شیریں ہمسایہ عزیز ایک یہودی تھا خوش آئین

جس شب یہ گئی سوتا تھا وہ بندہ حق ہیں پھر عقد کو شیریں ملی یا خواب تھا شیریں



دیدار پیبر کا ملا دین خدا کا  
 روشن کیا شیریں نے گھر اس اہل وفا کا  
 شوہر ہے وہ ذکر شدہ دین کرتی تھی اکثر پہنچانے مجھے دور ملک آئے تھے سرور  
 کہتی تھی کبھی دوسری بی بی کے ہیں لبر نام ایک کا سجاد ہے اور ایک کا اکبر  
 دونوں سے عیاں قدرت رب ازلی ہے  
 بس نام خدا ایک نبی ایک علی ہے  
 گا ہے یہ بیان کرتی تھی وہ عاشق مولا مولا مرے آئین تو ذرا شرم نہ کرنا  
 میں لوٹدی ہوں ادنی تو غلام انکا ہے گویا خدمت میں کمر بستہ سدا رہو مہبت  
 وہ کہتا تھا تو انکی میں ان کا یہ گھران کا  
 تقدیر یہ کہتی تھی کہ آئے گا سران کا  
 دن پوچھتا تھا آمد مولا کے جو شوہر تب کہتی تھی شوہر سے یہ وہ عاشق سرور  
 یہ پوچھنا میں بھول گئی داتے مقدر تاریخ مقرر نہیں آنا ہے مقرر  
 کہتا ہے یہ دل آئیں گے مولا مرے گھر میں  
 یا ماہ محرم میں دیا ماہ صفر میں  
 شیریں کو عجب الفت سلطان امم تھی ہر دم شد والا کی وہ مشتاق قدم تھی  
 آنکھ اس کی سوتے صورت باتوئے عجم تھی پتلی صفت قبلہ نما سوتے حرم تھی  
 غش کرتی تھی اقرار امام دو جہاں پر  
 اس کی نہ خبر تھی کہ سر آئے گا سنان پر  
 ڈیوڑھی پہ سدا نور کے تڑکے اسے آنا اور شام کو دروازے سے روتے ہوئے جانا  
 کہ صبح سے مولا کے لیے فرش بچھانا اور شام کے نزدیک بھدیاں اٹھانا  
 شہ کے لیے تیار کبھی کرتی غذا کو  
 مولا جو نہ آتے تو کھلا دیتی گدا کو  
 ناگاہ ہوا شاہ سے برگشتہ زانا جائز کیا فرزند پیبر کا ستانا  
 مسلم کا مدینہ سے ہوا کوفہ کو آنا آخر کو ہوئے شاہ بھی میثرب کو روانا

U-1097418

واں نکلے نبی قبر سے اور شاہ وطن سے  
 یا روح نکلے نگلی شیریں کے بدن سے  
 تصویر دہاں در بدر آقا کو پھراتی      شیریں یہاں در پر کبھی آتی کبھی جاتی  
 گھبرا کے کبھی کوہ کے نیچے اتر آتی      رہ گیروں کو جا جا کے سر راہ سنانا  
 دنیا میں ہوں اور نہیں دنیا کی خبر ہے  
 لوگو تمہیں دلبر زہرا کی خبر ہے  
 پانی جو نہ اس نے خبر ضبط پیمبر      ذبیح سے ہوئی تارک لذات وہ مضطر  
 کچھ پی لیا کچھ کھالیا آیا جو میسر      سونے کے لیے فرش و زمین دونوں برابر  
 اندیشوں نے یہ حال کو تبدیل کیا تھا  
 پوشاک بدلنا بھی غرض چھوڑ دیا تھا  
 ہمسائیاں کہتی تھیں بنایا ہے یہ کیا حال      پوشاک جو میلی ہے تو ابھی ہوئے ہیں بال  
 وہ کہتی تھیں نیرنگ نظر آتا ہے امسال      دریافت بھی کو نہیں ہوتا مرا احوال  
 پوشاک کی کچھ مجھ کو خبر ہے نہ ردا کی  
 اللہ بس اپ خیر کرے آل عبا کی

بند ماتے بالا حضرت مصنف کے زور بیان، خلاق سخن اور عالی خیالی سے پورے طور پر  
 خبر دیتے ہیں۔ بلاشبہ جناب مرحوم اپنے جواب آپ تھے۔

ع خاموشی شنائے تو حد شنائے تو

الحمد للہ کہ یہ دوسری جلد بھی بہارستان سخن کی تمام ہوئی۔ مگر مرثیہ نگاری کے لگاؤ  
 سے راقم کا فرض منصبی تھا کہ استاد فن جناب فضیلت آب مرزا اوج صاحب ادام اللہ تعالیٰ  
 افاداتہ کے نمونہ کلام سے بھی اپنی اس تصنیف کو بھی زینت دیتا ہے۔ لیکن نہایت جلئے حسرت  
 ہے کہ حضرت مہدوح کا کوئی کلام اس ہیچمان کو دستیاب نہ ہو سکا۔ حالانکہ اس ناچیز کو حضرت  
 کے کلام بلاغت نظام سے مشرف ہونے کا اتفاق بار بار ہوا ہے۔ آپ جناب سلطان الذکرین  
 مرزا دبیر علی اعلی اللہ مقامہ فی الجنۃ کے ایسے خلع الصدق ہیں کہ ماسوا اللہ جنہوں نے  
 اپنی حیرت انگیز قابلیت شاعری سے اپنے پدر بزرگوار کے نام نامی کو اوج بالا لائے اوج بخشا  
 ہے۔ پدر نام دار و پسر نام جو۔ جناب اوج لاریب ایک بڑے رزمی شاعر ہیں۔ آپ کا زور کلام



تناسب مضامین اور فلسفانہ انداز بیان بہت کچھ قابل قدر ہے آپ جناب میر انیس صاحب اور اپنے والد عالی مقام کی ترکیب شاعری سے بالکل ایک جدا رنگ رکھتے ہیں۔ اور یہ ایسا رنگ ہے کہ ہر ذی فہم اسے آسانی کے ساتھ تمیز کر سکتا ہے۔ مجھے اس کا بھی افسوس ہے کہ کوئی نمونہ حضرت شاد مدظلہ کی مرثیہ نگاری کا عدم دستیابی کی وجہ سے فقیر کی اس تصنیف میں داخل نہ کیا جاسکا۔ آپ کا کلام بھی ایک خاص رنگ رکھتا ہے اور نہایت قابل توجہ ہے۔



رب لامکاں کا صد شکر ہے کہ اس نے ہمیں توفیق دی کہ ہم اردو ادب کی کتب کو سافٹ میں تبدیل کر سکے۔ اسی صورت میں یہ کتاب آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ مزید اس طرح کی عمدہ کتب حاصل کرنے کے لئے ہمارے گروپ میں شمولیت اختیار کریں۔

انتظامیہ برقی کتب

گروپ میں شمولیت کے لئے:



محمد ذوالقرنین حیدر: +92-3123050300

اسکالر سردار طاہر صاحب: +92-334 0120123





**Price Rs. 22 00**